قاضی عبدالستار: حیات اور کارنامے

تحقیقی مقالہ

برائے ڈی۔فل۔اردو (2021)

نگراں

پروفیسر شبنم حمید

صدر، شعبۂ اردو

الہ آباد یونیورسٹی، پریاگ راج
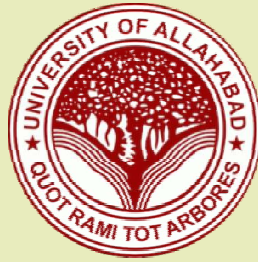
مقالہ نگار

راشدہ خاتون

ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو

الہ آباد یونیورسٹی، پریاگ راج

شعبۂ اردو

الہ آباد یونیورسٹی، پریاگ راج

DEPARTMENT OF URDU

University of Allahabad, Prayagraj

Prof. Shabnam Hameed
Head
Department of Urdu
University of Allahabad
Prayagraj

پروفیسر شبنم حمید
صدر
شعبۂ اردو
الہ آباد یونیورسٹی، پریاگراج

CERTIFICATE

This is to certify that **Rasheda Khatoon**, D. Phil student, Department of Urdu, University of Allahabad, has completed her Research Work on **"QAZI ABDUS SATTAR: HAYAAT AUR KAARNAMEY"** under my supervision. Her Research Work is satisfactory and may kindly be sent to the external examiners for evaluation.

Date: 18/06/2021

Supervisor's Signature

(Prof. Shabnam Hameed)

HEAD
Urdu Department
University of Allahabad
Prayagraj-211002

Residence

Superintendent - House, P. D. Hostel, Women's College Campus, A.U. , Prayagraj , Mob.: 9839055704
Email : shabnamhameed.au@gmail.com

DECLARATION

I hereby declare that this thesis entitled **"QAZI ABDUS SATTAR : HAYAAT AUR KAARNAMEY"** is bonafied research work carried out by me for the degree of Doctor of Philosophy (D.Phil) from Department of Urdu, University of Allahabad, under the guidance and supervision of Prof. Shabnam Hameed, Head, Department of Urdu, University of Allahabad.

The thesis has not previously formed the basis for the award of any degree, diploma or fellowship or other similar titles of recognition.

Date: 18 / 06 /2021

Rasheda Khatoon 18-06-2021

(RASHEDA KHATOON)
Research Scholar
Department of Urdu
University of Allahabad

HEAD
Urdu Department
University of Allahabad
Prayagraj-211002

پیش لفظ

اردو ادب کی تاریخ میں قاضی عبدالستار کی شخصیت محتاج تعارف نہیں ہے۔ انھوں نے شاعری بھی کی افسانے بھی لکھے اور ناول بھی رقم کئے بہ طور خاص تاریخی ناول لکھ کر ادب کی دنیا میں اپنا ایک الگ مقام بنایا اپنی ایک منفرد شناخت قائم کی۔

قاضی عبدالستار کی شخصیت ادبی اور فنی اعتبار سے عہد ساز شخصیت ہے۔ ان کی تخلیقات اردو ادب کا بیش بہا سرمایہ ہیں۔ انھوں نے اردو ادب کے ذخیرے میں ایسی بیش بہا یادگاریں چھوڑیں ہیں جن کی روشنی حال اور مستقبل کے ادیبوں کی رہبری اور رہنمائی کرتی ہے ساتھ ہی یہ یادگاریں ایک سماجی ودستاویز کی بھی حیثیت رکھتی ہیں۔ قاضی عبدالستار کا اسلوب اور اس کا رنگ وآہنگ انھیں ایک الگ شناخت عطا کرتا ہے۔ وہیں بیسویں صدی کی ساتویں دہائی میں تاریخی موضوعات پر قلم اٹھا کر انھوں نے اپنی ایک انفرادی شان قائم کی اور سب سے بڑے تاریخی ناول نگار ہونے کا سہرا بھی اپنے سر پر سجایا۔

قاضی عبدالستار کی افسانوی کائنات میں قدم رکھتے ہی ان بیانیہ انداز اور ماضی کے ماحول جزئیات نگاری دل کو چھو لیتی ہے۔ ان کی بیشتر تخلیقات ماضی کی بازیافت کا کام کرتی ہیں۔ قاری کو چونکا دیتی ہیں ایسا تو میں نے بھی سنا ہے ایسا تو میں نے بھی دیکھا ہے جیسی کیفیت ہوتی ہے۔ قاضی صاحب کی کہانیاں ماضی کی خوبصورت تصویریں ہیں جن کی پیشکش میں انھوں نے گہرے سماجی شعور اور اس میں ان کا فلسفیانہ اپروچ بھی دکھائی دیتا ہے۔ ان کی کہانیاں قاری کو اس سنہرے دور میں لے جاتی ہیں جن نے اپنے ماضی سے محبت کی ہے اس سے لگاؤ رکھتے ہیں اپنے خوبصورت ائیر کنڈیشن گھر کو بھول کر دالان چھجہ اوسارا اور ڈیوڑھی کو اپنے دل کے قریب محسوس کرتے ہیں اور اس مٹی کی سوندھی مہک، اس کی خوشبو اور اس کی ٹھنڈک محسوس کرتے ہیں اور دل ودماغ ولطف وانبساط کی دولت فراہم کرتے ہیں۔

اس لئے مجھے لگتا ہے کہ قاضی عبدالستار ایک ایسے فکشن نگار ہیں جنھیں تنقید کے مروجہ پیمانوں سے نہیں پرکھا جا سکتا اس لئے کہ انھوں نے اردو فکشن میں ایک نئی راہ نکالی ایک نئے زاویہ سے اپنے ماحول اور معاشرے کو دیکھا اور اپنے دور کے حالات کو ایک نئے انداز میں پیش کیا۔ یہ انداز ان کے معاصر ادیبوں سے بالکل مختلف نظر آتا ہے اس لئے قاضی عبدالستار صاحب پر لکھی گئی تحریریں یا تنقیدی نگارشات ان کے فن اور فکر کے ساتھ انصاف نہیں کر پاتیں کہ ان کے پیمانے پرانے ہوتے ہیں۔ پرانے پیمانے نئی زندگی یا نئی فکر والے فن پاروں کو ٹھیک سے پرکھ نہیں پاتے اس لئے ضرورت ہے کہ قاضی صاحب کی تخلیقات کو تنقید کے نئے معیاروں پر پرکھا جائے تا کہ ان کی صحیح قدر و قیمت کا تعین ہو سکے۔ میں نے اس موضوع کا انتخاب اسی مقصد کے پیش نظر کیا ہے۔ میرے نزدیک قاضی عبدالستار ایک ایسے فکشن نگار ہیں جن پر خاص توجہ کرنے کی ضرورت ہے اس لئے کہ انھوں نے اردو فکشن میں بالکل نئے موضوع کو داخل کیا ہے۔ جس وقت دوسرے فکشن نگاروں کے یہاں زمیندارانہ نظام کے ظلم وستم کو دکھایا جا رہا تھا اور ان کی خرابیاں گنوائی جا رہی تھیں۔ وہیں قاضی عبدالستار نے اسی زمیندارانہ نظام کو ایک نئے زاویۂ نظر سے دیکھا اور اپنی تحریروں سے یہ ثابت کیا کہ ظلم وستم ڈھانے والا طبقہ اب خود بھی ظلم وتشدد کا شکار ہے۔ حالات نے اس کو ظالم سے مظلوم بنا دیا ہے جابر سے مجبور کر دیا ہے اور اس کو انھوں نے اس دردمندی اور سوز وگداز کے ساتھ پیش کیا کہ پڑھتے وقت اس طبقے سے قاری کو ہمدردی ہونے لگتی ہے اور کہیں کہیں تو زمینداروں کے بگڑے ہوئے حالات بدلی ہوئی صورت حال کو دیکھ کر آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔ قاضی عبدالستار کا افسانہ ''پیتل کا گھنٹہ'' اور ''مالکن'' اس کی سب سے بڑی عمدہ مثال ہیں۔

جہاں ایک طرف قاضی انعام حسین اور ان کی بیوی مفلسی کے اس مقام پر ہیں جہاں لوگ اپنے ضمیر تک کا سودا کر دیتے ہیں مگر انھوں نے اپنی فیاضی اور وضعداری کو قائم رکھنے کے لئے اپنی وراثت کی نشانی کو بیچ ڈالتے ہیں۔ انعام حسین اور اس کی بیوی محتاگی غریبی بےبسی دیکھ کر ایک سخت جان قاری بھی آبدیدہ ہوسکتا ہے۔ اور ''مالکن'' افسانے کی مالکن کی فقیری اور بھوک مری ایک دردمند انسان کے درد وغم میں اضافہ کر سکتی ہے۔

ان کے علاوہ قاضی صاحب کے بیان کردہ موضوعات ایک خاص عہد کا ایسا سماجی دستاویز ہیں جس

میں تاریخ،تہذیب کے ساتھ سماجی، سیاسی شعور اور ایک دردمندانہ لگاؤ بھی دکھائی دیتا ہے۔فکشن کو قاضی عبدالستار نے ایک نیا اسلوب بھی دیا۔ایک ایسا اسلوب جو بیانیہ کا حسن تو پیدا کرتا ہی ہے۔شعری آہنگ کا لطف بھی حاصل کراتا ہے۔قاضی عبدالستار نے اپنی افسانوی تحریروں میں ایسی ایسی عبارتیں لکھی ہیں اور ایسے ایسے جملے خلق کئے ہیں کہ لوگ انھیں شاعری کی طرح پڑھتے اور سر دھنتے ہیں۔''کہانی سنانے کا ڈھنگ'' اور ''قول محال کا بادشاہ''، ''نسیم بہار کا پالا ہوا''، ''یا افسانوں کا زمیندار''، ''عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں'' جیسے القاب و آداب سے انھیں تخلیق کار اور نقاد یاد کرتے رہے ہیں۔قاضی عبدالستار کے شعری جملے بھی شاعری کی طرح ذہن میں نقش ہو جاتے ہیں۔موقع ومحل سے لوگ انھیں دہراتے رہتے ہیں۔

قاضی عبدالستار نے جس باریکی سے زمیندارانہ معاشرے کو دیکھا اور جس سچائی کے ساتھ اسے پیش کیا اس کی اس پیش کش کے انداز سے ایک ایک بات کی تصویر ابھر آتی ہے۔ایسا بیانیہ ایسا انداز بیان کسی اور فنکار کے یہاں مشکل سے ہی نظر آتا ہے۔قاضی عبدالستار کے یہاں ایسا اس لئے ہوا کہ وہ خود بھی زمیندارانہ ماحول سے تعلق رکھتے تھے۔وہ زمیندار تھے اور زمیندارانہ نظام کو قریب سے دیکھا تھا اور اس کی نعمتوں سے لطف اندوز بھی ہوئے تھے اس لئے ان کی افسانوی تحریروں میں اس نظام کی بولتی ہوئی تصویریں ابھر آتی ہیں۔

قاضی عبدالستار کے فکشن کی یہ خوبیاں تقاضا کرتی ہیں کہ قاضی عبدالستار پر توجہ مرکوز کی جائے اور ان کے فکر وفن کو بار بار پڑھا جائے اور ان پر بار بار لکھا جائے۔قاضی صاحب کو پڑھتے ہوئے میں احساس سے گزری کہ قاضی صاحب کے فکر وفن کے ساتھ انصاف نہیں ہو پایا ہے۔میری ناقص رائے کے مطابق ابھی تک قاضی عبدالستار کے حیات اور مکمل ادبی کارناموں پر باضابطہ کوئی ایسا تحقیقی کام نہیں ہوا ہے جو اتنے بڑے فنکار کے شایان شان ہو۔اس لئے ایم۔اے(اردو) الہ آباد یونیورسٹی سے کرنے کے بعد میں نے یہ طے کیا کہ مجھے قاضی عبدالستار کے فکشن پر کام کرنا ہے۔اس لئے میں نے شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی اردو ریسرچ میں داخلہ کا فارم پُر کر دیا اور قاضی عبدالستار کی حیات اور کارنامے پر تحقیق کرنے کے لئے خاکہ پیش کیا اور اتفاق میرا یہ موضوع منتخب بھی ہو گیا۔جب یہ موضوع تحقیق کے لئے مجھے پیش کیا گیا تو میرے نگراں استاد ذی وقار پروفیسر علی احمد فاطمی صاحب کو بنایا گیا اور اس مقالے کا آغاز ان کی ہی رہنمائی میں ہوا۔

پروفیسر فاطمی خود بھی فکشن کے نقاد ہیں اور قاضی عبدالستار سے ان کی قربت بھی رہی ہے۔انھوں نے میرے اس موضوع میں دلچسپی بھی خوب لی اور انھوں نے میری ملاقات بھی قاضی صاحب سے کرادی۔ میں نے قاضی صاحب سے اس موضوع پر کام کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تو قاضی صاحب بہت خوش بھی ہوئے اور انھوں نے اپنے فن وفکر کے کچھ اسرار ورموز بھی بتائے اور میرے لئے دعائیہ کلمات بھی کہے۔ میری بات قاضی صاحب سے فون پر بھی ہوئی اور انھوں نے اپنا ناول ''حضرت جان'' کی عکسی کوارسال کرنے کے لئے کہا جوان کے پاس موجود نہیں تھا اتفاق سے وہ ناول پروفیسر علی احمد فاطمی کے توسط سے میرے پاس موجود تھا جسے میں نے بہت خوشی کے ساتھ پوسٹ کردیا۔

پروفیسر علی احمد فاطمی صاحب جون 2019 میں سبکدوش ہوگئے اور یو جی سی کے اصول وضوابط کے تحت میرا کام پروفیسر شبنم حمید صاحبہ کے ذمہ سونپ دیا گیا۔ پروفیسر شبنم حمید نے بھی اپنی دلچسپی کا اظہار کیا اور بہ خوشی نگراں ہونا قبول کیا اور کام کرانے میں دلچسپی کا اظہار کیا۔ان کے نیک اور مفید مشوروں نے قدم قدم پر میری رہنمائی کی اور میرے مقالے کو بہتر اور وقیع بنانے میں ایک اہم کردار نبھایا۔ پروفیسر شبنم حمید نے نگراں کا کام تو انجام دیا ساتھ ہی صدر شعبہ کی حیثیت سے بھی میرے کام میں دلچسپی لی۔ یہ ان ہی کی دلچسپی اور ہدایات کا نتیجہ ہے کہ میرا مقالہ وقت پر پایۂ تکمیل کو پہنچا۔

اس مقالے میں میں نے پانچ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا باب حیات وشخصیت پر مبنی ہے۔اس باب میں قاضی عبدالستار سے متعلق سوانحی کوائف کو حقائق کی روشنی میں جانچنے اور پرکھنے کی سعی کی گئی ہے اور اس بات کی حتی الامکان کوشش کی گئی ہے کہ ان کی پیدائش حیات وشخصیت کے متعلق جو بھی بات کی جائے وہ دلائل کی روشنی میں کی جائے۔ کیونکہ قاضی عبدالستار کی سن پیدائش کے متعلق الگ الگ تاریخ درج ہیں۔ ساتھ ہی مصنف کے ماحول اور ان کے مزاج اور ان کی شخصیت کے مختلف جہتوں کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جو شخصیت بعض لوگوں کی نظر میں اچھی تو بعض لوگوں کی نظر میں منفی نظر آتی ہے۔ان کی شخصیت کی انانیت،خود پسندی اور کجی کا بھی پتہ لگانے کی کوشش کی گئی ہے ساتھ ہی اس کے تہذیبی ونفسیاتی عوامل کے اثرات بھی ان کی تحریروں میں دکھائے گئے ہیں۔

قاضی عبدالستار کے سوانحی کوائف اور ان کے تحقیقی تنقیدی کاموں کو سن اشاعت کے ساتھ درج کرنے

اور یکجا کرنے کی حتی الامکان کوشش کی گئی ہے ان کی تخلیقات کب اور کہاں پہلی بار شائع ہوئیں ان کو معروضی اور تحقیقی انداز سے لکھا گیا ہے۔ مقالے کے ہر باب میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ موضوع کے متعلق تمام تر پہلوؤں کا احاطہ کیا جا سکے تمام ضروری حوالے آجائیں تا کہ بات مدلل اور مستند ہو۔ اس بات کا بھی خیال رکھا گیا ہے کہ معروضی نقطۂ نظر سے جائزہ لیا جائے تا کہ ہر پہلو کے ساتھ انصاف ہو سکے۔

دوسرے باب میں قاضی عبدالستار سے قبل اردو فکشن کا عمومی جائزہ پیش کیا گیا ہے تا کہ اردو فکشن کے خدوخال اس کی ارتقائی صورت حال کا جائزہ لیا جا سکے اور ساتھ ہی یہ پتہ لگایا جا سکے کہ قاضی عبدالستار سے قبل اردو فکشن کیسا تھا۔ کیسے کیسے موضوعات ادب میں پیش کئے جا رہے تھے اور قاضی عبدالستار نے ادب کو کیا دیا اور کیسے ناول اور افسانے تخلیق کئے۔ ان کی انفرادیت کی کیا وجوہات ہیں۔ اس باب میں ڈپٹی نذیر احمد، عبدالحلیم شرر، پریم چند، اعظم کریوی، سدرشن، سہیل عظیم آبادی، اختر حسین رائے پوری، عصمت چغتائی، کرشن چندر وغیرہ کے فکشن کا مختصراً جائزہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

تیسرا باب قاضی عبدالستار کی افسانہ نگاری پر مبنی ہے۔ اس باب میں زمیندارانہ نظام کی شروعات کا ایک اجمالی جائزہ جو مختلف کتابوں، دستاویزوں اور ویب سائٹ سے حاصل کی گئی معلومات سے اخذ کیا گیا ہے۔ اس کے بعد قاضی عبدالستار کی افسانہ نگاری کے امتیازات اور زمینداری کے خاتمے کے اثرات جن کی مختلف شکلیں قاضی عبدالستار کی افسانہ نگاری میں نظر آتی ہیں ان پر معروضی انداز میں گفتگو کی گئی ہے ان افسانوں کا تفصیلی جائزہ اور تجزیہ پیش کیا گیا ہے جن سے قاضی عبدالستار کو ادب کی افسانوی دنیا میں پہچان ملی۔ قاضی عبدالستار کے یہاں خاص موضوعات دیہی، شہری اور تاریخی رنگ کے نظر آتے ہیں انھیں ذیلی ابواب میں تقسیم کر ان پر الگ الگ عنوان کے تحت روشنی ڈالی گئی ہے۔ تحقیقی وتنقیدی نقطۂ نظر سے انھیں پیش کیا گیا ہے یہ افسانے پہلی بار کسی رسائل و جرائد میں شائع ہوئے اس بات کا بھی اہتمام کیا گیا ہے۔ قاضی عبدالستار کا اسلوب اور زبان و بیان کے لحاظ سے بھی افسانے کا جائزہ لیا گیا ہے۔

مقالے کو چوتھا باب قاضی عبدالستار کی ناول نگاری بعنوان ''معاشرتی اور تاریخی ناولوں'' پر مختص ہے۔ اس باب میں قاضی عبدالستار کا پہلا ناول ''شکست کی آواز'' جو مختلف عنوان کے تحت شائع ہوتا رہا ہے ''آخری کہانی'' تک پر مبنی ہے۔ اس باب میں معاشرتی اور تاریخی ناول کے نام سے دو ذیلی ابواب قائم کئے

گئے ہیں۔معاشرتی ناول کے تحت ''پہلا اور آخری خط''، ''شب گزیدہ''، ''مجو بھیا''، ''بادل''، ''غبارِشب''، ''حضرت جان''، ''تاجم سلطان''، ''آخری کہانی'' تک کے تحت قاضی عبدالستار کی معاشرتی ناول کی قدر و قیمت متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔معروضی نقطۂ نظر سے ناولوں کا جائزہ لیا گیا ہے اوراس بات کی سعی کی گئی ہے کہ قاضی عبدالستار کے معاشرتی ناولوں کا مکمل جائزہ لیا جائے اوراس کی فنی باریکیوں پر سیر حاصل گفتگو کی جائے۔

تاریخی ناولوں کے تحت ''صلاح الدین ایوبی''، ''داراشکوہ''، ''خالد بن ولید'' اور ''غالب'' کو رکھا گیا ہے۔قاضی عبدالستار کے تاریخی ناول اپنے پیش رووٴں سے کتنے اور کیسے منفرد ہیں اس بات کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔قاضی عبدالستار کے تاریخی ناول اور تاریخی ناول کے ارتقاء میں اہم کردار نبھاتے ہیں اور ناول کے سرمایہ کو زرخیز بناتے اور تخلیق کاروں کو نئے طریقے اور نئے پیرائے میں سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔ان کے تاریخی ناولوں میں موضوعات کے ساتھ ساتھ ان کے انداز بیان اور اسلوب نگاری اور لفظوں کی سحر کاری کو بھی سمجھنے پرکھنے اوران کے مقام ومرتبے پر بحث کی گئی ہے۔

مقالے کے آخری باب میں قاضی عبدالستار کے غیر افسانوی تحریروں پر مبنی ہے جن میں ان کا تحقیقی مقالہ ''اردو شاعری میں قنوطیت''، ''جمالیات اور ہندوستانی جمالیات'' اور ادبی رسائل و جرائد میں شائع متفرق موضوعات پر مبنی ان کے مضامین کا تنقیدی کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ساتھ ہی سوانحی زندگی پر مبنی انٹرویو جوانھوں نے راشدانور راشد کو دیا تھا اس کو تنقیدی اور معروضی نقطۂ نظر سے پرکھا گیا ہے۔

قاضی عبدالستار ایک زمانے میں ''صہبا مچھریٹوی'' کے تخلص کے ساتھ شاعری کرتے تھے ان کی منتشر غزلوں اور نظموں کو مقالے میں شامل کیا گیا ہے۔

اس تحقیقی مقالے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں جن کرم فرماوٴں نے میرے ساتھ دیا ان کا شکریہ ادا کرنا اوران کے اس گراں بہا احسان کو یاد کرنا میرا فرض اولین ہے۔سب سے پہلے خدا کا شکرادا کرتی ہوں جس نے مجھے تعلیم حاصل کرنے کا موقع دیا اور مجھے ایک بہتر زندگی عطا فرمائی اور میرا تعلق علم وادب کی دنیا سے بنایا۔اپنے والدین کا جن کی دعاوٴں ،تمناوٴں اور کاوشوں نے مجھے قلم پکڑنے کے قابل بنایا جہاں میں گھر سے دور ہو کر اس علمی وادبی کام کرنے کے لائق بن سکی جنھوں نے میری تعلیم وتربیت پر خصوصی توجہ دی اور

مجھے تعلیم کے میدان میں آگے بڑھنے اور ہر طرح کی فکر پریشانیوں سے دور رکھا اور میرے حق میں ہمیشہ دعا گو رہے جن کی دعا سے ہر منزل آسان رہی اور کامیابی ملتی رہی۔ اپنے استاد ونگراں پروفیسر علی احمد فاطمی جن کی رہنمائی اور کرم فرمائی نے علم و ادب سے رشتہ جوڑنے تنقیدی و تحقیقی صلاحیت کو جلا بخشی جن کی مدد ،کوششوں اور کاوشوں سے مجھے مواد کی تلاش کرنے کے لئے زیادہ خاک چھاننے کی ضرورت نہیں محسوس ہوئی۔ پروفیسر شبنم حمید جن کی نگرانی میں یہ مقالہ پایۂ تکمیل کو پہنچا جنھوں نے ہمیشہ آسانیاں فراہم کیں اور جن شفقتوں اور محبتوں اور خصوصی توجہ نے میرے اندر ہمت اور حوصلہ پیدا کیا۔ حق تو یہ ہے کہ ان کے تئیں اپنی ممنونیت کے احساس اظہار کے باوجود شکریہ ادا کرنے سے گریز کر رہی ہوں یہ مختصر سا لفظ ان کے بے پایاں مہر و خلوص کا بدل نہیں ہوسکتا۔

شعبے کے دوسرے اساتذہ ڈاکٹر محمد کاشف، ڈاکٹر ظفر اللہ انصاری اور ڈاکٹر سنجے کمار کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔ اپنے تمام گھر والوں بہ طور خاص بڑے ابو اور بڑی امّی کا شکریہ جو ہمیشہ میرے حق میں دعا گو رہے۔ ساتھ ہی اپنے تمام بھائی بہنوں کا شکریہ جنھوں نے اپنے حصہ کا وقت مجھے دیا اور ہر طرح کی فکر سے آزاد رکھا۔ علاوہ ازیں تمام ساتھیوں کا شکریہ جن میں خصوصاً سفینہ سماوی بہن جو قدم قدم پر رہنمائی کرتی رہیں، چند دوسرے ساتھیوں اسنا سحر،صفت زہرا اور دیگر دوستوں کا شکریہ جن کے ساتھ رہ کر گھر والوں سے دوری کا کم ہی احساس ہوا۔ جناب موسیٰ صاحب کا بھی شکریہ ادا کرتی ہوں جنھوں نے وقت کی تنگ دامنی کے باوجود میرا مقالہ کمپوز کیا۔ اللہ انھیں جزائے خیر عطا کرے۔

تحقیقی مواد حاصل کرنے کے لئے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، رضا لائبریری رام پور، دہلی یونیورسٹی جانے کی ضرورت پڑی جہاں مجھے مواد حاصل کرنے میں ان تمام لائبریریوں کے حق میں دعا گو ہوں اللہ انھیں سلامت رکھے۔

مارچ 2021

راشدہ خاتون

شعبۂ اردو

الہ آباد یونیورسٹی، پریاگ راج

Hasnain Sialvi

فہرست

باب اول

قاضی عبدالستار: حیات اور شخصیت

☆ پیدائش

☆تعلیم و تربیت

☆ ملازمت

☆ خاندان

☆شخصیت کے امتیازات

(ا)انانیت

(ب)سخت مزاجی

(ج)بے باکی

☆ سوانحی کوائف

☆وفات

قاضی عبدالستار کی شخصیت کا جائزہ لینے کے قبل یہ جان لینا ضروری ہے کہ کسی فن کار کے فکر وفن کا محاکمہ کرتے وقت اس کی صورت و سیرت اور سوانحی کوائف کا احاطہ اس لیے کیا جاتا ہے تا کہ اس کی تخلیقات کی گرہیں کھل جائیں۔ دھند لکے دور ہو جائیں۔ ابہام کے بادل چھٹ جائیں، علامتیں واضح جائیں، نفسیاتی الجھنیں سلجھ جائیں، فن پارے کا مکانی اور زمانی تناظر سامنے آجائے اور وہ تناظر اس حقیقت کی غمازی کر سکے کہ کوئی فن پارہ کیوں کر وجود میں آیا، کس معاشرتی دباؤ کے نتیجے میں ابھرا، کن حالات نے اس کے لیے زمین تیار کی، کس آب و ہوا نے اس کی آبیاری کی اور کس ماحول نے اسے رنگ و روغن بخشا؟

فن کار کی شخصیت اور ذات وصفات کا مطالعہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ سوانحی کوائف فن کار کے فطری مزاج، اس کی علمی صلاحیت، ذہنی استعداد، خاندانی حسب ونسب، معاشرتی حالات، نفسیاتی کیفیات، زمانی و مکانی حالات سبھی کچھ سامنے لاتے ہیں۔ اس سلسلے میں پروفیسر غضنفر نے اپنے ایک مضمون میں بڑے ہی پتے کی بات لکھی ہے، فرماتے ہیں:

''خالص حقائق (Facts) پر مبنی جس غیر افسانوی صنفِ ادب کو فکشن کی طرح پڑھا جاتا ہے اور جس میں بسا اوقات فکشن سے بھی زیادہ لطف آتا ہے یا جس سے افسانوی ادب سے بھی سوا حظ حاصل ہوتا ہے وہ سوانح حیات ہے۔ لطف کا سبب یہ ہے کہ سوانح حیات کا محور و مرکزِ انسان ہوتا ہے۔ انسان جس کی ذات میں ایسی ایسی کھڑکیاں ہوتی ہیں جن کے کھلتے ہی حیرت واستعجاب کا سمندر ٹھاٹیں مارنے لگتا ہے۔ نہاں خانوں میں بیٹھی وہ صورتیں بھی دکھائی دینے لگتی ہیں جنھیں دیکھ کر ہوش گم ہو جاتے ہیں۔ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ جن کھڑکیوں سے ایسے ایسے نظارے نظر آتے ہیں کہ وہاں سے نگاہ ہٹنے کا نام نہیں لیتی اور نظاروں سے ایسے اور اتنے رنگ پھوٹتے ہیں جتنا کہ آسمان پر تننے والی اندر دھنش سے بھی نہیں چھوٹتے۔ انسان کے اندر ایسے ایسے طلسمات ہوتے ہیں جو کھلتے ہیں تو آدمی کے خط وخال، رنگ روپ، چال ڈھال،

اطوار و گفتار، قول و کردار سب کچھ بدل کر رکھ دیتے ہیں۔ تنی ہوئی موچھیں رکھنے اور شجاعت و جوامردی کا رزم نامہ لکھنے اور عقاب کی طرح جھپٹنے کی باتیں کرنے والا دبّو اور بزدل نظر آنے لگتا ہے اور شراب و شباب پر شاعری کرنے والا سفید ریشوں والا پارسا و پاکباز دکھائی دینے لگتا ہے۔ نہایت خوددار اور کسی کا کسی طرح کا بھی احسان نہ لینے والا شخص دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلاتا اور کہیں کہیں پر کسی کی حق تلفی کرتا ہوا بھی سامنے آتا ہے۔ اونچے قد والا بونا بن جاتا ہے اور بوٹا قد قد آوار ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس صنف کے دائرے میں ایسا انسان کھڑا ہو وہ صنف تو دلچسپ، پر لطف، پر تجسس اور قابلِ توجہ تو ہوگی ہی۔'' 1ے

لہٰذا میں نے یہ طے کیا کہ قاضی عبدالستار کے افسانوی کائنات کی سیر سے قبل ان کے سوانحی دنیا میں داخل ہو کر ان کی ذات و صفات، ان کی نفسیات اور ذہنی و قلبی کیفیات پر نظر ڈالی جائے تاکہ قاضی صاحب کی تخلیقی نگارشات کو سمجھنے میں آسانی ہو سکے اور میں نے اپنے اس سفر کا آغاز ان کے ابتدائی ایام سے شروع کیا۔

پیدائش:

قاضی عبدالستار پر لکھی گئی سوانحی تحریروں سے پتا چلتا ہے کہ وہ 9ر فروری 1933 کو اودھ کے مشہور شہر سیتا پور کے ایک گاؤں مچھریٹھہ میں پیدا ہوئے، مگر قاضی صاحب نے اپنی تاریخ پیدائش کے متعلق راشد انور راشد کو انٹرویو دیتے وقت جو بیان دیا ہے، وہ تاریخ اس تاریخ سے میل نہیں کھاتی مثلاً وہ فرماتے ہیں:

''میں نے جب سید ہاشم علی صاحب، وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سے ملاقات کی تو انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ آپ کی ڈیٹ آف برتھ کیا ہے، میں نے کہا ۱۶ر جولائی ۱۹۳۰ء، تھوڑی دیر وہ خاموش بیٹھے رہے پھر فرمایا: پانچ سال کے روٹیشن میں تو آپ کا چانس آئے گا بھی تو برائے نام۔ بیگم صاحبہ جو میری فین بھی تھیں، چائے بناتے بناتے رُک گئیں اور فرمایا کیا یو جی سی کا یہ حکم ہے کہ پانچ سال کا ٹرم ہو۔ وائس چانسلر نے فرمایا: تم نے صحیح کہا، میں تین سال کا روٹیشن کروں گا تاکہ قاضی صاحب کو پورا ٹرم ملے اور محفل برخاست ہوگئی۔'' 2ے

1ے: فکشن سے الگ۔ پروفیسر غضنفر۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی۔ سنہ اشاعت: 2013۔ ص: 109

2ے: قاضی عبدالستار: اسرار و گفتار۔ راشد انور راشد۔ عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی۔ سنہ اشاعت: 2014۔ ص: 214

''بابا میاں میونسپل بورڈ کے چیئر مین بھی رہے۔ سارے اسکول ان کے انڈر میں تھے۔ پرائمری اسکول کے ہیڈ ماسٹر ایک پنڈت جی تھے۔ وہ بابا کے مکھن لگانے کے لیے ایک دن آئے اور مجھے گود میں لے کر اسکول چلے گئے۔ نام لکھ دیا، لیکن عمر کا خانہ کیا کریں، بھاگتے ہوئے آئے اور کہا کہ میں نے بھیا کا نام لکھ دیا ہے، عمر بتا دیجیے، کیا لکھوں؟ انھوں نے کہا جو جی چاہے لکھ لو کیا اس سے نوکری کرانی ہے۔ انھوں نے چار سال چار مہینے چار دن لکھ دیے۔ ہم تین سال کے بھی نہیں تھے، وہ عمر آج تک چلی آرہی ہے۔''[3]

ان دونوں بیانات سے جو بات واضح ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ کاغذوں پر ان کی پیدائش کی جو تاریخ درج ہے، وہ صحیح نہیں ہے مگر قاضی عبدالستار کی بتائی گئی سن ولادت کی اس تاریخ یعنی 16 جولائی 1930ء کو بھی حتمی تاریخ قرار نہیں دی جاسکتی کہ اس کی کوئی سند موجود نہیں ہے اور قاضی صاحب کا یہ جملہ کہ ''ہم تین سال کے بھی نہیں تھے'' چیخ چیخ کر کہہ رہا ہے کہ یہ تاریخ اندازے کی بنیاد پر طے کی گئی ہے۔ یہ عین ممکن ہے کہ ان کی پیدائش کی اصل تاریخ ان دونوں کے علاوہ کوئی تیسری ہو۔ یہاں ایک بات سمجھ میں نہیں آتی کہ زمین دار گھرانے میں پیدا ہونے کے باوجود بچے کی یومِ ولادت کا رکارڈ گھر کے کسی کاغذ یا رجسٹر میں نہیں رکھا گیا۔ عام گھروں میں تو یہ بات عام تھی کہ ان دنوں پیدائش اور موت کا رکارڈ نہیں رکھا جاتا تھا مگر جن گھرانوں میں شجرے تیار کیے جاتے تھے، وہاں تو اس بات کا خیال ضرور رکھا جاتا تھا، یا رکھا جانا چاہیے تھا۔ یہاں یہ بات زیادہ اہم نہیں ہے کہ رکارڈ کیوں نہیں رکھا گیا مگر یہ بات اہم ضرور ہے کہ اس بڑے رائٹر کی یوم پیدائش کی اصل تاریخ شبہ کے گھیرے میں ہے۔ ہم وثوق سے نہیں کہہ سکتے کہ تاریخ وہ صحیح ہے جو سرکاری کاغذوں کے رکارڈ میں موجود ہے یا وہ جسے مصنف بتاتا ہے یا ان دونوں کے علاوہ کوئی اور؟ قاضی صاحب کے مذکورہ بالا بیانات سے پیدائش کی تاریخ تو ضرور الجھ جاتی ہے مگر ایک حقیقت نہایت سلجھتی ہوئی شکل میں سامنے آتی ہے کہ قاضی عبدالستار زمین دار گھرانے میں پیدا ہوئے تھے اور ایسے ماحول میں پیدا ہونے اور پروان چڑھنے والے بچوں کے مزاج سے خوئے برتری کبھی نہیں جاتی۔ خواہ وہ اپنی تعلیم کے آغاز کی مدّت کا معاملہ ہو یا اپنے ہیڈ شپ کے اظہار کا مسئلہ ہو، یعنی یہ کہ بہت کم عمری میں تعلیم کی ابتدا ہوگئی اور ہیڈ شپ کو برقرار رکھنے کے لیے روٹیشن کی مدت میں تبدیلی کردی گئی۔

3: قاضی عبدالستار: اسرار و گفتار۔ راشد انور راشد۔ عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی۔ سنہ اشاعت: 2014۔ ص: 47-48

تعلیم وتربیت:

جیسا کہ مذکورہ بالا ایک بیان سے ظاہر ہے کہ قاضی عبدالستار کی تعلیم کا آغاز پرائمری اسکول کے ہیڈ ماسٹر کے مطابق اس وقت ہوا جب وہ چار سال چار ماہ چار دن کے تھے اور اگر قاضی عبدالستار کے بیان کو سامنے رکھا جائے تو ان کا تعلیمی سلسلہ اس وقت شروع ہو گیا جب وہ تین سال سے بھی کم عمر کے تھے۔ یعنی ان کی ابتدائی تعلیم گاؤں کے مکتب میں ہوئی۔ یہ وہ زمانہ ہے جب چار سال چار مہینے یا اس سے بھی کم عمر کے تھے۔ انھوں نے 1948 میں ہائی اسکول سیتاپور سے پاس کیا اور 1950 میں آر آر ڈی کالج سیتاپور سے انٹرمیڈیٹ کیا۔ ہائر تعلیم کے لیے وہ لکھنؤ آ گئے، یہاں سے 1953ء میں بی اے آنرز اور 1954ء میں ایم اے امتیاز کے ساتھ پاس کیا۔ اوّل پوزیشن کے لیے انھیں شنکر دیال شاد گولڈ میڈل بھی عطا کیا گیا۔

ملازمت:

1955ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں پی ایچ ڈی میں داخلہ لیا اور پروفیسر رشید احمد صدیقی کے زیر نگرانی اردو شاعری میں قنوطیت کے موضوع پر مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ پی ایچ ڈی کرنے کے بعد انھیں شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ہی لکچررشپ کی ملازمت مل گئی۔ 1956ء سے 1968ء تک وہ لکچرر کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ 1968ء میں وہ ریڈر ہوئے۔ ایک مدت تک وہ ریڈر رہے۔ 1981ء میں وہ پروفیسر کے عہدے پر فائز ہوئے اور اسی دوران انھوں نے صدر شعبۂ اردو کے فرائض بھی انجام دیے۔

خاندان:

جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ قاضی عبدالستار ایک زمین دار گھرانے میں پیدا ہوئے، ان کی زمینداری مسرکھ میں تھی۔ مسرکھ سیتاپور کا ایک مشہور قصبہ تھا۔ یہ ایک بڑا قصبہ تھا جس کی آبادی 38-1936 کے آس پاس تقریباً بیس ہزار تھی جس پر قاضی خاندان کے بزرگوں کی حکومت تھی۔ زمین داری کے سبب قاضی عبدالستار کے خاندان کا اثر و روخ دور دور تک تھا۔ وہ اپنے خاندان کے اکلوتے بیٹے تھے اس لیے ان پر پورے خاندان کا لاڈ پیار نچھاور ہوتا تھا۔ چونکہ ان پر خصوصی توجہ ہوتی تھی اس لیے وہ نازوں سے پالے گئے تھے۔ جب انھوں نے اپنی آنکھیں کھولیں تو جاگیردارانہ نظام اپنے شباب پر تھا۔ انھیں ہر طرح کی آرام و

آسائش کی سہولت میسر تھی۔ ان کے خاندان کی برتری ہر طرف قائم تھی۔

قاضی عبدالستار نے جس گھر میں آنکھیں کھولیں وہ ایک زمین دار گھرانہ تھا، وہ تعلقہ داروں کا گھرانہ تھا جہاں چاروں طرف رعب دبدبے کی فضا تھی، حکم بجالانے والے کارندے تھے، خدمت پر مامور مامائیں اور خادمائیں تھیں، ناز اٹھانے والے قدم قدم پر اطاعت گزار اور حکم بردار افراد تھے، فارغ البالی تھی، عیش و عشرت کا دور دورہ تھا۔ جاگیردارانہ نظام شباب پر تھا اور کیوں نہ ہو اس گھرانے کا بیس ہزار سے زیادہ آبادی والے قصبے پر حکومت جو تھی، اس قصبے کا نام مچھریٹہ تھا جو سیتاپور کی تحصیل مسرکھ میں واقع تھا۔ اس گھرانے کا کیا رُعب تھا اس قول سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے جو اس خاندان کے ایک فرد کے متعلق مشہور تھا:

''بڑے بھیا جہاں کھڑے ہوتے ہیں چار چار کوس کی زمین ہالت ہیں۔'' 4

(یعنی چار کوس تک کی زمین ہل جاتی ہے۔)

''بڑے بھیا بھل بھل موتت ہیں'' 5 (یعنی وہ آگ کا ہی پیشاب کرتے تھے)۔ مطلب یہ ہے کہ وہ بہت ہی غصہ ور اور جلالی زمین دار تھے۔

اس خاندان کے جاہ وجلال کا اندازہ اس واقعہ سے بھی لگایا جا سکتا ہے:

> ''جب زمین داری ختم ہوئی تو ان کے پھاٹک پر سرکاری ڈگڈگی بج رہی تھی۔ ان کے چچا دروازے پر لیٹے ہوئے تھے۔ سپاہی پہرے دے رہا تھا۔ انھوں نے تحصیل دار سے پوچھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے تو اس نے بتایا کہ زمین داری ختم ہونے کی ڈگڈگی بجائی جا رہی ہے۔ آج سے زمین داری کا حکم نہیں چلے گا۔ چچا اختر چیخے سپاہی! تحصیلدار سے کہہ دو کہ یہاں ڈگڈگی نہیں بجے گی۔ اب اگر یہاں ڈگڈگی بجی تو گولی مروا دوں گا۔ پنڈت تحصیل دار علاقے میں نیا نیا آیا تھا وہ مانا نہیں اور بھنگی سے کہہ دوبارہ ڈگی بجوا دی۔ چچا نے سپاہی سے کہا کہ Shoot him۔ سپاہی نے بندوق اٹھائی اور گولی مار دی۔ تحصیلدار ڈھیر ہو گیا۔'' 6

یہ تھا وہ گھرانہ، یہ تھا وہ ماحول جس کا فرد زمین داری ختم ہو جانے کے بعد بھی جھکا اور ٹوٹا نہیں۔ جو سب

4: قاضی عبدالستار: فکر، فن اور فنکار۔ ڈاکٹر احمد خاں۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔ سنہ اشاعت: 2005۔ ص: 17

5: قاضی عبدالستار: فکر، فن اور فنکار۔ ڈاکٹر احمد خاں۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔ سنہ اشاعت: 2005۔ ص: 17

6: قاضی عبدالستار: فکر، فن اور فنکار۔ ڈاکٹر احمد خاں۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔ سنہ اشاعت: 2005۔ ص: 19

چھن جانے کے بعد اکڑا رہا۔ اپنی آن پر قائم رہا اور اپنی جان کی پرواہ کیے بنا اپنی آن بان اور شان کے لیے گولی چلوادی۔

ایسے ماحول میں قاضی عبدالستار نے ہوش سنبھالا۔ ظاہر ہے ان پر اپنے ماحول کا اثر پڑنا ناگزیر تھا۔ جاہ وجلال، شاہانہ ٹھاٹ باٹ، جاگیردارانہ طور طریق کا وصف مزاج میں درآنا فطری تھا۔ قاضی عبدالستار نے اس ماحول کو صرف دیکھا ہی نہیں بلکہ اس کی برکتوں کو بھوگا بھی۔ ان کی ایک مثال ملاحظہ فرمائیے۔ قاضی صاحب راشد انور راشد سے گفتگو کرتے وقت ایک جگہ فرماتے ہیں:

> ''ہم بابا میاں کے ساتھ ایک ٹھاکر صاحب رٹھوار پور کے یہاں گئے۔ مکان قریب ہی تھا۔ ٹھاکر صاحب بیمار تھے۔ ہم بابا میاں کے ساتھ انگلی پکڑے ہوئے جب گنج سے گزرے تو دکان دار کھڑے ہو کر سلام کرنے لگے۔ ہم نے جواب دیا۔ بابا میاں نے فرمایا۔ جواب دینے کی کوئی ضرورت نہیں، ان کا فرض ہے تمھیں سلام کرنا۔'' 7

یہ تو صرف ایک منظر ہے، ایسے مناظر اور مظاہر تو اس طرح کے ماحول میں قدم قدم پر نگاہوں کے سامنے آتے ہیں اور اپنے رنگ ونور سے ایک خاص طرح کے مزاج کی تشکیل کرتے ہیں۔ مزاج کا یہ رنگ شخصیت میں اتنا رچ بس جاتا ہے اور اس قدر گاڑھا ہو جاتا ہے کہ نامساعد حالات میں بھی اپنا رنگ دکھانے سے باز نہیں آتا۔ جوتا حیات ساتھ چلتا رہتا ہے اور قاضی عبدالستار کی شخصیت ایسے ہی رنگوں سے پروان چڑھی جن کا ذکر تفصیل سے کیا جا رہا ہے۔

شخصیت کے امتیازات:

راشد انور راشد خواہ کتنا ہی زور دے کر یہ بات کیوں نہ کہیں:

> ''۔۔۔۔۔ جب مستقل ملاقاتوں میں انھیں قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تو ایک نئے قاضی عبدالستار سے ملاقات ہوئی۔ میں نے انھیں نہ صرف منکسر المزاج پایا بلکہ اس بات کا بھی اندازہ ہوا کہ وہ بے حد نرم دل ہیں اور محبت کی دولت فراخ

7: قاضی عبدالستار: اسرار و گفتار۔ راشد انور راشد۔ عرشیہ پبلی کیشنز، نئی دہلی۔ سنہ اشاعت: 2014۔ ص: 48

دلی سے لٹانے میں انھیں قلبی سکون نصیب ہوتا ہے۔'' 8

مگر قاضی عبدالستار کا وہ مزاج جو عام طور پر لوگوں کے مشاہدے میں آتا رہا ہے اور جس کی خمیر ان کے خاندانی ماحول کی مٹی سے تیار ہوا ہے اور جس کا ذکر خود راشد انور راشد نے بھی کیا ہے۔ مثلاً:

''میں ابتداء میں انھیں ایک سخت مزاج اور انا پرست ادیب سمجھتا تھا۔ یہ خیال بھی ذہن میں گھر کر گیا تھا کہ انسانی قدروں کو اہمیت نہیں دیتے اور ہر لمحہ خود پسندی کے زعم میں سرشار رہتے ہیں۔ میرے ذہن میں یہ تمام باتیں اس لئے بھی نقش ہوگئی تھیں کہ اکثر و بیشتر لوگ ان سے متعلق اسی طرح کی باتوں کا ذکر کیا کرتے تھے۔ مجھے ذاتی طور پر ان کی سخت مزاجی کا کوئی تجربہ نہیں تھا لیکن پتہ نہیں کیوں ان سے متعلق لوگوں کی عمومی باتیں مجھے حقیقت پر مبنی معلوم ہوتی تھیں۔ میرے محدود اور ناقص مشاہدات بھی اس کا سبب ہو سکتے ہیں۔ میں نے جب کبھی بھی انھیں کسی فنکشن میں دیکھا وہ تمام لوگوں سے مختلف نظر آئے کسی سے کوئی بات چیت نہیں، بلکہ خاموشی اور اپنی دنیا میں مگن، ہر لمحہ چہرے پر تفکر اور کسی قدر ناگواری کے تاثرات جیسے ہر شخص سے ناراض ہوں اور تمام لوگوں کی نااہلی پر حقارت کی اچٹتی ہوئی نگاہ ڈال رہے ہوں۔ میں نے انھیں کبھی بھی ہنستے یا مسکراتے ہوئے نہیں دیکھا۔ ان کی قہر آلود نگاہوں کی تاب اچھے اچھے نہیں لا سکتے تھے۔ گرج دار آواز کے ساتھ لہجہ بے حد ترش، مشاہدات میں شخصیت کے یہ عناصر کارفرما ہوں اور مختلف لوگوں کی بے تکلف آرا سے بھی ان باتوں کی تصدیق نہیں ہوئی ہو تو آخر کس بنا پر قاضی عبدالستار کی کوئی دوسری امیج ذہن میں آپاتی''۔ 9

بدل نہیں جاتا، راشد انور راشد کی ملاقاتوں میں دکھائی دینے والی منکسر المزاجی قاضی عبدالستار کی سخت مزاجی اور انا پرستانہ رویے اور اس کی جارحیت کو جھٹلا نہیں پاتی اس لئے کہ ان کے مزاج کی یہ تلخ حقیقت ہے اور اس تلخ حقیقت کے بہت سارے مظاہر ہیں، جو ان کی نجی زندگی میں بھی نظر آتے ہیں۔ قاضی صاحب پر کڑی نظر رکھنے والے (جن میں بعض معروضی نقطۂ نظر والے لوگ بھی شامل ہیں) کبھی دبی اور کبھی کھلی زبان سے فرماتے ہیں کہ ان کی اس سخت مزاجی اور انا پرستی کی ضرب ان کی گھریلوں زندی پر ایسی پڑی کہ ان کی

8: قاضی عبدالستار: اسرار و گفتار۔ راشد انور راشد۔ عرشیہ پبلی کیشنز، نئی دہلی۔ سنہ اشاعت: 2014۔ ص: 21

9: قاضی عبدالستار: اسرار و گفتار۔ راشد انور راشد۔ عرشیہ پبلی کیشنز، نئی دہلی۔ سنہ اشاعت: 2014۔ ص: 22

دونوں بیویاں جن میں سے ایک تو ان کی محبوبہ بھی رہیں، ان سے جدا ہوگئیں اور کچھ لوگ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ ان کی پہلی بیوی کے بھائی چودھری محمد نعیم جوسی۔ ایم۔ نعیم کے نام سے مشہور ہیں نے جو قاضی عبدالستار کی جمالیات اور ہندوستانی جمالیات پر سخت تبصرہ کیا اور اسے کے۔سی۔ پانڈے کی کتاب کا چربہ ثابت کیا وہ قاضی صاحب کی اسی سخت مزاجی کے مظاہر اور ان کے ردّعمل کے سبب کیا ورنہ کوئی اپنے بہنوئی کی کتاب پر بھلا اتنا سخت رویہ کیسے اپنا سکتا ہے؟ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ راشد انور راشد نے جس منکسر المزاج کا ذکر کیا ہے، وہ سرے سے غلط ہے یا قاضی عبدالستار کے اندر وہ وصف موجود نہیں ہے، حقیقت یہ ہے کہ قاضی عبدالستار کے اندر یہ وصف بھی موجود ہے اور راشد انور راشد کے علاوہ ان کا یہ وصف دوسروں کو بھی محسوس ہوا۔ مثلاً غضنفر اپنے خاکے ''فکشن کا فسوں ساز میں لکھتے ہیں:

''ایک روز استاد (قاضی عبدالستار) نے خاص طور پر مجھے اپنے گھر بلایا اور لکھنے پڑھنے کا ایک ضروری کام مجھے سونپ دیا۔ مشکل سے ایک سوا گھنٹہ گزرا ہوگا کہ بیڈروم سے نکل کر ڈرائنگ روم میں آگئے اور میز پر ایک بڑی سی ٹرے رکھتے ہوئے مجھے مخاطب کیا۔ بس اب اور نہیں لیجیے یہ پھل کھائیے اور چائے پیجیے۔''

''سر میں تھکا نہیں ہوں'' میں بولا تو بولے:

''مجھے معلوم ہے کہ آپ جوانی کے جوش سے لبریز ہیں اور استاد کے کام سے لگے ہوئے ہیں مگر میں دیر تک کسی کو اس حالت میں دیکھ نہیں سکتا۔ اپنے طالب علموں کو Relaxed Mood میں دیکھنا چاہتا ہوں اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب آپ اپنا قلم میز پر رکھ دیں اور چائے کی چسکی لیتے ہوئے گپ کریں۔ یہ گپ بڑے کام کی چیز ہے۔ ادب و آرٹ کی طرح کبھی کبھی اس سے بھی قلب و نظر کو سرور اور دماغ کو غرور حاصل ہوتا ہے اور گئی ہوئی طاقت بھی واپس آجاتی ہے۔ جس کا آنا آگے جانے کے لئے بے حد ضروری ہوتا ہے۔ کام تو ہوتا رہے گا۔ انجوائے کیجیے۔ چونکیے نہیں، کام کے لیے تو وقت کافی پڑا ہے مگر انجوائے مینٹ کے لئے وقت کم ہے اور شاید مواقع اس سے بھی کم۔

میں انھیں حیرت سے دیکھنے لگا میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میرے سامنے والا شخص مچھر پیٹے کا کوئی رئیس زادہ ہے جس کی دیوڑھی کی دیواروں پر تلواریں اور بندوقیں ٹنگی رہتی ہیں اور بات بات میں میان سے تیغیں کھنچ جاتی ہیں، انگلی بندوق کی لبلبی پر پہنچ جاتی ہے۔

اور جس کے رعب سے رعیت ہر وقت تھر تھر کانپتی رہتی ہے جسے اس بات سے سرو کار نہیں ہوتا کہ چلچلاتی دھوپ میں کام کرنے والے جسم کی چربی پگھل رہی ہے یا کڑاکے کی سردی میں کوئی روح ٹھٹھر رہی ہے یا وہ آدمی بودھ یا جین مٹھ کا کوئی سنت فقیر ہے، جسے انسان تو انسان جانوروں تک کے دکھ سکھ کی فکر ہے اور کیڑے مکوڑے کی تکلیف بھی گوارا نہیں۔'' 10۔

یعنی ثابت یہ ہوا کہ قاضی عبد الستار کے مزاج میں تلخی کے ساتھ ساتھ نرمی بھی موجود تھی اور یہ دونوں رنگ راشد انور راشد اور غضنفر کے علاوہ دوسروں کو بھی دکھائی دیتے ہیں۔ مثلاً صغیر افراہیم صاحب لکھتے ہیں:

''قاضی صاحب کی شخصیت کا واضح پہلو بیباکی، زندہ دلی، استقلال اور جرأت ہے۔ ان کے مزاج میں غیرت اور خودداری کا رنگ بہت گہرا تھا۔ موصوف کے تخلیقی کرداروں میں جتنا کرّ وفر اور گھن گرج ہے، نجی زندگی میں اتنی ہی نرمی اور نزاکت تھی۔'' 11۔

اور ڈاکٹر احمد خان اپنی کتاب ''قاضی عبد الستار'' فکر وفن اور فن کار میں فرماتے ہیں:

''قاضی عبد الستار اپنے دوست اور دشمن کا اشتہا علی الاعلان کرتے ہیں۔ وہ بیمار رشتوں پر یقین نہیں رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی ظاہری صورت ایک اکھڑ اور ضدّی کی سی معلوم ہوتی ہے لیکن ان کی شخصیت کے نہاں خانے میں جھانکیے تو آپ کو ایک مخلص اور زندہ دل انسان نظر آئے گا۔ ان کے قریب رہنے والوں نے اس بات کو اچھی طرح محسوس کیا ہے۔'' 12۔

10۔ روئے خوش رنگ: فکشن کا فسوں ساز۔ پروفیسر غضنفر۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی۔ سنہ اشاعت: 2014۔ ص: 164-165

11۔ افسانوی ادب کی نئی قرأت۔ پروفیسر صغیر افراہیم۔ سنہ اشاعت: 2011۔ ص: 71

12۔ قاضی عبد الستار: فکر، فن اور فنکار۔ ڈاکٹر احمد خاں۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔ سنہ اشاعت: 2005۔ ص: 21-22

یہ نرم مزاجی اس لئے ہے اور اس کا مظاہرہ اس لئے ہوتا ہے کہ قاضی عبدالستار ایک فن کار بھی ہیں۔ یہ سچ ہے کہ ان کی پیدائش ایک تعلقہ دار کے گھر میں ہوئی، ان کی پرورش و پرداخت جاگیردارانہ ماحول میں کئی گئی اور ان کا مزاج زمیں دارانہ مٹی سے تشکیل پایا مگر قدرت نے ان کے سینے میں ایک فن کار کا دل رکھ دیا تھا جس نے اکثر ان کے مزاج سے بغاوت کی اور انھیں اس راستے پر بھی لے گیا جدھر اس طرح کے مزاج والے خود پرست، انا پسند، اور سخت گیر انسان جانا پسند نہیں کرتے۔ پروفیسر غضنفر نے قاضی عبدالستار کے اس پہلو کی طرف بڑے ہی خوبصورت انداز میں اشارہ کیا ہے:

> ''استاد کا جس شہر سے جوانی سے لے کر پیری تک کا واسطہ رہا، میر انیس اگر اس سے گزرتے یا ادھر توجہ کرتے تو لکھنؤ کی طرح اس کے اعداد بھی انھیں کوفے سے ملتے ہوئے معلوم ہوتے مگر استاد پر اس شہر کا رنگ خاص نہیں چڑھا۔ اس لئے کہ قدرت نے ان کے سینے میں ایک فنکار کا دل رکھ دیا تھا۔ ایسا دل جو منافقت کی زد میں تو آ سکتا ہے مگر خود کبھی منافق نہیں ہوسکتا اور نہ ہی کسی کو منافقت کی ضرب لگا سکتا ہے۔ فن کار کا دل اس خدا رسیدہ بزرگ کے مقدس روضے کی سر زمین کی مانند ہے جہاں منافقت کے سیاہ بچھو ڈنک نہیں مارتے۔'' 13

پروفیسر ابن کنول نے قاضی عبدالستار کے خاکے میں شخصیت کے تمام پہلوؤں پر نظر ڈالی ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''قاضی صاحب نے اپنے آؤ بھاؤ، رکھ رکھاؤ کے سبب پوری یونیورسٹی اور یونیورسٹی سے باہر بہت بدمزاج، بددماغ اور خود پرست سمجھے جاتے تھے، جو کچھ کہتے پیٹھ پیچھے کہتے تھے۔ ہم بھی قاضی صاحب کے بارے میں ایسی رائے رکھتے تھے جب تک ملے نہیں تھے لیکن ملنے کے بعد ساری غلط فہمی دور ہوگئی وہ شریفے کی طرح تھے، بظاہر کھردرے پن لیکن اندر سے نرمی اور شیریں جس کو عزیز رکھتے تھے اس کی تکلیف میں افسردہ ہو جاتے تھے۔'' 14

پروفیسر علی احمد فاطمی اپنے مضمون ''پالا ہوا ہے وہ بھی نسیم بہار کا'' میں رقم طراز ہیں:

> ''آپ قاضی صاحب سے اگر ذرا بھی قریب ہیں تو آپ کو صاف محسوس ہوگا کہ صبح سے لے کر شام تک چائے سے لے کر جام تک، نام سے لے کر کام تک یہاں تک کہ آل احمد

13: روئے خوش رنگ: فکشن کا فسوں ساز۔ پروفیسر غضنفر۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی۔ سنہ اشاعت: 2014۔ ص: 164-165

14: کچھ شگفتگی کچھ سنجیدگی (خاکے)۔ ابن کنول۔ کتابی دنیا، نئی دہلی۔ سنہ اشاعت: 2020۔ ص: 30

سرور سے لے کر خورشید الاسلام تک غرضیکہ ہر عمل ، ہر گفتگو میں ایک مخصوص ترنگ ہوتی ہے۔طنطنہ ہوتا ہے گرج چمک بھی اور پھر نرمی اور لچک بھی۔لیکن یہ نرمی اور یہ بیش بہا موتی ہر اک کے حصے میں کم آتے ہیں۔ایک بار اعتماد کا گوہر ہاتھ لگ جائے تو سب کچھ لوٹ لیجیے۔''15؎

ان کے اس نرم مزاجی کو مزید ملائم بنانے میں ترقی پسند تحریک سے ان کے جڑاؤ نے اہم رول ادا کیا۔ اس تحریک سے ادب کو اور کچھ فائدہ پہنچا ہو یا نہ ہو مگر یہ فائدہ ضرور پہنچا کہ اس نے انسانوں کی قلب ماہیت میں ایک بڑا ہی اہم کردار ادا کیا۔ بڑے بڑوں کی کایا پلٹ دی۔آسمانوں پر رہنے والوں کو زمین پر بٹھا دیا۔وہ لوگ جو دبے کچلے انسانوں کے بارے میں کبھی سوچتے بھی نہیں تھے،ان کے حالات بدلنے کے لئے انھیں عملی اقدامات کرنے پر مجبور کر دیا اور قاضی عبدالستار جیسے انا پرست اور رئیسی انداز رکھنے والے ادیب کو جن وادی لیکھک سنگھ کا صدر بنا دیا۔

قاضی عبدالستار کو دنیا فکشن نگار کی حیثیت سے جانتی ہے مگر حقیقت ہے کہ وہ ایک شاعر بھی تھے اور اپنے تخلیقی سفر کا آغاز انھوں نے شاعری سے ہی کیا۔ان کے استاد نے ان کا تخلص صہبا مچھریٹوی رکھا تھا،مگر بہت جلد انھوں نے شاعری ترک کر فنِ افسانہ نگاری سے اپنا ناطہ جوڑ لیا۔نمونے کے طور پر ان کی ایک نظم پیش کی جا رہی ہے۔نظم کا عنوان ہے''اپنے استاد معظم و محتشم راجہ بابو گر چرن لال شیدا، نبی نگر کے حضور میں''۔

گر چرن لالا تھا نام اس کا تخلص شیدا

سانولہ رنگ،چھریرا سا بدن

اور قدو قامت ایسی

جس طرح صحن چمن میں شمشاد

اس کی پیشانی پہ شفقت کی شرافت کی چمک

کالے ابرو، وہ کھڑی ناک وہ ہلکے رخسار

اس کے ہونٹوں پہ سجی رہتی تھی ہلکی سی تبسم کی لکیر

15؎: نذر قاضی عبدالستار۔پالا ہوا ہے وہ بھی نسیم بہار۔مرتب پروفیسر غیاث الدین۔ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔سنہ اشاعت:2006۔ص:81

جامہ زیب ہم نے بہت دیکھے مگر اس کی وہ جامہ زیبی

شیروانی میں وہ یوں سجتا تھا کہ دیکھا کیجیے

چوڑی دار اس پہ یوں پھبتا تھا کہ بس کیا کہیے

بولتا تھا کہ گہر رول رہا ہو جیسے

جب وہ ہنستا تھا تو ہنس پڑتے تھے کیسر تختے

جب وہ روتا تھا تو رو دیتے تھے ساون بھادوں

اس کی خدمت سے مشرف بھی رہی حضرت مینا اکثر

مگر آداب کی پابند کہ دربار میں سلطاں کے کنیز

اس کی بیوی تھی نہ بچّے نہ کوئی خاص عزیز

عمر بھر کی تھی کمائی وہ فقط چند ہی دوست

چند شاگرد جو پروانوں کے مانند نثار

اس قدر غور سے سنتا تھا وہ اشعار مرے

آسمانوں سے صدا دیتا ہو جیسے جبریل

میرے اشعار وہ مٹی کے کھلونے ٹوٹے

کیمیا رشکِ توجہ سے جو ہو جاتے تھے سونا چاندی

ایک دن اس نے اداس ہم کو جو دیکھا تو کہا

اتنی سی عمر میں ماتھے پہ لکیروں کا ہجوم؟

کون سی آگ ہے سینے میں کہ چہروں پہ دھواں اڑتا ہے

تیری آنکھوں میں تو جلتے ہیں، جدائی کے چراغ

میرے بیٹے، میرے صہبا مرے شاگردِ عزیز

آج میں تجھ سے جو کہتا ہوں اسے غور سے سن

باپ تیرا ہے رئیس ابنِ رئیس

نہ شرابی، نہ جواری، نہ طوائف کا مرید

اس کو محبوب چکوروں کا کبھی اور کبھی شیروں کا شکار

کبھی منڈی، کبھی میسور، کبھی سندر بن

مختلف سمتوں میں پڑتے ہیں پڑاؤ اس کے

اور سیّاح وہ ایسا کہ پھرا کرتا ہے ملکوں ملکوں

کبھی آتا نہیں بہتے ہوئے دریا کو قرار

کس نے پہنائی صبا کو زنجیر

کون کر سکتا ہے خوشبو کو اسیر

میرے بیٹے مرے شاگردِ عزیز

وہ اگر بھول گیا تجھ کو بھلا دے تو بھی

آج بتلاتا ہوں میں تجھ کو ترے غم کی حقیقت کیا ہے

جیسے گر جائے ترے کوٹ کے کالر کا گلاب

کہیں کھو جائے تری پاؤں کی جوتی کا ستارا جیسے

کچھ نہیں اس کے سوا، کچھ بھی نہیں، کچھ بھی نہیں

تجھ کو اللہ نے بخشا ہے یہ سونے کا قلم

تجھ کو شہزادۂ اقلیمِ قلم ہونا ہے

کل تجھے بادشہِ ملکِ ادب ہونا ہے

میرے شاگرد مری جان عزیز

وہ تجھے بھول چکا اس کو بھلا دے تو بھی

اس کے ہر نقشِ محبت کو مٹا دے تو بھی

آج ہر رسم کو اُلفت کی اٹھا دے تو بھی

وہ تجھے بھول چکا اس کو بھلا دے تو بھی

مذکورہ بالا جائزے اور درج بالا سوانحی کوائف کی روشنی میں پروفیسر قاضی عبدالستار کی شخصیت کا جو خاکہ ابھرتا ہے اس میں حسب ذیل نقوش نمایاں ہیں:

انانیت، سخت مزاجی، زود حسی، خودداری اور بے باکی۔

انانیت:

انانیت قاضی عبدالستار کی شخصیت کا ایک اہم جزو ہے۔ ان کی اس خصوصیت کا اظہار ان کی تحریر، تقریر، گفتگو، معاملات، برتاؤ ہر جگہ ہوا ہے، قاضی صاحب اسے ایک ادیب کی شخصیت کا لازمی جزو سمجھتے تھے۔ اسی لیے انھوں نے اپنے ایک انٹرویو میں انانیت پر تفصیلی گفتگو کی ہے اور اس خصوصیت کی جی کھول کر تعریف بھی کی ہے، فرماتے ہیں:

> ''بعض کم پڑھے لکھے لوگ انانیت کے صحیح معنی نہیں جانتے اور اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ اردو ادب میں سب سے بڑے انانیتی ادیب تو ابوالکلام آزاد ہوئے ہیں۔ جامع مسجد پر جو تقریر انھوں نے کی وہ انانیتی ادب کی بہترین مثال ہے۔ ہر تخلیقی فن کار میں انا ضرور ہوتی ہے۔ اس کا سبب ہے جو کچھ لکھا جا رہا ہے اگر وہ اس سے مطمئن ہے تو وہ کیوں لکھے گا؟ کیوں پڑھے گا؟ وہ قلم اس وقت اٹھائے گا جب وہ یہ طے کرے گا کہ یہ جو کچھ لکھا جا رہا ہے، کمتر ہے۔ میں اس سے بہتر لکھ سکتا ہوں اور لکھوں گا۔ انانیت صرف ادیبوں میں نہیں ہوتی بلکہ کم و بیش ہر انسان میں ہوتی ہے۔ نہ صرف یہ انسانوں میں بلکہ جانوروں میں بھی ہوتی ہے۔ شیر، ہاتھی اور طاؤس کی انانیت بہت مشہور ہے۔ شیر اپنے حدود میں کسی دوسرے کو برداشت نہیں کرتا۔ ہاتھی جب اپنی مادہ کے قریب ہوتا ہے تو کوئی انسان پہنچ جائے تو اسے زندہ نہیں

چھوڑتا، طاؤس سب سے اونچے درخت کی سب سے اونچی شاخ پر بسیرا کرتا ہے اور جب چنگھاڑتا ہے تو پورا جنگل لرز اٹھتا ہے۔ جناب راشد صاحب! آپ نے پہلی غزل اس وقت کہی ہوگی جب آپ نے اپنے ہم عمروں کی سنی ہوئی غزلوں سے بہتر کہنے کا حوصلہ محسوس کیا ہوگا۔ یہ سب کیا ''میں'' غزل کہوں گا''، میں کا کثیر استعمال غلط ہے لیکن میں کا استعمال صحیح ہے۔ میدان جنگ کا رجز کیا ہوتا ہے، انانیت کی بہترین مثال ہوتا ہے۔ خالد سیف اللہ نے میدان جنگ میں فرمایا موت میری تلوار کا لقب ہے۔ فتح میرے گھوڑے کی جھپٹ کا خطاب ہے، یہ میدان جنگ کا رجز بھی ہے اور انانیتی ادب کی مثال بھی۔ انکساری اور خاکساری اچھی چیز ہے لیکن موقعے اور محل کے لحاظ سے اس کا استعمال کرنا چاہیے۔ میدانِ جنگ میں فوجیں کھڑی ہوتی ہیں۔ ایک شخص رجز پڑھتا ہوا نکلتا ہے، مخالف فوج سے بھی دوسرا شخص نکلتا ہے، دونوں اگر خاکساری اور انکساری کا اظہار کرنے لگیں کہ حضور پہلے آپ، تو اس کا قوی امکان ہے کہ دونوں کے سپہ سالار دونوں کی گردنیں اڑادیں، تو جناب راشد صاحب انانیت ایک بہت اہم تخلیقی اور مقدس جذبہ ہے جسے تخلیقِ ادب میں کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔'' 16؎

انانیت کے متعلق بلا شبہ یہ ایک خوبصورت بیان ہے اور اس بیان کو اس انداز سے پیش کیا گیا ہے کہ پڑھتے وقت کہانی سننے کا لطف حاصل ہوتا ہے مگر اس بیان کے اندرون میں اتر کر دیکھیے تو قاضی عبدالستار کا یہ جواز محسوس ہوگا جسے انھوں نے اپنی انانیت کے دفاع میں پیش کیا ہے۔ ٹھیک ہے انانیت اچھی چیز ہے اور ادب کے لیے ضروری ہے مگر خود قاضی صاحب اور راشد انور راشد کو بھی احساس ہے کہ اگر یہ حد سے تجاوز کر جاتی ہے تو ہنر کے بجائے عیب بن جاتی ہے۔ راشد انور راشد کو بھی قاضی صاحب کی بے جا انانیت کا شدید احساس ہے جبھی تو وہ سوال کرنے سے قبل لمبی چوڑی تمہید باندھنے پر مجبور ہوتے ہیں اور انھیں یہ کہنا پڑا ہے:

''......اگر ایک ادیب جانتا ہے کہ دنیا اس کی اہمیت تسلیم کرے تو سب سے پہلے اسے خود اپنی اہمیت سے واقف ہونا پڑے گا۔ اگر وہ انکساری میں اپنے آپ کو

16؎: قاضی عبدالستار: اسرار و گفتار۔ راشد انور راشد۔ عرشیہ پبلی کیشنز، نئی دہلی۔ سنہ اشاعت: 2014۔ ص: 282-283

سب سے کمتر ظاہر کر رہا ہے تو دنیا کیسے اس کی اہمیت کا اعتراف کرے گی۔ لہٰذا
انانیت کا ہونا ناگزیر ہے۔ ہاں وہی انانیت جب حد سے تجاوز کر جاتی ہے تو خود
پسندی میں تبدیل ہو جاتی ہے، تکبر اور گھمنڈ آ جاتا ہے جو کسی طرح مناسب
نہیں۔ انا اور انانیت کا جذبہ چوں کہ آپ کے مزاج میں بھی لازمی جزو کی
حیثیت سے شامل ہے۔ اس لیے ذرا تفصیل سے بتانے کی زحمت گوارا کریں کہ
انا اور انانیت کو آپ کس زاویے سے دیکھتے ہیں؟'' 17؎

اگر ایک بڑی آبادی جس میں دانشور اور معروضی نقطۂ نظر رکھنے والے ادیب و اسکالرز بھی ہیں، کو قاضی عبدالستار کے مزاج میں انانیت حد سے بڑھی ہوئی محسوس ہوتی ہے تو اس بات پر یقین کرنا پڑے گا کہ قاضی صاحب کی انانیت اپنے اندر منفی اثرات رکھتی تھی اور اس طرح کی انانیت کا سبب ان کا وہ مزاج تھا جس کی تشکیل جاگیردارانہ معاشرے کے عناصر سے ہوئی تھی اور جس کی تربیت میں اس ماحول نے اہم کردار نبھایا تھا جس میں اپنی ناک اوپر رکھنے کے لیے دوسرے کی ناک کاٹ لی جاتی تھی یا اپنے سامنے والے کے سینے میں گولی اتار دی جاتی تھی۔

قاضی عبدالستار کی حد سے بڑھی ہوئی اسی انانیت نے جہاں انھیں محفل میں ممتاز و منفرد کیا وہیں انھیں محفل سے الگ بھی کر دیا۔ اس سے ان کا امیج ایک مغرور انسان کا امیج بن گیا۔ ایسا انسان جو رات دن اپنے علم و ہنر اور خاندانی برتری کے زعم میں رہتا ہے، جو کسی کو خاطر میں نہیں لاتا، ایسے آدمی کے دوست کم اور دشمن زیادہ ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ اس کی انانیت ہر رشتے میں حائل ہو جاتی ہے اور اس کے حائل ہوتے ہی مضبوط سے مضبوط رشتے کی دیوار بھی خواہ وہ دوستی کی ہو یا محبت کی، منہدم ہونے لگتی ہے۔ یونیورسٹی اور شعبے میں احباب کی کمی، پہلی بیوی کی علاحدگی اور دوسری بیوی کی جان لیوا بیماری۔ بچوں کی ناکامی اور کچھ کی بے راہ روی کی وجہ ان کی یہی حد سے تجاوز کی ہوئی انانیت ہے۔ زمانے سے خود کو الگ رکھنے اور دنیا سے مختلف نظر آنے کے چکر میں اکثر وہ محفلوں اور نشستوں میں ایسی باتیں کہہ جاتے تھے اور ایسے جملے اچھال دیتے تھے جو نوکِ سناں کی طرح لوگوں کے سینے میں چبھ جاتے تھے۔ ظاہر ہے ان کے اس عمل کا ردّعمل ہونا لازمی ہے۔ نتیجے میں خوش گوار اور خوبصورت رشتے بھی زخمی ہو جاتے تھے۔ خلاصۂ کلام کے طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان

17؎: قاضی عبدالستار: اسرار و گفتار۔ راشد انور راشد۔ عرشیہ پبلی کیشنز، نئی دہلی۔ سنہ اشاعت: 2014۔ ص: 282-283

کی انانیت سے جہاں ان کی تخلیق کو فائدہ پہنچا وہیں ان کی شخصیت کو نقصان بھی پہنچا اور ان کے بہت سارے دکھوں کا سبب یہی ان کی انانیت ثابت ہوئی۔ ابوبکر عباد نے بھی قاضی عبدالستار کی شخصیت پر کچھ اس طرح کا بیان دیا ہے:

''قاضی صاحب؟؟؟ پسند اور کافی حد تک خود فریفتگی کا شکار تھے۔ ان میں انا اور احساس برتری ضرورت سے کچھ زیادہ ہی تھا۔ مزاج میں ایک نوع کی شدت تھی جس کا اظہار وہ پسند و ناپسند دونوں صورتوں میں یکساں طور پر کرتے تھے۔ وہ اپنی ذات کے علاوہ اپنے علم، اپنی تحریر وتقریر، اپنے اسلوب، اپنی طرز اور اپنے فکر وخیالات سے جنون کی حد تک محبت کرتے تھے اور محبت کے اس حرم کی کھڑکی جو کہیں کھلتی تھی تو اس کے منظر نامے کی حد شاگردوں، محبوب شناساؤں اور ثنا خوانوں سے شاید و باید ہی آگے بڑھ پاتی تھی۔ قاضی صاحب نے اپنی نظروں میں اپنا اس قدر بلند اور پرشکوہ بنایا ہوا تھا کہ انھیں اپنے بیشتر ہم عصر اور رفقاء بونے اور بڑی حد تک بے بضاعت دکھتے تھے۔ مجلسوں، محفلوں اور سیمیناروں میں تحیر و تجسس پیدا کرنے والی باتیں، متعینہ موضوع کی مخالفت میں ہونکالنے والا بیان یا کسی نئی جہت کو آشکار کر کے اپنی انفرادیت منوانے اور سامعین کو اپنی گل افشانی گفتار کے سحر میں گرفتار کرنے کے فن سے خوب واقف تھے۔ وہ دوستوں پر جان چھڑکنے کے باوجود بھی کسی کمی کے احساس میں مبتلا رہتے اور دشمنوں سے براہ راست یا بالواسطہ معمولی سا بھی بدلہ لینے کے بعد یک گونہ طمانیت محسوس کرتے۔'' 18ؔ

سخت مزاجی:

سخت مزاجی قاضی عبدالستار کے جاگیردارانہ معاشرے کی دین ہے، راشد انور راشد اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

''میں ابتدا میں انھیں ایک سخت مزاج اور انا پرست ادیب سمجھتا تھا۔ یہ خیال بھی ذہن میں گھر کر گیا تھا کہ وہ انسانی قدروں کو اہمیت نہیں دیتے اور ہر لمحہ خود پسندی کے زعم میں سرشار رہتے ہیں۔ میرے ذہن میں یہ تمام باتیں اس لیے بھی نقش ہوگئی تھیں کہ اکثر و بیشتر لوگ ان کے متعلق اسی طرح کی باتوں کا ذکر کیا کرتے تھے۔ مجھے ذاتی طور پر ان کی

18ؔ: ایوان اردو: قاضی عبدالستار: شخص، فن اور اسرار۔ ڈاکٹر ابوبکر عباد۔ نئی دہلی۔ اکتوبر 2019۔ ص: 22-23

سخت مزاجی کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔'' 19؎

راشدانور راشد کو قاضی عبدالستار کی سخت مزاجی کا ذاتی طور پر کوئی تجربہ بھلے ہی نہ ہو مگر ان کے اسی بیان سے ظاہر ہے کہ زیادہ تر لوگوں کے نزدیک وہ سخت مزاج محسوس ہوئے تھے اور لوگوں نے اس کا اظہار راشد انور راشد سے بھی کیا۔ کوئی کسی کے متعلق یوں ہی کوئی رائے نہیں بنا لیتا، ضرور اس کے پیچھے کچھ نہ کچھ ہوتا ہے اور جب بہت سارے لوگوں کی رائے ایک جیسی ہو تو اس سچائی کے سچ ہونے میں کسی شبہے کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ سچ یہی ہے قاضی صاحب کے رویّوں میں ان کی سخت مزاجی جھلکتی تھی بلکہ بعض لوگوں کے خیال میں یہ سختی کبھی کبھی جارحانہ صورت بھی اختیار کر لیتی تھی۔ اس کے اظہار میں وہ کسی قسم کی رورعایت نہیں کرتے تھے۔ سامنے والا کوئی بڑا ہو یا چھوٹا، وہ سخت سست سنانے میں کسی کے ساتھ بھی کسی قسم کی کوئی نرمی نہیں برتتے تھے۔ اپنی سخت مزاجی کا اظہار خود بھی قاضی صاحب نے اپنے انٹرویو میں کئی موقعوں پر کیا ہے، خصوصاً آل احمد سرور کا جہاں جہاں ذکر کیا ہے اپنی سخت مزاجی کا ثبوت دیا ہے، ان کی یہ سختی ان کے اپنوں جن میں ان کے بال بچے بھی شامل ہیں، کے ساتھ بھی روا رہی ہے اور اپنے شعبہ کے دوسرے رفقاء کے ساتھ بھی خصوصاً خلیل الرحمٰن اعظمی اور شہر یار کا ذکر جس انداز سے انھوں نے کیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ان لوگوں کے ساتھ کتنے سخت گیر رویہ روا رکھتے جو ان کو پسند نہیں تھے یا جن سے وہ کسی بات پر خفا رہتے تھے۔ قاضی صاحب کے اس بیباک رویے کے بارے میں کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ قاضی صاحب ہر کس و ناکس کو منھ نہیں لگاتے اور خاص طور سے بدتمیز اور بدتہذیب لوگوں سے بات کرنا پسند نہیں کرتے۔ جنھیں وہ پسند کرتے انھیں پسند کرتے ہیں اور ہر محفل میں ان کا نہایت احترام سے ذکر کرتے ہیں۔

مظفر حسین سیدان کے اس انداز سختی اور بے باکی کے بارے رطب اللسان ہیں:

''مغرور ہیں، کسی کو خاطر میں نہیں لاتے، لیکن ہمارا مشاہدہ و تجربہ دونوں اس کے برعکس ہیں۔ ان کا معاملہ یہ ہے کہ بقول حالی وہ خاکساروں کے لئے خاکسار، مگر سر بلندوں کے تئیں انکسار برتنے کے قائل بالکل نہیں، ہرگز نہیں ہم نے قاضی صاحب کو بڑے بڑوں کا طنطنہ توڑتے دیکھا ہے اور خردوں کی دلداری کرتے بھی۔ یہ خیال قطعی غلط، بلکہ گمراہ کن ہے کہ قاضی صاحب کسی کو گردانتے نہیں، کسی کا ادب نہیں کرتے، ہم نے خود انھیں متعدد

19؎ قاضی عبدالستار: اسرار و گفتار۔ راشدانور راشد۔ عرشیہ پبلی کیشنز، نئی دہلی۔ سنہ اشاعت: 2014۔ ص: 47-48

اکابرین کی تعریف وتوصیف میں رطب اللسان دیکھا ہے، ہزار بار دیکھا ہے مثال کے طور پر رشید صاحب کی تعریف کرتے نہیں تھکتے۔ وہ ان کی ادبی شان کے علاوہ ان کی شخصی عظمت واعلیٰ کردار کے شدید مداح ہیں، جس کا ثبوت یہ کہ انھوں نے صدر شعبہ کی حیثیت سے زمام اقتدار سنبھالتے ہی رشید احمد صدیقی پر مذاکرہ کرایا، شعبہ میں ان کی تصویر آویزاں کرائی۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کی تاریخ میں رشید احمد صدیقی پر یہ پہلا سیمینار تھا اور شاید آج تک آخری بھی۔ قاضی صاحب اپنے استاد محترم احتشام حسین کی بھی تعریف کرتے نہیں تھکتے۔ ان کی عظمت کی بھی اور حسن اخلاق اور وضع داری کی بھی۔ سرور صاحب کو وہ ہمیشہ استاد محترم کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ ان کی محبتیں انھیں یاد ہیں اور ستم بھی، اگر چہ ناخوش ساعتوں میں وہ ان کے نامنصفانہ طریق کار کے ضمن میں بعض در پردہ حقائق بھی افشا کرنے سے نہیں چوکتے، لیکن انتہائی جائز تنقید کے ساتھ، نیز ان کے بعض اصول پسندوں کا ذکر وہ ایمانداری سے کرتے ہیں۔ ہم نے ہمیشہ قاضی صاحب کو جذبی صاحب کا کام بڑے احترام ومحبت کے ساتھ لیتے دیکھا۔ اسی طرح مجنوں گورکھپوری کا ذکر بھی بڑے منصفانہ ڈھنگ سے کرتے ہیں اور اختر انصاری کا ذکر جب بھی کرتے ہیں ادب و اعتراف کے ہمرشتہ۔ علاوہ ازیں قاضی صاحب کا جذبۂ احترام سید صاحب کے لئے شدید طور پر وقف ہے، ہم نے اس کے نظارے کئی بار دیکھے ہیں، وہ ہمیشہ ان کی علمیت اور انشاء پردازی کے بھی قائل رہے اور انصاف پسندی اور نیک نیتی کے ساتھ۔'' 20

قاضی عبدالستار کی سخت مزاجی مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتی تھی، ایک صورت وہ بھی ہے جسے معروف ناول نگار غضنفر نے قاضی صاحب والے خاکے میں پیش کی ہے:

''استاد کا اندازِ تمسخر خاصا مہذب بھی ہوتا ہے، ان کے مذاق کا انداز ہمیشہ تہذیب کے دائرے میں رہتا ہے اور اکثر وہ ادبی حسن سے مملو بھی ہوتا ہے۔ وہ بے وقوف کو بے وقوف نہیں، معصوم کہتے ہیں، جو استاد کے رنگ مزاج سے واقف ہے وہ تو اپنی معصومیت پر آنسو بہاتا ہے اور جو واقف نہیں ہے وہ استاد

20۔ فکر وتحقیق (خاکہ نمبر)۔ عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں، قاضی عبدالستار۔ مظفر حسین سید۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی۔ جنوری تا جون 2017 صفحہ: 404

کے عطا کیے گئے اس لقب پر خوش ہوتا ہے اور استاد کا شکریہ ادا کر کے استاد کی مسکراہٹ کو اور گاڑھا کر دیتا ہے۔'' 21ے

سخت مزاجی اگر چہ اچھی چیز نہیں سمجھی جاتی مگر یہ قاضی عبدالستار کی تخلیقی سرگرمیوں میں کافی معاون ثابت ہوئی ہے۔ قاضی صاحب جس پیشے سے تعلق رکھتے ہیں وہاں اخلاق کا بڑا زور ہوتا ہے اور وہ زور شخصیت پر ضرب لگا تا رہتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جہاں سچ بولنے کی ضرورت ہوتی ہے، فن کار پورا سچ نہیں بول نہیں پاتا اپنے سچ کو دبا دیتا ہے، اس پیشے میں رہنے والا ادیب بھی نرم پڑ جاتا ہے، اسی لیے کہا جاتا ہے کہ استاد یا معلّمی کا پیشہ اختیار کرنے والا تخلیق کار بہت اچھا فن کار نہیں بن پاتا۔ اس لیے کہ اسے زندگی کے تئیں جتنا سخت ہونا چاہیے، سخت نہیں ہو پاتا، مگر قاضی عبدالستار اپنی سخت مزاجی کے سبب اخلاقی دباؤ میں نہ آ سکے اور اسی لیے ان حقائق کو بھی بے خوفی اور صاف گوئی سے بیان کرنے میں کامیاب ہو گئے جن کو بیان کرنے سے اکثر لوگ کتراتے ہیں۔

بے باکی:

قاضی عبدالستار کی بے باکی پر کسی کو کلام نہیں، سارا زمانہ ان کی بے باکی اور صاف گوئی کا معترف ہے۔ ان کی اس بے باکی کا اظہار ملازمت کے سلسلے میں بھی دیکھنے کو ملتا ہے جب پروفیسر کی تقرری پہلی بار نہ ہونے پر دوبارہ درخواست دینے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میں بھی انٹرویو لینے والے سے سوال کروں گا اور درخواست کے فارم پر یہ شعر لکھ دیا۔ ؎ حسد سزائے کمال سخن ہے کیا کیجیے

ستم بہائے متاع ہنر ہے کیا کیجیے

مگر علی گڑھ کی تاریخ میں پہلی بار ایسا ہوا کہ وہ بنا انٹرویو کے پروفیسر بن گئے۔ ان کی بے باکی ان کی تحریر، تقریر، معاملات کے معمولات، خلوت، جلوت ہر جگہ نظر آتی ہے، جن لوگوں نے قاضی عبدالستار کی شخصیت کو موضوعِ قلم بنایا ہے، ان سب نے ان کی اس خصوصیت کا ذکر کیا ہے، مثلاً راشد انور راشد اپنے انٹرویو والی کتاب کے مقدمے میں لکھتے ہیں:

''قاضی عبدالستار کے اخلاقی اور انسانی رویوں سے متعلق بھی لوگوں کے تاثرات

21ے: روئے خوش رنگ: فکشن کا فسوں ساز۔ پروفیسر غضنفر۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی۔ سنہ اشاعت: 2014۔ ص: 168

قدرے مختلف اور کسی قدر تلخ ہو سکتے ہیں۔ وہ ''اچھے اچھوں'' کو خاطر میں نہیں لاتے اور کوئی بھی بات بلا جھجھک کسی کے بھی سامنے اور کہیں بھی کہہ سکتے ہیں۔ وہ کسی کو خوش یا ناراض کرنے کے لیے شعوری طور پر ایسا نہیں کرتے۔ یہ رویہ ان کے بنیادی مزاج میں شامل ہے۔ حق گوئی نے انھیں کسی قدر بے باک بنا دیا ہے اور اس بے باکی کی وجہ سے وہ ادبی حلقوں میں اعتراضات کا نشانہ بنتے رہتے ہیں، جو کوئی بھی مصلحت کوشی سے دور ہوگا اور سچائی کے بیان میں پوری طرح ایمان دار، اس کے لہجے میں بے باکی تو لازمی طور پر شامل ہو جائے گی۔'' 22

پروفیسر غضنفر اپنے خاکے ''فکشن کے فسوں ساز'' میں فرماتے ہیں:

''محفلوں میں ملاقات کے دوران شخصیت کے اور بھی جوہر سامنے آنے لگے۔ شانِ بے نیازی کے شانہ بہ شانہ منظرِ آن بان بھی نظر آئے، رئیسانہ طمطراق کے رنگ بھی لہرائے، آن پر جان دینے والا انداز بھی سامنے آیا اور ساتھ ہی بے باکی کا وہ طور بھی دکھائی دیا جس کے متعلق علامہ اقبال فرما گئے ہیں۔

ع چپ رہ نہ سکا حضرتِ یزداں میں بھی اقبال

استاد کی بے باکی کا تو یہ عالم ہے کہ اپنی محفلوں کو کامیاب بنانے کی خاطر ان کو مدعو کرنے والے میز بان اور منتظمین اس وقت تک خوف و دہشت کے شکنجے میں کسے رہتے ہیں جب تک کہ استاد اپنی افتتاحی تقریر یا صدارتی خطبے کا آخری جملہ فرما نہیں دیتے، اس لیے کہ انھیں یہ ڈر لگا رہتا ہے کہ پتا نہیں کب کوئی بات ان کی طبع پر گراں گزر جائے اور ان کی رگ حمیّت پھڑک اٹھے اور وہ عالمِ جمال سے نکل کر حالتِ جلال میں پہنچ جائیں اور کوئی ایسی نازک تقریر فرما دیں کہ جس سے مقاصدِ میز بان خاک میں مل جائیں اور منتظمین کے کیے کرائے پر پانی پھر جائے۔ا'' 23

پروفیسر صغیر افراہیم، پروفیسر علی فاطمی، پروفیسر غضنفر، ڈاکٹر ابوبکر عباد، پروفیسر ابن کنول اور راشد انور

22: قاضی عبدالستار: اسرار و گفتار۔ راشد انور راشد۔ عرشیہ پبلی کیشنز، نئی دہلی۔ سنہ اشاعت: 2014۔ ص: 25

23: روئے خوش رنگ: فکشن کا فسوں ساز۔ پروفیسر غضنفر۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی۔ سنہ اشاعت: 2014۔ ص: 167

راشد جیسے ادیبوں کے قاضی عبدالستار کے مزاج کو سمجھنے اور دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ جا بہ جا ان کی تحریروں میں قاضی عبدالستار کی شخصیت کے امتیازات کا ذکر ملتا ہے۔ قاضی عبدالستار کے مزاج کا ایک نمایاں وصف بے باکی ہے اور اس وصف کا ایک بڑا ثبوت وہ انٹرویو ہے جسے انھوں نے راشد انور راشد کو دیا ہے اور جس میں ان کی بے باکی کے بے شمار قصے اور واقعات بیان ہوئے ہیں اور یہ بات بڑی حد تک درست بھی ہے کہ ان کے بیان میں بے نیازانہ شان اور بے باکانہ اظہار ان کے اسی وصف کی بدولت آیا ہے، مگر ان کی یہ بے باکی اکثر لوگوں کی دل آزاری کا سبب بھی بنی ہے، اس لیے کہ وہ اپنی بے باکی کے اظہار میں کہیں کہیں حد سے گزر جاتے ہیں اور اس حد تک آگے نکل جاتے ہیں کہ وہ بھول جاتے ہیں کہ حقائق کچھ اور ہی ہیں، مثلاً ان کا یہ بیان ملاحظہ فرمائیے:

> ''راشد: استاد محترم رشید احمد صدیقی اور معین احسن جذبی سے متعلق آپ کے تاثرات تو مختلف حوالوں سے دوسری جگہوں پر بھی آتے رہے ہیں، لیکن علی گڑھ میں بلکہ شعبۂ اردو میں اور بھی کچھ نمائند شخصیات تھیں، مثلاً خورشید الاسلام اپنے زمانے میں ادبی سطح پر کافی سرگرم تھے اور انھوں نے تخلقی تنقید کی بنا پر ادبی دنیا میں ہنگامے بھی برپا کیے۔ ان سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کریں تو خوشی ہوگی۔''
>
> قاضی عبدالستار: منشی مہر الاسلام یعنی خورشید الاسلام عجیب و غریب آدمی تھے۔ ذہین تھے، کبھی پڑھا لکھا بھی ہوگا، لیکن جب وہ انگلینڈ سے آئے، شاید 1957ء میں تو وہ بانجھ ہو چکے تھے، وہ ہمارے عزیز دوست مسعود عالم کے ماموں تھے، مسعود عالم نے ہی میرا ان سے تعارف کرایا، میرے یہاں رشتوں کی بڑی قدر رہے، میں نے ان کو ماموں کا ہی مرتبہ دیا، جب وہ تشریف لاتے تو جیسی خاطر مدارات میں کر سکتا، وہ کرتا تھا، پھر وہ مجھے اپنی شام کی محفلوں میں شریک کرنے لگے، وہ بلا نوش تھے، نشے میں احمقانہ باتیں کرتے تھے، میرے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ خورشید صاحب استاد محترم پروفیسر رشید احمد صدیقی کی صاحبزادی سلمیٰ صدیقی سے شادی کرنا چاہتے تھے جو ظاہر ہے ممکن نہیں ہوئی، اب خورشید صاحب چڑھ گئے، چوں کہ رشید صاحب جون پور کے تھے اور جون پور پورب میں ہے، اس لیے وہ پورب کو گریاتے

رہتے تھے، پہلے میں سمجھتا نہیں تھا، پھر کچھ سن گن ملی، بدکلام اور بدمزاج میں خود بھی کیا کم تھا، بلکہ ہوں، ایک دن شام کی محفل میں بھڑک گیا، میں نے کہا دلی کا پورب لکھنؤ ہے، کہنے لگے کہ جی، میں نے کہا لاہور کا پورب دلی ہے اور پیشاور کا پورب لاہور اور کابل کا پورب پشاور ہے، تو اس حساب سے بی بی دلّی کا حساب کہاں آیا، بہت زور سے چیخے آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟ میں نے کہا خورشید صاحب میں آپ کا شاگرد ہوں، میں اس لہجے اور ان الفاظ میں گفتگو سننے کا عادی نہیں ہوں، آپ بس خاموش ہو جائیں، موصوف خاموش ہو گئے لیکن باطنی طور پر تعلقات ختم ہو گئے، وہ میرے گھر آتے تھے، اپنے گھر بھی بلاتے تھے، اپنی محفلوں میں شریک بھی کرتے تھے لیکن انھوں نے اپنے طور پر یہ طے کر لیا تھا کہ مجھے پروفیسر نہیں ہونا ہے اور میری پوری مخالفت انھوں نے کی لیکن میں نے ان سے ایک بار بھی نہیں کہا کہ حضور خورشید الاسلام صاحب آپ مجھے سپورٹ کیجئے، میں نے اپنی پوری عمر میں کسی پروفیسر سے کسی شخص سے اپنی سفارش نہیں کرائی، جس کا انھیں بہت دکھ تھا، وہ چاہتے تھے کہ میں ان سے گزارش کروں لیکن یہاں یہ حال:

آگے کسو کے کیا کریں گے دستِ طمع دراز
وہ ہاتھ سو گیا ہے سرہانے دھرے دھرے

ایک دن فرمانے لگے کہ آپ کو معلوم ہے مولانا ابوالکلام آزاد نے میرے لیے کیا کہا؟ میرے مضمون کا ایک جملہ پڑھ کر وہ اچھل پڑے تھے کہ شبلی پہلے یونانی ہیں جو ہندوستان میں پیدا ہوئے، میں نے کہا خورشید صاحب! مولانا کے بارے میں مشہور ہے کہ شام کے وقت تنہا محفل سجاتے تھے، اس عالم میں انھوں نے پڑھا ہوگا اور وہ اچھل پڑے ہوں گے ورنہ یہ جملہ مہمل ہے، یونانی سے کیا مطلب ہے، آپ کا؟ یونانیوں کا تو بہت ذکر قوم لوط کے سلسلے میں ہوتا ہے، آپ کیا بکتے ہیں، بہت زور سے چلائے، میں نے عرض کیا، چلایئے مت، شبلی کی یونانیت پر روشنی ڈالیے، محفل برخاست ہو گئی۔'' 24

24: قاضی عبدالستار: اسرار و گفتار۔ راشد انور راشد۔ عرشیہ پبلی کیشنز، نئی دہلی۔ سنہ اشاعت: 2014۔ ص: 186-188

راشدانور راشداور غضنفر نے بے باکی کو قاضی عبدالستار کے مزاج کا مثبت عنصر قرار دیا ہے اور خود قاضی صاحب نے اپنے اس بیان میں مزے لے لے کر اپنی بے باکی کا مظاہرہ کیا ہے۔

اور یہ بات بڑی حد تک درست بھی ہے کہ قاضی عبدالستار کی تخلیقی تحریروں میں بے نیازانہ شان اور بے باکانہ اظہار ان کے اسی وصف کی بدولت آیا ہے مگر یہ بات بھی اپنی جگہ درست ہے کہ ان کی یہ بے باکی اکثر لوگوں کی دل آزاری کا سبب بھی بنی ہے، اس لیے کہ وہ اپنی بے باکی کے اظہار میں کہیں کہیں حد سے تجاوز کر جاتے ہیں جیسا کہ خود ان کے مذکورہ بالا بیان سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔

قاضی عبدالستار کے مذکورہ بالا بیان سے یہ تاثر ابھرتا ہے کہ انھوں نے ملازمت کے لیے کبھی کسی سے سفارش نہیں کرائی اور خورشید الاسلام سے ایک بار بھی نہیں کہا کہ حضور خورشید الاسلام صاحب آپ مجھے سپورٹ کیجئے مگر ان کی تقرری کے سلسلے میں جو علی گڑھ کے گلیاروں میں خبریں گشت کرتی ہیں وہ یہ ہیں کہ قاضی عبدالستار نے اس کے لیے خورشید الاسلام کی نثری نظموں کے مجموعہ ''جستہ جستہ'' کی رسمِ رونمائی کا اہتمام بڑی دھوم دھام سے کیا، اس محفل میں خورشید الاسلام کے خوب قصیدے پڑھے، اس بات کا بھی خیال رکھا کہ خلیل الرحمٰن اعظمی کو اس محفل سے دور رکھا جائے اور عین وقت پر ان سے جستہ جستہ پہ اظہار رائے کی دعوت دی جائے، ایسا ہوا بھی مگر خلیل الرحمٰن اعظمی نے قاضی صاحب کے خیال کے برعکس نہ صرف یہ کہ جستہ جستہ پر تقریر کی بلکہ ان نظموں کی تعریف بھی کی، یہ مجموعہ اسی خورشید الاسلام کا تھا جس کے بارے میں قاضی عبدالستار اپنے انٹرویو میں فرما چکے ہیں کہ جب وہ انگلینڈ سے آئے شاید 1957ء میں تو وہ بانجھ ہو چکے تھے۔

قاضی صاحب کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر غور کرتے ہوئے بار بار میرا ذہن الجھ جاتا ہے اس لئے کہ انھوں نے اپنے معاصرین ادیبوں پر جو رائے دی ہیں وہ حقیقت کے کچھ برعکس بھی نظر آتی ہے۔ مثلاً وہ خلیل الرحمٰن اعظمی کو صرف ایک مصرعہ کا شاعر مانتے ہیں۔ ان کا خلیل الرحمٰن اعظمی کو ایک مصرعہ کا شاعر ماننا ایسا ہے جیسے مجروح کے متعلق ان کے حاسدین کا خیال ہے کہ مجروح صرف ڈیڑھ مصرعے کے شاعر ہیں جب کہ حقیقت یہ ہے کہ مجروح کے درجنوں اشعار زبان زد خاص و عام ہو گئے۔

اس تفصیلی گفتگو کا مقصد صرف یہ عرض کرنا ہے کہ انسان جب غصے میں ہوتا ہے یا کسی سے شدید نفرت کرتا ہے یا کسی کی دشمنی پر اُتر آتا ہے تو طیش میں اور حالتِ غیض و غضب میں بہت سی حدیں پار کر جاتا ہے۔ شعبۂ اردو

کے ادیبوں کے ذکر کے سلسلے میں اپنے خیمے کے لوگوں کی تعریف کرنا اور دوسرے خیمے میں کھڑے ادیبوں کو نظر انداز کرنا یا ان کا نام نہ لینا، اسی حقیقت کا ثبوت ہے، بہر حال یہ بشری کمزوریاں ہیں جو بڑے سے بڑے انسان کے اندر بھی دکھائی دے جاتی ہیں۔

قاضی عبدالستار کو اپنی پیچیدہ شخصیت اور اپنے فکری اور ذہنی خیالات کا بہ خوبی احساس بھی ہے اس لئے وہ کہتے ہیں:

''یہ سچ ہے کہ میری رائے میں کچھ تعصب ہے اور اگر وہ نہ ہوتا تو میں والی اللہ ہوتا مجھے اپنے تعصب سے کوئی انکار نہیں۔'' 25؎

قاضی عبدالستار کی شخصیت کے یہ وہ عناصر ہیں جن سے ان کی شخصیت کی پوری تصویر بنتی ہے اور یہ وہ تصویر ہے جس کا عکس ان کی تخلیقی تحریروں میں دکھائی دیتا ہے اور جس سے فن کار قاضی عبدالستار اور بھی طمطراق، آن بان اور شان کے ساتھ ہمارے سامنے آتا ہے، یہی وہ عناصر ہیں جو قاضی عبدالستار کی زبان کو طاقت اور بیان کو زورعطا کرتے ہیں۔

قاضی عبدالستار کی اس پیچیدہ شخصیت پر اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر ابوبکر عباد لکھتے ہیں:

''جن لوگوں نے قاضی صاحب کی زندگی کا قدرے توجہ سے مشاہدہ کیا ہے وہ تسلیم کریں گے کہ قاضی صاحب حقیقی سے کہیں زیادہ خیالی دنیا کے باشندے تھے۔ وہ، وہ نہیں تھے جو وہ تھے۔ بلکہ زندگی بھر وہ، وہ رہے جو دراصل وہ تھے ہی نہیں یوں جانیے کہ قاضی صاحب اہم اور اعلیٰ فکشن کے کرداروں کی دنیا سے بچھڑا ہوا ایک ایسا کردار تھے جسے غالباً خود قاضی صاحب نے ہی خلق کیا تھا، ایسا کردار جس میں زمیندارانہ کہر وفر، مغل تہذیب کی نفاست ونزاکت اور عہد عتیق کی جلالت وسادگی ہر صورت نمایاں تھی۔ قاضی صاحب کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے ''قاضی عبدالستار'' کا یہ کردار اس ہنر مندی سے تشکیل دیا تھا کہ وہ ہو بہو ہم جیسا ہی چلتا پھرتا، ہنستا بولتا، زندہ جاوید انسان دکھتا اور ہماری اس حقیقی دنیا میں زندگی کرتا تھا۔'' 26؎

25؎: قاضی عبدالستار: اسرار و گفتار۔ راشد انور راشد۔ عرشیہ پبلی کیشنز، نئی دہلی۔ سنہ اشاعت: 2014۔ ص: 301

26؎: ایوان اردو: قاضی عبدالستار: شخص، فن اور اسرار۔ ڈاکٹر ابوبکر عباد۔ نئی دہلی۔ اکتوبر 2019۔ ص: 23

پروفیسر ابن کنول نے اپنے خاکوں کے مجموعہ ''کچھ گفتگو کچھ سنجیدگی'' میں قاضی عبدالستار کا عمدہ خاکہ لکھنے کی کوشش کی ہے جس میں انھوں نے علی گڑھ کے زمانے کی ان سنی کہانیاں قاضی صاحب سے ان کے مراسم کا ذکر کیا ہے کیونکہ قاضی عبدالستار ابن کنول کے استاد تھے اور افسانے کی محفلوں میں یہ تمام لوگ شامل ہو کرتے تھے ابن کنول قاضی عبدالستار کے مزاج ان کے ہمدردانہ اور مشفقانہ انداز کو خوبصورت بیان کے ساتھ لکھا ہے۔علی گڑھ اور لکھنؤ کی تہذیب وتمدن سے سجا ہوا اور زمیندارانہ آن بان شان سے پرویا ہوا انسان جس کے اندر ہمیشہ اس بات کا غرور رہا ہے کہ اس کے سب سے استاد رہے ہیں اور سب سے زیادہ شاد رگ استاد ہیں۔

بدلتے ہوئے سماجی اقدار ایک تہذیب کے نمائندہ اور بیدار کو کس طرح غمگین کرتی ہے اپنا دکھ وہ کس طرح کس الفاظ کے پردوں کے پیچھے چھپاتا ہے اور اپنی تخلیق کے ذریعہ اس کو کم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ان تمام واقعات کو ابن کنول نے عام فہم اور برجستہ انداز میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے اور لفظوں کے تال میل اور اس کی تشکیل سے خاکے کو اس طرح لکھا ہے کہ قاضی عبدالستار کی پوری تصویر آنکھوں کے منقش ہو جاتی ہے۔ابن کنول نے ذاتی معاملات کو بھی نہایت سلیقے سے بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔جس سے قاضی عبد الستار کی مشفق مہربان شخصیت کا سامنا ہوتا ہے جو دور ہوتے ہوئے بھی اپنوں کا خیال رکھتے ہیں۔

سوانحی کوائف:

پیدائش سے لے کر موت تک کے حالات وواقعات پر نظر رکھنا اس لئے ضروری ہوتا ہے کہ ان حالات وواقعات سے فن کار کی نفسیات سمجھ میں آتی ہے۔اس کے مزاج کا پتا چلتا ہے۔اس کے مزاج کو تشکیل دینے والے امور کا علم ہوتا ہے۔اس کی پسند ناپسند،اس کی خوشی،اس کے غم،اس کے احساسات،اس کے جذبات، اس کے خیالات،اس کی ترجیحات سب سے سے واقفیت ہو جاتی ہے۔اس فن کار کی ذات وصفات کے متعلق اتنی معلومات حاصل ہو جاتی ہے کہ اس کی تحریروں کو پڑھنا اور اس کی معنوی تہوں کو کھولنا آسان ہو جاتا ہے۔ لہٰذا قاضی عبدالستار کے سوانحی کوائف درج کیے جارہے ہیں تاکہ ان کی روشنی میں قاضی عبدالستار کی شخصیت کے ظاہری اور باطنی گوشے اچھی طرح روشن ہو جائیں:

نام : قاضی عبدالستار عرفیت (چھبّن بھائی،بھیّا راجہ،بھیّا سرکار)

سن پیدائش : سرکاری رکارڈ کے مطابق ۹ فروری 1933ء

(مصنف کے بیان کے مطابق ۱۶ر جولائی 1930ء)

جائے پیدائش : موضع مچھریٹھہ، قصبہ مسرکھ ضلع سیتارپور، صوبہ اترپردیس

گھرانہ : زمیں داروں کا

تعلیم : پرائمری اسکول مچھریٹھہ، مسرکھ، سیتاپور

ابتدائی تعلیم : 1948 آر۔آر۔ڈی۔کالج

انٹرمیڈیٹ : 1950 آر۔آر۔ڈی۔کالج

بی۔اے۔آنرز : 1953، لکھنؤ یونیورسٹی، (فرسٹ ڈویژن)

ایم۔اے۔ : 1954،(اردو) لکھنؤ یونیورسٹی، امتیاز اور گولڈ میڈل کے ساتھ)

پی۔ایچ۔ڈی۔ : 1957، موضوع: اردو شاعری میں قنوطیت، زیرِ نگرانی پروفیسر رشید احمد صدیقی ،شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

ملازمت : عارضی لیکچرر، شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔1956

لیکچرر (مستقل)، شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔1961

ریڈر، شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔1967

پروفیسر، شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔1981

صدر شعبہ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ 1993-1988

ازدواج : محترمہ شاہدہ محمود، چودھری محمود کی بیٹی اور مشہور ادیب چودھری محمد نعیم کی بہن

تاریخ 1954 سے 1995 تک (پہلی بیوی)

محترمہ کوثر مجید عبدالمجید کی بیٹی تاریخ نکاح 1977 (دوسر بیوی)

اولاد : معین ستار (بیٹا) پہلی بیوی سے

عابدہ ستار (بیٹی) پہلی بیوی سے

درریز ستار (بیٹا) دوسری بیوی سے

شاہویز ستار (چھوٹا بیٹا) دوسری بیوی سے

تصنیفات:

1۔ شکست کی آواز، پہلا ناول، 1954 میں ادارۂ فروغ اردو لکھنو سے شائع ہوا، یہ ناول پاکستان میں دودِ چراغ محفل'' کے نام سے ''نقوش'' میں 1961ء میں شائع ہوا۔ یہی ناول ہندی میں پہلا اور آخری خط کے عنوان سے 1962ء میں شائع ہوا۔

2۔ شب گزیدہ (ناول) 1960

3۔ مجّو بھیا (للّی) 1963ء

4۔ صلاح الدین ایوبی (ناول) 1965 تاریخی ناول نامور بادشاہ صلاح الدین ایوبی کی زندگی پر

5۔ بادل 1965

6۔ غبارِ شب (ناول) 1966ء

7۔ غبارِ شب۔ مجّو بھیا۔ بادل تینوں کو ایک ساتھ 'غبارِ شب' کے عنوان سے 1974ء میں شائع کیا گیا۔

8۔ داراشکوہ (ناول) 1968ء (مشہور مغل شہزادہ داراشکوہ کے زندگی پر)

9۔ غالب (ناول) 1986ء (مشہور شاعر مرزا اسداللہ خاں غالب کی زندگی پر)

10- حضرت جان (ناول) 1990 (موجودہ زمانے کے حالات پر)

11- خالد بن ولید (ناول) 1995 (تاریخی ناول، مذہب اسلام کے ایک نامور بہادر سپہ سالار اور جلیل القدر صحابی کی زندگی پر)

12- تاجم سلطان (ناول) 2005۔ یہ ناول تاج پور کے نام سے بھی 2006 میں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، علی گڑھ سے شائع ہوا۔

13- آخری کہانی 2015

14۔ آئینہ ایام (افسانوی مجموعہ) 1995 مرتب ڈاکٹر محمد غیاث الدین۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤسنگ، علی گڑھ

15- اردو شاعری میں قنوطیت (تحقیقی مقالہ) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پریس 1977، علی گڑھ

16- جمالیات اور ہندوستانی جمالیات (تنقید) ادبی پبلی کیشنز، آنند بھون، دودھ پور، علی گڑھ بار اول۔ 1997

17- سفر ہے شرط (رپورتاژ)

انعامات و اعزازات:

1- پدم شری ایوارڈ، حکومتِ ہند، 1974

2- پہلا غالب ایوارڈ، حکومت ہند 1973

3- اعجازِ میر، میر اکادمی، لکھنؤ 1977

4- یوپی اردو اکادمی ایوارڈ، لکھنؤ 1978

5۔ عالمی فکشن ایوارڈ۔ 1987

6- گیانیشور ایوارڈ، مہاراشٹر اردو ساہتیہ اکادمی، بمبئی 1988

7- پہلا 'نشان سرسید' ایوارڈ، علی گڑھ 1996

8- بہادر شاہ ظفر ایوارڈ، اردو اکادمی، دہلی 2002

9- عالم اردو ایوارڈ، دوحہ قطر 2005

10- اقبال سمّان، مدھیہ پردیش 2006

11- یوپی ہندی سنستھان ایوارڈ، لکھنؤ 2011

12- سدبھاؤنا کمیٹی ایوارڈ

وفات:

قاضی صاحب بہت سخت جان تھے، مسلسل جان لیوا بیماری سے مردانہ وار لڑتے رہے، کئی بار تو ایسا لگا کہ انھوں نے موت کو شکست دے دی ہو۔ ایک بار تو باقاعدہ ٹیلی ویژن پر ان کی موت کا اعلان بھی ہو گیا مگر سخت جان قاضی صاحب موت کے منہ سے نکل آئے۔ کافی دنوں تک اس سے جوجھتے رہے، اسے پوری طرح شکست دینے کی کوشش کرتے رہے مگر موت سے کس کو رستگاری ہے۔ آخر کار ایک دن موت سے شکست کھا ہی گئے۔ وہ تاریخ اردو ناول نگاری کی تاریخ کی ایک عہد ساز تاریخ بن گئی۔ وہ تاریخ ہے: 29 اکتوبر 2018 سر گنگا رام ہسپتال میں انھوں نے اپنی آخری سانسیں لیں اور تدفین علی گڈھ کے منٹو ای قبرستان میں ہوئی اس طرح یہ جگہ اردو کے تاریخی ناول نگار کی وآخری آرام گاہ بن گئی۔

باب دوم

قاضی عبدالستار سے قبل اردو فکشن کا عمومی جائزہ

قاضی عبدالستار کے فکشن کو سمجھنے کے لئے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اردو کی اس افسانوی روایت پر ایک نظر ڈال لی جائے جس نے قاضی عبدالستار کے فکشن کے لئے زمین ہموار کی۔ قاضی عبدالستار سے قبل اردو فکشن کی ایک طویل تاریخ موجود ہے جس میں ناول بھی ہیں اور مختصر افسانے بھی فکشن کے اس ارتقاء میں کئی موڑ آتے ہیں اور ہر موڑ پر نئے رجحانات ومیلانات دکھائی دیتے ہیں اور ہر ایک رجحان ومیلان سے نئے رنگ وآہنگ پھوٹتے ہیں۔ اور کہیں کہیں روایتی افسانے بھی دکھائی دیتے ہیں جو پیش رو کے نقش قدم پر چلتے دکھائی دیتے ہیں۔ ساتھ ہی فکشن کی اس روایت کو آگے بڑھانے میں بہت سے نام ہیں مگر جن فکشن نگاروں کے نقوش نمایاں ہیں اور جنھوں نے زیادہ اہم کردار ادا کئے ہیں ان میں ڈپٹی نذیر احمد، رتن ناتھ سرشار، عبدالحلیم شرر، راشد الخیری، مرزا ہادی رسوا، منشی پریم چند، سدرشن، علی عباس حسینی، اختر حسین رائے پوری، اوپندر ناتھ اشک، اعظم کریوی، کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، عزیز احمد، احمد ندیم قاسمی، خواجہ احمد عباس، خدیجہ مستور، حیات اللہ انصاری، بلونت سنگھ وغیرہ قابل ذکر ہیں جو اردو فکشن کی تاریخ میں ایک اہم رول ادا کرتے ہیں۔ اردو فکشن کے اس ارتقائی سفر میں تین موڑ آتے ہیں:

☆ابتدائی موڑ

☆انگارے کا موڑ

☆ترقی پسند موڑ

ابتدائی موڑ وہ ہے جہاں سے اردو فکشن کی شروعات ہوتی ہے۔ اس موڑ پر ناول بھی نظر آتے ہیں اور افسانے بھی۔ اور دونوں میں داستان کا رنگ حاوی نظر آتا ہے۔ وہ فنی پختگی نظر نہیں آتی جو بعد کے فکشن میں دکھائی دیتی ہے۔ اس موڑ پر اردو فکشن کے جو نمونے دکھائی دیتے ہیں وہ ڈپٹی نذیر احمد، رتن ناتھ سرشار، اور عبدالحلیم شرر کے ناول ہیں اور منشی پریم چند، سدرشن، اختر حسین رائے پوری، سہیل عظیم آبادی، اعظم کریوی وغیرہ کے افسانے ہیں جن میں داستانوی رنگ صاف نظر آتا ہے۔ اور رومانی فضا کا غلبہ ہے۔ زبان وبیان

میں لفظی سحر کاری کا اہتمام کیا گیا ہے۔ حقیقت نگاری پر کم توجہ ملتی ہے۔ خیالی اور مثالی یا پھر اصلاحی باتیں زیادہ دیکھنے کو ملتی ہیں۔ عام تحریروں میں مقصدیت حاوی ہے البتہ 'امراؤ جان ادا' جو قدرے بعد میں لکھا گیا میں فنی پختگی کا احساس ہوتا ہے۔ حقیقت نگاری بھی دکھائی دیتی ہے اور نیا رنگ و آہنگ ملتا ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد کو اردو کا پہلا ناول نگار تسلیم کیا جاتا ہے۔ مراۃ العروس جو انھوں نے 1869ء میں لکھا اس ناول میں انھوں نے سماجی مسائل اور اصلاح معاشرہ پند و نصیحت کے انداز سے لکھا گیا ہے۔ یہ ناول انھوں نے اپنے بچوں کے لئے لکھا اس میں سماجی، اصلاحی اور مذہبی باتوں کا بیان کیا جس سے کسی معاشرے اور گھر کو بہتر بنایا جا سکے۔ جب وہ یہ ناول لکھ رہے تھے اس وقت ان کے پاس ایسا کوئی خاکہ موجود نہیں تھا اور نہ انھیں یہ معلوم تھا کہ وہ ایک نئے طرز کی بنیاد ڈال رہے ہیں۔ وہ بس لکھ رہے تھے کچھ اچھی اور نصیحت آمیز باتیں مگر وقت نے ''مراۃ العروس'' کو اردو کے پہلے ناول کا خطاب دے دیا اور ڈپٹی نذیر احمد کو پہلا ناول نگار۔ ''مراۃ العروس'' کے علاوہ ''ابن الوقت''، ''توبۃ النصوح''، ''فسانہ مبتلا''، ''رویائے صادقہ''، ''ایامیٰ'' ان کے قابل ذکر ناول ہیں۔ ان تمام ناولوں میں ڈپٹی نذیر نے 1857ء کے غدر کے بعد مسلمانوں خاص طور سے متوسط گھرانوں کے سیاسی و سماجی مسائل کا بیان کیا ہے جو اپنی جھوٹی انا شان و شوکت کو بچائے رکھنے کا جتن کر رہے تھے۔ انھوں نے کسی رومانی قصے کہانیوں کو پیش نہ کر کے سیاسی اور سماجی طور پر بد حال مسلمان جن کی تہذیب جن کا وقار ان کی نظروں کے سامنے رو بہ زوال تھا اور ایک نیا نظام ایک نئی تہذیب غالب آ رہی تھیں وقت تیزی سے تبدیل ہو رہا تھا مغربی دنیا کا اثر مشرقی روایات کو کچل رہا تھا ان سب کا ذکر ملتا ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد کے یہاں سر سید احمد خاں کی اصلاحی تحریکوں کا عکس صاف نظر آتا ہے اور اس لئے انھوں نے سر سید اور اس دور کی بدلتی ہوئی زندگی پر ''ابن الوقت'' ناول کے ذریعہ سر سید کی کوششوں اور کاوشوں اور اس کے مثبت اور منفی پہلوؤں کو اپنے زاویہ نظر سے دیکھنے اور پھر اسے لکھنے کی کوشش کی ہے۔ علی عباس حسینی نذیر احمد کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''انھوں نے اپنے ناولوں میں کہیں پر بھی بادشاہوں، شہزادوں اور امراء کی زندگی پیش کرنے کی کوشش نہ کی۔ وہ داستان گو اور قصہ گو نہ تھے۔ وہ مذہبیات کے عالم اور قرآن کے حافظ و مترجم تھے۔ ان کی ذہنیت بالکل مولویانہ تھی۔ وہ رومان سے نفرت کرتے تھے وہ طبقہ ادنیٰ کے ساتھ نماز تو پڑھ سکتے تھے لیکن ان کے ساتھ بیٹھ کر ہنس بول نہ سکتے تھے۔

ان کے نزدیک صحبت ارذال سے پرہیز واجب تھا، تفریح و تفنن ادب اور آرٹ ان کی نظر
میں لہو لعب تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی مذکورہ ادبی تصنیفات کو ان کے زمانے میں ناول
نہ سمجھا گیا۔'' 1

رتن ناتھ سرشار ہفتہ وار ''اودھ اخبار'' کے ذریعہ ادب کی دنیا میں قدم رکھتے ہیں۔ جب وہ ''فسانۂ آزاد'' لکھ رہے تھے ان کے ذہن میں کسی بھی طرح کا کوئی ناول کو تصور نہیں تھا۔ صرف قصہ در قصہ بیان کر رہے تھے جس میں انھوں نے لکھنؤ اور اہل لکھنؤ کا دلچسپ انداز میں تذکرہ تھا جس میں انھوں نے لکھنؤ کی زندگی کی ان تمام رنگینیوں رعنائیوں اور عیش کوشیوں کا بیان کیا ساتھ ہی اس زمانے کی ان خرابیوں کا بیان کیا جن سے معاشرے میں برائیاں پھیل رہی تھیں۔ ان کے یہاں محلوں سے لے کر بازاروں تک زہد و عشق سے لے کر رنگین مزاجوں اور بیگمات سے لے کر طوائفوں تک کا بیان نہایت باریکی اور دل چسپ انداز میں ملتا ہے۔ رتن ناتھ سرشار کا زمانہ بھی مذہبی تھا۔ اس وقت لوگ انگریزی زبان اور انگیریزی طرز معاشرت کی مخالفت کرتے تھے۔ اس لئے مغربی چیزوں کو نظر انداز کرتے تھے۔ ادب میں بھی یہ پہلو رواں رکھا اور ادب کو تفریح کا ذریعہ نہ مان کر اسے اصلاح معاشرے کی غرض سے پیش کرتے تھے۔ رتن ناتھ سرشار نے ''سیر کہسار''، ''جام سرشار'' میں بھی اصلاح معاشرہ کا خاص دھیان رکھا اور لکھنؤ معاشرے میں خواب غفلت میں پڑے ہوئے رئیسوں، نوابوں کو جو عیش پرستی، حسن و عشق، مرغ بازی، بٹیر بازی اور کبوتر بازی کی دنیا میں الجھے ہوئے تھے ان کو خواب غفلت سے بیدار کرنے اور بدلتے وقت سے نظریں ملانے کی طرف متوجہ کیا۔ اس کے علاوہ انھوں نے اپنی تخلیقات میں اپنے کرداروں کی سیر دنیا کے مختلف مما لک میں بھی کرائی اور ان کے دلچسپ اسلوب کی وجہ سے ان کی تحریریں پسند کی جاتی تھیں اس طرح سے رتن ناتھ سرشار نے اپنی قلم کے ذریعہ معاشرے کا کام دل چسپ اور مزاحیہ انداز سے کیا۔

منشی سجاد حسین نے رتن ناتھ سرشار کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کی اور ''اودھ پنچ'' کے ذریعہ ایک مزاحیہ کالم لکھنے کی شروعات کی جس کا مقصد طنزیہ اور مزاحیہ انداز میں قوم کو بیدار کرنا تھا اس لیے انھوں نے اپنے زمانے کے معاشی اقتصادی حالات کو پیش کیا جس میں لکھنؤ اور اہل لکھنؤ کی تباہیاں، بربادیاں، روز

1: اردو ناول کی تاریخ اور تنقید۔ علی عباس حسینی۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ۔ سن اشاعت: 2011ء۔ ص: 78

افزوں بگڑتی ہوئی سماجی اور اقتصادی صورت حال کا بیان کیا۔انھوں نے شگفتہ نثر اور دلچسپ اسلوب کی بنیاد بھی ڈالی طرحدار لونڈی، کایا پلٹ، میٹھی چھری، احمق الدین جیسے فن پارے پیش کئے۔

مولانا عبدالحلیم شرر اردو کی تاریخی ناول نگاری میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں اور انھیں پہلا تاریخی ناول نگار بھی مانا جاتا ہے۔عبدالحلیم شرر نے اپنے تاریخی ناولوں کے ذریعہ مسلمانوں کی عظمت معاشی کی داستان کو پیش کرنے کی شروعات کی۔عبدالحلیم شرر کے تاریخی ناول لکھنے کی ابتدا اس وقت ہوئی جب انھوں نے والٹر اسکاٹ کے ناول The Talisman پڑھا تو ان کی رگِ حمیت بھڑک اٹھی اور انھوں نے تاریخی ناول لکھنے کی شروعات کی۔'' ملک العزیز ورجینا'' ان کا پہلا ناول ہے۔ اپنے ناولوں کے ذریعہ انھوں نے مسلمانوں کو ان کی عظمت ماضی کی داستان کو یاد دلانے کی کوشش کی جہاں دشت تو دشت دریاؤں کے راستے عبور کرتے ہوئے اسلام کا پرچم لہرایا تھا۔شرر کے ناولوں میں مسلمانوں کے جوش جہاد کے مافوق الفطری صورت حال دکھائی دیتی ہے اور مسلمانوں کو نہایت شریف، بہادر، وعدہ، وفا کرنے والے، اخلاق پسند دکھایا گیا ہے وہیں پر عیسائیوں کی ایسی صورت دکھائی گئی ہے جہاں وہ وعدہ خلاف، عہد شکن، مکار اور جھوٹے ہیں اور دھوکے دہی سے جنگوں کو جیتنا چاہتے ہیں۔عیسائی لڑکیاں مسلمانوں نوجوان کے حسن و اخلاق اور خوبصورتی سے متاثر ہوکر ان کے دامِ الفت میں گرفتار ہوجاتی ہیں اور مذہب تبدیل کر کے مسلمان ہوجاتی ہیں۔

شرر نے درجنوں تاریخی ناول لکھے اور ان سب میں مسلمان مجاہدین کے کارناموں کو پیش کیا تا کہ نوجوان نسل اپنے اسلاف کے کارناموں سے متعارف ہوسکے اور خواب غفلت سے بیدار ہوسکے۔انھوں نے یہ کام اس وقت انجام دیا جب مسلمانوں پر چاروں طرف سے مصیبتیں ٹوٹ پڑی تھیں اور ان کے لیے اپنے تشخص کو بچانا نہایت مشکل تھا اور ان کے دلوں میں بے چینی، مایوسی، افسردگی گھر کر چکی تھی۔ایسی حالت میں انھوں نے اس مایوسی اور کرب کی صورت حال سے مسلمانوں کو نکالنے کے لیے ماضی کا سہارا لیا اور ان کے اندر حال سے لڑنے اور مستقبل کو بہتر بنانے کے لیے جوش وجذبہ اٹھا اور ان کے نزدیک یہ ایک کڑوی دوا تھی جس کو شوگر سے لپیٹ کر دی جارہی تھی۔ پروفیسر علی احمد فاطمی شرر کے تاریخی ناولوں پر اپنے خیال کا اظہار کچھ اس طرح کرتے ہیں:

''شرر کو صحیح مقام دینے کے لئے ہمیں نئی روشنی اور آج کے تقاضوں کو بالائے طاق رکھنا پڑے گا۔ اس دور میں پہنچنا پڑے گا جس نے ان کو تاریخی ناول لکھنے پر مجبور کیا۔ اس وقت کا ماحول، اس وقت کے حالات کو اچھی طرح سمجھنا پڑے گا حال کی عینک سے ماضی کو دیکھنا غلط ہے۔ اس میں جو نظر آئے گا وہ دھندلا اور گرد آلود ہوگا۔ کسی بھی دور کی تحریر کو سمجھنے کے لئے اس دور میں پہنچنا لازمی ہے۔''[2]

راشد الخیری کا نام بھی مشرقی تہذیب وتمدن کا باریکی سے اظہار کے ضمن میں لیا جاتا ہے۔ انھوں نے اسلامی طرز تہذیب کو نئے زمانے کے ان طوفانوں کو روکنے کے لیے لکھا جب مغربی معاشرت اور مغرب کے اثرات تیزی سے مشرقی سورج کو ڈھانپ رہے تھے۔ انھوں نے نوحہ گیری کے انداز میں ایک ایسا ادب پیش کیا جہاں ایک مثالی زندگی اور مثالی خاندان کا بیان کا بھرپور اظہار ملتا ہے۔ ''صبح زندگی''، ''شام زندگی'' ان کی تخلیقات کا اچھا نمونہ ہیں۔

مراز محمد ہادی رسوا کا نام ناول نگاری کے میدان میں سب سے منفرد ہے۔ اس وقت جب ناصحانہ انداز کے ناول اور قصے لکھے جا رہے تھے اور مذہبی زندگی، اخلاقی زندگی پر زور دیا جا رہا تھا اس وقت انھوں نے ''امراؤ جان ادا'' جیسا ناول لکھ ادب کو بالکل نئے انداز سے روشناس کرایا۔ انھوں نے ایک طوائف کی اس درد بھری کہانی کو موضوع بنایا جس کو کوٹھے پر تو سبھی جاتے تھے مگر اپنی قلم کی پہونچ سے دور رکھتے تھے۔ انھوں نے اس ناول میں امیرن نامی اس طوائف کا اتنی دردمندی سے ذکر کیا ہے کہ وقت اور حالات کی ستم ظریفیوں نے اسے طوائف بنا دیا۔ اس ناول میں لکھنؤ کا پورا معاشرہ جیتا جاگتا دکھائی دیتا ہے۔ یہ ناول اہل لکھنؤ کی تہذیبی وثقافتی زندگی کا بہترین مرقع ہے۔

مرزا رسوا ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے اور مشرقی علوم وفنون سے واقف تھے۔ انھوں نے اپنے سیکولر فلسفیانہ عقلی نقطۂ نظر کی بدولت ہمیشہ انسانیت کا درس دیا۔ ناول پڑھتے ہوئے اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ امیرن صرف ایک طوائف نہیں ایک انسان ہے، اس کے دل میں بھی جذبات ہیں اور اس کو دکھ درد کا احساس ہوتا ہے۔ اس ناول نے اردو ناولی نگاری کی دنیا میں بہت سی تبدیلیاں پیدا کیں۔

انگارے کا موڑ وہ موڑ ہے جہاں سے اردو فکشن کا رخ بدلتا ہے۔ اسے ایک نیا راستہ ملتا ہے۔ اس سفر

---

[2]: عبدالحلیم شرر بہ حیثیت ناول نگار۔ علی احمد فاطمی۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی۔ 2007۔ ص 197

میں کچھ انقلابی نوجوان شامل ہوتے ہیں۔وہ اپنے انقلابی خیالات اور باغیانہ تیور سے اردو فکشن میں ایک نیا رنگ و آہنگ ، نئے نئے موضوعات کو داخل کرتے ہیں۔''انگارے'' دراصل ایک کتاب کا نام ہے جس میں سجاد ظہیر، رشید جہاں، محمود الظفر اور احمد علی کے افسانے شامل ہیں ۔ یہ سارے لکھنے والے انقلابی قسم کے نوجوان ہیں جن کے خیالات بالکل نئے ہیں جن کا انداز باغیانہ ہے۔ان کی کہانیوں میں معاشرے کے ان پہلوؤں کو موضوع بنایا گیا ہے جن کو شجر ممنوعہ سمجھا جاتا تھا۔جن کا ذکر تک زبان پر لانا معیوب سمجھا جاتا تھا۔

اس موڑ نے اردو افسانے میں بے باکی کی راہ پیدا کی اور لکھنے والوں کے اندر اخلاقی جرأت کا جذبہ بیدا کیا۔افسانوں کا یہ مجموعہ سماج کی فرسودہ روایتوں، بوسیدہ قدروں اور مصالحت پسندانہ تحریکوں کے خلاف کھلا احتجاج تھا۔اس لیے''انگارے'' کی اشاعت نے معاشرے میں اتھل پتھل مچا دی تھی۔اس مجموعے نے لوگوں کے ذہنوں میں ہیجان پیدا کر دیا اس کا اثر اتنا شدید ہوا کہ اس وقت کے عالموں اور دانشوروں کے دلوں میں احتجاج کی لہر پیدا ہوئی اور مذہبی طبقے کی طرف اس مجموعہ کی کاپیاں جلائی گئیں۔اس کی اشاعت نے جہاں ایک طرف یہ ثابت کر دیا کہ قدیم ادب دور حاضر کی صحیح اور سچی عکاسی کرنے سے معزور ہے وہیں دوسری طرف نوجوان ذہنوں کی خلش اور انقلابی قدروں کی لہر کو تیز کر دیا۔کھوکھلے عقیدوں غیر انسانی روایتوں اور بدعتوں، مذہبی اجارہ داروں کے خلاف لب کشائی نظر آنے لگی۔وقار عظیم رقم طراز ہیں:

> ''''انگارے'' مغرب کے فن اور مشرق کی زندگی کے چھوٹے بڑے بہت سے اہم مسائل کا فنی امتزاج ہے۔''انگارے'' کی کہانیوں میں ہندوستان کی مذہبی، سماجی اور سیاسی زندگی اور ان سب کی پیدا کی ہوئی عجیب غریب شخصیتوں اور ذہنوں کی تیکھی تصویریں ہیں جن میں رورعایت کہیں نہیں اور آزادی اور بے باکئ خیال ہر جگہ ہے۔۔۔موضوع کے لحاظ سے اس سے پہلے اردو کے افسانوں میں اتنی صاف گوئی اور بے باکی کہیں نہیں ملتی اور نہ فن کے لحاظ سے اتنی نازک پیچیدگیاں''انگارے'' کے افسانہ نگاروں نے ہندوستانیوں کی مختلف جماعتوں کے راسخ عقیدوں کے خلاف ایسی باتیں کہیں جنھیں کہنے میں لوگ اب تکلف اور جھجھک محسوس کرتے تھے۔لوگوں نے اب تک اپنی زندگی کے جن پہلوؤں کو دیکھ کر دیدہ دانستہ ان کی طرف سے چشم پوشی اختیار کر رکھی تھی۔''انگارے'' کے افسانہ نگاروں نے فنی جسارت سے کام لے کر ان پر روشنی

ڈالی۔''3؎

''انگارے'' ادب میں شعلہ کا باعث بنا اور اس نے روایتی اور پرانے طرز کو جلا کر خاک کر دیا اور ایک نئی روش کی ابتدا ہوئی۔ جس کی وجہ سے ادب میں نئے نئے موضوعات کو دخل ملا اور تنوع پیدا ہوئے اگر چہ افسانے اور ڈرامے فنی اعتبار سے کمزور تھے مگر موضوعاتی اعتبار سے ذہن و دل میں چنگاری کا باعث بنے اور پھر ایک ایسی روایت چل پڑی جہاں ادیب اور تخلیق کاران تمام مسائل کو ادب میں پیش کرنے لگے جو ابھی تشنہ تھے غرض ''انگارے'' کی اشاعت نے اردو ادب کے پردے پر ان تمام داغ اور دھبوں کو دکھا دیا اور جو مسائل و موضوعات عام زندگی سے جڑے ہوئے تھے ان کا بیان کرنا شروع کر دیا۔

تیسرا موڑ:

اردو افسانوی سفر کا تیسرا موڑ وہ مقام ہے جہاں سے ترقی پسند یدیت شروع ہوتی ہے۔ یہ ترقی پسند یدیت با قاعدہ ایک تحریک کے ذریعہ شروع کی جاتی ہے جس کی بنیاد 1935ء میں پڑی ہے۔ ہندوستانی طلبہ کا ایک مختصر گروپ پیرس میں ہونے والی ایک کانفرنس میں شامل ہوتا ہے اور اس کانفرنس کی سرگرمیوں سے اس حد تک متاثر ہوتا ہے کہ وہ ایک ادبی تنظیم کی بنیاد ڈال دیتا ہے۔ اس تنظیم کا نام انجمن ترقی پسند مصنفین رکھا جاتا ہے۔ اس حلقے میں جو طلبہ پیش پیش رہے اس میں سجاد ظہیر، ڈاکٹر محمد دین تاثیر، محمد علی، ڈاکٹر ملک راج آنند، ڈاکٹر جیوتی گھوش کے نام قابل ذکر ہیں۔

اس تحریک کی بنیاد ایک صحت مند ادب کی تشکیل کے لیے رکھی گئی جہاں داستانوں کے مافوق الفطری عناصر کے خلاف احتجاج تھا وہیں سماجی اور معاشرتی اصلاح بھی تھا جس سے ایک ایسا ہندوستان تعمیر ہو جو استحصال سماجی نابرابری اور ذہنی غلامی کے خلاف کام کرنا تھا۔ اس تحریک کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے سجاد ظہیر فرماتے ہیں:

> ''ترقی پسند تحریک کا رخ ملک کی عوام کی جانب، مزدوروں، کسانوں اور درمیانہ طبقے کی جانب ہونا چاہئے۔ ان کو لوٹنے والوں اور ان پر ظلم کرنے والوں کی مخالفت کرنا، اپنی ادبی کاوش سے عوام میں شعور، حرکت، جوش عمل اور اتحاد پیدا کرنا اور ان تمام آثار و رجحانات کی مخالفت کرنا جو جمود، رجعت اور پست ہمتی پیدا کرتے ہیں۔ ہم شعوری طور

3؎ نیا افسانہ۔ وقار عظیم۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ۔ 1982۔ ص 60

پر اپنے وطن کی آزادی کی جدوجہد اور وطن کے عوام کی حالت سدھارنے کی تحریکوں میں حصہ لیں۔ صرف دور کے تماشائی نہ ہوں بلکہ حتیٰ المقدور اپنی صلاحیتوں کے ،مطابق آزادی کی فوج کے سپاہی بنیں۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ ادیب کے دل میں نوع انسان سے انس اور گہری ہمدردی ضروری ہے بغیر انسان دوستی، آزادی خواہی اور جمہوریت پسندی کے ترقی پسند ادیب ہونا ممکن نہیں۔''4

پریم چند ترقی پسند تحریک سے قبل ہی افسانہ لکھ رہے تھے اور ان کے افسانے مختلف ہندوستانی مسائل کی عکاسی بھی کرتے تھے۔ پریم چند کا نام تخلیقی دنیا میں اہمیت کا حامل ہے۔ پریم چند کی تخلیقی زندگی کا آغاز سجاد حیدر یلدرم، نیاز فتحپوری، مجنوں گورکھ پوری کی رومان پرور فضا سے مرغوب نظر آتا ہے اور ان کے ابتدائی دور کے افسانوں میں داستانوی، رومانی انداز رومانی فضا اور مثالی اسلوب کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ لیکن جلد ہی انھوں نے دیہی مسائل، دیہی زندگی، مظلوم و مجبور اور بے کس، بے بس کسانوں کی طرف اپنی توجہ مرکوز کر دیا اور ایک نئے سماج کی تشکیل کی اولین کوشش کی۔ پریم چند کے یہاں دیہات وقصبات کے قدرتی مناظر بکھرے ہوئی دکھائی دیتے ہیں۔ پریم چند کے یہاں اصلاحی اور حقیقت پسندانہ مثالی افسانے ملتے ہیں۔ پریم چند کے بعد سے ہی ان کے طرز تخلیق جیسا افسانہ لکھنا فیشن بن گیا۔ اور ایک تخلیق کاروں کا ایک کارواں ان کے نظریہ محکوم و مزدور و کسان کی پیروی کرنا نظر آتا ہے۔ پریم چند کی افسانہ نگاری پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر صغیر افراہیم لکھتے ہیں:

''پریم چند نے دیہی زندگی کو قریب سے دیکھا تھا۔ وہ اُن کے مسائل کو سمجھتے تھے۔ زمینداری نظام، کچلے ہوئے پسماندہ کسان، سسکتے ہوئے ہریجن، عہد قدیم سے رائج ذات پات کی تفریق مروجہ رسوم، تعلیم کی کمی اور ان کے تعلق سے پیدا ہونے والے مسائل اور وہ استحصال جو برسہا برس سے طاقتور کمزور کے ساتھ روا کئے ہوئے تھا۔ یہ سب پریم چند پر عیاں تھے۔ ان موضوعات کو اپنی گرف میں لیتے ہوئے پریم چند برابر افسانے لکھتے رہے اور دیہی آبادی کے کوائف اور ان کی نفسیات سے متعارف کراتے رہے۔''5

پریم چند کے موضوعات کا غیر معمولی تنوع پایا جاتا ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں زمینداروں،

4: روشنائی۔ مرتب نجمہ ظہیر باقر علی باقر۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی۔ 2013۔ ص 79-78

5: اردو افسانہ ترقی پسند تحریک سے قبل۔ صغیر افراہیم۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ۔ 2009۔ ص 47

پنڈتوں، مذہبی ٹھیکیداروں کے استحصال، مہاجنوں زمینداروں کے ظلم وجبر اپنے زمانے کے دلتوں نچلے طبقوں کی حالت زار کے ساتھ دیہی عورتوں کی سماجی اور گھریلو زندگی کی بےبسی مجبوری، جنسی وذہنی مسائل کی عکاسی ملتی ہے ان کے یہاں بیوہ عورتوں کی ناگفتہ صورت حال، طوائفوں کی تنگ وتاریک زندگی کا نہایت باریکی سے بیان ملتا ہے۔ ان کے یہاں نہ صرف کسانوں کی مجبوریاں محکومیاں نہیں دکھائی دیتی بلکہ کسانوں اور مزدروں کی کام چوری اوران کی فطرت، ان کے مکروفریب، جھوٹ اور دھوکہ بازی کا بھی بیان ملتا ہے جس کی سب سے بہترین مثال ان کا لافانی افسانہ ''کفن'' میں ملتی ہے۔

ادب کے پریم چند ایک ایسے رہنما کی طرح تھے جن کی بدولت ادب ان عظمتوں اور بلندیوں کو حاصل کیا جس کی ایک زمانے سے ضرورت تھی۔ انھوں نے مافوق الفطری اور داستانی فضا سے ادب کو نکالا اور ادب میں غریب مزدور بےبس لوگوں کو داخل کیا۔ ان کے منشا ومقصد سماج کے ہر انسان کو ساری حقوق اور عزت کی زندگی دینا تھا۔

اردو ادب کی لامحدود کائنات میں ایک نمایاں نام سدرشن کا ہے۔ انھوں نے اپنے سماج اور معاشرے کی سچی تصویر ادب کے ذریعہ پیش کرنے کی کوشش کی۔ ان کے یہاں بھی سماج اور معاشرے کو بہتر بنانے کی سعی نظر آتی ہے غربت، افلاس، بھوک، رسم ورواج، غیر اخلاقی باتوں، سماج کی برائیوں کو افسانے کا موضوع بنایا۔ سدرشن کے یہاں دیہی زندگی کے علاوہ شہری زندگی کی بھی عکاسی نظر آتی ہے۔ روزمرہ کے جیتے جاگتے کرداروں کے ذریعہ ایک صحت مند معاشرے کی تشکیل کی کاوش کا اظہار ملتا ہے۔ ان کے افسانو پر اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر سید اعجاز حسین لکھتے ہیں:

> ''سب سے پہلی چیز جو سدرشن کے افسانوں کو طلسم تاثیر بنادیتی ہے۔ وہ روداد قصہ ہے۔ واقعات کو اس طرح ترتیب دیتے ہیں ہر ایک قدم پر اشتیاق بڑھتا جاتا ہے کہ اب اس کے بعد دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ اور یہ خصوصیت روداد کی پیچیدگی سے نہیں پیدا ہوتی بلکہ واقعہ یا ماجرا کا انتخاب اتنا دلچسپ ہوتا ہے کہ باوجود سادہ ہونے کے بھی دلوں پر ہر وقت ان کا قبضہ رہتا ہے۔'' 6

اعظم کریوی کا نام ان افسانہ نگاروں کی فہرست میں شامل ہے جو اپنی ملازمت کے ساتھ دنیا جہاں کو

6: مختصر تاریخ ادب اردو۔ سید اعجاز حسین۔ اعجاز پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی۔ 1964۔ ص 252

قریب سے دیکھتے ہیں اس کا مشاہدہ کرتے ہیں اور پھر اپنی قلم کے ذریعہ صفحہ قرطاس پر لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اعظم کریوی فوجی ملازمت کے دوران مختلف علاقوں میں گزر بسر کیا اور پھر اس زندگی کے واقعات و حادثات عوام کے دکھ درد، مصیبتوں کے تلخ وشیریں تجربات کو پیش کرنے کی اچھی کوشش ان کے تخلیقات میں دکھائی دیتی ہیں۔

اعظم کریوی نے جاگیردارانہ نظام کی غیر مساویانہ سلوک، غیر ملکی سامراجیت، ناانصافی، نابرابری، ظلم و ستم کو بے نقاب کیا۔ اعظم کریوی کے افسانوں میں بے بس اور لاچار، مجبور کسانوں مزدوروں کا دکھ درد دیکھنے کو ملتا ہے۔ ان کے افسانوں کے کردار اتنے سادہ معصوم اور بھولے بھالے ہوتے ہیں کہ آسانی سے سرمایہ داروں اور زمینداروں کے دام میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ ساتھ ہی آپس میں ہی لڑائی جھگڑا کرنا ہر ایک بات پر بحث ومباحثہ کرنا ان کی خصلت ہوتی ہے چھوٹی چھوٹی باتوں پر فرقہ وارانہ فسادات ہو جانا دکھائی دیتا ہے اور پھر خود کی غلطی اور پانے کئے کی سزا پانا ان کی عادت ہے۔ اعظم کریوی کو شہر سے زیادہ دیہات کے مناظر متوجہ کرتے ہیں اور ان کی روح سرسبز اور شادانی عطا کرتے ہیں۔ اعظم کریوی اپنی تخلیقات کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ’’’’جب دل پر چوٹ لگتی ہے یا دل کسی نظارے سے متاثر ہوا تو میں افسانہ لکھنے بیٹھ جاتا ہوں... یہ صورت شہر سے زیادہ جب میں کبھی دیہات میں رہتا ہوں تب پیش آتی ہے۔ سرسبز لہلہاتے کھیت، دریا کا کنارہ اور دیہاتیوں کی معصوم زندگی میرے دل پر خاص اثر کرتی ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ میرے افسانے زیادہ تر دیہاتی معاشرت کے آئینہ دار ہوتے ہیں...‘‘ 7

اعظم کریوی کا مقصد اصلاحی اور اخلاقی معاشرے کی تشکیل کا ہے اور انھوں نے بھی ایک ایسے موضوعات کو پیش کیا جو ادب میں رائج تھا۔ دیہات کے ان کے افسانے مشاہدہ اور باریک بینی کی عمدہ مثال نظر آتے ہیں۔ اعظم کریوی کے افسانوں کے بارے میں انور سدید رقم طراز ہیں:

> ’’اعظم کریوی کے یہاں دیہات ایک خود کفیل کائنات ہے۔ بلاشبہ یہ دیہات غربت اور افلاس کی آمگاہ ہے۔ لیکن یہ اپنی تن پروری کے لئے شہر کا رخ نہیں کرتا اور اندرون

7: بحوالہ اردو افسانوں میں دیہات کی پیش کش۔ انور سدید۔ اردو رائٹرس گلڈ، الہ آباد۔ 1997۔ ص 52

دیہات ہی اپنی قسمت آزمائی کرتا ہے۔اس زاویے سے دیکھئے تو اعظم کریوی نے
دیہات کی دروں بینی کا زاویہ پیش کیا ہے۔'' 8

علی عباس حسینی اردو کے بزرگ افسانہ نگار کی طرح نظر آتے ہیں اور ناول کے نقاد کے طور پر بھی ابھرتے ہیں۔ان کی بھی زندگی دیہاتی اور قصباتی ماحول میں بسر ہوئی۔ جہاں کے منفرد مسائل سے ان کا سابقہ پڑا اوران کے یہاں دیہات کی زندگی کے واقعات، چوپال کے مختلف حادثات، رسم ورواج، روایات کی مختلف قسمیں۔ تیج وتہوار کے مناظر نظر آتے ہیں۔ان کے یہاں بھی مقصدیت اور اصلاحی نقطۂ نظر نظر آتا ہے۔محکوموں اور مزدوروں کی طرفداری کا بیان اور زمینداروں اور جاگیرداروں کی سختی پر ان کو لعنت اور ان کے ظالمانہ استحصالی رویہ کی مذمت کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔

علی عباس حسینی کا ایک اچھا افسانہ ''میلا گھومنی'' ہے۔ یہ افسانہ ان کے بیشتر افسانوں سے مختلف ان کے ناصحانہ انداز سے منفرد نظر آتا ہے۔اس افسانے میں ایک بنجارہ کی جنسی نا آسودگی کی داستان بڑے دل چسپ انداز میں نظر آتی ہے اوراس جنسی نا آسودگی کا بیان بہت واضح انداز میں دکھائی دیتا ہے۔ یہ بنجارن کئی مردوں سے شادی کرتی رہتی ہے اورلڑائی جھگڑے کرتی ہے ساتھ ہی اپنے شوہروں کی بھی عزت نہیں کرتی ہے ان کا مقابلہ کرتی ہے اس کے آنے سے پورے گھر کا سکون وچین تباہ ہوجاتا ہے۔ یہ بنجارن عجیب قسم کی عورت ہے آخر ایک دن لاپتہ ہوجاتی ہے اور کچھ لوگوں کو ایک میلے میں کسی دوسرے مرد کے ساتھ دکھائی دیتی ہے۔اس افسانے میں حسینی صاحب نے عورت کے بالکل الگ روپ کا بیان کیا ہے۔علی عباس حسینی کے دوسرے افسانوں میں منفرد موضوعات نظر آتے ہیں۔ درد وغم اپنے دل کی کسک کو افسانوں میں شامل کیا ہے۔علی عباس حسینی کے افسانوں پر وقار عظیم نے کچھ اس طرح اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے:

''علی عباس حسینی کے دردمند دل نے دیہات کی زندگی میں درد وغم کے انگنت موقع تلاش کر لئے۔ اور اس میں اپنے دل کی تڑپ وکسک اور درد وغم کے تاثر کو شامل کر کے دوسروں کو بھی اپنا شریک غم بنایا ہے۔حسینی نے پریم چند کی ڈگر پر چل کر دیہاتوں کی گلی کوچوں میں پہنچنا سیکھا اور اپنی باریک بین نظروں سے وہ مناظر دیکھے جو پریم چند کی نظر سے بھی پوشیدہ تھے۔انھوں نے اپنے ماحول کے دل کی دھڑکن صرف سنی ہی بلکہ محسوس

8: بحوالہ اردو افسانوں میں دیہات کی پیش کش۔انور سدید۔اردو رائٹرس گلڈ، الہ آباد۔1997۔ص 52

بھی کی ہے۔اس لئے ان کے دائرہ قلم کا مرکز شعوری یا تحت الشعوری طور پر متعین ہو چکا ہے۔زمین دار کا ظلم اور رعایا کی مصیبت علی عباس حسینی کے افسانے، کسانوں غریبوں، مزدوروں اور بے سہارا انسانوں کی زندگی کی ترجمانی کرتے ہیں۔انھوں نے گاؤں کی پرلطف زندگی کو بڑے خوبصورت انداز میں پیش کیا۔'' 9

اختر حسین رائے پوری کا تعلق بھی ترقی پسند نظریے تخلیق کا اظہار ہے۔ان کے یہاں ایک خاص طرح کا گھن گرج اور بلند آہنگ دکھائی دیتا ہے۔ظلم کا انتقام،مظلوموں اور محکوموں کو اپنے قلم سے جگانے کی کوشش نظر آتی ہے۔ان کے افسانوں میں ان کا جوش جذبہ اُبل اُبل کر سامنے آتا ہے۔ساتھ ہی یہ بلند آہنگ یہ ڈانٹ، پھٹکار دیہات کے ان پیچیدہ مسائل پر بھی پڑتی دکھائی دیتی ہے جہاں ضیعف الا اعتقادی ہے، جہالت ہے اور حرص وہوس، مال ودولت، زر اور زمین کی ہے۔

اختر حسین رائے پوری کے یہاں سیاسی زندگی کے مسائل بھی نظر آتے ہیں۔ جہاں سیاسی لیڈر نام نہاد نیتا لوگ کسی طرح غریبوں مزدوروں کا استحصال کرتے ہیں اور انھیں اپنے جھوٹے وعدوے،مکر وفریب کے الفاظ کے ساتھ انھیں چھلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ان کے افسانوں میں ہندوستان کی بدلتی صورت حال اور سیاسی انقلاب کی آہٹ سنائی دیتی ہے۔اختر حسین رائے پوری ایک زمانے تک ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہے اور اشتراکیت کے پرچار و پرسار میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔مگر کچھ وقت کے بعد اس تحریک سے علیحدگی اختیار کر لی اور قیام پاکستان کے بعد ہجرت کر گئے اور لکھنا بھی ترک کر دیا۔اختر حسین رائے پوری کے بارے میں سید اعجاز حسین لکھتے ہیں:

''ایک خاص بات جو اُن کو رومانی قسم کے ترقی پسند ادیبوں کی صف میں ممتاز کرتی ہے یہ ہے کہ وہ عام ادیبوں اور شعراء کی طرح، ہماری روح میں تسکین اور خواب کا عنصر نہیں آنے دیتے بلکہ اس کو مضطرب، بےچین اور تڑپتا ہوا چھوڑ دیتے ہیں،جس سے ہمارے دلوں میں موجودہ نظام کی خرابیوں کا صحیح احساس پیدا ہو جاتا ہے۔ان کی مفکرانہ طرز تخیل افسانہ پڑھنے والوں کو خاص طور پر متاثر ومرعوب کرتی ہے۔جس کے سبب بعض وقت روانی کا فقدان معلوم ہونے لگتا ہے۔اُن کے افسانوں کا مجموعہ ''محبت اور نفرت'' کے

9: نیا افسانہ۔وقار عظیم۔ایجوکیشنل بک ہاؤس،علی گڑھ۔1982۔ص 199-198

مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ بعض اوقات افسانوں کی طرز نگارش مضمون اور مقالہ نگاری سے متصل ہو جاتی ہے۔اور اُن کے افسانے اصول افسانہ نگاری سے ذرا بھٹکے ہوئے نظر آتے ہیں۔''10؎

سہیل عظیم آبادی کا تعلق بہار سے تھا اس لیے ان کے افسانوں میں بہار کی دیہاتی زندگی کی چلتی پھرتی دکھائی دیتی ہے۔سہیل عظیم آبادی کے افسانوں کا موضوع دیہات وقصبات میں ہونے والی قدرتی تباہیوں، آفتوں اور معاشی زندگی کی تنگ حالی اور بدحالی ہے۔

سہیل عظیم آبادی کے افسانوں میں انسانی رشتوں کا بیان ایک دوسرے کے جذبات اور گھریلو زندگی کے مختلف واقعات کا بیان ملتا ہے۔ساتھ ہی زندگی کی تلخیوں، نا اتفاقیوں، آپسی رنجشوں کا ذکر بھی گہائی اور گیرائی سے دکھائی دیتا ہے۔ان کے دیہات وقصاب اپنے منفرد رنگ کے ساتھ نظر آتا ہے۔کسانوں اور مزدوروں کی دکھ بھری زندگی، فکر معاش جیسے بنیادی مسائل کی عکاسی نظر آتی ہے۔

سہیل عظیم آبادی کا مشہور افسانہ'' الاؤ'' ہے جہان دیہات کے مناظر کے ساتھ کسانوں اور زمینداروں کے مابین تصادم کی کہانی ملتی ہے جہاں ایک طرف زمیندار ہیں اور پرانے خیالات اور مذہبی نظام سمجھتے ہوئے ان کے حامی نظر آنے والے لوگ مگر اسی دیہات کے کچھ نوجوان نسل ایسی ہے جو زمینداروں سے خوف نہیں کھاتی ہے بلکہ ان کا مقابلہ کرنے کی ہمت وقوت رکھتی ہے۔اس افسانے میں نئ نسل کے لوگ زمینداروں کے ظلم وستم کے خلاف آواز اٹھاتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔سہیل عظیم آبادی کے قبیل کے لکھنے والوں کا رنگ وآہنگ دھیرے دھیرے تبدیل ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ان کے یہاں روایتی افسانوں کے موضوعات میں بھی تبدیلی ہوتی ہے۔موضوعاتی تنوع بھی نظر آتا ہے۔سہیل عظیم آبادی نے زمینداروں کے ظلم کے ساتھ کسانوں کی فطری کمزوریوں کو بھی نشانہ بنایا۔ان کی جہالت لاعلمی اور غلامانہ ذہنیت، غلطیوں اور کوتاہیوں کا بھی کھلےلفظوں میں ذکر کیا۔

اوپندر ناتھ اشک کا نام افسانوں کے علاوہ ڈرامہ نگاری کے سلسلے میں بھی لیا جاتا ہے۔اشک کا انداز بھی اپنے پیش رووں کی طرح ہے مگر ان کے یہاں ناصحانہ انداز صاف طور پر دکھائی دیتا ہے۔اشک کے افسانوں کے موضوعات چھوٹے گاؤں۔کھیت کھلیان میں بسنے والے بھولے بھالے کسانوں کی سادہ اور

10؎ مختصر تاریخ ادب اردو۔سید اعجاز حسین۔اعجاز پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی۔1964۔ص264

عام زندگی کا عکاس ہے۔اشک کے یہاں سیاسی تحریکوں کے علاوہ آزادی کے وقت پیدا صورت حال بھی نظر آتی ہے۔ان کے افسانوں میں سماجی نا برابری، ظلم و استحصال، محکومی اور غلامی، عورت کی بے بسی اور بے چارگی کی داستان بھی سنائی دیتی ہے۔اشک نے اپنے ترقی پسند نظریے کو ان الفاظ کے ذریعہ پیش کیا ہے:

''''ترقی پسندی کسی مزدور یا کسان یا بیوہ یا کسی دوسرے پسماندہ شخص کا قدرے عریاں نقشہ پیش کر دینے تک ہی ختم نہیں ہوجاتی۔ نہ ہی افسانے میں دو چار دیدہ دانستہ لکھی ہوئی گالیاں یا کراہیت پیدا کرنے والے مناظر کا ذکر اسے ترقی پسند بناتا ہے۔ درحقیقت کسی افسانے کا ترقی پسند یا رجعت پسند ہونا مصنف کے اپنے نقطۂ نظر پر منحصر ہے۔ جسے سامنے رکھ کر وہ افسانہ لکھتا ہے یا جو اس کے افسانہ سے اخذ کیا جا سکتا ہے۔''[11]

''قفس'' اشک کی لکھی ہوئی ایک علامتی طرز کی کہانی ہے۔اس کہانی میں طبقاتی کش مکش، سرمایہ داری نظام اور عام افسانوں کے مابین جو فرق ہے اس کو پیش کرتی ہے۔اپندر ناتھ اشک نے ترقی پسندی نظریہ، اقتصادیات کے تحت اس کہانی کو لکھا ہے۔

تیسرے موڑ کے تحت یعنی ''انگارے'' کے بعد ترقی پسند تحریک کے زیر سایہ افسانہ لکھنے والوں کی ایک لمبی فہرست ہے جہاں نئے انقلابی خیال کی ایک پوری نسل فکشن کے آسمان پر طلوع ہوتی ہے اور اپنے موضوعات کے تنوع کے ساتھ ادبی افق پر ستارے کے مانند اپنی چمک بکھیر دیتی ہے۔جن میں نمایاں نام کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، عزیز احمد، خواجہ احمد عباس وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ان سبھی کا اپنا اپنا رنگ و آہنگ ہے اگرچہ یہ سبھی ترقی پسند مصنفین قرار دیئے جا سکتے ہیں مگر ان سبھی کے یہاں ایک مخصوص نظریۂ حیات و کائنات ہے جن کو وہ اپنے قلم سے سجاتے اور سنوارتے ہیں اور اردو ادب کے دامن کو رنگین بناتے ہیں۔

کرشن چندر کا موضوع فطرت نگاری ہے وہیں اس فطرت نگاری کی عکاسی میں انسان کے دکھ درد کے ایک ایک جزئیات کو بیان کرتے ہیں۔کرشن چندر کے یہاں حیات انسانی کے بنیادی مسائل اپنے رومانی رنگ کے ساتھ موجود ہے۔جن کو پڑھنے میں قاری کو نیا احساس ہوتا ہے وہیں فکری سطح پر احساس و ادراک کی

11: کونپل اور دوسرے افسانے۔اوپندر ناتھ اشک۔مکتبہ اردو لاہور۔1940۔ص36

نئی نئی منزلوں سے دوچار ہوتا ہے۔ ''دادر پل کے بچے'' جیسا افسانہ کرشن چندر کے ذہنی شعور کی ایک عمدہ مثال ہے جہاں اس نے انسانیت کے اس منظر کو پیش کیا ہے جو ننگا بھوکا اور پھٹے حال ہے جن کا ماضی بھی اندھیرے اور گندگی سے بھرا ہوا اور مستقبل بھی روشن دکھائی نہیں دیتا اور شاید اس منظر کو تبدیل کرنے کے لئے ایک نئی دنیا کی ضرورت پڑے کیونکہ ان کی حالت کو بدلنا اس جہاں میں ممکن دکھائی نہیں دیتا ہے۔

عزیز احمد کرشن چندر کے اس حساس بیانیہ اور ان کے مظلوم انسانوں کے تئیں ہمدردی اور ان کی ترقی پسندی کے تئیں پختہ شعور کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''تمام ترقی پسند ادیبوں میں کسی کا نام اس قدر توصیف اور عزت کا مستحق نہیں جتنا کرشن چندر جی کا ہے۔ اس کی وجہ ان کی بے لوث یا خلوص انسانیت ہے جو ان کی تحریر سے مترشح ہے اسی پر ان کے تخئیل اور ان کے فن کی بنیاد ہے۔ اس انسانیت کی وجہ سے ترقی پسندی کبھی دل آزاری نہیں کرتی۔ وہ دلوں میں اتر کر اپنا کام کرتی ہے۔ سب کو متاثر کرتی ہے لیکن کسی کا دل نہیں دکھاتی۔ یہ خصوصیت ترقی پسند ادیبوں میں شاید ہی اور کسی میں پائی جاتی ہو، یہ ایک خداداد نعمت ہے، ایک طرح کی بے غرض نفسیاتی کیفیت ہے۔
>
> اس انسانیت اور انسان پرستی کی وجہ سے کرشن چندر کے دل میں مظلوم انسان سے ہندردی کی بنیاد ایک طرح کی روحانیت اور فطرت پرستی ہے۔'' 12

سعادت حسن منٹو نے ادب میں ایک نئے طرز تحریر کے مطابق ایسی افسانے لکھے جو نہایت دل چسپی سے پڑھے گئے اور سب سے زیادہ موضوع بحث بنے۔ منٹو سے پہلے ادب میں جنس کا بیان اس طرح سے نہیں ملتا تھا جیسا کہ انھوں نے کہا بے لاگ اور بے خوف ہو کر انھوں نے جنس کا ایسا بازار گرم کیا کہ انسانی فطرت کے چھپے ہوئے امراض باہر آنے لگے۔ شجر ممنوعہ جیسے واقعات پہلی بار لوگوں نے افسانے کی شکل میں پڑھنا شروع کیا اور غور کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ شجر ممنوعہ صرف لذت کے لیے نہیں ہیں بلکہ اس کے پیچھے حیات انسانی کی ایک لمبی داستان ہے۔ یہاں بھی بحث ومباحثے کی ہزاروں گنجائش موجود ہیں۔ انسان کے شعور میں بہت سی کہانیاں پوشیدہ جو لاشعور کا حصہ بن گئی ہیں۔ '' کالی شلوار'' صرف ایک جنسی افسانہ ہی نہیں بلکہ اپنی تہذیب، اپنی روایت سے جڑے رہنے کی ایک ان کہی کہانی ہے جو ہمارے شعور ہماری فطرت میں

12: ترقی پسند ادب۔ عزیز احمد۔ رزّاقی میشن پریس، حیدرآباد، دک۔ مارچ 1945۔ ص 169

اتنی حد تک پیوست ہے کہ کوٹھے پر رہنے کے باوجود بھی محرم کا مہینہ آتے ہی کالے رنگ کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ منٹو کی یہی خصوصیت انھیں ترقی پسندوں میں ممتاز کرتی ہے۔ منٹو کی یہی حقیقت نگاری اور معاملات انسانی کی رنگارنگ تصویر فکر وخیال اوراحساس کی گہرائیوں تک اتر جاتی ہے اور منٹو ادبی حلقوں میں صرف جنس کے کاروبار کے لیے نہیں بلکہ حیات نفس انسانی کے نئے مزاج کے معمار کے لیے جانے جاتے ہیں۔ڈاکٹر محمد اشرف نے منٹو کی حقیقت نگاری پر خامہ فرسائی کچھ اس طرح کی ہے:

''منٹو کی بے لاگ حقیقت نگاری اور بے باکانہ بیان نے مختلف مکتبۂ فکر وخیال کے لوگوں کو ناراض کیا اور اپنی جدت طرازی کے ذریعہ ان پر کیے گئے ۔ گہرے طنز کے بدلے تمام عمر رسوائیوں کا سامنا کرنا پڑا،لیکن اپنے خلاف چلنے والی سرگرمیوں سے وہ کبھی نالاں نہیں ہوئے اور نہ ہی شکست خوردہ سپاہی کی طرح کبھی اپنی بیٹھ دکھائی بلکہ وہ اپنی روش پر رواں دواں رہے۔''13؎

ترقی پسندوں میں ایک ایسا نام جو جذبات نگاری سب سے بہترین پیش کش میں صف اول پر قائم ہے وہ راجندر سنگھ بیدی کا ہے۔انھوں نے ادب میں اپنے فکشن کے ذریعہ جذبات انسانی کی ہے مختلف شکلوں کو نہایت خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔انسانی کے ذہنی خیالات کا اتنا باریک اظہار بیدی کے فن کا خاص نمونہ ہے۔''اپنے دکھ مجھے دے دو'' یا پھر ''ایک چادر میلی سی'' ان کے فکشن میں جذبات انسانی کا کاروبار رواں دواں نظر آتا ہے۔ وقار عظیم بیدی کے فن امتزاجی پہلو پر اپنی ناقدانہ رائے کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

''بیدی کی جذباتیت اس سستے قسم کی جذباتیت سے بالکل مختلف ہے اس میں خطیبانہ جوش کی جگہ اس ہمدرد انسان کی سی نرمی اور دردمندی ہے اور شاعری کی گھلاوٹ۔اس میں اونچے اور فہم سے دور رہنے والے فلسفے اور کتابوں سے سیکھی ہوئی نفسیات کا جھوٹا سہارا نہیں یہ جذباتیت دنیا کے دکھ درد کو بھیانک بن کر پیش کرنا بھی نہیں جانتی،اسے اپنی دیکھی ہوئی ہر چیز کو کاغذ پر اگل دینے کا شوق بھی نہیں۔یہ جذباتیت تو دنیا کو اچھی اور بری چیزوں پر گہری نظر ڈالنے کی عادی ہے۔اسے ہر چیز کی اوپری سطح سے نیچے بہت دور گہرائی میں پہونچ جانے کی عادت ہے اور اس لیے اس کی پہچان اور اضطراب میں بھی

13؎ ترقی پسند تحریک اور اردو فکشن۔ڈاکٹر محمد اشرف۔ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،دہلی۔2014 ص 44

ہر جگہ سکون ہے۔

بیدی کی جذباتیت میں گہرائی اور سکون ہے اور اس گہرائی نے ان کے افسانے کو اُس کا موضوع بھی دیا ہے اور فن بھی۔''14؎

عصمت چغتائی کا نام ترقی پسند افسانہ نگاروں میں متوسط طبقے کی عورتوں کا باریکی سے اظہار بیان ہے۔عصمت نے گھریلو عورت کے مسائل نو جوان لڑکیوں کی نفسیاتی پیچیدگیوں اور جنسی ضروریات کو اپنے فن وفکر کا محور و مرکز بنایا ہے۔عصمت کے یہاں عورتوں کی زبان گھریلوں محاورے اور تمام پیچیدگیوں کا اظہار ملتا ہے۔جو ان سے پہلے کمیاب تھا۔عصمت نے گھریلو سچائیوں سے نقاب کشائی اور ان باتوں کا اظہار کیا جس کا ذکر کرنے سے لوگ کتراتے نظر آتے ہیں۔''لحاف''،''چوتھی کا جوڑا''،''ننھی کی نانی''،''دو ہاتھ'' مختلف انداز کی کہانیاں ہیں۔جنھیں عصمت نے بے باکی سے برتا ہے۔ان کے جہاں سماج کے فرسودہ نظام سے بغاوت نظر آتی ہے تو وہیں وہ ایسا نظام بھی چاہتی ہیں جہاں انسانی دکھوں کا مدّوا ہو سکے۔''چوتھی کا جوڑا'' ایک عام سا مسئلہ نظر آتا ہے مگر نہایت سنگین جو ابھی بھی چوں کا توں برقرار ہے۔اخلاقی قدروں کے پیچھے کسی طرح سے غریب لڑکیاں شکار ہو کر جوانی کی دہلیز پار کر جاتی ہیں اور سماج اور مذہب کے ٹھیکیداروں کو اس بات کا احساس نہیں ہوتا۔عصمت کے یہاں ہندوستان کی غریبی، مفلسی کا ذکر مختلف شکلوں میں نظر آتا ہے اور ان کی وجہ سے تمام انسانوں کو کیا کیا تکلیف اٹھانی پڑتی ہے۔ان سب کا خوبصورت بیان ملتا ہے۔عصمت چغتائی کے فکر وفن پر خلیل الرحمٰن اعظمی کا خیال ہے کہ

''عصمت چغتائی اردو افسانہ نگاری میں جو طرز تحریر اور جو موضوعات و مسائل لے کر آئیں وہ ایک نئے عنوان کی چیز تھی۔عورت کی زندگی اور اس کے جنسی مسائل کو یوں تو پہلے بھی ہمارے بہت سے افسانہ نگاروں نے برتا تھا لیکن ان افسانوں اور عصمت کی کہانیوں میں بنیادی فرق ہے۔عصمت ان مسائل کو عورت ہی کے زاویۂ نگاہ سے دیکھا ہے اور انھیں صرف بیان کرنے یا عمومی انداز میں اکسانے اور چھیڑنے کے بجائے انھیں محسوس کیا ہے۔''15؎

14؎:نیا افسانہ۔وقار عظیم۔ایجوکیشنل بک ہاؤس،علی گڑھ۔1982۔ص93-94

15؎:اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک۔خلیل الرحمٰن اعظمی۔ایجوکیشنل بک ہاؤس،علی گڑھ۔2015۔ص193

عصمت چغتائی فرسودہ مضامین اور روایتی اسلوب سے بدظن نظر آتی ہیں۔ان کے نگارشات کو پڑھ کر ایسا لگتا ہے کہ وہ اپنے نقطہ نظر اور اپنے فکر وخیال کے تحت لکھا پسند کرتی ہیں۔ بنائے گئے اصولوں کو توڑ نا، نئے راستے کی تلاش،حرکت وحرارت کا جذبہ خاص طور پر نمایاں نظر آتا ہے۔اس لیے وہ اپنی تخلیقات میں چلتی پھرتی دکھائی دیتی ہیں۔

عزیز احمد، احمد ندیم قاسمی، خواجہ احمد عباس، خدیجہ مستور، حیات اللہ انصاری، بلونٹ سنگھ، ترقی پسند افسانہ نگاروں کی فہرست میں اپنے اپنے مقام پر قائم ودائم ہیں۔ان تمام افسانہ نگاروں کے یہاں اپنا اپنا الگ رنگ نظر آتا ہے۔عزیز احمد جہاں جاگیردارانہ تہذیب کے بنیادی نقطہ کو بیان کرتے ہیں اوران کے آنگن کی مختلف پہلوؤں کی گرہ کشائی کرتے ہیں وہیں تقسیم ہنداور معاشی مشکلات کا خوبصورت بیان ان کے یہاں ملتا ہے اس کے ساتھ ہی جنسی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر بھی باریکی سے نظرڈالی ہے۔

احمد ندیم قاسمی کے یہاں پنجاب کے دیہات کی منظرکشی،معاشی اور معاشرتی مصیبتوں اور پریشانیوں کے ذکر سے اپنے فن کو رنگ وروغن بخشا ہے۔قاسمی کے یہاں خوبصورت رومانی فضا اور سحر آمیز نشہ قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔

حیات اللہ انصاری کے یہاں حقیقت نگاری کا بے لاگ اظہار ملتا ہے طبقاتی کش مکش اور سماجی اور سیاسی زندگی کی سفاک حقیقتوں کا سامنا گہری معنویت کے ساتھ موجود ہے۔حیات اللہ انصاری کی صحافتی زندگی نے انھیں زندگی بدلتے ہوئے سماج کی ان سچائیوں سے روبرو کرایا جن سے عام انسان دور ہے۔ انصاری نے اپنے مشاہدے اور مطالعے کو اپنے فن میں باریکی سے پیش کیا ہے۔

خدیجہ مستور، بلونت سنگھ،خواجہ احمد عباس کے یہاں بھی زندگی اور حیات انسانی کی مختلف جہتوں کا ذکر ملتا ہے۔آل احمد سرور ’’ترقی پسند تحریک پر ایک نظر‘‘ پر نظر ڈالتے ہوئے ترقی پسند تحریک کے زیر سایے لکھنے والوں پر مختصر مگر جامع خیالات کا اظہار کرتے ہیں:

> ’’میرے خیال میں بیدی، کرشن چندر، عصمت، منٹو، اختر انصاری، اختر اورینوی، حیات اللہ انصاری، حسینی اور عسکری اس دور کے بہترین افسانہ نگار ہیں۔ بیدی سب سے اچھا فنی احساس رکھتے ہیں۔اس کے افسانے ہیرے کی طرح ترشے ہوئے ہوتے ہیں۔ کرشن چندر اپنی خطابت اور جذباتیت کے باوجود فضا پیدا کرنے میں جواب نہیں

رکھتا۔عصمت کے یہاں حیرت انگیز قوت، قدرت اور شدت ہے، نوجوان لڑکیوں کی نفسیات اور متوسط طبقے کے خاندانوں کی بظاہر پرسکون زندگی کے ہنگاموں کی عصمت سے پہلے کسی کو خبر نہ تھی، اس دنیا میں کیا کچھ نہیں ہوتا اور منٹو کے کئی افسانے باوجود ایک خطرناک میلان کے اردو کے بہترین افسانوں میں شمار ہوں گے۔ان میں ''نیا قانون''، ''ہتک''، ''کالی شلوار''، ''دھواں'' ضرور شامل ہوں گے۔اختر انصاری کا ''ایک واقعہ'' اختر اورینوی کی ''کلیاں اور کانٹے''، حیات اللہ انصاری کی ''آخری کوشش''، حسینی کا ''میلہ گھومنی'' اور عسکری کی ''چائے کی پیالی'' کے ذکر کے بغیر یہ جائزہ مکمل نہیں ہوگا۔اس کے علاوہ اور بھی بہت سے نوجوان لکھنے والے ہیں خصوصاً پنجاب میں جنھوں نے ترقی پسند افسانے کو تقویت پہنچائی ہے۔اردو کے بیشتر افسانہ نگار اس تحریک سے متاثر ہوئے۔ترقی پسند ادب نے جس طرح انسان کی زندگی اور ادب کے اسٹیج پر مرکزی جگہ دی ہے۔جس طرح عام آدمیوں میں ہیرو کے صفحات دیکھے اور دکھائی ہیں جس طرح طبقاتی اور سماجی خلیجوں کو کم کیا ہے جس طرح اصلاح بغاوت اور انقلاب کے لیے ولولہ پیدا کیا ہے۔جس طرح ماضی پرستی کے بجائے ماضی کو عقل کی عینک سے دیکھا سکھایا ہے جس طرح ہیرو پرستی کم کی ہے، جس طرح ادب کی سائنس اور دوسرے علوم کی اسے تقویت پہنچائی ہے جس طرح لوگوں میں اپنی پرانی مصیبت پر قناعت کرنے کے بجائے ایک نئی مسرت کو لبیک کہنے کا جذبہ بیدار کیا ہے، جس طرح زبان کو چند مخصوص لوگوں کا کھلونہ بنانے کے بجائے سب کے دل کا آئینہ بنایا ہے، جس طرح آس سے رونے یا رولانے کے بجائے جگانے کا بادہ وساغر کے بجائے تلوار کا کام لیا ہے۔جس طرح سے تنقیدی شعور کو ابھارا ہے اور تخلیقی جوہر کی ترتیب وتہذیب کا کام اپنے ذمہ لیا ہے۔اس سے اس کی کامیابی اور بڑائی ظاہر ہوجاتی ہے۔ادب کی دنیا میں نئی راہوں، تجربوں، دریافتوں کی بڑی اہمیت ہے۔نئے راستوں میں لوگ بھٹکتے بھی ہیں لیکن انھیں لغزشوں سے راستے کی ابرو قائم ہے۔کچھ لوگ صرف لغزشوں کو دیکھتے ہیں، کچھ لوگ راستے پر بھی نظر رکھتے ہیں اردو ادب کے متعلق یہ فطرہ تھا کہ شاید وہ زندگی کے دوش بدوش چل سکے۔ ترقی پسند تحریک نے اس خطرے کو بڑی حد تک دور کر دیا ہے۔''[16]

16: تنقید کیا ہے۔آل احمد سرور۔مکتبہ جامع، نئی دہلی۔2011۔ص141

قرۃ العین حیدر کا نام اردو ادب کے افق پر ایک افسانہ نگار اور ناول نگار کی حیثیت سے نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ان کے لافانی شاہکار فکشن کی دنیا کو عروج بخشا اور اس میں وسعت پیدا کی۔قرۃ العین حیدر نے ''میرے بھی صنم خانے''،''آخری شب کے ہم سفر''،''چاندنی بیگم''،''سیتا ہرن''اور''آگ کا دریا'' لکھ اردو ناول نگاری میں بیک وقت تمام موضوعات و مسائل کو داخل کیا اور ادب نے ان کو سب سے بڑا ناول نگار کا سہرا ان کے سر پر سجا دیا۔

''آگ کا دریا'' برصغیر کی اس تہذیبی تاریخ کو احاطہ میں لایا گیا ہے جن سے ہندوستان کی تصویر بنتی ہے اس ڈھائی ہزار سال تہذیب میں کب، کیسے اور کتنے بدلاؤ کے یہاں کے انسانوں کی زندگی میں تغرو تبدل پیدا ہوا اور پھر آزادی کے بعد کیا صورت حال ہوئی ان تمام موضوعات فکر و فلسفہ اور شعور کی رو میں لکھا گیا بہترین ناول ہے۔یہ ناول شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے۔پروفیسر نورالحسن نقوی قرۃ العین حیدر کی اس شعور اور تخلیقی وژن کی تعریف ان لفظوں میں کی ہے:

> ''قرۃ العین حیدر اجتماعی شعور کی بازیافت کرتی ہیں اور ہزاروں سال پر پھیلی ہوئی زندگی ان کے چند صفحات میں سمٹ آتی ہے۔قدیم ہندوستان تہذیب اور فلسفہ ان کے شعری اسلوب میں ڈھل کر کبھی ناول کا روپ اختیار کرنا ہے تو کبھی افسانے کا۔ان کے یہاں کہانی پن، سماجی آگہی اور تاریخی بصیرت مل کر ایک وحدت تاثر بن جاتے ہیں۔''17؎

قرۃ العین حیدر قاضی عبدالستار کی ہم عصر ہیں یہ بھی جاگیردارانہ گھرانے سے تعلق رکھتی ہیں۔ان کا قلم بھی گذشتہ عظموں کے سنہرے دور کی تلاش کرتا ہے اور اپنی کھوئی ہوئی جڑوں کی طرف بار بار لوٹتا ہے۔قرۃ العین حیدر کے ماضی کے بازیافت کی کہانی اور قاضی عبدالستار کے ماضی کی سنہرہ اقدار میں مماثلت پائی جاتی ہے۔قاضی عبدالستار کے ناول نگاری کی تعریف قرۃ العین حیدر نے کی اور انھیں بڑا ناول نگار تسلیم کیا۔

ترقی پسند تحریک کا وجود مظلوموں، محکوموں، کسانوں اور غریبوں کی حق گوئی اور زمینداروں کے مظالم کے خلاف پیدا ہوا تھا۔اور اس تحریک کا منتہا و مقصد بھی یہی تھا کہ ظلم و تشدد کے خلاف آواز بلند کی جائے اور ان کی آزادی مساویانہ حقوق کے لیے سرگرم رہا جائے۔اس تحریک کی حمایت میں ایک بڑا طبقہ جو ادب کی دنیا سے وابستہ تھا تن من اور دھن سے زمینداروں اور جاگیرداروں کے خلاف تیار ہو گیا اور یک رنگینی طریقہ

17؎: تاریخ ادب اردو۔پروفیسر نورالحسن نقوی۔ایجوکیشنل بک ہاؤس،علی گڑھ۔2014۔ص362

تخلیق کی ابتدا ہوئی۔اس زمانے میں زمینداروں کے یہاں ظلم وستم کی تمام مثالیں اور تعیش کی تمام شکلیں عروج پر تھیں جس کی وجہ سے لکھا جانے والا ادب حقیقت کی عکاسی کرتا ہوا محسوس ہو رہا تھا مگر جیسے جیسے وقت گزرتا گیا اور مختلف تحریکات قوانین اور وقت کی تبدیلی کے ساتھ اس نظام میں تبدیلی آتی گئی جن کا ذکر آگے کیا جائے گا ان زمینداروں جو ظلم وستم کی مثال کے لیے پیش کیا جا رہا تھا۔ بدلتے وقت کے ساتھ نشیب وفراز کا شکار ہوا آزادی کے بعد ان کی حالت قابل رحم ہوگئی۔مسلمان امیر زمیندار پاکستان بنوانے کے بعد ہندوستان سے ہجرت کر گئے اور وہاں ایک نئی ٹھاٹ باٹ کی زندگی گزارنے لگے۔ ہندوستان کے بچے ہوئے زمینداروں کی حالت نہایت دیگر گوں ہوگئی اور ان کا پرسان حال کوئی نہ رہا۔ادب بھی انھیں سوٗ شجر ممنوعہ سمجھ رہا تھا۔اب اور ایسی حالت میں بھی سمجھتا رہا صرف معدودے چند حضرات ایسے تھے جو اس طبقے خاص سے تعلق رکھتے جنھوں نے ان کے دکھوں کو سمجھا اور درد کو محسوس کیا جن میں قاضی عبدالستار کا نام سر فہرست ہے۔قاضی صاحب نے جس دور میں آنکھیں کھولیں اس وقت زمینداروں کے عروج کا زمانہ تھا انھوں نے زمینداروں کے عروج کے زمانے کو قریب سے دیکھا اور اس لذتوں سے لطف اندوز بھی ہوئے اور پھر انھوں نے ان کا زوال بھی دیکھا۔یہ زمانہ ایک ہوش مند انسان کے اعصاب پر اثر انداز ہوا اور جس کا ذکر انھوں ے نے اپنی تخلیقات سے کیا اور انھوں نے ان کے زوال کی دردمند تصویروں کو ادب میں جگہ دی اور قاری کو دیکھا کہ اب زمینداروں کی وہ صورت حال نہیں رہی جس کا ذکر ادب میں کیا جا رہا ہے وقت بدل چکا ہے اور زمیندار ظالم نہیں مظلوم ہے، جابر نہیں مجبور ہے۔اس طرح ایک نئے اور منفرد انداز کے ساتھ وہ ادب کی دنیا میں داخل ہوئے اور ایک الگ شناخت قائم کی۔

قاضی صاحب کے یہاں زمینداروں کی مختلف شکلیں صاف شفاف اس لیے بھی نظر آتی ہیں کہ انھوں نے اس معاشرے کو نہایت قریب سے دیکھا کوئی بھی فن پارہ اسی وقت کامیاب ہوتا ہے جب اس فن پارے میں بیان کردہ موضوعات کا تخلیق کار کو انتہائی گہرائی اور گیرائی سے مطالعہ اور مشاہدہ ہو یا جن افراد یا معاشرے کا وہ ذکر کر رہا ہے ان سے تعلق ہو سنی سنائی باتوں یا فریم میں لگی ہوئی تصویر سے ادب کی تخلیق کرنا مشکل ہوتا ہے جو صرف دیکھ کر تخلیق کیا جا رہا ہے اس لیے ادیب کو سماج کا حساس فرد ہونا ضروری قرار دیا جاتا ہے تاکہ اس کے بیانیہ میں احساس فکر کی آمیزش ہو جس کو پڑھ کر قاری بھی بے خود ہو جائے اور اس کو محسوس ہو

کہ وہ ابھی اس دنیا کی سیر کررہااوراس زمانہ میں سانس کے رہا ہے۔

اس بحث کا مقصد یہی ہے کہ قاضی عبدالستار سے قبل جن فکشن نگاروں کا جائزہ لیا گیا ہے ان کے یہاں یک طرفہ بیانیہ موجود ہے جو ایک خاص دور کی پیداوار تھے مگر آزادی کے بعد موضوعات میں تنوع پیدا ہوا جس میں فرقہ وارانہ فسادات، ہجرت ماضی کا کرب بدلتے ہوئے زندگی کے نئے رنگ وآہنگ کا بیان ملتا ہے اور اس دور میں قاضی عبدالستار نے ایک الگ موضوع کی طرف قاری کی توجہ مبذول کرائی۔قاضی صاحب کے فکشن کا یہ الگ انداز اس لیے نظر آتا ہے کہ انھوں نے ترقی پسندوں کے بنائے پیمانے میں اپنے تخیّل کو باندھنے کی کوشش نہیں کی جہاں جاگیردار ظالم اور کسان مظلوم تھا۔ یہ تو حقیقت ہے کہ کسانوں کا سب سے زیادہ استحصال ہوا مگر آزادی کے بعد یہ طبقہ جس طرح زوال کا شکار ہوا اوران کی ملکیت کو زبردستی چھین کر حکومت نے قبضہ کرلیا۔جس نظریے کے تحت یہ کیا گیا اس کا فائدہ پوری طرح کسان اور مزدور حاصل نہ سکے بلکہ ایک نئے طریقے سرمایہ دار کا عروج ہوا اورانھوں نے املاک پر قبضہ کرنا شروع کردیا۔مظلوم طبقہ تک کوئی مدد نہ پہونچ سکی بلکہ یہ سرمایہ دار عام اور غریب طبقے سے دھوکے بازی سے سب کچھ اپنے زیرکنٹرول کرتا رہا اور جو زمیندار جابر وظالم بھی نہیں تھے جن کے زیرسایے کسان اچھی زندگی گزار رہے تھے وہ بھی اس طوفان میں سراسیمہ ہوگئے۔مزدور وکسان بے یار ومددگار، بے سہارا چھوڑ دیئے گئے،غریب اورغریب ہوتا گیا اور امیر زیادہ امیر ہونے لگا۔اب زمینداروں کے پاس کچھ بھی نہیں بچا وہ طبقہ جس نے کبھی اپنے ہاتھ سے ایک گلاس پانی نہ پیا ہو اس کے لیے کسی کے در پر نوکری کرنا اہانت آمیز بات لگتی تھی اس لیے یہ زمیندار اپنی پرانی قدروں اور روایتوں کو بچانے کی تگ ودو کرنے لگے جو ان کا قیمتی اثاثہ تھیں مگر کب تک؟ یہ طبقہ کسی کے آگے ہاتھ پھیلانا یا کسی کے در پر نوکری کرنا اپنی شان سمجھتا تھا غرض بھوکوں مرنے اور فاقے کی نوبت آگئی وہ زندگی سے دور ہونے لگے اور بچے کھچے لوگ پاکستان سدھارنے لگے دھیرے دھیرے ان کا نام ونشان مٹنے لگا۔قاضی عبدالستار نے انھیں اجڑتے بکھرتے طبقے کو اپنی قلم سے یادگار اور جیتا جاگتا دکھانے کی کوشش کی ہے۔اس عمومی جائزے کا یہی مقصد تھا کہ قاضی صاحب کے فن کی انفرادی خصوصیت اوران کے امتزاجی رنگ کو پیش کیا جاسکے۔آئندہ باب میں قاضی عبدالستار کی تخلیقات کے فکر وفن کا تفصیلی جائزہ پیش کیا جائے گا۔

باب سوم

قاضی عبدالستار کی افسانہ نگاری

(الف) زمیندارانہ نظام کی شروعات: ایک اجمالی جائزہ

(ب) افسانوں کا تنقیدی جائزہ۔

دیہی افسانے: پیتل کا گھنٹہ۔ سایہ۔ ٹھاکر دروازہ۔ سوچ۔ کھا کھا۔ مجریٰ۔ مالکن۔ لالہ امام بخش۔ روپا۔ ایک کہانی۔ بلاعنوان۔ رضو باجی

شہری افسانے: کتابیں۔ ایک دن۔ ماڈل ٹاون۔ تحریک

تاریخی افسانے: بھولے بسرے۔ نیا قانون۔ آنکھیں

قاضی عبدالستار کا شمار ان چند افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے جنھوں نے آزادی کے بعد پیدا شدہ مسائل کو اپنے فکر وفن کا موضوع بنایا۔ جن کا تعلق ہندوستان کے مشرقی یو پی کے بد حال زمینداروں، غریب جا گیرداروں اور مظلوم تعلقداروں سے تھا۔ قاضی عبدالستار ویسے تو ناول نگار کی حیثیت سے مشہور ہیں مگر بہ حیثیت افسانہ نگار بھی کافی اہم ہیں۔ انھوں نے اردو افسانوں کے نئے موضوعات دیئے، زندگی کو دیکھنے کا نیا نظریہ پیش کیا۔ زبان و بیان کے نئے انداز وضع کئے۔ زمیندارانہ معاشرے کو اس طرح پیش کیا کہ جن زمینداروں سے دوسرے کی کہانیوں میں نفرت ہوتی تھی، اب ان سے ہمدرری ہونے لگی۔ کسی بھی فنکار کا یہ بڑا کارنامہ ہے کہ وہ اپنے زمانے کے زاویہ نظر کو بدل دے۔ ''پیتل کا گھنٹہ'' قاضی عبدالستار کے اس وصف کا نمونہ ہے۔ یہ انداز قاضی صاحب کے دوسرے افسانوں میں بھی موجود ہے۔

غرض دوسرے باب میں ہم نے دیکھا کہ قاضی عبدالستار سے قبل فکشن کی کیا صورت حال تھی، کن کن موضوعات پر ادب لکھا جا رہا تھا۔ اس باب میں قاضی عبدالستار کی افسانہ نگاری پر بحث کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ ایک نظر زمیندارانہ نظام کی شروعات اور اس کا انسانی زندگی میں عمل دخل پر بھی بات کر لی جائے۔ کس طرح ایک نظام غالب آجاتا ہے اور وہ دھیرے دھیرے پورے انسانی زندگی میں اثر انداز ہوتا اور خاندان تک تباہ و برباد ہو جاتے ہیں، ساتھ ہی زمیندارانہ نظام اپنے ظالم و جابر پنجے کسانوں اور مزدوروں کی زندگی پر پیر گاڑے ہوئے تھا۔ اور کیسے اس نظام کا خاتمہ ہوتا ہے۔ اس نظام کے خاتمے کے بعد زمینداروں کی کیا صورت حال تھی ان امور پر اس باب میں بات کی جائے گی۔ تا کہ معروضی انداز سے زمیندارانہ نظام کے علاوہ قاضی عبدالستار کی تخلیقات کے حوالے سے حقیقت کی بازیافت ہو سکے۔ زمیندارانہ نظام کے شروعات کی بڑی وجہ انگریزی حکومت کا ہندوستان میں جابرانہ اور ظالمانہ طرز حکومت ہے جس نے ہندوستانیوں کو خواب و غفلت سے نہ صرف باہر نکالا بلکہ حقیقت سے آنکھ ملا کر مقابلہ کرنے کی اس ہمت اور حوصلہ بھی عطا کیا۔ اس جنگ میں ہندو اور مسلمان برابر کے شریک کار رہے مگر جیسے جیسے غلامی کی بیڑیاں کٹتی گئیں ویسے ویسے

ہندوستانیوں کے دلوں سے اخوت ومحبت کی جگہ نفرت اور حقارت کا جذبہ بھی پیدا ہونے لگا۔جس کی سب سے بڑی وجہ انگریزوں کی وہ پالیسیاں تھیں جن میں ہندو اور مسلمان الگ الگ قوم، مذہب اور تہذب وثقافت کے زاویہ سے ان کے ساتھ غیر مساویانہ سلوک کیا جارہا تھا۔ وہ ہندوستانی جو سیکڑوں برسوں مل جل کر رہتے آئے تھے دھیرے دھیرے ان کے بیچ نفرت وتشدد کی اونچی دیواریں حائل ہونے لگیں۔جنھیں آسانی سے توڑ پانا مشکل ہی نہیں ناممکن تھا پھر یہ دیوار آخر کار ملک کو دو حصوں میں تقسیم کرا کے ہی دم لی اور اس دیوار نے رفتہ رفتہ اپنی اونچائی اور موٹائی بڑھاتی گئی۔ خیر اسی دیوار کو ٹوٹنے کے لئے ادیب وشاعر میدان میں آتے گئے اور اپنے اپنے نقطۂ نظر سے اسے ٹوٹنے، ختم کرنے یا اس کے ہونے سے جو پریشانیاں، مصیبتیں اور دقتیں آرہی تھیں ان کا بیان کرنے لگے۔اسی تقسیم کی دیوار کے چلتے ہندوستان کا طبقاتی نظام بھی بدلا جن میں معاشی، سیاسی، مذہبی اور سماجی نظام جو ہندوستان کے جڑوں اور ہندوستانیوں کے دل و دماغ میں برسوں سے رچا بسا تھا جب آزادی حاصل ہوئی، پرانے نظام میں تبدیلی لاحق ہوئی اور یہ تبدیلی مختلف شکل میں باہر آرہی تھیں۔ جو سیاسی، سماجی اور معاشی تھی۔اسی معاشی تبدیلی کو پیش کرنا اور اس معاشی اور اقتصادی تبدیلی سے کیا فائدے اور نقصان ہوئے اور ہمارے ادیبوں نے اسے کس طرح ادب میں برتا، یہ بدلاؤ کس طرح قاضی عبدالستار پر اثر انداز اور انھوں نے کس طرح اسے ادب میں پیش کیا ہے۔ان تمام باتوں کا معروضی نقطۂ نظر سے جائزہ لیتے ہوئے قاضی عبدالستار کے فنی محاسن پر گفتگو کرنا ہے۔

ہندوستان کی تقسیم کے ساتھ ہی ہجرت، قتل وخون، غارت گری کے سبب انھیں موضوعات کو ادب میں بھی پیش کیا جانے لگا جس کی وجہ سے ادب کے قرطاس پر تبدیلیاں آنی شروع ہوگئی اور فرد کی تنہائی کا احساس حد درجہ بڑھ گیا۔افسانے میں موضوعاتی اور اسلوبیاتی اعتبار سے تبدیلیاں ظہور پذیر ہوئیں۔ سیاسی مجبوری اور محکومی کا احساس ختم ہوتے ہی دونوں اطراف میں عصری حوالوں سے معاشرتی سطح پر مسائل اور ان کا حل ڈھونڈنے کی سعی کی گئی۔ نئی طبقاتی تقسیم موضوع بننے لگی۔ امیر غریب اور غریب امیر بھی بننے لگا۔ آزادانہ معاشرت کا بھی وجود ہوا۔جن کو چند تخلیق کاروں نے موضوع بنایا۔مگر یہ طبقائی کش مکش اور معاشی نظام کے تبدیل ہوتے دستور نے اس نظام کے پروردوں کو بری طرح متاثر کیا جس کا اظہار کرنے کے لئے یہ بے چین ہو گئے۔ اور انھوں نے ذاتی طور سے جو محسوس کیا اسی کو لکھنے کی کوشش کی۔ اس کے علاوہ معاشرت

سیاست اور بین الاقوامی سطح پر جو تبدیلیاں ہورہی تھیں اس کے اظہار کی بھی ضرورت تھی جس کا اظہار آزادی کے بعد کے تخلیق کاروں بالخصوص 1960 کے بعد کے لوگوں نے کیا۔ جس میں بیک وقت تمام موضوعات در آنے لگے جس کی وجہ سے تازگی کا ایک انوکھا احساس بھی نظر آیا جس میں اسلوب وموضوع میں تنوع پیدا ہوا۔ جہاں علامتی استعاراتی اور تجریدی افسانے شامل ہونے لگے۔

جہاں ماضی کا درد اور حال کی عکاسی ہے وہیں دوسری طرف بہتر مستقبل کی امید بھی نظر آتی ہے۔ جہاں ایک طرف روایت سے والہانہ لگاؤ بھی ہے وہیں دوسری طرف فرسودہ نظام سے بغاوت بھی ہے۔

ہندوستان کی آزادی کی تحریک اور مغربی ادب سے شناسائی، معاشرے اور سماج میں بدلتے ہوئے نظریات، اقتصادی بحران اور دوسری جنگ عظیم کے بعد سیاسی، سماجی اور نفسیاتی پہلوؤں میں کافی بدلاؤ آ گیا۔ جس کی بہترین عکاسی کے طور پر بیدی، کرشن چندر، عصمت اور قرۃ العین حیدر کے نام لئے جاسکتے ہیں۔ جن کے یہاں ان تمام موضوعات ومسائل پر بحث ملتی ہے۔ اس طرح ادب میں ایک نئے اسلوب کے ساتھ اردو افسانہ کے منظرنامے میں بہت سے موضوعات وافکار ونظریات پیش کئے جاتے رہے۔ تقسیم ہند کے بعد ترقی پسند تحریک کا زور ٹوٹنا شروع ہوا۔ جس کی وجہ سے ادیبوں اور مصنفوں نے ایک نئے انداز کے ساتھ ادب میں داخل ہونا شروع کیا جس تقسیم کی لکیر نے ذہنوں کو جھنجھوڑ دیا اور اذہان کو مقفل کر دیا تھا یہ حالت برصغیر کے لئے نہایت ہی بھیانک اور وحشت ناک تھی۔ وطن عزیز کی آزادی نے بہت کچھ بدل ڈالا۔ جس میں ایک بڑا بدلاؤ زمینداری نظام کا خاتمہ اور جمہوری نظام کا تسلط اور آزادانہ معیشت کا جنم تھا اس کے ساتھ ہی فرقہ وارانہ تعصب ہجرت کے مسائل، ماضی کی بازیافت اور اس کا کرب ناسٹیلجیا جیسی فکروں نے ادب کو ایک الگ اور نئی راہ دکھائی۔

غرض اسی دور میں قاضی عبدالستار کی تخلیقات منظر عام پر آتی ہیں۔ قاضی صاحب کا تعلق زمیندار گھرانے سے تھا۔ اور ان کے سامنے زمیندارانہ شان وشوکت کی دنیا آباد تھی۔ اسلئے اس نظام کے خاتمے نے ان کے ذہن کو بہت متاثر کیا۔ جس کی وجہ سے ان کی تخلیق کا ایک بڑا حصہ اسی نظام کی داستان بیان کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ جہاں ظالم اور مظلوم کی بدلتی ہوئی صورت حال اقتدار کی تبدیلی مٹتی ہوئی تہذیب کا نوحہ نظر آتا ہے۔

قاضی صاحب کی تخلیق کا خاص وصف یہ ہے کہ انھوں نے ان تمام موضوعات کو ادب کا حصہ بنایا جس کو

ایک صدی تک ظالم و جابر سمجھا جاتا رہا تھا۔اس طبقات کی عکاسی قاضی عبدالستار کی تخلیقات میں نظر آتی ہے۔ اس لئے قاضی صاحب کی تخلیق اپنے بیش رووٗں سے کافی مختلف نظر آتی ہے۔ان کی تخلیقات پر گفتگو کرنے سے پہلے بہتر ہوگا کہ زمینداری یا جاگیرداری کیا ہوتی ہے؟اس کی شروعات کیسے ہوتی ہے؟اوراس کے خاتمے پر ایک مختصر بحث کر لی جائے تا کہ قاضی عبدالستار کی تخلیقات کے فکر وفن کو بہ آسانی سمجھا جا سکے۔

ادب میں بہت سی باتیں ڈھکے چھپے انداز میں بیان کی جاتی ہیں۔اس میں نہ تو کسان یا زمیندار کی تاریخ بیان کی جاتی ہے اور نہ ہی ان کے خاتمے کی وجہیں بتائی جاتی ہیں۔ یہ تو قاری کے علم و ادب پر منحصر ہوتا ہے کہ وہ کسی واقعہ کی تخلیق میں کتنی گہرائی تک جا سکتا ہے۔یا کوئی واقعہ یا حادثہ ادب کا حصہ بنتا ہے تو اس کی کیا وجہ ہے۔ورنہ زندگی،سماج و معاشرے میں بہت سے واقعات و حادثات رونما ہوتے ہیں وہ سبھی ادب کا حصہ نہیں بن پاتے۔ خیر اس منظر نامے کے ذریعہ قاضی صاحب کی تخلیق کو سمجھنے میں مزید آسانی ہو جائے گی۔ ساتھ ہی یہ پتہ لگایا جا سکتا ہے کہ جس زمیندار کی تصویر انھوں نے اپنی تخلیقات میں پیش کی ہے وہ حقیقت کے کتنی قریب ہے۔ یہ بات قابلِ قبول ہے جس سے ایک باشعور انسان انکار نہیں کر سکتا کہ دولت کی تقسیم کا معاشرتی زندگی سے گہرا تعلق ہے اور معاشرے کا نظام اسی صورت میں درست کیا جا سکتا ہے۔ جب معاشی نظام بھی چست درست ہو۔سقراط،افلاطون،ارسطو یہاں تک کہ لینن اور کارل مارکس نے اپنے اپنے طرز فکر کی بنیاد پر مثالی ریاست قائم کرنے کی کوشش کی۔ویکیپیڈیا جاگیردارانہ نظام کی تعریف کچھ اس طرح بیان کرتا ہے۔

> ’’جاگیردارانہ نظام وہ معاشرتی،اقتصادی اور سیاسی نظام جو جدید حکومتوں کے قیام سے پہلے یورپ اور ایشیا کے اکثر ملکوں میں رائج تھا۔اس نظام کی بعض حقومتیں یہ تھیں کہ بادشاہ کی طرف سے مختلف افراد کو ان کی خدمات کے صلے میں زمینوں کے وسیع رقبے جاگیر کے طور پر عطا کئے جاتے تھے یہ جاگیردار اپنی جاگیر میں رہنے والے مزارعین سے زمینوں پر کام کراتے تھے۔زمین کا لگان وغیرہ خود جاگیردار وصول کرتے تھے جس میں سے بادشاہ کو حصہ جاتا تھا۔عام طور پر پیداوار کا ایک تہائی حصہ کسان کا ہوتا تھا،ایک تہائی جاگیردار کا اور آخری ایک تہائی بادشاہ کا۔ جاگیردار کی حیثیت مزارعین اور دیگر مقامی باشندوں کے لئے حکمران سے کم نہیں تھی۔مزارعین جاگیردار کے ظلم و ستم کی چکی میں پستے

رہتے تھے۔ان کو کسی قسم کے سیاسی حقوق حاصل نہیں تھے۔
انیسوی صدی میں یورپ میں صنعتی انقلاب کے بعد جا گیردارانہ نظام کو زوال آیا اور اس
کی جگہ سرمایہ دارانہ نظام نے لے لی۔اب یہ نظام یورپ سے بالکل ناپید ہو چکا ہے۔
لیکن افریکا اور ایشیاء کے جن ملکوں میں کلی یا جزوی طور پر اب بھی اس کی عمل داری ہے۔1؎

انگلستان کی خانہ جنگی کے بعد بہت سے دور اندیش اور مدبّر اسی فکر میں تھے کہ دولت خصوصاً زمین کی تقسیم کا کچھ ایسا اصول بنایا جائے جس میں امیر اور غریب کا فرق کسی حد تک مٹایا جا سکے۔لیکن اس وقت مذہب اور کلیسا کے اختلاف کا زمانہ تھا جس میں سائنسی اور مذہبی جنگ چھڑی ہوئی تھی۔اس لئے معاشی نظام کی اصلاح کے لئے کوئی خاص قدم نہیں اٹھایا جا سکا۔فرانسیسی انقلاب نے مذہبیات، سیاسیات اور معاشیات میں فرق کیا۔مساوات اور برابری کے نظام کو نہ صرف مذہبی عقیدے کے طور پر قبول کیا۔ بلکہ سیاسی غرض کا موضوع بھی بنا دیا۔اس انقلاب نے قانوناً لوگوں کو مساوات کا حق کو حاصل کرا دیا۔مگر دولت کا فرق جوں کا توں برقرار رہا۔امیروں اور غریبوں کی حالت میں نمایاں فرق نہیں ہوا۔غرض انقلاب کے چند سال بعد ہی امیری اور غریبی کے فرق کو دور کرنے اور تعلیم اور تہذیب کو امیروں کی حد مقرر سے آگے بڑھا کر غریبوں تک پہونچانے کی کوشش کی جانے لگی۔

اگر ہندوستان کے پس منظر میں دیکھا جائے تو زمینداری نظام ہندوستان میں مغل دور اور برٹش دور حکومت میں ایک سیاسی اور سماجی نظام تھا۔جس میں زمین کا مالک کسان نہ ہو کر زمیندار ہوتا تھا۔اور اس پر کاشت کرنے والے کسان سے زمیندار لگان وصول کرتا تھا۔لیکن ہندوستان کے آزاد ہونے پر یہ نظام ختم کر دیا گیا۔ یہ نظام سماج میں اپنی جڑیں اتنی گہری بنا چکا تھا کہ آسانی سے مٹا دینا کسی کے بس کی بات نہیں تھی۔ سرمایہ دارانہ نظام پوری دنیا میں جس قدر تسلط جمائے ہوئے تھا اس کو ختم کرنے کے لئے جن انقلابات اور تحریکوں کا وجود ہوا اور دیکھتے دیکھتے تمام ممالک میں پھیل گیا جن کا اثر ہندوستان پر بھی پڑا اور یہاں پر بھی جاگردارانہ نظام کے خلاف آوازیں بلند ہونے لگیں۔کیونکہ ہندوستان کے معاشی نظام کے تحت زمین پر کسی کا مالکانہ حق نہیں ہوتا تھا۔وہ کسی فرد واحد کی ملکیت نہیں ہوا کرتی تھی۔زمین بھی پانی ہوا اور روشنی کی طرح قدرت کا ایک تحفہ قرار دی جاتی تھی۔مہاشری جیمنی کے مطابق ’راجا زمین پر قابض نہیں ہو سکتا ہے۔کیوں کہ وہ اس کی

1؎: ویکیپیڈیا CCBY-SA 3.0۔جاگیردارانہ نظام

ملکیت نہیں ہے۔ بلکہ پورے عالم انسان کے لئے ہے۔'

اس لئے اس پر سب کا برابر کا حق ہے۔منو نے اسمرتی (82,37,230) لکھا ہے۔' رشیوں کے مطابق زمین کا مالک وہی ہے۔جس نے اس کے جنگل کو کاٹ کر اس کو صاف کیا اور کاشت کاری کے لائق بنایا۔'

قدیم ہندوستان میں گاؤں میں ایک بڑے حصہ پر زمین پر مالک کا حق دینے کے لئے اس کا انتخاب گاؤں کے لوگ ہی کرتے تھے۔اور اس کو اس ملک کے بادشاہ یا ولی عہد کی حمایت حاصل ہوتی تھی۔راجا اسے زمین کا ٹیکس نہ دینے پر ہٹا سکتا تھا۔غرض کی یہ ملکیت خاندانی ہوا کرتی تھی۔قدیم ہندوستان میں زمین کی ملکیت بیچنے اور خریدنے کا کوئی حق نہیں تھا۔اور اس بات کی تصدیق مغربی مفکرین بیڈن پاویل اور جارج کلیمپ نے بھی کی ہے۔کلیمپ ویل کا قول ہے کہ' زمین پر کاشت کاری کا حق صرف ایک حق ہی تھا۔اور ہندو نظام کے مطابق قدیم ہندوستان میں کئی طبقے موجود تھے۔جو کاشت کاری کرتے تھے۔'

عہد وسطیٰ میں مغلیہ راجا زمین پر لگان یا مالگزاری گاؤں کے مکھیا یا کبھی کبھی سامنتی راجاؤں یا سرداروں کے ذریعہ وصول کرتے تھے۔اس طرح عہد وسطیٰ میں ایک ایسے طبقے کا جنم ہوتا ہے۔جس کو زمین دار کا ایک روپ کہا جا سکتا ہے۔ جو راجا اور کسانوں کے بیچ کڑی کا کام کرتے تھے۔لیکن یہ طبقہ بھی راجہ کی مرضی کے مطابق بنا ہوا تھا جب کہ آئین اکبری میں کاشت کار اور حکومت کے بیچ کسی وسطی طبقے کو کوئی اہمیت نہیں دی گئی ہے۔

بادشاہ اور زمیندار قانوناً صرف لگان لینے والے افسر ہی ہوتے تھے۔مغلیہ بادشاہوں نے زمین کے مالک بننے کا کبھی دعویٰ نہیں کیا۔ یہ بات تاریخی طور پر بھی ثابت ہے۔اورنگ زیب نے ہنڈی، پالم اور دوسری جگہوں پر کسانوں سے زمین خریدی اسی طرح اکبر نے اکبر آباد اور الہٰ آباد کا قلعہ بنانے کے لئے زمینوں کو خریدا تھا۔

تاریخی ثبوتوں کے مدنظر یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ شاہ جہاں نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔مغلیہ سلطان ٹیکس یا مالگزاری وصول کرنا ہی اپنا حق سمجھتے تھے۔مغلیہ سلطنت میں کاشت کاروں کو بہت سے حقوق حاصل تھے۔ کاشت کار اپنا لگان سلطانوں کو گاؤں کے پردھان کے ذریعہ ہی پہونچاتا تھا۔ساتھ ہی اس طبقے کو اس کا

محنتانہ ملتا تھا۔ انگریزوں کے دورحکومت میں اورنگ زیب کے انتقال کے بعد (1707) کاشت کاروں کے حقوق دھیرے دھیرے کمزور پڑنے لگے۔ جب دہلی کی حکومت کمزور پڑنے لگی۔ اسی افراتفری کے دور میں بیچولیے متوسط طبقے کے کچھ نمونے دکھائی دینے لگتے ہیں۔

جب ریاستوں کے راجا اور نوابین اپنی رعایا کے حقوق کا تحفظ کرنے میں مشکلات کا سامنا کر رہے تھے۔ تبھی یہ لوگ گاؤں کے مکھیا یا سرپنچ کا سہارا لینے لگے۔ اور ساتھ ہی کسانوں کے حقوق پر حملہ کرنا شروع کیا اسی حالات کے تحت کچھ زمینداروں کا عروج ہوتا ہے۔ لیکن اس وقت بھی کسانوں کو زمینوں پر پورا حق حاصل تھا۔

ہندوستان میں جیسے انگریز آتے گئے اور ان کی آمد مضبوط ہونے لگی یہاں تک کہ ان کے ہاتھ حکومت کی گردن تک پہونچ گئے اور حکومت کی باگ ڈور سنبھالنے لگے تو زمین داری نظام میں کافی اضافہ ہونے لگا۔ انگریزوں کی سوچ یہ تھی کہ وہ زمینوں کے مالک ہیں اور کسان کاشت کاران کی رعایا۔ انھوں نے اسی مدنظر کاشت کاری زمینوں پر عارضی غیر عارضی اور استمراری بندو بست ریاست کے راجاؤں نوابوں اور زمین داروں کے ساتھ کئے۔

الغرض یہ سیاسی نظریات سے متاثر ہو کر ایک پرگنہ ٹیکس وصول کرنے والے افراد کو پانچ سال کے لئے پٹے پر دیا جاتا۔ اس طرح زمینداری نظام کو آگے بڑھانے نے اسے مضبوط اور مستحکم کرنے کے لئے انگریزوں کا زیادہ ہاتھ رہا۔ اگرچہ شروعات میں ان کا نظریہ کاشت کاروں کو ان کے حقوق سے دستبردار کرنا نہیں تھا۔ سن 1786 میں لارڈ کارنوالیس وارن ہیسٹنگس کے بعد گورنر جنرل ہوا۔ لارڈ کارنوالیس بھی زمینداری نظام کا حمایتی تھا۔ اس نے بنگال، بہار، اڑیشہ کے دس سالہ بندوبست کا حکم دیا۔ دو برس کے بعد ہی بورڈ آف ڈاریکٹرس نے اس دس سالہ بندوبست کو مستقل (Permanent-Settlement) بنانے کا حکم دے دیا۔

مدراس میں زمیندارانہ نظام کی شروعات انگریز حکمرانوں کی پالیسی کے ذریعہ ہوئی۔ گاؤں کی زمین کا بٹوارہ کر کے انھیں نیلام کر دیا جاتا تھا۔ اور نیلامی پالیسی کے تحت انھیں بیچ دیا جاتا تھا۔ شروعات میں یہ بندو بست کسانوں سے ہی کیا جاتا تھا۔ لیکن بعد میں سیاسی نظریہ کے تحت یہ بندوبست زمینداروں سے کیا جانے

لگا۔مشہور تاریخ داں سرو ینٹ اسمت علی گڈھ کی بندو بست رپورٹ میں اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ روایتی زمینداری حقوق کی ان دیکھی کرتے صرف ضرورت کو دھیان میں رکھے ہوئے بندو بست کاشت کاروں اعزاداروں سے کئے گئے۔اس طرح سے انگریزوں کوامیر طبقے کے ذریعےٹیکس حاصل کرنے میں آسانی ہوگی۔

اس طرح ہندوستان کی تاریخ میں اس بندوبست کے ذریعہ ریاست اورکسانوں کے بیچ زمیندار طبقے کا عروج انگریزوں کی پالیسی کے ذریعہ ہوا۔اس کے ساتھ ہی کسانوں کے زمینی حقوق جوقدیم زمانے سے چلے آرہے تھے۔چھین لئے گئے۔یہ وسطی سماج دھیرے،دھیرے امیر ہوتے گئے۔کیوں کہ زیادہ لگان وصول کرنے کے لئے یہ زمینداروں کوزیادہ وظیفہ اورتنخواہ کالالچ دیتے تھے۔اس بندوبست کے ذریعہ کسانوں کی مالی حالت پرکوئی دھیان نہیں دیا گیا۔جس کی وجہ سے ان کی مصیبت،پریشانی،اورحقوق کی طلبی میں روز بہ روز اضافہ ہوتا گیا۔اس طرح کے واقعات میں اضافہ ہونے کے سبب انگریز حکمرانوں نے اس طرف دھیان دینے کی کوشش کی اور زمینداروں کوزیادہ رعایت دینے کی کوشش کی تاکہ وہ اپنے زیرنگیں کام کرنے والوں آسامیوں کےتحفظ کے لئے کام کرےلیکن یہ ان کی بہت بڑی بھول تھی۔

زمینداروں نے ہمیشہ ان کےحقوق کےساتھ دھوکہ کیا۔لہٰذاانگریزوں حکمرانوں نےسوچا کہ اس بھول کوسدھارا جائے۔اس کےتحت کسانوں کی حالت سدھارنے کے لئے زمینی نظام بنانے کی کوشش کی۔یہ قدم زمیندارانہ نظام کے زوال کی طرف پہلاقدم کہا جاسکتا ہے۔اس لئے قدم 1859 سے 1929 تک رہا۔یہ نظام زمینداروں کے لگان بڑھانے کےحقوق پر بندش لگانے والے تھےجس سے امیر طبقے کے کسانوں کوزیادہ فائدہ ہوا۔لیکن اس قانون کےتحت بھی لگان وصول کرنے کےنظام کوآسان جانے کی کوشش برائے نام کی گئی۔چھوٹی حیثیت کے کسانوں کوکوئی خاص فرق نہیں پڑا۔تاکہ وہ لگان وقت پرحکومت کوپہونچا سکے۔سن 1959 میں زمینی نظام کا پہلاقرادات پیش کیا گیا۔قرادات کےتحت سبھی برٹش ہندوستان کےتحت ایک مثالی قانون تھا۔جس کوہندوستان کےسبھی حصوں میں رضامندی ملی۔ساتھ ہی وقت۔وقت پراس میں ترمیم کی گنجائش بھی رکھی گئی۔اوراس میں ترمیم بھی کی گئی۔تاکہ غیرمطمئن کسانوں کومطمئن کیا جاسکے۔لیکن پھر زمین دارکسانوں کوغیرآئینی طریقہ سے ستارہے تھے۔اورلگان کے لئے ان کےخون نچوڑ رہے تھے۔جس

سے کسانوں کے اندر ایک گہری بے چینی اور اضطرابی کیفیت پھیلنے لگی۔

زمینداری نظام کے خاتمے کا دوسرا قدم 1930 سے 1944 تک رہا۔اس وقت پورے ملک میں تحریکیں سرگرم ہونے لگیں۔ کسان سبھا کے ذریعہ تحریکیں انقلابی قدم میں زور آنے لگا۔اوراس کا بیج کسان سبھا کے ذریعہ بویا گیا جواکھل بھارتیہ کسان سبھا کی آلہ آباد قیام میں ۱۱رفروری1918 کو ہوئی تھی۔اس کے بعد کانگریس کسانوں کے مفاد میں آگے بڑھنے لگی۔اس کے نتیجے گاؤں کے کسانوں میں کافی بیداری پیدا ہونے لگی۔ پنڈت نہرو نے یو۔ پی کی کانگریس کمیٹی میں کہا کہ سیاسی آزادی کا کوئی معنی نہیں ہے۔جب تک کہ کسانوں کو ان کے استحصال سے آزادی نہ مل سکے۔دھیرے، دھیرے کسانوں میں کافی بیداری پھیلی ساتھ ہی ان میں بے چینی بھی اپنی حالات کو سدھارنے کو لے کر پیدا ہوئی۔جس کی وجہ سے حکومت پر کافی دباؤ پڑا۔ اور لگان میں کمی کی مانگ کرنے لگے۔

عالمی جنگ کے خاتمے کے بعد زمیندارانہ نظام کا آخری دور شروع ہوا جو 1945 سے 1955 تک چلا جنگ کے ختم ہوتے ہی برٹش حکومت نے 1945 میں گورمنٹ آف انڈیا نے 1935 کے اندراج میں ریاستی نظام میں الیکشن کرانے کا فیصلہ کیا۔

کانگریس نے اس انتخاب میں حصہ لیا۔اور دسمبر 1945 میں اپنے انتخابی اشتہار میں زمیندارانہ نظام کے تحت کہا گیا کہ زمینی نظام کا سدھار جس کی ہندوستان کو بہت ضرورت ہے کسانوں اور حکومت کے بیچ وسطی سماج یعنی زمینداری نظام کو ہٹا دینے سے مطلق ہے۔اس انتخابی اشتہار سے معاشیات، سیاست داں کے ساتھ بہت ہی حامی تھے۔زمیندارانہ نظام ہندوستان کے معاشی ترقی میں رکاوٹ ڈالی تھی۔ کیوں کہ بڑے زمیندار ہمیشہ خودغرض، ہوتے تھے۔

اس کے بارے میں خود قاضی صاحب فرماتے ہیں:

> ''زمیندار صرف اپنے لئے زندہ رہتا ہے۔اس کا نہ باپ ہوتا ہے۔ نہ بیٹا، نہ بیوی، نہ بچے۔۔۔دنیا کے سب سے ظالم جانور کا نام زمیندار ہے، وہ اپنی زمینداری پر حکومت قائم کرنے کے لئے کسی کو بھی ذبح کر سکتا ہے۔'' 2

Indian Land - Problems G.D.Patel بنگال لینڈ یکشن 1940 بھی اس نقطے پر پہونچا

2: قاضی عبدالستار: اسرار و گفتار۔راشد انور راشد۔عرشیہ پبلی کیشنز، نئی دہلی۔سنہ اشاعت: 2014۔ص: 253

کہ 1993 کا مستقل بندو بست اس وقت جن وجہ سے کچھ فائدے کے لئے ضروری سمجھا گیا۔آج کے دور میں غیرضروری ہے اور نظام میں اتنی برائیاں پھیل چکی ہیں کہ اب یہ ملک کے مفاد میں کسی طرح بھی فائدے مند نہیں ہے۔غرض انھوں نے بھی اس نظام کو ختم کرنے کی وکالت کی۔

ہندوستانی اور مغربی معاشی مفکروں کی آرا کے مطابق زمینداری نظام کا خاتمہ زیادہ کاشت کاری کے لئے یا پیداوار کے لئے ضروری ہے۔اس کے علاوہ یہ نظام دنیا کے ہر حصہ میں وقت کے حساب سے نہ ہونے کی وجہ سے ختم ہو چکا ہے۔ساتھ ہی یہ نظام بہت مہنگا اور ملک کے مفاد میں مضر ہے۔ساتھ اگر اب اس کا خاتمہ نہ کیا گیا تو یہ ملک اور سماج کی بھلائی اور اس کے مفاد میں وقت کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔

کانگریس کو سن 1950 میں الیکشن میں کامیابی ملی اور ہر ریاست میں کانگریس کے وزیر بنے تو انتخابی وعدے کے مطابق زمینداری نظام کے خاتمے کے لئے بل پیش کیا۔یہ بل 1950 سے 1955 تک قانون بن کر نافذ ہو گئے نتیجتاً زمینداری نظام کا ہندوستان سے خاتمہ ہو گیا۔اور کاشت کار اور حکومت بیچ دوبارہ سیدھا رشتہ قائم ہو گیا۔زمین کا حق جس پر وہ کاشت کاری کرتا تھا۔کسانوں کو حاصل ہو گیا جو نظام صدیوں سے چلا آرہا تھا۔اس طرح سے جس زمینداری نظام کی شروعات ہمارے ملک میں انگریزوں کے آمد کے ساتھ شروع ہوا تھا۔انگریزوں کے خاتمے کے ساتھ اس کا خاتمہ ہو گیا۔اس نظام کے خاتمے پر کسی نے بھی کو دکھ کا ذرا بھی احساس نہیں ہوا۔کیوں کہ اس کے خاتمے کے ساتھ ہی پھر سے صدیوں سے چلی آرہی روایت شروع ہو گئی۔

دستکاری کے صنعت کی تباہی و بربادی، ذراعت کی عام تباہی جدید مشینی صنعت کی کمی اس کے علاوہ معاشی لوٹ کھسوٹ جس میں بڑھے ہوئے ٹیکس، باہری انگریزی سرمایہ داری اور تجارتی کمپنیاں اور ان کی زیادہ سے زیادہ نفع کمانے کی سوچ انگریزوں کی معیشت پر پڑا۔جس کی وجہ سے ملک میں عام لوگوں کے بیچ غریبی اور بے روزگاری بڑھنے لگی۔جس کا سب سے زیادہ اثر دیہات کے کسانوں دستکاروں اور شہر کے مزدوروں اور نچلے طبقوں کے ساتھ ہی ملازمت اور کچھ زمیندار جن کی حالت ابھی بہت اچھی نہیں تھی ملکی تاجروں پر پڑا۔

انگریزی دور حکومت میں کچھ ایسے طبقے بھی تھی جن پر بہت زیادہ اثر نہیں پڑا۔ان کے ریاستوں کے نواب جن کی مالی حالت انگریزوں کے رحم و کرم پر ٹکی تھی۔اور جن کی مالی حالت بہت بہتر تھی جا گیردار جن کے

پاس بڑی۔ بڑی جا گیریں تھیں۔اور کچھ دیسی راجا جن کو انگریزوں نے ٹیکس کی وصولی کی سہولیات کے مدنظر بنایا تھا۔ان کے ہاتھ سے سیاسی اور انتظامی طاقت ختم ہو چکی تھی۔ یہ صرف انگریزوں کی جی حضوری اور ان کے بنائے گئے وظیفوں پر عیش کر رہے تھے۔ یہ سرکار کی پست پناہی لے کر عام لوگوں کو لوٹ کر ان پر لگان کا زیادہ سے زیادہ جو جی میں آئے ڈال کر مفت خوری کی زندگی بسر کر رہے تھے۔تا کہ ان کے حاکم ان سے خوش رہیں۔سجاد ظہیر اس بارے میں رقم طراز ہیں:

''جس طرح انگریز سامراجیوں نے ہمارے ملک میں نو جوانوں، ریاستوں، جا گیرداروں کو ان کی سیاسی قوت سلب کر کے اپنے مقاصد کے لئے برقرار رکھا۔اور بڑے پیمانے پر ان جگہوں پر بھی زمینداریاں قائم کیں۔ جہاں پر پہلے سے وہ موجود نہ تھیں۔اس طرح اور اس کے ساتھ ،ساتھ سامراجیوں نے تمام ان اداروں، روایات اور تصورات کو بھی ابھارنے اور برقرار رکھنے کی کوشش کی اور ان کی سر پرستی کی۔جن سے ملک کے مختلف مذہبی یا قومی گروہوں ذاتوں اور فرقوں میں نا اتفاقی اور دوری بڑھتی تھی۔ یا جن سے توہم پرستی، تقدیر پرستی یاس اور لاچاری کے جذبات ابھرے تھے۔ جو عقل اور نئی روشنی کے خلاف تھے۔'' 3

زمین پر زمینداروں کے کیا حقوق ہیں۔ دراصل انگریزی مفہوم کے مطابق مالک زمین یا صرف مالگزاری کے ٹھیکہ دار اور محصل اس امر کے متعلق بہت اختلاف رائے پھیلا ہوا ہے۔۱۸۴۵ء میں جو لگان کا ایک بڑا مقدمہ چلا اس میں کلکتہ ہائی کورٹ کے ججوں نے یہ تجویز کیا کہ بنگال کے زمیندار دراصل مالک زمین نہیں بلکہ محصل تھے یعنی سرکار کی طرف سے مالگزاری تحصیل کیا کرتے تھے۔لیکن ہندوستانی مدبرین کا خیال ہے کہ زمین کے حقیقی مالک بھی وہی تھے۔ بلکہ ان میں بعض ،بعض تو صوبوں کے حصوں پر حکمراں تھے۔

الغرض اس بحث سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ زمینداروں کو سرکار یا حکومت کی طرف سے کوئی آئینی حقوق نہیں ملے۔اور نہ ہی یہ کسی قانون کے تحت بنائے گئے تھے۔ یہ زمیندار صرف وقتی طور پر متوسط طبقے کے طور پر ابھرے مگر حکمراں جیسے اثر و رسوخ کو حاصل کر لیا۔ اور ان میں زیادہ تر ظالم کے زمرے میں شامل ہوئے۔اس بات سے زمینداروں کے عروج کے مختلف پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے ساتھ ہی ان کے خاتمے کے

3: کلیات سجاد ظہیر: روشنائی (جلد اول) مرتبین نجمہ ظہیر، باقر علی باقر۔قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی۔ص: 45

وجوہات پر ہم نے مفصل بات کی ہے۔ یعنی جس کا جو حق تھا اس کو حاصل ہو گیا۔ برسوں روایت اور نظام پھر سے قیام ہو گیا۔ ان کی عیاشی، بدمستی اور بے جا ظلم وستم کا خاتمہ ہو گیا جو خود کو مسیحا اور خدا کا دُوت سمجھ بیٹھے تھے۔ کلام کو قطع نظر کرتے ہوئے ہم اب اصلی موضوع کی طرف آتے ہیں یعنی۔۔۔۔۔۔

قاضی صاحب کی تخلیق میں بھی یہ ثابت ہو چکا اور انھوں نے ان کے ظالمانہ اور جابرانہ رویہ کو بنا کسی مصلحت کے پیش کیا ہے۔ جو اپنے جوان بیٹے کو زہر دے کر مار ڈالتا ہے۔ کیوں کہ وہ اپنے باپ کے بے جا مصارف کو پسند نہیں کرتا ہے۔ مگر اس کا باپ جو صرف زمیندار ہوتا ہے اور کچھ نہیں کہتا ہے میری زمینداری کوئی چٹائی یا دری ہے جو لپیٹ دی جائے۔

لیکن ہندوستان کی آزادی کے بعد شب گزیدہ ہوتے ہی اس طبقے کا خاتمہ ہو گیا۔ زمیندارانہ نظام کے اگر دوسرے زاویہ پر نظر ڈالیں تو ہمیں قاضی صاحب کی تخلیق میں کئی رنگ اس زمیندارانہ نظام کے پسِ پردہ نظر آتے ہیں۔ جس میں ان کی اعلا اخلاقی وتہذیبی قدریں، ہندوستانی کلچر، مشترکہ تہذیب ایک شاندار نمونہ نظر آتا ہے۔ قاضی صاحب اس بارے میں لکھتے ہیں:

''زمیندار اگر مسلمان ہے تو اس کا مختار ہندو ہوگا۔ یہ قانون تھا، اور زمین دار اگر ہندو ہے تو اس کا مختار مسلمان ہوگا۔''[4]

بہر کیف ان تمام موضوعات اور منظر کشی کی خوبصورت عکاسی قاضی صاحب کی تخلیق میں نظر آتی ہے۔ قاضی صاحب کے افسانوں میں صرف زمیندارانہ نظام کے زوال کے نظریہ سے نہ پڑھ کر ایک قاری کی حیثیت سے مطالعہ کیا جائے تو ہمیں محسوس ہوگا کہ ان کی کہانیوں میں شکست وریختہ کی وہ بڑی عبرت ناک داستان پوشیدہ ہے۔ جس میں 1857 کے غدر سے لے کر 1947 ہندوستانی کی آزادی اور پاکستان کے قیام تک مسلمانوں کی تباہی وبربادی تہذیبی اقدار کا زوال ان کی شناخت جو بری طرح ٹوٹ کر بکھر گئی تھی۔ جن کا لوٹ آنا ناممکن ہے۔ ساتھ ہی انگریز حکمرانوں کی حکمت عملی پھوٹ ڈالو اور راج کرو۔ جس میں انھوں نے صدیوں سے چلی آرہی ہندو مسلم روایت آٹھ سو سالہ تاریخ جہاں کبھی کوئی فرقہ وارانہ فسادات نہیں ہوئے کسی دہشت گرد تنظیم نے سر نہیں ابھارا۔ انھوں نے مسلمان اور ہندو کے نام سے لوگوں کے دلوں میں اس قدر نفرت کا بیج پیدا کیا۔ اور ساتھ ہندوستان کی تقسیم اور پاکستان کے قیام نے کثیر تعداد میں لوگوں کو ہجرت کرنے

---

[4]: قاضی عبدالستار: اسرار و گفتار۔ راشد انور راشد۔ عرشیہ پبلی کیشنز، نئی دہلی۔ سنہ اشاعت: 2014۔ ص: 280

پر مجبور ہونا پڑا۔ پورے ہندوستان کے مسلمانوں کے تاریخی پس منظران کے ہجرت کے مسائل جو سبھی مقامات اتر پردیس، بہار، دہلی، بنگال اوران کی بڑی، بڑی جائیداد، باغ، مکانات، کھیت، کھلیان سب پر بل ڈوزر چل گیا۔ اور ساتھ ہی ان کو وراثت کے حق سے محروم ہونا پڑا بے انتہا ظلم وستم اور مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔

اردو افسانے میں دیہات وقصبات کی پیش کش، مزدور وکسانوں کی صورت حال بیان کرنے کے بعد تقسیم ہند کی وجہ سے ترقی پسند تحریک کا زور ٹوٹنا شروع ہوا۔ جس کی بدلی ہوئی فضا اور نئے موضوعات کی عکاسی اردو ادب میں نظر آنے لگتی ہے۔ اور جس میں بدلی ہوئی تہذیبی وثقافتی، اخلاقی اقدار اور اعلیٰ روایات کو قرۃ العین حیدر، انتظار حسین، عبداللہ حسین، قاضی عبدالستار جیسے ادیبوں نے اپنی تخلیق کے ذریعہ پیش کیا۔ ابوالکلام قاسمی صاحب نے قاضی عبدالستار کے افسانوی رنگ کو تین مختلف رنگوں میں تقسیم کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''قاضی عبدالستار کے یہاں دو تین رنگ بڑے واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ ''پیتل کا گھنٹہ'' اور اس قبیل کی دوسری کہانیاں ''مالکن'' وغیرہ کا رنگ ''رضو باجی'' اور ''کھا کھا'' جیسی کہانیوں سے مختلف ہے۔ ان کا تیسرا رنگ وہ ہے۔ جو شہروں کی زندگی کے موضوعات پر لکھی ہوئی کہانیوں میں جھلکتا ہے۔ ''جنگل''، ''ہاڈل ٹاون''، اور ''سوچ'' اس نوع کی کہانیاں ہیں۔'' 5

غرض ہم اس باب میں قاضی صاحب کے افسانوں کو تین رنگ دیہی، شہری اور تاریخی زمرے میں تقسیم کرتے ہوئے ان کے افسانوں فکری وفنی مباحث پر روشنی ڈالنا چاہیں گے۔ جس کی وجہ سے قاضی صاحب کی تخلیق کے ان پہلو کی نشاندہی کی جاسکے۔ غالباً جواب تک ان کے افسانوں پر نہیں کی جاسکی ہے۔ ساتھ ہی قاضی صاحب کی تخلیق کو ادب کے کس مقام پر ہمارے نقادوں نے رکھا ہے۔ اس نقطے کو بھی سمجھا جاسکتا ہے۔ اس طرح سے پہلے ان کے دیہی افسانوں پر بحث کی جائے گی۔ جس کی وجہ سے ان کو اردو کا دوسرا پریم چند کہا جاتا ہے۔

قاضی صاحب نے اپنا پہلا افسانہ ''اندھا'' کے نام سے لکھا جو لکھنؤ سے شارب لکھنوی کی ادارت میں شائع ہونے والے ادبی جریدے ''جواب'' میں ایڈیٹر کے آدھے صفحے کے تعریفی نوٹ کے ساتھ شائع ہوا۔ قاضی صاحب کا یہ افسانہ 1946 میں شائع ہوا جب ابھی قاضی صاحب ثانوی درجے کے طالب علم تھے۔ یہ

5: ادیب (سہ ماہی) اردو فکشن نمبر، دہلی۔ جولائی 1991۔ ص: 101

افسانہ اپنے موضوع کی مقبولیت کے بنا پر دیگر اہم رسالوں میں بھی شائع ہوا۔ جس کی تصدیق صغیر افراہیم اور صاحب علی کے مضامین سے ہوتی ہے۔ جنھوں نے قاضی صاحب کے پہلے افسانے ''اندھا'' کو ''مضراب'' میں شائع ہونے کی بات لکھی ہے۔

مگر غیاث الدین احمد صاحب نے ''آئینہ ایام'' کے مقدمے میں کچھ اس طرح رقم طراز ہیں:

''ان کا (قاضی صاحب) پہلا افسانہ اندھا کے نام سے لکھنؤ کے جریدہ ''جواب'' میں ایڈیٹر شارب لکھنوی کے آدھے صفحے کے ادارتی نوٹ کے ساتھ ۱۹۴۶ میں شائع ہوا تھا۔'' 6

اس افسانے نے قاضی صاحب کو ادبی دنیا میں افسانہ نگار کی حیثیت سے متعارف کرا دیا مگر قاضی صاحب کا دھیان شاعری کی طرف ہو گیا اور انھوں نے بہت سی انقلابی نظمیں اور غزلیں محبوب کے لب و رخسار کی تعریف میں لکھیں۔ مگر قاضی صاحب کو بہت جلدی یہ بات سمجھ میں آ گئی کہ جو بات ہم نثر میں آسانی کے ساتھ اور پورے انہماک کے ساتھ کہہ سکتے ہیں وہ شاعری کے ذریعہ ممکن نہیں۔ اور وہ خود کہتے ہیں کہ ہم نے طالب علمی کا زمانہ شاعری کرنے اور ہاکی کھیلنے میں گزارا۔ لیکن جب قاضی صاحب فکشن کی طرف متوجہ ہوئے تو پوری طرح اسی میں ڈوب گئے۔ اور ان قلم سے شاہکار افسانے اور ناول وجود میں آئے۔

☆☆☆

6: آئینۂ ایام: قاضی عبدالستار کے بہترین افسانے۔ مرتب: ڈاکٹر محمد غیاث الدین۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔ سنہ اشاعت: 1995۔ ص: 11

دیہی زندگی پر مبنی افسانے

قاضی عبدالستار نے مختلف موضوعات پر مختلف نوعیت کے افسانے لکھے ہیں جن میں دیہی ،شہری اور تاریخی انداز کے افسانے قابل ذکر ہیں ۔ان تمام افسانوں پر الگ سے بات کی جائے گی۔قاضی عبدالستار نے دیہی زندگی پر جوافسانے لکھے ہیں وہ بیحد اہم ہیں۔جس پر سب سے پہلے بات کی جائے گی۔

دیہی معاشرت اور دیہی زندگی پر جس طرح سے پریم چند نے خوبصورتی کے ساتھ افسانوں کا تانا بانا بنا ہے۔کچھ اسی انداز میں آزادی کے بعد کی دیہی زندگی کو قاضی عبدالستار نے اپنے فن کا موضوع بنایا ہے۔جس کی وجہ سے ان کی تخلیقیت میں ایک لگ رنگ نمایاں ہے۔اس میں جو خاص رنگ سب سے زیادہ ابھرتا ہے وہ جاگیرداروں کی غریبی اور زوال پذیر ہوتی زندگی کا نوحہ ہے۔جس کو انھوں نے بہت قریب سے دیکھا اور افسانوں میں برتا۔ان کا تعلق اودھ کے زمیندار طبقے سے تھا جن کے پاس دولت اور زمینیں تھیں۔اس لئے قاضی عبدالستار کے یہاں زمیندارانہ طبقہ کی آن بان اور شان موجود ہے۔جب ہم ان کے افسانوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس میں قاضی عبدالستار چلتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں۔جس کی وجہ سے ان کے یہاں حقیقت کا عنصر نظر آنے لگتا ہے۔

قاضی عبدالستار کے افسانوں میں عصر حاضر کے مسائل کی جھلک بھی نظر آتی ہے انھوں نے اپنی فنی چابکدستی سے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ اگر چہ زمیندارانہ نظام ختم کر دیا گیا ہے۔مگر ابھی بھی بندھوا مزدوری اور غریبی جوں کی توں براجمان ہے''دیوالی'' جیسے افسانے میں انھوں نے اس طرح کے مسائل کی عکاسی کی ہے کہ آج بھی غریب اور مزدور کو ان کے تہوار منانے کا حق نہیں حاصل ہے بلکہ وہ صرف مالکن اور مالک کے گھر کا کام اور ان کی خوشی کے لئے اپنی خوشی قربان کر دیتا ہے۔

آزادی سے پہلے جن ظالم زمینداروں اور تعلقداروں پر تخلیق کاروں نے اپنی تخلیقات کا بیشتر حصہ صرف کیا ہے۔آج آزادی کے بعد ان کی حالت بالکل تبدیل ہو چکی ہے۔وہ بھی ایک عام انسان کی طرح

روزی روٹی کے محتاج ہیں۔ ان کے پاس کفالت شعاری کا کوئی ذریعہ موجود نہیں ہے۔ بلکہ ان کے آگے بھوکوں مرنے کی نوبت آ چکی ہے۔ یوں تو زمیندار ختم ہو گئے مگر اس سے کسانوں مزدوروں اور غریبوں کا کوئی حتی الامکان فائدہ نہیں ہوا۔ بلکہ۔ اور اسی کی جگہ ایک تیسرے فرقے سرمایہ دار نے ملک وسیاست پر پوری طرح سے قبضہ جمائے ہوئے ہے۔ جس کے زور و دھونس کو ختم کر پانا مشکل کام ہے۔ اور یہ طبقہ پورے ملک کے معاشی نظامی کو اپنے کنٹرول میں رکھتا ہے۔ جس کی وجہ سے آج بھی کسانوں کو اس کی محنت کا پورا حصہ نہیں مل پاتا ہے۔ قاضی صاحب نے زمینداروں کے شکست خوردہ نظام کا اس طرح بیان کیا ہے کہ خود قاری بھی اس کے ہمدردی کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ ساتھ ہی جدید دور کے تناظر میں بھی سوچنے اور سمجھنے کی کوشش کرتا ہے کہ اس نظام کے خاتمے کے بعد ہم نے کیا کھویا اور کیا پایا۔

محمد حسن نے قاضی صاحب کی تخلیق پر اپنی صحت مندانہ رائے اس طرح دی ہے:

''ان کہانیوں میں (قاضی عبدالستار کی کہانیوں میں) پریم چند کے بعد پہلی بار دیہات کی سچی تصویر کشی ہوتی ہے۔ یہ دیہات پریم چند کے زمانے کی طرح معصوم بھی نہیں ہے۔ اس میں نہ محض ظالم زمیندار ہیں نہ محض مظلوم کسان، بلکہ لٹے ہوئے زمیندار، پرانی آن بان کو کس طرح قائم رکھنے کی جتن کرتے ہیں۔ اور کسانوں کا ابھرتا ہوا مالدار طبقہ نئی طاقت کو حاصل کرنے اور اپنے نئے حاصل کئے ہوئے غول کے اظہار کے راستے سوچتا دکھائی دیتا ہے قاضی عبدالستار کی فکر کا محور پچھلی اقدار کو ٹوٹنے بکھرنے پس منظر سے آہنگ کرنے کے لئے انسان کی جاں باز کاوش ہے۔ وہ زمانے اور زندگی کی باگ پر بڑھ کر ہاتھ ڈالنا چاہتا ہے۔ مگر اس کوشش میں منہ کے بل گرتا ہے۔ پھر سنبھلتا ہے اور اسی طرح رخش عمر اپنا سفر طے کرتا ہے۔'' 7

محمد حسن کے اس نظریہ سے اس بات کا اتفاق کیا جا سکتا ہے کہ ان کے گاؤں پریم چند کے گاؤں سے الگ ہے۔ جن کا پورا منظر نامہ کہیں نہ کہیں بدلا ہوا ہے۔ اس لئے ہندی ادب کے ناقد بابا ناگار جن نے قاضی عبدالستار کی تخلیق کو دیکھتے ہوئے اپنی رائے کا اظہار اس طرح کیا کہ ہمیں قاضی عبدالستار کی تخلیق کو کورس ورک (Text Book) کی طرح پڑھنا چاہیے۔ انھوں نے جس طرح سے دیہات پر لکھا ہے یہ پریم چند کے بعد

7: عصری ادب: ساتویں دہائی کا افسانہ۔ محمد حسن۔ نئی دہلی۔ سنہ اشاعت: 1970۔ ص: 139

قاضی عبدالستار کا ہی کارنامہ ہے۔

قاضی عبدالستار کے افسانوں میں موضوعاتی تنوع کم پایا جاتا ہے۔ان کی تمام کہانیاں زمیندارانہ نظام کے آس پاس پر ہی مبنی ہیں مگر انھوں نے جو کچھ لکھا اس ایک سماجی شعور اور تخلیقی وفور ملتا ہے جس کی وجہ سے ایک عام واقعہ بھی غیر معمولی اور نہایت معنی خیز بن جاتا ہے۔ان کے ہر افسانے میں ایک نیا رنگ نظر آتا ہے کو ان کے افسانوی کائنات میں بکھر جاتا ہے۔اور جس کی شناخت بھی مشکل ہوتی ہے۔ یہ انداز بیان دیہی زندگی پر لکھے گئے افسانوں کے ساتھ زیادہ دکھائی دیتا ہے۔

مختصر یہ کہ افسانے کے اس باب میں ہم قاضی عبدالستار کے افسانوں کے فنی محاسن کا پتا لگانے کی کوشش کریں گے۔تا کہ ان کی تخلیق کی فنی خوبیاں اجاگر ہوسکیں۔ساتھ ہی ان کے اسلوب کی رنگا رنگی زبان و بیان کی خوبیوں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

یہاں قاضی عبدالستار کے دیہی زندگی پر مبنی چند افسانوں کا تجزیہ کیا جائے گا۔جس میں انھوں نے دیہی معاشرت، دیہی زندگی کے طرز و تہذیب کو برتا ہے۔ساتھ ہی زمیندارانہ نظام کے زوال کے زمینداروں کی مٹتی اور گم ہوتی شناخت اور ان کے دکھ درد اور مصیبتوں کو پیش کیا ہے۔

پیتل کا گھنٹہ

’’پیتل کا گھنٹہ‘‘ قاضی عبدالستار کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے۔جس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۸۳ میں الٰہ آباد سے شائع ہوا اس میں ایک ناولٹ ’’مجّو بھیا‘‘ بھی شامل ہے۔جس کا جائزہ ناول کے باب میں لیا جائے گا۔اس کے علاوہ تین افسانے ’’پیتل کا گھنٹہ‘‘، رضو باجی‘‘، ’’مالکن‘‘ بھی شامل ہیں۔پیتل کا گھنٹہ پہلی بار ماہنامہ ’’کتاب‘‘ لکھنؤ سے 1962 کے فروری شمارے میں شائع ہوا۔صاحب علی نے لکھا ہے:

’’1964 میں پیتل کا گھنٹہ قاضی عبدالستار نے لکھا۔‘‘ 8

غیاث الدین نے لکھا ہے:

’’1964 سے باقاعدہ افسانہ نگاری کا آغاز ہوتا ہے جب انھوں نے ’’پیتل کا گھنٹہ‘‘ جو ماہنامہ ’’کتاب‘‘ لکھنؤ میں شائع ہوا۔‘‘ 9

ماہنامہ ’’کتاب‘‘ کے کور پیج پر منتخب افسانہ نمبر 1962 میں شائع ہونے کے بارے میں لکھا ہے۔ممکن ہے کہ یہ افسانہ 1962 میں شائع ہوا۔

قاضی عبدالستار کا افسانہ ’’پیتل کا گھنٹہ‘‘ ایک ایسا افسانہ ہے جس کو زمین دار یا جاگیر دارانہ نظام کے خاتمے کے گھنٹے کے طور پر جانا جاسکتا ہے۔اس افسانے کے شائع ہوتے ہی قاضی عبدالستار شہرت کی بلندیوں پر پہنچ گئے اور ان کو اردو کا ایک اہم افسانہ نگار تسلیم کیا جانے لگا۔حصول آزادی کے بعد جس طرح سے حکومتِ ہند نے زمین دارانہ نظام کو رد کر دیا۔جس کی وجہ سے بڑے بڑے صاحب ملکیت لوگ زمین پر آ گئے۔نہ صرف زمین پر آ گئے بلکہ ان کے آگے کفالت شعاری کا شدید مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا۔ایک ایسا زمیندار جس نے کبھی اپنے ہاتھ سے ایک گلاس پانی بھی نہ پیا ہوگا جس کو عدالت تک طلب نہ کر سکتی ہو اور جن کے لئے بندوقوں کا لائسنس حاصل کرنا نہایت حقیر کام سمجھا جاتا ہو۔اُس زمیندار کے لئے اپنی شان و شوکت، رعب و جلال کی وجہ سے کسی کے در پر نوکری کرنا نہایت ہی اہانت آمیز بات لگتی تھی۔نتیجتاً زمینداروں کے آگے بھوکوں مرنے کی

8: اردو فکشن کا مطالعہ: ڈاکٹر صاحب علی۔اردو چینل۔سنہ اشاعت:2006۔ص:153

9: آئینۂ ایام: قاضی عبدالستار کے بہترین افسانے۔مرتب: ڈاکٹر محمد غیاث الدین۔ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔سنہ اشاعت:1995۔ص:11

نوبت آ گئی اور گھر کے قیمتی اشیاء دھیرے دھیرے فروخت ہونے لگے۔ ان تمام واقعات وحادثات کی بازگشت قاضی عبدالستار کے اکثر افسانوں میں نظر آتی ہے۔

اس افسانہ میں مصنف کا درد اور مرکزی فکر متن میں اس قدر رچ بس گئی ہے کہ اس کو آسانی سے سمجھ پانا مشکل ہے، اور کہیں پر بھی ایسا محسوس نہیں ہوتا کہ مصنف نے جان بوجھ کر کوئی واقعہ بیان کیا ہو۔ بلکہ افسانہ کو پڑھ کے ایسا لگتا ہے کہ اس میں کوئی عام واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ جب کہ اس افسانے کی بنیادی فکر کو سمجھنے کے لئے ہمیں زمینداری کے عروج وزوال اور تہذیب وثقافت سے واقفیت ہونا ضروری ہے۔ جو اس افسانے کے متن میں پوشیدہ ہے۔

''پیتل کا گھنٹہ'' زمینداروں کی رخصت ہوتی ہوئی تہذیب وثقافت ایک ایسے خاص معاشرے اور نظام کا وہ قصۂ پارینہ ہے جس میں بھسول اسٹیٹ کے زمیندار قاضی انعام حسین کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ اس میں راوی کو قاضی انعام حسین کے دور کے رشتے دار کے طور پر دیکھا گیا۔ راوی کہیں جارہا تھا تبھی لاری کا انجن خراب ہوجاتا ہے۔ بہت کوشش کرنے کے باوجود بھی انجن کام نہیں کرتا۔ لاری کے سبھی لوگ اُتر جاتے ہیں اور بیڑی اور سگریٹ سلگانے لگتے ہیں۔

تبھی ایک دیہاتی آدمی راوی کے ہاتھ سے آدھی جلی ہوئی تیلی نکال لیتا ہے۔ راوی اس کی بے تکلفی پر ناگواری کا اظہار کرتا ہے۔ مگر کچھ بول نہیں پاتا۔ کیونکہ ہندوستان کی آزادی اور دستور ہند کا عمل اور برابری کا قونون نافذ ہونے کی وجہ سے عام انسان بھی آگے تمام حقوق پانے کا حقدار ہوگیا۔

راوی کے دریافت کرنے پر یہ کون سا گاؤں ہے۔ بھسول کا نام سنتے ہی راوی کو اپنی شادی یاد آجاتی ہے۔ اور زمیندارانہ نظام کی شان وشوکت کے ذہن میں تازہ ہوجاتی ہے۔ اور اس کو قاضی انعام حسین جو بھسول کے زمین دار تھے جن کے چاروں طرف خدمت گاروں کی ایک ٹولی ہمیشہ جمع رہتی تھی۔ جن کی حکومت اور دولت کے افسانے راوی نے اپنے گھر میں سن رکھے تھے۔ غرض وہ پگڈنڈی کے راستے ہوتے ہوئے گزرتا ہے تبھی اس کی نظر قاضی انعام حسین کی بنوائی ہوئی مسجد پر پڑی جس کے چاروں طرف عمارتوں کے بجائے اُس کا ملبہ دکھائی دیتا ہے۔ وہاں پر نہ تو کوئی آدم ہے اور نہ ہی آدم زاد۔ راوی جب اپنی سسرال تک پہنچتا ہے تبھی ڈیوڑھی سے قاضی انعام حسین لمبے قد کے جھکے ہوئے، ڈورے کی قمیض، میلا پاجامہ اور موٹر ٹائر

کے تلوؤں کا پرانا پمپ پہنے ہوئے ماتھے پر ہتھیلی کا چھجہ بنائے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

اس افسانے میں قاضی صاحب نے حلیہ، پوشاک، ساز وسامان اور الفاظ کے ساتھ مہمان نوازی کے انداز سے زمینداروں کے اوپر گزرے تغیرات زمانہ اور وقت کے جبر،ظلم وستم کو نہایت باریکی سے بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔افسانے کا ایک اقتباس پیش ہے:

''ہم اس چکر دار ڈیوڑھی سے گزر رہے تھے جس کی اندھیرے چھت کمان کی طرح جھکی ہوئی تھی دھنّیوں کو گھنے ہوئے بدصورت شہیتر روکے ہوئے تھے۔

وہ ڈیوڑھی ہی سے چلائے ارے سنتی ہو....دیکھو تو کون آیا ہے میں نے کہا اگر صندوق وندوق کھولے بیٹھی ہو تو بند کر لو جلدی سے۔لیکن دادی تو سامنے ہی کھڑی تھیں۔دھلے ہوئے گھڑوں کی گھڑونچی کے پاس دادا ان کو دیکھ کر سٹپٹا گئے۔وہ بھی شرمندہ سی کھڑی تھیں۔پھر انھوں نے لپک کر گھر کی الگنی پر پڑی مارکین کی دھلی چادر گھسیٹ لی۔اور ڈوپٹہ کی طرح اوڑھ لیا۔ چادر کے ایک سرے کو اتنا لمبا کر دیا کہ کرتے کے دامن میں لگا دوسرے کپڑے کا چمکتا پیوند چھپ جائے۔'' 10؎

سماجی رشتوں اور روایتی قدروں کی پاسداری پر قاضی صاحب نے نہایت باریک بینی سے نظر ڈالی ہے۔مہمان کی خاطر مدارات کرنے کے لئے میاں بیوی متفکر ہوتے ہیں اور نظریں نہیں ملا پاتے۔اقتباس:

''...جس پر میلے کپڑے، کتھے چونے کی کلیاں اور پان کی ڈلیاں ڈھیر تھیں اور آنکھوں سے کچھ اور سوچ رہی تھیں۔'' 11؎

یہاں آنکھوں سے کچھ اور سوچنے کا مطلب مہمان کی خاطر داری سے ہے کیونکہ گھر میں چند ٹوٹے پھوٹے برتنوں کے علاوہ نہ تو کوئی اشیاء نہ ہی پیسے تھے۔آگے کا اقتباس ملاحظہ ہو:

''قاضی انعام حسین۔دونوں ہاتھوں میں خدمت گاروں کی طرح طباق اٹھائے ہوئے آئے۔جس میں الگ الگ رنگوں کی دو پیالیاں ''لب سوز'' لب بند چائے سے لبریز رکھی تھیں۔ایک بڑی سے پلیٹ میں دو ابلے ہوئے انڈے کاٹ کر پھیلا دیے گئے تھے۔'' 12؎

10؎ آئینۂ ایام: قاضی عبدالستار کے بہترین افسانے۔مرتب: ڈاکٹر محمد غیاث الدین۔ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔سنہ اشاعت: 1995۔ص: 52

11؎ آئینۂ ایام: قاضی عبدالستار کے بہترین افسانے۔مرتب: ڈاکٹر محمد غیاث الدین۔ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔سنہ اشاعت: 1995۔ص: 53

12؎ آئینۂ ایام: قاضی عبدالستار کے بہترین افسانے۔مرتب: ڈاکٹر محمد غیاث الدین۔ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔سنہ اشاعت: 1995۔ص: 53

اس اقتباس میں قاضی صاحب کی باریک بینی کو داد دینی پڑتی ہے۔ دو رنگ کے چائے کے پیالے کہنے کا مقصد زمین داروں کی اس ٹھاٹ باٹ اور شان و شوکت کی ایک کہانی پوشیدہ ہے۔ جس میں خوبصورت اور قیمتی سامانوں سونے، چاندی، پیتل، تانبہ کا برتن استعمال کرنے والے لوگ آج دو رنگ کے برتن میں چائے پینے پر مجبور ہیں۔ ایک بڑی سے پلیٹ میں انڈے کاٹ کر پھیلا دینا ان کی مفلسی کو ظاہر کرتا ہے۔ انڈے کو کاٹ کر پھیلانے کا مقصد زیادہ دکھانا تاکہ وہ کم نہ دکھائی دے۔ انواع اقسام کھانے سے دسترخوان کو سجانے والے زمیندار آج دو انڈے کو کاٹ کر پھیلانے پر مجبور ہیں۔

قاضی صاحب نے اس افسانے میں زمینداروں کو جس طرح بے بس اور مجبور دکھایا ہے وہ قابل غور ہے اور پرکشش بھی۔ ترقی پسند تحریک کے تحت جس طرح سے یک رنگی طریقۂ تخلیق رائج الوقت تھا جس میں ہر زمیندار ظالم و جابر اور ہر کسان مظلوم و مجبور تھا۔ قاضی صاحب نے اس یک رنگی نظریہ سے الگ ہٹ کر اردو افسانے کو ایک نئی جہت سے روشناس کرایا۔ بلکہ آزادی کے بعد زمینداروں کے اوپر جس مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا اس کی سچی اور حقیقی داستان کو پیش کیا۔

قاضی صاحب کے فن کا خاص وصف یہ ہے کہ انھوں نے نہ صرف زمینداروں کی حالت زار کو بیان کیا ہے بلکہ اس کے ساتھ ہی ان تمام عادات و اطوار، عیش پرستی، عیاشی، قتل و غارت گری، بے جا مصارف اور دیگر برائیوں کو بھی بیان کرنے سے اجتناب نہیں کیا جس کی وجہ سے آج انھیں یہ دن دیکھنا پڑتا ہے۔

ڈاکٹر احمد خاں قاضی صاحب کے فکر و فن پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> ''انھوں نے زوال پذیر جاگیردارانہ نظام کے پس منظر میں انسانی رشتوں کو جس درد انگیز پیرائے میں پیش کیا ہے یہ انھیں کا حصہ ہے۔ پریم چند کے بعد قاضی صاحب کا شمار ان اہم افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے جنھوں نے دیہی زندگی اور دیہی معاشرت کی بھرپور تصویر کشی کی ہے۔ اسی خصوصیت کے بنا پر انھیں اردو کا دوسرا پریم چند کہا جاتا ہے۔'' 13؎

افسانے میں جب راوی نہانے جاتا ہے تو اسے وہاں پر پیتل کا گھنٹہ دکھائی دیتا ہے جو بھسول اسٹیٹ کی اعلان ریاست کی شان میں ایک صدی سے بجتا چلا آ رہا تھا جو مونگیوں کی مار سے داغ دار ہو گیا تھا۔

دوسرے دن جب راوی رخصت ہونے لگتا ہے تو دادی اس کے بازو پر امام ضامن باندھتی ہیں اور

13؎ قاضی عبدالستار: فکر، فن اور فنکار۔ ڈاکٹر احمد خان۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ۔ سنہ اشاعت: 2011۔ ص: 211

اکاون روپئے مٹھائی اور ۱۰ روپئے کرائے کے لئے دیتی ہیں۔ جب راوی اس کے لئے منع کرتا ہے تو کہتی ہیں۔اقتباس:

''چپ رہوتم...تمھاری دادی سے اچھے تو ایسے ویسے لوگ ہیں جو جن کا حق ہوتا ہے وہ دے تو دیتے ہیں۔غضب خدا کا تم زندگی میں پہلی بار میرے گھر آؤ اور میں تم کو جوڑے کے نام پر ایک چٹ بھی نہ دے سکوں۔ میں... تیری دادی تو فقیرن ہوگئی،... بھکارن ہوگئی۔

معلوم نہیں کہاں۔کہاں کا زخم کھل گیا تھا وہ دھاروں دھار رو رہی تھی۔'' 14؎

اس اقتباس میں قاضی صاحب نے جس شدت کے ساتھ ان کرب و اذیت سے ان کی حالت زار کو بیان کیا ہے جس میں قاری خود کو شریک مانتا ہے اور ایک عجیب سی احساس ندامت میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ نہ جانے کہاں کہاں کا زخم کھل گیا تھا۔ اس جملے میں زمینداروں کی شان وشوکت،عظمت، رتبہ، جاہ وجلال، رعب و دبدبہ کی یاد دلاتا ہے جس کو آسانی سے بھول جانا ان کے بس کی بات نہیں تھی۔

وہ طبقہ جو امتیازی شان کے ساتھ زندگی گزارتا تھا۔زمین داری کے خاتمے کے بعد کس طرح نان شبینہ کا محتاج ہو گیا۔ وہ کوٹھیاں، محلات، حولیاں نوکر چاکر ہاتھی گھوڑے تمام حکومتِ عصر اور تبدیلیٔ وقت کے ہاتھوں میں چلے گئے وہ لوگ جو کل تک اس طبقہ کے یہاں کھاتے پیتے اور کام کرتے تھے آج سماج کے اعلیٰ طبقوں میں ان کا شمار ہونے لگا کل کا کسان آج کا زمیندار بن گیا سرپنچ مکھیا اور تھانے دار بن گیا اب یہاں کے زمینداروں کے محلات، حولیوں اور کوٹھیوں کے صرف کھنڈرات باقی رہ گئے ہیں گزشتہ آن بان اور شان ختم ہو چکی ہے انھیں کھنڈرات اور عظمتِ رفتہ کے نشانات کو قاضی صاحب اپنی تخلیق میں پُر جلال زبان اور بے مثال اسلوب میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔

جب راوی یکّے سے رخصت ہوتا ہے تو یکّہ والا ایک سواری کو بیٹھاتا ہے اور بتاتا ہے کہ یہ بھسول کے شاہوکار ہیں۔ جب ساہوکار جی یکّہ سوار ہو جاتے ہیں تو یکّے والا ان کے سامنے پیتل کا گھنٹہ لا کر رکھ دیتا ہے۔

اس افسانے میں قاضی صاحب نے قاضی انعام حسین کے ذریعہ زمیندارانہ نظام کی اس تہذیبی اقدار کو بھی بیان کرنے کی کوشش کی ہے جو زمیندارانہ نظام کے خاتمے کے ساتھ ہی پوری طرح ختم ہو چکی ہے۔اس

14؎ آئینۂ ایام: قاضی عبدالستار کے بہترین افسانے۔مرتب: ڈاکٹر محمد غیاث الدین۔ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔سنہ اشاعت:1995۔ص:55

افسانے میں قاضی انعام حسین کے پاس اپنے مہمان کی میز بانی کرنے کے لئے پیسے نہیں ہوتے تو وہ اپنے ریاست کی آخری نشانی کو فروخت کرنے میں عار محسوس نہیں کرتے اور بیچ کر اپنی مہمان کی خاطر مدارات کرتے ہیں۔جس کی وجہ سے ہمارے دل میں زمیندارانہ طبقے کی وہ اونچی تہذیبی اور اخلاقی اقدار پیوست ہوجاتی ہیں۔ زمینداری کے خاتمے کے ساتھ ہی ان کی سماجی زندگی کا روخ اچانک بدل جاتا ہے۔ان کی پوری تہذیبی روایت غریبی کا شکار ہوجاتی ہے تہذیب کی ہی اعلیٰ روایت بار بار قاضی صاحب کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے اور انھیں اپنی اسی تہذیبی اقدار سے لاشعوری طور پر جو ایک وابستگی تھی جس سے وہ خود کو الگ نہیں کر پاتے ہیں۔جس کا وہ بار بار بیان کرنے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔اس کے بارے میں ابوالکلام قاسمی صاحب فرماتے ہیں:

> ''ان کا غیرت مند میز بان اپنی ریاست کی آخری نشانی فروخت کر کے ریاست کی یاد سے بھی دست بردار ہونا گوارا کر لیتا ہے۔مگر اپنی روایتی مہمان نوازی اور تہذیبی فرائض کی انجام دہی میں کوتاہی کرنا گوارا نہیں کرتا۔'' 15؎

پیتل کا گھنٹہ بیچاں کر قاضی صاحب سے شاید یہ بھی دکھایا کہ اگر چہ زمینداری ختم ہو چکی ہے اور وہ واپس آنے والی نہیں ہے مگر وہ ماضی کا ایک واقعہ بن گیا مگر گھنٹہ بیچ کر اس کے میزان نے اپنی تہذیبی اقدار کی جو چھاپ چھوڑی ہے وہ کبھی نہیں مٹنے والی ہے۔اگر زمینداری نظام کو بھول بھی جائے تو پیتل کا گھنٹہ بیچ کر کی گئی مہمان نوازی کو لوگ ہمیشہ یاد رکھیں گے۔

پیتل کا گھنٹہ بک جانے اور ساہوکار کے ہاتھوں میں پہنچنے سے پہلے اگر اہم اس افسانے کا گہرائی سے مطالعہ کریں تو ہمیں قاضی انعام حسین زمیندارانہ طبقے کا نمائندہ نظر آتے ہیں۔جس میں انھوں نے پیتل کا گھنٹہ جوان کی ریاست کی آخری نشانی کی طرح ان کے پاس موجود تھا۔ جس کو دیکھ کر راوی حیرت زدہ رہ جاتا ہے۔وہ پیتل کا گھنٹہ جس پر قاضی انعام حسین آف بھسول اسٹیٹ اودھ کا چانداور ستاروں کا مونوگرام بنا ہوا تھا،ساہوکار کے ہاتھوں میں چلا جاتا ہے۔وہ ساہوکار طبقہ جو آزادی کے قبل کسانوں اور مزدوروں کے استحصال میں زمینداروں کا برابر کا شریک کار رہا تھا۔ پرانے نظام کے زوال اور نئے نظام کے عروج، اقتصادی مسائل سرمایہ دارانہ نظام کا تسلط ایک ایسا خوفناک منظر تھا جس کی وجہ سے مالکن اور محلوں کے اندر

15؎:ادیب(سہ ماہی)اردو فکشن نمبر،دہلی۔جولائی 1991۔ص:102

رہنے والی عورتیں اپنی قدروں کو چھوڑ کر کفالت شعاری کے لئے کرتے سینے اور محنت مزدوری کرنے پر مجبور ہوگئیں۔اور مقروض باپ اپنی بیٹیوں کو عمر دراز لوگوں سے بیاہ دیا۔

نئے نظام کے تحت ساہوکاروں کی مالی حالت بہتر ہوئی مگر زمینداروں کو بری طرح شکست وریخت کا سامنا کرنا پڑا۔اور زمیندارانہ نظام کی جگہ ایک نئے نظام نے جنم لے لیا۔اس کے بارے میں صغیر افراہیم صاحب لکھتے ہیں:

''اس منظر میں نوآبادیاتی نظام کا استحصالی طبقہ دم توڑ چکا ہے۔لیکن پردھان سرپنچ لیکھ پال اور سرکاری افسران کی شکل میں اس طبقے کا وجود ضرور برقرار ہے۔'' 16

ساہوکار کے ہاتھوں میں پیتل کا گھنٹہ چلا جانا ظلم کے اس بدلتے طریقہ کار کو قاضی صاحب نے طنز بھرے انداز میں نشانہ بنایا ہے۔اور یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ آزادی کے بعد زمیندار تو ختم ہو گئے مگر ساہو کار،سرمایہ دار جس میں ملٹی نیشنل کمپنیوں کے مالک آج بھی کسانوں اور مزدوروں کا جس طرح سے استحصال کر رہے ہیں۔جس کی وجہ سے کسانوں اور مزدوروں کی حالت آج بھی ویسی کی ویسی ہی بنی ہوئی ہے۔جس کی وجہ سے وہ آئے دن خودکشی وخودسوزی کرنے پر مجبور نظر آتے ہیں۔

سرمایہ دار اور ملٹی نیشنل کمپنیاں ایک نئے انداز میں کسانوں اور مزدوروں کا استحصال کر رہی ہیں جو دکھائی دینے کے باوجود بھی نظر نہیں آتا ہے۔یہ ملٹی نیشنل کمپنیاں اُن کسانوں کی محنت سے تیار کئے گئے سامانوں کو کم قیمتوں پر خرید کر انھیں اتنے اونچے داموں پر فروخت کر رہی ہیں جس کا اندازہ خریدنے والے کو بھی نہیں ہوتا۔دو روپئے میں ایک کلو خریدے گئے آلو سے وہ ایک پیکٹ میں صرف آدھے آلو سے بنائی گئی چپس کا پیکٹ پانچ روپئے میں بیچتے ہیں۔اور یہ کسان اور مزدور اتنا لاچار اور بے بس ہے کہ ان اور سرمایہ داروں کے خلاف چاہتے ہوئے بھی کوئی قدم نہیں اٹھا سکتا،جس طرح سے اس نے زمیندارانہ نظام کو ختم کرنے کے لئے متحد ہو کر قدم اٹھایا تھا۔یکے والا جب گھنٹے کے بارے میں ساہوکار جی سے دریافت کرتا ہے تو ساہوکار جی بتاتے ہیں:

''ہاں کل شام معلوم نائی کا وقت پڑا ہے میاں پر کہ گھنٹہ دے یدہن بلائے کے۔ایی...تبھی یکے والا کہتا ہے...''ہاں وقت وقت کی بات ہے۔شاہ جی ناہیں تو ای گھنٹہ...اے گھوڑے کی دم راستہ دیکھ کر کے چل...''یہ کہہ کر اس نے چابک جھاڑا۔'' 17

16: افسانوی ادب کی نئی قرأت۔پروفیسر صغیر افراہیم۔ایجوکیشنل بک ہاؤس،علی گڑھ۔سنہ اشاعت:2011۔ص:73

17: آئینۂ ایام:قاضی عبدالستار کے بہترین افسانے۔مرتب:ڈاکٹر محمد غیاث الدین۔ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،دہلی۔سنہ اشاعت:1995۔ص:56

وقت وقت کی بات ہے اس جملے میں قاضی صاحب نے ماضی اور حال کی بہترین عکاسی کی ہے۔ وقت جو ہر لمحہ بدلتا رہتا ہے جس پر کسی کا بس نہیں ہوتا۔ اور ہر عروج کو اپنے پاؤں تلے روند کر اس کو ماضی بنا دیتا ہے۔گلوں کو شاخ سے ٹوٹنے اور پھوٹنے کے عمل کو روکا نہیں جا سکتا ہے۔

اس افسانے میں راوی کو محسوس ہوتا ہے کہ ''میاں قاضی انعام کا برا وقت میں ہی ہوں باجود اس احساس کے اس کا قدم مستقبل کی طرف رہتا ہے کیوں کہ وقت کو کوئی روک نہیں سکتا ہے۔''

عابد سہیل نے قاضی عبدالستار کی پوری تخلیق اپنے فکر کے محور و مرکز میں لا کر گفتگو کرتے ہیں اور انھوں نے ہر اچھے افسانہ نگاروں کی تخلیق پر سوالیہ نشان لگاتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

> ''قاضی عبدالستار نے اپنے افسانہ کے فریم میں جڑی ہوئی جس تصویر کا انتخاب کیا ہے وہ شیشہ کے پیچھے اپنا رنگ و روغن چاہے کچھ دن اور برقرار رکھ لے لیکن ہر اس دن کے ساتھ جو گزر رہا ہے وہ نئے سیاق وسباق سے کٹتی جا رہی ہے اور اگلے دس بیس برسوں بعد صرف داستان پارینہ کے طور پر زندہ رہے تو رہے اصل زندگی میں ہرگز موجود نہ ہوگی۔ زندگی کا نسب و نما تیزی سے تبدیل ہو رہا ہے اور ہر کردار کو ایک ایسے ملک میں جو ابھی صرف ترقی پذیر ہے اتنی اور ایسی تبدیلیوں سے دو چار کر رہا ہے۔ جتنی اور جیسی پہلے صدیوں میں بھی نہیں ہوتی تھی۔ قاضی عبدالستار نے اپنے بیشتر تخلیق میں زمینداروں اور اس دور کے نوابین عہد کو اپنے اپنی تخلیق کا محور و مرکز بنایا ہے۔ کیا آنے والے وقت میں ان کی تخلیق کی معنویت قائم رہے گی یا وقت جس تیزی سے گزر رہا ہے جو اس کو پیروں تلے روندتے ہوئے گزر جائے گی۔'' 18

عابد سہیل صاحب کی اس بات پر غور کریں تو حقیقت صاف نظر آئے گی اور یہ حقیقت نہ صرف قاضی عبدالستار کی تخلیق کے بارے میں کہا جا سکتا ہے بلکہ پوری دنیا کا ادب جس بحرانی دور سے گزر رہا ہے۔ یہ بات تمام ادبیات پر صادق آتی ہے۔ باوجود ابھی بھی ادب کے شوقین زندہ ہیں اور قاضی صاحب کی تخلیق پر بابا ناگا رجن کے اس جملے کو یاد کرنا چاہئے۔

بابا ناگا رجن نے قاضی عبدالستار کے فن پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ قاضی صاحب کی تخلیق کو ہمیں

18: نذر قاضی عبدالستار۔ مرتب: پروفیسر محمد غیاث الدین۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔ سنہ اشاعت: 2006۔ ص: 251

کورس ورک کے روپ میں پڑھنا چاہئے۔

مسلم تہذیب وثقافت کے ساتھ تاریخی عمارتوں کا ذکر جامع مسجد کے دراز نو بیٹھ کر نہ قبول ہونے والی دعا اور مشترکہ تہذیب کے ساتھ اقتدار کی ہوس کی بہت سی مثالیں قاضی صاحب کی تخلیق میں آسانی سے دیکھی جا سکتی ہیں۔غرض یہ بات دور حاضر کی روشنی میں دیکھا جائے تو قاضی صاحب کی تخلیق ایک دستاویزی سند رکھتی ہے۔جس طرح سے کسی ملک یا قوم کی تاریخ تہذیب اور تمدن جاننے کے لئے وہاں کے ادب کو پڑھنا ضروری ہو جاتا ہے ٹھیک اسی طرح سے زمین داروں کی تاریخ ان کی تہذیب وثقافت ساتھ ہی زمینداری کے خاتمے کے اسباب وعلل جاننے کے لئے قاضی عبدالستار کی تخلیق پڑھنا ضروری ہو جاتا ہے۔

☆☆☆

سایہ

سایہ قاضی عبدالستار کی ماضی کی یاد میں لکھی گئی کہانی ہے۔قاضی عبدالستار کی فکر وفن کا محور ومرکز جہاں زمینداری نظام کے خاتمہ کے بعد زمینداروں کی تباہی و بربادی کی داستان کی اہم ناک تصویر پیش کرنا ہے وہیں ماضی کی یاد میں سکون کے کچھ لمحے کی تلاش بھی دکھائی دیتی ہے ایسا نہیں ہے کہ قاضی عبدالستار کے فن میں صرف ماضی کا ماتم نظر آتا ہے یا ماضی کی بازیافت کا عمل ہے بلکہ انھوں نے اپنی تخلیق کے ذریعہ ایک ایسے دور کو کہانیوں کے البم میں بند کر دیا ہے جس کو کھولنے پر ماضی کی کربناک داستانوں کی تصویر دکھائی دیتی ہے ارسطو نے کہا تھا کہ ٹریجڈی کا اصل درد امیر لوگوں کے خاتمہ پر ہوتا ہے۔اسی طرح جس زمیندار کو ایک مدت تک ظالم و جابر کے نام سے جانا گیا ہے جو سماج کے حاکم اور امیر تھے جب وہ برباد ہونے لگے تو ان کی تباہی و بربادی کا غم اسی نظام کے پروردہ لوگوں کو زیادہ ہوا۔

جب کہ عام لوگ اس تبدیلی سے زیادہ متاثر نہیں ہوئے خاص طور سے ہندوستان کے ادیبوں نے اس نظام کے خاتمہ پر کوئی خاص توجہ نہیں دی اور نہ ہی اسے اپنے تخلیق کا حصہ سمجھا اور اسے پیش کرنا ضروری نہیں جانا۔یہ انفرادیت قاضی عبدالستار کے حصہ میں آئی۔

زمینداداری نظام کے خاتمہ کو آسانی سے قبول کر لینے کے پیچھے مختلف وجوہات تھیں جن میں ایک خاص وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ صاحب حیثیت زمیندار جو مسلمان تھے پاکستان بننے کے بعد وہ آسانی کے ساتھ

پاکستان جاکر عیش و آرام کی زندگی بسر کرنے لگے۔ آزادی کے بعد ہندوستان میں بہت کم ہی زمیندار بچے تھے جو چھوٹے حیثیت کے مالک تھے۔ جو نہ تو پاکستان جاسکتے تھے اور نہ ہی عیش و عشرت کی زندگی ہندوستان میں گزار سکتے تھے۔ ان کے ساتھ کئی طرح کی مصیبتیں تھیں قاضی عبدالستار نے انھیں چھوٹے حیثیت کے زمینداروں کے ذوق و شوق کا بیان کیا ہے۔ جہاں وہ ایک چھوٹی سی بات اور خلاف توقع اور مزاج کے مطابق کوئی بات نہ ہونے پر کس طرح سے آپے کے باہر ہوکر غصہ میں بے قابو ہو جاتے تھے ساتھ ہی بدلہ لینے کے لئے کسی بھی چیز کی بازی لگا دیا کرتے تھے یا نچلے طبقے کی زبان سے اپنے بارے میں کوئی بھی بات جوان کے مزاج کے خلاف ہوئی تھی برداشت نہیں کرتے تھے۔ اور خود کو سچا ثابت کرنے کے لئے زندگی روپیہ پیسہ بھی داؤ پر لگا دیتے تھے۔

اس کہانی میں ایسے ہی ایک موتی بیچنے والے کا واقعہ ہے جس میں خوش بخت بہادر سے موتی نہ خریدنے میں اس نے شاہ جی سے کہا کہ ''جی ہاں موتی مہنگے ہیں''۔ اس جملے کو سن کر شاہ جی کو محسوس ہوا کہ اسے کم حیثیت سمجھا گیا اور طیش میں آکر اپنے گھر میں رکھے ہوئے تمام موتی جوئے میں داؤ پر لگاتے ہیں اور ہارتے جاتے ہیں مگر خود ہار نہیں مانتے دھیرے دھیرے باغ تال جنگل بازار سب ہارتے جاتے ہیں یہاں تک کہ ان گڑھی کو بھی رہن پر رکھنا۔ پڑتا ہے بالآخر ایک دن مر جاتے ہیں ان کی موت کے بعد ان کی بیوی کو بہت سی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے کیوں کہ کفالت شعاری کا کوئی ذریعہ موجود نہیں تھا۔

اس افسانے میں قاضی عبدالستار نے دیہاتی زبان اور دیہاتی مکالموں کے ساتھ افسانے کے پلاٹ کا تانہ بانہ بنا ہے اور افسانے کو ماضی کی یاد سے آغاز کرتے ہوئے نہایت دردمندانہ انداز میں ایک بیوہ کی زندگی کو پیش کیا ہے ساتھ ہی زمینداروں کے عجیب و غریب شوق اور ان کی طرز زندگی پر نظر ڈالی ہے۔ اس کے علاوہ قاضی عبدالستار کے فن کا خاص وصف مشترکہ تہذیب اس افسانے میں دکھائی دیتی ہے یہاں دیوالی اور دوسرے تیوہار کس طرح ایک دوسرے سے مل کر مناتے اور ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہوکر ساتھ دینے کی برسوں کی روایت دیکھنے کو ملتی ہے۔ یہی زمیندار جو تباہ و برباد ہوئے جن کو مصنف نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور ان کے دکھ درد کو اپنے فکر اور فن کا حصہ بنایا۔ قاضی عبدالستار نے مسلمان زمینداروں کی زیادہ کہانیوں ادب میں پیش کی ہیں۔ اگر انھوں نے ہندو زمیندار جو ظالم و جابر تھے اور اپنی ذات برہمن اور پنڈت

طبقہ سے تعلق رکھتے تھے ان کے ظالمانہ اور جابرانہ رویوں کو بیان کرتے ہوئے ان کی تباہی و بربادی کی داستان پیش کی ہوتی جوانھوں نے کسانوں اور مزدوروں کے ساتھ رواں رکھا تھا تب ان کی کہانیوں کا کینوس بڑا ہو جاتا اور ان کی تخلیق میں نمایاں فرق ہوتا۔شاید قاضی صاحب کے پیش نظر مسلمان زمینداروں کی اعلیٰ تہذیبی روایت ان کے رکھ رکھاؤ کی کہانی پیش کرنا تھا جوانوکھی اور منفرد تھی۔جو وقت کے ساتھ ختم ہوتی چلی گئی تہذیب کی یہی اعلیٰ روایت قاضی صاحب کو بار بار قلم اٹھانے پر مجبور کرتی ہے۔اس کے علاوہ قاضی عبدالستار نے زمینداروں کے بے جا مصارف عیش پسندی اور موضوع بنایا ہے۔

''سایہ'' کہانی میں انھوں نے ایک مسلم گھرانے اور مسلمان زمیندار کی کہانی بیان کی ہے جس زمیندار شاہ جی کے مرنے کے بعد اس کی بیوی اکیلے زندگی گذارتی ہے۔کفالت شعاری کا کوئی ذریعہ نہیں بچا ہے۔ اور اسے محسوس ہوتا ہے کہ ہندوستان اور پاکستان جانے والے لوگوں میں جس میں خدا نے اس کے نام کا رجسٹر کہیں کھو گیا ہے۔اس میں شاہ جی کی بیوی ماضی کی یاد میں ڈوبی رہتی ہے۔

فلش بیک کے ذریعہ قاضی صاحب نے اس کی ماضی کی یاد کے سہارے ایک واقعہ کا ذکر کیا ہے۔جس میں زمینداروں کے بے جا مصارف ان کی تعیش پسندی کو فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔

☆☆☆

ٹھاکر دروازہ

قاضی عبدالستار کے دیہی افسانوں کا تعلق اودھ کے دیہات وقصبات اور زمیندارانہ سماج کی تہذیب وثقافت کو اپنے خاص انداز میں پیش کش سے ہے۔

قاضی صاحب کا تعلق دراصل سیتاپور کے زمیندارانہ طبقے سے تھا۔اس لئے اکثر ان کے دہی افسانوں میں اودھ کے مقامی الفاظ اور ان کی بولیوں کا ذکر مل جاتا ہے۔

پیتمبر پاسی جو اس افسانے کا اصل کردار ہے۔زمینداری ختم ہونے سے قبل ٹھاکر نواب علی کی پہریداری کرتا تھا۔لیکن آزادی ملنے کے بعد وہ گاؤں کا پردھان بن جاتا ہے۔پیتمبر پاسی گاؤں کا مکھیا تو بن جاتا ہے لیکن اپنی روایت کو نہیں بھولتا ہے۔اور اسے پوری طرح نبھانے کی کوشش کرتا ہے۔اسے اپنی روایت سے جذباتی لگاؤ ہے۔

ساتھ ہی اس افسانے میں قاضی صاحب نے یہ بھی دکھانے کی کوشش کی ہے کہ وہ طبقہ جو ابھی تک اپنے پورے جاہ وجلال، رعب و دبدبہ اور اپنی امتیازی شان وشوکت کے ساتھ زندگی گذارتا تھا۔ آزادی کے بعد کوٹھیاں، محلات، نوکر چاکر، ہاتھی گھوڑے نچلے طبقے کے ہاتھوں میں چلے گئے جو کل تک ان کی سیوا کرتا چلا آرہا ہے۔ اس افسانے میں اعلیٰ طبقہ کی عکاسی نواب کرتا ہے اور پتمبر پاسی جو نچلے طبقے سے تعلق رکھتا تھا جو نواب کی پہرے داری کرتا تھا آج کس طرح سے مالک بن جاتا ہے اقتباس نقل کرتی ہوں۔

''پتمبر''

''مالک''

یہ کٹھار تمھارا ہے۔ بڑا باغ تمھارا ہے دریا پور کی سرکاری آرضی تمھاری ہے۔ تمھارے باپ کی جگہ ہمارے پلنگ کا پہرہ بھی تمھارا ہے۔'' 19

ٹھاکر جو اعلیٰ طبقہ سے تعلق رکھتا ہے زمینداری ختم ہونے سے پہلے بھی وہ جاہ حشمت کا مالک تھا اور اب بھی سماج میں اس کو وہی حیثیت ہے اس افسانے میں قاضی صاحب نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ ''ٹھاکر'' کس طرح سے لوگوں کو آپ میں لڑاتا ہے۔ اور ان کی ضمانت کا ذمہ بھی لیتا ہے۔ غرض کی ٹھاکر اپنی عادتوں سے باز نہیں آتا ہے۔ بلکہ نیت نئی سازشوں کا جال بنتا رہتا ہے۔ پتمبر کے باپ کا قتل ہونے کے بعد وہ پتمبر کو بلاتا ہے اور کہتا ہے:

''تمھارے مقتول باپ کا مقدمہ ہمارا ہے۔'' 20

اس کے علاوہ ٹھاکروں کا کام علاقے میں رہزنوں اور ڈاکوؤں کو سرپرستی دینا بھی تھا وہ ہمیشہ اپنے مفاد کے لئے ان کا استعمال کرتے تھے۔

آزادی کے بعد بھی انھوں نے سرپنچوں اور گاؤں کے مکھیاؤں پر پورا دبدبہ حاصل کئے ہوئے تاکہ کسی بھی پریشانی اور قتل وغارت گری کے موقع پر ان کا ساتھ مل سکے۔ ٹھاکر پتمبر سے کہتا ہے جب وہ گاؤں کا مکھیا چن لیا جاتا ہے تو:

''اور تم پر دھانتا چھوڑ بھی نہیں سکتے کہ اگر ہم پر اس سے بھی برا وقت آ گیا تو کم از کم ایک

19: آئینۂ ایام: قاضی عبدالستار کے بہترین افسانے۔ مرتب: ڈاکٹر محمد غیاث الدین۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔ سنہ اشاعت: 1995۔ ص:25

20: آئینۂ ایام: قاضی عبدالستار کے بہترین افسانے۔ مرتب: ڈاکٹر محمد غیاث الدین۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔ سنہ اشاعت: 1995۔ ص:25

پردھان تو ہمارے ساتھ ہوگا۔'' 21؎

گاؤں کا پردھان چن لئے جانے کے بعد جب پتمبر کو اپنی ذمہ داری کا احساس ہوتا ہے۔ ساتھ ہی وہ ٹھاکر کے پاس ملنے کے لئے جاتا ہے۔ روایت کی پاسداری پتمبر کے ہر فعل وعمل سے ظاہر ہوتی ہے۔ جب وہ داناپور پہونچتا ہے تو ہمیشہ کی طرح سیڑھیوں پر چڑھنے سے پہلے جوتے اتار دیتا ہے۔

اس کے علاوہ اس افسانے میں قاضی صاحب نے زمینداروں کی ناچ گانے کی روایت کو دکھانے کی کوشش کی ہے۔ رنگ رلیوں اور رنگین محفلوں کے ساتھ عورتوں کے ناچ گانے ان کی تہذیبی وراثت کا ایک حصہ سمجھی جاتی تھی۔ افسانے کا ایک حصہ ملاحظہ ہوں۔

''پردھان پتمبر.... تمھارا اور تمھاری عورتوں کا یہ ناچ ہم کو پسند نہیں رہا۔ دنیا سنے گی تمھارے خلاف ہو جائے گی۔ تم کو ووٹ نہیں دے گی۔ تم کو پردھانتا سے اتار دیگی۔''

پتمبر جواب دیتا ہے۔

''ناچ تو پرکھوں سے ہوتا آیا ہے.... پردھانتا تو آج آئی ہے''۔ 22؎

اس افسانے میں قاضی صاحب نے یہ دکھایا ہے کہ آزادی کے بعد زمینداری کے کسی فعل کو اچھا نہیں سمجھا گیا۔ ٹھاکر کا ''دنیا تمھارے خلاف ہو جائے گی تم کو ووٹ نہیں دے گی'' اس طرح سے پتمبر سے کہنا یہی ثابت کرتا ہے۔ لیکن پتمبر ہر اس چیز جو اس کی روایت کا حصہ رہی تھی اور زمیندارانہ نظام کے اعلیٰ طبقہ کی نشاندہی کرتی ہے اس کو جاری رکھنا چاہتا ہے۔ کیوں کہ برسوں سے وہ اس نظام کا حصہ رہا ہے۔ اور اس کو اتنی جلدی بھول جانا اور اپنی پردھانی پر گھمنڈ کرتے ہوئے اپنے پرکھوں کے رسم ورواج کو چھوڑ دینا اسے کسی طرح قبول نہیں ہے۔

غرض اس افسانے میں قاضی صاحب نے اودھی زبان کا استعمال کیا ہے جو ہماری جیسی نئی نسل کو اس زبان سے ناواقفیت کے سبب دقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ قاضی صاحب کے افسانوں میں شامل بعض دوسرے الفاظ کو سمجھنے کے لئے اکثر ہمیں لغت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ چند الفاظ ملاحظہ ہوں۔

تدواری، تلچوری، مندرائی بھینس، تروا ہے، لیزم اور جھانجھ۔ جیسے مقامی الفاظ کا استعمال اودھ کی دیہی

21؎: آئینۂ ایام: قاضی عبدالستار کے بہترین افسانے۔ مرتب: ڈاکٹر محمد غیاث الدین۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔ سنہ اشاعت: 1995۔ ص: 25

22؎: آئینۂ ایام: قاضی عبدالستار کے بہترین افسانے۔ مرتب: ڈاکٹر محمد غیاث الدین۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔ سنہ اشاعت: 1995۔ ص: 26

زندگی کی مکمل عکاسی کرتا ہے۔

☆☆☆

سوچ

قاضی عبدالستار کا لکھا ہوا افسانہ سوچ ماضی کی یاد اور ماضی کے درد کو بیان کرتی ہوئی کہانی ہے۔اس کہانی میں بلیرڈ جو ایک قسم کا کھیل ہے اس کی اصطلاحوں کے ذریعہ ماضی حال اور مستقبل وصل اور جدائی سے تعبیر کرتے ہوئے لکھا گیا افسانہ ہے۔اس کھیل میں جہاں جس کو زیادہ پوائنٹ حاصل ہوتے ہیں اس کی جیت ہوتی ہے۔کس طرح سے قسمت پلٹتی ہے ایک انسان کو امیر سے غریب اور بادشاہ سے فقیر بنا دیتی ہے۔ اس کہانی میں ماضی کی کرب ناکیاں اپنے عروج پر دکھائی دیتی ہیں اور ماضی حال اور مستقبل کا فلسفیانہ انداز میں تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔اس افسانے میں ماضی حال اور مستقبل کا تجزیہ کرتے ہوئے ایک عورت کی فطرت کی عکاسی بھی پیش کی گئی ہے۔لمحوں کو ایک عورت کس طرح سے اپنا روپ بدلتی ہے۔اور کچھ عورتیں جو اپنے مفاد کے لئے اپنا سب کچھ قربان کر دیتی ہیں۔ایک عورت کی عظمت اور غلاظت کو اس اقتباس کے ذریعہ پیش کیا ہے:

''یادیں عورتوں کی طرح عجیب ہوتی ہیں۔جو کبھی اپنے سپوتوں کو ڈس لیتی ہیں اور کبھی رسولوں کی پیدائش کے کرب کا پہاڑ اپنے شانو پر اٹھا لاتی ہیں۔کبھی ساہی کے کانٹوں کی طرح اس طرح وجود میں پیوست ہو جاتی ہیں کہ موت کے ناخن لہولہان ہو جاتیں اور کبھی ایسا گھنا سایہ بن کر موجود کو ڈھانپ لیتی ہیں کہ تمام زبانوں کے تمام محبوبوں کے تمام گیسوؤں کی جماؤں رائیگاں ہو جائے۔'' 23

راوی ماضی کی یادوں میں کھویا ہوا رہتا ہے۔کبھی وہ اک بڑے زمیندار کے گھر کا چشم و چراغ تھا اور اس کہانی میں اس کا مد مقابل راجکمار نہایت غریب جس کی زمینداری راوی کے گاؤں میں فیل تھی مگر آج وہ صاحب حیثیت بن بیٹھا ہے۔اور ایک عورت سے ملاقات کراتا ہے وہ عورت جو سج دھج کر بیٹھی رہتی ہے اس کی چچی ہے۔اس عورت نے دیکھنے کے بعد راوی کے ذہن میں عورتوں کے متعلق بہت سے خیالات پیدا

23: آئینۂ ایام: قاضی عبدالستار کے بہترین افسانے۔مرتب: ڈاکٹر محمد غیاث الدین۔ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔سنہ اشاعت: 1995۔ص: 147

ہونے لگتے ہیں۔

جو کبھی چھ بچوں کی ماں اور اس کے نصیر چچا کی بیوی تھی نصیر چچا جو دیکھنے میں نہایت مفلس اور مفلوک الحال لگتے تھے وہی ان کی بیوی ان سے کم عمری میں اور خوبصورتی میں نہایت ہی کوئی جواب نہیں رکھتی تھی مگر وہ نصیر چچا کو چھوڑ کر آج اس مرد کے ساتھ ہے۔جس کو دیکھ راوی کے ذہن میں خیال آتا ہے کہ اور اس کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے۔

''میں نے گلاس ان کے ہاتھوں سے لے لیا ان کی طرف دیکھا وہ ایک عورت کے بجائے خوش آمدید کہتا خود کھلا دروازہ معلوم ہوئیں جن میں کوئی بھی داخل ہوسکتا ہے۔'' 24؎

اس افسانے میں قاضی صاحب نے ماضی کی یاد کے ساتھ رشتے کلچر آئیڈیل پر بحث کی ہے۔اس کے علاوہ غریبی مفلسی اور فاقہ کشی جس کے آگے انسان مجبور ہو کر ایسا کام کرنے لگتا ہے۔جو غلاظت زدہ ہے۔ آزادی کے بعد جس طرح سے مسلم گھرانے کے لوگ غریبی اور بھوک مری کا شکار ہوئے اس کی عکاسی اس افسانے میں نظر آتی ہے۔اس کے علاوہ یہ بھی دیکھانے کی کوشش کی گئی ہے یہ وہی لکھنؤ امین آباد کی جگہ ہے جہاں،اقتباس۔

''پرانے لکھنؤ کی ناہموار پیچیدا گلیوں کے دونوں طرف غریبی کے اشتہاروں کی طرح ٹوٹے پھوٹے مکانات کھرے ہیں۔ان کی نالیوں میں بھوک سڑتی رہتی ہے اور فاقوں کا تعفن رینگتا رہتا ہے سیاہ کبوتروں کے ہجوم کی طرح جب شام ان پر اتر آتی ہے تو ان کہانیوں پر یقین آجاتا ہے جن کے مطابق یہاں تاریخ کے قافلے اترے تھے اور تہذیب نے آداب سیکھے تھے۔'' 25؎

غرض اس کہانی میں قاضی عبدالستار نے غم اور دکھ سے بھری یادیں حافظے کی چھلنی میں چھنے ہوئے ماضی کو یاد کیا ہے۔ جہاں ایک وقت کس طرح سے پلٹ کر انسان کو بھوکا ننگا کر دیتا ہے۔فلیش بیک کی تکنیک کے ساتھ علامتی اور فلسفانہ انداز میں لکھا ہوا قاضی عبدالستار کا بہترین افسانہ ہے۔ یہ کہانی لکھنؤ کی تہذیب و ثقافت کے حرماں نصیبی کی داستان ہے جس پر وقت کے بے رحم پاؤں نے کچل کر ایک خوبصورت داستان کی

24؎: آئینۂ ایام: قاضی عبدالستار کے بہترین افسانے۔مرتب: ڈاکٹر محمد غیاث الدین۔ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔سنہ اشاعت:1995۔ص:148

25؎: آئینۂ ایام: قاضی عبدالستار کے بہترین افسانے۔مرتب: ڈاکٹر محمد غیاث الدین۔ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔سنہ اشاعت:1995۔ص:146

شکل کو مسخ کر دیا ہے۔

☆☆☆

کھا کھا

''کھا کھا'' قاضی عبدالستار کی ایک ایسی کہانی ہے جس میں ایک بے کس بے سہارا عورت کی کہانی بیان کی ہے۔''کھا کھا'' بے سہارا اور بیوہ بدقسمت عورت کو کہا جاتا ہے۔اس میں افسانے میں قاضی صاحب ایک ایسی ہی عورت کی داستان بیان کی ہے جو بچپن میں والدین کے سایہ سے محروم ہوگئی شادی ہوی تو کم عمری میں بیوہ ہوگئی بچہ پیدا ہوا تو وہ بھی داغِ مفارقت دے گیا۔ بیتے زمانے میں گاؤں دیہات کے محلوں میں ایسی عورتیں مل جاتی تھیں جن کے اوپر جنات کا سایہ کہہ کر اکثر بچے ان سے ڈرا کرتے تھے جو بیوہ رہتی تھیں اور جن کے آگے پیچھے کوئی نہیں رہتا تھا اور وہ کسی سے بہت کام باتیں کرتی تھیں۔اپنے عجب انداز اور دیکھنے میں کوئی دوسری مخلوق محسوس ہوتی تھیں قاضی صاحب کی اس کہانی کو پڑھ کر مجھے ایسی عورتیں یاد آ گئیں۔لیکن اب ایسی عورتیں ناپید ہوگئی ہیں۔''کھا کھا'' میں قاضی صاحب نے ایک غم بھری داستان کو پیش کیا ہے۔ساتھ ہی ان کے رعب وجلال کو بھی پیش کیا ہے۔اس کہانی میں عورتوں کے مکالمے ان کی زبان اور ان کی رنگ وڈھنگ کو مصنف نے نہایت باریک بینی سے بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔

☆☆☆

مجریٰ

''مجریٰ'' قاضی عبدالستار زمیندارانہ زوال اور ان کی بدلتی صورت حال بدلتی ہوئے سماجی اقدار پر لکھا گیا ہے۔یہ افسانہ افسانہ نمبر ''نیا دور'' کراچی، پاکستان سے شمارہ نمبر 74-73 میں شائع ہوا۔افسانے میں مجریٰ کو ایک علامت کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔زمینداروں اور جاگیرداروں کے یہاں کسی خاص تقریبات کے موقع پر مجریٰ کا انتظام ہونا ناگزیر تھا۔مجریٰ یا نوٹنکی کا انتظام ہر کاص وعام کام کے موقع پر کیا جاتا تھا اور یہ ان کا شوق تھا۔زمیندرانہ نظام کے زوال کے بعد کس طرح سے ان کے ان تمام کھیل تماشوں کی وجہ سے تباہی و بربادی کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ قاضی عبدالستار نے اس افسانے میں ہندومسلم زمینداروں کے بیچ بھائی

چارے مشترکہ تہذیب کی روایت کو بھی قلم بند کرنے کی کوشش کی ہے۔ جب وہ ایک دوسرے کے ساتھ نہایت ہی فراخ دلی اور محبت کے ساتھ رہتے تھے۔ اور ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہو کر خوشیوں اور ہر تیوہاروں کو ساتھ میں مل کر منایا کرتے تھے۔ اس افسانہ میں قاضی صاحب پرانی تہذیبی روایت جہاں لوگ ایک دوسرے کے عہد و پیمان کو کس طرح سے نبھاتے تھے اور اپنے ساتھ ہی دوسرے لوگوں کا خیال رکھنا برے وقت میں ایک دوسرے کا ساتھ دینا اس افسانے کا مرکز ہے۔

قاضی عبدالستار کی تخلیق کا ایک خاص وصف یہ بھی ہے کہ وہ بہت سی باتوں کو اشاروں کنایوں میں اس طرح سے بیان کر دیتے ہیں کہ ایک بار میں قاری کو سمجھ میں نہیں آتے ہیں جس کی وجہ سے افسانے کا متعدد بار مطالعہ کرنے کے بعد افسانے کی کئی پرتے قاری کے سامنے آتی ہیں۔ پیچیدہ بیانیہ جو کو ایک سنجیدہ قاری باریکی سے مطالعہ کرنے کے بعد اسی موضوع سے مستفید ہو سکتا ہے۔

اس افسانے میں بھی زمیندارنہ نظام کے زوال کے بعد زمینداروں کی دکھ بھری داستان کو موضوع بنایا گیا ہے اس افسانے میں قاضی عبدالستار نے گذرے ہوئے وقت اور اس وقت میں زمینداروں کی سکھ اور عیش و عشرت بھری زندگی کو مرکز میں رکھ کر مجریٰ جیسے تماشے کے ذریعہ ان کی حالتِ زار کو بیان کیا ہے۔ وقت کی ستم ظریفی کا عالم یہ ہے کہ ان کے پاس نہ تو کھانے کے لئے انواح اقسام کے لذیز پکوان رہے جو زمینداروں کے دسترخوان کی زینت ہوا کرتے تھے اور سیر و شکار کے ذریعہ مختلف قسم کے جانوروں اور قیمتی چڑیوں کے ملائم گوشت سے لطف اندوز ہوتے تھے جو بہترین عمدہ اور قیمتی کپڑے زیب تن کرتے تھے۔ منفرد انداز کے لباس زیب تن کرنے کی وجہ سے زمینداروں کی ہیبت اور خوف لوگوں کے دلوں میں گھر کر جاتا تھا ساتھ ہی انھیں ایک الگ پہچان دیا کرتا تھا۔ اس افسانے نے جب درجن پور کے ٹھاکر اپنے بھتیجے کی شادی کا دعوت نامہ لے کر حضرت پور کے سرکار کے پاس آتے ہیں مذکورہ تمام پریشانیاں حضرت پور کے سرکار کے آگے آکر کھڑی ہو جاتی ہیں ساتھ ہی جاگیرداروں کے پاس سواری کے نام پر بیش قیمتی گھوڑے اور دید و قامت ہاتھی کی سواری ہی ان کے شایانِ شان ہوا کرتی تھیں زمینداری کے خاتمے کے بعد یہ تمام جاگیریں وقت کے ہاتھوں پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے باورچی کھانے کی زینت بننے لگیں یعنی انھیں بیچ بیچ کر پیٹ کا جہنم بھرا جاتا تھا۔ جب درجن پور جانے کا سوال کھڑا ہوتا ہے تو انھیں یہ تمام وسائل یاد آتے ہیں۔ اقتباس

ملاحظہ ہو:

''جب سے وقت خراب ہوا ہے ہم نے اپنی اصلاح کر لی۔ شکار اسی طرح چھوڑ دیا کہ چڑیوں کا نام بھول گئے۔ دستر خوان اٹھا دیا کہ اکیلے بیٹھ کر دال روٹی کھانے کے لئے اس تکلیف کی کیا ضرورت ہے۔ انتہا ہے کہ پیچوان کا حصہ ختم ہو چکا ہے، سواری کے نام پر صرف اپنی ٹانگیں رہ گئی ہیں۔'' 26؎

اس افسانے میں قاضی عبدالستار نے بدلتی ہوئی اقدار مٹتی ہوئی سماجی اور معاشرتی قدریں نئ اور پرانی نسل کے مابین فرق کو بھی برتنے کی کوشش کی ہے۔ ایک وقت ہوا کرتا تھا جب تہذیبی قدریں عروج پر تھیں ہر کسی کو عزت دینا اور ان کی قدر کرنا لوگوں کے اندر مذہب کی طرح معنی رکھتا تھا۔ مگر بدلتے وقت کے ساتھ کس طرح سے لوگ تہذیبی زوال کا شکار ہوئے اس کی خوبصورت عکاسی اس افسانے میں نظر آتی ہے ساتھ ہی قاضی عبدالستار نے یہ بھی دکھایا کہ طوائفوں کے کوٹھوں پر جانے اور اس سے شادی کرنے اس کو ایک مقام و مرتبہ دینا بھی ان کے سماج کی ایک شان سمجھا جاتا تھا۔ مگر بدلتے وقت کے ساتھ نوٹنکی کرنے یا مجریٰ کرنے والی عورتوں کے اوپر گندے اور بھدّے اشارے کرنا اور انھیں غلط القاب کے ساتھ پکارنا ایک تفریح کا ذریعہ بن گیا ہے اس افسانے میں ایک جگہ ایسا موڑ آتا ہے جس سے قاضی عبدالستار کے بدلتی ہوئی سماجی اقدار پر روشنی پڑتی ہے:

''کیسی کیسی قاتل راتوں اور جان لیوا محفلوں کا جلوس ان کے سامنے سے گذرنے لگا۔ پھر انھوں نے محفل کا جائزہ لیا۔ جس میں عجیب عجیب قسم کی پتلونیں اور انہونی قمیض پہنے کچھ اس طرح بیٹھے تھے کہ ان کی کوئی کل سیدھی نہ تھی۔ ان کی ایک آستین سے جوانی اور دوسری سے شراب آتش ٹپکایا جا رہا تھا۔ شراب ایسی اور اتنی بے حرمتی پہلی بار دیکھی تھی ان کی نگاہیں اور قہقہے اتنے بے ادب تھے اور ہاتھوں اور ہونٹوں اور ابروؤں کے اشارے اتنے گستاخ تھے کہ وہ نظریں نیچی کر کے سٹک کی مہنال سے کھیلنے لگے اور سوچنے لگے کہ ہمارے یار انرودھ سنگھ کے جلال و اقبال کو کیا ہوا کہ اس طرح خاموش ہیں۔'' 27؎

اس اقتباس سے بدلے ہوئے اقدار کے تئیں قاضی عبدالستار کا دکھ کھل کر سامنے آجاتا ہے۔ یہ نازیبا حرکتیں جو

26؎: آئینۂ ایام: قاضی عبدالستار کے بہترین افسانے۔ مرتب: ڈاکٹر محمد غیاث الدین۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔ سنہ اشاعت: 1995۔ ص: 162

27؎: آئینۂ ایام: قاضی عبدالستار کے بہترین افسانے۔ مرتب: ڈاکٹر محمد غیاث الدین۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔ سنہ اشاعت: 1995۔ ص: 167

نئی نسل کے ذریعہ ایک ناچنے والی کے سامنے کی جارہی ہیں اور ساتھ ہی پرانی نسل کے لوگ اتنے بے بس اور لاچار ہیں کہ ان کی ان تمام حرکات وسکنات کو روکنے کے لئے کچھ کر نہیں پا رہے ہیں، یہاں پر قاضی عبدالستار نے زمینداروں کا جاہ وجلال جس طرح سے ہتہ وتیگ ہوا کہ وہ اپنے لوگوں اور بچوں کے غلط حرکت کرنے سے نہیں روک پا رہے ہیں۔ جبکہ ایک زمانہ ہوا کرتا ہے جب زمینداروں کے غصہ جاوجلال کے آگے سپاہی بھی ہاتھ جوڑے نظر آتے تھے۔

افسانے میں اس کے علاوہ ہندو مسلمان کے بیچ بھائی چارگی دوستی اور حسن سلوک پر بھی بھرپور روشنی پڑتی ہے کس طرح اس نظام کے خاتمے سے پہلے دونوں مل جل کر ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہو کر رہا کرتے تھے۔ قاضی صاحب کا خاص وصف مشترکہ تہذیب کا خوبصورت بیان ہے۔

اس افسانے میں حضرت پور کے سرکار کی بیوی ایک کوٹھے کی طوائف ہے اور اس کے کوٹھے پر رہنے سے لوگ چکّر لگایا کرتے تھے۔ ان میں سے دین دیال نام کا ایک نوخیز لونڈا بھی تھا اس بات کی جانکاری اس افسانے سرکار کے بیوی کی باتوں کے ذریعہ ہوتی ہے۔ آج جب حضرت پور کے سرکار کے پاس سے تمام دھن و دولت ختم ہو چکے ہیں تو بیوی کے گہنے بیچ بیچ کر گھر کے اخراجات پورے کئے جا رہے ہیں اب کی باری بیوی کی انگوٹھی بیچنے کی آتی ہے مگر اس کی شرط ہوتی ہے کہ وہ صرف دین دیال کے ہاتھوں ہی اپنے گہنے فروخت کرے گی بیگم کے سامنے جب دین دیال گپتا آتا ہے تو اپنے ساتھ ایک بکس لاتا ہے۔ جس میں بیگم کے تمام گہنے محفوظ رہتے ہیں جہاں کہیں بھی بیگم کے گہنے فروخت ہوتے تھے وہ خرید کر اپنے پاس محفوظ کر لیا کرتا تھا۔ آج جب بیگم کے گھر پر براوقت پڑتا ہے تو وہ تمام زیورات اس کو واپس لا کر دیتا ہے۔ اور کہتا ہے:

> ''تمہارے نکاح کے زیوروں پر میرے علاوہ کسی کی پرچھائیاں بھی تم کو پسند نہیں میں جانتا تھا کہ تم ایک دن مجھ سے کہو گی سو بھاگیہ سے آج وہ دن آ گیا، جینے میں مزا تو مدت سے نہیں تھا۔ لیکن .... تھوڑے دنوں سے بیمار بھی رہنے لگا ہوں معلوم نہیں میرے بعد کس لڑکے کے ہاتھ کیا لگے اور وہ کیا سلوک کرے .... اس لئے اب تمھیں انھیں سویکار کر لو.... قبول کر لو۔'' 28

غرض ''مجری'' افسانے میں بیک وقت کئی موضوعات سامنے آجاتے ہیں جن کو قاضی عبدالستار نے

28۔ آئینۂ ایام: قاضی عبدالستار کے بہترین افسانے۔ مرتب: ڈاکٹر محمد غیاث الدین۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔ سنہ اشاعت: 1995۔ ص: 168

خوبصورتی سے برتا ہے ساتھ ہی افسانے میں فنیؔ چاؤ کے ساتھ ماضی کی دھندلی یادیں اور خوبصورت وقت کی یاد تازہ ہوجاتی ہے جو زمینداروں کی زندگی کا ایک خوبصورت باب تھی۔مگر آج وہ تمام اقدار وروایات ماضی کی آغوش میں سما چکی ہیں۔

☆☆☆

مالکن

قاضی عبدالستار کا یہ افسانہ ایک عورت ''مالکن'' کردار کے ذریعہ زمینداری کے خاتمے المناک داستان کو پیش کیا ہے۔یہ افسانہ پہلی بار رسالہ ''گفتگو'' بمبئی سے شائع ہوا۔زمانے کی جن کی شان وشوکت جاہ وجلال اور ضروریاتِ زندگی کی فراوانی کے ساتھ بدلتے ہوئے وقت کی ستم ظریفوں کے تقابل کے ساتھ موجودہ ساز و سامان کے ذریعہ بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ تمام اشیائیں زمینداروں کے عروج وزوال کی بہترین داستان بیان کرتی ہیں۔قاضی صاحب نے زمیندارانہ نظام کے زوال پر آنسو نہیں بہائیں بلکہ ایک ناظر کی حیثیت سے انسانی قدروں کے ٹوٹنے اور بکھرنے کا رنج ضرور کرتے ہیں چونکہ زمینداری اور جاگیرداری نظام کا خاتمہ آزادی اور تقسیم ہند کے واقعہ سے منسلک ہے۔اس لئے قاضی صاحب کے افسانہ پڑھتے وقت یہ احساس ہوتا ہے کہ تقسیم کے بعد کس طرح تہذیب کا شیرازہ بکھرا اور اس کے ساتھ ہی اس تہذیب کے وہ حسین عناصر بھی گم ہوگئے۔جو صدیوں کے کوششوں وکاوشوں کے نتیجے میں بن پائے تھے۔اور اسی بات قلق وافسوس قاضی صاحب کی بیشتر تخلیقات میں نظر آتا ہے۔یہ المیہ نہ صرف افسانے کے عام قاری کو گراں گذرتا ہے بلکہ خود افسانے کا کردار بھی آہ وزاری میں مشغول رہتا ہے۔جو صرف خدائے مطلق کے سامنے ہی کرتا ہے۔اور اس کی یہ شکایت جاءنماز پانی کے وضو کا لوٹا اور دعا تک محدود رہتی ہے۔عام انسانوں کے سامنے اس نے کبھی شکوہ وشکایت یا اف تک نہیں کیا اور نہ ہی اس بات کا احساس ہونے دیا کہ اس نظام کے خاتمے نے ہماری روزی روٹی کا خاتمہ کر دیا۔اب ہمارے پاس پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے وضو کے لوٹے کے سوا کوئی ذریعہ نہیں رہا۔ان کی تہذیب کی پاسداری کا یہ عالم ہے کہ مالکن کے میاں کا انتقال ہوئے مدت گذر چکی ہے مگر ان کے نام وناموس کے تحفظ کی فکر ہر وقت گھیرے رہتی ہے۔کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے اور منھ کھولنے یا کسی کا دیا ہوا کام کرنے سے پہلے وہ ہزار بار سوچتی ہیں کہ کہیں ''مرنے والے یعنی ان کے شوہر کے روح کو تکلیف نہ ہو۔

''مالکن'' کو جب پیٹ کی آگ کی جلن بالکل برداشت نہیں ہوتی تو چودھری گلاب سے اشارے و کنایہ کی ہی صورت میں کہتی ہیں۔ کیوں کہ ایک نوکر کے سامنے کام مانگاان کی کسر شان کے تھا ساتھ ہی ان کی تہذیب بھی اس بات کو گوارا نہیں کرتی تھی جس ''مالکن'' کے خاندان کی وجہ سے ہزاروں گھروں میں چراغ جلتے ہوں اور کام اور نوکری کی تلاش مکمل ہوتی تھی اس مالکن حمیت نے نوکر گلاب سے صرف اتنا کہا۔

''ہاں میں تم سے ایک بات کہنے والی تھی۔''

''حکم''

''یہاں رونک پور میں یا.... کسی اور گاؤں میں کوئی....

''جی....''

''میں نے کہا سرکار میں سمجھا نہیں''

''کوئی کرتا پہنتا ہے'' 29؎

چودھری گلاب اس بات کا مطلب آسانی سے سمجھ جاتا ہے۔ کیوں کہ حویلی کے بوڑھے راز دار کی تخئیل کی آنکھیں بھوکی مالکن کو بلکتا ہوا دیکھ رہی تھیں اور اس کے کانوں میں بے آواز سسکیاں زہر کی بوندیں ٹپکا رہی تھیں۔ مالکن کہتی ہیں۔ اتنے بڑے گھر میں اکیلی بیٹھی کوّے ہنکایا کرتی ہوں۔ رات تو روتے گذر جاتی ہے۔ مگر یہ پہاڑ ایسے دن چھاتی پر سوار رہتے ہیں ٹالے نہیں ٹلتے کوئی کرتا ارتا ہو تو سینے پرونے میں دل اٹک جاتا۔

قاضی عبدالستار کی یہ کہانی بیک وقت کئی موضوعات کا احاطہ کرتی ہوئی نظر آتی ہے رونق پور کے زمیندار چودھری میر محمد علی کی بیوہ جس کا اصلی نام زیب النساء بیگم تھا جو اس افسانے میں ''مالکن'' کے نام سے جانی جاتی ہیں اور انھیں کے جذبات و احساسات کے ساتھ فلیش بیک تکنیک کے ذریعہ افسانے کے مرکز میں ڈھالا گیا ہے۔ اس افسانے میں ''مالکن'' کے شوہر میر، محمد علی مر چکے ہیں اور ہندوستان تقسیم ہو چکا ہے۔ میر محمد علی کی بیوہ پر کسٹوڈین کی مصیبت نازل ہو چکی ہے۔ ان کی کوئی اولاد نہیں ہے پاکستان بننے کے بعد مسلمانوں پر حکومت کا جو عتاب نازل ہوا اس کی منظر کشی اس افسانے میں صاف نظر آتی ہے۔ رات دن کی مقدمے بازی کی وجہ سے گھر کے سارے قیمتی گہنے اس وجہ سے بیچنے پڑتے ہیں تا کہ حکومت کو یہ یقین دلایا جا سکے کہ میر محمد علی مر چکے ہیں ''وہ پاکستان نہیں قبرستان گئے ہیں''

29؎ آئینۂ ایام: قاضی عبدالستار کے بہترین افسانے۔ مرتب: ڈاکٹر محمد غیاث الدین۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔ سنہ اشاعت: 1995۔ ص: 102

قاضی صاحب نے یہاں پر بے حد معنی خیز انداز میں اپنی بات کہنے کی کوشش کی ہے افسانے میں آگے کا جو واقعہ درج ہے وہ اس طرح ہے:

''مالکن نے گہنے پاتے بیچ کر حکومت کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ میر محمد علی بیگ پاکستان نہیں قبرستان گئے ہیں۔ برسوں کی لکھلٹ یقین دہانی کے بعد ایک رات چودھری الہ آباد سے پروانہ لائے کہ حکومت نے مان لیا ہے کہ میر محمد علی بیگ پاکستان نہیں قبرستان گئے ہیں وہ رات عجیب رات تھی۔ مالکن ساری رات جاءنماز پر بیٹھی رہیں....ساری رات شکرانے کی نمازیں پڑھتی رہیں اور صبح ہوتے ہی حویلی کے سامنے پٹواری نے ڈگی پیٹ کر زمینداری کے خاتمے کا اعلان کر دیا۔'' 30

قاضی صاحب نے اس افسانے میں ایک مسلمان عورت کی داخلی کیفیات کی بہترین عکاسی کی ہے جو افسانے میں بیشتر جگہ نظر آتی ہے۔مقدمات سے چھٹکارا حاصل ہونے پر اور اپنے شوہر کے انتقال کا یقین دلانا حکومت کو اور اس کی موت پر اس لئے شکر ادا کرنا کیوں کہ تقسیم کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں کی حالت نہایت ابتر ہوگئی تھی اور انھیں حکومت ہمیشہ شک بھری نگاہوں سے دیکھا کرتی تھی مالکن کو اس اذیت اور مصیبت سے نجات حاصل ہوگئی تھی۔

اس افسانے میں قاضی صاحب نے ''مالکن'' کی ہمت اور حوصلہ کی تعریف کرتے ہیں اور لکھتے ہیں زمینداری کے خاتمے کے ساتھ ہی زمین، جائداد باغ و درخت سب تاش کے پتوں کی طرح بٹتے چلے گئے۔ اور ساتھ ہی گھر کے اندر کام کرنے والے ایک۔ایک نوکر جانے لگے۔گھر میں استعمال ہونے والے تمام سامان بکنے لگے اب فاقے کی نوبت آگئی۔گھر کی ان تمام پریشانیوں کے باوجود مالکن کی خوداعتمادی ہمت اور حوصلہ میں کمی نہیں آئی اور وہ اپنے ایک دور کے رشتے کے چچا کا بیٹا جو انھیں پاکستان لے جانے کے لئے آتا ہے صاف انکار کر دیتی ہیں۔درج ذیل اقتباس کے ذریعہ مالکن کے تاثرات اور اپنے ملک کی مٹی سے لگاؤ اور تہذیبی زندگی کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔

''مجھ کمبختی ماری پر ایسے پیمبری وقت پڑ گئے ہیں کہ موئے ایرے غیروں کے ساتھ دوسرے ملک سدھار جاؤں گی....اس سے کہنا اپنے ہوٹوں سوٹوں کو سمیٹ لے جاتے

30: آئینۂ ایام: قاضی عبدالستار کے بہترین افسانے۔مرتب: ڈاکٹر محمد غیاث الدین۔ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔سنہ اشاعت: 1995۔ص: 99

اپنے ساتھ پاکستان۔'' 31؎

اس افسانے میں قاضی صاحب نے زمیندارانہ خاندان کی تہذیب وثقافت کی اعلیٰ روایات کے اعلیٰ نمونے کئی جگہ پیش کئے ہیں۔ایک بار رونق پور میں سیلاب آتا ہے اور پوری حویلی کے چاروں طرف پانی بھر جاتا ہے۔زمینداروں کے یہاں خدمت گاروں کی یہ خاص بات تھی کہ وہ اپنی جان پر کھیل کر بھی اپنے مالک کی حفاظت کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔اس سیلاب کی وجہ سے ہزاروں مکان تباہ و برباد ہو گئے تھے مگر مالکن کے خدمت گاروں نے ان کی حفاظت کے جو قدم اٹھائے جو اس طرح سے پیش کئے ہیں:

''جب ڈیوڑھی گر گئی اور اندر کے کئی درجہ بیٹھ گئے تب چودھری کی نمک حلالی کو غیرت آئی۔ علاقے بھر کے نامی۔نامی کہاروں اور مچھیروں کی چھوٹی سی فوج بنائی اور ان کے بازوؤں کے بجرے پر چڑھ کر تھان گاؤں سے نکلے اور رونق پور کی حویلی میں اتر گئے۔دروازے کی اوٹ میں کھڑی ہوئی مالکن کانپتی ہوئی آواز میں خطاب کیا۔

''حضور اب بھی کچھ نہیں بگڑا ہے...حکم دیجئے تو جان پر کھیل کر پالکی چڑھالاؤں اگر سرکار کی جوتیاں تک بھیگ جائیں تو جو چور کی سزا وہ میری۔'' 32؎

اس افسانے چودھری نارائن خدمت گار کے ذریعہ ان کی نمک حلالی خدمت خلق اور روایت کے اعلیٰ نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں یہ وہی گلاب ہے جو مالکن کی کفالت شعاری کے لئے انھیں کرتے کے کپڑے لاکر سینے کو دیتا ہے۔لیکن جب اس کی بیوی بچوں اور بہوؤں کے ذریعہ اس کے اوپر مالکن سے عشق کی جھوٹی تہمت لگائی جاتی ہے جس کی وجہ سے اس کے ضمیر کو اتنی ٹھیس لگتی ہے کہ وہ کنویں میں کود کر خودکشی کر لیتا ہے۔کیوں کہ جب مالکن نے فاقے سے تنگ آکر اس سے کرتے کے کپڑے لانے کو کہتی ہیں تو گلاب نارائین کو بے حد افسوس اور دکھ ہوتا ہے اور اس نے خود کے پیسے سے کپڑے خرید کر مالکن کو ٹھاکر گھنشیام سنگھ کے نام پر سینے کو دیتا ہے۔لیکن دھیرے، دھیرے یہ بات اس کے گھر والوں کو پتا چل جاتی ہے اور اس کے اوپر ناجائز تعلقات کا الزام لگ جاتا ہے۔جس کی وجہ سے وہ خودکشی کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

کہانی کو قاضی صاحب نے بیانیہ اور فلیش بیک تکنیک کے ذریعہ تیار کیا ہے۔ماضی اور حال کے

31؎: آئینۂ ایام: قاضی عبدالستار کے بہترین افسانے۔مرتب: ڈاکٹر محمد غیاث الدین۔ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔سنہ اشاعت: 1995۔ص: 162

32؎: آئینۂ ایام: قاضی عبدالستار کے بہترین افسانے۔مرتب: ڈاکٹر محمد غیاث الدین۔ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔سنہ اشاعت: 1995۔ص: 98 - 99

واقعات کے ذریعہ اس افسانے کو نہایت خوبصورتی اور باریک بینی سے تیار کیا ہے اس افسانے میں ''مالکن'' جاگیردارانہ نظام کی اعلیٰ روایتوں کا ہر جگہ عمدہ نمونہ پیش کرتی ہیں۔سیلاب کے وقت چودھری گلاب نارائن ان کو حفاظت کی جگہ لے جانے کے لئے حویلی میں آتا ہے تو اس سے کہتی ہیں:

''تم کیسی بات کرنے لگے گلاب۔خدانہ کرے میں اپنی زندگی میں حویلی کے باہر پاؤں نکالوں اور مرنے والے کے نام پر سیاہی لگاؤں۔'' 33

غرض ''مالکن'' قاضی عبدالستار کا ایک ایسا کردار ہے جو تمام دشواریوں سے جوجھتے ہوئے زندگی سے جڑے رہنے اور، ہمت اور حوصلہ بنائے رکھتے ہوئے حالات کا سامنا کرتا ہے۔اور اس افسانے میں ایک مسلمان عورت کی وطن دوستی اور حبُ الوطنی کی صاف مثال مل جاتی ہے۔''مالکن'' چاہتی تو آسانی کے ساتھ پاکستان جا کر عیش وآرام کی زندگی گذار سکتی تھیں کیوں کہ ہندوستان کے بیشتر زمینداروں اور تعلقداروں نے ہجرت کرنا ہندوستان میں رہنے سے بہتر سمجھا تھا اور وہاں جا کر ایک آرام دہ زندگی گذار رہے تھے۔مگر مالکن نے بھوک برداشت کرنا اور فاقہ سہنا تو قبول کر لیا۔مگر اپنے وطن سے دور جانا قبول نہیں کیا۔

☆☆☆

لالہ امام بخش

قاضی عبدالستار کا لکھا ہوا ایک افسانہ ''لالہ امام بخش'' قابل ذکر ہے۔یہ افسانہ زمیندارانہ نظام کے تحت پائے جانے والے پردھانوں اور چودھری کے غاصبانہ رویّہ کو دکھاتا ہے۔

یوپی کے گاؤں اور دیہات کی زندگی اور وہاں پر گذارے جانے والے وقت نے قاضی صاحب کو بہت متاثر کیا۔شب و روز گزرنے والے واقعات ان کے افسانے کے عنوانات کے تحت ان کی تخلیق میں شامل ہو گئے۔عام طور پر ان کے افسانوں میں جس دیہات وقصبات کی عکاسی کی جاتی ہے وہ ان کا اپنا گاؤں سیتا پور، مچھرہٹہ کا وہ علاقہ ہے جہاں انھوں نے اپنی آنکھیں کھولیں اور بچپن اور جوانی کا زریں عہد گزارا۔اس لئے انھوں نے وہاں کی زندگی میں پائی جانے والی تبدیلیوں کی بھرپور عکاسی کی۔جس میں خاص موضوع جاگیردارانہ اور زمیندارانہ نظام ہے۔

33: آئینۂ ایام: قاضی عبدالستار کے بہترین افسانے۔مرتب: ڈاکٹر محمد غیاث الدین۔ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔سنہ اشاعت:1995۔ص:152-150

لالہ امام بخش کہانی میں ہندو مسلمان ایک ساتھ رہ کر ایک دوسرے کے بیچ تیوہار میں شامل ہونا ایک دوسرے کے درد میں شامل ہونا وغیرہ مشترکہ روایت سامنے آتی ہے وہیں دوسری طرف ان ماحول کو پراگندہ کرنے اور ایک دوسرے میں پھوٹ ڈالنے کی سازش بھی بے نقاب ہوتی ہے۔

دیہات وقصبات میں کس طرح لوگ غم اور خوشی کے موقعے پر ایک دوسرے کا ساتھ دیتے ہیں اور وہیں دوسری طرف ایک دوسرے کے معاملات میں ٹانگ اڑانے اور کام روکوانے کی گاؤں کے لوگوں میں جو صلاحیت ہوتی ہے۔اس کی بھی عکاسی ملتی ہے۔ چوپال میں بیٹھے ہوئے یہ لوگ کس طرح سے ایک انسان کو دوسرے کے خلاف بھڑکاتے ہیں اور یہی بھڑکاؤ انداز کبھی ،کبھی منافرت اور فرقہ وارانہ رنگ اختیار کر لیتا ہے نتیجتاً غریب اور بے گناہ لوگ مارے جاتے ہیں اس کی عکاسی بھی اس افسانے میں نظر آتی ہے۔

بہر کیف قاضی صاحب گاؤں کی زبان اور دیہاتی جملوں میں اس افسانے کو لکھا ہے جو پر کشش بھی ہے۔مگر اس زبان سے ناواقفیت کے تحت پڑھنے میں دقت بھی محسوس ہوتی ہے۔

☆☆☆

روپا

''روپا'' قاضی عبدالستار کی جنسی بے راہ روی پر لکھی ہوئی ایک کہانی ہے جس میں روپا نام کی یہ عورت شادی سے پہلے کئی جوان لڑکوں سے عشق لڑائی ہے۔اور جب اس کی شادی ایک دبلے پتلے شخص سے کر دی جاتی ہے تو وہ اس کے ساتھ خوش نہیں رہ پاتی۔اور اس کے گھر سے جانے کے بعد اپنے پرانے عاشقوں کو گھر پر بلاتی ہے۔ایک دن اس کا شوہر اس کو رنگے ہاتھوں پکڑ لیتا ہے۔اور لڑکی کے عاشق اور اس کے شوہر کے بیچ زبردست ہاتھا پائی ہوتی ہے۔جس میں اس کا شوہر دبلا پتلا ہونے کے باوجود بھی عاشق صاحب کو ہرا دیتے ہیں یہ ساری حرکت روپا دم بخود دیکھتی رہتی ہے اور اپنے شوہر کی جواں مردی ہمت اور طاقت پر حیران ہو جاتی ہے۔آخر میں وہ اپنے شوہر سے مرعوب ہو جاتی ہے۔اور اس کے ساتھ رہنے لگتی ہے۔

اس کہانی میں حسینی کے کردار کو اور اس کے آس پاس کے ماحول دیہاتی پس منظر میں پیش کیا ہے۔ گاؤں کی زبان کے ساتھ ہی وہاں کے میلے ڈھیلے کا ذکر اس کہانی میں حقیقی پس منظر پیش کرتا ہے۔گاؤں اور دیہات کی لڑائی جھگڑوں اور آپسی مکالموں کا ذکر ساتھ ہی بھینسوں اور مرغیوں کا ذکر اس افسانے کے دیہاتی

پس منظر کو جاذب نظر بنا دیتا ہے۔

مصنف نے اس کہانی میں حسینی اور روپا کے عاشق کے بیچ کی لڑائی کو بڑی خوبصورتی اور جزئیات نگاری سے کام لیتے ہوئے مزاحیہ انداز میں پیش کیا ہے۔ جس کو پڑھ کر قاری کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آجاتی ہے۔ اور وہ اس لڑائی سے لطف اندوز ہوتا ہے۔

☆☆☆

ایک کہانی

''ایک کہانی'' قاضی عبدالستار کا ایسا افسانہ ہے۔ جس میں زمیندارانہ نظام کے خاتمے کے بعد کے پس منظر کو پیش کیا گیا ہے۔ زمیندارانہ نظام کے زوال کے بعد کس طرح سے اس طبقے کو مصیبت کا سامنا کرنا پڑا اور گھر کے قیمتی اشیاء دھیرے۔ دھیرے فروخت ہونے لگے۔ ساتھ ہی قرض کا بوجھ بڑھتا گیا اور کمائی کی کوئی بھی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ گھر کی عورتیں اور ان کے زیور گروی رکھے جانے لگے۔ غریبی اور مفلسی نے گھر کی عورتوں سے تہذیب و شرافت سے بھی دھیرے، دھیرے دور کرنا شروع کر دیا۔ پردے اور غیر محرم سے اجتناب کی پابندی بھی سرکنے لگی۔ گھر کی بیٹیاں بوڑھی ہونے لگیں کوئی رشتہ نہ ملنے کی صورت میں ماں۔ باپ امید لگائے بیٹھے تھے وہ اس دنیا سے رخصت ہونے لگے۔ اور آخر کار انھوں نے اپنی بیٹیوں کو عمر دراز لوگوں سے بیاہ دینا شروع کر دیا۔ تاکہ کفالت شعاری کا کوئی راستہ نظر آجائے اور دوسری صورت میں اس لئے عمر دراز اور نامناسب جگہوں پر بیاہ دیا کہ انھیں قرض سے چھٹکارا حاصل ہو جائے۔

قاضی عبدالستار نے اپنی تخلیقات میں لڑکیوں کے شادی کے مسائل کو متعدد جگہوں پر ابھارا ہے۔ رضو باجی اس میں قاضی عبدالستار کی بہترین کہانی ہے جہاں سید اپنی ذات برادری کے باہر لڑکیوں کو بیاہ دینا اپنی توہین سمجھتے تھے۔ غرض اس میں بھی اس فکر کی آواز سنائی دیتی ہے۔ جس میں ایک مقروض باپ اپنی بیٹی کو عمر دراز مرد سے شادی کرا دیتا ہے۔ یہ سارے فعل زمینداروں کی لاچاری بے بسی اور مفلسی کو ظاہر کرتا ہے۔

افسانوں کے ضمن میں ایک بہترین افسانہ ''بلاعنوان'' ہے۔ یہ افسانہ رسالہ ''شاعر'' کے ہم عصر اردو ادب نمبر شمارہ نمبر 765 میں 1977 میں شائع ہوا۔ اس میں قاضی صاحب نے نہایت خوبصورت انداز سے افسانے کی شروعات کی ہے۔ تہذیب تمدن سماج، کلچر جس کی عکاسی قاضی صاحب کا خاص وصف ہے۔

افسانے میں جس کو تاریخ وتہذیب کے آئینے میں کچھ اس طرح سے پیش کیا گیا ہے:

''جامع مسجد.....مرحوم تاریخ کی مغرور علامت اپنے گنبدوں کے بوجھ کے نیچے کچلی ہوئی دراز تو بیٹھی دونوں بیتاروں کے عظیم ہاتھ اُٹھائے کبھی نہ ختم ہونے والی دعا مانگ رہی تھی۔''

۔۔۔۔۔تہذیب وتمدن، سماج اور کلچر شرافت اور تجارت شخصیت اور ماحول، قدر اور روایت سب کسی کباڑی کی دوکان پر رنگ لگے خالی ڈبوں کی طرح ڈھیر پڑے تھے اور میں کہانی کے اس کردار کی طرح اپنے آپ سے شرمسار تھے۔'' 34

اس کہانی میں ایک انگریز عورت کو موضوع بنا کر لکھا گیا ہے۔ جو ہندوستان آکر یہاں کے لوگوں کے ذہنوں میں قابض ہو کر کس طرح سے پیش آتی ہے اور جس کا کوئی گھر ٹھکانہ نہیں ہے۔ ہر کسی سے ملنا اور ان کو اپنی باتوں سے مرعوب کرنا اس عورت کے ذریعہ شاید قاضی صاحب نے انگریزی تہذیب کا ہندوستان میں آنا اور آکر ہندوستانیوں کے ذہن پر مسلط ہو جانا ساتھ ہی انگریزوں کا ہندوستان پر قبضہ دکھانا مقصد ہے۔

جس کو انھوں نے ایک عورت کے ذریعہ خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے جو جاتے وقت ہندوستان سے اپنے ساتھ بہت کچھ لے کر چلے گئے۔ جس کو انھوں نے لڑکی کے دونوں ہاتھوں میں سوٹ کیس کے ذریعہ پیش کیا ہے۔ یہ ایک علامتی کہانی ہے جس میں ہندوستان کی تہذیب وثقافت کی خوبصورت داستان جس کا شیرازہ بکھر گیا ہے اور لوگ مغربی تہذیب کا سارا اثاثہ گنوا کر خالی ہاتھ رہ گئے ہیں۔

قاضی عبدالستار کا یہ افسانہ منفرد انداز کا حامل ہے۔ فلسفیانہ انداز نے اس افسانے کو ایک خاص فکر سے مملو کر دیا ہے۔

☆☆☆

رضو باجی

رضو باجی قاضی عبدالستار کا ایک ایسا افسانہ ہے جس میں زمینداری کے خاتمے کے بعد اس طبقے کی لڑکیوں کی شادیوں کو لے کر ایک شدید مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا۔ یہ مسئلہ ایسا تھا جس کا شکار جوان لڑکیوں کے ساتھ

34: آئینۂ ایام: قاضی عبدالستار کے بہترین افسانے۔ مرتب: ڈاکٹر محمد غیاث الدین۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔ سنہ اشاعت: 1995۔ ص: 150

ان کے خاندان والے ہوتے ہیں۔اوران کی زندگی نہایت غیر ہوجاتی ہے۔اقدار عالیہ نے اپنی تہذیب و ثقافت کا جو معیار بنایا تھا۔اورجس میں اپنے خونی رشتے ہڈی اور سید خاندان کی تلاش میں لڑکیوں کی شادی جھوٹے خاندان میں کرنا اپنی توہین سمجھتے تھے۔جس کی وجہ سے کنواری لڑکیاں ادھیڑعمر کو پہونچ جاتی ہیں۔اور جن کے پاس کفالت شعاری کا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا ہے۔یا باپ کے مقروض ہونے کی وجہ سے لڑکیوں کو ان کے جذبات واحساسات کی پرواہ کئے بنا ایسی جگہہ بیاہ دیا جاتا تھا تا کہ انھیں قرض سے چھٹکارا حاصل ہوسکے۔

رضو باجی افسانے میں قاضی صاحب نے اقدار عالیہ کی تہذیب وتمدن کی حسین وجمیل جھلکیوں کے ساتھ اس طبقے کی عورتوں اورنو جوان اورخوبصورت لڑکیوں کے جذبات واحساسات اوران کے نفسیاتی کش مکش کی خوبصورت عکاسی نظر آتی ہے۔جس میں ان لڑکیوں کو اپنے جذبات خواہشات اورمرضیات کے بیان کرنے کی کوئی اجازت نہیں تھی۔ جوان کی تہذیبی اقداراورانانیت کی پاسداری کے اپرنظر اپنی شادی اوراپنی پسند کا ذکر کرنا ان کی طوائفوں کے لئے بھی حقیر کام گردانا جاتا تھا۔

افسانہ عہد ماضی کی داستان کے طور پر شروع ہوتا ہے۔اوراس افسانے کا راوی جو فلیش بیک میں جا کر کہانی بیان کرتا ہے۔ یہ کہانی رضو باجی کے بھیجے گئے خط کے ذریعہ شروع ہوتی ہے۔ جو راوی کو ملتا ہے۔اور اس کے ساتھ راوی کے دماغ میں رضو باجی کی داستان کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہوجاتا ہے۔جس میں رضو باجی کے ساتھ راوی کے عشق کی داستان کے پس منظر میں زمیندارانہ نظام اوراس عہد کی عورتوں کے سماجی حالات اوران کی تہذیبی اورثقافتی اقدار کے ساتھ ان کے پردے کی پابندی اوران کی حفاظت کے ساتھ ہی ان کی زندگی کے تمام پیچ وخم نظر آتے ہیں۔جس میں ان کو باپردہ حیادار اورمہذب فرد کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ جو بنا مرد کی اجازت کے باہر نہیں نکل سکتی اورجن کے ادھے کے بیل صرف بوڑھے آدمی ہی ہانک سکتے ہیں۔ یا کسی ادھے پر کسی عورت کا اکیلے مرد کے ساتھ بیٹھنا بدتہذیبی سمجھا جاتا ہو۔محرم کی نویں رات پورے سال کی وہ واحد رات ہوتی تھی جس میں اس طبقے کی بیبیاں زیارت کو اس طرح سے پردے کے ساتھ بھیس بدل کر باہر نکلتی تھیں تا کہ ان میں سے کوئی بھی پہچانی نہ جائیں۔لیکن اجن میاں یہ تمام فعل رضو باجی کے ساتھ انجام دیتے ہیں۔رضو باجی کو اپنے ادھے پر اکیلے بیٹھا کر گھر لے کر آتے ہیں اندھیری رات میں کنویں کے پاس لے جاتے ہیں اورامام باڑے کی زیارت بھی کراتے ہیں۔

افسانے کی شروعات سیتاپور تحصیل سدھولی کے منظر سے ہوتی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ زمینداری نظام کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ جو جگہ جھیلوں اور شکاریوں کے لئے مشہور تھی اب ان جھیلوں میں دھان بویا جاتا ہے۔ بندوقیں جو اس طبقے کے رعب وجلال کی نشانی ہوا کرتی تھی ان کو بیچ کر چکیاں لگائی گئی ہیں۔ اور بندوقوں کے لائسنس بلیک کر کے شیر وانیاں بنائی جاتی ہیں۔

اس منظر نگاری کے بعد رکھو چچا جو سارن پور میں ممتاز حیثیت کے مالک تھے ان کی اکلوتی بیٹی رضو باجی جو نہایت خوبصورت اور بڑی جائیداد کی مالک تھیں ان کے ذریعہ اس طبقے کی عورتوں کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ جن کی شادی کے لئے متعدد رشتے آتے ہیں مگر وہ ہر رشتے سے انکار کرتی رہتی ہیں۔ آخر کار اپنی ماں کے مرنے اور باپ پر فالج کا حملہ ہونے کے بعد ایک رشتے کو قبول کر لیتی ہیں۔ مگر عین منگنی کے دن ان کے اوپر 'جن' آجاتے ہیں۔ رضو باجی کے اوپر جنات کی سواری کو سن کر رشتے آنا بند ہو جاتے ہیں اور اس طرح رضو باجی کی عمر گذرتی رہتی ہے۔ اور وہ عمر کے اس مقام پر ہوتی ہیں جہاں پر پہونچ کر اکیلا پن اور تنہائی ایک ایسا عبرت انگیز افسانہ بن جاتی ہے۔ جس کو دیکھ کر کنواریوں کی روح کانپ جاتی ہے۔ رضو باجی اس عمر کو پہونچتی ہیں اور حج کرنے کا فیصلہ کرتی ہیں۔

رضو باجی کے خط بھیج کر بلانے پر اجن میاں ان کے پاس پہونچتے ہیں اور ان کے ذہن میں رضو باجی کے ساتھ گزارے گئے وقت کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ رضو باجی اجن میاں سے عمر میں بڑی ہوتی ہیں اور جن کے حسن کے افسانے اس نے سن رکھے تے۔ جب وہ محرم میں ان کے گھر پہونچتا ہے تو کسی نہ کسی بہانے رضو باجی کو دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ محرم کی نویں کو جب ساری عورتیں باہر چلی جاتی ہیں تو اجن میاں رضو باجی کے ساتھ زیارت کا پروگرام بناتے ہیں۔ اور ایک اندھیرے کنویں کے پاس لے جاتے ہیں۔ جس کو جناتوں کے کنویں کے نام سے تعارت کراتے ہیں۔ اور تو ہم پرستی کے سبب یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہاں پر مانگنے سے ہر مراد پوری ہو جاتی ہے۔ اور یہاں اجن میں رضو باجی سے کہتے ہیں آپ مجھے ذرا دیر کے لئے چھوڑ دیجئے میں ایک دعا مانگ لوں.... کیوں کہ رضو باجی ڈری سہمی اجن میں کو شانوں سے پکڑی ہوی ہوتی ہیں اور کہتی ہیں چلو یہاں سے جلدی سے چلو۔ اس کے بعد دونوں امام باڑہ جاتے ہیں۔ جہاں پر کر بلائے معلّی سے لائی ہوئی ضریح جس پر عورتیں اپنی بالوں کی ایک لٹ باندھ کر اپنے دل کی مراد مانگتی ہیں اور پوری ہونے پر لٹ کھول کر

لے جاتی ہیں۔ رضو باجی جب یہاں پر پہنچتی ہیں تو اپنے بال کی لٹ باندھ کر مراد مانگنے کے بعد باہر نکلتی ہیں تو وہاں پر موجود عورتیں کنکھیوں سے گھورتی ہیں۔ تبھی ایک عورت دوسری عورت سے پوچھتی ہے کون ہے؟ دوسری جواب دیتی ہے بڑے بھیا کی دلہن ہے۔ جب دونوں باہر نکلتے ہیں تو رضو باجی کے چہرے پر مخصوص مسکراہٹ ہوتی ہے۔ جس کو دیکھ کر اجن میں پوچھتے ہیں آپ بہت خوش ہیں۔ تو وہ کہتی ہیں:

''اوں.... ہاں.... نہ مانگتے دیر نہ ملتے دیر۔ اور اجن میاں اس جملے کے مطلب کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔'' 35

غرض اس کے بعد اجن میاں رخصت ہو جاتے ہیں۔ اور پڑھنے لکھنے اور ملازمت ملنے پر اپنا گھر بسا لیتے ہیں۔ اور رضو باجی تنہا زندگی کا سفر طے کرنے لگتی ہیں۔ پندرہ برس کے بعد جب دونوں کی ملاقات ہوتی ہے تو پورا منظر بدلا ہوا ہوتا ہے۔ رضو باجی ایک نازک اور خوبصورت لڑکی کی جگہہ ایک ادھیڑ عمر کی سفید کپڑے پہنے عورت نظر آتی ہے۔ جس کو دیکھ کر راوی حیرت زدہ رہ جاتا ہے۔ اور ان کی نگاہ اور چہرے کی افسردگی اور ویرانی سے وہ کانپ اٹھتا ہے۔ یہ دن نوچندی جمعرات کا ہوتا ہے۔ اور اسی دن رضو باجی کے اوپر جنات آتے ہیں۔ جن کی وجہ سے ان کی شادی رک جاتی ہے۔ اجن میاں کے دریافت کرنے پر رضو باجی اس راز سے پردہ اٹھاتی ہیں کہ اگر وہ اپنے اوپر جنات کی سواری آنے کا بہانہ نہیں کرتی تو ان کی شادی کر دی گئی ہوتی اور کوئی دولہا آگیا ہوتا غرض وہ شادی سے بچنے کے لئے جنات کے آنے کا بہانہ کرتی ہیں۔

اس واقعہ کے ذریعہ قاضی صاحب نے اس عہد کی لڑکیوں کی نفسیاتی حالت کی عکاسی کی ہے جن کے پاس اپنی خواہش اور مرضی کا اظہار نہ کر پانے کا اور شادی نہ کرنے کا صرف یہی بہانہ ہوا کرتا تھا۔ ان لڑکیوں کے پاس تہذیبی زندگی اور روایت کے اقدار کا اتنا خیال ہوا کرتا تھا کہ ان کے دل کی آہ وزاری جذبات واحساسات کو حویلیوں کے اندر زندہ دفن کر دینا بہتر سمجھتی تھیں مگر اپنی تہذیبی اور خاندانی زندگی پر آنچ نہیں آنے دیتی تھیں۔ اس کے علاوہ اس طبقے کے مرد کو اتنے اختیارات حاصل ہوتے تھے کہ اپنی اکڑ، انا، ضد کے چلتے لڑکیوں کی مرضی کے بنا اور ان کے احساسات وجذبات کا خیال نہ کرتے ہوئے صرف ایسی جگہ شادیاں طے کرتے جو ان کے حسب ونصب اور ان کے جیسا صاحبِ حیثیت کا مالک ہو۔ یا کبھی۔ کبھی ایسا ہوتا تھا کہ بھائی اپنی بہنوں کی شادیاں صرف اسی وجہ سے نہیں کرتے تھے کہ ان کو جائیداد میں سے حصہ دینا پڑے گا۔ جس کی

35: آئینۂ ایام: قاضی عبدالستار کے بہترین افسانے۔ مرتب: ڈاکٹر محمد غیاث الدین۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔ سنہ اشاعت: 1995۔ ص: 34

وجہ سے ان کی عمر گذرتی رہتی تھی اور اس استحصال کی وجہ سے وہ جنسی امراض میں گرفتار ہو جایا کرتی تھیں۔ رضو باجی کے افسانے میں ان تمام واقعات کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ رضو باجی کہتی ہیں:

''تم کو معلوم ہے مجھ پر جنات کب آئے؟ آج سے دس سال پہلے۔'' اور تم کو معلوم ہے تمھاری شادی کو کتنے برس ہوئے؟ دس سال! تم کو ان دونوں باتوں میں کوئی رشتہ نہیں معلوم ہوتا۔ تم نے چتر ہٹہ کے سفر میں کیا کیا؟ تم محرم کی نویں تاریخ مجھے کہاں کہاں گھسیٹتے پھرے؟ تم اس بھیانک کنویں سے میرے سامنے کیا مانگنا چاہتے تھے۔ تم نے عباسی علم کو بوسہ دے کر مجھے کنکھیوں سے دیکھتے ہوئے کسے پانے کی آرزو کی تھی۔؟ جاؤ امام باڑے کی ضریح کو غور سے دیکھو۔ میرے بالوں کی سرخ لٹ آج بھی بندھی نظر آئے گی اگر کھچڑی نہ ہوگئی ہو تو۔ کیا میں نے امام حسین سے صرف ایک عدد شوہر مانگنے کے لئے یہ جتن کئے تھے۔ سارنگ پور کی ناونوں اور میراثنوں سے پوچھو کہ وہ رشتے لاتے لاتے تھک گئی لیکن میں انکار کرتے نہ تھکی۔ کیا تم مجھ سے یہ چاہتے تھے کہ میں سارنگ پور سے ستو باندھ کر چلوں اور چتر ہٹہ کی ڈیوڑھی پر دھونی مار کر بیٹھ جاؤں اور جب تم برآمد ہو تو اپنا آنچل پھیلا کر کہوں کہ حضور مجھ کو اپنے نکاح میں قبول کر لیں کہ زندگی سوارت ہو جائے۔ تم نے رکھومیاں کی بیٹی سے وہ بات چاہی جو رکھومیاں کی طوائفوں سے بھی ممکن نہ تھی۔'' 36؎

غرض اس افسانے کے ذریعہ قاضی صاحب نے ماضی کے دھندلے نقوش کی یاد تازہ کر دی ہے۔ جن میں اقدار عالیہ خاص طور سے مسلم تہذیب و تمدن اور اس عہد کی عورتوں کی ایثار و قربانی اور اس طبقے کی لڑکیوں کی خاندانی انانیت کی پاسداری کا عمدہ نمونہ نظر آتا ہے۔ اور اس افسانے کو قاضی صاحب نے اپنی فنی چابکدستی کے تحت واقعات کی ترتیب و تنظیم کے ساتھ ختم کرنے کی کوشش کی ہے۔

پورے افسانے کی منظر کشی اس انداز میں کی گئی ہے کہ پورا افسانہ ایک مخصوص پلاٹ کے تحت ڈھل کر کہانی اپنے اختتام تک پہونچ جاتی ہے۔ رضو باجی کہتی ہیں:

''یہ حج میں اپنے باپ کے لئے کرنے جا رہی ہوں جو میرے بوجھ سے کچل کر مر گئے

36؎: آئینۂ ایام: قاضی عبدالستار کے بہترین افسانے۔ مرتب: ڈاکٹر محمد غیاث الدین۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔ سنہ اشاعت: 1995۔ ص: 36-37

جنھوں نے مرتے وقت بھی اپنی عقبیٰ کے لئے نہیں میری دنیا کے لئے دعا کی اس لئے میں نے تم کو معاف کیا۔ اگر تم زاہدہ کو مجھ پر سوت بنا کر لے آتے تو بھی معاف کر دیتی۔'' 37؎

یہ افسانہ عزت نفس احساس زیاں احساس ندامت کی خوبصورت داستان پیش کرتا ہے اور قاری خود کو اس احساس میں مبتلا پاتا ہے۔ رضو باجی کے اس جملے کے بعد راوی کو یوں محسوس ہوتا ہے.... جیسے زندگی رائیگاں چلی گئی۔ جیسے میری بیوی نے مجھے اطلاع دی ہو کہ میرے بچے میرے بچے نہیں ہیں۔

قاضی عبدالستار کی تخلیق کا خاص وصف یہ ہے کہ وہ ایک۔ ایک جملے اور الفاظ کی تراکیب، ساز و سامان تشبیہات اور استعارات کے ذریعہ عہد ماضی کا پورا منظر کھینچ دیتے ہیں۔

قاضی صاحب کا بے حد مشہور جملہ ہے کہ ایک بہترین افسانہ کی تکنیک چاول پر قل ہو اللہ لکھنے جانے کی تکنیک ہے۔ اور ساتھ ہی انھوں نے یہ بھی کہا ہے کہ افسانے کا فن ناول کے فن سے کہیں مشکل ہے۔ قاضی صاحب کے افسانوں کے پلاٹ ترتیب و تنظیم میں ایک۔ ایک لفظ کو اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ ایک نقطہ اور ایک جملے کے ذریعہ وہ بہت سے واقعات اس طرح سے ذکر کرتے ہیں کہ جب تک آپ اس واقعہ کی تفصیل نہ جان لے تب تک کسی ٹھوس نتیجے پر نہیں پہونچ سکتے۔ اس کی وجہ سے ایک افسانے کو یا کبھی۔ کبھی ایک سطر یا ایک لفظ کو کئی۔ کئی بار پڑھنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ تبھی کسی افسانے کی پوری فضا اور واقعات کی صحیح ترتیب سمجھ میں آتی ہے۔

رضو باجی سارن پور تحصیل سیتا پور کے بڑے زمیندار رکھو چچا کی اکلوتی بیٹی ہے۔ جس کو اس کا ماموں زاد بھائی دل ہی دل میں چاہتا ہے۔ رضو باجی بھی اسے پسند کرتی ہیں۔ لیکن دونوں اپنے عشق کا اظہار نہیں کر پائے بالآخر اجن میاں کی شادی ہو جاتی۔ لیکن رضو باجی تمام عمر شادی نہ کر کرنے کا فیصلہ کر لیتی شروعات میں وہ سبھی رشتے ٹھکراتی رہی۔ لیکن والدین کا دباؤ دیکھ کر خود پر جنات آنے کا بہانہ کیا تا کہ رشتے آنا بند ہو جائیں۔ نتیجتاً ایسا ہی ہوتا ہے۔ رضو باجی اڈھیڑ عمر کو نہیں ہیں تو وہ اپنے والد مرحوم کے ایصال ثواب کے لئے حج بیت اللہ پر جانے کا عزم کرتی ہیں اس موقع پر وہ اجن میاں کو گھر پر مدعو کرتی ہیں اور ان پر اپنے عشق کا راز عیاں کر دیتی ہیں۔ اجن میاں کو رضو کی ساری باتیں سن کر بہت دکھ ہوتا ہے۔ اور رضو باجی کے دکھ اور کرب کا

37؎ آئینۂ ایام: قاضی عبدالستار کے بہترین افسانے۔ مرتب: ڈاکٹر محمد غیاث الدین۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔ سنہ اشاعت: 1995۔ ص: 37

احساس ان کے جملے سے ہوتا ہے۔ اقتباس:

''...تم نے رکھومیاں کی بیٹی سے وہ باتی چاہی جو رکھومیاں کی طوائفوں سے بھی ممکن نہ تھی۔
اگر تم زاہدہ کو مجھ پر سوت بنا کر لاتے تو بھی معاف کر دیتی۔'' 38

افسانہ رضو باجی میں مصنف نے معاشرتی توہم پرستی، کھوکھلی وضعداری، قربانی اور انانیت کی جیتی جاگتی تصویر کھینچی ہے۔ رضو کا عشق جب ناکام ہوا جاتا ہے تو وہ زندگی بھر شادی نہ کرنے کا فیصلہ کرتی ہے۔ جو ایثار و قربانی کی کم یاب مثال ہے۔ رضو باجی کی بلاوے پر اجن میاں صاحب اس کے گھر جاتے ہیں تو اس سے دریافت کرتے ہیں۔ کہ یہ جنات کا کیا چکر ہے۔ رضو باجی جواب دیتی ہیں:

''مجھ پر جنات نہیں آتے اجن میں! میں جناتوں کو خود بلاتی ہوں۔ اگر جنات نہیں آتے تو
کوئی دلہا آ چکا ہوتا۔'' 39

قاضی صاحب نے اس افسانے کے ذریعہ متوسط گھرانے کی لڑکیوں کی بے بسی اور مجبوری پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اس طبقے کی لڑکیاں، روایت اور انانیت کی پاسداری میں کس حد تک جاسکتی ہیں رضو باجی اس طبقے کی نمائندگی کرتی ہے اور اپنے نظام کے خلاف ایک خاموش احتجاج کی نمائندہ نظر آتی ہیں ایک افسانہ قاضی عبدالستار کا نمائندہ اور قابل ذکر افسانہ ہے۔

☆☆☆

38: آئینۂ ایام: قاضی عبدالستار کے بہترین افسانے۔ مرتب: ڈاکٹر محمد غیاث الدین۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔ سنہ اشاعت: 1995۔ ص: 37

39: آئینۂ ایام: قاضی عبدالستار کے بہترین افسانے۔ مرتب: ڈاکٹر محمد غیاث الدین۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔ سنہ اشاعت: 1995۔ ص: 36

شہری افسانے

1857ء کے بعد ہندوستان کی تاریخ کا سب سے اہم اور عظیم سیاسی و معاشرتی سانحہ ۱۹۴۷ء یعنی تقسیم ہند کا المیہ ہے۔ اس المیہ نے جہاں برصغیر کو ٹکڑوں میں تقسیم کردیا وہیں دوسری طرف زندگی کے تمام شعبوں میں تبدیلیاں پیدا ہوگئیں۔ متحدہ ہندوستان کی صدیوں کی مشترکہ تہذیب کا شیرازہ بکھر گیا۔ مذہبی رواداری اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کا مروجہ نظام درہم برہم ہوکر رہ گیا۔ یوں تو 1947 میں ہندوستان انگریزی حکومت سے آزاد ہوگیا لیکن مگر اس کے ساتھ ہی شہری زندگی اور دیہی زندگی میں بھی واضح تبدیلیاں پیدا ہونے لگیں۔

لوگ گاؤں چھوڑ کر شہر میں بسنے کو ترجیح دینے لگے۔ جس سے شہری کرن میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ سائنسی ایجادات نے زندگی کو مزید مشینی بنا دیا۔ اور لوگ بے حس ہوتے چلے گئے۔ مشینی آلات نے نہ صرف احساس مروت کو کچل دیا بلکہ لوگوں کو مزید سفاک خودغرض اور لالچی بنا دیا۔ بڑھتی آبادی سے غریبی بے روزگاری اور بے چارگی میں اضافہ ہوتا گیا۔ رہائش کا مسئلہ بڑھتا گیا۔ اور لوگوں کے دل بھی تنگ ہوتے چلے گئے۔ بڑے بڑے خاندان سے سمٹ کر لوگ Nuclear family کو ترجیح دینے لگے جس سے آپسی رشتوں کی گرماہٹ نیز اپنا پن مفقود ہوتا چلا گیا۔ اور لوگ اکیلے پن کا شکار ہونے لگے۔ فلیٹ کلچر نے ایک دوسرے کو اجنبی بنا دیا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف لوگ اخلاقی طور پر بہت دور ہوتے چلے گئے تو دوسری طرف ان میں نفسیاتی پیچیدگی بھی بڑھتی چلی گئی۔ نپے تلے انداز میں کھانا پینا سونا جاگنا حتیٰ رومانی اور جنسی رشتے کی گرماہٹ اور خوبصورتی کی جگہہ مشینی جذبات اور سرد احساس نے دلوں کے اندر خالی پن پیدا کرنا شروع کر دیا۔ زندگی گھڑی کے گول اور سوئچ بورڈ پر منحصر ہوگئی ہے موبائل میں زندگی سمٹ کر ایک ٹون ہمہ وقت الارم دیتی محسوس ہونے لگی۔ نتیجتاً آزاد ہوکر بھی سماجی پیچیدگی کا شکار ہوتے گئے۔ نہ صرف دوسروں سے بلکہ انسان خود سے بھی دور ہوتا چلا گیا۔ اور اس کے اندر اخلاقی ہمدردی محبت خلوص ایثار کے جذبے عنقا ہونے لگے۔ معاشرے میں ہونے والی یہ تبدلییاں نئے انداز سے ادب میں بھی جگہ پانے لگیں اور یہ ظاہری تبدیلیوں نے باطنی جذبات

واحساسات کو کچلنا شروع کر دیا۔ اپنا اجنبی اور اجنبی اپنا لگنے لگا۔ پوری دنیا کے لوگوں سے دوستی ہونے لگی اور اپنوں سے نفرت ہونے لگی۔ قریب کے لوگ دور اور دور کے لوگ قریب لگنے لگے۔ سوچنے سمجھنے، غور وفکر کرنے زندگی کے تئیں کوئی نظریہ قائم کرنے میں ایک عجیب کش مکش اور الجھن کا شکار ہونے لگی۔ تخلیق کاروں نے فرد کی داخلی کرب کو موضوع بنا کر علامتی اور تجریدی افسانے لکھے۔ جس میں کردار سے عاری افسانے منظر عام پر آنے لگے۔ کیوں کہ اس کی ایک بڑی انسان کی شناخت کی گم شدگی تھی۔ شناخت گم ہوئی تو کردار بھی گم ہو گیا۔ جس کہ وجہ سے انسانوں کے بیچ فرق کرنا مشکل ہو گیا۔ قاضی عبدالستار نے شہری زندگی پر جتنے بھی افسانے لکھے ہیں۔ ان میں ان تمام مسائل کی باز گشت موجود ہے۔ جس میں کردار پلاٹ اور کہانی بھی ہے۔ چند قابلِ ذکر ہیں جیسے، ''ایک دن''، ''ماڈل ٹاون''، ''کتابیں'' وغیرہ ان افسانوں میں انھوں نے روزی روٹی مسئلہ شناخت کی گمشدگی عدم تحفظ، اداسی ناکامی، جھوٹ فریب دھوکہ کے ساتھ اخلاقی پستی، بے راہ روی اور ادب میں بڑھتی فحاشیت اور عریانیت کی طرف توجہ مبذول کرائی ہے۔

شہری زندگی کے بدلتے ہوئے رویہ جس میں انسانوں کے اندر چین وسکون کو تباہ و برباد کر دیا تھا ہر انسان ذہنی پریشانی، تنہائی کے کرب اور خوف میں مبتلا ہو گیا اسی بدلتے ہوئے تناظر سے قاضی عبدالستار کے افسانوں کو سمجھنے کی کوشش کی جائے گی جس میں انھوں نے شہری زندگی اس کی بدلتے ہوئے منظر نامے کو پیش کیا ہے۔ جہاں گاؤں دیہات وقصبات سے نکل کر ایک بڑی آبادی شہر کا رخ کرتی ہے اس امید پر کہ وہاں جدید سہولیات کی فراہمی ہوگی ساتھ ہی زندگی گزارنے کا حیلہ اور نوکری کی تلاش نے انسان کو خود سے دور کر دیا۔ جس میں گھر، پریوار، بیوی، بچے اور خاندان کا روایتی تصور دھیرے، دھیرے مٹنے لگا۔ ایک دوسرے کی مسابقت کے ساتھ آفس کے ایک کونے میں بیٹھ کر کیا جانے والا کام چمنیوں سے نکلنے والے دھوئیں اور بڑھتی ہوئی مصروفیات اور وقت کی کمی بس کا مشکل اور صبر آزما سفر مقابلے اور مسابقے کی اندھی دوڑ نے ادب میں مختلف زاویے سے نظر آنے والے موضوع بن گئے قاضی عبدالستار کے چند شہری افسانوں میں ان موضوعات کا عکس دکھائی دیتا ہے جس پر یہاں بات کی جائے گی۔

☆☆☆

کتابیں

''کتابیں'' یہ افسانہ ''کتاب'' لکھنؤ سے 1969 میں شائع ہوا۔قاضی عبدالستار کا یہ افسانہ شہر کے متوسط طبقے کی مسلم عورتوں کے جنسی جذبات واحساسات گھٹن اور نفسیاتی کشمکش کے ساتھ ایک لٹریچر کے گمراہ کن نتائج غیر اخلاقی فحش کہانیوں اور تصاویروں پر مبنی افسانہ ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار ایک بیوہ عورت سدو کا ہے۔ سدو اپنے شوہر کے انتقال کے بعد اپنی جوان بیٹی رشو کے ساتھ رہتی ہے پرانی قدروں اور روایتوں کا حامل یہ خاندان بنا پردے کے کسی کے سامنے آنے کو معیوب سمجھتے ہیں۔ ساتھ ہی نماز، روزہ کی پوری پابندی کرتے ہیں۔ مگر اپنی جنسی بھوک کو شانت کرنے کے لئے کوئی نہ کوئی طریقہ انسان نکالتا ہے۔ کچھ اسی طرح کے واقعات اس افسانے میں پیش کئے گئے ہیں۔ اس افسانے کا واقعہ کچھ اس طرح ہے۔

سدو کے شوہر کی چوتھی برسی کے موقعے پر اس کے بڑے بھائی نے سدو نے کہا کہ پندرہ روپئے ماہوار پر ایک ماسٹر صاحب کو باہر کا کمرہ کرایے پر اٹھا دیا ہے۔ تاکہ گھر کی مالی تنگ دستی ختم ہو جائے۔ ماسٹر صاحب گھر میں عزت وآبرو کے ساتھ رہنے لگتے ہیں کچھ دنوں کے بعد دس روپے مہینہ زائد دے کر بھائی صاحب کی سفارش پر گھر میں ہی کھانا کھانے لگتے ہیں۔ ماسٹر صاحب کے پاس کھانا لے جاتے ہوئے سدو پردے کا پورا خیال رکھتی ہے۔ کچھ دن گزرنے کے بعد سدو ماسٹر صاحب سے کہتی ہے:

> ''اللہ ماسٹر صاحب اسکول سے ایک آدھ کتاب لا دیجئے....آخر بے کار بیٹھی رہتی ہوں دن بھر'' [40]

کچھ دنوں کے بعد ماسٹر صاحب کتاب لا کر دے دیتے ہیں۔ وہ باورچی کھانے میں کتاب کے ورق الٹنے لگتی ہے اور کتاب کے لفظ۔ لفظ سے ٹپکتے ہوئے نشہ سے شرابور ہونے لگتی ہے۔ اسی طرح وہ مدہوشی کے عالم میں کتاب پڑھتی رہتی ہے جب دروازے کی کنڈی بجتی ہے تب اسے ہوش آتا ہے کہ ظہر کا وقت ہو چکا ہے۔

وہ کتاب لا کر اپنے تکیے کے غلاف میں چھپا دیتی ہے اور سوچتی ہے کہ اگر رشو جو اس کی بیٹی ہے دیکھ لے گی تو کیا کہے گی۔

40: آئینۂ ایام: قاضی عبدالستار کے بہترین افسانے۔ مرتب: ڈاکٹر محمد غیاث الدین۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔ سنہ اشاعت: 1995۔ ص: 91

کتاب کو پڑھنے کے بعد اس کی عجب سی کیفیت ہوتی ہے اور جیسے تیسے وہ عشاء کی نماز پوری کرتی ہے۔ نماز پڑھنے کے بعد جب وہ سونے جاتی ہے تو دوبارہ کتاب پڑھنے لگتی ہے اور اسی طرح مدہوش اور لذت محسوس کرتی ہے تبھی اسے اپنے شوہر کی بات یاد آتی ہے۔ جو مرتے وقت اس سے کہہ رہے تھے:

''سدو میں تو جا رہا ہوں۔ رشو کے بیاہ کا تنکا۔ تنکا جمع کر کے رکھ دیا ہے۔...۔اللہ بھائی جان کو زندہ رکھے کسی کھاتے پیتے لڑکے کے ہاتھ دیں گے۔ لیکن تمھارا....تمھارا کیا ہوگا سدو تم بیٹھنا بھی چاہو گی تو یہ بدن تمھیں بیٹھنے نہ دے گا۔ اس کو دیکھنے والے تم کو بیٹھنے نہ دیں گے'' 41

ایک جوان اور بیوہ عورت کے کردار کو افسانہ نگار نے بہت ساری سماجی اور نفسیاتی الجھنوں کا شکار دیکھایا ہے۔ بیانیہ تکنیک اور واحد متکلم کے ذریعہ پورا افسانہ بیان ہوا۔

کہانی کا بیشتر حصہ مرکزی کردار سدو کے ذہنی خلفشار پر مبنی ہے۔ اور کبھی ماضی میں تو کبھی مستقبل میں ہونے والے حادثات و واقعات کے امکان بنانے لگتی ہے۔ کیوں کی جس کتاب کو پڑھ کر سدو کے ہوش و حواش پر جنس کا بھوت سوار ہونے لگتا ہے وہی کتاب اپنی بیٹی رشو کے تکیئے کے غلاف کے نیچے پاتی ہے جس میں ایک خط بھی رکھا ہوا ملتا ہے۔ جس میں لکھا ہوتا ہے:

''چاند''

تم بلا وجہ ڈر کر چلی گئیں تمھاری امی جب سوتی ہیں کروٹ تک نہیں بدلتیں۔ کل رات جب تم آؤ گی تو میں تم کو بہت عمدہ کتاب دونگا۔ میرے کمرے کا دروازہ کھلا ہوگا۔ اور میں اندر ہی لیٹونگا۔'' 42

یہ پڑھ کر سدو کے حالت فاختہ ہوگئی اور اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے اور اپنے ذہن میں طرح۔طرح کے پلان بنانے لگتی ہے۔ اس افسانے میں قاضی صاحب نے سماج میں ہونے والی غیر اخلاقی قدروں، ناجائز تعلقات، فحش اور عریانیت کو موضوع بنایا ہے۔ اسکول میں پڑھانے والا ماسٹر جو ماں۔ باپ اور بچوں کے اندر تہذیب اور اخلاق کا درس دیتا ہے وہی ماسٹر کو ماں اور بیٹی کی عزت اور حرمت کا ذرا بھی خیال ہیں آتا۔ فحش کتابیں جو اسنے بیٹی کو پڑھنے کو دیا وہی ایک ماں کو بھی دیتا ہے جس کی وجہ سے دونوں بیک وقت

41: آئینۂ ایام: قاضی عبدالستار کے بہترین افسانے۔ مرتب: ڈاکٹر محمد غیاث الدین۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔ سنہ اشاعت: 1995۔ ص: 92

42: آئینۂ ایام: قاضی عبدالستار کے بہترین افسانے۔ مرتب: ڈاکٹر محمد غیاث الدین۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔ سنہ اشاعت: 1995۔ ص: 93

جنسی وذہنی کشمکش کا شکار ہوتی ہیں۔

گھر میں رہنے والا یہ کرایہ داران کی بیٹی کے ساتھ رنگ رلیاں بھی مناتا ہے۔خط پڑھنے کے بعد سدو ماسٹر صاحب کو بدنام کر کے شادی کرنے کا فیصلہ کرتی ہے۔کیوں کہ اسے لگتا ہے اگر یہ حرکت صرف رشو کے ساتھ ہوتی تو وہ معاف کر دیتی اور اپنے بھائی کے کہنے کے مطابق اس کی شادی کرا دیتی ہے۔مگر ماسٹر صاحب نے اخلاقی حدوں کو پار کر دیا۔سدو اسے سبق سکھنانے کے لئے ایک غیر اخلاقی طریقہ کار اپناتی ہے:

''وہ اندھیرے گپ کمرے میں بدن کو سمیٹ کر داخل ہوگئی اور دو باہیں اس کی کمر میں لپٹ گئی اور گرم اور نرم سانسیں اس کے چہرے پر رینگنے لگیں جب ماسٹر صاحب لذت کے سمندر میں سر سے پاؤں تک ڈوب گئے تو اس نے آہستہ سے لالٹین جلانے کو کہا۔'' 43

جب ماسٹر صاحب نے سدو کو دیکھا تو ان کے ہوش اڑ گئے اور ہکلاتے ہوئے صرف اتنا کہتے ہیں۔ 'سدو یہ سب حقیقت میں نہیں کرتی ہے بلکہ یہ اس کے ذہن میں چلتا رہتا ہے۔'

قاضی صاحب کے افسانوں کا خاص وصف یہ ہے کہ ذرا سی چوک ہونے اور لفظوں کے الٹ پھیر ہونے پر افسانہ سمجھ میں نہیں آتا ہے۔اگر پورا افسانہ قاری نے بھر پور توجہ سے نہیں پڑھا تو یا ایک لفظ چھوڑنے پر بھی جو واقعہ انھوں نے بیان کیا وہ آسانی سے ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔اس لئے قاضی صاحب کا افسانہ نہایت باریکی سے پڑھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

سدو آگے سوچتی ہے۔اور ذہنی طور پر اسے لگتا ہے اس واقعہ کے بعد ماسٹر صاحب نے اس سے شادی کر لی اور وہ ماسٹر صاحب کے ساتھ وہ کھیل رہی ہے تبھی اس کے بھائی آجاتے ہیں اور زمین پر حقارت سے تھوک دیتے ہیں۔اور باہر چلے جاتے ہیں۔تبھی ایک عورت آتی ہے اور کہتی ہے:

''جیتی رہو.....لڑکی کے خون سے رنگا ہوا سہاگ سلامت رہے۔''

''اس نے کانپ کر کروٹ بدلی'' 44

اس جملے میں یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ سدوت کے تخیل میں یہ بات سوچ رہی تھی افسانے میں وقت اور ماحول کا انکشاف تھوڑے۔تھورے سے جملوں کے ذریعہ پیش کر کے پوری فضا کو قاری کے سامنے پیش کیا گیا

43: آئینۂ ایام: قاضی عبدالستار کے بہترین افسانے۔مرتب: ڈاکٹر محمد غیاث الدین۔ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔سنہ اشاعت: 1995۔ص: 96

44: آئینۂ ایام: قاضی عبدالستار کے بہترین افسانے۔مرتب: ڈاکٹر محمد غیاث الدین۔ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔سنہ اشاعت: 1995۔ص: 94

ہے۔جس سے کہانی میں واقعات کی کڑیاں جڑتی چلی گئی ہیں۔

قاضی صاحب کے افسانوں میں جنسی باتوں کھل کر استعمال نہیں ہوا ہے اور اشارے کنایہ کی صورت میں ہی بات کی گئی ہے۔جس کی وجہ سے آگے کے مرحلے کو قاری کے تخئیل پر ہی چھوڑ دیا جاتا ہے۔قاضی صاحب نے منٹو وعصمت یا دیگر افسانہ نگاروں کی طرح جنھوں نے کھل جنس کے موضوع پر لکھا ہے اس کا انداز نہیں دکھائی دیتا ہے۔بلکہ تہہ داری اور رمزیہ انداز دیکھائی دیتا ہے۔

سدوا ابھی یہ سب سوچتی رہتی ہے تبھی باہر کی کنڈی کھٹکھٹا کر ماسٹر صاحب اندر آتے ہیں اور بھیگے ہوئے کپڑوں میں فرمائش کرتے ہیں کہ جلد انھیں چائے بنوا کر پلائی جائے وہ اپنے خیالی دنیا سے باہر نکل آتی ہے جس میں وہ ماسٹر صاحب کو بدنام کر کے شادی کرنے پھر سماج کی ڈر سے رشو سے ماسٹر صاحب کی شادی کرانے کا فیصلہ کرتی ہے۔ماسٹر صاحب کے گھر میں آنے کے بعد وہ سب کچھ بھول کر ایک بیوہ ،شریف عورت اور اپنی بیٹی کی ماں بن کر ماسٹر صاحب کو داماد کی نظر سے دیکھتی ہے۔اور چائے بناتے وقت اپنے خدشات اور اندیشوں اور جو باتیں ابھی وہ سوچ رہی تھی اس پر نادم ہو کر مسکرانے لگتی ہے۔

یہ افسانہ اسی جذبے کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے۔اس کہانی کا بیشتر حصہ مرکزی کردار کے ذہن میں پیدا خیالات وحادثات پر مبنی ہے یعنی شعور کی رو میں لکھا گیا ہے۔ساتھ ہی ایک بیوہ عورت اور اس کی جوان لڑکی کی حرکات وسکنات کا حقیقی اور سچا منظر پیش کرتا ہے۔قاضی صاحب کو جزئیات نگاری پر کافی عبور ہے۔جو وہ کوئی افسانہ یا کہانی بیان کرتے ہیں تو وہ اپنے دور اور سماج کی سچی تصویر پیش کرنے لگتی ہے۔الفاظ کا منفرد اور خوبصورت استعمال کرنے کے بدولت ہی انھیں قول محال کا بادشاہ سمجھتا جاتا ہے۔اردو ادب میں ان کے اسلوب اور نادر خوبصورت تشبیہات واستعارات کی ہمیشہ تعریف کی جاتی ہے۔وہ جس طبقے کا واقعہ بیان کرتے ہیں اسی طبقے کی زبان استعمال بھی کرتے چاہے وہ دیہات کی منظر نگاری ہو یا عورتوں کی زبان غرض قاضی صاحب کا یہ افسانہ اپنی ان تمام خصوصیات سے لبریز نظر آتا ہے۔

☆☆☆

ایک دن

شہری افسانے کے زمرے میں قاضی عبدالستار کی کہانی ''ایک دن'' کو رکھا جا سکتا ہے۔جس میں وقت

24 گھنٹے میں بٹے ہوئے کام کاج اور مشینی انداز میں گذرتی ہوئی زندگی کی عکاسی کی گئی ہے۔ جہاں ایک انسان وقت کے خانوں میں بڑا ہوا ہر کام اسی طرح انجام دیتا ہے۔ جس طرح مشین۔ جہاں جذبات واحساسات کی کوئی قدر دانی نہیں ہے۔ جہاں جنسی رشتے اور میاں بیوی کے جذباتی تعلقات بھی وقت کی پابندی اور مشینی انداز میں طے کئے جاتے ہیں۔

اس کہانی میں جو ہیرو ہے وہ زندگی میں ڈسپلن اور نظم وضبط کا حد سے زیادہ قائل ہے۔ وہ اپنا ہر کام روٹین کے تحت کرتا ہے۔ اس میں مصنف نے اسے انسان کی جگہہ مشین کے روپ میں دکھایا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ اپنی بیوی سے جنسی عمل کے معاملے میں بھی اس کا رویہ خاصا میکانکی ہے اور سرد ہے۔ دو متضاد رویوں اور رجحانات رکھنے والے دو جوان جسم شادی کے بندھن میں جکڑ جاتے ہیں مگر ان کے بیچ کبھی جذبات کا لطیف احساس کبھی قائم نہیں ہوا۔ یہ افسانہ ایک عورت کی نفسیات کی خوبصورت پیشکش ہے۔ ایک اقتباس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ کس باریکی کے ساتھ مصنف نے یہاں تک گھر کے کسی کام میں اس کی مرضی یا حمایت شامل اس طرح نہیں ہے۔ اقتباس:

> ''وہ بیٹھی سوچتی رہی اپنے آپ سے اپنے وجود کے معنیٰ پوچھتی رہی۔ کیا اس کی جاگتی آنکھوں نے اس زندگی کے خواب دیکھے تھے خواب جن کی گرمی سے کانپتی راتیں دہک اٹھتی ہیں اور جن کی نرم نرم خنکی سے دیکھتی دوپہریں کا پینے لگتی ہیں کیا یہی وہ پاک صاف زندگی ہے جس کی چاہت میں اس نے کسی پرشوق نگاہ کی رنگین گستاخیوں کو نظر کے قریب نہ آنے دیا۔ کسی بے قرار ہاتھ کے لمس کی خوشبودار گرد اپنے دامن پر نہ پڑنے دی۔'' 45

یہاں سلمیٰ جس کو ایک خوبصورت پیار بھری زندگی کی خواہش ہے مگر اس کا شوہر وہ پیار نہیں دے پاتا جس طرح اس کو خواہش ہوتی ہے بلکہ ہر کام کو سرد باسی اور مشینی انداز میں پیار کرتا ہے۔ سلمیٰ اپنی زندگی کے بارے میں سوچتی ہے۔ وہ کوئی سجاوٹی سامان ہے جس کو گھر میں سجانے کے لئے لایا گیا ہے۔

اس کہانی میں مصنف نے جس طرح سے ایک مرد کے کردار کے اندر ڈسپلن اور سمجھداری دکھائی ہے وہ حیرت کی بات ہے۔ ہیرو کی عادات میں جو سلیقہ ڈسپلن سامنے آیا ہے وہ عموماً عورت کی فطرت کا حصہ ہوتا ہے مگر ہیروئن کو اپنے شوہر کا اتنا نظم وضبط پسند نہیں ہے۔ وہ زندگی کو مشینی انداز میں نہیں بلکہ زندگانی کے ساتھ

45: آئینۂ ایام: قاضی عبدالستار کے بہترین افسانے۔ مرتب: ڈاکٹر محمد غیاث الدین۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔ سنہ اشاعت: 1995۔ ص: 47

گذارنا چاہتی ہے کیونکہ وہ جانتی ہے کہ احساسات وجذبات کو اگر انسانی وجود سے الگ کر دیا جائے تو انسان کی حیثیت ایک چلتے پھرتے بت سے زیادہ کچھ نہیں رہ جاتی۔

اس کہانی میں صرف تین کردار ہیں جو سلمیٰ کا شوہر جو ایک سلیقہ مند انسان پروفشنل لائف گذارتا ہے۔ شہری زندگی میں وقت سے اٹھنا بیٹھنا اور وقت سے کھانا پینا بہت ضروری ہے ورنہ ایک منٹ کی دیری سے سڑکوں پر لمبے جام اور ٹریفک سے پورا گھنٹہ برباد ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے شہری زندگی گذارر ہے لوگ وقت کی سوئی کے حساب سے چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ اس میں بھی سلمیٰ کے شوہر کو وقت کی ٹک ٹک میں قید انسان کی طرح پیش کیا گیا ہے۔ جو گن، گن اور نہایت احتیاط سے ہر کام انجام دیتے ہیں۔ مگر سلمیٰ جو ایک نو جوان خوبصورت لڑکی ہے اس کو یہ مشینی زندگی پسند نہیں ہے۔ اور وہ اپنے شوہر کے اس نظم وضبط والی زندگی سے بے زار نظر آتی ہے۔ شوہر کے آفس جانے کے بعد وہ گھر میں تنہا ہو جاتی ہے اور سوچتی رہتی ہے کیا یہ وہی زندگی ہے جس کی وہ خواہش کر رہی تھی۔ یہاں تک کہ بچہ پیدا کرنے کے لئے شوہر کی طرف سے روک ہے اور شادی کے ۵ سال بعد ہی وہ دنیا میں اپنے بچے کو لانا چاہتا ہے تاکہ اس کے آنے کے بعد اس کے خرچ کے لئے پیسے اکٹھے ہو جائیں۔ سلمیٰ کو فریم دیکھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ وہ بھی اس فریم کی طرح اس گھر میں لاکر رکھ دی گئی ہے۔ جو خرید کر قید خانے کی طرح ڈال دی گئی ہے۔ اسے محسوس ہوتا ہے جو بظاہر خوبصورت اور آرام دہ مکان میں ہوٹل میں۔ قید خانے میں رکھ کی گئی ہے۔ اس کے اندر رکھے گئے پھل شیرنیاں نمکینیاں اس کا ذائقہ وہ خود اپنی مرضی سے نہیں کھا سکتی ہے۔ وہ صرف وقت سے کھلتی اور وقت سے بند ہوتی ہے۔

جو شہر میں نوکری کرتا ہے وہ جانتا ہے کہ شہر میں نپے تلے انداز میں رقم ملتی ہے اور اسی رقم سے گھر کا پورا خرچ اٹھانا پڑتا ہے اس میں سلمیٰ کا شوہر مہینے کی ایک تاریخ کو سیلری لاتا ہے اور الگ، الگ خرچ کے لئے پیسے الگ، الگ لفافے میں بند کر کے رکھتا ہے ایک طرف سے شہری زندگی نہایت ہی مشکل امر ہوتا ہے اگر ضرورت سے زیادہ خرچ ہوا اور نظم بگڑ جاتا ہے۔ سلمیٰ کا شوہر اس سے کہتا ہے کہ آج میں تمہیں فلم دیکھانے لے کر چلتا ہوں اور وہ اپنی پسند کے کپڑے اس کو پہناتا ہے اور ٹکٹ خریدتا ہے۔ مگر سلمیٰ سنیما ہال نہیں پہونچتی ہے۔ جس کے نہ آنے کی وجہ سے پریشان نہیں ہوتا بلکہ اس کو اس بات کا افسوس رہتا ہے کہ ایک ٹکٹ برباد ہو گیا۔ گھر جانے کے بعد وہ جولا جو اس افسانے کی نوکرانی ہے اس سے دریافت کرتا ہے کہ سلمیٰ کہاں تو وہ

جواب دیتی ہیں کہ وہ تو ٹھیک 6 بجے رکشے پر بیٹھ کر گئی ہیں۔ اس کے اس جواب پر سلمیٰ کی کوئی فکر لاحق نہیں ہوتی بلکہ وہ گھر کے چاروں طرف نظر دوڑاتا ہے کہ کہیں کوئی چیز سلمیٰ اپنے ساتھ نہ لے کر چلی گئی ہو اور وہ چیک کرتا ہے مگر سبھی چیزوں کو اپنی جگہ محفوظ پاتا ہے۔ غرض وہ فریج کھول کر آئیس کریم نکالتا ہے اور اس میں سلمیٰ کا لکھا ہوا خط دکھائی دیتا ہے۔ اس کے بعد وہ سکون سے آئس کریم کھانے کے بعد خط پڑھتا ہے۔ جس میں سلمیٰ نے لکھا ہے کہ مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں ہے کیوں کہ آپ نے شکایت کا کوئی موقع دیا ہی نہیں۔ آپ ایک جدید ترین آٹومیٹک مشین ہیں۔ اور میں!.... مجھ سے متعلق کاغذات آپ ہی کے سیاہ بکس میں محفوظ ہیں۔

خط پڑھنے کے بعد میاں صاحب کو کوئی افسوس نہیں ہوتا بلکہ لیکن کا احساس ہوتا ہے۔ اور اس کے بعد وہ نئی بیوی کے بارے میں سوچنے لگتا ہے وہ شادی بیاہ اور اس میں لگنے والے پیسے وغیرہ سب کچھ سوچنے کے بعد وہ سکون سے سو جاتا ہے۔

اس افسانے میں قاضی صاحب نے ایک کسے اور گھٹے ہوئے پلاٹ میں پورے افسانے کو لکھا ہے اور اس بھی کوئی جھول محسوس نہیں ہوتا ہے۔ اس افسانے میں کی شروعات اس طرح کی ہوتی ہے کہ افسانے میں آگے کے وقعہ کو جاننے کے لئے قاری میں تجسس پیدا ہو جاتا ہے۔ ساتھ ہی سلمیٰ کے خیالات اس کے جذبات واحساسات کی پیکر تراشی جس طرح سے قاضی صاحب نے کی ہے وہ قابلِ تعریف ہے۔ اگر چہ ایک عورت کے اندر عورت صلاحیت اور سلیقے مندی سے گھر چلانے کا جو طریقہ ہوتا ہے یہاں ایک مرد کے اندر پیوست ہے۔ اس کہانی کو پڑھنے کے بعد مجھے ایسا محسوس ہو کر شموئل احمد نے ناول ''ندی'' قاضی صاحب کے شاید اس افسانے سے تحریک پا کر لکھی گئی ہے۔

جہاں ایک عورت جو شاعری میں فن اور آرٹ کی دلدادہ ہے اور اس کے اندر جذبات واحساسات کا سفید سمندر ہے اور وہ پیار اور محبت کے رشتے کو ہر چیز سے زیادہ اہمیت دیتی ہے اور ادب کی شاگردہ ہے۔ وہی اس کی شادی ایک انجینئر سے ہو جاتی ہے جو اپنی زندگی میں نظم وصبط کا قائل ہے اور ہر کام مشینی انداز میں انجام دیتا ہے۔ جدید آٹومیٹکس مشین اس طرح جس طرح قاضی صاحب نے اس افسانے میں سلمیٰ کے شوہر کو پیش کیا۔ بہر کیف قاضی عبدالستار کی یہ کہانی جذبات واحساسات کے نازک بیان کے ساتھ اسلوب کے سطح پر بھی خاصی کامیاب ہے اور زبان وبیان بھی خوبصورت انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

☆☆☆

ماڈل ٹاون

''ماڈل ٹاؤن'' شہری زندگی پر مبنی افسانہ ہے جس میں شہر میں ہونے والے تمام مسائل کی عکاسی نظر آتی ہے۔ جس میں بے روزگاری، عوام کی بدحالی، انسان کی دوہری شخصیت، بڑھتی ہوئی آبادی، ملازمتوں کی کمی اخلاقی پستی، صارفیت کا بڑھتا بازار اور اجنبیت کا بڑھتا ہوا گھیرتا ہوا رجحان سامنے آتے ہیں۔

ماڈل ٹاون متوسط طبقے کے ایک بے روزگار نوجوان کی کہانی ہے۔ جو روزی روٹی کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ افسانے کا جو دوسرا کردار ہے وہ غزالہ ہے جو اپنے ماموں زاد بھائی کی چاہت میں گرفتار رہتی ہے اس کے ماموں ایک رئیس آدمی ہیں جن کا ایک ہی بیٹا ریاض ہے۔ ریاض کے باپ نہیں چاہتے کہ ان کی بیٹے کی شادی غزالہ سے ہو اسلئے اس کہانی میں جو راوی ہے اس کو غزالہ سے شادی کرنے پر مجبور کرتے ہیں اور جہیز کے طور پر چار سو ماہوار کی نوکری اور رہنے کے لئے ماڈل ٹاون میں فلیٹ دینے کو کہتے ہیں۔ اس کہانی کا مرکزی واحد متکلم غزالہ سے شادی کرنا منظور کر لیتا ہے یہ جانتے ہوئے بھی کہ غزالہ اور ریاض کا ناجائز تعلق جسمانی حدوں تک بھی ہے۔ مگر بے روزگاری اور زندگی کی تک و دو سے تنگ آ کر وہ شادی کرنے کا فیصلہ کر لیتا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''اس نے بھاری بھر کم اور گوری چٹی غزالہ کو گھور کر دیکھا تو اس کے گالوں پر ریاض بھائی کے ہونٹوں کی مہریں لو دینے لگیں۔ کمر پر ریاض بھائی کے باہوں کے نشان ابھر آئے.... لیکن جیب کی بیماری سے نجات پانے کے لئے اس نے غزالہ کو قبول کر لیا مسلسل بے کاری سے نجات پانے کے لئے اس نے شادی کر لی۔ کڑوی کسیلی دوا کا لبریز پیالہ آنکھیں بند کر کے نگل گیا۔'' 46

اس اقتباس کے ذریعہ ایک انسان کی بے روزگاری کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے قاضی صاحب نے امیر اور رئیس لوگوں کی نفسیات کو بھی اجاگر کیا ہے۔ غزالہ جوان کی بہن کی بیٹی ہوتی ہے۔ مگر اپنے اکلوتے بیٹے کی شادی اس سے اس لئے نہیں کرتے کیوں غزالہ کی ماں کے پاس دولت نہیں ہے اور باپ مر چکا ہے۔

46۔ آئینۂ ایام: قاضی عبدالستار کے بہترین افسانے۔ مرتب: ڈاکٹر محمد غیاث الدین۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔ سنہ اشاعت: 1995۔ ص: 126

شہروں کی زندگی میں بڑھتی اجنبیت ،محبت خلوص رشتہ داری اور ہمدردی کا جذبہ کم ہوتا جارہا ہے سبھی لوگ صرف اپنے مطلب اور فائدے کے لئے دوسروں کا ساتھ دیتے ہیں اس افسانے میں اس نقطے کی طرف افسانہ نگار نے توجوہ دلائی ہے۔سماج میں بڑھتی بے روزگاری اور بڑھتی آبادی کی وجہ سے راوی کونوکری نہیں ملتی ہے۔غزالہ کے ماموں کوغزالہ سے پیچھا چھوڑانے کے لئے راوی کونوکری اور فلیٹ دے کراس کی شادی کرادیتے ہیں۔اس کے ساتھ ہی اس افسانے میں شہری زندگی کی چمک دمک بھاگ دوڑ کی زندگی کوبھی پیش کیا گیاہے۔شہروں کی گہما گہمی ،مقابلہ اور مسابقت کے جھوٹ دھوکہ اور غریب انسان کی زندگی جواپنے ضمیر کو مارکرزندہ رہنے پرمجبور ہے کوبھی اس افسانے میں پیش کیا گیا ہے۔

ایک دن بس کے سفر میں راوی کہیں جارہا ہوتا ہے تبھی اسی بھیڑ بھاڑ میں اسے ریاض بھائی دیکھائی دیتے ہیں جو''ریگل''(دہلی کا مشہور سنیما گھر جواب بند ہو چکا ہے)پرملنے کی دعوت دیتے ہیں۔بہت دیرتک انتظار کرنے کے باوجود بھی ریاض بھائی وہاں نہیں پہونچتے ہیں غرض راوی سنیما دیکھنے لگتا ہے۔سنیما ختم ہو جاتی ہے مگر ریاض بھائی کا پتا نہیں چلتا ہے۔وہ شہروں کی انسانوں سے بھری ہوئی آبادی کو دیکھنے لگتا ہے۔ بسوں میں بھرے ہوئے اینٹیں ڈھونے والے ٹھیلوں کی طرح لگتی ہیں جس کو دیکھ کرراوی کوایسا لگتا ہے کہ انسان نہیں صرف اینٹیں ہی اینٹیں ہوں۔وہ بھی بس اسٹینڈ کی طرف بھاگتا ہے اور ایک بس میں سوار ہوجاتا ہے۔ ماڈل ٹاون میں اترنے کے بعد شہری زندگی کی انسانوں سے بھری ہوئی اداسی میں اوراونچی، اونچی عمارتوں کی یکسانیت کودیکھ کر چکراجاتا ہے۔عرض ڈی بلاک کا پتہ پوچھتے ہوئے آگے بڑھتا ہے۔

اس افسانے میں قاضی صاحب میں فلیٹ شدہ زندگی کوموضوع بنایا ہے۔جس میں تمام فلیٹ ایک جیسے دکھائی دیتے ہیں۔جس کی یکسانیت کی وجہ سے اکتاہٹ محسوس ہونے لگتی ہے۔اورانسان عجیب سی کیفیات کا شکار ہوجاتا ہے اوراکثر اپنے فلیٹ میں پہونچنے کے بجائے کسی اور بلڈنگ کی ڈوربیل بجانے لگتا ہے۔کچھ ایسا ہی واقعہ افسانہ نگار نے اس افسانے میں پیش کیا ہے۔جیسے ہی راوی اپنے فلیٹ کے دروازے کے پاس پہونچتا ہے اس کا آدھا پٹ کھلا ہوا دکھائی دیتا ہے۔اوراندراسے اپنی بیوی غزالہ نظر آتی ہے۔اورریاض بھائی غزالہ کے ساتھ رومانس کرتے ہوئے دیکھائی دیتے ہیں اب اسے برداشت نہیں ہوتا ہے اوراندر گھس جاتا ہے۔

فلیٹ میں اندر جانے سے پہلے راوی لاشعوری طور پر ریاض بھائی کو گندی گندی گالیاں دیتا ہے اور ان سے مار پیٹ کرتا ہے۔

تبھی فلیٹ کا مکین باہر نکلتا ہے اور اس سے پوچھتا ہے تم کون ہو۔ راوی بھی اس سے یہی سوال کرتا ہے۔ راوی ہکلانے لگتا ہے کیوں کہ سامنے والا ریاض بھائی نہیں ہوتا۔ اس کو چونکہ واہم ہو جاتا ہے۔ غرض مکیں اس کو چور سمجھ کر باہوں میں چکڑ لیتا ہے۔ اور چلانے لگتا ہے اس کی آواز سن کر ہر دروازے اور ہر کھڑکی سے انسانوں کے سر دکھائی دینے لگتے ہیں۔ اور لوگ اسے مار مار کر لہولہان کر دیتے ہیں۔ اور لوگ اس سے طرح۔ طرح کے سوال کرتے ہیں اور وہ کہتا ہے۔ ۱۱/۳۱ یہ میرا فلیٹ ہے اور اس میں میری بیوی موجود ہے۔ مکیں کہتا ہے ابے پاگل ہو گیا ہے۔ اس میں تو میں رہتا ہوں۔ اس افسانے میں قاضی صاحب نے انسان کی نفسیات کی بھی عکاسی کی ہے۔ راوی چونکہ پہلے سے پریشان اور تھکا ہوا تھا ساتھ ہی ریاض بھائی کے ملنے کے وعدے کے بعد ان کا ریگل نہ پہونچنا ان کے ذہنی رویوں کو متاثر کر دیا تھا۔ ساتھ ہی غزالہ اور ریاض کے ناجائز تعلقات کا اس کو علم تھا جس کی وجہ سے وہ دوسرے فلیٹ میں جا کر وہاں کے مرد کو ریاض سمجھ بیٹھتا ہے اور اس عورت کو غزالہ اور انھیں لگتا ہے کہ ریاض بھائی نے مجھے بیوقوف بنایا ہے۔ اس کے بعد جب اس سے سوال کرتے ہیں کہ آپ کہاں سے ہیں تو وہ کہتا ہے ''ماڈل ٹاون'' نہیں ہے؟

ماڈل ٹاون میں بھی وہ اپنے فلیٹ ماڈل ٹاون کیمپ جانے کے بجائے ماڈل ٹاون کینٹ میں پہونچ جاتا ہے جس کی وجہ سے وہ واہم کا شکار ہو جاتا ہے۔ غرض یہ افسانہ قاضی عبدالستار کا شہری زندگی پر لکھا ہوا افسانہ ہے۔ انھوں نے شہری زندگی پر بہت ہی کم افسانے لکھے ہیں جس میں تجریدیت اور علامیت بھی پائی جاتی ہے۔ جدیدیت کی اندھی دوڑ میں بہت سے افسانہ نگاروں نے تجریدی اور تمثیلی افسانے لکھے جس کردار، پلاٹ اور کہانی عنقا تھی۔ اس کے باوجود قاضی صاحب کے افسانے جو شہری زندگی کے موضوعات پر مبنی ہیں ان میں کردار، پلاٹ اور کہانی آسانی سے دیکھنے کو مل جاتی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ قاضی صاحب اپنے تمام موضوعات سے مکمل طرح انصاف کر پائے ہیں۔ اور بہت ہی اعلیٰ معیار کے افسانے پیش کئے ہو بلخصوص جو شہری زندگی پر مبنی ہے۔ مگر قاضی صاحب کی تخلیق کی خاص بات یہ ہے کہ انھوں نے افسانے کے روایتی انداز کہانی سے کبھی انحراف نہیں کیا اور مخصوص انداز میں افسانے لکھتے رہے۔

☆☆☆

تحریک

یہ افسانہ اورمزاحیہ باب میں ’’سیب‘‘ کراچی نسیم درانی کے زیرادارت شائع ہوا۔’’تحریک‘‘ قاضی عبدالستار کا علامتی افسانہ ہے۔جس کے پس منظر میں جا گیردارانہ نظام کے زوال کے پس پست ادبی شاعروں کی بدلتی صورت حال پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ جہاں شعروادب کا مزاج کس قدر بدل گیا ہے اور پیسے پھینکے کے بعد لکھی لکھائی شاعری دستیاب ہو جاتی ہے۔اس افسانے میں کئی زاویے سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ایک طرف مشاعروں میں شعروادب کا زوال ہے تو دوسری طرف شاعروں کی گرتے معاشی حالات جس میں وہ اتنے مجبور و بے بس ہوگئے ہیں کہ اپنا کام اپنا پیٹ پالنے کے لئے اپنا کلام بیچ رہے ہیں۔ساتھ ہی بدلتی ہوئے اقدار اور معاشرتی ریاکاری اور زوال زدہ سماج پر روشنی ڈالی گئی ہے۔جس کو قاضی صاحب نے علامتی انداز میں نشانہ بنایا ہے۔

اس افسانے میں تحریک بیگم کا کم سن فرزند’’للّو میاں‘‘ مشاعرے کو میلہ سمجھ کر وہاں جانے کی ضد کرتے ہیں۔ماں اپنے لاڈلے بیٹے کی خواہش کو مارنا نہیں چاہتی ہے۔ بلکہ اپنے بیٹے کو وہاں جانے کی اجازت دے دیتی ہے اور ساتھ ہی اشعار پڑھنے کی خوب مشق بھی کرائی ہے۔ساتھ ہی اپنے کم سن فرزند کے لئے مرتب علی کو چونی دے کر اچھی غزل گردے صاحب سے لکھوا لانے کے لئے بھیجتی ہے۔اس واقعہ کو قاضی صاحب طنزیہ انداز میں اس طرح لکھا ہے۔اقتباس:

> ’’اچھا تو نخاص لے کے جاؤ کسی مادر زاد شاعر کے آگے چھونی پھینکو اور گرما گرم لکھوالاؤ‘‘۔ 47

قاضی صاحب کے اس افسانے پر اگر دوسرے پہلو سے نظر ڈالی جائے تو کچھ اس طرح سے اس افسانے میں طنزیہ انداز مل جائے گا جہاں کسی تحریک کے زیراثر ملنے والے شاعر کے اوپر طنز کیا گیا ہے۔ یہاں تحریک بیگم کو ماں کا روپ دیا گیا ہے اور اس کا بیٹا’’للّو میاں‘‘ للّو جو ایک کم سن بچہ ہے مگر مشاعرے میں جانے کی ضد کرتا ہے۔تحریک اپنے زیراثر چلنے والے کسی شاعروں کو کچھ پڑھنے لکھنے سے نہیں روک سکتی غرض وہ پیسے

47۔ آئینۂ ایام: قاضی عبدالستار کے بہترین افسانے۔مرتب: ڈاکٹر محمد غیاث الدین۔ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔سنہ اشاعت:1995۔ص:133

دے کر غزل لکھواتی ہے۔اور جب مشاعرے میں وہ جاتا ہے۔وہاں اسٹیج پر ادب سے جڑے ہوئے کوئی افراد نہیں ہیں بلکہ وزیر تاجر اور دیگر سرکاری عہدیداروں کو ڈائس پر جگہ دی گئی ہے۔یہ کڑوی سچائی یہاں پر مصنف نے بیان کی ہے۔اور دوسری طرف للومیاں جب ڈائس پر جاتے ہیں تو کچھ پڑھ نہیں پاتے اور زور۔زور سے رونے لگتے ہیں غرض ایک طرف یہ بھی کہا جاسکتا ہے۔تحریک کے زیرسایے چلنے والے کچھ شعراء جن کے اندر فنی صلاحیت ناپید ہوتی ہے جو صرف نام کمانے کے لئے ادب سے جڑے رہتے ہیں اور دوسری طرف روپیہ پیسے کے دم پر کلام پیش کرتے ہیں۔اس کے ساتھ ہی سامعین جن کے اندر ادب کو سمجھنے کی فنی صلاحیت اور نقد ناپید ہوتی جارہی ہے وہ مشاعروں کے اسی انداز سے خوش ہوجاتے ہیں اور واہ واہی کے سارے ریکارڈ توڑ دیتے ہیں یہاں تک کبھی،کبھی انھیں قابو میں کرنے کے لئے پولیس کا سہارا لینا پڑتا ہے تاکہ مشاعرے کا نظم و ضبط بنا رہے۔اس کے ساتھ ہی میڈیا اور اخبارات والے جس شاعر کے کلام میں صرف تک بندی فنی صلاحیت سے ناپید شاعری تھی اسی خبر اور اس کی شاعری کی تعریف کے پل باندھتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

غرض اس افسانے میں قاضی صاحب پیسے اور بیڑی کے بدلے اپنا ادبی سرمایہ فروخت کرنے والے لوگ کی معاشی صورت حال پر روشنی ڈالی گئی ہے ساتھ ہی اخلاقی اور معاشرتی ریاکاری اور پستی شعروادب کا گرتا اور بدلتے ہوئے ماحول پر روشنی ڈال گئی ہے۔

افسانہ ''تحریک'' میں قاضی صاحب نے اپنے اسلوب اور طرز ادا کو اپنے سابقہ انداز اور افسانے سے بالکل الگ رکھا ہے۔اس افسانے میں ادبی محاورے اور استعاراتی زبان کے ساتھ علامتی انداز کے افسانے کے رنگ وآہنگ میں ایک نمایاں تبدیلی نظر آتی ہے۔

بہر کیف تحریک افسانہ اپنے موضوعات فکر مسائل پیش کش انداز بیان کے زیر نظر ایک الگ انداز کا افسانہ ہے اور علامتی افسانے کے شمارے میں قاضی عبدالستار کے اس افسانے کو آسانی سے رکھا جاسکتا ہے۔

''جنگل''،''پرچھائیاں''اور''تحریک'' قاضی عبدالستار کی تجریدی و علامتی کہانی کے زمرے میں رکھا جاسکتا ہے جس میں انھوں نے علامتی انداز میں بدلتے ہوئے سماجی اقدار پر نظر ڈالی ہے۔ان افسانے میں افسانہ تحریک پر تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے۔

افسانہ''جنگل'' میں انھوں نے انسانوں کی ذاتی مفاد پر روشنی ڈالی ہے۔ساتھ ہی جنگل کو ایک علامتی

انداز میں پیش کیا ہے۔جنگل کے ہر ایک زاویے کونہایت باریک بینی سے مصنف نے ڈرامائی انداز میں سجایا ہے۔

''یادیں''،''رانی ماں''،''پانی کی پوٹلیاں''،''نومی''،''دھندلے آئینے''،''گرم لہو میں غلطان''،''لالہ امام بخش''،''نازو''،''سایہ''،''سالملی'' وغیرہ قاضی عبدالستار کی ان کی فکروفن کو دوہراتی ہوئی کہانیاں ہیں جس میں بیشتر انسانوں میں جاگیردارانہ نظام کے زوال کے بعد بدلتے ہوئے سماجی اقدار کے دھندلے کرب کو بیان کیا گیا ہے۔ ماضی اور وقت کی بے رحم موجیں کسی طرح سے ایک پورے نظام کی شان وشوکت رعب و جلال کوڈوبوتی چلی گئیں اس صورت حال کی بہترین عکاسی قاضی عبدالستار کی تخلیقات میں نظر آتی ہیں۔

تاریخی افسانے

تاریخی ناول یا تاریخی افسانے اُس فن پارے کو کہتے ہیں جس میں کسی تاریخی واقعہ کوادبی لوازمات کے ساتھ پیش کیا جاتا ہےاس میں تاریخ کا خالص اور سپاٹ بیان نہیں ہوتا کیوں کہ بنیادی طور پرادبی فن پارے ہوتا ہے۔اس میں تاریخ کے کسی وقاقعہ کی بنیاد پر مصنف اپنے تخیل اور تفکر کی رنگ آمیزی سے افسانہ یا ناول پیش کرتا ہے۔ اس میں بعض مرکزی کردار اور واقعات ہر صداقت پر مبنی ہوتے ہیں لیکن بعض واقعات و حادثات فرضی بھی ہوتے ہیں۔ کیوں کہ کسی واقعہ کی ادبی تشکیل کے لئے مصنف کا ایسا کرنا اس کی فنی مجبوری ہوتی ہے۔ یا دوسرے الفاظ میں کہے تو یہی اس کا ادبی حسن ہوتا ہے۔ کیوں کہ ایسی تخلیقات بالآخر ادب کا حصہ ہوتی ہیں نہ کی شعبۂ تاریخ کی۔

قاضی عبدالستار کے یہاں بھی کچھ تاریخ واقعات وحادثات افسانوں کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ قاضی عبدالستار کی تخلیقات کا جہاں تک سوال ہےاس میں تاریخی واقعات کے ساتھ سماجی زندگی کی بھی عکاسی ملتی ہے۔مگر یہ بہت کم موقعوں پر ہی دکھائی دیتی ہے۔ اکثر و بیشتر ان کی تاریخی تخلیقات میں بادشاہوں اور سلطانیوں کے عہد نگاری کے ساتھ اس عہد کے محل کے آرایش وزیبائش کا زیادہ ذکر ملتا ہے۔ قاضی عبدالستار کے یہاں جزئیات نگاری کے فن میں کمال حاصل ہے۔جس کی وجہ سے وہ درباری اشیاؤں لوازماتوں کا ذکر اتنی فنی خوبی سے کرتے ہیں کہ قاری ان کے اسی فن کا گرویدہ ہوجاتا ہے۔اس باب میں ہم قاضی عبدالستار کے تاریخی افسانوں کا ذکر کریں گے۔ قاضی عبدالستار کو تاریخی ناول لکھنے میں کافی عبور حاصل تھا انھوں نے تاریخی ناول زیادہ لکھے ہیں جو خاصا کامیاب بھی رہے،اور تاریخی فن پارے میں ایک نئے اضافے کی حیثیت بھی رکھتے ہیں اس عنوان پر بحث ناولوں کے باب میں ہوگی یہاں پر ہم صرف قاضی عبدالستار کے تاریخی افسانوں کا ذکر کرینگے۔

قاضی صاحب نے تاریخی افسانوں میں تین بڑے اور مشہور ومقبول واقع کو موضوع بنایا ہے۔ جو کہ

ہندوستان کی تاریخ میں غیر معمولی حیثیت رکھتے ہیں۔اور انھیں نظر انداز کر کے ہندوستان کی تاریخ کو لکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔

سب سے پہلے ہم تاریخی افسانے پر تھوڑا بحث کرنا چاہیں گے۔کیوں کہ تاریخی ناول تو آسانی سے دستیاب ہو جاتی ہے کیا تاریخی افسانے بھی اس مقدار میں ملتے ہیں؟۔اس کے بارے میں ہمارا جواب ہے شاید نہیں۔کیوں کہ بہت ہی تخلیق کاروں نے تاریخ کو افسانے کا موضوع بنا کر پیش کیا ہے۔اس کی سب سے بڑی وجہ شاید تاریخ کا وہ لا متناہی سلسلہ ہے جس کی وجہ سے ادیب کے سامنے سب سے بڑی رکاوٹ یہ آتی ہے کہ وہ کس واقعہ کو تاریخ کا موضوع بنائے۔وہ بھی افسانے کے روپ میں کیوں کہ افسانے کا کینوس چھوٹا ہوتا ہے۔بہ نسبت ناول کے۔تاریخی ناول تو لکھا جا سکتا ہے مگر تاریخی افسانہ لکھنا بہت مشکل کام ہوتا ہے۔

جس طرح سے تاریخی ناولوں میں اکثر و بیشتر راجاؤں، بادشاہوں، سلطانیوں اور نوابوں کے اوپر ہی زیادہ تر لکھا گیا ہے۔اس میں رومانی قصے کہانیوں کے علاوہ عام لوگوں کے بارے میں بہت کم جانکاری ملتی ہے۔اس کی وجہ کیا ہے؟

''پروفیسر علی احمد فاطمی'' اپنی کتاب ''عبدالحلیم شرر بہ حیثیت ناول نگار'' میں لکھتے ہیں:

> ''اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ تاریخی ناول وہی سب سے اچھا اور کامیاب سمجھا جائے گا جو خوبصورتی کے ساتھ تاریخی ماحول کو پیش کرے۔وہ جس دور کی منظر کشی کر کے آنکھوں میں اُتر آئے۔اس لئے ضروری نہیں کہ وہ پورے تاریخی واقعات کو پوری سچائی کے ساتھ پیش کرے۔'' اس بحث میں یہ واضح ہو جاتا ہے کہ تاریخی ناول میں تاریخی ماحول کو پیش کرنا ضروری ہے۔'' 48

قاضی صاحب کے تاریخی افسانوں پر ڈاکٹر محمد غیاث الدین نے اپنی رائے کا اظہار بہت خوبصورت انداز میں اس طرح پیش کیا ہے۔

> ''قاضی صاحب نے تاریخ پر بھی افسانہ لکھا ہے۔عام طور پر تاریخ کے بڑے واقعات کا علم قاری کو ہوتا ہی ہے۔اس لئے اسے کہانی کی شکل میں پڑھنا تضیع اوقات سمجھا جاتا ہے۔مگر قاضی صاحب کے تاریخی افسانوں کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے تاریخ کے ہر واقعہ

48: عبدالحلیم شرر بحیثیت ناول نگار۔پروفیسر علی احمد فاطمی۔قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی۔سنہ اشاعت: 2007۔ص: 171

کواس قدر دل چسپ حقیقی پراثر اور جاندار بنا کر پیش کیا ہے کہ ماضی جسم و روح کے ساتھ آنکھوں کے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے۔ اور قاری کہ مسرت کے ساتھ۔ ساتھ بصیرت بھی حاصل ہو جاتی ہے۔ ہندی کے آچاریہ چتر سین شاستری، برندابن لال ورما اور اردو کے عزیز احمد اور قرۃ العین حیدر کی طرح قاضی عبدالستار نے بھی تاریخ کو ادب بنا کر حال کے مسائل کا حل ماضی میں بھی تلاش کرنے کی فنکارانہ کوشش کی ہے۔'' 49

غیاث الدین صاحب کی مدلل رائے نے قاضی صاحب کے تاریخی افسانوں میں مستقبل کی جو بات کہی ہے۔ وہ بالکل سچ ہے۔ اکثر ہم کسی بھی تاریخی ادب کو صرف تاریخ اور ماضی کے پہلو سے پڑھتے اور وہیں تک اس ختم کر دیتے ہیں مگر ایک بڑے فنکار کی یہ خوبی ہوتی ہے کہ وہ ماضی میں ہوئے کسی عظیم واقع یا عام واقعہ کو بھی کس طرح عہد حاضر کے آئینے سے مقابلہ کر کے دیکھتا ہے۔ اور یہی پر ایک بڑے اور سچے فنکار کی یکتائی ثابت ہو جاتی ہے۔ اور اس کا فن عام لوگوں سے مختلف دکھائی دیتا ہے۔

قاضی صاحب کے تاریخی موضوعات پر لکھے ہوئے تقریباً سبھی افسانیں آنکھیں، نیا قانون، سات سلام، بھولے بسرے اسی نوعیت کے افسانے ہیں۔

تاریخی واقعات کو موضوع بنا کر پھر اس سے عہد حاضر کے ساتھ ہم آہنگ کر کے اس طرح سے پیش کرنا مستقبل میں قاری اسی واقعہ کے نتائج سے باخبر ہو جائے یہ ایک بڑے فنکار اور صاحبِ اسلوب نگار کی قابلیت کی دلیل ہوتی ہے۔ کیوں کہ افسانے کا کینوس اتنا چھوٹا ہوتا ہے کہ اس میں کسی عہد کی مکمل منظر کشی کرنا اتنا آسان کام نہیں ہے جتنا کہ ناول میں۔

لہٰذا ہم یہاں پر قاضی صاحب کے چند مختصر تاریخی افسانوں کا تجزیہ کرتے ہوئے ان کے تاریخی افسانے کی فن اور اصول پر بحث کرینگے تاکہ ان کے تاریخی افسانوں کی فنی محاسن پر وہ باتیں سامنے آیئے جو ابھی پردہ فضا میں ہیں۔ ڈاکٹر صاحب علی قاضی عبدالستار کے افسانوں پر بحث کرتے ہوئے ان کے تاریخی افسانوں پر مختصر طور پر اس طرح سے خیال آرائی کی ہے:

''تاریخی افسانے بھی انھوں نے بڑے دلکش انداز میں لکھے ہیں ایسی کہانیوں میں انھوں نے کسی رومانی واقعہ کا انتخاب کیا ہے۔ اور اس میں اپنی انشاپردازی کا رنگ بھرا ہے۔''

49۔ آئینۂ ایام: قاضی عبدالستار کے بہترین افسانے۔ مرتب: ڈاکٹر محمد غیاث الدین۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔ سنہ اشاعت: 1995۔ ص: 13

چنگیز کی موت‘‘ اور آنکھیں ایسی ہی رومانی کہانیاں ہیں۔ تاریخ کے سیاسی مسائل پر ان کی گہری نظر ہے۔ یہ ان کا محبوب موضوع ہے‘‘ رومانی کہانیوں کے تاریخی واقعات کے علاوہ قاضی صاحب نے تاریخ کے سیاسی مسائل پر بھی انھوں نے افسانے تخلیق کئے ہیں۔ جن میں ’’نیا قانون‘‘ اور ’’بھولے بسرے‘‘ قابلِ ذکر ہیں۔‘‘ 50

’’نیا قانون‘‘ میں انھوں نے انگریزوں کی الحاق کی سیاسی نیتی اور نظریہ کو موضوعِ فن بنایا ہے۔ جس میں واجد علی شاہ کی خوش رنگیوں اور خوش بیانیوں کے ساتھ مغل حکومت کے چند راجپوت سپاہیوں کی نمک حلالی اور وطنی محبت کو ’’بھولے بسرے‘‘ افسانے کے ذریعہ یاد کرنے کی کوشش کی ہے۔ قاضی صاحب کے تاریخی افسانوں میں کرداروں کے جیتے جاگتے ثبوت مل جاتے ہیں۔

تاریخی ناول تاریخی افسانے اس فن پارے کو کہتے ہیں جس میں کسی تاریخی واقعہ کو ادبی لوازمات کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ اس میں تاریخ کا خالص اور سپاٹ بیان نہیں ہوتا کیوں کہ بنیادی طور پر ادبی فن پارہ ہوتا ہے۔ اس میں تاریخ کے کسی واقعہ کی بنیاد پر مصنف اپنے تخیل اور تفکر کی رنگ آمیزی سے افسانہ یا ناول پیش کرتا ہے۔ اس میں بعض مرکزی کردار اور واقعات مبنی بر صداقت ہوئے ہیں لیکن بعض جزئیات فرضی ہوتے ہیں کیوں کہ اس واقعہ کی ادبی تسکین کے لئے مصنف کا ایسا کرنا اس کی فنی مجبوری ہوسکتی ہے۔ یا دوسرے الفاظ میں کہیں کہ یہ ادب کی مانگ ہوتی ہے اس کا ادبی حسن ہوتا ہے کیوں کہ ایسی تخلیقات بالآخر ادب کا حصہ ہوتی ہیں نہ کی خالصتاً تاریخ کی۔ قاضی عبدالستار کے یہاں بھی کچھ تاریخی واقعات وحادثات افسانوں کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔

☆☆☆

بھولے بسرے

یہ افسانہ علی گڑھ میگزین میں 1984 میں ایڈیٹر محمد علی جوہر کے زیر اشاعت شائع ہوا۔ بھولے بسرے قاضی عبدالستار کا لکھا گیا۔ تاریخی افسانہ ہے۔ یہ افسانہ ہندوستان کی بغاوت کے آخری دنوں کی یادگار رہے۔ 10رمئی 1957 ہندوستان کی تاریخ میں وہ دن ہے جب تمام ہندوستانیوں نے انگریزوں کی غلامی کا طوق

50: اردو فکشن کا مطالعہ۔ ڈاکٹر صاحب علی۔ اردو چینل۔ سنہ اشاعت: 2006۔ ص: 159

اتار پھینکنے کا کچھ دیر کے لئے فیصلہ کر لیا اور کچھ جانباز اور محبِّ وطن فوجی اپنے فن من اور دھن کی بازی لگا انگریزوں کے خلاف جنگ لڑی۔ لیکن انگریزوں کی سیاسی چالوں ہم وطنوں کے دھوکے فریب اور وسائل کی کمی نے اس تحریک کا دم توڑ دیا۔ خزانے خالی ہو چکے تھے کچھ چال باز سیاسی تحریک کے مقاصد کو چھوڑ کر اپنی اپنی جانوں اور تنخواہوں کو بچانے کی فکر میں لگے ہوئے تھے۔

مگر انھیں دنوں میں کچھ نمک حلال شخصیتوں نے اپنے بادشاہ اور مغلیہ حکومت کی حفاظت کے لئے پورا دم لگا دیا۔ جس کی عکاسی اس افسانے میں نظر آتی ہے۔

انقلابی فوجیوں میں نظم و نسق کی کمی اور روپیوں کی قلت کی وجہ سے کچھ لوگ ساتھ چھوڑ کر چلے گئے۔ اور کچھ لوگ ابھی بھی بادشاہ کی خدمت میں لگے ہوئے تھے۔ انھیں خدمت سے دستبردار کر دینے کے باوجود بھی آخری دم تک مغلیہ حکومت کے وفادار بنے رہنا چاہتے تھے۔ مگر بوڑھے اور ضعیفِ بادشاہ بہادر شاہ ظفر حقیقت شناس کی مستقبل شناس نظروں نے دیکھ لیا تھا کہ اب کسی طرح انگریزوں سے جنگ جیتا نہیں جا سکتا۔

افسانہ شروع کرتے وقت قاضی عبدالستار نے نہایت خوبصورت انداز میں اس بھاری اور سب کچھ چھین لئے جانے والی رات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں جس کی سیاہی نے نہ صرف مغلیہ حکومت مگر ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت پر بھی کالکھ لگا دی۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

''کچھ راتیں اتنی بھاری ہوتی ہیں کہ صدیوں میں کبھی کبھی اور کسی کسی ملک پر اترتی ہیں۔
ان کی کچھ سے وہ سورج جنم لیتا ہے جن کی روشنی میں سونا پیتل اور پیتل سونا ہو جاتا ہے
۱۹ ستمبر ۱۸۵۷ء کی رات ایسی ہی ایک رات تھی۔'' 51

کیوں کہ یہ رات ایسی رات تھی جب ہندوستان کا مستقبل غیر ملکی ہاتھوں میں جانا تھا۔ شہر میں گھمسان لڑائی ہو رہی تھی ہر طرف گولیوں کی بارش ہو رہی تھی توپوں کی آوازوں سے لال قلعہ اور دہلی دروازہ کانپ رہا تھا۔ باغی فوجیوں میں اب لڑنے کا دم باقی نہیں رہا تھا۔ چنانچہ ۱۹ دسمبر کو جو ہفتے کا دن تھا بادشاہ نے قلعہ چھوڑ دیا اور بیگمات شہزادوں کے ساتھ چلی گئی۔ اس سے پہلے بادشاہ جس طرح سے محل کے نوبت خانے سے تمام فوجیوں اور خدمت گاروں کو رخصت کرتا ہے اس کی خوبصورت منظر نگاری کی گئی ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

''روشنیاں تیز کرو باپ دادا کے اس سجادے کو آخری بار دیکھ لوں کہ شاید پھر کبھی دیکھنا

51: آئینۂ ایام: قاضی عبدالستار کے بہترین افسانے۔ مرتب: ڈاکٹر محمد غیاث الدین۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔ سنہ اشاعت: 1995۔ ص: 220

نصیب نہ ہو۔سینکڑوں ،شعلوں، پنشاخوں اور گلاسوں اور جھاڑوں کی روشنی میں بادشاہ
نے دیکھا کہ تخت طاؤس پر لال غلاف پڑا ہوا ہے۔اوراس کے دونوں بازوؤں پر دوسپاہی
کیسری بانے پہنے ہتھیاروں میں اینچی بنے کانوں تک مونچھیں چڑھائے شیروں کی طرح
کھڑے ہیں۔جیسے ہی بادشاہ نے سیڑھی پر قدم رکھا انھوں نے کندے سے بندوقیں اتار
کر سلامی دی اور تن کر کھڑے ہوگئے۔بادشاہ ان میں سے ایک کے قریب گیا ان کے
بدن دیکھتا رہا۔ان کے چہرے دیکھتا رہا۔ان کی آنکھیں دیکھتا رہا اور سر ہلاتا رہا۔
''تمہارا نام کیا ہے''؟
''اجیت سنگھ...تم کو کمر کھولنے کا حکم نہیں ملا....ملا تھا مہابلی!
بادشاہ کھڑا کانپتا رہا اور گردن ہلاتا رہا۔''ہم نے تمھاری خدمت معاف کی جاؤ....اپنے
ماں باپ کا کلیجہ ٹھنڈا کرو۔'' 52

بادشاہ نے نوبت بند کرنے کا حکم دیا۔ انگریزوں کے توپوں کے دھوئیں سے ہندوستانی انقلاب کا سورج گہنگا چکا تھا۔اور کشمیری دروازہ انگریزوں کے ہاتھ آچکا تھا۔ جامع مسجد ہزاروں نمازیوں کے خون سے وضو کر رہی تھی۔کرنل ہمٹن کی فوج اوراس کی پلٹوں نے دھاوا بول دیا تھا۔انگریزی فوج فاتح ہوکر بوبت خانے کی سیڑھیوں تک آگئے۔کرنل ابھی دیوان عام کی دہلیز پر پہونچا تھا کہ ایک بارود اور توپوں کی آواز سے بھی تیز آواز کرنل کے پیر کو جمادئے:

''خبردار...تخت شاہی....ادب لازم''
کرنل نے فوراً گھوڑے کی راسیں کھینچ لیں۔اور گلے میں پڑے فلیڈ گلاس کو آنکھوں میں
لگا کر ادھر اُدھر دیکھنے لگا اور سوچنے لگا ابھی کس کے اندر اتنی ہمت اور جراءت باقی ہے جو
بادشاہ اور شہزادے اور شہزادیوں کے گرفتار ہونے کے باوجود بھی ہمارے قدم روک
دیئے۔بگل بجاتے ہی سارے دیوان عام میں گھوڑے اور فوجیوں کی ٹاپوں کی آواز سے
بھر گیا۔اور دیوان عام کو چاروں طرف سے گھیر کر کرنل نے آواز لگائی۔
''دہلی فتح ہوچکا ہے....ہتھیار ڈال دو....نہیں تو کتے کی موت مارا جائے گا۔'' 53

ابھی کرنل کے الفاظ کی گونج دیوانِ عام میں پھیل رہی تھی کہ ایک تیز رفتار بندوق کی گولی دندناتے ہوئے آئی

52: آئینۂ ایام: قاضی عبدالستار کے بہترین افسانے۔مرتب: ڈاکٹر محمد غیاث الدین۔ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔سنہ اشاعت:1995۔ص:222

53: آئینۂ ایام: قاضی عبدالستار کے بہترین افسانے۔مرتب: ڈاکٹر محمد غیاث الدین۔ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔سنہ اشاعت:1995۔ص:223

اور ڈگلس کے گھوڑے کو لگی اور اس کے پیر گھوڑے کی رکابوں میں پھنس گئے۔ اور لگا تار گولیاں چلنے لگیں۔ لگا تار چلنے والی گولیوں کے بیچ کرنل نے اپنی فوجیوں ے کو حکم دیا۔ حکم دیتے ہی دیوانِ عام میں گولیوں کی بوچھار آنے لگی۔ انگریزوں نے یہ سمجھا اندر فوجیوں کے کچھ دستے موجود ہیں اور انھوں نے اندھا دھند فائرنگ کرنے کا حکم، دے دیا۔ جب آنے والی باغیوں کی طرف سے گولیوں کا آنا بند ہو گیا تو فرنگی سپاہی دیوان عام کے اندر داخل ہوئے۔ انھیں دوبارہ کسی مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

چاروں طرف نظر دوڑانے کے بعد اندر انھیں صرف اور صرف دو سپاہیوں کی لاش برآمد ہوئی جن کی آواز نے انگریز حاکموں کے پیر کچھ دیر کے لیے روک دیئے۔ اور انھیں ایک دم یہ لگا تھا کہ اندر فوجیوں کی بڑی تعداد موجود ہے۔ یہ دونوں سپاہی اپنی بہادری، جفاکشی اور دیانت داری اور وفاداری کا مغل حکومت کو ثبوت دے کر اس دارِفانی سے کوچ کر چکے تھے۔ اس منظر کو نہایت خوبصورتی سے قاضی صاحب نے بیان کیا ہے:

''تخت طاؤس کے ارد گرد درجنوں خالی دغی ہوئی بندوقیں پڑی ہیں اور ان کے سامنے کیسری بانے پہنے کانوں تک مونچھیں چڑھائے گولیوں سے چھلنی اپنے خون میں لت پت دو سپاہی صرف دو سپاہی پڑے ہیں۔'' 54؎

دونوں کی لاشوں کو دیکھ کر ڈگلس اور فاتح ہملٹن نہایت ہی حیرت کا شکار ہو گئے۔ انھیں دونوں کو دیکھ کر یقین نہیں ہو رہا تھا کہ انھیں شکست تسلیم کر چکے بادشاہ کی وفاداری کا کتنا سچا اور بڑا ثبوت دیا ہے۔ ہملٹن کہتا ہے۔ جب انھیں پورے دیوان عام کا کونہ کونہ اور تہہ خانوں کا چپہ چپہ چھان مارا اور انھیں ان کے علاوہ تیسری لاش برآمد نہیں ہوئی تو:

''غلاف پوش نقلی تخت طاؤس پر فاتح ہمیلٹن کا بوٹ اسی طرح رکھا۔ ڈگلس چپ چاپ کھڑا تھا، ہملٹن نے لاشوں کو گھور کر دیکھا اور جیسے ڈگلس سے کہا یا آپنے آپ سے کہا اگر دہلی کے بادشاہ کو ان جیسے ہزار دو ہزار سپاہی مل گئے ہوتے تو اور ڈگلس نے جملہ پورا کر دیا۔

''تو ہندوستان کی تاریخ بدل گئی ہوتی۔'' 55؎

مصنف نے اس افسانے میں دو انگریز سپاہیوں کی جاں فشانی اور قربانی کو موضوع بناتے ہوئے یہ

54؎ آئینۂ ایام: قاضی عبدالستار کے بہترین افسانے۔ مرتب: ڈاکٹر محمد غیاث الدین۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔ سنہ اشاعت: 1995۔ ص: 225

55؎ آئینۂ ایام: قاضی عبدالستار کے بہترین افسانے۔ مرتب: ڈاکٹر محمد غیاث الدین۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔ سنہ اشاعت: 1995۔ ص: 225

افسانہ لکھا ہے۔اور ساتھ ہی مغل حکومت کے بجھتے ہوئے چراغ کو بھی نہایت پرسوز انداز میں بیان کیا ہے۔وہ مغل حکومت جس کا آخری اور نامدار بادشاہ بہادر شاہ ظفر تھا۔ بہادر شاہ ظفر کے پاس وہ سلطنت نہیں رہی تھی جو ان کے آبا اکبر اعظم یا اورنگ زیب عالمگیر کے پاس تھی۔لیکن اس میں شک نہیں کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ان کی پکار پر ہندوستان کے طول وعرض سے لوگ انگریزوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔اس جنگ میں شکت کے بعد مغل بادشاہ پر فوجداری کا مقدمہ چلایا گیا۔انھیں قید کر کے جلاوطن کیا گیا۔اس افسانے میں قاضی صاحب نے دہلی پر انگریزوں کی فتح اور ان کی قتل وغارت گری کے ساتھ ساتھ ظلم وبربریت کو بھی بہت خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔

۱۸۳۷ء میں جب بہادر شاہ ظفر نے اقتدار سنبھالا تو اس وقت عظیم مغلیہ سلطنت سکڑ کر دہلی کے گردنواح تک محدود ہوگئی تھی لیکن اس کے باوجود وہ اپنی رعایا کے لئے شہنشاہ ہی رہے۔

دی لاسٹ مغل نامی کتاب کے مصنف اور مشہور تاریخ داں ولیم ڈیلرمیل نے لکھا ہے کہ

> ''وہ نامور شاعر صوفی پیر ہونے کے ساتھ ایسے شخص تھے جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے اتحاد میں یقین رکھتے تھے۔وہ صرف اور صرف جنگ آزادی کے علامتی رہنما تھے ان کا اپنا کوئی لشکر نہیں تھا اور نہ ہی کوئی فوج تھی۔'' [56]

21 ستمبر کو میجر ہڈسن نے بہادر شاہ ظفر کو ہمایوں کے مقبرے سے بادشاہ کو اس شرط پر حراست میں لے لیا کہ اگر بادشاہ بہ خوشی اپنے آپ کو ان کے حوالے کر دیں گے تو ان کی جان بخشی کر دی جائے گی۔لیکن گرفتاری کے بعد بھی بادشاہ کے ساتھ بہت برا سلوک کیا گیا انھیں رنگون کی سزا دی گئی اور ان کی حالت نہایت ہی قابل رحم اور عبرت ناک تھی۔

اس افسانے میں قاضی صاحب نے نہایت خوبصورت انداز میں بہادر شاہ ظفر کی ناکامی اور مغلیہ حکومت کے قبر میں داخل ہونے والی رات کا قصہ بیان کیا ہے ساتھ ہی دو مغل راجپوت سپاہیوں کی جواں مردی اور جفاکشی کی حیرت انگیز داستان افسانے میں پیش کی ہے اور اپنے خوبصورت اسلوب سے تاریخ کے دھندلا چکے اور ان کو زندہ جاوید کیا ہے۔

☆☆☆

56: بی بی سی نیوز۔آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر دلوں پر آج بھی حکمرانی۔ایتھراجن انبراسن۔9 نومبر 2017

نیا قانون

اس افسانے میں قاضی صاحب نے جب اودھ کا الحاق برٹش حکومت میں ہوتا ہے اس کو موضوع بنایا ہے۔ اس افسانے اودھ کا نواب واجد علی شاہ ہے۔ جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ نہایت ہی تعیش پسند نواب تھا۔ اس افسانے میں قاضی صاحب نے انگریزوں کا اودھ پر قبضہ، سلطنت کا زوال اقتدار کی تبدیلی اور انگریزی قانون کی آمد، بادشاہ سے وزیروں اور عمالوں کی غداری عیش ونشاط اور رنگین محفلوں میں ڈوبے رہنے والا بادشاہ اور اس کے وزیروں پر لکھا گیا ہے۔

پلاسی 1757ء اور بکسر کی جنگ 1764ء میں ہوئی اس جنگ میں ہی ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ اہل وطن کے کچھ غداروں نے چند قیمتوں کے عوض میں ہی ملک کو غیر ملکی حکمرانوں کے ہاتھوں میں بیچ دیا۔ اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قاضی صاحب نے لکھا ہے:

''یہ بندوق جلد بھرنے اور فائر کرنے میں انگریز کی بندوق سے بدرجہ بہتر ہے۔ لیکن اس کے چلانے والے کندھے غدار اور انگلیاں نمک حرام ہیں''... 57

افسانے کا آغاز نواب ریزیڈنٹ بہادر کی کوٹھی سے ہوتا ہے جو نواب کی نہ ہو کر انگریزوں کی چھاؤنی محسوس ہو رہی تھی۔ تمام برجوں اور فرازوں پر توپیں چڑھی ہوئی تھیں۔ اور چاروں طرف انگریز سواروں اور پیدلوں کا ہجوم ہے۔ جو اودھ کی گلی کوچوں میں گورے انگریز اپنی میموں کا ہاتھ دبائے مستی سے ادھر ادھر پھر رہے ہیں۔

اس افسانے میں قاضی صاحب الحاق کے موضوع اور جب اس کی رپورٹ واجد علی شاہ کے پاس پیش ہوتی ہے تو اس کی منظر کشی کی ہے۔ اس الحاق کے پہلے تاریخی دستاویز جو لارڈ ڈلہوزی کی ایک رپورٹ کے مطابق اس طرح پیش کی گئی۔ اس نے اپنی ایک رپورٹ میں لکھا کہ اودھ کی حکومت سے متعدد عہد ناموں کے مطابق اودھ کی عوام اور حکومت کی حفاظت کرنا کمپنی کی ذمہ داری ہے۔ بادشاہِ اودھ ظالم اور عیش پسند ہے۔ وہاں کی رعایا اس کی حکومت سے مطمئن نہیں ہے۔ اگر انگریزی فوج امن برقرار نہ رکھے تو وہاں کے لوگ بغاوت پر آمادہ ہیں۔ کرنل مطمین اور جنرل اولٹرم کی رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ اودھ کی دیوانی، فوجداری

57: آئینۂ ایام: قاضی عبدالستار کے بہترین افسانے۔ مرتب: ڈاکٹر محمد غیاث الدین۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔ سنہ اشاعت: 1995۔ ص: 74

اور فوج پر قبضہ کر کے حکومت کا انتظار کرنا چاہیے۔ بادشاہ کو معزول کر کے اس کی پینشن کر دینا چاہیے۔ تا کہ وہ اپنی زندگی آسانی سے عیش کے ساتھ گذار سکے۔

جنرل اوٹرم کو ڈلہوزی نے کلکتہ بلا کر کہا کہ واجد علی شاہ سے ایک معاہدہ لکھوالو کہ وہ اودھ کی حکومت اپنی مرضی سے کمپنی کو بغیر کسی دباؤ کے دے رہے ہیں۔ اس قسم کی تحریر تیار کر کے گورنر کو دکھائی۔ اور اپنی آمد کی اطلاع کپتان ہمیر کو کر دی۔ اس رپورٹ کو قاضی صاحب نے اس طرح پیش کیا ہے:

''کمپنی بہادر نے پچاس لاکھ سالانہ کے وظیفے کے عوض میں سلطنت کا الحاق کر لیا'' 58؎

30 جنوری کو جب اوٹرم لکھنؤ پہنچا۔ کپتان ہیر نے اس کا استقبال کیا۔ شام کو وزیر اعظم علی نقی خاں اس سے ملنے پہونچا۔ اس وقت تک وہاں الحاق کی کوئی اطلاع یا خوف نہیں تھا۔

علی نقی خان کو ملاقات کے دوران ریزیڈنیٹ نے الحاق کی اطلاع دی اور یہ بھی دھمکی دی کہ جو بھی عامل یا حاکم اس حکم کی مخالفت کرے گا سزا پائے۔ اور جو الحاق کرانے میں معاون ہوگا۔ اس کی نوکری بحال رہے گی۔ سارے شعبوں پر کمپنی کا قبضہ ہے۔ اور اب صرف معزولی کے حکم پر بادشاہ کے دستخط کرانا باقی ہے۔ قاضی صاحب نے اپنے فن کے پیرائے میں اس واقعہ کو اس طرح پیش کیا ہے:

''میر منشی نے ایک خریطہ کھول کر پڑھنے لگا جب اس کے منھ سے یہ فقرہ ادا ہوا۔ کمپنی بہادر نے پچاس لاکھ سالانہ وظیفے کے عوض میں سلطنت کا الحاق کر لیا'' تو وکیل السلطنت کہ سپاہی بچہ تھا ہر چند کہ سپہ گری کے سبق بھول چکا تھا تاہم نیزے کی طرح تن کر کھڑا ہو گیا۔

''یہ ناممکن ہے''

''ریزیڈنٹ نے کھڑے ہو کر اسے گھورا۔ ایک ایک لفظ توڑ کر ادا کیا۔

''یہ گورنر جنرل بہادر کا حکم ہے اور تم کو اس دستاویز پر دستخط کرنا ہیں۔

وکیل السلطنت نے وزیر اعظم کو دیکھا جس کی انگلیاں طبلے کی سنگت کی عادت کی جگالی کر رہی تھیں اس نے خود اپنی آواز سنی۔ اور جیسے اس کی زبان سے یہ فقرہ ادا ہوا۔

''اس کا فیصلہ تو آج سے بہت پہلے بکسر کے میدان میں ہو چکا تھا تاہم اتنے بڑے حکم کی تعمیل کے لئے کم از کم دس دن کی مہلت۔''

زیزیڈنٹ نے نہایت تیزی کے ساتھ جواب دیا۔

58؎: آئینۂ ایام: قاضی عبدالستار کے بہترین افسانے۔ مرتب: ڈاکٹر محمد غیاث الدین۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔ سنہ اشاعت: 1995۔ ص: 72

نائیں ممکن نہیں۔'' 59

اس طرح وہ دونوں مہلت مانگتے رہے مگر عیار اور مکار فرنگی جن کو پہلے ہی حکم صادر ہو چکا تھا الحاق وہ تو صرف دستاویزی خانہ پرتی کر رہے تھے۔ بھلا مہلت کیوں کر دیتے۔

وکیل اسلطنت اور وزیر اعظم جب بادشاہ کے دربار میں پہونچے تو وہاں کا ماحول عیش و سرمستی میں ڈوبا ہوا تھا۔ بے فکری رنگین محفلیں، سینکڑوں خوبصورت کنیزیں، مشہور زمانہ سازندوں کے آگے بادشاہ ہیرے جواہرات کا تاج پہنے تخت پر جلوہ افروز تھا۔

الحاق کی خبر پا کر بادشاہ نہایت غصہ میں ہوکر جوش وجلال کے ساتھ ریزیڈنٹ کے محل میں داخل ہوتا ہے۔

''نوابین اودھ اور برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی کے سیاسی رشتے'' کتاب کے مصنف ڈاکٹر مصطفےٰ حسین نظامی نے لکھا ہے:

> ''واجد علی شاہ ضرور ایک حمیت والے شخص تھے جو انگریزوں سے نفرت کرتے تھے۔ اور بڑی صلاحیتوں کے حامل تھے وہ ایک اعلیٰ فوجی افسر تھے۔ ماہر سیاست داں تھے۔ معاشیات پر ان کی گہری نظر تھی۔ ملک کے حالات سے باخبر تھے انھوں نے دوسری ریاستوں سے تعلقات پیدا کئے۔ ان کی خود اعتمادی اور سیاسی سوجھ بوجھ نے انگریزوں کو چونکا دیا۔ انگریزوں نے سازشوں کے جال بنے جن میں پھنس کر انھیں قید ہونا ہی پڑا۔ انگریز ان کو ہندوستان کی فتح کی آخری کڑی مان اسے فتح کرنے میں جی جان سے جٹ گئے۔ انھوں نے عمال کو رشوت خور، نمک حرام، سازشی اور غدار بنا دیا۔ واجد علی شاہ کی نا اہلی اور عیاشی کو مشہور کر کے ان کی عزت اور ان کی محبت وعقیدت کم کرنے لگے۔ تاکہ عوام کہیں ان کی معزولی سے بھڑک کر انگریزوں کو ملک بدر نہ کر دیں۔ واجد علی شاہ کی گرفتاری کے بعد بھی ان معزولی اور گرفتاری کو جائز ٹھہرانے کے لئے بہت زیادہ اشاعت ہوئی۔ انگریزوں کی بات دشمنی سمجھی جاتی تھی۔ اس لئے بھاڑے کے لکھنے والوں سے واجد علی شاہ کی عیاشیوں کے خوب تذکرے کرتے ہوئے تاریخیں مرتب کی گئیں۔'' 60

59: آئینۂ ایام: قاضی عبدالستار کے بہترین افسانے۔ مرتب: ڈاکٹر محمد غیاث الدین۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔ سنہ اشاعت: 1995۔ ص: 72

60: نوابین اودھ اور برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی کے سیاسی رشتے۔ ڈاکٹر مصطفیٰ حسین نظامی۔ ص: 250

یہ افسانہ اسی وقت کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔جن انگریزوں کے جال میں نہ صرف اودھ بلکہ پورا ملک پھنس گیا تھا۔ساتھ ہی افسوس کی بات ہے کہ ان تمام سازشوں کے جال کچھ ہندوستانی دغابازوں کے ہی بنے ہوئے تھے۔ریزیڈنٹ کا اثر اور دباؤ بادشاہ پر اتنا زیادہ تھا کہ وہ شخصی کام بھی ریزیڈنٹ کے مشورے کے بغیر نہیں کرتا تھا۔بادشاہ دھیرے۔دھیرے احساس کمتری کا شکار ہوئے لگا۔اپنی مایوسیوں سے عاجز ہو کر اپنا وقت گذارے کے لئے رقص وسرور کی محفلوں میں پناہ لینے لگا۔انھوں نے انتظام سلطنت اپنے قابو میں نہ دیکھ کر اس سے فرار حاصل کرنے کے لئے خود کو وقت کے حوالے کر دیا۔اور خود فراموشی کے لئے نئے نئے اسباب ڈھونڈنے لگا۔شاہی پرچم اتار لئے گئے۔ایک نئے نظام اور انگریزی قانون کا نفاذ ہو گیا۔بادشاہ نے اپنی گرفتاری اور اپنی حالت کو دیکھ کر بے اعتنائی کے ساتھ ریزیڈنٹ سے کہا۔اقتباس:

''جب دنیا پرانی ہو جاتی ہے تو نئی دنیا کے لئے نئے قانون وفیصلے ہوتے ہیں اور اب زمانہ آگیا ہے کہ تاجر گھوڑا بادشاہ شیروں پر غالب ہو جائے گا آج وہی قانون قدرت ہے۔''[61]

غرض یہاں اس اقتباس میں قاضی صاحب نے'بیک وقت دو باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے ایک واجد علی شاہ کی ہمت اور خودی کا عالم یہ ہے کہ گرفتار ہونے کے باوجود بھی خود کو شیر سے تشبیہہ دی ہے اور کہا کہ دنیا پرانی ہو جاتی ہے تو نظام تبدیل ہو جاتے ہیں۔اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ آنے والے وقت میں معثیت کا ہی بول بالا ہوگا جس ملک کی معثیت جتنی مضبوط ہوگی وہ پوری دنیا میں اپنی طاقت اور اپنے حکم کے مطابق فیصلے کرے گا۔غرض یہ افسانہ ایک خوبصورت تاریخی پس منظر پیش کرتا ہے اجس میں نہ صرف ایک واقعہ کا بیان ہے بلکہ اس عہد کی اور بادشاہ کی ساری سچائیوں کو انھوں نے نہایت فکری انداز میں پیش کیا ہے۔اس افسانے میں شاہی تہذیب وتمدن کے ساتھ۔ساتھ آداب شہنشاہی۔طرز معاشرت ومعثیت کمزور ہوتی اودھ کی حاکمیت اور سیاسی عدم استحکام کے ساتھ،سیاسی کمزوریوں کو انھوں نے فنی چابکدستی سے پیش کیا ہے۔

☆☆☆

آنکھیں

61: آئینۂ ایام: قاضی عبدالستار کے بہترین افسانے۔مرتب: ڈاکٹر محمد غیاث الدین۔ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔سنہ اشاعت: 1995۔ص: 74

آنکھیں قاضی عبدالستار کا لکھا ہوا تاریخی افسانہ ہے جو رسالہ ''نقوش'' میں پہلی مرتبہ شائع ہوا۔ جس میں جہانگیر سے متعلق ایک واقعہ کا ذکر ہے اور اس کی داستان جہانگیر کی زبان سے بیان کی گئی ہے جو وہ ملکہ نور جہاں کو سناتا ہے۔ ایک دن ملکہ نور جہاں جہانگیر کو اداس اور پریشان دیکھتی ہیں تو بادشاہ سے اس کی وجہ دریافت کرتی ہے۔ نور جہاں کے اصرار پر جہانگیر اس واقعہ کا ذکر کرتا ہے جو اس کے ساتھ پیش آیا تھا مگر اس واقعہ کو سنانے سے پہلے جہانگیر شراب کا سہارا لیتا ہے۔ اور نہایت ہی دل سوزی سے واقعہ بیان کرتا ہے۔ یہاں سے افسانہ فلیش بیک میں جاتا ہے جب وہ بادشاہیت کے دوسرے سال میں تھا اور مینا بازار سے اس کا جلوس رونق افروز تھا تبھی ایک دوشیزہ آتی ہے اور جہانگیر کو پان کی گلوریاں پیش کرتی ہے۔ جہانگیر اس کے حسن و جمال اور اس ہرن جیسی غزالی جھیل جیسی خوبصورت آنکھوں کو دیکھ کر عاشق ہو جاتا ہے۔ اور اس کا حال دیوانوں جیسا ہو جاتا ہے۔ نور جہاں جب جہانگیر سے اس کی پریشانی کا سبب دریافت کرتی ہے اور کہتی ہے۔ اگر عالم پناہ ہندوستان کے شہنشاہ نہ ہوتے تو ایک عظیم مصنف عظیم شاعر مصور اور عظیم موسیقار ہوتے۔ جہانگیر مغل دور کا ایک ایسا بادشاہ تھا جس کو سب سے زیادہ مصوری کا شوق تھا اور اس کے دربار میں سب سے زیادہ اس وقت دنیا کے عظیم مصور جمع رہتے تھے۔ غرض اپنی تعریف سن کر جہانگیر کہتا ہے یہ تعریف ہے یا غم گساری۔ غرض نور جہاں پوچھتی ہے اس کی آنکھوں میں نیند کیوں نہیں ہے تو جہانگیر کہتا ہے سچ بولنا اور اس واقعہ کا ذکر کرنا جو پیش آچکا ہے نہایت ہی دشوار کام ہے۔ مگر نور جہاں کہتی ہے آپ جو ارشاد فرمانا چاہتے ہیں ارشاد فرمائے اس کے بعد بھلے ہی جلاد کو حکم دے کر میری قوت سماعت چھین لی جائے۔ اس بات کو سن کر جہانگیر کہتا ہے۔ اقتباس:

> ''خوب.... جوانی آنکھیں قبول کر چکی.... بڑھاپا سماعت کو سولی چڑھا دے.... غرض جب نور جہاں لاعلمی اور نا سمجھی کا اظہار کرتی ہے تو جہانگیر واقعہ کی تفصیل اس انداز میں بیان کرتا ہے کہ ایک ایک لفظ سے جہانگیر کے دل کی بے قراری ظاہر ہونے لگتی ہے۔
> پہلی بار ما بدولت کو غربت کا تجربہ ہوا ایسی غربت جو دل کو مٹھی میں دبوچ کر ایک ایک قطرہ نچوڑ لیتی ہے اور جب ہم نے چاہا کہ دل کی ویرانی کو شراب سے شاداب کر لیں تو پہلی بار انکشاف ہوا کہ شراب نشے سے عاری ہو چکی ہے۔'' 62

62: آئینۂ ایام: قاضی عبدالستار کے بہترین افسانے۔ مرتب: ڈاکٹر محمد غیاث الدین۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔ سنہ اشاعت: 1995۔ ص: 215

کیوں کہ اس کنیز جس نے جہانگیر کو پان کی گلوریاں پیش کی تھی اس کے حسن و جمال اور اس خوبصورت آواز کو سن کر جہانگیر اپنا ہوس و حواس کھو بیٹھتا ہے۔ اس کو محسوس ہوا کہ ہندوستان کی سلطنت میں کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جو اس کنیز کے حسن و جمال کا مقابلہ کر سکے۔

یہ کنیز بخارا کے شیخ الاسلام کی پوتی اور جلوہ دار شیخ عرب کی بیٹی تھی جس کا نام صائمہ خاتون تھا۔ غرض جب جہانگیر کو اس کنیز کے بارے میں بتایا جاتا ہے تو اس نے صائمہ بیگم کو دربار جہانگیر میں حاضر ہونے کا فرمان دیتا ہے۔ صائمہ بیگم نے شہنشاہ کے حکم کی تعمیل کی وہ دربار میں حاضر ہوئی مگر اس کے اندر مغلیہ حکومت کے جاہ وجلال کا کوئی ڈر یا خوف نہیں تھا بلکہ اس نے نہایت ہمت دلیری کا مظاہرہ کرتے ہوئے دربار جہانگیر میں اس طرح رونق افروز ہوئی جیسے کسی اپنے جاننے والے کے گھر میں حاضر ہو رہی ہوں۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''صائمہ بیگم اس طرح باریابی ہوئی گویا وہ کشور ہندوستان کے قلعہ معلیٰ میں نہیں کسی غریب عزیز کے گھر میں قدم رنجہ فرما رہی۔ نقاب کے اٹھتے ہی داروغۂ چاندنی خانہ نے قلعہ معلیٰ کی تمام روشنیاں ایک شاہ برج میں انڈیل دی ہوں۔ استفسار پر اس طرح مخاطب ہوئی جیسے جہانگیر سے نہیں اپنی ڈیوڑھی پر کھڑے ہوئے سوالی سے مخاطب ہے....اس کی خطابت نے یقین دلایا کہ مابدولت نے محرم خاں کو سفیر بنا کر غلطی کا ارتکاب نہیں جرم سرزد فرمایا ہے۔ پھر معلوم ہوا کہ بھری دوپہر پر رات غالب آ گئی ہے۔ وہ جا چکی تھی....اس کے غروب ہوتے ہی محرم خاں باریاب ہوا۔ عرض کیا گیا کہ خلعت نامقبول اور دعوت نامنظور ہوتی۔'' 63

جہانگیر مغلیہ بادشاہ کو ایک ادنیٰ سی عورت کے اس برتاؤ کی قطعی امید نہیں تھی وہ صائمہ بیگم کے اس رویہ سے بہت دل برداشتہ ہوئے اور جب ان کی دیوانگی حد سے تجاویز کر رکھی اور صائمہ بیگم کی انانیت کا علم جب علیسا حضرت ثانی کو ہوا تو ان کو جہانگیر کی اس حالت پر بہت تشویش ہوئی۔ تو انھوں نے جہانگیر سے دریافت کیا کہ اس لڑکی میں کیا نظر آ گیا تو مغل حکومت کے جبروت و جاہ وجلال کی بازی لگا دی گئی۔ بار ہا سوال کرنے پر جہانگیر نے جواب دیا کہ صائمہ بیگم سر سے پیر تک کرشمہ الٰہی ہیں اور ان کی آنکھوں میں جو وسعت گہرائی اور بے پناہی ہے وہ زمین و آسمان کے درمیان بھی اپنا کوئی جواب نہیں رکھتی ہے۔

63۔ آئینۂ ایام: قاضی عبدالستار کے بہترین افسانے۔ مرتب: ڈاکٹر محمد غیاث الدین۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔ سنہ اشاعت: 1995۔ ص: 217

اس کے بعد علیسا حضرت ثانی کے سفارش خاص پر صائمہ بیگم قعلہ مبارگ میں حاضر ہونے اور عالم پناہ کی خدمت کے لئے راضی ہوگئی۔ یہ خبر سن کر جہانگیر کو نہایت ہی خوشی ہوئی۔ اور اس نے غسل کر کے نیا لباس نئے جواہرات اور خاصہ تناول فرمایا اور داروغہ چاندنی خانہ کو حکم دیا کہ قعلیٰ معلیٰ کا چپہ چپہ روشنی میں غرق کر دیا جائے۔ غرض صائمہ بیگم کی حاضری اور ان کے استقبال کے لئے جہانگیر نے پورے محل کو سجوا دیا۔ اس کے بعد جہانگیر نے حکم دیا کہ صائمہ بیگم کی سواری کو نوبت خانے کی سیڑھیوں تک آنے کی اجازت دی جائے۔ ان کے سارے احکامات کی تعمیل ہوئی اور جہانگیر بے صبری کے ساتھ اس کی آمد کا انتظار کرنے لگے۔ صائمہ بیگم کی دربارِ جہانگیری میں تشریف آوری ہوئی۔ دو عورتیں اس کو بازو کو سہارا دئے ہوئے تھیں۔ صائمہ بیگم کے حکم پر دونوں نے ان کے بازو کو چھوڑ دئے۔ صائمہ بیگم کے ہاتھ میں ایک سرخ پیالہ تھا۔ وہ کورنش ادا کرنے کے بجائے گھٹنوں پر گر پڑی اور کانپتے ہاتھوں کے ساتھ پیالہ ظل الٰہی کی طرف بڑھایا.... جہانگیر نے تخت سے اتر کر صائمہ بیگم کی نذر میں دئے گئے۔ پیالہ کو قبول کیا۔ پیالہ ہاتھ میں آنے ہی جہانگیر کے حواس فاختہ ہوگئے۔ اور اسے ایسا محسوس ہوا گویا آنکھوں کی بصارت چلی گئی ہو۔ کیوں کہ پیالہ میں صائمہ بیگم کی آنکھیں تڑپ رہی تھیں۔ قاضی عبدالستار نے جہانگیر کی زبان سے اس طرح سے اس پہلو کا ذکر کیا ہے:

> ''ہاں بیگم اس کی آنکھوں کے دیدے پیالے میں رکھے ہوتے تھے ....شہنشاہ کو پوری عمر میں آداب شہنشاہی کبھی اتنے بھاری نہ معلوم ہوئے ....تاہم انھوں نے نقاب اُٹھادیا.... آنکھوں کی جگہ دو سوراخ تھے۔ جن سے خون رس رہا تھا زرد سنگ مرمر سے تراشا ہوا چہرہ ساکت تھا۔ پائے مبارک میں جیسے کسی نے زنجیر ڈال دی۔'' 64

صائمہ بیگم کی یہ حالت دیکھ کر جہانگیر ''تڑپ اٹھا اور انھیں آداب شہنشاہی کی تمام روایات بھاری معلوم ہو رہی تھیں اور اس نے نہایت ہی دیوانہ وار اور افسوس کے ساتھ صائمہ بیگم سے صرف اتنا کہا یہ کیا کر ڈالا۔

صائمہ بیگم نے نہایت دل سوزی اور خون جگر سے چھلنی انداز سے صرف اتنا کہا۔ جس میں بادشاہوں کی بادشاہی، فقیروں کی فقیری امیری اور غریبی کا تمام فلسفہ سما جاتا ہے۔ شہنشاہوں کی پسند غریبوں کو زیب نہیں دیتی ناچیز کی آنکھیں جہاں پناہ کو پسند آ گئیں۔ نذر میں گذار دی گئیں۔ کل کی گلوریوں کی طرح قبول فرمالیجئے۔ صائمہ بیگم کے جواب سے جہانگیر کو محسوس ہوتا ہے صدیوں کا دور اس کے ایک۔ ایک لفظ میں بھر آیا

64۔ آئینۂ ایام: قاضی عبدالستار کے بہترین افسانے۔ مرتب: ڈاکٹر محمد غیاث الدین۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔ سنہ اشاعت: 1995۔ ص: 219

ہو۔

غرض صائمہ کی اس انا پرست اور خود دار حرکت نے یہ ثابت کر دیا کہ اسے کنیزوں اور لونڈیوں میں شمار ہو کر شہنشاہ کی تفریح کا سامان بنا قبول نہیں ہے۔ اس نے مغل شہنشاہی کے جبروت کے آگے خود کو فنا کر دیا۔ صائمہ بیگم کا یہ قدم جہانگیر کو احساس جرم کے ساتھ احساس ندامت کو بری طرح گرفتار کر دیا۔ اس واقعہ میں قاضی عبدالستار نے جہانگیر کی تڑپ اور احساس جرم کی شدت کو اپنے مخصوص انداز میں اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ واقعہ بے حد دل سوز ہے۔ کہا جاتا ہے کہ تاریخی اعتبار سے اس میں کوئی صداقت نہیں ہے۔ جہانگیر نے اپنی خودنوشت ''تزک جہانگیری'' میں زندگی کے چھوٹے بڑے ہر واقعات کو قلم بند کیا ہے لیکن اس افسانہ میں جو واقعہ درج ہے وہ اس کی خودنوشت کو کہیں موجود نہیں ہے۔ اس افسانے کو پیش کرنے میں قاضی عبدالستار کے زور تخئیل اور ان کے واقعہ نگاری کے ساتھ منظر نگاری کی بہترین مثال نظر آتی ہے۔ انھوں نے اپنے ذہن سے اختراع کئے گئے واقعات کو مغل آداب شہنشاہی کے ساتھ نہایت خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔

اس افسانے میں قاضی عبدالستار نے نہایت ہی باریکی کے ساتھ جہانگیر کی زبان سے اس کی نفسیاتی کشمکش کی بہترین عکاسی کی ہے۔ صائمہ بیگم کے اس قدم نے جہانگیر کو جس احساس ندامت کو گرفتار جس کی وجہ سے جب بھی وہ تنہا ہوتا ہے صائمہ بیگم کی دکھ بھری آواز اس کی سماعت کو گونجنے لگتی ہے۔ جہانگیر نور جہاں سے اس حالت کو بیان کرتے ہوئے کہتا ہے۔ آج بھی وہ آواز جہانگیر کی پیٹھ پر تازیانے برسانے لگتی ہے اور صائمہ بیگم کی آنکھوں کے وہ زندہ دیدے انگارے کی طرح اس کے وجود کو ڈرانے لگتے ہیں جہانگیر آگے کہتا ہے۔ اگر آج صائمہ بیگم زندہ ہوتی تو یہ جہانگیر محل اس کے قدموں کے نذر کر دیا جاتا تا کہ دل کی تڑپ اور دل سوزی کو کچھ سکون حاصل ہو سکے۔

الغرض اس افسانے میں مغلیہ عہد کے جاہ وجلال اور بادشاہانہ شان وشوکت آداب شہنشاہی کی تمام تر کیفیات وحالات دیکھنے کو ملتی ہیں۔ جہانگیر اور نور جہاں کے مکالمے سے پورے افسانے میں ایک ڈرامائی فضا موجود ہے۔ افسانے میں ابتداء سے انتہا تک خوبصورت الفاظ کے ساتھ نادر تشبیہات واستعارات کا بہترین مرکز نظر آتا ہے۔ قاضی عبدالستار کا سحر آلود اسلوب پورے افسانے میں مکمل طور پر چھایا ہوا ہے۔

☆☆☆

معاشرتی ناول

اردو ناول کی تاریخ میں ایک ایسا فن کار بھی موجود ہے جو دور سے پہچان لیا جاتا ہے اس لئے کہ اس نے اپنے ناولوں کی عمارت نئے رنگ و روغن سے تیار کی ہے اس کی چمک دمک دوسرے ناولوں سے بالکل مختلف ہے۔ یہ وہ ناول نگار ہے جس نے ''شب گزیدہ'' لکھا۔ ''صلاح الدین ایوبیؒ'' تحریر کیا، ''دارا شکوہ'' پیش کیا۔ ''غالب'' کو موضوع افسانہ بنایا، میری مراد قاضی عبدالستار سے ہے۔ قاضی عبدالستار کے ناول دور سے ہی پہچان لئے جاتے ہیں اور ان کا آہنگ اوروں سے مختلف نظر آتا ہے۔ ان کا رنگ ڈھنگ سب سے جدا ہوتا ہے۔ اس نئے پن کا سبب قاضی عبدالستار کی وہ شخصیت ہے جو زمیندارانہ ماحول میں پروان چڑھی اور جس نے زمیندارانہ زندگی کو سن کر نہیں بلکہ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر جانا اور سمجھا۔ اس لئے ان کے ناولوں میں اس ماحول سے اٹھائے گئے کردار سچے اور فطری نظر آتے ہیں اور جن کے باہری چکا چوندھ کے ساتھ ان کی باطنی کرب ناکیاں بھی جھانکتی ہیں۔ قاضی عبدالستار نے اپنے موضوعات کے اظہار کے لئے اپنی زبان استعمال کی جو ان سے پہلے کبھی استعمال نہیں کی گئی۔ ایسا اسلوب اختیار کیا جو اردو فکشن میں پہلی بار نظر آیا۔ قاضی عبدالستار کی زبان سہی معنوں میں فکشن کی زبان ہے جس کا ایک ایک جملہ افسانہ طرازی کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے، کہانی کہتا ہوا دکھائی دیتا ہے، روداد سناتا ہوا سامنے آتا ہے۔

اس باب میں ہم قاضی عبدالستار کے معاشرتی اور تاریخی ناولوں پر بحث کریں گے اور ان کے فنی اصولوں اور تقاضوں کو دھیان میں رکھتے ہوئے ادب میں اس کے مقام و مرتبے کو متعین کرنے کی کوشش کریں گے مگر اس سے پہلے معاشرتی اور تاریخی ناولوں کے فن اور اصول پر ایک نظر ڈالنا ضروری ہے تاکہ معاشرتی اور تاریخی ناولوں کے اصول وضوابط پر بات ہو سکے۔

قاضی صاحب کے ناول اپنے عہد کی مصوری ہی نہیں کرتے بلکہ اس گہرائی اور گیرائی اپنے اور عصری حقائق کے ساتھ بیان بھی کرتے ہیں۔ گو کہ ان کا قلم زوال پذیر جاگیردارانہ معاشرے کی تصویر کشی ہے اور وہ

اس سماج کے بعض ایسے بیان، ایسے تضادات اور ایسے تاریخی حقائق اور تہذیبی عوامل کا ذکر کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں جو تاریخی دستاویز میں ملنا کسی طرح ممکن نہیں ہے۔ اگر چہ قاضی عبدالستار زمیندارانہ نظام کے پروردہ تھے اور اس نظام سے انھیں عقیدت تھی محبت تھی اپنی روایتی تہذیب وتمدن سے لگاؤ تھا مگر انھوں نے زمینداروں کے جابرانہ پہلوؤں کا بیان کرنے سے گریز نہیں کیا۔ اور ان کی معاشی بدحالی کی کہانی پیش کی تھی اور ان الجھنوں پریشانیوں اور ذہنی اور نفسیاتی کیفیتوں کا بھی مکمل نقشہ پیش کیا ہے۔ ساتھ ہی زمیندارانہ نظام سے پہلے ان کے یہاں عیش کوشی بے جا مصارف ان کے عیش وآرام کا ذکر قاضی صاحب کی تحریروں کے باطن میں پوشیدہ ہیں۔

قاضی صاحب کے معاشرتی ناول اپنے ایک خاص دور کی یادگار ہیں جن میں انھوں نے اپنے نظریہ فکر کے مطابق دیکھنے اور ناول کے فنی لوازم کو نظر میں رکھتے ہوئے ایک کامیاب کوشش کی ہے۔

ہر ناول یا افسانہ اپنے زمانے اپنے عہد کی تصویر ہوتا ہے۔ کسی بھی معاشرے کے متعدد پہلوؤں کو جب کوئی تخلیق کار اپنے فکر وخیال سے دیکھتا ہے اور پھر اپنے اسی خیال اور احساس کو تخیل کی آمیزش کے ساتھ صفحۂ قرطاس پر پیش کرتا ہے وہ ادب بنتا ہے۔ ادب میں بھی مختلف خانے بنائے گئے جب کوئی تخلیق کسی ایک گوشے کے اصول وضوابط کو مکمل کرتی ہے تو اسے وہی نام دے دیا جاتا ہے۔ جیسے کوئی معاشرتی ناول کوئی تاریخی ناول کا نام حاصل کر لیتی ہے۔ ویسے کسی بھی تخلیق کار کی تخلیق اپنے معاشرے کے بیچ سے ہی جنم لیتی ہے اس لئے کسی بھی تخلیق کو اپنے سماجی اور معاشرے کی پیش کش کے لئے معاشرتی تخلیق کہا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر احسن فاروقی اور ڈاکٹر سید نورالحسن ہاشمی ''ناول کیا ہے'' میں ناول اور زندگی کے باب میں لکھتے ہیں:

> ''ہر ناول زندگی کا ایک تجربہ پیش کرتا ہے یہ تجربہ ہی ناول کا مواد ہے مگر یہ مواد یا تجربہ ناول نگار کی ہستی سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔ درحقیقت یہ تجربہ ناول نگار کا ذاتی تجربہ ہوتا ہے کیونکہ وہ اپنے ذاتی مشاہدات والیامات کو یکجا کر کے ہی ناول بناتا ہے۔ زندگی جو ناول میں پیش کی جاتی ہے وہ اپنی جگہ اہمیت ضرور رکھتی ہے مگر خود مصنف کی شخصیت اس تجربہ سے کہیں زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ اس کی ہستی خالق کی ہستی کی طرح اس تخلیق کردہ دنیا کے ہر کونے میں آشکار یا پنہاں ہوتی ہے اور اگر ہم اس تک نہ پہنچ سکیں تو اس کی تخلیق

کردہ دنیا کی سیر بیکار ہوگی۔''1؎

قمر رئیس نے ناول اور ناول نگار اور امور اس ناول کے فنی تقاضوں پر فکر آمیز بات لکھی ہے کہ کوئی بھی واقعہ یا کوئی کردار کیسے ناول بنتا ہے اس کے محرکات وعوامل کیا ہوتے ہیں جو کسی خاص واقعہ یا قصے کو ناول کا روپ دیتے ہیں، لکھتے ہیں:

''ناول دراصل حرفتی دور کے بدلتے ہوئے پیچیدہ معاشرے میں فرد کی کشمکش اور آویزش کے عمل سے ترکیب پاتا ہے اور یہی وہ عمل ہے جس میں ناول کے کردار اپنے باہمی رشتوں اور رویئوں عمل اور درعمل کی کڑیوں میں ڈھل کر اپنی انفرادیت اور معنویت پاتے ہیں۔ان کی انفرادیت ناول نگار کے نفسیاتی درس اور ان کی معنویت ناول نگار کی سماجی اور فلسفیانہ بصیرت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔اور نگار ہمیں منظر نہیں دکھاتا بلکہ مخصوص حالات (Situations) کے پس منظر میں وہ اپنے کرداروں کی جذباتی اور ذہنی تصویریں دکھا کر یا ان کے انفرادی تجربوں میں تعمیمی رنگ بھر کر کسی سچائی اور حقیقت کو واضح کرتا ہے۔''2؎

قاضی عبد الستار کے ناول اپنے مخصوص دور کے آئینہ دار ہیں۔انھوں نے اپنے ناولوں کے ذریعہ جہاں حالات کی مصوری کی ہے وہیں کرداروں کے ذہنی اور نفسیاتی عوامل کو اپنے عہد کے پس منظر میں نہایت باریکی سے تصویر کشی کی ہے۔

''پہلا اور آخری خط'' کا جاوید زمیندارانہ نظام کے خاتمے کے بعد تعلیم حاصل کرنے کے بعد بھی بے روزگار ہے اور صرف ایک نوکری کی تلاش میں وہ در بہ در مرا مرا پھرتا ہے۔اسے نہ تو نوکری حاصل ہوتی ہے اور نہ محبت۔قاضی عبد الستار نے اس ناول میں آزادی کے فوراً بعد کی صورت حال کی بہترین مصوری کی ہے۔قیام پاکستان کے بعد مسلمانوں کی زندگی دگر گوں تھی وہ کیسے شب و روز کا مقابلہ کر رہے تھے اور ایک ایک دن کس اذیت کے ساتھ بسر کر رہے تھے۔''شب گزیدہ'' قاضی عبد الستار کا معاشرتی ناول ہے اس ناول میں بھی انھوں نے آزادی سے پہلے کی صورت حال کا بیان کیا ہے۔اور زمیندارانہ نظام کی کھوکھلی سچائیوں کو پیش کیا ہے۔ایک زمیندار کے رہن سہن، خورد و نوش بود و باش کا بہترین مرقع یہ ناول پیش کرتا ہے ساتھ ہی

1؎: ناول کیا ہے؟ ڈاکٹر احسن فاروقی اور ڈاکٹر سید نور الحسن ہاشمی۔ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ۔اشاعت: 2011۔ص: 44

2؎: تلاش و توازن۔قمر رئیس۔جمال پریس، دہلی۔سنہ اشاعت: 1968۔ص: 23

ایک زمیندار کا ظلم جو اپنی آن بان شان زمینداری بچانے اور اپنی پہچان بنائے رکھنے کے لئے اپنے بیٹے کو زہر دے کر مار ڈالتا ہے۔ زمینداروں کا اتنا سخت بیان کسی اور فنکار کے یہاں مشکل سے نظر آتا ہے۔ قاضی عبدالستار کی اس خصوصیت اور ان کے معاشرتی لگاؤ اور فنی ادراک پر روشنی ڈالتے ہوئے انور پاشا لکھتے ہیں:

''قاضی عبدالستار کے ناولوں میں مشترکہ تہذیب، ماضی سے جذباتی وابستگی اور جاگیردارانہ نظام کے آخری نقوش کی تصویر کشی نمایاں مقام رکھتی ہے خواہ ''شکست کی آواز'' ہو یا ''شب گزیدہ'' یا ''پہلا اور آخری خط'' ان کے بیشتر ناولوں کا کینوس اودھ کے تعلقہ دار کنبے اور ان کے جاگیردارانہ اقدار اور طرز معاشرت کے گرد گردش کرتا ہے۔ لیکن قرۃ العین حیدر کے برعکس قاضی عبدالستار بیشتر شہری طرز معاشرت اور تہذیبی فضا کی چمک دمک تک ہی اپنے ناولوں کو محدود نہیں رکھتے بلکہ دیہی زندگی اور اس جاگیردارانہ ثقافت کی نیرنگیوں کا نقشہ بھی پیش کرتے ہیں جس کا حق پریم چند کے بعد بیشتر ناول نگار ادا کرنے سے قاصر ہیں۔

قاضی عبد الستار خاص طور سے آزادی سے قبل اور کچھ بعد کے ٹوٹتے بکھرتے تعلقداروں، زمین داروں اور کسانوں کی تہذیبی میراث اور وضع داروں کے پس منظر میں ان کے کرب اور المناک تباہیوں کو اپنے ناولوں میں سمونے کی کوشش کی ہے۔ گرچہ قاضی عبدالستار کی ہمدردانہ وابستگی اسی زوال پذیر تہذیبی اقدار و روایات سے ہے ان کے ناولوں میں بھی ماضی کی یادوں کی پرچھائیوں کی فضا حاوی ہے۔'' 3

☆☆☆

3: ہندو پاک میں اردو ناول تقابلی مطالعہ۔ انور پاشا۔ پیش رو پبلی کیشنز، نئی دہلی۔ سنہ اشاعت: 1992۔ ص: 28

پہلا اور آخری خط

قاضی عبدالستار کا پہلا ناول ''شکست کی آواز'' کے نام سے ادارہ فروغِ اردو لکھنؤ جنوری 1954 میں شائع ہوا۔اس ناول کو قاضی عبدالستار کے 1953 میں لکھا اس ناول کے تخلیق کے واقعہ کے متعلق فرماتے ہیں:

''ایک روز بیٹھے بیٹھے خیال آیا کہ یہ جو ترقی پسند فکشن نگار ہیں یہ زمینداروں کو بدنام کرتے ہیں اور کسانوں کی مدح سرائی کرتے ہیں، حالاں کہ زمین دار نام کا زمیندار رہ گیا ہے، قابلِ رحم ہو گیا ہے روٹیوں کا محتاج ہو گیا ہے۔لیکن ناول اور افسانوں میں وہی پریم چند کے زمانے کا زمین دار نظر آتا ہے میں نے اس رویے کے خلاف لکھنے کا منصوبہ بنایا اور اس خیال میں میں نے پہلا ناول ''شکست کی آواز'' لکھا مسودے کو دوبارہ پڑھا اور پروفیسر مسعود حسین رضوی ادیب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ کچھ دیر کے بعد پیشی ہوئی، میں نے مسودہ پیش کیا اور عرض کیا کہ میں نے یہ ناول لکھا ہے میں چاہتا ہوں کہ ایک نظر آپ ڈال لیں۔انھوں نے بددلی کے ساتھ فائل لی اور کہا پرسوں دوشنبے کو اسی وقت آجایئے گا۔آپ حیران مت ہوں میں پورے ہوش وحواس میں میں ایک ایک لفظ استعمال کر رہا ہوں۔ایک ایک لفظ کانٹے پر تلا ہوا ہے سچائی کے ساتھ۔ میں فوراً الٹے قدموں واپس ہو گیا۔دوشنبے کے دن شام کو پہنچا پرچہ بھجوایا۔پروفیسر کی کرخت آواز آئی، تشریف لایئے۔کمرے میں قدم رکھتے ہی انھوں نے مسودہ پھینک دیا۔بی۔اے میں ٹاپ کرنا ایک چیز ہے، ناول لکھنا دوسری چیز۔کسی دوسرے کی تحریر اپنے نام سے دینا اور وہ بھی استاد کی سند کے ساتھ انتہائی بری بات ہے۔تشریف لے جایئے۔میں نے کانپتے ہاتھوں سے مسودہ اٹھایا اور لرزتے پیروں سے واپس چلا آیا۔دوستوں کو آب دیدہ ہو کر یہ واقعہ سنایا۔وہ قہقہے لگانے لگے۔''ابے اس سے بڑی تعریف کیا ہوگی'' خیر چند روز بعد میں پروفیسر نورالحسن ہاشمی کے پاس پہنچا اور پوری روداد سنائی وہ مسکراتے رہے کچھ کہے

بغیر مسودہ لے لیا۔اور فرمایا پرسوں آیئے گا۔ہم پرسوں شام کو پہنچے۔سلام کے جواب میں وہ مسکرائے۔ میں نے آپ کا ناول ادارہ ''فروغ اردو'' والوں کو اشاعت کے لئے دے دیا ہے۔ میرے منھ سے آواز نہیں نکلی، اتنا خوش ہوا پوچھا تو صرف اتنا کہ سر یہ کتنے دن میں چھپ جائے گا۔ پان کی گلوری منھ میں رکھی میرے خیال میں دو مہینے کے اندر کتاب آ جائے گی۔ میں رخصت ہوا قدم زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔معلوم ہوتا تھا میں ہوا میں اُڑ رہا ہوں خدا خدا کر کے دو مہینے پورے ہوئے۔ میں ادارۃ فروغ اردو کے مالک شمس لکھنوی کے پاس گیا۔ان کے پاس میں پروفیسر ہاشمی صاحب کے ساتھ جا چکا تھا۔ انھوں نے بٹھایا، چائے پلائی اور ایک کاغذ سامنے رکھ دیا کہ اس پر دستخط کر دیجئے۔ میں نے کانپتے قلم سے دستخط کئے۔انھوں نے دس جلدیں اور ایک لفافہ مجھے دیا اور کہا کہ میں نے ایک ہزار جلدیں چھاپی ہیں یہ ڈھائی سو روپے آپ کی Royality ہیں اور یہ کتابیں لے جائیں۔'' [1]

قاضی عبدالستار کا لکھا ہوا یہ پہلا ناول ادبی دنیا میں پسند کیا گیا، کیوں کہ اس ناول میں عام روش سے ہٹ کر ہندوستان کی آزادی اور تقسیم ہند کے المیہ کے بعد مسلمان زمینداروں اور جاگیرداروں کے حالِ زار کو نہایت کرب بھرے انداز میں بیان کیا کس طرح سے زمینداری کے خاتمے کے بعد ایک خاندان تباہ و برباد ہو کر بکھر رہے تھے۔اس تقسیم نے نہ صرف انسانوں، گھروں، خاندانوں کو الگ کیا بلکہ دلوں کو بھی بانٹ کر ہمیشہ کی بے وفائی اور جدائی دے گیا۔

''پہلا اور آخری خط'' قاضی عبدالستار کا سب سے پہلا اہم اور دلچسپ ناول ہے جسے معاشرتی ناول کہا جا سکتا ہے۔جس میں اودھ رنگین اور بکھری ہوئی حویلیوں اور ٹوٹتے ہوئے کنگوروں کی یاد تازہ کراتا ہے۔ ایک عظیم جاہ و جلال ماضی جس پر قدرت نے وقت کی ایسی مار ماری کہ لمحوں میں سب کچھ تباہ و برباد ہو گیا۔ اس ناول کے سرورق پر لکھا ہے۔

''اودھ کی حویلیوں کی رنگین و پر جلال داستان'' اودھ کی رنگین حویلیوں کا حال بیان کرنا کسانوں اور مزدوروں کا قاتل کہا جانے والا زمیندار جب وقت کی ستم ظریفی کا شکار ہوتا ہے تو اس کی حمایت میں نہ تو کسی

---

[1]: قاضی عبدالستار: اسرار و گفتار۔راشد انور راشد۔عرشیہ پبلی کیشنز دہلی۔سن اشاعت 2014 ص 149-147

تخلیق کار کا قلم اٹھا اور نہ ہی کسی نے ادب کے اوراق پر سیاہی بکھیری کیونکہ نہ تو کسی ادیب یا تخلیق قار کو اس بات کا دکھ یا افسوس تھا اس نظام کے ٹوٹنے اور بکھرنے کا سب سے زیادہ جس تخلیق کار نے قبول کیا وہ قاضی عبدالستار تھے کیونکہ وہ اسی خاندان کے پروردہ تھے۔ اپنا خاندان پریوار چاہے جتنا بھی ظالم و جابر کیوں نہ ہوں اس خاندان کے چشم و چراغ کو اس سے جو محبت والفت ہوتی ہے وہ اس خاندان کا فرد ہی سمجھ سکتا ہے۔ قاضی عبدالستار سے پہلے قرۃ العین حیدر نے بھی اپنی تخلیقات میں اس نظام کو توجہ کا مرکز بنایا ہے۔ اس نظام کے جاہ وجلال کو پیش کیا ہے۔ اور مٹتی ہوئی تہذیب کے المیہ کو پیش کیا ہے۔

''شکست کی آواز'' کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی یہ ناول ''دورِ چراغ محفل'' کے نام سے بھی منظر عام پر آیا۔ ہندی والوں نے اسے ''پہلا اور آخری خط'' کے نام سے چھاپا پھر اردو والوں نے بھی اسی یہی نام دے دیا۔ بہت ہی کم وقفے میں اس کا دوسرا ایڈیشن شائع ہو گیا۔ قاضی عبدالستار اس ناول کے شائع ہونے کے بعد نقادوں کے رویہ کے بارے میں فرماتے ہیں۔ چونکہ اس ناول میں زمینداروں کی حالتِ زار کو بیان کیا گیا ہے۔ اور اسے ایک فرد کی حیثیت سے دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس زمانے میں ترقی پسندوں کے بنائے گئے اصول وضوابط کے برعکس اس ناول میں زمیندار کو مظلوم دکھایا گیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''زیادہ تر لوگوں نے اپنے افسانوں اور ناولوں میں زمین داروں کو ظالم بنا کر پیش کیا ہے جو درست نہیں ہے میں نے پہلی بار زمیندا کو ایک فرد کی طرح دیکھا اور پیش کیا۔ اور افسانوں اور ناولوں کے ذریعہ یہ بتانے کی کوشش کی کہ زمیندار کی موجودہ حالت خود قابلِ رحم ہوگئی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ زمیندار اور جاگیردارانہ طبقے کو اس زاویہ سے بھی دیکھا جائے۔ اس زمانے میں ترقی پسندوں نے زمینداروں کو درست زاویے سے دیکھا ہی نہیں۔ وہ لوگ بڑی بڑی باتیں کرتے ہیں، لیکن میں ترقی پسندوں کو احمق کہتا ہوں، اور اس لئے کہتا ہوں کہ انھوں نے بعض چیزوں کو صحیح تناظر میں نہیں پیش کیا۔ ترقی پسندوں نے میرے خلاف بھی اپنا محاذ کھولا یہ کہہ کر مجھے سخت سست کہتے رہے کہ میں Landed aristocracy کو represent کرتا ہوں جو ترقی پسندوں کی لائن کے خلاف ہے۔ لیکن ہوا یہ کہ میرا پہلا ہی ناول ''شکست کی آواز'' ہندی میں ترجمہ ہوا۔

بابا ناگارجن جو کہ ایک جینوئن نقاد تھے انھوں نے 1962 میں الہ آباد کے اسکا ہوٹل میں ایک بڑا جلسہ کیا۔ مجھے ابھینڈ ن پتر دیا اور یہ کہا کہ جس کو دیہات پر لکھنا ہو وہ قاضی عبدالستار کو Textbook کی طرح پڑھے۔ظاہر ہے یہ اتنا بڑا اعلان تھا کہ اردو کی وہ دنیا، جس میں زیادہ تر ترقی پسندوں کا غلبہ تھا وہ گویا Shock شاک میں مبتلا ہوگئی۔اور وہ ناول بہت تیزی کے ساتھ چار پانچ زبانوں میں ترجمہ ہوا''۔ 2

ناول کا قصہ: پہلا اور آخری خط لال پور کے چودھری نعمت رسول جو تعلقہ دار تھے ان کی زندگی زمینداری اور تعلقہ داری کے خاتمہ کے بعد کی دکھ بھری داستان ہے۔اس ناول میں بہ طور خاص جس امر پر سب سے زیادہ دھیان دیا گیا ہے وہ زمینداری کا زوال ہونے کے بعد زمینداروں،تعلقہ داروں اور جاگیر داروں کو کن کن مصائب و آلام کا شکار ہونا پڑا اس کو ایک سچے فنکار کی طرح قاضی صاحب نے دکھانے کی کوشش کی ہے۔زمینداری کے خاتمے کے بعد اس ناول کو نہ صرف تخئیل کی داستان کہا جا سکتا ہے بلکہ اس میں معاشرے کی زندہ اور جیتی جاگتی حقیقتوں کا بیان ہے۔جس میں زمینداروں اور جاگیرداروں کی شان وشوکت رعب وجلال زمینداری کے خاتمے کے بعد بھی کس طرح یہ طبقہ اس کو دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے بلکہ ان کی خامیوں کمزوریوں اور عیاشیوں کو بھی بے نقاب کرتا ہے۔لال پور کے چودھری کی زندگی کس طرح مشکل اور تکلیف کے ساتھ گذری یہاں تک کہ گھر کے قیمتی زیورات باغ کھیت کھلیان سب کچھ فروخت ہوگئے نوبت یہاں تک آ پہونچی کہ گڈھی کو بیچ کر پاکستان جانے کا ارادہ بنالیا مگر پرانی دشمنی کے چلتے جلال پور کے رام پانڈے کی گولیوں کا شکار ہوکر ہندوستان میں ہی دفن ہونا پڑا اور چودھری کی بیٹی ''اپیا'' جس کا اصلی نام ثمینہ ہے اور اس ناول کی ہیروئن ہے 30-35 سال کی عمر میں تنہا اور بے یارومددگار چھوڑ گئے۔جس کی شادی کرنے کے بارے میں چودھری صاحب نے کبھی نہیں سوچا جو زمینداری نظام ٹوٹنے کے بعد بھی زمیندار رشتہ اور اپنے حیثیت کے گھرانے کی تلاش میں ''اپیا'' کو بڑھاپے کی دہلیز تک پہونچا گئے۔غرض ان کے اس فیصلے میں بھی زمینداروں کی کچھ جھوٹی اور کھوکھلی تہذیب کا بھی پتہ چلتا ہے۔چودھری صاحب کی پہلی بیوی کی موت کے بعد وہ دوسری شادی ایک مراشن سے کر لیتے ہیں اور وہ چودھری کے بڑھاپے کی وجہ سے ایک نوکر راجو کے ساتھ جسمانی رشتہ بنالیتی ہے۔چودھری صاحب کو گھر کی کوئی فکر نہیں رہتی جس کی وجہ سے

2: قاضی عبدالستار: اسرار و گفتار۔راشد انور راشد۔عرشیہ پبلی کیشنز دہلی۔سن اشاعت 2014ء۔ص: 173-172

ان کا بڑا بیٹا اجے بدکردار عیاس اور شرابی بن جاتا ہے۔ ایک دن اپنی سوتیلی ماں کو راجو کے ساتھ رنگے ہاتھوں پکڑ لیتا ہے اور غصہ میں آکر اس کی اور اس کے عاشق راجو کا قتل کر دیتا ہے اور خود بھی مارا جاتا ہے۔

ناول کے قصے کا دوسرا پہلو سیتاپور کے ایک تعلقہ دار گھرانے سے تعلق رکھتا ہے جن کی تعلقداری ختم ہونے کے بعد وہ پائی پائی کا محتاج ہو جاتا ہے۔ جاوید جو اس خاندان سے تعلق رکھتا ہے اس ناول کا ہیرو ہے اور لکھنؤ یونیورسٹی سے ایم.اے کر کے ایل.ایل.بی کر رہا ہے۔ مگر ابھی تک بے روزگار ہے۔ نوکری اور چار پیسہ کمانے کی فکر اسے ہمیشہ پریشانیوں میں مبتلا رکھتی ہے گھر میں پیسہ کی کمی کے چلتے آئے دن لڑائی جھگڑے ہوتے رہتے ہیں جاوید کے بڑے بھائی کسی طرح جاوید کی پڑھائی جاری رکھنے کے لئے پرانے رکھے زیورات اور زمینوں کو بیچتے رہتے ہیں تا کہ اسے کوئی ڈھنگ کی نوکری حاصل ہو اور زندگی چین وسکون سے گذر سکے۔ مگر ایسا ہونا ممکن نظر نہیں آتا ہے۔ اپنی چھوٹی بہن شمو کا خط ملنے پر جس میں اس نے اپنے بھائی جاوید سے چند چیزوں کی فرمائش کی تھی جاوید پوری نہیں کر پاتا ہے۔ جسے سوچ کر جاوید کو بہت زیادہ شرمندگی ہوتی ہے۔ ''پہلا اور آخری خط'' جاگیردارانہ نظام کی شکست وریختہ، بے چارگی بے بسی اور مفسلی معاشرتی بدحالی کی پیدا شدہ صورت حال اور اثرات جو ازدواجی زندگی پر بھی اثر انداز ہوتی ہے کا بہترین ثبوت ہے۔

اس ناول میں جہاں ایک طرف جاگیردارانہ نظام کی شکست وریخت اور دم توڑتی ہوئی تہذیب کو موضوع بنایا گیا ہے وہی دوسری طرف معاشی مسائل کی کمزوریوں اور خامیوں پر نظر ڈالی گئی ہے۔ جس کی وجہ سے جوان لڑکیوں کی شادیاں نہیں ہو پاتی اور وقت کی کاٹ مار اثر انداز ہوتی رہتی ہے۔ زمینداری فیل ہو جانے کے بعد جاگیردارانہ سماج یک بارگی مسائل کا شکار ہو جاتا ہے ان کی جائیداد کسٹوڈین کے پاس چلی جاتی ہے۔ جاگیرداروں کی شان وشوکت قصہ پارینہ ہو جاتی ہے آمدنی کے ذرائع محدود ہو جاتے ہیں لیکن زمیندار طبقہ اپنی وضع قطع اور کھوکھلی شان وشوکت اپنا رعب ودبدبہ قائم رکھنے کی پوری طرح کوشش کرتا ہے۔ اس ناول میں جہاں ایک طرف چودھری صاحب کا اثر ورسوخ پرانی نسلوں تک ہی محدود ہے وہیں دوسری طرف نئی نسل کے نوجوان چودھری کے کسی فیصلے یا بات سے مرعوب نہیں ہوتے بلکہ اس کا دوٹوک جواب دے دیتے ہیں رام لال پانڈے اس ناول میں چودھری صاحب پر حملہ کر دیتا ہے۔ نتیجہ انھیں اپنی جان گنوانی پڑتی ہے۔ اس ناول میں زمیندار اور جاگیردار اپنی بالادستی قائم رکھنے کے لئے ڈاکہ ڈلواتے ہیں اور طرح طرح کے

حربے استعمال کرتے ہیں۔

لال پور کے تعلقہ دار چودھری نعمت رسول یعنی اس ناول کی ہیروئن کے باپ سے رشتے میں جاوید کا ماموں ہوتا ہے۔ جاوید کو اپنی ماں کا خط ملتا ہے جس میں لال پور کے چودھری سے ملنے کی درخواست کی جاتی ہے۔ خط ملتے ہی جاوید نعمت رسول سے ملنے جاتا ہے اور وہاں پر اس کی ملاقات ماموں کی بیٹی شمی سے ہوتی ہے۔ جو اس سے عمر میں دس سال بڑی ہے اور تقریباً 34-35 سال کی کنواری دوشیزہ ہے۔ چودھری نعمت رسول جو کہ ایک تعلقہ دار تھے مگر تعلقہ داری کے خاتمے کے بعد بھی اپنے اثر و رسوخ کو قائم رکھنے کی پوری کوشش کرتے ہیں اور پورے علاقے میں اپنی سیاست کی پینٹھ گاڑے ہوئے ہیں جوانی کی دہلیز پار کرتی اس بیٹی کے ہاتھ پیلے کرانے کی کوئی جلدی نہیں ہے۔

اپیا کے کردار کو دیکھ کر تعلقہ داروں کی جھوٹی شان و شوکت اور وضع داریاں صاف طور پر عیاں ہوتی ہیں اس کے علاوہ چودھری صاحب کو اپنی بچی کے سونے کے زیورات نہ پہننے کا غم ہوتا ہے کہتے جس کی مائیں اور دادیاں سونے کے زیورات پہنتی تھی آج میری بچی پھولوں کے زیور پہنے پر مجبور ہے اُن کے اُس جملے سے اُن کی شکست خوردگی صاف طور پر نظر آتی ہے مگر اپنی بیٹی کے مستقبل کے بارے میں نہیں سوچتے انھیں ماضی تو یاد ہے مگر مستقبل کی کوئی فکر نہیں ہے۔

اقتباس ملاحظہ ہوں جس میں جاوید لال پور چودھری کے گھر سے لوٹنے کے بعد اپنے بڑے بھائی کو وہاں کی حالت سناتے ہوئے کہتا ہے:

> ''ارے ابالیشن کا اُن پر کیا اثر پڑا ہے..... چودھری صاحب کیسے ہیں۔ چھودھرائن صاحبہ کا کیا رنگ رہا۔ اور کیا مطلب ہوتا''۔
>
> ''یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ اُن کا علاقہ چھن گیا ہے۔ وہی آن بان وہی مصارف ماموں۔ موممانی اجے سب لوگ بہت با اخلاق اور بہت پُر محبت ہیں'' میں تو ان کی خاطر مدارت سے اُکتا گیا تھا۔'' [3]

اُس ناول کو قاضی عبدالستار نے آزادی کے فوراً بعد لکھا جب بیک وقت کئی مصیبتیں نازل ہو چکی تھیں خاص طور سے مسلمانوں کے اوپر کئی عذاب نازل ہوئے ہندوستان کی تقسیم کی وجہ سے اُن کی وفاداری مشکوک

---

[3]: پہلا اور آخری خط۔ قاضی عبدالستار، اسرار کریمی پرس، الہ آباد ص46

ہوگئی تھی وہیں دوسری طرف زمینداری اجڑنے سے زمیندار زمین پر آگئے تھے۔

مسلم طبقہ تعلیم کے معاملے میں کافی پیچھے تھے جس کی وجہ سے نوکری کا ملنا نہایت ہی دشوار گذار کام جو کچھ نوجوان بچے پڑھ رہے تھے انھیں بھی نوکری کی تلاش میں در، در بھٹکنا پڑا جس کی وجہ بیکاری اور بے چارگی ان کے گھروں میں مضبوطی سے پیر جمالئے۔اس ناول میں جاوید اوراجے اس طبقہ کی اعلیٰ ثبوت فراہم کرتے ہیں۔جس میں جاوید ایم۔اے کرنے کے بعد ایل۔ایل۔بی کر رہا ہے اور ایک ہونہار اور محنتی طالب علم ہے۔گھر والے جیسے تیسے فاقہ کرتے ہوئے بھی اس کی تعلیم جاری رکھنے کی پوری کوشش کرتے ہیں تا کہ اسے کوئی اچھی نوکری مل جائے۔مگر اسے کوئی روزگار نہیں ملتا ہے۔وہیں دوسری طرف اجے جو چودھری کا بیٹا ہے۔ایک بڑے خاندان سے تعلق رکھتا ہے پڑھائی لکھائی میں کوئی دلچسپی نہیں ہے بی۔اے کے امتحان میں تین سال فیل کر پڑھائی چھوڑ چکا ہے۔چودھرائن کی زبانی اُس وقت کے حالات پر روشنی پڑتی ہے۔اقتباس ملاحظہ ہوں:

''اپنی بیکاری کا اُسے بڑا غم ہے۔مگر کیا کرے نوکریاں تو موئی جیسے عنقا ہوگئیں ....
حکومت میں کون پوچھتا ہے....ورنہ اب تک ڈپٹی ہوگیا ہوتا میرا لال....معلوم نہیں کتنے
لڑکے تمھاری اس گڑھی میں آئے اور تحصیلدار ڈپٹی ہوکر گئے۔'' 4

ہندوستان کی اس خراب حالات کو دیکھتے ہوئے مسلمان پاکستان کا رخ کرنے پر مجبور ہوتے گئے اس ناول میں بھی چودھری اپنا سارا مکان زمین و جائیداد بیچ کر پاکستان جانے کا ارادہ کرتے ہیں مگر پاکستان جانے سے پہلے ایک پرانے دشمن رام لال پانڈے کے ہاتھوں گولیوں کا شکار ہوکر اپنی جان گنوا دیتے ہیں۔

اس کے علاوہ اس ناول میں زمینداروں کی عیاشی اور بدمستی بھی کھل کر سامنے آتی ہے۔جس میں اپنے بڑی عمر کی عورتوں اور مردوں سے رشتہ بنانا ساتھ ہی زور زبردستی کرنا بھی شامل ہے۔چودھری کی بیوی کی موت ہونے کے بعد ایک جوان بیٹی کے ہونے کے باوجود چودھری صاحب دوسری شادی فرماتے ہیں اور وہیں دوسری طرف نئی چودھرائن چودھری صاحب کے درازعمر سے عاجز آ کر اپنے نوکر راجو سے جسمانی رشتہ بنا لیتی ہے۔اور گھر میں ہی رنگ رلیاں مناتی ہے اس کے علاوہ اجے جو چودھری کا بیٹا ہے۔ملیا نام کی ایک لڑکی سے زبردستی بھی کرتا ہے۔اُس کا منھ بند رکھنے کے لئے اپنا اثر ورسوخ بھی دکھاتا ہے۔مگر اپنی ماں کو

4: پہلا اور آخری خط۔قاضی عبدالستار۔ص46

ایک نوکر کے ساتھ رشتہ بناتے ہوئے دیکھ کر آگ بگولہ ہو جاتا ہے اور دونوں کا خون کر دیتا ہے مگر وہ خود بھی نوکر کے ہاتھوں مارا جاتا ہے۔ نسیمن اور دوسری نوکرانیوں کا الگ الگ لوگوں سے تعلقات ہیں جن سے وہ رات کے اندھیروں میں چوری چھپے ملتی ہیں۔ اس کے علاوہ دو پاکیزہ محبتیں بھی پروان چڑھتی ہیں۔ مگر دونوں کو حالات کی ستم ظریفوں نے الگ کر دیا۔

اپنا جن سے جاوید محبت کرتا ہے اور ان سے دس سال چھوٹا ہے۔ جاوید کے گھر والے اس کی شادی اپنا سے کرائے پر رضا مند نہیں ہیں وہیں دوسری طرف سلمٰی اعجاز جو جاوید سے محبت کرتی ہے اور ایک بڑے گھر کی اکلوتی بیٹی ہے آفاق نام کے ایک شخص کے نکاح میں دے دی جاتی ہے۔ ان سب کے پیچھے سماج میں پھیلی ہوئی برائیوں بدمعاشیوں اور لالچ کو قاضی عبدالستار نے خوبصورت انداز سے برتنے کی کوشش کی ہے۔ جاوید کے گھر والے اس کی شادی اپنا سے کرانے کے لئے اس لئے رضامند نہیں ہیں کیونکہ زمینداری فیل ہو جانے اور چودھری کی موت کے بعد جاوید کو جہیز ملنے کی کوئی امید نہیں تھی۔ وہیں دوسری طرف جاوید جو ابھی تک بے روزگار ہے سلمٰی کے گھر والے اس لئے اس کی شادی جاوید سے نہیں کرتے۔ معاشی اور معاشرتی بحران وقت کی ستم ظریفیاں جاگیردارانہ سماج کی بے جا اور فضول خرچے رنگ رلیاں اور تعیش پسندی کو اس ناول میں خوبصورت انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ جس میں چودھری نعمت رسول گڑھی کے تمام اثاثے خستہ کی بندوقوں کو بھی فروخت کر دیتے ہیں تاکہ ان کی بالادستی عام لوگوں پر قائم ودائم رہے۔

اس ناول میں مصنف نے ماضی کی بازیافت کے ساتھ ایک پورے عہد کی جیتی جاگتی تصویر کو اپنی قلم کے ذریعہ زندہ کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔ اس میں قاری کو جذباتی وابستگی کے ساتھ ماضی کے دھندھلے جلتے بجھتے چراغوں سے اودھ کی رنگین اور پر جلال عمارتوں کی کہانیاں دیکھنے اور سننے کو مل جاتی ہیں۔ جو زمیداروں کی زندگی میں کبھی ممکن نہیں تھا۔ یہ ناول اودھ کی زندگی تہذیب وتاریخ کے ساتھ عروج وزوال کی بہترین داستان ہے۔

یہ ناول نہ صرف ماضی کا المیہ ہے بلکہ ماضی حال اور مستقبل کی ایک غم بھری داستان کو بھی پیش کرتا ہے۔

اس ناول پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر ہارون ایوب صاحب لکھتے ہیں:

''اس ناول میں قاضی صاحب نے اپنے مخصوص اسٹائل میں انداز بیان کی بے پناہ قدرت کا استعمال کر کے ناول کو اہم اور انفرادی مقام عطا کر دیا ہے۔ انھوں نے بیک وقت شہر اور گاؤں میں بسنے والے تعلقہ دار گھرانوں کے ماحول کو اپنے دلکش انداز میں اس خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے کہ یہ ناول تعلقہ داری نظام زندگی کا آئینہ دار بن گیا ہے اور اس زندگی کے تمام نشیب وفراز اس میں نمایاں طور پر نظر آنے لگتے ہیں۔'' 5

اس ناول میں تمام تر سماجی مسائل کے ساتھ خصوصاً لڑکیوں کی شادی کے مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ جو نہایت دردناک ہے۔ یہاں بھی جاگیرداروں کی کھوکھلی شان وشوکت اور طبقاتی زیروزبر پر ان کی جھوٹی وضع داریاں صاف طور پر عیاں ہوتی ہیں۔ یہ لوگ اب بھی عام لوگوں سے رشتہ کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں بلکہ قرض لے کر جہیز دے کر اپنی لڑکیوں کی شادیاں اونچے طبقہ میں کرنا چاہتے ہیں۔ انھیں اپنی بھی اپنے وضع قطع پر ناز ہے اور یہ بھول چکے ہیں کہ ہم کل کے زمیندار آج کے نوکر ہو چکے ہیں اور کل کے نوکر آج ہم پر حکومت کررہے ہیں۔ جب ایک نوکر کا رشتہ ان کی بیٹی کے لئے آتا ہے جو کل تک چودھری کے نانا اور دادا کے سپاہیوں میں شامل تھا اس رشتے کو سن کر چودھری صاحب آگ بگولہ ہو جاتے ہیں اور ان کا پارا ساتوں آسمان تک پہونچ جاتا ہے۔ اور کہتے ہیں کہ اگر وہ آج یہاں ہوتا تو میں اس کو بھینگوں سے جوتے لگوا دیتا۔

اقتباس ملاحظہ ہوں:

''آپ کو معلوم ہے اُن کا دادا میرے نانا کے سپاہیوں میں تھے اور اب وہ سطوت رسول کی لڑکی کے لئے پیغام دیتا ہے۔ خدا کی قسم اگر وہ خود آتا تو اسی گھڑی میں بھینگوں سے جوتے لگوا دیتا۔'' 6

قرۃالعین حیدر نے قاضی عبدالستار کے متعلق کہا تھا کہ

''نہ صرف یہ کہ قاضی عبدالستار کو کہانی کہنے کا ڈھنگ آتا ہے۔ بلکہ اپنے موضوع اور کرداروں سے اتنی گہری واقفیت بھی کم افسانہ نگاروں کو حاصل ہوگی۔...'' 7

قرۃالعین حیدر جو ادب ایک بلند پایہ تخلیق کار ہیں قاضی عبدالستار کے متعلق ان کے یہ خیالات بالکل

5: اردو ناول پریم چند کے بعد۔ ڈاکٹر ہارون ایوب۔ ص 231

6: پہلا اور آخری خط۔ قاضی عبدالستار۔ اسرار کریمی پریس، الہ آباد۔ بار اول 1967 ص 11

7: گفتگو (رسالہ) بمبئی۔ شمارہ نمبر 1 ص 353

درست ثابت ہوتے ہیں قاضی عبدالستار نے اپنے ناولوں کے قصہ کو پلاٹ کے تحت ایک خوبصورت لڑی کے پیوست کرنے کی کوشش کی ہے ان کے پلاٹ مربوط اور گھٹے ہوئے ہوتے ہیں کہیں بھی پیچیدگی اور ژولیدگی نظر نہیں آتی ہے۔ ساتھ ہی قاری کا تجسس بھی برقرار رہتا ہے کہ آگے کیا ہونے والا ہے اور یہ کہانی کہنے کے اس ڈھنگ کی وجہ سے قاضی عبدالستار کی ناولوں میں قاری کی دل چسپی بنی رہتی ہے اور پورا ناول ختم ہونے کے بعد ہی سکون نصیب ہوتا ہے۔ یہ فن ان کے معاشرتی ناولوں کے ساتھ ساتھ تاریخی ناولوں میں بھی موجود ہے جہاں دلچسپی کے بہت ہی کم موقع نصیب ہوتے ہیں۔ غرض کہ پہلا اور آخری خط قاضی عبدالستار کی عمدہ فنکاری کا اعلیٰ ثبوت ہے۔ اس ناول میں ابتداء سے لے کر درمیان کے واقعات بھی ایک دوسرے سے جڑے ہوتے ہیں ناول پڑھتے ہوئے کبھی کبھی کئی سطریں دوبارہ پڑھنے کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔ کیوں کہ مصنف نے بہت کم الفاظ کا استعمال کرتے ہوئے ایک واقعہ کے فوراً بعد ہی دوسرا واقعہ شروع کر دیتا ہے۔ جس کی وجہ سے کبھی کبھی پریشانیوں کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے۔ سطریں دوبارہ پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں سے دوسرے واقعہ اور دوسری جگہ کا ذکر شروع ہو گیا ہے۔ جاوید جو کہ لکھنؤ یونیورسٹی کے ہاسٹل میں رہتا ہے وہاں سے کبھی کبھی اپنی پہلی معشوق سے ملنے بھی چلا جاتا ہے۔ جو لکھنؤ میں ہی ہوتی ہیں۔ اس طرح سے پلاٹ میں ایک قسم کی کمزوری دکھائی دینے لگتی ہے۔ مگر واقعات کی ترتیب کرنے کے بعد پوری کہانی سمجھ میں آجاتی ہے۔ یہ مرحلہ قاری کو خود انجام دینا پڑتا ہے۔ ناول میں شعور کی رو کا بھی استعمال دکھائی دیتا ہے۔

کردار نگاری: اردو ناولوں میں چند ایسے بڑے کردار ہیں جن کا نام زندہ جاوید ہے۔ قاضی عبدالستار نے بھی کچھ ایسے کردار تخلیق کئے ہیں جو اہمیت کے حامل ہیں۔ قاضی عبدالستار کے تخلیقات میں ان کے افسانوں کے علاوہ ناولوں کے جاگیردار ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ اس کے علاوہ تاریخی ناول کا داراشکوہ قاضی عبدالستار کا زندہ جاوید کردار ہے۔

پہلا اور آخری خط میں بیک وقت کئی کردار اہمیت کے حامل ہیں اس ناول میں نہ تو کرداروں کی بہت لمبی فوج ہے اور نہ ہی گنتی کے چند کردار ہیں بلکہ جو بھی کردار ہیں وقت اور ضرورت کے حساب سے اہمیت کے حامل ہیں۔

اس ناول میں جاوید، اپیا اور سلما کا کردار سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے جو ناول کے ہیرو و ہیروئن

ہیں اس کے علاوہ ماموں یعنی چودھری نعمت رسول لال پور کا کردار جو ایک تعلقہ دار ہیں جن کے اوپر ناول کا سارا اثاثہ قائم ہے۔ زمینداروں اور جاگیرداروں کا ایک زندہ ثبوت ہیں۔ چودھری صاحب کے حرکات و سکنات ان کا رعب و دبدبہ اس کے عالوہ ان کی فرقہ وارانہ ہم آہنگی سیر وشکار کا شوق سب کچھ اس کردار کے اندر جمع ہے۔ قاضی عبدالستار کے اس کردار کا تعارف اس انداز سے کرایا ہے۔

''آپ کو معلوم ہے.... اُن کے دادا میرے نانا کے سپاہیوں میں تھے۔ اور اب وہ سطوت رسول کی لڑکی کے لئے پیغام دیتا ہے۔ خدا کی قسم اگر وہ خود آتا تو اسی گھڑی میں بھنگوں سے جوتے لگوا دیتا۔'' 8

اونچے اونچے دروازوں پر پڑی حلیفوں سے کوئی گرجدار آواز آ رہی تھی۔ میں ایک کرسی پر بیٹھنے لگا کہ اندر کتوں کے بھونکنے کی آواز آئی۔ ساتھ ہی ساتھ ایک آدمی نے چک اٹھا کر آنے کا اشارہ کیا۔

''.... ماموں فرش پر کھڑے تھے۔ لانبا خمیدہ قد... جھاگ جیسا ململ کا کرتہ.... جامے دار کی آدھی آستین کی صدری چھپا ہوا چوڑی دار پاجامہ زردوزی کا جوتا۔ شانوں پر کامنی سے کشمیری شال پڑی ہوئی۔ کھچڑی بالوں کے پٹے کٹے ہوئے عقاب جیسی تیز آنکھیں۔ کشادہ پیشانی کسی قدر سانولے رنگ پر دودھ جیسی سفید مونچھیں ... سر سے پیر تک مجسم امارت۔'' 9

غرض اس کردار میں زمینداروں کی پوری شان وشوکت جلوہ گر ہے۔ ساتھ ہی چودھری صاحب کے کردار کی اپنوں کے لئے نرمی اور دشمنوں اور عزیزوں نوکروں کے لئے ان کا فولاد جیسا حکم آمیز انداز زمینداروں کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ کس طرح سے ایک نوجوان ملیا کے بھائی پر غصہ کرتے ہیں اور اپنے جوتے پیٹتے ہیں اس کے علاوہ ٹھاکر صاحب جو کہ ہندو ہیں ان کے ساتھ دوستی ہندو مسلم بھائی چارگی کا عمدہ ثبوت ہے جب ہندوستان میں دونوں فرقے آپس میں مل جل کر رہتے تھے۔

اس کے علاوہ دوسرا کردار مومانی کا ہے بہت اہم نہیں تو غیر اہم بھی نہیں ہے چودھری صاحب کی پہلی بیوی کا انتقال ہونے پر وہ ایک مراثن سے شادی کر لیتے ہیں اور یہی مراثن چودھری صاحب کی بیوی ہے۔

8: پہلا اور آخری خط۔ قاضی عبدالستار۔ ص 11

9: پہلا اور آخری خط۔ قاضی عبدالستار۔ ص 11

جوڈیل ڈھول والی شخصیت کی مالک ہے ان کا سارا کام گھر کے اندر نوکروں چاکروں کی دیکھ ریکھ کرنا اچھے اچھے کپڑے پہنا اور عمدہ کھانا کھا کر پان کھانا ہے اور نوکروں کے اوپر حکم صادر کرنا یہ مراشن جو چودھری صاحب سے عمر میں چھوٹی ہے اور چودھری صاحب کی بڑھی عمر سے عاجز آ کر اپنے ایک نوکر سے ناجائز تعلق استوار کر لیتی ہے۔غرض اس کے کردار میں زمیندارانہ نظام مراشنوں اور کوٹھے پر رہنے والی عورتوں کی عکاسی نظر آتی ہے جو کسی بڑے رئیس اور زمیندار سے لالچ کی وجہ سے شادیاں کر لیتی تھیں اور گھر میں آ کر اپنا رعب و دبدبہ قائم کر لیتی تھیں اکثر یہ عورتیں دیکھنے میں خوبصورت اور کم عمر ہوتی تھیں قاضی عبدالستار کی اکثر ناولوں میں اس طرح کے کردار نظر آتے ہیں اس کے علاوہ زمیندار اور جاگیردار بیویوں کے رہتے ہوئے بھی رشتہ رکھنا اور دوسری عورتوں سے جائز تعلق رکھنا ایک عام بات ہوا کرتی تھی۔غرض یہ کردار اپنی نازیبا حرکات کی وجہ سے انھیں اپنے بیٹے اجے کے ہاتھوں جان گوانی پڑتی ہے۔اس ناول میں تیسرا کردار ''اپیا'' یعنی چودھری صاحب کی بیٹی شمینہ جمال کا ہے جو مسلم یونیورسٹی علی گڈھ سے تعلیم یافتہ خاتون ہیں ساتھ ہی ادب کی باذوق طالب علم ہیں ان کے کمرے میں فیض،اقبال اور کرشن چندر کے شعری اور افسانوی مجموعے قرینے سے سجے ہوئے ہیں جس کو دیکھ کر ان کے ذوق وشوق کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔''اپیا'' جن کی عمر ۳۵۔۳۰ سال کے قریب ہے مگر ابھی تک کنواری ہیں۔اُن کی شخصیت میں ایک سوگواری ہمیشہ قائم رہتی ہے۔ان کی رنجور آنکھوں کے طلسم میں آ کر جاوید میاں اپنا چین وسکون کھو دیتے ہیں۔

قاضی عبدالستار ''اپیا'' کے کردار سے اس طرح تعارف کراتے ہیں۔

> ''بائیں طرف سے ایک سرسریں ہاتھ نے شفاف تولیہ بڑھایا اور میں بدحواس ہوگیا۔ سفید ریشمی غرارے اور جمپر میں لپٹا ہوا دراز قد....سرمئی جارجٹ کا ڈوپٹہ پیشانی تک مُڈھا ہوا جس میں نیلا سوئٹر جھانک رہا تھا۔سفید رنگ پر ہلکی ہلکی زردی چھائی ہوئی ۔ مہراب دار ابرو رنجور آنکھیں جن کے گوشوں پر مہین مہین شکنیں کانپ رہی تھیں۔گالوں پر ننھی سرمئی لکیریں طلوع ہوتی ہوئی جذبات سے عاری ہونٹوں میں سیکڑوں نغموں کی لاشیں رکھی ہوئی۔ناک میں مومانی جیسی تابندہ مگر ذرا چھوٹی سی کیل۔ایک کان میں جھولتا ہوا لمبا لمبا آویزہ۔''

کم از کم بیس پچیس سال کی ہوگی مگر ہر زاویہ سے دوشیزہ معلوم ہو رہی تھی ان کے سراپے

پر ایک جلال سا برس رہا تھا۔ ایسا جلال جو بندگی پر اکساتا ہو میری نظریں ان کے چاندی
جیسے پیروں پر تھیں جن کے مخملی جوتوں کا کام دھندلا ہو گیا تھا اچانک مری نگاہیں چونکیں۔
ان کی آنکھیں پوری طرح کھل گئی تھیں اور ایک دلدوز نغمہ تیر بن گیا۔'' 10

''اپیا'' کا کردار زمیندارانہ نظام کی لڑکیوں اور عورتوں بے کسی اور مجبوری کی یاد دلاتا ہے جہاں لڑکیوں کو اپنے پسند اور مرضی سے جینے کا کوئی حق حاصل نہیں تھا اگر چہ وہ گھر میں پورے عیش و آرام اور قیمتی زیورات اور کپڑوں سے آویزاں رہتی تھیں مگر قیدی کو چاہے سونے کی جیل میں ہی کیوں نہ رکھا جائے مگر وہ آزادی نہیں بلکہ قفس ہی کہلائے گی۔ زمیندارانہ نظام میں عورت پتھر کی مورت کی حیثیت رکھتی تھی انھیں بہت ہی کم حقوق حاصل تھے خاص طور سے باہری کام کاج میں ان سے کوئی رائے نہیں لی جاتی ہے یہاں تک کہ شادیاں بھی ان کی مرضی کے مطابق نہیں ہوتی ہے بلکہ لڑکی کی اجازت کے بغیر ان کی شادیاں کر دی جاتی تھیں جس کی وجہ سے اکثر لڑکیاں یا تو زہر کھا کر خودکشی کر لیتی تھیں یا پھر خود کے اوپر جنات کی سواری آنے کا بہانہ کرتی تھیں۔ تاکہ کسی طرح دوزخ بھری زندگی گذارنے سے بچ جائے۔ اس ناول میں اپیا کا کردار ایسا ہی دل دوز اور عبرت ناک کردار ہے۔ ''اپیا'' کے لہجے میں ان کی زندگی کی ویرانی اور تنہائی صاف طور پر عیاں ہوتی ہے۔

جب جاوید ''اپیا'' سے اپنی محبت کا اظہار کرتا ہے تو ''اپیا'' کہتی ہے۔ تم کیوں بھول جاتے ہو کہ تم مجھ سے دس برس چھوٹے ہو۔

اتنے جذباتی نہ بنو...کوئی اندھے کے لئے اپنی آنکھیں نہیں پھوڑ لیتا۔ جب جاوید ان سے کہتا ہے کہ وہ کل واپس چلا جائے گا ''اپیا'' کو اس کی اس بات سے بہت دکھ ہوتا ہے ان کا دکھ اس اقتباس کے ذریعہ محسوس کیا جا سکتا ہے۔

> ''تو یہ رات جو آدھی گذر چکی ہے۔ میرے حافظے میں سوتی رہے گی اور ایک دن کالے
> گلابوں کی طرح مرجھا جائے گی۔ امی ہر سال لکھنؤ جا جا کر پائجاموں پر کار چوپ
> کڑھواتی رہیں گی۔ ابو ہر سال ''دیوہ'' کے میلے سے چاندی کے برتن خریدتے رہیں
> گے۔ لیکن پھولوں میں لدی موٹر لال پور کے بدنصیب پھاٹک پر کبھی نہ رکے گی۔ سہ
> منزلے کی سنسان شبنمی ہر شام مجھے دوربین سمیت اپنے کلیجے سے لگائے روتی رہے گی

10: پہلا اور آخری خط۔ قاضی عبدالستار۔ ص 9-8

میرے کمرے میں ہمیشہ ایک ہی مسہری رہے گی ہمیشہ ایک۔'' 11؎

غرض ''اپیا'' کے کردار میں جس سے بڑھتی عمر اور شادی نہ ہونے کا کرب جس طرح سے پیوست ہے وہ اس ناول کو ایک المیہ کا انداز بھی عطا کرتی ہے۔ کیوں ماں کے مرنے، باپ کی مصروفیت اور بھائی کے غلط کردار کی وجہ سے وہ خود کو ہمیشہ تنہا ہی محسوس کرتی رہتی ہیں جاوید کے آ جانے سے ان کی زندگی میں بہار آ جاتی ہے مگر ان کو ہر وقت اس بات کا پاس ولحاظ رہتا ہے کہ وہ اس سے عمر میں بڑی ہے اور اپنے جذبات کو قابو میں رکھنے کی پوری کوشش کرتی ہیں۔ مگر کہیں نہ کہیں ان کے بات اور انداز سے ان کی جاوید کے لئے محبت ظاہر ہوتی رہتی ہے جسے چھپانے کی وہ نا کام کوشش کرتی ہیں۔

باپ کی موت کے بعد وہ اپنے ماموں کے ساتھ پاکستان چلی جاتی ہیں اور جاوید کے نام ایک خط چھوڑ جاتی ہیں جو جاوید کے نام ان کا پہلا اور آخری خط ہوتا ہے۔ اس خط میں انھوں نے اپنی بربادی کا ذمہ دار آفاق نام کے ایک ایسے مرد کو ٹھہراتی ہیں جس نے شمینہ جمال یعنی ''اپیا'' سے جھوٹی محبت کے دعویٰ کرتا ہے۔ اور سوتیلی ماں جس نے بیٹی کی کبھی پرواہ نہیں کی بلکہ اپنے نوکر کے ساتھ رنگ رلیوں میں مصروف رہی۔

اس خط میں ''اپیا'' جاوید کے تئیں اپنے جذبات کا اظہار کرتی ہیں۔ اور اس کے علاوہ جاوید سے دوری بھی ان کو برداشت نہیں ہوتی ہے اور جاوید کے لکھنؤ جانے کے بعد اپنے علاج کے بہانے ان سے ملنے پہونچ جاتی ہیں۔ کبھی کبھی جذبات کی رو میں بہہ کر اپنے درد وکرب کو اس طرح بیان کرتی ہیں۔

''سوچنے کو تو میں نے بھی بہت کچھ سوچا تھا جاوید...لیکن میں تم سے کیا کہوں بارہ برس ہو گئے۔ کوئی بے باک نظر گڑھی کی بلند دیواریں پھاند کر میری خواب گاہ کے نزدیک نہ آسکی۔ کوئی ایسا بھی تو نہ تھا جس سے باتیں کر کے میں اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرتی۔ میں قہقہے لگانا بھول گئی۔ میں جب تم لوگوں میں بیٹھ کر مسکرا لیتی ہوں تو مجھے ایسا معلوم ہوتا جیسے میں کوئی بڑا اخلاقی گناہ کر رہی ہوں تم میرے اتنے قریب آ گئے ہو کہ میں ڈوبی جا رہی ہوں۔ میں خوفزدہ سی رہنے لگی ہوں۔ جب تم مجھے چھو لیتے ہو تو میں لرز اٹھتی ہوں میرا دل دھڑکنے لگتا ہے۔ اور...تم یہ سب کچھ سمجھانے سے نہیں سمجھ سکتے۔'' 12؎

11؎: پہلا اور آخری خط۔ قاضی عبدالستار۔ ص114

12؎: پہلا اور آخری خط۔ قاضی عبدالستار۔ اسرار کریمی پریس، الہ آباد۔ بار اول 1967ء۔ ص:113

غرض اس ناول میں ''اپیا'' کا کردار ایک جیتا جاگتا اور متحرک کردار ہے۔

اس کے علاوہ ناول میں دوسرا کردار جاوید کا ہے جو ایک بے روزگار نوجوان ہے۔ جو زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتا ہے زمینداری فیل ہوجانے کے بعد یہ پریوار پائی پائی کا محتاج ہوجاتا ہے۔ اور فاقہ کشی پر مجبور ہے۔ اس کے گھر میں ماں، بڑے بھائی اور چھوٹی بہن کے علاوہ یہ خود ہے اس کنبہ کا خرچ مشکل سے ہی بچی ہوئی زمینوں پر کاشت کاری کرکے پوری ہوتی ہے۔ جاوید کے بڑے بھائی اس کی تعلیم کے لئے ہر مہینے خرچ دیتے ہیں اور اس بات کا ان کو بہت احساس رہتا ہے۔ اور وہ چاہتے ہیں کہ کسی طرح جاوید تعلیم مکمل کرکے ایک اچھی سی نوکری تلاش کرلے تاکہ آمدنی کے ذرائع مل جائیں۔ مگر نوکری ملنا اور مسلمانوں کو کسی بڑے سرکاری عہدے پر فائز ہونا نہایت مشکل کام تھا کیوں کہ حکومت وقت نے مسلمانوں کے لئے سیاست کے بساط پر انھیں ایسی حالت میں لا دیا تھا جہاں ان کے وجود کا بھی مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا گیا۔ ہندوستان کی تقسیم کے بعد ان کی وفاداری مشکوک ہوگئی تھی۔

جاوید کی چھوٹی بہن نسیم اس کے نام خط لکھتی ہے اور اس سے اپنے جوتے اور کپڑے کی شکایت کرتی ہے جو پھٹ چکے اور نئے جوتے کی فرمائش کرتی ہے۔ ساتھ ہی اپنی امی سے سوئٹر کی فرمائش کرتی ہے اور کہتی ہے کہ اسکول میں سب لڑکیاں سوئٹر پہن کر آتی ہیں مگر اس ماں جو غریبی اور محتاجگی کی زندگی گذار رہی ہے اپنی بچی کی فرمائش کے لئے ڈانٹ پلاتی رہتی ہیں۔

قاضی عبدالستار نے زمینداری نظام کے خاتمے کے بعد اس طبقے کی حالات کا ذکر اتنے درد بھرے انداز میں کیا ہے کہ قاری کو ان کی اس حالت پر ترس آتا ہے۔ ایک آن بان اور شان اور انواع اقسام کے دسترخان جو زمینداری تہذیب کی ایک نشانی ہوا کرتی تھی۔ ساتھ ہی جن کی ڈیوڑھی ہزار فقیر فقیرنی کے پیٹ پلتے تھے شادیوں میں محلے بھر کے لوگ شریک ہوکر کھانا کھایا کرتے تھے آج ان کے پاس پیٹ بھر کر کھانے کو بھی نہیں بچا ہے۔ اس ناول میں بھی جاوید کے گھریلو حالات کا ذکر مصنف نے نہایت درد بھرے انداز میں کیا ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو جس کے ذریعہ گھر کے اندرونی حالت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

''اماں دسترخوان بچھا رہی تھیں....وہ گلاسوں میں پانی رکھ رہی تھی۔ ہم لوگ کھانا کھانے لگے اماں نے تھوڑا سا گوشت پکایا تھا اور وہ پلیٹ میرے سامنے رکھ دی۔ وہ سر جھکائے دال کھا رہی تھی۔ میں نے ایک بوٹی چمچ میں لے کر اس کی پلیٹ کی طرف بڑھائی اس

نے پلیٹ اٹھائی اور اماں کی طرف دیکھنے لگی۔

''اس میں مرچا ہے بھیا... مجھے گوشت اچھا نہیں لگتا۔''

اماں اپنے آنسو روکے بڑے ضبط سے کھانا کھا رہی تھیں۔'' 13؎

غرض اس ناول میں جاوید کا کردار تعلقہ داری نظام کے خاتمے کے بعد کی صورت حال کی عکاسی کے طور پر بہتر ڈھنگ سے پیش کیا گیا ہے۔ جاوید پڑھا لکھا نوجوان ہے۔ جس کے ذریعہ قاضی عبدالستار نے مسلمان نوجوانوں کی بدتر حالت کو پیش کیا ہے۔ جاوید کا کردار جذباتی اور رحم دل بھی ہے۔ جب وہ لال پور جاتا ہے تو ''اپیا'' کی حالت اس سے دیکھی نہیں جاتی ہے۔ ان کی زندگی میں خوشیاں لانے کی وہ مکمل کوشش کرتا ہے اور ان کے ساتھ ایک جذباتی لگاؤ بھی محسوس کرتا ہے۔ مگر ''اپیا'' جو اس سے عمر میں بڑی ہوتی ہیں۔ اس رشتے سے انکار کرتی رہتی ہیں مگر جاوید ''اپیا'' سے شادی کرنے کے لئے اپنے بڑے بھائی کی ناراضگی بھی مول لیتا ہے۔ لیکن انھیں بھی بے یار و مددگار نہیں چھوڑنا چاہتا ہے۔ اس ناول میں سلمٰی اعجاز کا بھی کردار ہے جو ایک بڑے گھر کی اکلوتی بیٹی اور جاوید کی منگیتر بھی ہے اور رشتے میں پھوپھو کی بیٹی بھی ہوتی ہے جو نہایت خوبصورت اور پڑھی لکھی لڑکی ہے۔ مگر جاوید نہ تو لالچی ہے اور نہ ہی موقع پرست وہ سلمٰی سے سات سال سے محبت کرتا ہے مگر ''اپیا'' سے ملنے کے بعد جو جذباتی لگاؤ محسوس کرتا ہے وہ سلمٰی کے لئے محسوس نہیں کرتا ہے اس لئے اپنے دوست سے کہتا ہے کہ وہ ''اپیا'' سے سچی محبت کرتا ہے جب کہ سلمٰی کے ساتھ صرف ایک جذباتی رشتہ ہی ہے۔

سلمٰی اعجاز کا کردار مشرقی تہذیب و تمدن کی نشانی ہے۔ وہ جاوید کی محبوبہ اور منگیتر ہے جب سلمٰی کے گھر والے اس کی بے کاری سے عاجز آ کر سلمٰی کا رشتہ کہیں اور طے کرنا چاہتے ہیں تو سلمٰی اپنا فیصلہ سنا دیتی ہے کہ وہ جاوید کے ساتھ ہی رہنا چاہتی ہے اور ہر زاویہ سے اس کی مدد کرتی رہتی ہے۔ جاوید سلمٰی کو بتا دیتا ہے اور جو ذہنی مریضہ بن جاتی ہے کہ وہ ''اپیا'' سے محبت کرتا ہے۔ اور اس کو جاوید کی بے وفائی سے بہت صدمہ پہونچتا ہے۔

اس کے علاوہ اس ناول میں جاوید کی ماں اس کے بڑے بھائی اور اس کی چھوٹی بہن کا کردار بھی اہمیت کا حامل ہے جن کے ذریعہ قاضی صاحب نے وقت کی ستم ظریفی زمینداروں کی غریبی بے بسی اور مفلسی

13؎ پہلا اور آخری خط۔ قاضی عبدالستار۔ اسرار کریمی پریس، الہ آباد۔ ص: 90

کا خوبصورت انداز میں ذکر کیا ہے۔جن کے گھر میں پیسے کی قلت کی وجہ سے آئے دن لڑائی جھگڑے اور ذہنی پریشانیاں غالب رہتی ہیں۔

چودھری صاحب کے لال پور حویلی کے کچھ اور بھی کردار اہمیت کے حامل ہیں جن میں حسن بانو ملیا وغیرہ ہیں۔

غرض اس ناول میں جتنے بھی کردار بیان کئے گئے ہیں موقع و محل کے حساب سے آتے ہیں اور اپنا کام پورا کرتے ہیں۔کسی بھی کردار کے اندر جھول یا ٹھہراؤ نہیں بلکہ سبھی متحرک کردار کی علامت ہیں۔

منظر نگاری:

ناول میں منظر نگاری کو ایک خاص اہمیت دی جاتی ہے۔جس ناول میں منظر نگاری جتنی صاف اور واضح ہوگی وہ ناول اتنا ہی کامیاب سمجھا جائے گا۔قاضی عبدالستار کو منظر نگاری پر کافی عبور حاصل ہے اکثر جب وہ کسی منظر کا ذکر کرتے ہیں تو تمام جزئیات کے ساتھ وہ تصویر بالکل نظروں کے سامنے آجاتی ہے۔اس ناول میں بھی عمدہ منظر نگاری کی بہترین مثال دیکھی جاسکتی ہے۔چاہے وہ کوئی بھی مناظر ہوں جن میں قدرت کے مناظر کے ساتھ حویلیوں کے اذکار عورتوں کے کپڑوں زیوروں یا دوسرے ملبوسات کے ساتھ سیر وشکار کا منظر بڑے خوبصورت انداز میں پیش کیا گیا ہے۔قاضی عبدالستار کا کمال اکثر ان کے جنگی مناظر میں دیکھا جاتا ہے مگر تعلقداروں اور زمینداروں کی حالتِ زار کا ذکر جس درد بھرے انداز میں کیا ہے وہ بھی قابلِ دید اور قابل ستائش ہے۔آرائش و زیبائش کے ساتھ تشبیہ واستعارے کے استعمال سے بھی قاضی عبدالستار عمدہ منظر نگاری کرتے ہیں۔

ایک منظر کا ذکر اس اقتباس میں دیکھا جاسکتا ہے۔

> ''سیاہ رنگ کا بوڑھا پھاٹک اپنا مغرور سر اٹھائے میرے سامنے تھا۔دائیں جانب پیپل کے طویل درخت کے نیچے ایک ہاتھی گنوں سے کھیل رہا تھا۔جس پر سیاہ رنگ کی خوب صورت ہوج کسی ہوئی تھی۔کچھ دور ہٹ کر دو ادھے کھڑے تھے....دو آدمیوں کے کاندھوں پر کارتوس کی پیٹیاں جھول رہی تھیں جس میں سرخ سرخ کارتوس دلہنوں کی طرح جھانک رہے تھے۔'' 14؎

14؎ پہلا اور آخری خط۔قاضی عبدالستار۔اسرار کریمی پریس،الہ آباد۔بار اول 1967ء۔ص:11

اسلوب نگاری:

فضا آفرینی کو قاضی عبدالستار نے اپنے خوبصورت اسلوب کے ذریعہ خوبصورت الفاظ کا جامہ پہنا کر اپنے ناولوں میں اس طرح سے سجایا ہے کہ قاری ان کے حسن بیان کی داد دیئے بغیر نہیں رہ پاتا۔ ایک دو اقتباس کے ذریعہ اس فضا آفرینی کو آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے:

(۱)''جس میں درد کے ساتھ ایک انجانی کسک بھی شامل ہے۔ سورج ایک بدنصیب تمدن کی طرح ڈوب رہا تھا۔ مغربی آسمان پر لگی ہوئی آگ ابھرتے ہوئے سرمئی کپڑے کی چادر میں بجھ رہی تھی۔'' 15

(۲)''میر کے سارے دیوانوں کا درد اُن کی آواز میں کھینچ آیا تھا۔'' 16

(۳)''دیوانی رات چاند کی لاش کو اپنی ممتا کے کلیجے سے لگائے قہقہے لگا رہی تھی دیو پیکر گڑھی کی بوڑھی برجیاں چاندنی میں نہا رہی تھیں۔'' 17

(۴)''سورج کے گلابی تبسم میں یونیورسٹی سوئی تھی۔ مغلوں کے تاریخی محل کی طرح اونچے اونچے گنبد افق کے دوش پر رکھے لوریاں سن رہے تھے۔ جیسے رخصت ہوتی تہذیب مورخ کے قلم سے سرگوشیاں کر رہی ہو۔'' 18

مکالمہ:

قاضی عبدالستار نے مکالمے کا نہایت اور برجستہ انداز میں پیش کیا ہے۔ اگر مکالمہ زیادہ لمبا چوڑا ہوگا یا نصیحت آمیز ہوگا تو قاری کو اس سے الجھن ہونے لگتی ہے۔ مکالمہ ہمیشہ آسان زبان چھوٹے چھوٹے سطروں میں ہونا چاہئے تاکہ کردار کی گفتگو آسانی سے سمجھ میں آجائے۔ قاضی عبدالستار کے اس ناول میں مکالمے چھوٹے چھوٹے اور خوبصورت انداز میں بیان کئے گئے ہیں جن میں کوئی الجھاؤ یا پیچیدگی محسوس نہیں ہوتی ہے۔

اقتباس ملاحظہ ہوں:

15: پہلا اور آخری خط۔ قاضی عبدالستار۔ اسرار کریمی پریس، الٰہ آباد۔ بار اول 1967ء۔ ص:14

16: پہلا اور آخری خط۔ قاضی عبدالستار۔ اسرار کریمی پریس، الٰہ آباد۔ بار اول 1967ء۔ ص:19

17: پہلا اور آخری خط۔ قاضی عبدالستار۔ اسرار کریمی پریس، الٰہ آباد۔ بار اول 1967ء۔ ص:2

18: پہلا اور آخری خط۔ قاضی عبدالستار۔ اسرار کریمی پریس، الٰہ آباد۔ بار اول 1967ء۔ ص:43

''نہیں پہلے آپ بتلا دیجئے۔ کہ آپ کا انٹرسٹ نہیں ہے۔''

''بھلا میرا کیا انٹرسٹ ہوسکتا ہے۔ لاحول ولاقوۃ''

''میں اس سے محبت کرتا ہوں جاوید بھائی''

''کب سے مجھے جھرجھری آ گئی۔

''کوئی ایک سال ہو چکا ہے۔'' 19؎

اس ناول میں مکالمے کی بھرمار نہیں ہے جتنے بھی مکالمے استعمال کئے گئے وہ سب اپنے فطری رنگ میں نظر آتے ہیں۔ جو قاضی صاحب کی تخلیقات میں عمدہ فناری کا ایک بین ثبوت ہے۔

اس ناول میں قاضی عبدالستار نے اودھی بولی کا بھی استعمال کیا ہے جو جیسا کردار ہے اس کی زبان سے ویسا ہی مکالمہ ادا ہوا ہے۔ اکثر ناول نگار یہ غلطی کر جاتے ہیں کہ ایک جاہل اور دیہاتی کردار کی زبان سے صاف اور شستہ الفاظ ادا کراتے ہیں جو فنکاری کی بہت بڑی کمزوری مانی جاتی ہے اس ناول کو اودھ کے پس منظر میں لکھا گیا ہے اس لئے اودھ کے دیہاتی کردار اپنی زبان میں باتیں کرتے ہیں جس کی وجہ سے ناول حقیقت کے اور قریب محسوس ہوتا ہے۔ اگرچہ قاری کو اودھی زبان کی ناواقفیت کے بنا پر مفہوم سمجھنے میں دقت محسوس ہوتی ہے مگر اس ناول میں صفحے کے نیچے اس کے معانی بھی لکھے ہوئے ہیں جس کے ذریعہ قاری کو پوری گفتگو کو آسانی سے سمجھ لیتا ہے۔

نقطۂ نظر:

یہاں نکات ابھر کر سامنے آتے ہیں ایک طرف جاگیر دار طبقہ ابھی بھی اپنی روایات کو قائم و دائم رکھنا چاہتا ہے دوسری جانب وہ نچلا طبقہ جو کل تک اس طبقہ کی خدمت گاری پر معمور تھا طبقہ اعلیٰ سے رشتہ داریاں قائم کرنے پر اُتر آیا ہے۔ اس سے زمینداری کے خاتمے سے شدید مسائل پیدا ہونے والی صورت حال سے بہ خوبی واقف ہے۔ اس ناول میں مصنف نے اعلیٰ تخلیق کے فنی شعور کا زبردست شعور دکھائی ہے۔ اور اس نے اس ناول میں بیک وقت تصادم کے رنگوں کو پیش کیا ہے۔ اندھے اور دھندھلے تصورات اور غیر ضروری روایات کو ٹوٹتے بکھرتے دکھایا ہے۔ زمینداری کے خاتمے کے بعد جس طرح سے پریشانیاں اپنا دامن پھیلائے زمینداروں کے گھر میں گھس گئی اس کی خوبصورت عکاسی اس ناول میں نظر آتی ہے۔ اس کے ساتھ

19؎ پہلا اور آخری خط۔ قاضی عبدالستار۔ اسرار کریمی پریس، الہ آباد۔ بار اول 1967ء۔ ص:74

فاضل مصنف نے زمینداروں کی وضع قطع مختلف قسم کے اشواق اور بے جا مصارب پر بھی گہری چوٹ کی ہے۔ جس کی وجہ سے ان کے یہاں گذرے وقت کے شدت کے ساتھ مسائل اٹھ کھڑے ہوئے کیونکہ بدلتے وقت کے ساتھ یہ تعلقہ دار نہ تو خود کو بدل سکے اور نہ ہی انھوں نے اس بات کو گوارا کیا کہ چلتی آرہی روایت کو توڑ کر نئے دور کے ساتھ قدم ملا کر چلے۔ سیر و شکار کا شوق علاقے پر اثر ورسوخ سیاست میں دلچسپی اور نوکروں کی فوج انواح اقسام کے پکوان زمینداروں کے یہاں تہذیب اور زمینداری کی آن بان اور شان کی نشانی سمجھے جاتے تھے۔

غرض اس ناول کا نقطہ نظر صاف اور واضح ہے جس میں قاضی عبدالستار نے ایک ختم ہوتی ہوئی تہذیب ایک دور اور ایک سماج کو آئینہ دکھایا ہے اس ناول میں نہ صرف غریبوں کی حالتِ زار کو بیان کیا گیا ہے بلکہ زمینداروں کی بڑھتی ہوئی پریشانیاں اور ان مفلوک الحال زندگی پر ایک درد آمیز طنز بھی ہے۔ ساتھ ہی ایک زندہ معاشرے کی مرتی ہوئی زندگی کا بہترین نقشہ ہے۔

شب گزیدہ

شب گزیدہ قاضی عبدالستار کا ایک شاہکار ناول ہے۔ جس میں انھوں نے زمینداروں کے آپسی تصادم یعنی بہ طور خاص باپ بیٹے کے درمیان قدامت پسندی اور رجعت پسندی کی جنگ کو نہایت خوبصورت انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ قصّہ گوئی، واقعات نگاری بہترین کرداروں کی معرکہ نگاری کے ساتھ ایک خوبصورت اسلوب میں لکھے گئے اس ناول کے بارے میں قرۃ العین حیدر بھی یہ کہنے پر مجبور ہوگئی کہ:

''نہ صرف یہ کہ قاضی عبدالستار کو کہانی کہنے کا ڈھنگ آتا ہے بلکہ اپنے موضوع اور کرداروں سے اتنی گہری واقفیت بھی کم افسانہ نگاروں کو حاصل ہوگی......

''شب گزیدہ سے بہتر کہانی قاضی عبدالستار ہی لکھ سکتے ہیں۔'' 1ے

قرۃ العین حیدر ایک مایہ ناز ادیبہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ انھوں نے شب گزیدہ کے بارے اتنی بڑی رائے یونہی قائم نہیں کہ ہے۔ بلکہ شب گزیدہ پڑھنے والے ہر قاری کو پڑھتے وقت اور پڑھنے کے بعد بھی اس بات کا احساس ہوتا ہے۔ ڈاکٹر ہارون ایوب ''شب گزیدہ'' کے بارے میں رقم طراز ہیں:

''اس ناول کی اہم ترین خصوصیت یہ ہے کہ ایک خوبصورت نظم کی طرح پڑھنے والے کے دل ودماغ پر چھاتا چلا جاتا ہے۔'' 2ے

''شب گزیدہ'' 1966ء میں ادارہ انیس الٰہ آباد سے شائع ہوا۔ 126 صفحات پر مشتمل یہ ایک بہترین ناول ہے جس میں ایک زمیندار کی سفّاک شخصیت اور اس کے ظلم وستم کو بہترین ڈھنگ سے پیش کیا گیا یہ ناول ایک المیہ ہے جس میں ایک زمیندار باپ اپنے بیٹے کو اپنے ہی ہاتھوں سے زہر آلود مٹھائی کھلا کر قتل کر دیتا ہے کیونکہ وہ زمینداروں کی قدامت پرستی کو پسند نہیں کرتا ہے اور جدید زمانے سے قدم سے قدم ملا کر چلنا چاہتا ہے۔ زمینداروں کے ظلم وستم کا اتنا خطرناک بیان جس میں ایک باپ خود اپنے بیٹے کو اپنے

1ے: قرۃ العین حیدر۔ تبصرہ۔ شب گزیدہ گفتگو شمارہ نمبر 1۔ ص:353

2ے: اردو ناول پریم چند کے بعد۔ ڈاکٹر ہارون ایوب، اُردو پبلیشر تلک مارگ، لکھنؤ 1987 ص 221

ہاتھوں سے قتل کر دیتا ہے اردو میں اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔ کیونکہ زمیندار صرف زمیندار ہوتا ہے۔ وہ نہ تو باپ یا بیٹا ہوتا ہے اور نہ ہی بھائی یا کوئی دوسرے رشتہ کو اہمیت دیتا ہے۔ راشد انور راشد کو دئے گئے انٹرویو میں انھوں نے ''شب گزیدہ'' کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے:

> ''شب گزیدہ میرا دوسرا ناول ہے خالص معاشرتی ناول ہے۔ پہلے ناول میں پوری بات پورا دیہات اور دیہات کے وہ بڑے بڑے کردار جو میں نے دیکھے تھے یا جنھیں میں جانتا تھا وہ نہیں آسکے تھے۔ ''شب گزیدہ'' میں میں نے کوشش کی وہ تمام باتیں آ جائیں جو بحیثیت تخلیق کار مجھے اندر سے بے چین کر رہی تھیں۔ اس ناول میں میں نے زمیندارانہ نظام کے کھوکھلے پن کو نمایاں کیا ہے۔ دنیا کے سب سے ظالم جانور کا نام زمیندار ہے۔ وہ اپنی زمینداری پر اپنی حکومت قائم رکھنے کے لئے اپنے بیٹے، باپ، بھائی کو بھی ذبح کر سکتا ہے۔ اگر اس کو کسی کا ہاتھی یا گھوڑا پسند آ گیا تو اس کے حصول کے لئے گھروں کو اجاڑ سکتا ہے کچھ بھی کر سکتا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ وہ اپنے مذہب کو تبدیل کر سکتا ہے لیکن اپنے ہاتھ سے نظام اقتدار کو نکلتا ہوا نہیں دیکھ سکتا۔ ''شب گزیدہ'' میں میں نے قدیم تصورات کے حامل زمین اور نئی قدروں کے حامل اس کے اکلوتے بیٹے کے ٹکراؤ کی کہانی پیش کی ہے۔''[3]

شب گزیدہ ناول میں اتر پردیش کے ایک علاقے ''جام نگر'' کے زمیندار گھرانے کی زندگی کو پیش کیا گیا ہے۔ ہندوستان کی آزادی اور تقسیم ہند سے قبل جاگیرداروں کی چلتی پھرتی اور حقیقی زندگی کو قاضی عبدالستار نے اس ناول میں نہایت باریکی اور خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ اس ناول کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ محض نو دن کی قلیل مدت میں لکھا گیا۔

اتر پردیش کے علاقہ ''جام نگر'' کے زمیندار جو مرزا صاحب یعنی بڑے سرکار کے نام سے جانے جاتے ہیں اور پورانی وضع قطع کے زمیندار ہیں ان کو اپنی یہ زمینداری اپنی جان اور خون کے رشتے سے بھی عزیز ہے اور اس بات کے لئے بالکل بھی تیار نہیں کہ ان کی زمینداری کا چھوٹے سے بھی چھوٹا حصّہ ضائع ہو ان کا اکلوتا بیٹا جمّی جو لکھنؤ یونیورسٹی سے تعلیم یافتہ ہے اور جدید ذہن کا مالک حالاتِ حاضرہ کا عکاس ہے۔ اسے

3: قاضی عبدالستار اسرار و گفتار۔ گفتگو کی شکل میں سوانح عمری۔ راشد انور راشد۔ عرشیہ پبلی کیشنز، نئی دہلی۔ ص:253

ہندوستان کی بدلتی ہوئی صورت حال کا مکمل اندازہ ہے اور اسے یہ بھی معلوم ہے کہ ہندوستان کی آزادی کے بعد کانگریس حکومت جو سب سے پہلا کام کرے گی وہ یہ ہے کہ زمینداری کا خاتمہ کرے گی جب اپنے باپ سے یہ بات کہتا ہے تو وہ یہ سب کرآگ بگولہ ہوجاتے ہیں اور اسے ڈانٹ کر بھگا دیتے ہیں۔ اقتباس ملاحظہ ہوں:

''ابو یہ بات میں نے اس لئے گوش گذار کی تھی کہ آئے دن اخباروں میں آتا رہتا ہے کہ ہندوستان آزاد ہونے والا ہے اور ہندوستان آزاد ہونے کے بعد کانگریسی حکومت جو کام سب سے پہلے کرے گی وہ یہ کرے گی کہ زمینداری ختم کرے گی۔'' 4

جمی جب اپنے باپ بڑے سرکار سے یہ بات کہتا اور انھیں سمجھا تا ہے کہ بیکار کے شوق اور ساز و سامان کو گھر سے نکال دیا جائے اور آنے والے وقت کا سامنا کرنے کے لئے تیار ہو جائیں تو انھیں اپنے بیٹے پہ حکمت آمیز بات بہت بری لگتی ہے۔ کیونکہ ایک زمیندار جس نے بچپن سے بڑھاپے تک زمیندارانہ آن بان اور شان کے ساتھ عمر گزاری ہو جسے صرف احکام صادر کرنے کی عادت ہو انھیں یہ بات بھی برداشت نہیں ہوگی کہ جس زمینداری کی بدولت انھیں یہ عزت و احترام حاصل ہے اور پورے قصبے اور پورے علاقے پر ان کا حکم چلتا ہو اسے نئے قانون کے مطابق زندگی جینے کے لئے مجبور ہونا پڑے اس شکست خوردہ ذہنیت اور آنے والے وقت سے نظریں چرا کر جینے کے لئے انھوں نے بیٹے کی اس بات کو ٹھکرا دیا اور اس سے نہایت زور سے گرجتے ہوئے کہتے ہیں کہ....

''ابو اتنی زور سے گرجے کہ جمی پریشان ہوگیا۔

''میری زمینداری چٹائی ہے؟ دری ہے؟ جاجم ہے؟ آخر کیا ہے؟ زمینداری ختم ہو جائے گی اور ہم تماشہ دیکھا کریں گے؟ '' 5

غرض ایک رجعت پسند زمیندار جس نے اپنی پوری زندگی زمینداری کو ایک نہ ختم ہونے والی ملکیت سمجھا اور زمیندارانہ شان و شوکت کو زندگی کا حاصل سمجھا اس زمیندار نے حقیقت کا آئینہ دیکھنے کے بجائے اپنے بیٹے کو خود ہی اپنی نظروں سے دور کر دیا۔

4: شب گزیدہ (ناول)۔ قاضی عبدالستار۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڈھ۔ 1988ء۔ ص:111

5: شب گزیدہ (ناول)۔ قاضی عبدالستار۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڈھ۔ 1988ء۔ ص:111

جمی جو اپنے باپ کے بے جا مصارف اور شان وشوکت کو پسند نہیں کرتا ہے گھر میں نوکروں کی فوج اور فالتو کے اخراج کو برداشت نہیں کرتا اور اس نے گھر کے تمام دقیانوسی سامانوں اور بلاضرورت نوکروں غیر اہم چیزوں کو نکال باہر کر دیتا ہے۔ جس کی وجہ سے اس کا باپ نہایت پریشان ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ مختار عام رحمت علی کی بے جا مداخلت کو وہ برداشت نہیں کرتا ہے۔ جمی یہ چاہتا ہے کہ بڑے سرکار دور جدید سے ہم آہنگ ہو کر زندگی گذارے نہ کہ کسی مختار عام کے زیر سائے اپنے فیصلہ کرے۔ مختار عام رحمت علی خاں نہایت چالاک اور لالچی انسان تھا۔ اور پورے علاقے میں رحمت علی خاں کے نام کا ڈنکا بجتا تھا۔ ہاتھیوں کی خرید فروخت سے نوکروں کے بارے میں بھی سارے فیصلے رحمت علی خاں کی ہی مرضی سے انجام پاتے تھے۔ رحمت علی خاں ایک مڈل پاس انسان تھا جام نگر میں آنے کے بعد وہ بڑے سرکار سے ملا اور دھیرے دھیرے بڑے سرکار کو اپنا گرویدہ بنا کر مختار عام بن گیا۔ مختار عام بننے کے بعد اس نے اپنے ظاہری ساز و سامان کے ذریعہ لوگوں پر ایسا رعب جھاڑا کہ خیر آباد کے عباس صاحب نے ہاتھیوں اور بندوقوں کا مالک سمجھ کر اپنی بڑی بیٹی مہرن کی شادی رحمت علی خاں سے رچا دی۔ اب اس مختارِ عام کو ایک اور سنہرا موقعہ میسر آ گیا اور اس نے بڑے سرکار کی عیش پسندانہ طبیعت کو اپنی بیوی کے ذریعہ اور بھی بدمست کر دیا۔ اس طرح سے رحمت علی خاں نے اپنی بیوی کو بڑے سرکار کی داشتہ بنا کر سارے گڑھی میں اپنا حکم چلاتا ہے۔ رحمت علی خاں کے خسر عباس میاں کا انتقال ہوتے ہی اس نے اپنی سالی چندا کو اپنے گھر میں رکھ لیا۔ جب مہرن سے بڑے سرکار کا جی بھر گیا تو اس نے چندا کی چاندی لوٹنے کی کوشش کی۔ اس طرح سے مختارِ عام رحمت علی خاں نے اپنی بیوی اور سالی کو بڑے سرکار کے ہاتھوں میں بیچ کر اپنی لالچی اور مکاری کا ثبوت دیتا ہے۔ قاضی عبدالستار نے خوبصورت انداز سے اس بڑے سرکار کی ہوس پرست ذہنیت کو نشانا بنایا ہے۔ اقتباس

''ایک دن رحمت علی خاں نے سرکار کی دعوت کی۔ لال ریشم میں بیر بہوٹی بنی میرن نے سونے سے بھری روپہلی کلائی سے لوٹا اٹھا کر اس ادا سے ''سرکار'' کے ہاتھ دھلائے کہ ''سرکار'' کی بھوک اڑ گئی.... مہرن لق ودق صحن کے اس طرف صحنی میں بیٹھی پان لگا رہی تھی، سرکار کو آتے دیکھ کر چونکی اور چاہا کہ دوسرے کمرے میں سوتی چندا کو آواز دے مگر آواز حلق میں پھنس کر رہ گئی اور خود سرکار کی باہوں میں پھڑ پھڑا کر رہ گئی۔ چار چھ برس بعد جب مہرن کے بدن کی چاندنی سنولانے لگی اور چندا چودھویں کے چاند کی طرح

چمکنے لگی تو سرکار نے اسے بھی اپنے شیشے میں اتار لیا۔ رفتہ رفتہ میرن اور چندا دونوں کے لئے رحمت علی خاں کی وہی حیثیت ہوگئی جو مشتری جان کے لئے استاد مدّی کی تھی۔'' 6

دونوں عورتوں کو بڑے سرکار کی داشتہ بنا کر اپنا اثر و رسوخ اس قدر مختار عام نے قائم کر لیا جس کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا کہ اصل سرکار رحمت علی خاں ہے۔

جمی مختار عام رحمت علی خاں کی بڑھتی ہوئی طاقت سے بہت خائف ہے اور کسی طرح اپنے باپ کو اس کے اثر و رسوخ سے نکالنا چاہتا ہے۔ مگر ''بڑے سرکار'' کو جنسی ہوس پرستی نے اتنا دیوانہ بنا رکھا ہے کہ وہ کسی بھی بات پر توجہ نہیں کرتے۔ غرض تعلیم مکمل کرنے کے بعد جب جمی گھر میں واپس آتا ہے تو اپنی مرضی سے بہت سی چیزوں میں تبدیلی لاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ رحمت علی خاں کے کسی بھی فیصلے یا حکم کو نہیں مانتا بلکہ نوکروں کے سامنے ان کی بے عزتی کرتا رہتا ہے۔ یہ بات رحمت علی خاں کو برداشت نہیں ہوتی ہے اس لئے وہ چھوٹے سرکار کے خلاف بڑے بڑے سرکار کے کان بھرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اپنے بیٹے کی گڈھی میں بڑھ رہی اہمیت اور عزت سے خوف زدہ ہوجاتے ہیں کیوں کہ سکندر پور کے پھوپھا سے اس کے باپ کے خراب تعلقات ہیں جب کہ جمی اپنے پھوپھی اور پھوپھا سے لگاؤ رکھتا ہے ایک بار جمی شکار کھیلنے جاتا ہے رات ہوجانے پر وہ اپنے پھوپھا کے گھر چلا جاتا ہے۔ جن کی اکلوتی بیٹی زبیدہ سے وہ دل کی گہرائیوں سے محبت کرتا ہے اور اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔

یہ جان کر اسی کے باپ بہت ناراض ہوتے ہیں اور اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہیں۔

جمی علاقے کے ایک بدمعاش جلال چودھری بے ڈھب کی دعوت میں شرکت کرتا ہے راستے میں اس کے اوپر حملہ ہوجاتا ہے جس کی وجہ سے بے ڈھب گرفتار ہوجاتا ہے لیکن جمی کے بیان دینے پر وہ چھوٹ جاتا ہے اور ان سب کے پیچھے رحمت علی خاں کا ہاتھ ہوتا ہے۔

ان تمام واقعات کی وجہ سے رحمت علی خان اور جمی میں ان بن ہوجاتی ہے اس کے علاوہ حویلی میں بہت سی تبدیلیاں لانے کی کوشش کرتا ہے۔ جو بڑے سرکار کو بالکل پسند نہیں آتی ہے۔ ساز و سامان کی تبدیلیوں کو لے کر باپ اور بیٹے میں خوب کہا سنی ہوتی ہے۔ باپ کو لگتا ہے کہ اس کی زمینداری اور سامانوں کا

6: شب گزیدہ (ناول)۔ قاضی عبدالستار۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڈھ۔ 1988ء۔ ص 41

مزاق جمی اٹھا رہا ہے اور اسے دقیانوسی قرار دے رہا ہے۔ جبکہ بڑے سرکار حویلی میں موجود پرانے طرز کے بھی سامانوں کو اپنی تہذیب اور وراثت کی نشانی سمجھتے ہیں ان کے خیال میں ہاتھی رکھنا موٹر رکھنے سے زیادہ شان وشوکت کو ظاہر کرتا ہے بلکہ جمی چاہتا ہے کہ گھر میں جدید آلات اور موٹر گاڑی سواری کے لئے آجائے جس کی دیکھ بھال کرنا ہاتھی کی کفالت شعاری سے آسان ہے۔ جمی کا کہنا ہے۔

''آپ کے پاس تین ہاتھی ہیں۔ ان کا شکار کے علاوہ کوئی مصرف نہیں اور بڑا شکار یہاں ناپید ہے۔ اس لئے میرا خیال ہے کہ ایک ہاتھی شوق کے لئے کافی ہے۔ گھوڑے بارہ ہیں۔ آپ گھوڑے پر سوار نہیں ہوتے۔ اس لئے صرف دو گھوڑے کافی ہونگے۔'' 7

اس طرح جمی نے دوسرے غیر ضروری بیلوں اور جانوروں کو نکالنے کی پیش کش کی اس کے علاوہ گھر میں نوکروں کی جو فوج تھی اس کو کم کرنے کی گزارش کی مگر ان تمام باتوں کو سن کر بڑے سرکار بھڑک گئے۔ کیوں کہ زمینداروں کو ہاتھی، گھوڑے، بیل اور نوکروں کی لمبی فوج پالنا اپنی زمینداری اور آن بان شان کی نشانی سمجھتے تھے۔ انھیں لگتا ہے کہ ان تمام باتوں کو مان لینے پر ان کی وضع داری اور شان میں کمی آجائے گی۔

اسلئے نہایت غصے میں طنز اور تلخی کے ساتھ جمی کو جواب دیتے ہوئے کہتے ہیں۔

''ہاں گڑھی کے اندر جو سبز گھاس کے تختے ہیں انھیں چھیل کر بیچ دیا جائے اور زمین پر گندم بو دیا جائے تا کہ آمدنی میں اضافہ ہو۔ میرے لئے جو پرندے پکتے ہیں انھیں بند کر دیا جائے اور گلیوں سے کتے پکڑ کر ذبح کرا دیئے جائیں۔ لیکن انھیں پکڑنے کون جائے۔ میں پکڑ لاؤں اور پکڑ کر کھالوں۔ اور یہ درختوں کو پانی دینے کے لئے جو ملازم ہیں انھیں برخاست کر دیا جائے اور میرے کندھے پر بہشتی رکھ دی جائے۔ 8

غرض بڑے سرکار نے کو یہ ساری باتیں نہایت ناگوار گذرتی ہیں۔ جب جمی پورانے طرز کے تمام فرنیچر صوفے اور کرسیوں کو بیچ کر اس کی جگہ نئی ڈیزائن کے فرنیچر منگواتا ہے اس کے علاوہ چائے کے پورانے سیٹ کی جگہ نیا منگاتا ہے تو بڑے سرکار کی برہمی دیکھنے سے بنتی ہے۔ کہتے ہیں کہ میں کوئی نو دولتا ہیں ہوں کہ دیوالی کے بھرکوں جیسا سامان رکھوں۔ میرے پاس منوں تو نہیں سیروں چاندی کے برتن موجود ہیں جن کی اہمیت تم نہیں سمجھ سکتے۔ کہتے ہیں:

7: شب گزیدہ (ناول)۔ قاضی عبدالستار۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڈھ۔ 1988ء۔ ص:109

8: شب گزیدہ (ناول)۔ قاضی عبدالستار۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڈھ۔ 1988ء۔ ص:111

''خیر تو ایک موٹر رکھنے کے لئے آپ یہ سارے انتظامات فرما رہے ہیں آپ ابھی صاحبزادے ہیں آپ نے ابھی دیکھا ہی کیا ہے۔ آپ کو شاید علم نہیں کہ ایک ہاتھی رکھنا دو موٹروں کے رکھنے سے زیادہ دشوار ہوتا ہے۔ موٹر پر اس وقت صرف ہوتا ہے جب وہ استعمال ہوتا ہے۔ ڈرائیور کا حال یہ ہے کہ میں نے بڑے، بڑے افسروں کو اپنے ہاتھ سے موٹر ہانکتے دیکھا ہے۔ ایک ہاتھی دس سیر راتب کھائے گا۔ دو چر کٹے ہوں گے، ایک فیلبان ہوگا۔ تو جو شان ہاتھی رکھنے میں ہے موٹر رکھنے میں نہیں ہے۔ جو چاندی کا اگالدان سامنے پڑا ہے اس میں کھانے اور چائے کے بہت نفیس سٹ آسکتے ہیں، یہ جو کرسی پڑی ہے۔ بدوضع اور دقیانوسی بقول آپ کے، اس ایک کرسی میں دفتروں والے گھٹیا فرنیچر سے کمرہ بھرا جاسکتا ہے۔ رہی عیش کی بات تو یہ اس طبقے کی ایجاد ہے امارت میسر نہیں اور جو غربا کی زندگی اور اپنی زندگی میں تفریق بھی دیکھنا چاہتا ہے۔ اس لئے اپنے دیوالئے پن پر پردے ڈالنے کے لئے نئے، نئے ڈھکوسلے ایجاد کرتا ہے۔ آپ موٹر بھی رکھئے۔ فرنیچر بھی خرید لیجئے آج کل کی مٹیا چینی سے دو چار الماریاں بھی بھر لیجئے۔ لیکن اپنے دماغ سے یہ خناس نکال دیجئے کہ مصارف اِس طرح کم ہوسکتے ہیں۔ مصارف اُس طرح کم ہوسکتے ہیں مصارف انھیں کے ہوتے ہیں جن کو خدا مصارف کے لائق بناتا ہے۔ بدھو، خیراتی کے یہاں مصارف نہیں ہوتے۔'' 9

بڑے سرکار کی اس لمبی چوڑی تقریر سے زمیندانہ آن بان شان صاف چھلکتی ہے۔ قاضی عبدالستار نے زمینداروں کی ذہنیت ان کی سوچ اور ان کے غیر ضروری مصارف جنھیں وہ اپنی زندگی کے لئے ضروری سمجھتے تھے۔ ساتھ ہی ان کا مغرور اور انا پرستی کو نہایت باریکی سے پیش کیا ہے۔

باپ اور بیٹے کی بات چیت سے قدیم اور جدید ذہنوں کی کشمکش صاف نظر آتی ہے باپ اپنی پورانی وضع قطع پر قائم رہنا چاہتا ہے جبکہ بیٹا نئے زمانے کے ساتھ چلنا چاہتا ہے۔

اس کے علاوہ بڑے سرکار جمی کی بڑھتی ہوئی مقبولیت سے بہت خائف تھے۔ انھیں یہ بات برداشت نہیں ہو رہی تھی کہ ان کا بیٹا ان کے کسی بھی کام میں ہاتھ ڈالے اور گڑھی کے لوگ مجھ سے زیادہ اس کو توجہ دیں۔ اس لئے میرن اور چندا کے کہنے پر اس کی شادی کے کرنے کے بارے میں سوچتے ہیں۔ اس کے علاوہ

9: شب گزیدہ (ناول)۔ قاضی عبدالستار۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڈھ۔ 1988ء۔ ص: 110

یہ جانتے ہوئے کہ جمی اپنی پھوپھی کی بیٹی زبیدہ سے چاہت رکھتا ہے اس کے علاوہ سکندر پور کے انور صاحب سے اس کے اچھے تعلقات ہیں ان سب واقعات کی وجہ سے وہ نہایت پریشان ہوجاتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ ان کی ساری حکومت اور دولت کو جمی اپنے نام کرنا چاہتا ہے۔ بڑے سرکار یہ بات بھول جاتے ہیں کہ جمی ان کا اکلوتا بیٹا ہے اور ساری دولت کا تنہا وارث ہے۔

بڑے سرکار کو محسوس ہوتا ہے کہ جمی کو سارے زمینوں کا مالک بنا دینے پر ان کی کوئی حیثیت نہیں باقی رہے گی۔ان کے لاشعور میں ایسے خیالات آتے ہیں۔اقتباس:

> ''وہ چیخ چیخ کر سپاہیوں کو پکارتے رہے لیکن کسی کے کان پر جوں نہ رینگی پھر بجلی چمکی اور سارے میں فانوس جل اٹھے۔انھوں نے اس روشنی کو دیکھا کہ نوبت خانے کے میدان میں شامیانہ لگا ہے اس کے وسط میں گنگا جمنی نمگیرہ کھڑا ہے۔اس پر جمی راجاؤں کی طرح نیم دراز ہے اور سارا جلسہ اس کے گرد لگا ہے۔سب اس کی ایک نگاہ کے محتاج ہیں۔جمی جوان کے پیٹ پر سوتا تھا جوان کی پیٹھ پر سواری کرتا تھا۔وہ جمی آج انھیں معطل کر کے ہر اس چیز پر قابض ہوگیا جس پر ان کی اور صرف ان کی حکومت ہے۔'' 10

اس اقتباس میں قاضی عبدالستار نے زمینداروں کی ذہنیت کا مکمل نقشہ کھینچا ہے جس سے صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ زمیندار ایک ایسی قوم ہے جس کو کسی اگر چہ وہ اس کا اپنا بیٹا ہی کیوں نہ ہوں اپنی حکومت اور سیاست میں کسی کی مداخلت برداشت نہیں وہ اپنے جیتے جی کبھی یہ نہیں چاہے گا کہ اس کے مال و دولت پر کسی اور کا قبضہ ہوجائے۔

جمی پر اپنی گرفت مضبوط کرنے اور اس کو کھنڈی میں باندھنے کی کوشش مہرن چندا اور رحمت علی کی طرف سے کی جاتی ہے۔ کیوں کہ جمی نے رحمت علی کو حکم دیتے ہوئے کہا کہ سارے اوزار اور ہتھیار گھر میں لاکر رکھ دئے جائیں اور جس کھیت میں خاں صاحب نے قلمی درخت لگوائے تھے ان سبھی کو راتوں رات کاٹنے کا حکم ہوتا ہے اور جمی کے کہنے کے مطابق سارے درخت کاٹ دئے جاتے ہیں اور اس کی جگہ پر صاف میدان بنا دیے۔

غرض اس ناول میں ضعیف اعتقادی کے بل بوتے بھی کام کرنے کے کئی واقعات نظر آتے ہیں جن

10: شب گزیدہ (ناول)۔قاضی عبدالستار۔ایجوکیشنل بک ہاؤس،علی گڈھ۔1988ء۔ص:170

میں مولوی صاحب کا ذکر خاص انداز میں کیا گیا ہے۔

مولوی صاحب کا تمسخر بھرے انداز میں ذکر کرنا اور مولوی صاحب کے ذریعہ غریب اور کمزور عورتوں کا جنسی استحصال کرنے پر طنز بھرے انداز میں بیان ملتا ہے۔ اور اسی مولوی صاحب کے ذریعہ چندا جو بڑے سرکار کی رکھیل ہے چھوٹے سرکار تک پہونچنا چاہتی ہے۔

مگر مولوی صاحب نے نہایت چالا کی اور ہوشیاری سے چندا کو اپنی باتوں میں پھنسا لیتے ہیں اور ایک رات اپنے گھر بلا کر اس کے ساتھ زبردستی کرتے ہیں۔

گاؤں اور دیہات میں ضعف اعتقادی اور توہم پرستی کی کئی مثالیں دیکھنے کو ملتی ہیں اکثر جناتوں والی مسجد اور خطرناک کنوؤں کے نام سے قصبات میں کچھ ایسی مخصوص جگہیں ہوتی ہیں جہاں رات بیرات کوئی جانا پسند نہیں کرتا ہے اور کسی کے اندر اتنی ہمت نہیں ہوتی ہے کہ کوئی وہاں تنہا جائے۔ ''شب گزیدہ'' میں ایسے ہی چند واقعات کا ذکر ہے جن میں جناتوں والی مسجد جو قلعے والی مسجد کے نام سے جانی جاتی ہے اس کے بارے میں مشہور ہے کہ وہاں پر رات کو جناتوں کی نماز ہوتی ہے۔ اس ناول جمی کے خالہ کا بیٹا اختر بھائی جو پڑھے لکھے اور تعلیم یافتہ نوجوان ہیں اور گاندھائی تحریک سے کافی متاثر ہیں جن کے نام کا گرفتاری وارنٹ جاری ہے جمی کے گھر آ کر رہتے ہیں قلعے والی مسجد کے بارے میں سن کر وہاں اکیلے جانے کا فیصلہ کرتے ہیں مگر رات کے وقت جب وہ وہاں جا رہے ہوتے ہیں تو پیچھے سے رام سنگھ جو ایک نوکر ہے جمی کے کہنے پر وہ بھی چپکے سے پیچھے سے آتا ہے اسے دیکھ کر خوف زدہ ہو جاتے ہیں مگر تصدیق ہونے پر مسجد کے اندر چلے جاتے ہیں وہاں جا کر دیکھتے ہیں کہ ایک گھوڑا بندھا ہوا ہے اور کوئی آدمی نماز پڑھ رہا ہے۔ اختر بھائی نے اسے سلام کیا اور خود بھی نماز کی نیت باندھ لی جیسے ہی وہ سجدے میں جاتے ہیں وہ آدمی اٹھ کر تیزی سے بھاگ جاتا ہے۔ بعد میں پتہ چلتا ہے کہ وہ گاؤں کا داروغہ ہوتا ہے۔

قاضی عبدالستار نے گاؤں میں موجود ضعیف اعتقادی اور توہم پرستی کا ذکر کر کے اور واقعات کی تفصیلات نہایت خوبصورت انداز میں بیان کی ہے جس کو پڑھتے ہوئے تجسس اور کرید کی کیفیت آتی ہے۔

غرض میں قصبات کے اس طرح کے مشہور واقعات جن کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی ہے۔ غلط ثابت ہوتے ہیں۔

بہرکیف اس ناول میں مصنف نے جاگیردارانہ سماج کی بھرپور عکاسی کی ہےاوران تمام کمزوریوں کو منظرعام پر لانے کی کوشش کی گئی ہے۔ جو جاگیردارانہ سماج کے زوال کا باعث ہیں۔ جاگیردارانہ سماج کا زوال ہمیں صرف تقسیم ہند کے پیش نظر کی وجہ سے نہیں چاہئے بلکہ اس کے پیچھے وہ سماجی حالات بھی کارفرما ہیں جو اس معاشرے میں عرصہ دراز سے راج ہیں۔عیش پرستی قدامت پرستی بے جا مصارف عیش بازی، شراب نوشی جنسی بدفعالی غرض ایسی لاتعداد برائیاں اور عادتیں جو زمینداروں کے لئے عام بات تھی اس ناول میں ان سب کا خاص الا خاص ذکر نظر آتا ہے جو ایک زوال پذیر معاشرے کے لئے معاون ثابت ہوتی ہیں۔

شب گزیدہ میں ایک مکمل ناول کی تمام خوبیاں موجود ہیں ہم جب اس کو فنی کسوٹی پر کستے ہیں تو اس ناول کی تمام فنی خصوصیات کھل کر سامنے آتی ہیں۔

قصہ گوئی:

قصہ پن یہ قصہ گوئی کسی بھی فن پارے کے لئے ضروری قرار دیا جاتا ہےاس ناول میں قصہ پن اپنے تمام تر جلوہ کاریوں کے ساتھ موجود ہے کیوں کہ ایک قاری کی دل چسپی کسی فن پارے میں اسی وقت تک موجود ہوگی جب اس میں ایک کامیاب اور دل چپ قصہ بیان کیا گیا ہو۔قاضی عبدالستار نے اس ناول میں جس طرح سے زمیندارانہ نظام کے تمام پہلوؤں اور زمینداروں کی زندگی کے تمام نشیب وفراز کا ذکر کیا ہے وہ ایک بہترین قصہ نگاری کی علامت ہے۔اس ناول میں شروعات سے لے کر ضمنی واقعات کے ساتھ تصادم پھر انجام ہوتا ہے جس کی وجہ سے قاری کی دل چسپی ہم وقت ناول کے مطالعے پر بنی رہتی ہےاور جب ناول ختم ہوجاتا ہےتو اس کے دیرپا اثرات سے خود کو محظوظ کرتا رہتا ہے۔اس ناول کا آغاز جس طرح سے منظر نگاری اور بادشاہ بیگ جو 1857ء کی جنگ آزادی میں انگریزوں سے لوہا لے چکے تھے قاری کو فوراً اپنی گرفت میں لے لیتا ہےاس کے بعد کئی واقعات سامنے آتے جاتے ہیں اس ناول کی خاص بات یہ ہےاس میں کسی کسان یا مزدور کی مظلومیت پر آنسو نہیں بہائے گئے ہیں بلکہ ایک جاگیردار اور زمیندار گھرانے کی کہانی بیان کی گئی ہے جس میں باپ بیٹے کے بیچ تصادم مختلف رنگ اختیار کرتا ہے۔ساتھ ہی باپ بیٹے کے بیچ قدیم وجدید ذہنوں کے کشمکش کے متعدد روپ بیان کئے گئے ہیں۔کس طرح بدلتے ہوئے دور میں ذہنوں میں

تفاوت پیدا ہوتا ہے۔زمیندار کس طرح اپنی روش سے ہٹنا پسند نہیں کرتے۔ بلکہ اپنی پرانی تہذیب وضع قطع، چال ڈھال، طور طریقے، رہن سہن غرض کہ پرانے طور وطریقے پر قائم رہنا چاہتے ہیں اور جدید اذہان کا کوئی بھی مشورہ انھیں قابلِ قبول نہیں۔ وہ اپنی نوابی اور زمیندارانہ آن بان اور شان وشوکت کو قائم رکھنا چاہتے ہیں جن کا جدید ذہن تقاضا نہیں کرتا۔ چھوٹے سرکار یعنی جمی جدید ذہن کا قائل ہے وہ گھوڑے ہاتھی اور دوسرانی پرانی چیزوں کے بدلے جدید مشینی آلات کو گھر میں لانا چاہتا ہے مگر ایک زمیندار کو جو شان ہاتھی رکھنے میں محسوس ہوتی ہے وہ موٹر Motar رکھنے میں نظر نہیں آتی۔ غرض بڑے سرکار کا خاصی اور پسندیدہ کام نوکروں کی فوج رکھنا اور ان پر احکام صادر کرنا ہے مگر جمی ان صرف سے قطع نظر ریاست کے کاموں میں دل چسپی ہے جس کے چلتے اس نے سیتا پور میں اسکول سر کھر میں مدرسہ اور نیم سار میں دھرم شالہ بنوایا۔ اس کے علاوہ وہ قومی یکجہتی میں مکمل یقین رکھتا ہے۔ ناول میں روپا نام کی لڑکی کے اغوا ہونے پر اس کو ڈھونڈ نکالتا ہے اور اس طرح سے ہندو مسلم فساد ہونے سے گاؤں کی حفاظت کرتا ہے گڑھی کے انتظامات میں ہندو اور مسلم دونوں کو برابر کا حق دیتا ہے اور دونوں کو کام پر لگاتا ہے۔ ٹھاکر اور بڑے سرکار کے ادھے کی لیکھ نہ بدلنے کے واقعہ میں بھی وہ دونوں کی مدد کرتا ہے۔ اور انگریز کمشنر Commisner کی حکمت عملی سے دونوں کا راستہ نکال دیتا ہے۔

''شب گزیدہ'' کے فنی محاسن کا ذکر کرتے ہوئے قمر رئیس لکھتے ہیں:

> ''قاضی عبدالستار جانتے ہیں کہ ناول زندگی کی عکاسی کا نہیں بلکہ اس کی فلسفیانہ تعبیر اور تخلیقی تعبیر کا نام ہے ....قاضی عبدالستار ناولوں کو قصے کی حیثیت سے دل چسپ بنانے کا گر جانتے ہیں، ان کی تخلیقی قوت ہر کردار کو روشن انفرادی پیکر بخشتی ہے اودھی بولی کے استعمال سے بھی انھوں نے اپنے کرداروں میں ارضیت اور زندگی کی روح پھونکی ہے۔''
>
> 11؎

''شب گزیدہ'' کا قصہ ایک دوسرے سے منسلک اور جاندار ہے۔ ناول میں قاری کی دل چسپی آغاز تا انجام تک بنی رہتی ہے دوسری خاص اودھ کے آس پاس کے مناظر کو خوبصورتی کے ساتھ پیوست کرنے کی کوشش کی گئی اودھی بولی کے ذریعہ قصہ میں حقیقی رنگ نظر آتا ہے۔ جاگیردارانہ سماج ایک ایسا سماج تھا جو

11؎: تلاش وتوازن۔ ڈاکٹر قمر رئیس۔ ادارہ خدام پبلیکیشنز،۔ 1968ء۔ ص:63

اپنے ظلم وزیادتی کے لئے مشہور تھا اس سماج اور معاشرے کی خاندانی اور گھریلو زندگی کو قاضی عبدالستار نے اتنے قریب سے دیکھا اور پیش کیا ہے کہ طبقہ اپنی تمام خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ سامنے آجاتا ہے۔ اس کے علاوہ اس ناول میں کچھ مکار، لالچی اور خود پرست لوگوں کی داستان بھی سامنے نظر آتی ہے جس میں رحمت علی خاں دولت کے لالچ کے لئے اپنی بیوی اور سالی اور بڑے سرکار کے آگے گروی رکھ دیتا ہے۔ زمیندارانہ ذہنیت کی خوبصورت مثال اس ناول میں نظر آتی ہے۔ جو ہر کسی کی بیوی اور بیٹی کو مالِ غنیمت سمجھتا ہے۔

پلاٹ:

کسی بھی کہانی کو بیان کرنے میں اس کے قصہ یا واقعے کو سلسلے وار بیان کرنے کی ترتیب کو پلاٹ کہا جاتا ہے۔ مربوط اور منظّم پلاٹ کسی بھی ناول کی فنی خوبی گردانا جاتا ہے وہی کمزور اور بے ترتیب پلاٹ کو فنی محاسن کے لئے خراب تصور کیا جاتا ہے۔ اس ناول کے پلاٹ نہایت مضبوط منظّم اور مربوط ہیں کہیں بھی پیچیدگی اور ژولیدگی نظر نہیں آتی ہے۔ اس لئے قاری کو پڑھنے اور ناول سمجھنے میں آسانی ہو جاتی ہے۔ ہارون ایوب صاحب ''شب گزیدہ'' پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''شب گزیدہ کی کہانی مربوط ہے اور واقعات کچھ اس ترتیب سے پیش آتے ہیں کہ اس کے غیر فطری ہونے کا احساس نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ جنسی موضوعات پر ناول نگار نے بے باکی سے قلم اٹھایا ہے۔ لیکن لذبیت کا شائبہ تک نہیں ابھر سکا ہے جو کہنا چاہتے ہیں وہ بڑی روانی سے کہہ جاتے ہیں۔''[12]

''شب گزیدہ'' کے واقعات کسی بھی دیہات وقصبات میں پیش آنے والے حقیقی زندگی کے واقعات محسوس ہوتے ہیں۔ اودھ کے منظر نامے کے تحت لکھا ہوا یہ ناول جہاں ہندو مسلم باہمی ہم آہنگی اور ملت کے ساتھ رہتے ہیں ویسے عام لوگوں کے اندر ہندو مسلم دوشمنی کا کوئی شائبہ نہیں ہے بلکہ دو زمینداروں اور جاگیر داروں کے بیچ جو تصادم اکثر و بیشتر دیکھنے میں آتا ہے وہ سب کچھ اس ناول میں موجود ہے۔ ایک کے بعد دوسرے واقعات اپنی فطری ربط کے ساتھ موجود ہیں۔ قاضی عبدالستار کی اسی فنی خوبی اور سہراتے ہوئے شمس الرحمٰن فاروقی رقم طراز ہیں:

> ''قاضی عبدالستار کی سب سے بڑی قوت ان کی حاضراتی Evocatite صلاحیت ہے

12: اردو ناول پریم چند کے بعد۔ ڈاکٹر ہارون ایوب۔ اُردو پبلیشرز تلک مارگ لکھنؤ۔ 1987ء۔ ص: 229

جوایک دوجملوں میں کسی مکمل صورتِ حال کوزندہ کردیتی ہے۔'' 13ؔ

فاروقی کی یہ بات قاضی عبدالستار کے فنی محاسن کے لحاظ سے بالکل درست نظرآتی ہے۔مصنف کی خاص خوبی یہ ہے کہ انھیں ہم وقت یہ معلوم رہتاہے کہ کون ساواقعہ کب اورکس طرح بیان کرناہے۔

قاضی عبدالستار کی واقعاتی فنی خوبی کوبروء کارلاتے ہوئے ڈاکٹراسلم آزادلکھتے ہیں:

''شب گزیدہ کے واقعات میں گہرارابطہ اورمضبوط تنظیم ہے۔کبھی کبھی جزئیات نگاری کے ذریعہ اُنھوں نے واقعوں کوآپس میں اس طرح مربوط کیا ہے کہ ان کی فنکارانہ ہوشمندی کی داددینی پڑتی ہے۔'' 14ؔ

''شب گزیدہ''میں واقعہ نگاری کا پختہ اوربالیدہ شعورمرکزی قصہ کواس طرح مصنف نے بیان کیا ہے کہ مرکزی واقعہ سے نظرنہیں ہٹتی ہے۔جاگیردارباپ اوربیٹے کے آپسی تصادم کے بعدجب بڑے سرکارکو اپنی زمینداری کی نیوہلتی ہوئی محسوس ہوتی ہےتواپناغصہ کھانے پراتارتے ہیں۔اس واقعہ کومصنف نے بہت خوبصورتی اورفنکاری کے ساتھ بیان کیاہے:

''مستان نے کے داہنے ہاتھ کی آستین الٹ دی۔ایک خدمت گارنے قورسے کے ڈونگے کا ڈھکنا اٹھایا،بڑے سرکارکاہاتھ ڈونگے تک پہنچ کررک گیا۔ان کے چہرے پر انقباض رونماہوا۔''

''باورچی کوبلاؤ''

دسترخوان کی مرغن فضاسوچ سے بوجھل ہوگئی۔باورچی ستون کے پاس آکرکھڑاہوگیا۔

بڑے سرکارنے ڈونگے کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ قورمہ پکایاہے.....یاجولاہوں کاکلیہ''

'میں پوچھتاہوں.....یہ شورباہے...یادھون ہے....کیاہے'' ؟

''سرکارہانڈی توگھی مسالے کی ہوتی ہے''۔

''توسالے کیاگھی مسالے جرمن سےلڑائی لڑنے،چلاگیا''؟

''سرکارآدھ سیری گھی کی ہانڈی اورہوتی ہے...پوسیری کی اور''۔

13ؔ:فاروقی کےتبصرے۔شمس الرحمٰن فاروقی۔شب خون کتاب گھرالہ آباد،جون1968ء۔ص:89

14ؔ:اردوناول آزادی کے بعدڈاکٹراسلم آزاد،نکھارپبلیکیشنزمئو،ص1981ء۔ص:280

''کان کھول کرسن لے کہ کل سے اگر میرے سامنے یہ کتے کا رانب آیا تو تجھ کو ذبح کر کے ہانڈی اتروادوں گا''۔ 15؎

اس واقعہ میں جس طرح زمیندارانہ ذہنیت کی عکاسی کی گئی ہے اس کی مثال اردو ادب میں مشکل سے ملے گی کیونکہ ایک زمیندار جب دستر خوان پر بیٹھتا ہے تو اس کے آگے اس کی پسند اور من مرضی کا کھانا موجود نہ ہوں تو اس کا پارا ساتویں آسمان پر پہونچ جاتا ہے۔ کھانے کے بھرے ہوئے برتنوں کو پھینکنا کچھ زمینداروں کے لئے عام بات تھی۔ زمینداروں کی داخلی اور خارجی زندگی کے ان چھوئے پہلوؤں پر قاضی صاحب نے نہایت باریکی سے نظر ڈالی ہے۔

عیاشی، بدمستی اور جنسی لذت پرستی زمینداروں کے مزاج میں پیوست تھی۔ ناچ گانے اور مجرا کرنے والی مراشنوں سے خاص روابط ہوا کرتے تھے۔ کسی چالاک اور لالچی انسان کے لئے یہ کافی آسان ہوا کرتا تھا کہ وہ شراب جنسی ہوس پرستی کا لالچ دے کر کسی زمیندار کا خاص بن جائے۔ اس ناول میں ایسا واقعہ کئی جگہ بیان کیا گیا ہے جن میں زمینداروں کی عیاشی کو قراری چوٹ ملتی ہے۔ رحمت علی خاں نے جس طرح اپنی بیوی اور سالی اور بڑے سرکار کا مہرہ بنا کر گڑھی میں ایک اونچی حیثیت حاصل کر لیتا ہے۔

اس کے علاوہ بڑے سرکار کی نیت شبونام کی ایک دوسری نوجوان لڑکی پر بھی ڈولتی رہتی ہے۔ اس ناول کا ایک کردار گلشن بوا زمینداروں کی ذہنیت پر اس طرح طنز کرتی ہیں:

''ارے برابر کا لڑکا گھر میں ہے اس لئے گھر کے اندر نہیں کرتے، نہیں تو محلے ٹولے کی کون شکل صورت کی عورت چھوڑی ہے۔ جب تک پلنگ پر دو عورتیں نہ ہوں وہ سوئے نہیں ہم لوگ تو مٹی کی ہانڈی ہیں۔ ایک میلی ہوئی دوسری منگالی گئی۔'' 16؎

غرض ''شب گزیدہ'' کا پلاٹ نہایت مربوط ہے جس میں واقعات کی ترتیب و تنظیم کی خوبصورت مثال نظر آتی ہے کچھ واقعہ ایسے بھی ہیں کہ شروع کرتے وقت سمجھ میں نہیں آتے کہ یہ کہاں اور کیسا واقعہ بیان کیا جا رہا ہے مگر آگے کے مطالعہ سے واقعہ کا منظر صاف ہو جاتا ہے اور پچھلے واقعہ سے جا کر منسلک ہوتا ہے۔

''شب گزیدہ'' کے واقعات اور کردار کے بارے میں فاروقی صاحب رقم طراز ہیں:

15؎ شب گزیدہ (ناول)۔ قاضی عبدالستار۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڈھ۔ 1988ء۔ ص:167

16؎ شب گزیدہ (ناول)۔ قاضی عبدالستار۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڈھ۔ 1988ء۔ ص:57

> ''شب گزیدہ'' کا بنیادی تاثر کسی مختصر نظم کی طرح پڑھنے والے پر چھا جاتا ہے پڑھنے کے بعد کہانی کے کردار اور واقعات حافظہ سے محو ہو جاتے ہیں۔لیکن پڑھتے وقت بے چارگی آنے والے طوفان کی نشان دہی کرتے ہوئے منڈلاتے بادل اور کہانی کے کراروں کی بے خبری اور الم ناک بے حسی کی جو کیفیت پہلے صفحے سے شروع ہوتی ہے آخر تک قائم رہتا ہے۔
>
> اور آخر تک چڑھتی ہوئی ندی کی طرح بڑھتی اور پھیلتی رہتی ہے، کتاب ختم کرنے کے بعد بہت دیر تک قائم رہتی ہے۔ 17

شب گزیدہ میں جتنے کردار بیان کئے گئے ہیں سبھی ناول کے بیانیہ میں اہمیت کے حامل ہیں ایک پورے عہد میں جس طرح سے زندہ اور جیتے جاگتے کردار پائے جاتے ہیں وہ سب اس ناول میں موجود ہیں۔زمیندارانہ عہد میں زمین کے مالک زمیندار کس رعب و دبدبے کا آدمی ہوتا تھا اس کی بھرپور عکاسی بڑے سرکار کے اندر دکھائی دیتی ہے۔

بڑے سرکار کے کردار کو مختلف زاویہ نظر سے دیکھا جا سکتا ہے۔اور ناول میں ان کی اہمیت اور ان کی ضرورت پر بحث کی جائے گی کس طرح سے قاضی صاحب نے ان کے کردار کو تراشا ہے اور ان کے کردار کے منفی اور مثبت باتوں کو قاری کے سامنے من وعن قبول کر کے اسے ایک لافانی کردار بنا دیا ہے۔

بڑے سرکار کے کردار کو دیکھ کر کوئی ادب کا قاری ان کی باریک بینی اور ان کے حقیقی اور رسمی پیش کش کو نشانہ نہیں بنا سکتا ہے کیونکہ قاضی عبدالستار کے اوپر یہ الزام عائد کیا جاتا رہا ہے کہ انھوں نے زمینداروں کی طرف داری بیان کی ہے ان کے کردار کے ظالمانہ اور جابرانہ رویوں پر کھل کر بحث نہیں کی ہے اور نہ ہی ان عیش پرستانہ زندگی کو بے باک ہو کر بیان کیا ہے مگر اس ناول سے قاضی عبدالستار پر لگے تمام الزامات غلط ثابت ہو سکتے ہیں۔

کردار نگاری:

کسی بھی واقعہ یا قصہ کے لئے راوی یا کردار کا ہونا ضروری خیال کیا جاتا ہے۔اس لئے کردار کی اہمیت ہر تخلیق میں ناگریز ہے۔''شب گزیدہ'' کردار نگاری کے حوالے سے ایک بہترین ناول ہے بلکہ یہ کہا

17: فاروقی کے تبصرے۔شمس الرحمٰن فاروقی۔شب خون کتاب گھر الہ آباد، جون 1968ء۔ص:89

جائے تو کردار ہی کے ذریعہ اس ناول میں تصادم کی کیفیت ملتی ہے اس تصادم کی خاص بات یہ ہے کہ کردار بھی بالکل حقیقی خونی رشتے باپ اور بیٹے کا ہے۔ دونوں زمیندار اور جاگیردار ہیں اس لئے تصادم کی یہ کیفیت زیادہ دل چسپ ہو جاتی ہے۔

ناول ''شب گزیدہ'' میں متعدد کردار ہیں بڑے سرکار مرزا صاحب ان کا اکلوتا بیٹا جمی چھوٹے سرکار، مختار عام رحمت علی خاں، رحمت علی خان کی بیوی مہرن سالی جنید انور پھوپھا، پھوپھی اور ان کی بیٹی زبیدہ اس کے علاوہ مولوی صاحب بڑے سرکار کے نوکر وغیرہ۔

بڑے سرکار مرزا صاحب جام نگر کے زمیندار ہیں یہ کردار ناول کے آغاء میں ہی سامنے آتا ہے اور ناول کے خاتمہ تک موجود رہتا ہے۔ بڑے سرکار کا کردار قدامت پسند اور زمینداروں کی آن بان شان کی عمدہ مثال ہے۔ جنسی شوق بے جا مصارف ہاتھی، گھوڑے اور بیلوں کو بلا ضرورت پالنا ہے اس کے علاوہ ہوس پرستی بھی ان کے اندر موجود ہے۔ ظالم و جابر انسان جو نوکروں پر ترس نہ کرنے بیوی کو دوئم درجہ دینے دوسری عورتوں سے تعلقات بنانے کا رسیا یہ کردار اپنی گندی ذہنیت اور کچے کان کا انسان ہے۔ جو ایک غیر آدمی کو صرف جنسی ہوس پرستی کے لئے اپنے بیٹے سے زیادہ اہمیت دیتا ہے اور اسے مختار عام بنا دیتا ہے اور اس کی ہر ایک جھوٹی اور سچی باتوں پر یقین کرتا ہے۔ بڑے سرکار کے سارے عمل مختار عام کے کہنے کے مطابق ہوئے ہیں۔ اسے اپنی بہن بیوی اور بیٹے پر یقین نہیں ہے بلکہ مختار عام کی بات مان کر تمام عمل کرتا ہے۔ پرانی وضع پر قائم رہنا بے جا مصارف کرنا غیر ضروری کاموں میں دخل دینا ظالم اور جابر کردار ہے بیٹے کی بڑھتی مقبولیت کو دیکھ کر خوف زدہ ہو جاتا ہے اور اسے راستے سے ہٹانے کے لئے زہریلی مٹھائی دے کر موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی شب گزیدہ کے کرداروں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> ''قاضی عبدالستار کی سب سے بڑی کم زوری ان کے کردار ہیں۔ بڑے حضور سے لے کر جمی (ہیرو) تک کوئی کردار متحرک یا سہ سمتی نہیں سب کے سب کسی تصویر رسالے سے کاٹ کر کاپی پر چپکائی ہوئی تصویر معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن جو چیز ان کو سنبھالے رہتی ہے وہ کہانی کا ڈرامائی ماحول ہے سارے کرداروں پر المیہ کی نیم تاریک دھند چھائی ہوئی ہے۔ وہ ٹٹولتے ہوئے راہ چلتے ہیں لیکن ان کا انجام تاریکی منطق کی سنگ دلی اور بے

> پروائی کے ساتھ بے لگام گھوڑے کی طرح دوڑتا ہوا ان سے ٹکرانے چلا آتا ہے اور جب کہانی ختم ہوتی ہے تو محسوس ہوتا ہے کہ وہ تو پہلے ہی صفحے پر ختم ہوگئی تھی۔ یہ ناگزیریت ''شب گزیدہ'' کا طرۂ امتیاز ہے۔'' 18؎

شمس الرحمٰن فاروقی نے اپنے تبصرے کے شروعات میں جس طرح سے اس ناول کے کرداروں کو تصویر یا غیر متحرک بتایا ہے وہ کس حد تک درست ہے اس کا فیصلہ تو دانشور حضرات کرینگے۔ مگر یہ بات مکمل طور پر ہضم نہیں ہوتی ہے کہ کیا کردار کے ذریعہ ناول مکمل ہوتا ہے یا ناول کے واقعات کرداروں کو بناتے اور بگاڑتے ہیں۔ اس ناول میں جتنے بھی کرادر موجود ہیں سبھی ایک اسٹیج پر چھپے ڈرامہ کی طرح آتے ہیں اور اپنے حصے کا کام کر کے چلے جاتے ہیں تو پھر یہ کردار غیر متحرک کیسے ثابت کر سکتے ہیں دوسرے بات یہ ہے کہ یہ ناول جس طرح سے زمیندانہ زندگی کا عکاس ہے اور خود فاروقی نے یہ بات لکھی ہے کہ اودھ کے مسلمان جاگیر دار طبقہ کے انحطاط اور ذہنی زوال کا جتنا اچھا اور سچا مطالعہ قاضی عبدالستار کا ہے اس کی مثال اردو میں نہیں ملتی تو یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک دور کو بیان کرتے ہوئے اس وقت اور ماحول کے کردار کو نہ پیش کرتے ہوئے اپنی مرضی سے اکیسوی صدی کے کردار کو ناول میں زبردستی ڈھکیل دیا جائے۔

جب کہ ''شب گزیدہ'' میں جمی اور اختر بھائی کا کردار بدلتے وقت کے تناظر میں نئی سوچ اور نئے ذہن کا حامل ہے جو اپنے زمیندار باپ کو قدامت پرستی سے روکنا چاہتا ہے۔ مگر حقیقی زندگی میں سچے اور پکے نہ لوٹنے والے انسان ہوتے ہیں وہ کبھی بھی اپنے اصولوں کو توڑنا پسند نہیں کرتے چاہے اس کے لئے خود کی جان دینی یا کسی کی لینی پڑے چہ جائیکہ یہ زمیندار جس نے اپنی پشتینی نشانی ''پیتل کے گھنٹے کو بیچ کر اپنی تہذیب وثقافت مہمان کی خطر مدارت کی لاج رکھ لی۔ اسی اصول کے چلتے باپ نے اپنے اکلوتے بیٹے کو زہر آلود مٹھائی کھلا کر قتل کر دیا مگر اپنے اصولوں سے سمجھوتہ نہیں کیا۔

بہر حال اس ناول میں بڑے سرکار کے کردار میں وہ تمام خوبیاں اور خامیاں موجود ہین یہ کردار ظالم و جابر زمیندار ہے جو اپنی زمین جائیداد کے لئے کسی بھی رشتے کو اہمیت نہیں دیتا ہے اور ہمیشہ اس رتبے پر بنے رہنا چاہتا ہے۔ زمیندارانہ تصادم کے چلتے اپنی بہن کے گھر آنا جانا نہیں ہے۔ ساتھ ہی ان کے سالے صاحب سے بھی آپس میں دشمنی ہے۔ زمیندارانہ ذہنیت نہ صرف بہن کے رشتے میں دکھائی دیتی ہے بلکہ اپنی

18؎ فاروقی کے تبصرے۔ شمس الرحمٰن فاروقی۔ شب خون کتاب گھر الہ آباد، جون 1968ء۔ ص: 90

بیوی سے بھی بڑے سرکار کے تعلقات اچھے نہیں ہیں۔

زمینداروں کی ایک عجیب ذہنیت ہوا کرتی تھی یہ اپنے گھر کی مستورات کو گھر کے اندر تمام طرح کے حقوق دے رکھے تھے مگر انھیں باہری کاموں حکومت اور زمین جائیداد کے کاموں سے لاتعلق رکھا جاتا تھا انھیں صرف گھر کی رانی مہارانی اور سیٹھانی کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا مگر گھر کے اندر یہ تمام القاب وآداب استعمال ہوتے تھے۔ اسی رعب وروایت کے چلتے بڑے سرکار بھی اپنی بیوی کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے اور دوسری طرف قاضی عبدالستار نے بڑے سرکار کی طرف سے اپنی بیوی کی طرف سے بدظن اور لاتعلق رہنے کی ایک وجہ راحت علی خاں کے سیاسی اور سماجی چالوں سے بھی دکھایا ہے۔ رحمت علی خاں زمینداروں کی عیش پرستانہ مزاج سے بہ خوبی واقف ہے اس لئے بلاتک ودووہ اپنی بیوی اور سالی اور پلیٹ میں رکھے گوشت کی طرح بڑے سرکار کے سامنے پیش کرتا ہے۔ زمیندار کی اس اخلاقی کمزوریوں جس طرح مختار عام یا دیوان لوگ فائدہ اٹھایا کرتے تھے اس واقعہ سے ثابت ہوتی ہے اس کے علاوہ ضعیف اعتقادی کی بدولت دعا تعویز، گنڈے کرنا ساتھ ہی الّو کا گوشت کھلا کر بڑے سرکار کے ذہن کو مولڈ کرنے مہرن اور چندا نے اپنے جسم وحسن کا دلدادہ بنا رکھا ہے۔ ساتھ بڑے سرکار کا اپنے بیٹے کی طرح سے بے اعتنائی برتنا اسے نیچا دکھانے کی ذہنیت ان کے اس خوف ودہشت کی وجہ سے ہے کہ جمی بڑا ہورہا ہے وہ بڑا ہونے کے بعد بڑے سرکار کی جگہ لے لے گا اور اس کی اہمیت وحیثیت کو چیلنج کرسکتا ہے اس مزاج کے چلتے وہ اپنے بڑے سے خائف رہتے ہیں اسے ہر بات میں ڈانٹتے اور ڈپٹے رہتے ہیں اس کی کسی بات کو قبول کرنے میں تامل برتتے ہیں۔ بڑے سرکار اپنے دقیانوسی روایتی اور فرسودہ ذہنیت کی وجہ سے اختر بھائی جو تحریک آزادی کے حامی اور گاندھائی خیالات کے دلدادہ ہیں ان سے بھی دوری رکھتے ہیں انھیں آوارہ بدمعاش اور کام چور جیسے لفظوں سے بے عزتی کرتے ہیں اختر بھائی کو ایک آنکھ سے بھی پسند ہیں کرتے ہیں بڑے سرکار ان کی ذہنیت سے واقف ہیں انھیں لگتا ہے یہ ہماری زمینداری اور جاگیرداری کے خلاف کام کرتے ہیں۔

بڑے سرکار کی جاگیردارنہ ذہنیت بھی اس وقت کھل کر سامنے آتی ہے جب ادھے کو نکالنے میں ٹھاکر صاحب اور بڑے سرکار کے مابین تصادم کھڑا ہوگیا کوئی بھی اپنا گھوڑا اور ادھا پیچھے کرنا ے اور دوسرے کو راستہ دینے میں خود کو کمتر آنکتا رہا تھا۔ مگر انگریز پولس آفسر کی وجہ سے ایک ہندو مسلم فساد ہونے سے بچ جاتا

ہے بڑے سرکار زمیندار جاگیردار ٹھا کر نواب جیسے لوگ اپنی انا اور خود پرستی کے چلے اس طرح کے واقعات کو نہایت معمولی سمجھتے تھے ان کے آپسی جھگڑے کی وجہ سے عام رعایا کا کتنا نقصان ہو رہا ہے انھیں اس بات کی کوئی فکر نہیں ہوتی تھی۔ غرض بڑے سرکار کے کردار میں وقت اس عہد کے زمیندار کی پوری ذہنیت کے ساتھ ایک جیتا جاگتا زمیندار دکھائی دیتا ہے۔

''شب گزیدہ'' کا دوسرا اہم کردار جمّی کا ہے جو بڑے سرکار کا اکلوتا وارث اور زمین و جائیداد کا مالک ہے جو چھوٹے سرکار کے نام سے جانا جاتا ہے۔ جمی نئے زمانہ کا لڑکا ہے لکھنؤ یونیورسٹی سے تعلیم یافتہ اور حالتِ حاضر کا عکاس بھی ہے اس کے اندر زمیندارانہ مزاج کی خودغرضی انانیت شامل نہیں ہے بلکہ سمجھداری بردباری کے ساتھ کوئی فیصلہ کرتا ہے۔ جمی کے اندر اخلاقی قدریں اور بھائی چارگی پائی جاتی ہے۔

یہ اخوت و محبت کے ساتھ سب سے پیش آتا ہے ساتھ ہی سادات کے راستے پر چلتا ہے۔ اپنے خالہ کے بیٹے اختر بھائی سے بہت محبت کرتا ہے اور اسے ہر طرح کی مدد کرتا ہے۔ ساتھ ہی اپنی پھوپھی کی بیٹی زبیدہ سے عشق کرتا ہے اور اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ زبیدہ کے ماں باپ سے بھی سلیقے اور محبت سے پیش آتا ہے جب کہ اس کو معلوم ہے کہ اُس کا باپ اُس کے اس رویہ کو بالکل پسند نہیں کرتا ہے۔ اس کا رویہ دیکھ کر اور زبیدہ کی طرح جمی کا جھکاؤ دیکھ کر رحمت علی خاں کے کہنے پر بڑے سرکار جلد از جلد جمی کی شادی کروانا چاہتے ہیں۔ جمی ترقی پسند خیالات کا مالک ہے اور اسی کے تحت کام کرتا ہے۔ گڑھی کی ایک غیر مسلم لڑکی روپا کے اغوا ہونے پر اس شازش میں ملوث لوگوں کا پتہ لگا کر انھیں سخت سزائیں دیتا ہے وہ کسی بھی طرح کی منافرت نہیں رکھتا ہے اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی پر زور دیتا ہے۔ جمی کے کردار کو قاضی صاحب نے اُس عہد کے ترقی پسند ماحول کے تحت پیش کیا اور اسے اس تحریک کا نمائندہ بنا کر باپ اور بیٹے کے بیچ تصادم کو پیدا کیا ہے اور یہی تصادم اس ناول کی جان ہے جہاں ایک طرف زمیندار باپ اپنے بیٹے کو زمیندار دیکھنا چاہتا ہے اور چاہتا ہے کہ اُس کا بیٹا اُس کی طرح زمیندارانہ آن بان اور شان کے ساتھ زندگی گزارے۔ گڑھی کے لوگوں کے ساتھ جابرانہ رویہ کے ساتھ پیش آئے وہی دوسری طرف جمی کو زمیندارانہ نظام کی کھوکھلی حقیقت سے آشنا ہے وہ لکھنؤ سے تعلیم یافتہ ہے اور ملک سیاسی صورت حال پر اُس کی پینی نظر ہے اس لئے وہ اپنے باپ کو بے جا مصارف سے بچانا چاہتا ہے اور انھیں حقیقت کا آئینہ دکھانا چاہتا ہے۔ جمی کی رواداری اور محبت و اخوت کو

دیکھ کراُس کا باپ خوف بھی کھاتا ہے جمی کی اسی شخصیت کی وجہ سے لوگ اسے پسند کرتے ہیں اوراسے عزت و عظمت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔غرض رحمت علی خاں بڑے سرکار کے کان بھرتا ہے اوراس کی اس مقبولیت سے خائف ہوکر جمی کی شادی کروانا چاہتا ہے۔جام نگر کی اس خراب صورت حال کا اندازہ جمی کو ہے اوران سب کے پیچھے مختار عام کی چال بازیاں بھی ہیں ساتھ ہی رحمت علی خاں مختار عام نے کس طرح سے اپنی گندی چال کے ذریعہ بڑے سرکار کو اپنے ہاتھ کا کھلونا بنا رکھا ہے اس بات سے بھی واقف ہے۔غرض جمی مختار عام کی عزت نہیں کرتا ہے اوربھری محفل میں انھیں نیچا دکھاتا ہے اوربھلا برا بھی کہتا ہے۔

''شب گزیدہ'' ناول میں سبھی کردار اہمیت کے حامل ہیں اورایک عہد کے کسی گاؤں اورنگر کی عکاسی کرنے والے تمام کردار بیک وقت اس ناول میں موجود ہیں۔خاص طور سے زمیندارانہ نظام اور جاگیر دارانہ خاندان کی عکاسی کرتا ہوا یہ سب کردار یعنی بڑے سرکار اوران کے بیٹے جمی چھوٹے سرکار کا کردار سب سے خوبصورتی سے بنایا گیا ہے۔جواس ناول کی بنیاد ہیں۔اس ناول میں چند دوسرے کردار بھی ہیں جو ضمنی اورذیلی کردار کے فہرست میں آتے ہیں ان میں اختر بھائی،رحمت علی خاں زبیدہ کے علاوہ پھوپھا اور پھوپھی کا کردار بھی اپنی ایک حیثیت رکھتا ہے اورناول کے تانے بانے میں تاگے کی حیثیت رکھتا ہے۔جن کا کچھ حد تک ذکر کیا جائے گا۔

رحمت علی خاں کا کردار بھی اہمیت کا حامل ہے بڑے سرکار اورجمی کے بعد سب سے زیادہ جس کردار کا اس ناول میں ذکر ہے اوراس ناول کے پیچ وخم میں ہاتھ ہے وہ رحمت علی خاں ہی ہے وہ ایک معمولی منشی تھا جو خیرآباد سے جام نگر کی ریاست میں آیا تھا مگر دھیرے،دھیرے بڑے سرکار زمیندار کی چاپلوسی کرتے کرتے مختار عام بن گیا اورمختار عام ہوتے ہی مہرن نام کی لڑکی سے شادی کر لیتا ہے اورساتھ ہی اپنی خوبصورت سالی چندا کو بھی اپنے ساتھ رکھتا ہے دونوں عورتوں کو مہرا بنا کر وہ بڑے سرکار کے سیاست اورریاست میں اپنی حیثیت نہایت مضبوط کر لیتا ہے اوراسی کے چلتے تمام طرح کے احکامات بھی صادر کرتا ہے۔مہرن اور چندا کو بڑے سرکار کی داشتہ کے طور پر استعمال کرتا ہے اور بڑے سرکار کے بیٹے کو پسند نہیں کرتا ہے کیوں کہ اس کے آنے کی وجہ سے اس کا رعب ودبدبہ کم ہونے لگتا ہے اوراسے اپنی مختاری خطرے میں دکھائی دیتی ہے اوراس لئے وہ بڑے سرکار کے کان بھرتا رہتا ہے اور باپ بیٹے کے درمیان نفرت کی دیوار کھڑی کرتا ہے دونوں کے

بیچ اتنی منافرت پھیل جاتی ہے کہ بالآخر باپ اپنے بیٹے کو ہی زہریلی برفی کھلا کر موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے اس کے علاوہ وہ جمی کے اوپر جاچ پور کے راستے میں تلواروں سے حملہ کرواتا ہے اور جمی کو اسے غیر محفوظ اور دشمنوں سے خطرہ سے آگاہ کرنے اور جاج پور والوں پر بھروسہ نہ کرنے کے لئے کہتا ہے مگر جمی اپنے اثر و رسوخ سے معلوم کرتا ہے کہ یہ سارا کیا دھرا اسی رحمت علی خاں کا ہی ہے۔ ساتھ ہی رحمت علی خاں اپنے شاطر بدمعاشوں کے ذریعہ لوٹ کھسوٹ ڈاکہ ڈالنے کا کام کرتا ہے اور لڑکیوں کے اغوا جیسے جرائم میں بھی ملوث رہتا ہے۔ روپا نام کی لڑکی کا اغوا کرتا ہے۔ ساتھ ہی اس ناول میں ترقی پسند تحریک کے نمائندہ اور آزادی کے متوالے اختر بھائی جن کو پولیس کی طرف گرفتاری کا وارنٹ ملا ہے جب یہ اپنے خالہ کے گھر رہتا ہے تو رحمت علی خاں پولیس کو یہ خفیہ جانکاری دیتا ہے نتیجے کے طور پر اختر بھائی پکڑے جاتے ہیں۔

غرض اس ناول میں قاضی صاحب نے رحمت علی خاں کے کردار کو نہایت فعال انداز میں پیش کیا ہے اگر دیکھا جائے تو یہ کردار ولن کا رول ادا کرتا ہے جو نہایت ہی چالاک اور مکار آدمی ہے جو لالچ اور عیش کے لئے سب کچھ کرتا ہے ساتھ ہی اپنی چال بازیوں سیاسی دخل اندازیوں سے مختار عام کے عہدے پر فائز ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اپنی گھر کی عورتوں کو بھی اپنی لالچ کے تحت استعمال میں لاتا ہے۔ یہ کردار ایک گھر کو آگ لگانے میں گھی اور شعلے کا کام کرتا ہے۔ بڑے سرکار کا کان بھرتا اور ان کے بیٹے کو زہر دے کر مار ڈالنے میں بھی گریز نہیں کرتا ہے۔ مختار عام کا کردار پیش کر کے قاضی عبدالستار نے اس عہد کے مختاروں اور دیوانوں کا خوبصورت نقشہ کھینچا ہے جو اپنی پوزیشن اور حیثیت کو برقرار رکھنے کے لئے کسی بھی حد تک جا سکتے ہیں ساتھ ہی زمین جائیداد مال دولت کو بھی مالکوں کی زراسی لاپرواہی اور بے اعتناہی سے ان پر قبضہ کر لیتے ہیں اور مالک کو اس کے عہد سے بے دخل کر کے خود ہی مالک بن بیٹھتے ہیں اس طرح کے واقعات حقیقی منظر کشی پیش کرتے ہیں جو قاضی صاحب نے مختار عام کے کردار کو پیش کر کے دکھایا ہے۔

ناول ''شب گزیدہ'' میں اختر بھائی کا کردار بھی اپنی ایک خاص شناخت رکھتا ہے اگر چہ اس کردار کا عمل دخل بہت کم ہے زمیندارانہ تصادم کے بیچ بھی اس کا کوئی رول نہیں ہے پر قاضی صاحب نے اختر بھائی کے کردار کو عہد کی ضرورتوں کے تحت پیش کیا ہے جب زمیندارانہ خاندان کے کھاتے پیتے گھرانوں کے لڑکے آزادی کی لڑائی میں شامل ہو چکے تھے جن کی پاداش میں انھیں انگریز حکومت نہایت سخت سزائیں دے رہی

تھی انھیں انڈر گراؤنڈ رہنا پڑ تا تھا ان کے نام سے وارنٹ نکلا کرتے تھے یہ لوگ گاندھائی تحریک سے متاثر ہو کر کھادی کے کپڑے پہنا اور گاندھی ٹوپی کا استعمال کرتے تھے یہ کردار ناول میں تحریک آزادی کے نمائندے کے طور پر سامنے آتا ہے۔ جو ہندوستان کو غلامی سے آزادی کرانے کے سپنے دیکھتا ہے پڑھا لکھا تعلیم یافتہ ہونے کے بعد انگریز حکومت کی غلامی نہیں کرتا اور ان کی نوکری کو کرنا آزادی کے اصولوں اور ضابطوں کے خلاف سمجھتا ہے۔جس کی وجہ سے وہ بے آسرا بے یارو مددگار ادھر اُدھر بھٹکتا رہتا ہے۔جمی اختر کے خالہ کا بیٹا ہے وہ جمی کے گھر پناہ لینے آتا ہے ساتھ ہی جمی کو دورِ حاضر کے بارے میں سیاست کے اصول و ضوابطوں کو سمجھانے میں مدد کرتا ہے۔

جنگ آزادی میں ایک مسلمان نوجوان لڑکا کس طرح سے اپنے گھر خاندان کے عیش و آرام کو چھوڑ کر کود پڑا اس خوبصورت عکاسی اس ناول میں نظر آتی ہے۔اقتباس ملاحظہ ہوں:

> ''تکیے کے نیچے سے وہ ٹوپی، وہ کھدّر کی ٹوپی نکالی جو باغیانہ بانکپن کی علامت بن گئی اختر بھائی نے اسے جما کر پہنا۔ پھر بوریے کی طرح کھردرے کمبل کو لپیٹ کر اوڑھا اور دروازے کی زنجیر کھولنے لگے۔ دروازہ کھلتے ہی ہوا کا اتنا تیز سرد اور اتنا تیز جھکڑ آیا کہ وہ ڈگمگا گئے۔اُن کے کان میں اُن کی ماں نے بڑی ممتا سے کہا کہ ایسی سردی میں باہر نہ نکلو میرے لال! اور اگر نکلتے ہی ہو تو وہ زیر جامہ پہن لو جو تمہارے باپ ولایت سے لائے تھے۔ وہ ولایتی سوٹ پہن لو جسے تمہارے باپ نے سردی میں سلایا تھا۔ وہ ہیٹ پہن لو جسے تمھارے باپ نے تمہارے لئے فرانس سے منگوایا تھا اور دیکھو میرے بکس سے وہ شال نکال کر گردن میں لپیٹ لو جس کا رنگ تم کو بہت پسند تھا اور جس کا وزن تولوں میں شمار کیا جاتا ہے۔اختر بھائی سنتے رہے۔ کھڑے رہے۔ کمبل سے آستین نکالی ایک بار پھر آنکھیں پونچھیں ایک سگریٹ اور سلگائی اور باہر نکل گئے۔'' 19[1]

گھر اور خاندان میں ایک باحیثیت اختر بھائی جب جنگ آزادی میں شامل ہوئے تو اپنا سارا عیش و آرام چھوڑ کر صرف مادرِ وطن کی خاطر زندہ رہے۔مگر اس اختر بھائی کے خلاف ذاتی دشمنی سے عاجز آ کر مختارِ عام رحمت علی خاں نے پولیس میں ان کے چھپنے کی جگہ کے بارے میں اطلاع دی نتیجتاً وہ پکڑے گئے۔

19[1]: شب گزیدہ (ناول)۔قاضی عبدالستار۔ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڈھ۔1988۔ص:131

سوراج حاصل کرنے کی آرزو لئے یہ نوجوان طبقہ کتنی اذیتوں اور مصیبتوں کے ساتھ زندگی گذار رہا تھا تعلیم یافتہ ہو کر یہ طبقہ انگریز وکیل بیرسٹر بننے کے بجائے خود کو آزادی کی راہ میں قربان کر دیا اس قربانی کے لئے انھیں نہ صرف اپنے گھر خاندان اور عیش و آرام کو قربان کرنا پڑا بلکہ اپنی محبت کو بھی وطن کے لئے چھوڑ دیا اور خود کو ہندوستان کی آزادی کے لئے وقف کر دیا۔

اختر بھائی کا کردار اپنے آپ میں ایک لافانی کردار ہے اور ہمارے وطن کے آزادی کے متوالوں کی یاد دلاتا ہے۔ جن کی بدولت آج ہم وطن کی آزاد فضا میں سانس لے رہے ہیں۔

قاضی عبدالستان نے ناول ''شب گزیدہ'' میں ایک مولوی صاحب کے کردار کا بھی ذکر کیا ہے جیسا کہ کسی دور میں مولویوں اور دعا تعویز کرنے والے بابا رہتے تھے۔ یہ مولوی کا بھی اسی طرح کا کردار ہے جس کے دم میں اتنا دم ہے کہ بے اولادوں کو اولاد نصیب ہو جاتی ہے اور ہر طرح کی بیماریوں سے صحت یابی مل جاتی ہے۔ ساتھ ہی محلے اور ٹولے کے ناکام عاشق ان کے پاس اپنی مرادیں لے کر آتے ہیں عورتیں لڑکیاں اور بچیاں اور ان کے پاس اپنے محبوب کو راغب کرانے کا عمل لینے آتی ہیں مگر عمل لینے سے پہلے ہی مولوی صاحب کا ردعمل ان کے اوپر ہوتا ہے بہت سی عورتوں سے جسمانی تعلقات بنا رکھے ہیں اور ریاست کے لوگوں کے بہت سے راز سے واقف ہیں لوگوں کو اپنی باتوں میں الجھا کر ان کا راز فاش کرنا اور عورتوں کے جسم سے کھیلنا ان کے عیاشی اور لالچی ذہنیت کی عکاسی کرتا ہے اگر چہ لوگوں کی نظروں میں مولوی صاحب کی بہت عزت ہے مگر مولوی صاحب کا باطن ان کے ظاہر سے الگ ہے۔

مولوی صاحب کی بیٹی کا ذکر بھی مولوی صاحب کے کردار کے ساتھ آیا ہے جو نوٹنکی کے مجنوں کے ساتھ لیلا فرار ہو جاتی ہے۔ رحمت علی خاں کی سالی چندا کے اوپر بھی مولوی صاحب کی لار ٹپکتی رہتی ہے ایک بار جب چندا مولوی صاحب کو اپنے گھر بلاتی ہے اور جمی کے لئے دم کرنے کے لئے کہتی ہے تا کہ چھوٹے سرکار اس کی زلفوں کے اسیر ہو جائیں اس موقع کا فائدہ اٹھا کر مولوی صاحب اسے اپنی باتوں میں پھنسا لیتے ہیں۔

غرض اس ناول میں قاضی صاحب نے مولوی صاحب حلیہ پوشاک کی اور چال ڈھال سے خوبصورت نقشہ کھینچتا ہے۔ جو مزاحیہ کے ساتھ تمسخر انداز لئے ہوئے ہے۔ ساتھ ہی نام نہاد باباؤں اور مولوی

کے خلاف ہماری آنکھوں پر لگے پردے کو بھی ہٹا دیتا ہے۔

مولوی صاحب کے کردار کو بہت خوبصورت انداز میں پیش کیا گیا ہے جو جیتے جاگتے کردار کی مثال ہے۔مولوی صاحب کے شخصیت کو قاضی صاحب نے اس طرح پیش کیا ہے۔

''مولوی صاحب اس بڑھاپے میں بھی وجاہت کا نمونہ تھے۔مضبوط ہاتھ پیر دراز قد، فربہ بدن ناف تک پھیلی ہوئی بیضوی کھچڑی داڑھی، بڑی بڑی آنکھوں میں سرمے کی نمایاں تحریر اور شانوں پر بل کھائے ہوئے خوشبودار پٹے، بڑی پُر جلال شخصیت تھی۔ عورتیں تو اپنے لب جاں بچوں پر مولوی صاحب کی ایک ''پھونک'' چھڑا کراتنی مطمئن ہو جاتیں کہ حکیم کے نام سے چڑنے لگتیں۔'' 20؎

چند دوسرے اہم کرداروں میں جمی کی ماں کا کردار ہے جو ایک بے بس ماں اور دوئم درجے کی بیوی کی حیثیت سے بڑے سرکار کے ساتھ رہتی ہے۔شوہر کی بے وفائی اور اس کی عیاشیوں سے بہ خوبی واقف ہے۔ گھر کے نظم و نسق میں کوئی خاص کردار نہیں ہے۔ بیٹے کے تئیں اس کے باپ کی بڑھتی ہوئی نفرت سے واقف ہے۔اور دونوں کے بیچ ہونے والے تصادم کو اچھی طرح سمجھتی ہے۔شوہر کی زمیندارانہ ذہنیت کے چلتے جمی کو آنے والے وقت کے لئے آگاہ کرنا چاہتی ہے۔ جب مرزا صاحب جمی کو برفی کھانے کے لئے دیتے ہیں تو جمی کو اپنی ماں کی کہی ہوئی بات یاد آجاتی ہے:

''دیکھو بیٹے تم اس وقت تک کوئی چیز نہ کھانا جب تک میں خود لے کر اسے تمھارے پاس نہ آؤں۔دیکھو یہ قاب تمھارے دادا کی ہے اس کی تاثیر یہ ہے کہ اس قاب میں اگر زہر ملی ہوئی کوئی چیز دس منٹ بھی رکھ دی جائے تو اس میں بال پڑ جائے گا۔ میں نے یہ قاب اس لئے نکالی ہے کہ اب تم کھانا صرف اسی میں کھایا کرو گے اور دیکھو بیٹے میں تم سے پھر کہتی ہوں کہ تمھارے باپ بھی کوئی چیز تم کو دیں تو تم کھانا نہیں۔ وہ تمھارے باپ ہیں لیکن میرے جنم جنم کے ساتھی ہیں میں ان کو بیس برس سے جانتی ہوں۔'' 21؎

امی جان مہرن چندا اور زبیدہ کا کردار بھی اہمیت کا حامل ہے اگر چہ ان سب کا ذکر بہت کم جگہوں پر ہوا ہے مگر ناول کے کلائمکس میں ایک اہم درجہ رکھتے ہیں۔

20؎ شب گزیدہ (ناول)۔قاضی عبدالستار۔ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڈھ۔ 1988ء۔ص:62

21؎ شب گزیدہ (ناول)۔قاضی عبدالستار۔ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڈھ۔ 1988ء۔ص:174

امی جان زمیندار خاندان کی بہو اور بیٹی ہیں اگر چہ ان کا رعب و دبدبہ بڑے سرکار پر نہیں چلتا ہے مگر میں اپنی ایک پہچان ہے امی بڑے سرکار کے کالے کرتوتوں سے واقف ہیں اور انھیں اس بات کا احساس ہے کہ ایک زمیندار اپنی حیثیت بنائے رکھنے کے لئے کچھ بھی کرسکتا ہے اس لئے جب باپ اور بیٹے کے بیچ تصادم ہوتا ہے تو وہ اپنے بیٹے سے باپ کے ہاتھ سے دی گئی کوئی بھی چیز کھانے سے منع کرتی ہے اور ایک قاب دیتی ہے جس کی تاثیر یہ ہے کہ اگر اس میں جادو یا زہریلی اشیاء رکھی جائے تو بال پڑ جائے گا۔مگر باپ کے ہاتھ سے برفی کا ٹکڑا جمی کھالیتا ہے کیوں کہ اسی پلیٹ سے اس کا باپ بھی کھار ہا تھا لیکن جمی کے برفی کے ٹکڑے میں زہر ملا ہوا تھا جس کو کھانے کے بعد اس کی موت ہو جاتی ہے۔امی جان کے جملے پر ہی اس ناول کا اختتام ہوتا ہے وہ اپنے شوہر سے کہتی ہے۔

''میں اپنے بیٹے کا بدلہ اِس عدالت سے لے کر اُس عدالت تک لوں گی۔'' 22

امی کا کردار غیر اہم نہیں ہے ناول کے تانے بانے میں ان کا ایک حصہ ہے۔اس کے علاوہ مہرن چندا بھی ایک اہم کردار حیثیت رکھتے ہیں بڑے سرکار کی عیاشی کے لئے بہترین مہرہ ہیں۔

اس کے علاوہ زبیدہ بھی محبوب کی بن کر اس ناول میں آتی ہے جو جمی کی پسند اور اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد ہے زبیدہ کے گھر والے جمی کو پسند کرتے ہیں مگر بڑے سرکار سے اپنی بہن اور بہنوئی سے رشتہ خراب ہونے کی وجہ سے وہ نہیں چاہتے کہ زبیدہ سے جمی کی شادی ہو جائے۔اس لئے وہ اپنے بیٹے کی پسند اور محبت کی مخالفت کرتے رہتے ہیں۔

منظر نگاری:

''شب گزیدہ'' ناول میں منظر نگاری کی بہترین فضا ملتی ہے جہاں اس ناول میں زمیندارانہ عہد کو پیش کیا ہے اسی طرح اس عہد کے نقش و نگار کو بھی پیش کر کے ناول میں حقیقی مناظر ابھارنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ساتھ حلیہ، پوشاک، ساز و سامان کے ذریعہ زمیندارانہ گھر پریوار کی عکاسی کی گئی ہے۔اودھی بولی کے تحت ناول سچے اور حقیقی پس منظر کو پیش کیا گیا ہے۔ریاست کے گھر، دالان، ڈیوڑھی، سواریوں کے انداز کو اسی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔زمیندارانہ زندگی کی متنوع پہلوؤں کو خوبصورت ڈھنگ سے پیش کیا گیا ہے۔

22: شب گزیدہ (ناول)۔قاضی عبدالستار۔ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڈھ۔ 1988ء۔ص:174

جہاں مختلف تیج تہوار، مذہبی اور سماجی رسومات، اور دوسری تقریبات اس کے لئے محرم کے دن نوحہ خانی کا طریقہ مساجد وممبر کے حالات قعلہ والی مسجد جنات کا ذکر بھی اس ناول میں آتا ہے۔

جنات والی مسجد کا واقعہ ہو یا ریاست کے اندر بڑے سرکار کے محلات کا ان تمام مناظر میں ہمیں ایک عہد کی سچی اور حقیقی منظر نگاری دکھائی دیتی ہے جو قاضی صاحب کے لفظوں کے خوبصورت تال میل سے پرکشش اور جاذب نظر بن گیا ہے۔

مکالمہ نگاری:

بھی ناول کے لئے نہایت ضروری جُز خیال کیا جاتا ہے۔ اگر ایک ناول میں مکالمہ کمزور ہو یا فنی خوبیوں سے مبرا ہوتو قاری اس ناول کو پڑھنے میں دل چسپی ہرگز نہیں دکھائے گا کسی قاری کو ناول اگر باندھے رکھتے ہے تو اُس کی بہت حد تک وجہ مکالمہ نگاری ہوتی ہے۔

مکالمہ کو پیش کرنا اسے برتنا بھی تخلیق کار کی فنی خوبیوں کا ایک عمدہ نمونہ ہوتا ہے۔ کس کردار سے کون سی بات کہلانی ہے اور اس کا انداز بیان کیا ہونا چاہئے۔ اُس کے بولنے کا طریقہ اُس کے پیش کرنے کا نظر یہ بھی سامنے آتا ہے اور اس مکالمے سے ہی راجا اور ریایا کا فرق تعلیم یافتہ اور جاہل کا فرق بھی سامنے آتا ہے۔

مکالمہ نگاری میں تخلیق کار کو ایک دیہاتی آدمی سے یا کسی مخصوص جگہ اور گاؤں کے منظر کو پیش کرتے ہوئے کسی مقامی اور دیہاتی غیر تعلیم یافتہ کردار سے وہی زبان اور مکالمہ پیش کرنا ہوتا ہے جس طرح سے ناول میں قاضی صاحب نے اودھ کے پس منظر میں وہاں کی روایتی زبان کو پیش کیا ہے ساتھ ہی چند دوسرے کرداروں کی زبان سے ان کی شخصیت کے مطابق زبان استعمال کی ہے۔

قاضی عبدالستار نے اس ناول میں انگریز افسر کے مکالمے میں بھی اس بات کا بہ طور خاص خیال رکھا ہے انگریزی آمیز ہندوستانی زبان کے ساتھ دیانت داری برتتے ہوئے حقیقی مکالمے کے منظر کو پیش کیا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہوں:

''ول مرزا صاحب اور ٹھاکر صاحب آپ دونوں اپنے اپنے ادھے کو سڑک سے نہیں ہٹاتا تو ہم نہ آپ پر دباؤ ڈالتا ہے اور نہ آپ پر۔ لیکن ہم آپ دونوں سے کہتا ہے کہ

کانون اپنے ہاتھ میں نہ لے اور ہمارے کہنے پر کاموس بیٹھا رہے۔''23؎

غرض اس مکالمے سے آپ کسی کردار کی حقیقت اور اس کی شناخت کو آسانی سے معلوم کر سکتے ہیں۔مکالمہ نگاری کی ایک مثال پیش کرتی ہوں جس میں خوبصورت الفاظ برحت اور برمحل جملوں کو خوبصورت انداز میں پیش کیا گیا ہے:

''جمی نے اُسے اٹھالیا اور اُس کے موٹے۔موٹے ہاتھوں میں دس روپے کا ایک نوٹ بٹی بنا کر پکڑا دیا۔ پھر کہاروں نے چینی کی طشتریوں سے میز کو بھر دیا۔ چودھری سر سے پاؤں تک التجا بنا کھڑا رہا۔

''سرکار کیا آپ کہہ کر نہیں آئے ہیں؟''

''کیوں؟''

''آپ جب گڑھی سے نکلتے ہیں تو آپ کے ساتھ شکر چلتا ہے،مگر آج آپ....''

''ہاں! مجھے تم سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔''24؎

غرض اس ناول میں جھوٹے جھوٹے برمحل مکالمے کے ساتھ پوری ناول کی فضا کو رنگ وروپ دیا گیا ہے۔اس ناول میں لمبے چوڑے مکالمے سے ناول کی فضا کو بوجھل بنانے کی کوشش نہیں کی گئی ہے۔مکالمہ نگاری اسی خصوصیت کے بنا پر ہی یہ ایک زندہ جیتا جاگتا نظر آتا ہے۔

اسلوب نگاری:

کوئی بھی تخلیق کار اپنا الگ اور مفرد اسلوب رکھتا ہے اور اسی اسلوب کے ذریعہ وہ پہچانا جاتا ہے۔ اسلوب Style of Writing کو کہتے ہیں۔اسلوب کے ذریعہ ہی تخلیق کار کی ایک الگ شناخت قائم ہوتی ہے۔

قاضی عبدالستار کی تخلیقی زبان میں جدت ندرت اور انوکھا پن دکھائی دیتا ہے وہ ان کا اندازِ بیان ہے۔ قاضی صاحب کا قول ہے''آپ ہماری ناول پڑھنا شروع تو کریں ختم کرانے کی ذمہ داری ہماری ہے'' قاضی صاحب کے اس قول کے پیچھے جو خود اعتمادی دکھائی دیتی ہے اس کا سبب ان کا منفرد اندازِ بیان اور

23؎:شب گزیدہ(ناول)۔قاضی عبدالستار۔ایجوکیشنل بک ہاؤس،علی گڈھ۔ 1988ء۔ص:95-94

24؎:شب گزیدہ(ناول)۔قاضی عبدالستار۔ایجوکیشنل بک ہاؤس،علی گڈھ۔ 1988ء۔ص:60

اسلوب کی سحر کاری ہے جس میں قاری آسانی سے گفتار ہو جاتا ہے۔مشکل سے مشکل مناظر کو جب وہ بیان کرتے ہیں تو زبان و بیان کو قدرت قلم سے جانے نہیں دیتے۔قاضی عبدالستار کی زبان کبھی کبھی دقت بھی پیدا کرتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اودھی زندگی میں یا زمیندارانہ اور جاگیردارانہ عہد میں جو الفاظ عام بول چال کی زندگی میں استعمال ہوتے تھے جو دھیرے دھیرے متروک ہو گئے۔

جیسے۔ اقتباس

''جام نگر کی پُلیا پر ایک آدمی گٹھری کی طرح پڑا تھا۔ماتا دین نے چودھری کو کہنی ماری۔

''کون؟''

''کٹھیا بتاسہ''

''کٹھیا بتاسہ تو ہے مگر مطلب بتاؤ؟

''سندیسہ!''

''بولو!'' 25ؔ

غرض اس اقتباس میں آپ آسانی سے دیکھ سکتے ہیں کہ قاضی عبدالستار کی زبان مشکل اور دقت طلب ہے آج کے قاری کے لئے غیر مانوس ہے۔

وہیں پر ان کے اسلوب کے وہ مناظر یہاں پر انھوں نے منفرد تشبہات و استعارات کے استعمال سے ناول میں حقیقی حسن پیدا کیا ہے۔چند مثالیں پیش کرتی ہوں۔اقتباس

(ا)''وہ اصول اُن کے سامنے ننگے ناچتے رہے اور قہقہے لگاتے رہے۔آزادی کی تمنا آئی جسے پانے کے لئے انھوں نے اپنی راتوں کی مانگ سے نیند کا سیندور نوچ لیا تھا اور ان پر حقارت سے مسکرا کر چل دی گئی۔'' 26ؔ

(۲)''اور اس طرح راتوں کے رنگین سپنے اور محبوب کی دل گداز بانہوں کے خوابوں کو چھوڑ کر چلے جاتے ہیں عذرا میری منزل نہیں ہے انھوں نے اپنے دل کے درد کو برداشت کر کے سوچا۔میری منزل شوراج'' ہے عذرا ٹھنڈے پانی کی ایک بوتل ہے جو میرے کندھے پر پڑی ہے جب پیاس سے زبان لٹکنے لگتی ہے تب میں دو گھونٹ پی لیتا

25ؔ: شب گزیدہ۔قاضی عبدالستار۔ص130

26ؔ: شب گزیدہ (ناول)۔قاضی عبدالستار۔ایجوکیشنل بک ہاؤس،علی گڈھ۔ 1988ء۔ص:130

ہوں۔عذرا سڑک کے کنارے کھڑے ہوئے چھتنار پیڑ کے سائے کی ٹھنڈک ہے کہیں
اس کے سائے میں عمر گذاری جاسکتی ہے۔''27ؔ

نقطہ نظر :

نقطہ نظر کے لحاظ سے دیکھا جائے تو ''شب گزیدہ'' میں قاضی صاحب نے اپنے خاص نقطہ نظر یعنی آزادی کے بعد زمینداروں کی سیاسی سماجی، مذہبی صورت حال کا ذکر کیا ہے اگر چہ یہ ناول آزادی کے پاس کے نقطہ نظر کو پیش کیا گیا ہے۔اس ناول میں انھوں نے جہاں باپ بیٹے کے بیچ قدیم اور جدید روایت اور حقیقت کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے وہیں اس ناول میں زمینداروں کی تہذیبی اور سماجی زندگی کو پیش کیا ہے جہاں ایک طرف قاضی صاحب نے زمینداروں کے عیاشی بدمستی کو دکھایا ہے وہیں دوسری ان کے رعب و دبدبہ اُن کے مزاج کی انانیت اور خود پسندی کو پیش کرنے کی کوشس کی ہے۔آزادی کے وقت کی ایسی صورت حال جب زمینداروں کے اوپر خطرے کی تلوار لٹکی رہتی تھی ایسے وقت میں ہوس کے ناخن نا لیتے ہوئے اپنی ضد اور انا کے چلتے اپنے بیٹے کو زہر دے کر مار ڈالنا ایک طرف سے ان زمینداروں کی تباہی کے آخری داستان کی نشانی پیش کرتا ہے۔

غرض اس ناول میں مختلف جگھوں پر مسلمانوں کے روز بہ روز زوال پزیر صورت حال کو پیش کیا گیا ہے جہاں ایک طرف بڑے زمیندار گھرانوں کے بچے نہ تو تعلیم حاصل کر رہے تھے اور نہ ہی کوئی روزگار باپ اور دادا کی جائیداد کو بیچ بیچ کر کھاتے کھاتے ایک دن کنگال ہو گئے۔اور اس تنگ حالی اور مفلسی کو قسمت اور مقدر کا نام دے کر آنسو پونچھتے ہوئے گلی محلوں سے گزر رہے تھے۔

بہر کیف یہ قاضی عبدالستار کا شاندار اور جاندار ناول ہے جو ایک عہد کی مکمل اور سچی داستان کو پیش کرنے کے لئے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

شب گزیدہ کے بارے میں وارث علوی لکھتے ہیں:

''شب گزیدہ'' ایک لچسپ اور کامیاب ناول ہے تو اس کے کرداروں کے سبب نہیں بلکہ وہ ایک پکچر گیلری ہے جس میں رنگ برنگی تصویریں آویزاں ہیں ڈیوڑھی والے مکانوں کی کسانوں کی، جھونپڑیوں کی، ان مسجدوں کی جن میں جنات رہتے ہیں مجرم کی رسوم

27ؔ: شب گزیدہ (ناول)۔قاضی عبدالستار۔ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڈھ۔ 1988ء۔ص:135

اور جلوسوں کی بڑے زمیندار کی، ٹھاکر بھرت سنگھ کی چال باز رحمت علی کی نو جوان جمی کی ان تصویروں کی وجہ سے ایک پوری تہذیب، تاریخ کا ایک بیتا ہوا ورق ہمارے ذہن میں زندہ ہے اور تصویروں کا یہ نگار خانہ قاضی عبدالستار ہی سجا سکتے تھے۔ کیوں کہ وہ جس معاشرت کو پیش کرتے ہیں خود اس کا ایک حصہ ہیں۔ اس کے پرستار بھی اور نکتہ چیں بھی' مدح خواں اور مرثیہ گو بھی۔ 28ے

غرض اس ناول میں سارے واقعات و حادثات ایک پکچر گیلری کی طرح ہمارے سامنے آتے جاتے ہیں۔ اور قاری کے دل و دماغ پر چھاتے چلے جاتے ہیں۔

طارق سعید نے قاضی عبدالستار کے بارے میں رقم طراز ہیں:

''اُردو آفاق میں یہ زمانہ قاضی عبدالستار کا ہے۔''

آزاد ہندوستان میں اُردوئے معلّٰی کا صرف ایک وارث و محافظ ہے اور وہ ہے ''قاضی عبدالستار'' جو صرف اپنے انشاء پرداز قلم نابغہ کی بنا پر دائمی اور کامران ہے دراصل کوئی شخص نہیں، اسلوب ہے۔'' 29ے

☆☆☆

28ے: گنجیفہ باز خیال۔ وارث علوی۔ ماڈرن پبلیشنگ ہاؤس۔ سن اشاعت۔ 2007 ص 09

29ے: اسلوب جلیل قاضی عبدالستار کا گرینڈ اسٹایل۔ ڈاکٹر طارق سعید۔ حوای نورانی مکتبہ دانیال۔ جون 1993ء۔ ص: 24

مجّو بھیا (ناولٹ)

''مجو بھیا'' قاضی عبدالستار کا ناولٹ ہے جو ان کے افسانی مجموعہ ''پیتل کا گھنٹہ'' میں شامل ہے۔ ''مجو بھیا'' ایک سماجی ناولٹ ہے جس میں آزادی کے بعد اور زمیندارانہ نظام کے خاتمے کے بعد کی صورت حال کو موضوع بنایا گیا ہے اس ناولٹ میں معاشی اور معاشرتی کی زبوں حالی جنسی بے راہ روی اور مجرمانہ اور عیاشی پسند انسانوں کے ذہنی بدفعلی کو نہایت باریکی سے دکھایا گیا ہے۔ اس ناولٹ میں قاضی عبدالستار نے یہ دکھایا کہ جب انسان کے ہاتھوں سے رعب ودبدبہ اور اس کی حاکمیت جانے لگتی ہے تو اسے پانے کے لئے انسان کن کن راستوں پر چلتا ہے۔ غرض اس ناولٹ میں بھی ایسی کہانی پیش کی گئی ہے۔

مجو بھیا ایک ایسی کہانی ہے جو اکثر وبیشتر قصبات ودیہات کے علاقوں میں دیکھنے کو مل جاتی ہے۔ اس ناول میں دیہات وقصبات کے مسائل کو بڑے خوبصورت انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اکثر وبیشتر ہم سمجھتے ہیں کہ دیہی علاقوں کے لوگ بڑے سیدھے سادے اور سادہ لوح طبیعت کے ہوتے ہیں مگر ایسا ہمیشہ سچ نہیں ہوتا ہے۔ اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ دیہات وقصبات میں مل جل کر رہنے کے باوجود بھی قتل وخون کے حادثے سنائی دیتے ہیں اس کے علاوہ جنسی بدفعلی بھی دکھائی دیتی ہیں۔ کوئی عورت گھریلو مجبوریوں سے بے بس ہوکر کام کرنے نکلتی ہے تو آس پاس کے لوگ کتنی گندی نگاہوں سے اسے گھورتے ہیں ویسے تو یہ شہروں میں بھی عام بات ہے کسی عورت یا لڑکی اور اپنے ہوس زدہ نگاہوں سے گھورنا اور اس پر جملے اُچھالنا یہ سب چند مردوں کی ناپاک ذہنیت کو پیش کرتا ہے۔ اس ناولٹ میں للّی چندہ اور دوسرے کرداروں کی مدد سے قاضی عبدالستار نے حقیقت کے کئی راز افشاں کئے ہیں۔

''مجو بھیا'' میں جاگیردارانہ نظام کے خاتمے کے بعد جاگیرداروں کی زوال بھری زندگی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ بڑے نام نہاد جاگیردار کس طرح گاؤں دیہات کی سماجی زندگی میں اپنی جھوٹی اور کھوکھلی شناخت کو بنائے رکھنے کے لئے طرح طرح کے حربے اپناتے ہیں اور اپنا

وقت گزارنے کے لئے مقدمے لڑواتے ہیں اپنا رعب و دبدبہ قائم رکھنے کے لئے قتل و غارت کے علاوہ لڑکیوں کا جنسی استحصال کرتے ہیں اپنے دشمنوں کو ٹھکانے لگانے کے لئے طرح طرح کے مجرمانہ فعل کو انجام دیتے ہیں۔اس ناولٹ میں قاضی عبدالستار نے ایک ایسی ہی زندگی کو اور ایسے سماج کو موضوع بنایا ہے۔

اس ناول کا قصہ کچھ اس طرح ہے کہ شیخ سرور علی مختاری عام کی ذمہ داری سے آزادی پا کر لکڑ واں کے تعلقہ دار پنڈت درگا سہائے کے مرنے کے بعد وہاں سے مان پور چلے جاتے ہیں اور وہاں پر جا کر جو ایک تعلقہ دار کے مختار عام تھے جنھیں صرف حکم چلانے اور کاشت کاروں کی گاڑھی کمائی سے اپنے دن کا آغاز کرتے تھے ان تمام نظام و ضابطوں کے خاتمے کے بعد خود کاشت کاری کرنے پر مجبور ہوتے ہیں اور چار جوڑی بیل خرید کر کسانی کروانے لگتے ہیں۔ساتھ ہی سماج میں اپنی وضع قطع قائم رکھنے مختاری کی فطرت کے چلتے مان پور میں بھی آ کر طرح طرح کے ہتھکنڈے اپناتے ہیں تا کہ سماج میں ان کی دھاک قائم ہو سکے مگر وقت سے پہلے ہی وہ اس دارِ فانی سے کوچ کر جاتے ہیں تب ان کا اکلوتا بیٹا ''مجو بھیا'' میدان میں اترتا ہے باپ کی زندگی میں وہ ہر فن مولا بنا رہتا ہے اور باپ کے حکم کے مطابق قرآن کی سورۃ کو درمیان سے سنانے لگتا ہے۔اور سا ہی مدّی چچا سے کشتی بھی لڑتا ہے۔شیخ جی کے انتقال ہونے پر ''مجو بھیا'' کتابوں کو طاقوں میں سجا کر سماج میں اپنی پکڑ مضبوط بنانے کی کوشش کرنے لگتا ہے اور تمام ملّی مسائل کو سلجھانے لگتا ہے ساتھ ہی اپنے آس پاس اپنے نو خیز لڑکوں کو اپنے گروہ میں شامل کر لیتا ہے جو انھیں ہر بات کی خبر اور مسائل کی جانکاری کے بارے میں ساتھ ہی ہر طرح کے مشورہ سے نوازتے رہتے ہیں۔اس کے علاوہ مان پور میں مسجد نہ ہونے پر زمین خرید کر مسجد بنا دیتا ہے اور خود ممبر پر چڑھ کر خطبہ دیتا ہے۔اور امامت بھی کرتا ہے۔جب وہاں کے لوگوں کو مسجد کا صحن تنگ ہونے کا احساس ہوا تو ''مجو بھیا'' سے شکایت کی گئی اور ''مجو بھیا'' غلط طریقے سے درگا سہائے سے زمین خرید لیتا ہے۔مگر یہ خبر درگا سہائے کو ملتی ہے آدمیوں اور بندوقوں کے ساتھ مان پور پر چڑھائی کر دیتا ہے مگر ''مجو بھیا'' اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر چالاکی اور ہوشیاری سے یہ جنگ جیت لیتا ہے۔

مجو بھیا جہاں ایک طرف نو خیز ہندو لڑکوں کو اپنا داہنا ہاتھ بنائے ہوئے ہے وہیں دوسری طرف ان کی مدد غیر قانونی فعل انجام بھی دیتا درگا سہائے کے گھوڑے پر سواری کرتا ہے اور گھوڑا پسند آنے پر اسے خریدنے

کی کوشش کرتا ہے۔مگر درگا سہائے اس کی بے عزتی کرتے ہیں اور ایسا محسوس کراتے ہیں کہ اس کی اوقات نہیں ہے جو وہ یہ گھوڑا خرید سکے۔غرض ''مجو بھیا'' کو یہ بات بہت بری لگتی ہے اور اس کے گرگے اسے طرح طرح کے مشورہ دیتے ہیں کیسے درگا سہائے کے گھوڑے کو حاصل کیا جائے رام دین نام کا پاسی اس کی اس سلسلے میں مدد کرتا ہے یہاں ایک اور کردار للّی ہے جس کو برص کی بیماری ہے اور جس کی شادی ایک بوڑھے حاجی میٹھے سے ہوتی ہے غرض للّی کو اس سازش میں شریک کیا جاتا ہے اور برص کی دوا سے گھوڑے کے بال اڑا دئے جاتے ہیں اور سفید گھوڑے کو کالا کر دیا جاتا ہے اور گھوڑا لے کر رام دین اپنے داماد کو دے دیتا ہے۔ وہیں للّی کی جوانی پر اس کی آنکھیں اٹک جاتی ہیں اور دونوں ساتھ رات گذارتے ہیں وہیں دوسری طرف تراب نامی گدّی نوجوان للّی کی طرف غلط نظروں سے دیکھتا ہے اور اس کی عزت سے کھلواڑ بھی کرتا ہے۔ ایک دن للّی تراب سے بدلا لینے کے لئے اس کی بھینسوں کو''مجو بھیا'' کے کھیت میں ہانک دیتی ہے نتیجے کے طور پر گدّیوں اور پاسیوں میں لڑائیاں ہوتی ہیں تراب جس نے منگلو کی بیوی چندا کو اپنے گھر میں اٹھوالیا تھا ساتھ ہی دوسری عورتوں اور دلہنوں کی طرف ہمیشہ الو کی طرح نظر گاڑے رکھتا ہے اس سے بدلا لینے کا سنہرا موقع حاصل ہو جاتا ہے گدّیوں اور پاسیوں کی لڑائی میں تراب مارا جاتا ہے۔ جہاں ایک طرف للّی کے سازش میں شریک ہونے پر گھوڑے کو مارا جاتا ہے۔وہیں دوسری طرف کملا پور سے ایک دوسرے گھوڑے کو خرید کر جرم کو مٹانے کی کوشش کی جاتی ہے''مجو بھیا'' کی منظور نظر للّی کو جب پتہ چلتا ہے کہ''مجو بھیا'' اب چندہ کی چاندی لوٹ رہے ہیں تو وہ انگاروں کو لہاتی ہے اور''مجو بھیا'' کو دھمکی دیتی ہے کہ تراب کو مارنے کے پیچھے چندہ کو پانے کی لالچ تھی ساتھ گھوڑے کے چوری کی گواہی دینے کے لئے تیار رہتی ہے تھانیدار یہ بات آکر''مجو بھیا'' کو بتاتا ہے۔اب''مجو بھیا'' کی رات کی نیند اور دن کا چین حرام ہو جاتا ہے اور للّی کو ٹھکانے لگانے کی کوشش کی جاتی ہے جہاں گھوڑے کو مار کر اسے دفن کر دیا جاتا ہے وہیں دوسری طرف للّی کو مار کر اس کی لاش بورے میں بند کر کے ندی میں پھنکوا دیا جاتا ہے ساتھ ہی یہ افواہ اڑائی جاتی ہے کہ للّی اپنے بوڑھے شوہر کو چھوڑ کر کسی آشنا کے ساتھ فرار ہوگئی ہے۔اس ناولٹ میں قاضی عبدالستار نے گاؤں دیہات وقصبات کی ان زمینی حقیقتوں سے پردہ اٹھایا ہے۔وارث علوی لکھتے ہیں:

''قاضی عبدالستار زر، زن، زمین سے لگے ہوئے ارضی کرداروں کے جذبات کے الاؤ

میں ادھر اُدھر سے ایندھن فراہم کر کے کیسے اس کی آگ کو بھڑکاتے ہیں۔ ان کا یہی مشاہدہ دیہی زندگی کی کھردری حقیقتوں، سفاکیوں اور منافقتوں کی تصویر گری کے ذریعے اس سچائی کو سامنے لاتا ہے جو سیانے گاؤں کی سہانی تصویر گری میں نظر نہیں آتی۔'' 1

یہ ناولٹ جہاں قاضی عبدالستار کے زمیندارانہ نظام کے ذہنی اور فکری مشاہدے کو دکھاتا ہے وہیں قارئین کو گاؤں کے ان سفاک پہلوؤں کو بھی دکھاتا ہے۔ جہاں ایک طرف گاؤں قصبات کے مافیا ٹائپ لوگ اپنی انا برقرار رکھنے کے لئے بے زبان جانوروں کو مار ڈالتے ہیں ساتھ ہی چھوٹی سی بات پر کسی بھی گھر میں لڑائیاں کرا سکتے ہیں کبھی کبھی یہ ہندو مسلم فسادات میں بدل جاتی ہے۔ جہاں ایک طرف ''مجو بھیا'' کو قرآن کے حافظ کے طور پر دکھایا گیا ہے وہیں وہ ضعیف اعتقاد بھی ہے اور اخلاقی گراوٹ کا شکار بھی ہے جو للّی اور چندہ سے ناجائز تعلقات بھی بنائے ہوئے ہے۔ ''مجو بھیا'' اپنی دھاک اور پہچان بنائے رکھنے کے لئے پاسیوں اور گدّیوں کے بیچ ہوئے تناضات کو ختم کرا دیتا ہے مگر جامن کے پیڑ کو کاٹنے کو لے کر تراب اور مجو بھیا کے بیچ تصادم ہوتا ہے جس میں تراب مارا جاتا ہے۔

''مجو بھیا'' ناولٹ کے بارے میں ڈاکٹر عبدالغفور رقم طراز ہیں:

''قاضی عبدالستار کا ناولٹ ''مجو بھیا'' اپنے پلاٹ کے لحاظ سے دیہاتی زندگی کے بہت قریب ہے اور دیہی زندگی کی حقیقی زندگی منعکس ہوتی ہے۔ البتہ قاری کے ذہن میں یہ سوال چبھنے لگتا ہے کہ کیا پورے راج پورہ میں سبھی بیاہی لڑکیاں اپنے اپنے شوہروں سے غیر مطمئن رہتی ہیں کیا سبھی نوجوان حرص وہوس کے شکار ہو جاتے ہیں جیسا کی للّی اور چندا کے قصہ میں دیکھنے میں آتا ہے ''مجو بھیا'' اور تراب کی جوانی بدمستیوں میں نظر آتی ہے۔ اس پر طرّہ یہ ہے کہ ادرک لینے کے بہانے تو کوئی دوائی طلب کرنے میں ایک دوسرے کو ہوس پرستی کا نشانہ نہیں بنانا چاہتا ہے۔ کیا ایک شخص بھی نہیں ہے جو ان پر قدغن لگا سکے۔''

2

ڈاکٹر عبدالغفور نے جو شکایت کی ہے وہ درست ہے مگر اس ناول کا بہ نظر غائر مطالعہ کریں تو ہر ایک قصہ دوسرے سے جڑا ہوا ہے اور سبھی کردار ایک ایک بہانے سے اپنا مطلب سادھنے کی کوشش میں ہے جیسا

1: قاضی عبدالستار کے معاشرتی ناولٹ۔ وارث علوی۔ ذہن جدید۔ ص: 79

2: قاضی عبدالستار بہ حیثیت ناول نگار۔ ڈاکٹر عبدالغفور۔ دانش کدہ، پٹنہ۔ 2016ء۔ ص: 222

کہ للّی کے تعلق سے کہا جائے تو وہ ایک برص کی بیماری میں مبتلا لڑکی ہوتی ہے جس کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنا کوئی پسند نہیں کرتا ہے جب وہ حاجی مٹھے کے پاس دوا لینے جاتی ہے تو حاجی میٹھے اپنے اکیلے پن سے عاجز آ کر اور للّی کو سہارا دینے کے لئے اسے اپنے نکاح میں رکھ لیتے ہیں للّی جہاں ایک نوخیز دوشیزہ ہے وہیں وہ تراب نامی نوجوان کے جملے اور ہوس پرست نگاہوں سے پریشان ہے اور اسے سبق سکھانا چاہتی ہے جس نے منگلو کی بیوی سے ناجائز رشتہ بنائے ہوئے ہے ساتھ ہی بھکا پاسی کی دلہن کو اٹھوا کر اپنے پاس رکھ لیتا ہے وہ گدّیوں کی ناک اور نہایت طاقتور انسان ہے جس سے کوئی بھی پنگا نہیں لینا چاہتا ہے للّی جیسی کمزور اور ناتواں لڑکی اس کو سبق سکھانے کے لئے ''مجو بھیا'' سے راہ رسم بڑھاتی ہے نتیجۃً ایک دن وہ مارا جاتا ہے دوسری طرف چندہ اپنے شوہر منگلو سے مار بھی کھاتی ہے اور دوسری طرف تراب سے ڈر کی وجہ سے تعلقات کو توڑنا بھی نہیں چاہتی ہے مگر جب تراب مر جاتا ہے تو ''مجو بھیا'' کے ساتھ چاندنی لٹاتی ہے اور للّی دونوں کو ساتھ میں دیکھ لیتی ہے۔غرض اس آگ میں خود جل جاتی ہے اور ''مجو بھیا'' کے ہاتھوں ماری جاتی ہے۔اس ناولٹ میں قاضی عبدالستار نے گاؤں کے ان پیچیدہ مسائل کو موضوع بنایا ہے جہاں ہر بات چھپالی جاتی ہے گھر کی مشترکہ دیوار میں تمام رازوں کو جانتی ہیں اور موقع ومحل کے حساب سے اچھالی جاتی ہے جہاں بوڑھے نوجوان سبھی کسی نہ کسی واقع سے منسلک ہوتے ہیں ساتھ ڈر خوف اور بدنامی کی وجہ سے بولنا پسند نہیں کرتے ہیں اگر کوئی بولتا ہے تو اس کی آواز ہمیشہ کے لئے بند کر دی جاتی ہے۔

عام انسانوں کی روزمرہ کی زندگی سے ان چند لوگوں کے طاقت اور تصادم کی کہانی کو قاضی عبدالستار نے اس ناول کے موضوع کے طور پر پیش کیا ہے جو اکثر چھپی ہوئی ہوتی ہیں۔

پلاٹ:

کسی قصہ یا کہانی کے ترتیب وتنظیم کو پلاٹ کہتے ہیں۔کسی کہانی کو مصنف کس طرح اور کیسے بیان کرتا ہے تاکہ قاری کی دل چسپی اس میں بنی رہے اور واقعات ایک دوسرے سے منسلک ہوں یہ تخلیق کار کی فنی مہارت اور ذہنی پختگی کو ثابت کرتا ہے۔جس کہانی میں پلاٹ کی منظّم سازی جتنے بہتر ڈھنگ سے کی جاتی ہے اس کہانی کو پڑھتے ہوئے قاری کی توجہ قصہ کی طرف بنی رہتی ہے اور اس کا دھیان معاملے کو سلجھانے اور پہلوؤں کو حل کرنے کی کوشش کرتا ہے ساتھ ہی قصہ کے خاتمے کے بارے میں بھی اپنی رائے قائم کرتا ہے

غرض کی ایک کہانی قاری کے ذہن میں بھی چلتی رہتی ہے۔اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ پلاٹ کے لحاظ سے ''مجو بھیا'' ایک عمدہ قصہ ہے جس میں واقعات ایک دوسرے سے منسلک ہیں پلاٹ نہایت مضبوط ہے۔سبھی واقعات ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔غرض کہ ''مجو بھیا'' کے ناول کی شروعات جس طرح سے شیخ سرور علی کے ککرواں راج چھوڑ کر مان پور میں آنا اور رہائش کے لئے زمین خرید کر کاشت کاری کی شروعات کرنا ساتھ ہی اپنی عادت کے مطابق اپنی مختاری کو قائم رکھنے کے لئے مان پور کے لوگوں کے آپسی جھگڑوں کو سلجھانا، مقدمے لڑنا دوا تعویز کرنا یہ سب اپنی دھاک بڑھانے کی کوشش ہے جب مان پور کے لوگ شیخ سرور علی کی حیثیت کو مان لیتے ہیں تو ان کی ہر اک پریشانیوں کا مداوا کرنے کے لئے ان کا بیٹا منظور جوان ہوتا ہے۔اور اپنے باپ کی جگہ لے لیتا ہے۔''مجو بھیا'' علاقے میں اپنی دانشمندی اور عقل مندی کے سبب ہندو و مسلمان دونوں پر برابر کی پیٹھ بنائے رکھتے ہیں اور موقع و محل کے حساب سے مدد لیتے ہیں۔اس کے بعد درگا سہائے کے گھوڑے کا واقعہ اسے حاصل کرنے کے لئے للّی کی بیماری کا ذکر کرنا اور اسے بوڑھے حاجی سے بیاہ کرانا بھی پلاٹ سازی کا ایک عمدہ نمونہ ہے تا کہ للّی کی موت کو دکھایا جاسکے۔اس کے علاوہ تراب اور پاسیوں کے بیچ کی لڑائیاں یہ تمام قصے اس ناولٹ میں ایک دوسرے سے منسلک ہیں۔

وارث علوی نے ''مجو بھیا'' کے پلاٹ سازی کے متعلق لکھا ہے:

> ''ایک اچھا ناول نگار کی طرح قاضی صاحب جب اپنے پلاٹ کو ایک معنی خیز اور چونکا دینے والا موڑ دیتے ہیں تو وہ اتفاق نہیں ہوتا بلکہ اس کا بیج وہ ناول کے آغاز ہی میں بو دیتے ہیں۔ 3

وارث علوی نے جس نقطے کی طرف ہمارا دھیان دلایا ہے قاضی عبدالستار کے ناولٹ کے پس منظر میں یہ بات حقیقت ثابت ہوتی ہے خاص طور سے جب کسی واقعہ کا آغاز ہوتا ہے قاری سوچ میں پڑ جاتا ہے کہ اس واقعہ کا اس قصے سے کیا لینا دینا ہے مگر جب وہ چھوٹا سا واقعہ مرکزی واقعہ سے مل جاتا ہے تو قاضی صاحب کے پلاٹ سازی کی داد دینی پڑتی ہے جیسے مجو بھیا میں جامن کے پیڑ کا ذکر ہے چندا اور للّی کی گفتگو سے لگتا ہے کہ یہاں صرف جامن کھانے کی بات ہو رہی ہے۔جو مکھن والے درخت کی مشہور جامن ہے مگر اسی پیڑ کو لے کر جب تراب اور مجو بھیا کے بیچ تصادم ہوتا ہے اور تراب مارا جاتا ہے تو یہ قصہ کھل جاتا ہے کہ جامن کے

3: قاضی عبدالستار کے معاشرتی ناولٹ۔وارث علوی۔ذہن جدید۔ص:79

پیڑ کا ذکر للّی کی زبانی کیوں کیا گیا۔

کردار نگاری:

''مجو بھیا'' کردار کے لحاظ سے ایک بہتر تخلیق کہا جا سکتا ہے ناول کے تمام کردار الگ الگ رنگ و رغن کے ساتھ ہمارے سامنے آتے ہیں جہاں ان میں فطری اور حقیقی رنگ ہے وہیں موقع و محل کے حساب سے بدلتے رہتے ہیں ایسا نہیں ہے کہ ''مجو بھیا'' کے کردار اکہری شخصیت کے مالک ہیں یا فرشتہ صفت ہیں یا وہ انسان کی دنیا سے نکل کر کوئی مہاتما سادھرسنت بن گئے ہیں جنھیں کوئی مصیبت نہ تو ہلا سکتی ہے اور جنھیں جنسی طلب جگا سکتی ہے یہ کردار اودھ کے چلتے پھرتے گاؤں اور قصبات کے وہ کردار ہیں جن کے اندر اصلاحی نقطہ نظر کی کھوج کرنا بے معانی ہے۔ اگر چہ ناول کے آغاز میں قاضی صاحب نے ''مجو بھیا'' کو ہرفن مولا قرار دیا ہے مگر دھیرے دھیرے مجو بھیا کے اندر ایک چالاک تیز سفاک خود مختار انسان کی شکل دکھائی دینے لگتی ہے مجو بھیا کا کردار تمام قصہ میں موجود ہے۔ مجو بھیا کا کردار ناول کے فضا میں چھایا ہے اور ناول کے موضوع اور عنوان کے لحاظ سے سب سے اہم کردار ہے

''مجو بھیا'' کا اصلی نام منظور ہے مگر دوستوں اور ہندو ہم ساتھیوں اور گاؤں کی فضا نے ظ کو ج میں تبدیل کر دیا اور وہ منظور سے ''مجو بھیا'' پا کر شہرت حاصل کر لی۔ اس کے علاوہ آس پاس کے لوگ ''مجو بھیا'' کے لئے کارِ خیر سے اتنا متاثر ہوتے ہیں کہ انھیں مسجد کی امامت کراتے ہیں اور عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

فسادات ہونے پر مجو بھیا کے گھر کے قریب کسی کو بھٹکنے کی اجازت نہیں اور ان کے ساتھی ہم وقت ان پر جان نچھاور کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔

یہاں تک کہ ضلع کے پولیس اور سپرٹینڈنٹ بھی ''مجو بھیا'' کو ہر بات سے آگاہ کرتے ہیں۔ مجو بھیا کا کردار جہاں ایک رئیس اور شہرت یافتہ مختار کا کردار ہیں وہیں ان کے اندر جنسی کمیاں اور خرابیاں بھی ہیں للّی کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھنا اور اس کے ساتھ رات گزارنا پھر اس کے بیماری کے ڈر سے للّی کو چھوڑ کر چندا کے ساتھ جسمانی تعلق بنانا ان کی جنسی کمزوری کو ثابت کرتا ہے۔ قاضی عبدالستار نے ان کی اس کمزوری کی طرف خوبصورتی سے اشارہ کیا ہے:

''مجو بھیا'' اپنی شہیتر ایسی ٹانگو پر پہاڑ سا بدن گھسیٹتے ہوئے اٹھے۔ کمرے کی دہلیز سے نکلتے ہی جلتے توے پر ان کا ہاتھ پڑ گیا اور دل اچک کر حلق میں اٹک گیا سنسان راتوں کے لمبے خوابوں کی جگمگاتی ہوئی زندہ تعبیر ان کے بازوؤں کی گرفت میں دھڑک رہی تھی۔ وہ اس لالچی بچے کی طرح ساکت کھڑے رہے۔ جسے مٹھائی کے جنگل میں چھوڑ دیا گیا ہو۔ ابھی وہ اپنے ہاتھوں میں بھری ہوئی آرزوؤں کی دولت ایک نظر دیکھ بھی نہ پائے تھے کہ شانوں سے ان کے ہاتھ تراش لئے گئے۔ پھر انھوں نے بجلی کی روشنی میں دیکھا للّی آنگن میں چھپ چھپ کرتی بھیکتی ہوئی جا رہی تھی۔'' 4

اچھائیوں برائیوں خامیوں سے بھرا ہوا یہ کردار اپنے آپ میں مکمل ہے جو اودھ کے گاؤں کی فضا کی بھرپور نمائندگی کرتا ہے۔ جو زوال آمادہ تہذیب گم ہوتی روایت کا زندہ ثبوت ہے جنھیں اپنے اثر ورسوخ کو قائم رکھنے کی فکر ہے ساتھ ہی دامن کو داغدار ہونے سے بچانے کے لئے غیر انسانی فعل کو کرنے کی ہمت اور طاقت ہے مگر اپنے افعال وکردار پر نظر ثانی کی ضرورت نہیں ہے۔

ناول میں دوسرا اہم مرد کردار تراب کا ہے جو بگڑا ہوا لوفر لفنگا نوجوان گدّیوں کی شان ہے یہ کردار گدّیوں کی آن بان قائم رکھنے اور غریب انسانوں سیدھے سادھے لوگوں کو ڈرا دھمکا کر رکھتا ہے اس کے علاوہ ہر گھر کی بہو بیٹیوں پر بھی نظر رکھتا ہے جنھیں شادی والے دن اپنے گھر میں اٹھوالیتا ہے۔ اس پر حیرت کی بات یہ ہے کہ اس کے قبیلے کے لوگ تراب کو سمجھانے کے بجائے اس کو مزید بڑھاوا دیتے ہیں اس کے لئے ایک بھینس کا انتظام کرتے ہیں تا کہ وہ اس کا دودھ پیئے اور خوب طاقت بنائے۔ تراب کئی عورتوں سے رشتہ بنائے ہوئے ہے بھکا پاسی کی بیوی کو اپنے پاس رکھتا ہے ساتھ ہی منگلو کی بیوی چندا سے عشق لڑاتا ہے ساتھ ہی للّی کی طرف گندی نگاہوں سے دیکھتا اور اس پر جملے اچھالتا ہے۔ مگر ایک مجو بھیا کے ساتھ لڑائی میں مارا جاتا ہے۔

للّی کا کردار عورت کے کردار میں سے اہمیت کا حامل ہے جو برص کی بیماری کی گرفت میں ہے جس کی وجہ سے اس کی شادی نہیں ہو پاتی وہ ایک کنواری جوان دوشیزہ ہے۔ جب وہ حاجی میٹھے کے پاس دوا لینے جاتی ہے تو حاجی میٹھے اپنے اکیلے پن سے عاجز آ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیتے ہیں اور اس کو اپنے منکوحہ بیوی بنانا

4: پیتل کا گھنٹہ۔ قاضی عبدالستار۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔ 2013ء۔ ص: 57

چاہیئے ہیں للّی کا باپ قادر خاں اپنی جوان بیٹی کو ایک بوڑھے کے ہاتھوں میں سودا کر دیتا ہے ایک جملے میں کہا جائے تو اپنے سینے کے بوجھ کو اتار پھینکنا ہے۔ گاؤں دیہات وقصبات میں غریبی و مفلسی سے دوچار انسان کے لئے حاجی میٹھے جیسے لوگ زحمت کا باعث ہوتے ہیں جو قادر خان جیسے باپ کی رحمت کو ان کے اثر سے اٹھالے جاتے ہیں اور باپ کے سر کی رحمت کا بوجھ ہلکا کرتے ہیں۔

شادی کے بعد للّی بالکل بدل جاتی ہے اور بن سنور کر جب باہر نکلتی ہے تو ہزاروں ہوس زدہ نگاہیں اس کی طرف گھورنے لگتی ہیں اور تراب کی آنکھ اس پر ٹک جاتی ہے ایک دن تراب اس کو اپنی ہوس پرستی کا نشانہ بنالیتا ہے۔ للّی کے حلیے کو قاضی عبدالستار نے خوبصورتی سے ہمارے سامنے پیش کیا ہے:

> ''شادی کے بعد للّی جو باہر نکلی تو مان پور چونک پڑا لوہے کی بالٹی پر سونے کی قلعی ہوگئی تھی۔ سارنگی کے تاروں کی طرح کسا ہوا انگ انگ بجنے لگا تھا جر پٹھی لوکیوں کا جھوا سر پر رکھ کر جب وہ شرماتی ہوئی بازار میں پہونچی تو دور دور تک دلوں نے دھڑکنا چھوڑ دیا۔ بکس کو یقین نہ آتا تھا کہ یہ قادر پھوپھا کی وہی لونڈیا للّی ہے جس کے ہاتھ کی چلم پیتے ابکائی آتی تھی۔ للّی کے مہندی لگے ہاتھ اس وقت تک ناچتے رہے جب تک جھوا دیکھنے والوں کی چھاتیوں کی طرح خالی نہ ہوگیا۔'' 5

مگر جب ''مجو بھیا'' تراب کی موت کے بعد چندا کی طرف نگاہِ التفات بڑھانے لگتے ہیں اور چندا کے ساتھ چاندنی رات گزارنے لگتے ہیں تو یہ بات للّی کو ناگوار گزرتی ہے اور ''مجو بھیا'' کا سارا سچ عدالت کے سامنے اگلنے کے لئے تیار ہوجاتی ہے مگر اس کے پہلے للّی کو اپنی جان گنوانی پڑتی ہے مجو بھیا کا سچ کھلنے سے پہلے ہی وہ قتل کر کے بورے میں بھر کے پھینک دی جاتی ہے۔

عرض للّی کا کردار متحرک زندہ اور فعال کردار ہے جو عام روایتی عورتوں کی طرح ڈرا سہما یا خوف زدہ نہیں ہے بلکہ تراب جیسے بدمعاش کا مقابلہ کرتی ہے اور اس کی گندی نگاہوں کا اپنے انداز سے جواب دیتی ہے اور اپنی عزت بچانے کے لئے ''مجو بھیا'' اور تراب کے بیچ لڑائی کرا دیتی ہے نتیجے کے طور پر تراب مارا جاتا ہے اس کے علاوہ چندا کے ساتھ ''مجو بھیا'' کو دیکھ اپنے دل کی بھڑاس نکالتی ہے اور اس کو دھمکاتی ہے۔ غرض للّی کے کردار میں اپنے سے طاقت ور انسان سے ٹکرانے کا مادہ موجود ہے جو اسے اس ناول میں نہایت

5: پیتل کا گھنٹہ۔ قاضی عبدالستار۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔ 2013ء۔ ص: 51

اہم بنا دیتا ہے۔

للّی کے علاوہ چندا کا بھی اہم کردار ہے للّی جہاں ایک طرف بہادر بے خوف وںڈر ہے جس کے اندر حالات سے ٹکرانے کی طاقت ہے وہیں چندا کا کردار ایک عام سی عورت کا ہے جو اپنے شوہر سے مار کھاتی ہے اور تراب کے ہاتھ کا کھلونا بھی بنی رہتی ہے تراب کے مرنے کے بعد ''مجو بھیا'' اس کے ساتھ رشتہ بناتے ہیں مگر چندا ایک چالاک عورت ہے جو للّی کا پتّہ کا ''مجو بھیا'' سے کاٹ دیتی ہے اور خود ''مجو بھیا'' کے بستر پر اپنا گھر بنالیتی ہے۔

''مجو بھیا'' ناولٹ میں دوسرے چھوٹے چھوٹے کردار بھی ہیں جو ضرورتاً سامنے آتے ہیں جن میں حاجی میٹھے کا کردار یا راج دین وغیرہ جو کہانی کو آگے بڑھانے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔

مکالمہ نگاری:

مکالمہ نگاری جہاں ناول کے لئے ضروری ہوتے ہیں وہیں مکالمہ نگاری میں ناول نگار کو بیک وقت کئی باتوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے کہ مکالمہ جست درست اور برمحل ہوں۔ مکالمہ کی زبان بھی کردار کے مطابق ہو ایسا نہ ہو کہ ایک دیہاتی جاہل کردار فارسی زبان بولے یا دیہات کا آدمی کسی شہری انداز میں بات چیت کرے۔

''مجو بھیا'' میں جہاں اودھ کے گاؤں کو پیش کیا گیا ہے اور ناولٹ میں اودھ کے ہی لوگ دکھائی دیتے ہیں ٹھیک اسی طرح اسی میں اودھی اور دیہاتی زبان کا استعمال کیا گیا ہے۔ جو مکالمہ نگاری میں حقیقت کا پورا عنصر سما گیا ہے۔

مکالمہ نگاری کی اسی خصوصیت کے بنا پر ناول میں کہیں بھی اٹکاؤ یا پیچیدگی پیدا نہیں ہوتی چھوٹے چھوٹے جملوں اور مکالموں کے ساتھ پوری فضا کو برمحل بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ساتھ ہی آدھے جملے کو لکھ کر کہانی کے واقعات کو پیش کرنے کی خوبصورت فضا دکھائی دیتی ہے۔

یہاں ایک اقتباس پیش کرتی ہوں جہاں للّی ''مجو بھیا'' کی بانہوں میں چندا کو دیکھ کر برہم ہوتی ہے اور اس نے ''مجو بھیا'' کی پول کھولنے کی کوشش کرتی ہے ان ادھورے جملوں میں مکالمہ نگاری کا سارا حسن سمٹ آیا ہے:

''چندا اپنے شانوں پر بکھرے ہوئے بالوں کو سمیٹ کر دوپٹہ اوڑھ رہی تھی۔ للّی اپنے

دھونکنی کی طرح چلتے ہوئے سینے کوسنبھالا اور گویائی کی ساری قوت جمع کر کے آہستہ سے

بولی۔

''میں جارہی ہوں''۔

''ہاں...دفعان...ہوجاؤ''

مجو بھیا نے دوسرا جوتا مارا اور کان تک کھینچی ہوئی کمال کی طرح صابر للّی دفعتاً لوٹ گئی۔

''تراب یہی دن کے لئے مارے گئے ہیں۔''

پلنگ سے اٹھتے ہوئے مجو بھیا کے چہرے پر اپنے جملے کا ردعمل دیکھے بغیر مُڑ گئی۔

''للّی۔''

مجو بھیا کی دہاڑ نے دالان ہی میں للّی کو ڈس لیا وہ کھڑی ہوگئی۔ مجو بھیا نے اپنا دھنی ایسا

ہاتھ اس کے کندھے پر رکھا اور ایسے لہجے میں بولے جیسے داروغہ کسی عادی مجرم کو تاکید کر

رہا ہو۔

''اگر یہ بات کسی کو معلوم ہوگئی تو اچھا نہیں ہوگا۔''

''للّی نے آنکھیں اٹھا کر مجو بھیا کو گھورا جن کے نتھنے بھڑک رہے تھے اور آنکھوں سے

چنگاریاں نکل رہی تھیں۔

برائی کے لئے ایک چندہ نائیں ہیں....کلکراواں کا گھوڑا۔'' 6

قاضی عبدالستار نے آدھے جملے میں مکالمہ نگاری کی خوبیاں اور ناولٹ کے واقعات کو پیش کر کے مزا دوبالا کر دیا ہے۔

قاضی عبدالستار نے اس ناول میں فضا آفرینی اسلوب نگاری اور اپنے فنی نقطہ نظر سے اس ناولٹ میں بیک وقت کئی موضوعات کو پیش کیا دیہاتی زندگی پر مبنی یہ ناول اپنی مقامی زبان و بیان کے نقطہ نظر سے اہمیت کا حامل ہے اگرچہ اودھی زبان کے جملے اور الفاظ قاری کے شستہ مزاجی کو تھوڑی دیر کے لئے کوفت میں بھی ڈالتے ہیں مگر بہ غور پڑھنے پر ناولٹ کے معانی و مفاہم عیاں ہو کر اپنے حسنِ واقعات میں اضافہ بھی کرتے ہیں۔

''مجو بھیا'' ناولٹ میں قاضی عبدالستار نے ایک دیہاتی پس منظر کو پیش کیا ہے۔جس زمیندارانہ نظام

6: پیتل کا گھنٹہ۔قاضی عبدالستار۔ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔2013ء۔ص:85-84

کی مٹتی ہوئی روایت اپنے اقتدار کو قائم و دائم کرنے کی ہوس خود کو دوسروں سے اوپر اور اونچا سر رکھنے کی فطرت نظر آتی ہے جہاں خود کی عزت بچانے کے لئے اپنے ساز وسامان کے ذریعہ دوسروں کو کمتر اور نیچا دکھانے کی ذہنیت نظر آتی ہے۔ اس ناولٹ میں ایک قصبے کے آپسی تفر کے رنگین ماحول ان پڑھ لوگوں کے بیچ ایک دوسروں سے نفرت اور تشدد کو برقرار رکھنے کی بھی کوشش کی جاتی ہے جس کی وجہ سے بہت سے لوگوں کو اپنی جان سے ہاتھ دھونے پڑتے ہیں۔ اس ناولٹ کے نقطہ نظر کو واضح کرتے ہوئے قاضی عبدالستار فرماتے ہیں۔

> ''مجو بھیا'' میں ایک نوجوان معمولی زمیندار، ایک رئیس کے گھوڑے پر عاشق ہوتا ہے اور اسے اپنے جان نثاروں کے ذریعہ چوری کرا لیتا ہے۔ اس کا رنگ بدل دیتا ہے اور اس ضمن میں جو بھی اس کے راستے میں آتا ہے اسے قتل کر دیتا ہے یا اجاڑ دیتا ہے ساری کہانی صرف دو باتوں کے گرد گھومتی ہے۔ ''گھوڑے کا حصول اور اقتدار کی سلامتی۔'' [7]

یہ بات حیرت انگیز اور مسرت آمیز ہے کہ قاضی عبدالستار نے الگ انداز سے ادب میں بہت کچھ نئے طور طریقے سے پیش کیا ہے جیسے پہلی بار انھوں نے بادل، یعنی ہاتھی، گھوڑا ان سب جانوروں کی کہانیاں پیش کی ہیں جو پورے سماج کو متحرک رکھتی ہیں اور زمیندارانہ نظام کے اس سماج کی عکاسی کی ہے جہاں سیر وشکار کا شوق انھیں پالتو بنانا اور ان کے حصول کے لئے جنگ وجدل بھی ہونا دکھایا ہے۔ جانور اسی معاشرے میں کتنی اہمیت رکھتے تھے اور زمیندار اپنی آن بان اور شان کو قائم رکھنے کے لئے ان کو اپنے پاس رکھتے تھے اس بات کی بھی عکاسی ہوتی ہے جو اپنے اقتدار کو قائم رکھنے کے لئے ایک معمولی زمیندار بھی کسی طرح حدوں کو پار کر جاتا ہے مگر خود کو سرنگوں نہیں ہونے دیتا ہے۔ ''مجو بھیا'' میں ان تمام واقعات وحادثات کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔

غرض قاضی عبدالستار کی یہ کہانی اپنے نقطہ نظر اور فکر کے لحاظ سے منفرد ہے جو انھیں ادب میں ایک مقام دلاتی ہے اور نئے نئے موضوعات کو شامل کرنے کے لئے اردو ادب ان کا احسان مند ہے۔

قاضی عبدالستار نے عشق کی کہانیاں نہیں لکھیں، اگرچہ ایک عام سی روایت رہی ہے پبلی سیٹی کے لئے

7: پیتل کا گھنٹہ۔ قاضی عبدالستار۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔ 2013ء۔ ص: 271

لوگوں نے ایسی کہانیاں خوب لکھی ہیں اور کمرشیل نقطہ نظر سے بھی یہ ایک فائدہ مند تجارت رہا ہے مگر قاضی عبدالستار کے منفرد نوعیت کے موضوع پر لکھی گئی کہانیاں انھیں شہرت اور کامیابی عطا کی ہیں۔

☆☆☆

بادل

’’بادل‘‘ قاضی عبدالستار کا مختصر ناولٹ ہے جو پہلی بار 1965ء میں ’’نیا دور‘‘ کراچی سے ’’غارِ شب‘‘ کے ساتھ 1974ء میں نصرت پبلشر، لکھنؤ سے شائع ہوا۔ اس میں بادل کے ساتھ دو مختصر ناولٹ ’’غبارِ شب‘‘ اور ’’مجو بھیا‘‘ بھی شامل ہیں۔ اس ناولٹ کو قاضی عبدالستار نے علامت کے طور پر پیش کیا ہے۔ ناولٹ کو قاضی عبدالستار نے علامتی انداز میں لکھا ہے اور آزادی کے بعد زمینداری نظام کا خاتمہ اور پھر اس نظام کے ساتھ نئے سرمایہ دارانہ نظام کا دھیرے دھیرے تسلط کس طرح ایک بادل کی شکل میں کئی گھروں اور انسانوں کی زندگی تباہ و برباد کرتا ہے۔ بادل چونکہ ایک جانور ہے مگر اس جانور کے ذریعہ قاضی صاحب نے ظلم و جبر کی داستان اور زمیندارانہ نظام کے مختلف مسائل اور ساتھ تعلقداری نظام کے خاتمے کے ساتھ اچانک رونما ہونے والی پریشانیوں ان تمام واقعات کا ذکر ناولٹ میں ملتا ہے۔

بادل ایک ایسا زمیندارانہ نظام ہے جب تک وہ موجود تھا زمینداروں کا گھر پریوار، خاندان محفوظ تھا مگر جیسے ہی وہ ختم ہوا یا یہ نظام اس گھر سے نکلا بہت سے گھروں کو تباہ و برباد کیا اور بہت سے لوگوں کی زندگیوں کا خاتمہ کر دیا۔

قاضی عبدالستار نے اس ناولٹ میں تاریخی واقعوں کو بھی بیان کیا ہے۔ واجد علی شاہ، جنگ آزادی اور بیگم حضرت محل کے جنگ میں شریک ہونے کا ذکر ملتا ہے ساتھ ہی انقلاب اور انقلابیوں کی شہادتوں کا بیان ملتا ہے۔ ساتھ ہی وطن کے کچھ غدّاروں کا بھی ذکر کیا ہے۔ غضنفر علی جو انقلاب کے بعد انگریزوں کی مخبری کرنے کی وجہ سے راجہ نواب بن چکے تھے لکھنؤ کے شیعہ حکومت سے پشتینی عداوت رکھتے تھے۔ ان کے خاندان کے ہی اکبر علی مہرولی کے چودھری کے یہاں بادل نہایت جتن کے بعد پیدا ہوا تھا۔ اس بادل کی پیدائش کے بارے میں قاضی عبدالستار نے اپنی سوانحی گفتگو میں راشد انور راشد سے اس ناولٹ ’’بادل‘‘ کے قصہ پر اپنا نقطۂ نظر بتاتے ہوئے کہتے ہیں:

''بادل کو میں نے زمینداری کی علامت بنایا ہے۔ وارث علوی اور باقر مہدی دونوں نے اسے علامتی ناولٹ کہا ہے اور یہ بھی ناولٹ ہے۔ یہاں بھی ایک زمیندار، دوسرے زمین دار کے ہاتھی پر عاشق ہو جاتا ہے اور اسے حاصل کرنے کے لیے شادی بھی کرتا ہے اور دلہن کو چھوڑ بھی دیتا ہے۔ ظاہری کہانی کے اندر باطنی کہانی بھی چلتی رہتی ہے چوں کہ زمین داری نظام کو برباد ہونا ہی ہے، اس لیے ہاتھی کے ذریعے دو گھر برباد ہوتے ہیں اور ہاتھی خود بیمار ہو جاتا ہے۔''[1]

قاضی عبدالستار نے الگ الگ زاویے سے کہانیاں لکھیں ہیں اگر چہ ان کے معاشرتی ناولوں میں زمیندارانہ اور جاگیردارانہ نظام کے آس پاس کا ہی بیان ملتا ہے۔ مگر جتنے مختلف نظریہ فکر اور متنوع خیالات کے تحت انھوں نے کہانیاں لکھی ہیں یہ کسی دوسرے فنکار کے یہاں مشکل سے نظر آتی ہے۔ انھوں نے اس نظام کے الگ الگ جزئیات کو نہایت باریکی سے دیکھا اور محسوس کیا اور پھر اپنی تخلیق کا محور و مرکز بنایا۔ ''غبار شب'' بھی اپنے انداز کی بالکل نرالی اور منفرد کہانی ہے جس میں اقتدار کو قائم و دائم رکھنے کے لیے مذہب کی تبدیلی دکھائی گئی ہے وہیں دوسری طرف ''مجوّ بھیّا'' میں حصولِ اقتدار کے لیے اور اپنی من پسند چیز حاصل کرنے کے لیے قتل۔ مجوّ بھیّا ایک گھوڑے پر عاشق ہو جاتا ہے اور جب وہ گھوڑا حاصل نہیں کر پاتا تو اسے قتل کر دیتا ہے اور دوائیوں کے ذریعہ رنگ تبدیل کر دیتا ہے۔ اس طرح سے اس کہانی اس ناولٹ میں ''بادل'' یعنی ہاتھی کو پانے کے لیے کئی زندگیاں ختم ہو جاتی ہیں اور مختلف خاندان تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔

قاضی عبدالستار نے اس ناولٹ کے پردے کے پیچھے تعلقہ داروں کے ان مسائل کو بھی پیش کیا ہے جو ان کے سماج میں بہت گہری جگہ بنا چکے تھے اور ان تمام مسائل اور خطرات سے آگاہ ہوتے ہوئے بھی یہ طبقہ اپنی جھوٹی انا کی خاطر ضد پر اڑا رہتا تھا۔ جس کے چلتے گھر کے گھر اجڑ جاتے تھے مگر وہ اپنی شان پر ڈٹے رہتے تھے۔

قصہ: ''بادل'' کی کہانی کچھ اس طرح ہے۔ بادل ایک ہاتھی کا نام ہے جو مہرولی کے چودھری اکبر علی کا پالتو جانور ہے۔ یہ پالتو ہاتھی چودھری اکبر علی کو جان سے زیادہ عزیز اور بیٹے کی طرح پسند ہے جسے وہ اپنے سینے سے لگا کر رکھتے ہیں۔ بادل دیکھنے میں بہت خوبصورت اور سمجھدار ہے بہت سارے لوگ اسے

1: قاضی عبدالستار: اسرار و گفتگو (گفتگو کی شکل میں سوانح عمری)۔ راشد انور راشد۔ عرشیہ پبلی کیشن، نئی دہلی۔ ص 271

چودھری سے چھیننے کی کوشش کرتے ہیں مگر ناکام رہتے ہیں۔

قاضی عبدالستار نے چودھری اکبر کے خاندان اور ان کے مہرولی میں ان آبا و اجداد کی تاریخ بھی خوبصورت انداز سے پیش کی ہے۔ قاضی عبدالستار کو تاریخ نگاری پر جو ملکہ حاصل ہے وہ اکثر ان کے فن میں در آتا ہے۔ اس ناول کو انھوں نے نیم تاریخی بنا کر پیش کیا اور بہت کم سے کم الفاظ کا استعمال کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ مہرولی والوں نے جس طرح سے مغل شہنشاہ سے ٹکرانے اور واجد علی شاہ سے سرفرازی خلعت پہنے کے واقعات کے علاوہ جب انگریزوں کے خلاف بیگم حضرت محل لکھنؤ سے لوہا لے رہی تھیں اس وقت مہرولی کے لوگوں کے کس طرح سے ان کا تعاون کیا اس کی روداد اس کہانی میں نظر آتی ہے۔ اس کے علاوہ اس ناولٹ میں انگریزی حکومت کے دوران ہندوستانیوں اور انگریزوں کے مابین تصادم 1942ء کی بھارت چھوڑ وتحریک کو بھی ناولٹ کا ایک حصہ بنا کر پیش کیا ہے۔ اس انقلاب کے شہیدوں کے ساتھ ناولٹ کے تعلقہ دار کی چودھری اکبر علی کی موت ہو جاتی ہے۔ اس کا بھی ذکر ملتا ہے۔ اس کے علاوہ 1952ء کے عام انتخابات پھر 1956ء میں پنچایت کے الیکشن کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔ ان سب واقعات کو ناولٹ میں فنی خوبی کے ساتھ قاضی عبدالستار نے پیش کیا ہے اور ان واقعتاً کا سہارا لے کر ایک طرح قاضی عبدالستار نے یہ بھی دکھانے کی کوشش کی ہے اس ناولٹ میں سچائیاں موجود ہیں اس واقعہ اور ناولٹ کا قصہ حقیقی سرزمین پر موجود ہے۔ غرض اس ناولٹ میں انھوں نے اپنے چند واقعات کو جوڑ کر ایک ناولٹ کی شکل دے دی ہے۔

بہرحال چودھری اکبر علی کی ایک ہی بیٹی زینو یعنی زینت ہے اور وہ شکل وصورت کی اچھی نہیں ہے۔ اس کی ولادت کے وقت ماں چل بسی۔ زینو کے جوان ہونے پر باپ کو اس کی شادی کی فکر لاحق ہوتی ہے لشکر پور کے ٹھاکر ریاست علی عرف رسّو بھّیا بھی ''بادل'' کو حاصل کرنا چاہتے ہیں مگر جب ناکامی ہاتھ لگتی ہے تو دوسری چال چلتے ہیں اور زینو سے اپنا رشتہ بھیجتے ہیں۔ چودھری رشتہ قبول کر لیتے ہیں اور نہایت دھوم دھام سے بارات آتی ہے۔ پورے علاقے کو دلہن کی طرح سجایا جاتا ہے۔ اور گرمی کی وجہ سے نزدیکی کنوؤں میں شکر ڈال دیا جاتا ہے یہ بارات اور شادی لوگوں کو مدتوں تک یاد کرتے رہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو جس میں بارات کے منظر کو پیش کیا گیا ہے:

''کئی باجے پوری آواز سے بج رہے تھے۔ کئی آتش باز ایک ساتھ بان چھوڑ رہے تھے،

چرخیاں چلا رہے تھے اور گولے داغ رہے تھے۔ بہت سی طوائفیں اور میراثی اور بھاٹ
آگے پیچھے مبارکبادیاں گاتے چل رہے تھے۔ سڑک کے دونوں طرف چھوٹے چھوٹے
کچے گھروں کے دروازوں پر بندھے ہوئے جانور بھڑک رہے تھے اور عورتیں اور بچے
کانوں تک آنکھ پھاڑے بارات دیکھ رہے تھے۔''2؎

دولہا بھی سج دھج کر سسرال آتا ہے اور''بادل'' کی حرکتیں دیکھ کر اس کے منھ میں پانی آتا رہتا ہے۔ غرض سلامی کی رسم کے لیے گھر کے اندر جاتا ہے اور سلامی میں خوش دامن اس کی بلائیں لیتی ہیں اور روپیوں سے بھری ہوئی تھالی اس کے سامنے رکھتی ہیں اور دولہا کا ہاتھ چھوانا چاہتی ہیں مگر دولہا نے دونوں ہاتھ سمیٹ کر گود میں رکھ لیے۔ اس کے بعد اس کے سامنے اشرفیوں سے بھری ہوئی تھیلی رکھی جاتی ہے مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوتا ہے تبھی شہ بالا صاحب فرماتے ہیں کہ بھائی جان ہاتھی کو مانگ رہے ہیں۔ دولہے راجہ کی اس فرمائش پر لوگ بے چین ہو جاتے ہیں۔ خوش دامن کہتی ہیں یہ نیک شگون کی بات اشرفیوں کو چھولو اس کے بعد ہاتھی بھی دیں گے مگر وہ صاحب بالکل تیار نہیں ہوتے، یہاں کہانی ایک نیا موڑ لیتی ہے اور ہاتھی ایک کردار بن جاتا ہے۔ ریاست بھائی کی طرف سے دولہا کہتا ہے کہ میں نے ہاتھی نہیں مانگا۔ میں نے بادل کو مانگا ہے اور اس پر چڑھ کر لشکر پور جائیں گے۔ چودھری کو جب یہ بات پتہ چلتی ہے تو وہ بہت پریشان ہوتے ہیں اوت کہتے ہیں کہ''بادل'' کوئی ہاتھی نہیں ہے بلکہ وہ میرا بیٹا ہے اور بیٹیوں کے جہیز میں بیٹے نہیں دیئے جاتے ہیں۔

غرض دولہا بے غیر دلہن لیے بارات واپس لے کر چلا جاتا ہے۔ اس کے بعد گھر میں عورتوں کی چہ مگوئیاں شروع ہو جاتی ہیں اور سبھی زینت یعنی دلہن کو اس کا قصوروار ٹھہراتے ہیں اور کہتے ہیں کہ پیدا ہوتے ہی ماں کو کھا گئی اب باپ کی عزت داؤ پر ہے۔

دلہن اس صدمے کو برداشت نہیں کر پاتی ہے اور وہ خودکشی کر لیتی ہے۔ ابھی چودھری اکبر علی مہر کے معاملے میں سیتا پور کورٹ میں بارایٹ لا سے مشورہ کر رہے تھے کہ 1947ء کے انقلاب کے وقت پولس کی گولی لگنے سے موقعے پر ہی دم توڑ گئے۔ ریاست علی کی لالچ میں پھر بھی کمی نہیں آتی اور وہ اپنے خسر اور بیوی کی موت کی خبر پا کر سسرال جاتے ہیں اور جہاں خوش دامن نے انھیں مختار عام بنا دیا مگر رسّو بھیّا خوش دامن

2؎: بادل۔ قاضی عبدالستار۔ ص 119

سے بادل لینے کے کاغذ پر دھوکے سے درخواست کرالاتے ہیں اوراپنے ساتھ بادل کو لے کرلشکر پور چلے آتے ہیں۔ یہاں سے کہانی آگے بڑھتی ہے اور بادل مہرولی سے نکل کرلشکر پورآ جاتا ہےمگر کھانا پینا چھوڑ دیتا ہےحریص لالچی ریاست علی بادل پر جلدازا جلد سواری کرنا چاہتے ہیں۔ایک دن جب بادل کھانا کھالیتا ہے تو ریاست علی فیل بان کے ساتھ سیر کو نکلتے ہیں راستے میں بادل اپنارخ مہرولی کی طرف موڑ دیتا ہے جب فیل بان اس لشکر پور کی طرف موڑ نا چاہتا ہے یہاں بادل کی بدتمیزی اور بد دماغی دیکھنے میں آتی ہے اور وہ سونڈ سے پکڑ کرفیل بان کو پٹک دیتا ہےجس سےاس کی موت ہوجاتی ہےاس کے علاوہ ریاست علی بھی خوب گھائل ہوجاتے ہیں اوران لوگوں کی ٹانگ ٹوٹ جاتی ہے اورلکھنؤ کے ہسپتال میں بھرتی ہونا پڑتا ہے وہیں سے ریاست علی کا نام لنگڑے بھّیا پڑ جاتا ہے۔

ریاست علی کے دواور بھائی تھےان سے جائیداد کو لے کر جھگڑا چلتا رہتا ہےاور وہ بندوقوں پر قبضہ کر لیتے ہیں اور جائیداد بھی لیتے ہیں اور ریاست علی کو بدلے میں ’’بادل‘‘ ملتا ہے۔دونوں بھائی اپنا حصہ فروخت کرکے پاکستان چلے جاتے ہیں ساتھ ہی الیکشن میں ان کے خلاف ایک جولاہے کو کھڑا کرکےان کو پنچایتی الیکشن ہرا دیتے ہیں۔زمینداری اور جائیداد کے ختم ہونے کے بعد اب ’’بادل‘‘ کو رکھنا مشکل اوراس کے خرچ اٹھانا دشوار ہوجاتا ہے۔ایک پنڈت جی کا قرض لنگڑے بھّیا پر چڑھ جاتا ہے۔جس کی ادائیگی وہ فوراً ان سے چاہتا ہے۔غرض ’’بادل‘‘ کو بیچنے کی نوبت آجاتی ہے۔لنگڑے بھّیا ملومہتا کودس ہزارروپیہ میں بادل کو بیچ ڈالتے ہیں۔ملومہتا بادل کو پالینے کا جشن منا رہا ہوتا ہےتبھی ہاتھی پاگل ہوجاتا ہےاور وہ ملومہتا کےلڑکے کے ساتھ آٹھ لوگوں کو مارڈالتا ہے۔گاؤں میں شور ہونے کے بعد کی بادل پاگل ہوگیا ہے سپاہی کی گولی لگنے پراُس کی موت ہوجاتی ہے۔

اس علامتی ناولٹ میں قاضی عبدالستار نے بادل کے روپ میں زمینداری نظام کے خاتمے کو دکھایا ہے۔جو بالآخر مارا جاتا ہےاور گھر سےنکل کرمختلف گھروں کو برباد کرتا ہے۔’’بادل‘‘ دراصل زمیندارانہ آن، بان، شان وشوکت کا مظہر ہے جس کی وجہ سے بہت سے حادثات رونما ہوئے۔اس ناولٹ میں قاضی عبدالستار نے زمینداروں کی ہوس اور لالچ کوموضوع بحث بنایا ہےجنھیں اپنی بیٹی کی خوشیوں سے عزیز ایک جانور بن گیا اوراس جانور کے چلتے ایک جوان لڑکی خودکشی کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔زمیندارانہ نظام میں ایسی

ہی بہت سی نو جوان لڑکیوں کی کہانیاں مل جاتی ہیں جو اپنے باپ، دادا اور خاندان کی شان وشوکت کی خاطر بلی کا بکرا بنائی گئیں اوران کی قربانیاں دی گئیں اور بہت سے لڑکیوں کی زندگیاں کرب ناک صورت حال میں گزری تھیں مگر ان باتوں کی کوئی حقیقت یا معنویت زمینداروں کے یہاں نہیں ہوتی تھی بلکہ وہ عورتوں کو اپنے پاؤں کی جوتی بنا کر رکھنے اور عیش وعشرت کا سامان ہی سمجھا۔ اس کے علاوہ ہر حادثات کے پیچھے عورت ہی قصوروار ٹھہرائی گئی جیسے اس ناولٹ میں زینو کو منحوس قرار دیا گیا ہے اور بے چاری زینو نام کی لڑکی سماج اور خاندان میں منھ دکھانے کے قابل خود کو نہ سمجھتے ہوئے خود کی زندگی کو ختم کر لینے میں ہی عافیت سمجھی۔

اس ناولٹ میں مفاد پرستی اور مطلب پرستی کی بوآتی ہے۔ جہاں شادیاں کسی لڑکی سے نہیں بلکہ ایک ہاتھی کو پالینے کے لیے کی گئی اور جب ہاتھی نہیں ملا تو بارات واپس چلی گئی اور ایک زندہ جیتی جاگتی لڑکی کو اپنے ہوس و لالچ کا راستہ بنایا گیا۔ جائیداد اور جہیز کے لیے عورتوں کو سیڑھی کی طرح استعمال کرنا اس سماج میں بہت آسان کام تھا۔

لیکن زینت کے مرنے کے بعد بھی اس لالچی ریاست علی کا حال بھی کچھ اچھا نہیں ہوا اور اس کو اپنے گناہوں کی سزا ملنے لگی۔ ''بادل'' تو انھیں مل جاتا ہے مگر اس کے بدلے انھیں بہت کچھ گنوانا پڑتا ہے ان کی عزت قدرومنزلت سب کچھ ختم ہو جاتا ہے یہاں تک جسمانی معزوری بھی جھیلنی پڑتی ہے ان کے سگے بھائی زمین وجائیداد بیچ کر پاکستان چلے جاتے ہیں اور وہ بے یارومددگار ہسپتال میں پڑے رہتے ہیں۔

غرض ''بادل'' ایک ایسا علامتی ناولٹ ہے جس میں قاضی عبدالستار نے زمیندارانہ اور جاگیردارانہ نظام کے پروردہ لوگوں کی ہوس پرستی کو خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔

کردار نگاری: ''بادل'' میں قاضی عبدالستار نے مختلف طرح کے کردار پیش کئے ہیں جو جاندار اور متحرک ہیں۔ کئی کردار ناولٹ میں اہمیت کے حامل ہیں جن کے اوپر پورا ناولٹ مبنی ہے جیسے ریاست علی رسو بھیّا کا کردار۔ اس کے علاوہ زینو کے باپ، اس کی ماں کا کردار۔ یہ تمام کردار فرضی نہیں کہے جا سکتے ہیں کیونکہ قاضی عبدالستار جن تاریخی حوالوں کا ذکر کیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ضلع مہرولی کے آس پاس یقیناً کوئی ''بادل'' جیسا واقع پیش آیا ہے جس کو قاضی عبدالستار نے اپنی فنی اور تخلیقی بصیرت کے ذریعہ ناولٹ کا روپ دے دیا کیونکہ زمیندارانہ نظام میں جاہ وچشم کی لڑائی عام بات تھی جو اپنی ایک لاٹھی اور ایک بھینس

کے لیےلڑ جاتے تھے۔اس ناولٹ میں بادل نامی ہاتھی کوموضوع بنایا گیا ہے۔ جوایک کردار کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ یہ''بادل''غیر معقول یامافوق الفطری کردارنہیں ہے بلکہ صرف فطری کردار جس کو چودھری نے پالتو بنا کراپنے بچے کی طرح پالا ہے۔بادل اس ناولٹ کا سب سے اہم کردار ہےجس کے اوپر پورا ناولٹ مبنی ہے اور بادل کے خاتمے کے ساتھ ہی ناولٹ کا خاتمہ ہوجا تا ہےاور پورے ناول میں اس کی حرکات وسکنات کا ذکر ہے۔''بادل'' ریاست کےلوگوں کےتوجہ کا مرکز ہے۔اکبرعلی مہرولی کےآباواجداد نے ہاتھی پالی اور بڑی مشکل کےساتھ''بادل'' کی پیدائش ہوئی۔اس کے بارے میں قاضی عبدالستار لکھتے ہیں:

''چودھری غضنفرعلی کے سترّہ بیٹے ہوئےلیکن سب شیرخوار ہی مرگئےآخران کی پانچویں بیوی سے اٹھارویں بیٹے چودھری اکبرعلی ہوئے۔اور مہرولی کے چودھری کے نام سے بجنے لگے۔اوراس وقت کینویس کے خیمے میں پڑے ہوئے دیکھ رہے تھے کہ انھوں نے کیسے کیسے جتن کیے۔کیسے کیسے پاپڑ بیلے۔کن کن راجاؤں کےپشتینی مہاوتوں سے سینہ بہ سینہ آئے ہوئےنسخوں پرعمل کر کے شاہی ہتھنی کےبطن سے''بادل'' پایا تھا۔ہائے وہ کیسا وہ غمزدہ دن تھاجسے''بادل'' کی پیدائش کی خوشی نےقلعی کر دیا تھا۔''3

بادل دیکھنے میں نہایت خوبصورت اورسڈول ہے۔ریاست علی صرف رسوبھیّا جوصرف لالچ کےتحت زینت سےشادی کرتے ہیں۔بادل کی حرکات کوللچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہیں۔بادل نہایت سمجھداراور چالاک ہےاور جب مہرولی سےشکر پوردھوکے سے ریاست علی لےکرآتے ہیں تو کھانا پینا چھوڑ دیتا ہےاور ایک دن جب ریاست علی اس پر بیٹھ کر سیر کو نکلتے ہیں تو اکھڑ جاتا ہےاور موقع پرفیل بان کو مارڈالتا ہےاور ریاست علی کوزخمی کردیتا ہےاور ملومہتا کے گھر جا کربھی آتنک مچاتا ہےاورآٹھ لوگوں کی جانیں لے لیتا ہے۔

جب ریاست علی بارات لےکرزینو کےگھرآتے ہیں تو وہ خوش آمدید اس طرح کرتا ہے۔

''ایک طرف سےآدمیوں کو چیرتا ہوامہرولی کا سدھاہوا،سجاہوابادؔل (ہاتھی) آیااوردولھا کوسلام کرکےگھوم گیا۔''4

بادل کی اہمیت اوراس کی پرورش نہایت نازونعم سے اکبرعلی کرتے ہیں اوراسے اپنے بیٹے سے بھی بڑھ کر پیار کرتے ہیں یہاں اس اقتباس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

3: غبارشب۔قاضی عبدالستار۔ص:131

4: غبارشب۔قاضی عبدالستار۔ص:120

''پھر۔۔۔پھر بادل کو پالا گیا۔ بادل جو چودھری اکبر علی کا بیٹا تھا مہرولی کا رئیس زادہ تھا۔ تھوڑے ہی دنوں میں اس کی خوش قامتی اور نیک اطواری کی دھوم مچ گئی وہ محمود آباد راج کی ''بٹلر پیاری'' کو جس کی اودھ میں نظیر نہ تھی دیکھ کر حقارت سے مسکرا دیا کرتے۔ ہاتھی کے مقابلے پر ہتھنی کو سدھانا بہت آسان ہوتا ہے پھر بھی بادل ''بٹلر پیاری'' سے کسی بات سے کم نہ تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ کئی باتوں میں آگے تھا لیکن چونکہ ''بادل'' اک چھوٹے سے رئیس کے پاس تھا اس لیے اسے وہ شہرت نہ مل سکی جس کا وہ حقدار تھا پھر وہ اس رجواڑے کا نام یاد کرتے کرتے تھک گئے جس نے بادل کو خریدنے کی حسرت نہ کی تھی۔''5؎

اس بات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ بادل نہایت خوبصورت اور سدھا ہوا جانور تھا جس کو پالنے کی لوگ حسرت کیا کرتے تھے پہلے ریاست علی نے بھی اسے خریدنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکے اس لیے وہ دوسرے راستے سے ہاتھی کو پانے کی کوشش کرتے ہیں۔ جب انھیں اس طرح بھی ناکامی ہاتھ آتی ہے تو دھوکے سے کاغذ پر دستخط کرا کے خوش دامن سے ہاتھی لے جاتے ہیں۔ مگر بادل اپنے مہرولی اور اپنے مالک کا وفادار تھا اور اس نے ان تمام لوگوں کو مار ڈالا جس نے اسے مہرولی کے اکبر علی سے دور کرنے کی کوشش کی اور بادل نے نہایت چالاکی سے خود کو تیار کر لیتا ہے اور جب رسّو بھیّا اس پر بیٹھ کر سواری کرنے نکلتے ہیں تو انھیں اور فیل بان کو زخمی کر دیتا ہے۔ فیل بان جنگل خان کو موقعے پر ہی موت ہو جاتی ہے۔ غرض ناولٹ میں ''بادل'' نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ یہ کوئی مافوق الفطری کردار نہیں ہے بلکہ حقیقی کردار ہے جس کے اوپر ناولٹ کا دارو مدار ہے اور جسے قاضی عبدالستار نے نہایت فنکاری سے پیش کیا ہے اور پہلی بار کسی جانور کے اوپر اس طرح سے کوئی ناولٹ لکھا گیا۔ اس لحاظ سے بھی اس ناولٹ کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔

''بادل'' کے چند دوسرے کرداروں میں اکبر علی رئیس مہرولی کا کردار اہمیت کا حامل ہے۔ جنھوں نے بادل کو پالا اور اس کی پرورش نہایت ناز و نعم سے کی ہے۔ زینت کے پیدا ہونے پر اس کی بیوی مر جاتی ہے اور وہ ایک جوان میراثن سے شادی کر لیتے ہیں اور خود کی سگی بیٹی سے زیادہ بادل کو چاہتے ہیں جب ریاست علی ان کا داماد بادل کو جہیز میں مانگتا ہے تو وہ انکار کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بیٹیوں کی شادیاں میں بیٹے نہیں دیئے جاتے۔ یہ ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں جنھوں نے مغل بادشاہ سے لوہا لیا اور بیگم حضرت محل

5؎: غبار شب۔ قاضی عبدالستار۔ ص: 131

جنگ آزادی میں جب ہار گئیں تھیں ان کے آبا و اجداد میں سے شیخ غضنفر علی نے ان کا استقبال کیا اور انھوں نے خوش ہو کر غضنفر علی کو بخشش میں جا گیریں عطا کیں۔ اس جا گیر میں سے ایک ہتھنی کی اولاد بادل تھا۔ بارات واپس ہونے کے بعد زینوان کی بیٹی بدنامیوں اور رسوائیوں کو برداشت نہیں کر پاتی اور افیون اور کڑوا تیل پی کر خودکشی کر لیتی ہے۔ اور جب اکبرعلی کو بیٹی کی خودکشی کی خبر ملتی ہے تو وہ بہت غمگین ہوتے ہیں جب حق مہر لینے کے لیے کورٹ بارایٹ لا کے تحت سیتاپور جاتے ہیں تو انقلابیوں کی گولیوں کا شکار ہو کر مر جاتے ہیں۔

غرض اکبرعلی کا کردار ایک ایسے رئیس تعلقدار کا کردار ہے جنھیں تعلقداروں کے ذوق وشوق سیر و شکار سے دل چسپی ہے اور جاہ وحشم کے مالک ریاست مہرولی میں ایک عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں پوری ریاست میں ان کا رعب و دبدبہ ہے۔ بارات والے دن اکبرعلی نے شاہانہ انتظام کیا اور گرمیوں کے دن کے سبب کنویں میں شکر ڈلوا دیا جس کی وجہ سے لوگ مدّتوں اس بارات اور اکبرعلی کی شان وشوکت کو بیان کرتے تھے۔

دوسرے اہم کرداروں میں جن پر ناولٹ کا بیشتر حصہ خرچ ہوا۔ ریاست علی عرف رسّو بھیّا کا کردار ہے۔ یہ حرص وہوش لالچی کردار ہے جنھیں صرف اپنے مفاد اور اپنی لالچ دکھائی دیتی ہے اور وہ بعد میں ایک المیہ کردار بن جاتے ہیں۔ ان کو ان کے خود غرضی لالچ اور دھوکے کی سزا مل جاتی ہے۔

ریاست علی پہلے پیسے کے بل پر بادل کو خریدنا چاہتا ہے مگر جب ناکامی ہاتھ لگتی ہے تو زینت سے شادی کے ذریعہ بادل کو مانگتا ہے انکار ہونے پر دلہن لیے بغیر واپس چلا جاتا ہے۔ اس کے اندر انسانیت، اخوت، محبت نام کی کوئی چیز نہیں ہے اور اس کی اس حرکت کے سبب ایک عورت اپنی جان دینے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ جب دھوکے سے اکبرعلی مارے جاتے ہیں تو پرسے کے بہانے اپنے سسرال جاتا ہے کیونکہ انھیں خوش دامن مختار بنانے کی دعوت بھیجتی ہیں وہاں پر جائیداد کے پیپر پر دستخط کرنے کے بہانے ''بادل'' کے کاغذ پر بھی دھوکے سے دستخط کرا لیتا ہے اور اس طرح وہ بادل کا مالک بن جاتا ہے اور جب مہرولی سے لشکر پور لاتا ہے تو بادل کے فیل بان کالے خان کو بھگا دیتا ہے اور ایک نئے فیل بان جنگل خان کو مہاوت بنا دیتا ہے۔ بادل جب کھانا پینا چھوڑ دیتا ہے تو اسے خوب مارتا ہے بادل کی پرورش ناز ونعم میں ہوئی تھی اور ہمیشہ اسے محبت ملی

تھی مگر ریاست علی کو اس سے کوئی محبت نہیں ہوتی ہے اور وہ بادل پر سواری کرنے کے لیے بے چین ہوتے ہیں۔ایک دن جب بادل راتب کھالیتا ہے تو اس پر بیٹھ کر سیر کو نکلتے ہیں بادل موقعے کی تلاش میں تھا باہر نکلتے ہی وہ مہرولی کی طرف جانے لگتا ہے جب جنگل خان اس کو مار کر اس کا رخ لشکر پور کی طرف موڑنا چاہتا ہے تو وہ جنگل خاں کو سونڈ سے پکڑ کر مار ڈالتا ہے اور ریاست علی کو زخمی کر دیتا ہے۔

ریاست علی اب ہسپتال میں داخل ہو جاتے ہیں اور لنگڑے ہو جاتے ہیں۔ بھائیوں کے ساتھ جائیداد کا بٹوارہ ہوتا ہے اور انھیں صرف بادل ہاتھ لگتا ہے۔ان کے بھائی جائیداد بیچ کر پاکستان چلے جاتے ہیں اور پنچایت کے الیکشن میں ان کے ہارنے کا انتظام کر جاتے ہیں۔ریاست علی کی رہی سہی عزت بھی خاک میں مل جاتی ہے اور قرض بڑھنے پر انھیں بادل کو بالآخر بیچنا پڑتا ہے۔

غرض ریاست علی ایک متحرک کردار ہے اور نہایت اہمیت کا حامل ہے اگر چہ اس کا کردار منفی ہے مگر ولن بھی کبھی کبھی ہیرو پر بھاری پڑتا ہے۔ریاست علی ایک خودغرض انسان ہے قاری کو اس کی سوچ اور اس کی لالچ سے نفرت ہوتی ہے۔ ناولٹ کے آخر میں اگر چہ اس کو بہت دکھ کا سامنا کرنا پڑتا ہے مگر قاری کو اس سے ہمدردی نہیں ہوتی بلکہ محسوس ہوتا ہے کہ خودغرضی اور لالچ کی اسے سزا مل رہی ہے اور وہ اپنے کرموں کا پھل پا رہا ہے۔ناولٹ میں یہ کردار نہایت اہم ہے۔

اس کے علاوہ زینت کا کردار اکبر علی کی دوسری بیوی اور مکونی کے ٹھاکر، جنگل خاں، کالے خاں، ملومہتا کا کردار ضمنی اور ذیلی کردار ہیں مگر سبھی اہمیت کے حامل ہیں اور اپنا اپنا پارٹ ادا کر کے ناولٹ کو انجام تک پہونچانے میں مدد کرتے ہیں۔

منظر نگاری: قاضی عبدالستار کو منظر نگاری پر ملکہ حاصل ہے۔وہ کسی بھی منظر کے بیان میں اتنی باریکی سے کسی واقعہ کو پیش کرتے ہیں کہ اس کی مکمل تصویر بن جاتی ہے۔

''بادل'' میں انھوں نے سیر و شکار کے دلدادہ تعلقداروں کا ذکر کیا ہے اور ایک ایک منظر کو خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ناولٹ کے شروع میں جس طرح منظر نگاری کی گئی کیسے ایک کوّا آٹے میں پھنس جاتا ہے۔ اس کے بارات اور شادی کے واقعات، رسم و رواج، دولہا کا سلام کرائی کی رسم ایک ایک منظر کو انھوں نے نہایت باریکی اور خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ چند اقتباس کے ذریعہ قاضی صاحب کی منظر نگاری کو آسانی

سے سمجھا جا سکتا ہے اوران کے بیانیہ آرٹ کی پذیرائی کی جا سکتی ہے۔

''ٹھاکر کے دروازے فیل خانے کے سامنے والے میدان میں خاصا لمبا چوڑا گڈھا کھدا ہوا تھا جو کوئی کمر بھر گہرا تھا اس میں لکڑیاں ٹھسی ہوئی تھیں اوراتنے زوروں سے جل رہی تھیں کہ ان کی گرمی فیل خانے تک پہنچ رہی تھی اور ہاتھی کو نکال کر باغ میں باندھ دیا گیا۔ اس آگ کے کنارے لشکر پور کے نو جوان ٹھاکر ریاست علی ایک شکرہ داہنے ہاتھ میں پکڑے آگ دکھار ہے تھے جب شکرہ آنکھیں بند کرنے لگتا تو پاس کھڑا ہوا ملازم چڑیامار پیچھے بیٹھے ہوئے نوکروں کو اشارہ کرتا اور وہ لوگ پیپے بجانے لگتے اس شور سے شکرہ آنکھیں کھول دیتا۔اور آگ کو دیکھنے پر مجبور ہو جاتا وہ تیسرا دن تھا اور شکرہ تقریباً ''غلام'' ہو چکا تھا۔'' 6

ایک اور منظر میں قاضی عبدالستار نے جہاں زمیندارانہ کے لوگوں کے عیاش ،بٹیر بازی ،کبوتر بازی اور چند دوسرے تفریحی مشغلوں کا ذکر کیا ہے اوراس نظام کے لوگوں کے سیر وشکار کا بھی بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔محلوں ،ڈیوڑھی ،مینار و گنبد کا بھی معنی خیز منظر بیان کیا ہے۔اقتباس ملاحظہ ہوں:

''لشکر پور کے ٹھاکرامانت علی نے اُتر سے پورب تک پھیلے ہوئے کئی گاؤں اکھاڑ کر پھینکوا دیئے تھے اور وہاں جھیل پیدا کر لی تھی۔جھیل میں چڑیاں پر کانے کے لیے آبی پرندے کاٹ کر ڈال دیئے جاتے۔چارہ بویا جاتا تھا اور ایک سپاہی چوبیس گھنٹے پہرہ دیا کرتا تھا۔لشکر پور کی دوسرے سمتوں میں بانس کی چوڑی اور گھنی باڑھ تھی کہ خرگوشوں کے ساتھ گیدڑ تک رین بسیرہ کرنے لگے اور نوجوانوں کے تیروں اور کتّوں کا نشانہ بننے لگے۔ ٹھاکر کے مکان کا ایک بہت لمبی چوڑی اور اونچی ڈھی (مٹی کا ٹیلہ) پر پھیلا ہوا تھا۔ ساری عمارت پکی تھی لیکن ایک ایک لکڑی سبک سجل اور منقش تھی۔ڈیوڑھی کے جہازی دروازے پر مین پوری کے کاریگروں نے مہینوں ہاتھی دانت کا کام کیا تھا اس کی دوسری منزل سے خیر آباد شریف کے مخدوم میاں کی درگاہ کا گنبد نظر آتا تھا۔'' 7

وارث علوی گنجفہ باز خیال میں قاضی صاحب کی منظر نگاری کی خوبیوں کو بیان کیا ہے۔لکھتے ہیں:

''ناول کا آرٹ بیان کرنے کا نہیں دکھانے کا آرٹ ہے۔ایسا لگتا ہے قاضی عبدالستار

6: غبارِ شب۔قاضی عبدالستار۔نصرت پبلشرز،لکھنؤ،ص:110

7: غبارِ شب۔قاضی عبدالستار۔ص:110

نے قلم رکھ کر کیمرہ ہاتھ میں لے لیا ہے، ایک ایک منظر کا ایسا بیان کرتے ہیں کہ ان کے بیانیہ میں قلم کا حسن پیدا ہو جاتا ہے۔ کہانی کا تعمیری حسن ایسا ہے کہ قاضی صاحب معمارِ اعظم کی طرح اینٹ پر اینٹ رکھے جاتے ہیں اور در و دیوار اور ستون و محراب اور برج نمایاں ہو کر ایک رفیع الشان عمارت کی ڈیزائن سے ذہن کو حیرت زدہ کرتے ہیں۔'' 8

یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ قاضی عبدالستار جب کسی واقعہ کا منظر بیان کرتے ہیں تو اس کی ایک ایک جزئیات کی مکمل عکاسی کرتے ہیں جس کی وجہ سے منظر مکمل طور پر قاری کی آنکھوں کے سامنے چھا جاتا ہے۔ ان کا قلم بیانیہ انداز میں بادشاہوں کی طرف جاہ و جلال کے ساتھ دکھائی دیتا ہے۔ چاہے وہ تاریخی کہانیاں لکھ رہے ہوں جس میں محلوں کے بیان، بادشاہوں کی آرائش و زیبائش یا پھر کسی صحرا ریگستان کا بیان ہو یا پھر اپنے معاشرتی، سماجی ناولوں میں کسی دیہاتی یا کسی روایتی کھیل کود، میلے ٹھیلے کا ذکر ہو۔ انھیں ایک ایک منظر کو بیان کرنے پر عبور حاصل ہے انھیں اپنے قلم پر اتنی گرفت ہے کہ وہ کسی بھی منظر کو خوبصورت دیدہ زیب بنا کر آسانی سے پیش کر سکتے ہیں۔ اس ناولٹ میں چڑیا پر کانے اور شکرہ کو پالتو بنائے جانے کے منظر کو اتنی باریکی سے بیان کیا ہے کہ قاری حیرت زدہ رہ جاتا ہے ساتھ ہی اسے زمینداروں کے ان اشواق کا پتہ چلتا ہے جو انھیں مرغوب تھے۔

زبان و بیان: قاضی عبدالستار کو مختلف زبانوں کے استعمال پر عبور حاصل ہے۔ ان کا قلم شاہانہ مزاج کی بھی عکاسی کرتا ہے اور عام انسان کی بھی۔ ان کے یہاں زبان میں شیرینی، لطافت اور چاشنی موجود ہے وہیں فارسی آمیز مسجع و مقفع جملے بھی موجود ہیں۔ قاضی عبدالستار اکبر اور بدھو کی زبان سے بھی بہ خوبی واقف ہیں۔ انھیں یہ بات اچھی طرح معلوم ہے کہ اکبر نہ تو بدھو خیراتی کی زبان بول سکتا ہے اور نہ بدھو اکبر کی زبان اس لئے جب ان کے سماجی اور دیہی ناولٹوں کو پڑھتے ہیں تو کردار کی حیثیت کے مطابق زبان بھی پڑھنے کو ملتی ہے۔ جہاں دیہاتی ماحول میں دیہات کے لوگوں کے جملے بگڑے ہوئے تلفظ و روایتی اور دیہی زبان کا استعمال۔ ایک بات اور قابلِ ذکر ہے کہ ان کے یہاں عورتوں کی زبان کا بھی خوبصورت استعمال دیکھنے کو ملتا ہے۔ عورتوں کے بولنے کے انداز ان کے مہاورے ان کی ناز و ادا کے ساتھ بلائیں لینے دعائیں دینے اور ان تمام موقوع پر استعمال کی گئی زبان و بیان کو ہم قاضی صاحب کی تخلیقات میں آسانی سے پڑھ سکتے

8: گنجفہ باز خیال۔ مصنف وارث علوی۔ ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی۔ ص: 29

ہیں۔اقتباس میں عورتوں کی زبان کی ایک مثال پیش کرتی ہوں زبان کی لطافت اور چاشنی میں عورتوں کی زبان کا بھرپور انداز صاف دکھائی دیتا ہے:

''مہرولی والے اس گھر کو جانتے ہیں۔۔۔خیر اس گھر کو جوار میں جانتا کون نہیں ہے لیکن بخشے تمہارے باپ سے مہرولی کے چودہری بھائی سے اچھے خاصے تعلقات تھے آنا جانا تھا۔کھانا پینا تھا۔ہڈّی بوٹی میں بھی وہ برابر کے ہیں لیکن۔''

اتنا کہہ کر وہ چپ ہوگئیں۔پھر دھیمی آواز میں اسی طرح بڑے بھیّا کی مخالف سمت میں دیکھتی ہوئی بولیں۔

''لڑکی ذرا صورت میں کم ہے۔''

''اب سے دور پار۔۔۔جب چھوٹے بھیّا کی جوڑی آئی ہے۔اور میں مقبول میاں کے پاس گئی ہوں تو وہاں چودہرائن بھی تھیں اور بٹیا بھی تھی۔۔۔چودہرائن خیر سیکڑوں میں ایک ہیں۔لیکن لڑکی کم رو ہے۔پھر گھر بھی سوتیلا ہے۔اگر چودھرائن کے لڑکا نہ ہوا تو لڑکی جائیداد کی بھی وارث ہوگی۔۔۔صورت کی کمی کے ساتھ یہ پشیتنی بھی ہے۔۔۔یہ سب تو تمہارے سوچنے کی بات ہے میرا کیا ہے۔۔۔۔ایک بہو صورت میں کم ہوگی تو اللہ رکھے دو بہوئیں صورت میں زیادہ آجائیں گی پھر نگوڑی صورت بھی کوئی دیکھنے کی چیز ہے۔ایک سے ایک صورت دارین سال دو برس میں کوّے ہڑانے لگتی ہیں۔۔۔شریفوں میں صورت دیکھی بھی نہیں جاتی۔۔۔۔شکل تو رنڈی پتریا کی دیکھی جاتی ہے۔''[9]

عورتوں کی زبان،ان کی عادات واطوار کا ذکر قاضی صاحب کے یہاں کمال باریکی سے آیا ہے۔عورتوں کا بولنا،ہنسنا،رونا،شرمانا،کپڑے،گہنے،ان کی ہر ایک ادا کا ذکر قاضی صاحب کے فن میں ایک الگ انداز سے پیش ہے۔جاگیردار اور تعلقدار گھرانوں کی عورتوں کا ذکر بھی ان کے فن کا ایک اہم پہلو ہے۔

مکالمہ نگاری: مکالمہ نگاری ایک فن ہے اور کسی بھی تخلیق میں مکالمہ اس کی جان ہوا کرتے ہیں جس طرح ڈراموں میں مکالمہ کی نہایت خاص اہمیت ہوتی ہے اسی طرح دوسرے فن پاروں میں بھی اس فنی معائب ومحاسن کو نظر میں رکھنا پڑتا ہے۔مکالمہ جتنا چھوٹا گڈھا ہوا اور برجستہ ہوگا وہ تخلیق اتنی کامیاب ہوگی

9: غبار شب۔قاضی عبدالستار۔ص:14

اوراس پر حقیقت نگاری کا غلبہ ہوگا اور قاری مکالمے میں دل چسپی لے گا۔ قاضی صاحب اس فن سے مکمل طور سے واقف ہیں اور انھوں نے اپنی تخلیقات میں اس بات کا لحاظ رکھا ہے کہ مکالمہ کردار کے حسب و مراتب کے مطابق ہی بیان کئے جائیں۔ اقتباس پیش کرتی ہوں:

''ارے سلمٰی۔''

''ہاں''

''غوث پور والا حال سنئے رہوء''

''ارے وا فرشتہ رہے فرشتہ...''

''کون؟''

''وہی غوث پور والا بیٹا۔۔۔''10؎

اس طرح بہت سے مقامات پر چھوٹے چھوٹے مقالے اپنی زبان کے ساتھ موجود ہیں جو کردار بولتا اور سمجھتا ہے۔ برجستہ اور گڈھے ہوئے جملے جن میں لچک نہیں ہے بلکہ وہ مکالمہ نگاری کے دوسرے فنی باریکیوں سے لبریز ہیں۔ پیچیدگی اور الجھاؤ نظر نہیں آتا۔ اودھ کی زبان سے ناواقفیت کی بنا پر اگر چہ کچھ قاری کو دقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے مگر ذرا سے غور و فکر سے مطلب واضح ہو جاتا ہے۔

باقر مہدی ''بادل۔ ایک تنقیدی جائزہ'' میں قاضی عبدالستار کے افسانوں اور ان کی تخلیقات کے باریک پہلوؤں پر گہری نظر ڈالی ہے اور جس طرح قاضی عبدالستار کو ان کے ہم عصر نقادوں کے ذریعہ نظر انداز کرنے کی کوشش کی گئی اس پر بھی سوال قائم کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

> ''سالہا سال پہلے میں نے قاضی عبدالستار کی کہانی پڑھی تھی برسوں بعد میں نے دوبارہ اس کہانی کو پڑھا ہے یوں تو ''بادل'' ایک ہاتھی کا نام ہے مگر یہ جاگیرداری دور کی علامت ہے میں نے بادل پر مضمون لکھنے سے پہلے سید رفیق حسین کے کئی افسانے اور ان پر لکھے گئے مضامین پڑھے۔ قاضی صاحب کا ''بادل'' بالکل مختلف نوعیت کا طویل افسانہ ہے۔ قاضی صاحب نے ''بادل'' کو ایک علامت کی صورت میں پیش کیا ہے تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ انا (EGO) کے آپسی تصادم سے کیا کیا نقصانات ہوتے ہیں پورا کا پورا جاگیرداری نظام کس طرح درہم برہم ہو جاتا ہے۔ میں کسی نقاد کو ہدف ملامت نہیں بناتا

10؎ بادل۔ قاضی عبدالستار۔ ص13

بلکہ خود شر مسار ہوں میں نے اس کہانی کو (پہلے) پسند کیا تھا۔اس پر مضمون لکھنا چاہئے تھا حد یہ ہے کہ پروفیسر احتشام حسین نے عابد سہیل اور انگنت افسانہ نگاروں کا نام لیا ہے مگر قاضی عبدالستار کا کہیں بھی نام نہیں ہے۔ ''اعتبار نظر'' اردو افسانہ پر ایک طویل مضمون ہے مگر ان کا نام نہیں ہے یہی نہیں پروفیسر محمد حسن تک نے قاضی صاحب پر کبھی کسی مضمون میں نام نہیں لیا ہے گویا کہ وہ قاضی صاحب کے استاد رہ چکے ہیں میری سمجھ میں نہیں آتا کہ نقادوں اور ایڈیٹروں نے قاضی صاحب کے ساتھ ایسا رویہ کیوں اختیار کیا؟ شاید اس لیے کہ قاضی عبدالستار نہایت خوددار شخص ہیں وہ کسی کے ''حواری'' نہیں رہے وہ محض پدم شری قاضی عبدالستار ہیں یعنی اپنی انائے واحد مالک۔''[11]

نقطۂ نظر: نقطۂ نظر کے لحاظ سے دیکھا جائے تو ناولٹ کے ظاہری پہلو کے ساتھ ایک باطنی کہانی بھی چلتی ہے اگر قاری اسے کسی علامت کے طور پر نہ قرأت کر کے صرف ناولٹ کے نقطۂ نظر سے پڑھے تو اسے اس میں دلچسپی نظر آئے گی۔اور وہ ایک نئے انداز کی کہانی سے لطف اندوز ہوگا وہیں دوسری طرف بادل کو اگر زمیندارانہ نظام کی علامت کے طور پر پڑھیں گے تو ہمیں احساس ہوگا کہ بادل کوئی نہیں بلکہ ایک ایسا نظام ہے جب تک یہ تھا اس طبقے کو لوگ ہنسی خوشی اور فراغت سے زندگی گزار رہے تھے مگر جیسے ہی ریاست اور قانون نے اسے لینے کی کوشش کی اور دھوکے سے زمینداری نظام کو ختم کر دیا تو اس نظام نے بہت سے گھروں اور خاندانوں کو تباہ و برباد کر دیا۔اور جو مسلمان تعلقدار بادل کی خواہش میں ہندوستان رہ گئے انھیں لنگڑا لولا اور مفلسی میں مبتلا کر دیا اور جو بادل کو چھوڑ کر پاکستان چلے گئے انھوں نے اپنی حیثیت حاصل کر لی اور ہندوستان کے لوگ جو بادل یعنی زمیندارانہ نظام کے پروردہ تھے انھیں کچھ حاصل نہ ہوا بلکہ صرف گھروں اور جانوں کی تباہی و بربادی ہی دیکھنے کو ملی۔

☆☆☆

11: نذر قاضی عبدالستار۔مرتب پروفیسر محمد غیاث الدین۔ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی۔ص 187

غبارشب

''غبارشب'' قاضی عبدالستار کا سماجی ناول ہے۔ یہ پہلی بار 1966ء میں اوراس کے بعد 1974ء میں نصرت پبلشرز، وکٹوریہ مارکیٹ، لکھنؤ سے شائع ہوا۔ضخامت کے لحاظ سے دیکھا جائے تو 67 صفحات پر مشتمل ایک بہترین ناولٹ ہے۔

راشدانور راشد کو دیے گئے ایک انٹرویو میں انھوں نے ''غبارشب'' ناولٹ پر مختصر مگر جامع بات کی ہے اور انھوں نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ اردو ادب میں ''غبارشب'' جیسے ناولٹ کی کوئی نظیر نہیں۔ یہ ایک ایسے شخص کی کہانی ہے جس نے اپنا مذہب تبدیل کر کے فرقہ پرست ذہنیت کے لوگوں کو ہمیشہ کے لئے خاموش کر دیا۔

> ''غبارشب کی کہانی اپنی طرح کی نرالی کہانی ہے۔ پورے اردو ادب میں اس کی کوئی نظیر نہیں۔ اقتدار کو ہاتھوں سے نکلتے دیکھ کر زمینداروں نے ہجرت تو کی ہے ایک سیکڑوں ہزاروں نے کی ہے لیکن ''غبارشب'' کے جمیل میاں نے جھام پور میں اپنی ریاست کو برقرار رکھنے کے لئے اپنا مذہب تبدیل کر دیا تھا اور اپنے دشمنوں کو نیست و نابود کر دیا تھا ایسی کوئی نظیر موجود نہیں۔''[1]

یہاں انھوں نے جس طرح ناولٹ کا خلاصہ پیش کیا ہے اسی طرح انھوں نے اپنے پورے سیاسی اور سماجی عناصر کے ساتھ ناول کے فنی لوازم کا بھی خیال رکھا۔ساتھ ہی انھوں نے یہ بھی دکھایا ہے کہ کسی مسئلہ سے نپٹنے کے لئے ہجرت ہی واحد راستہ نہیں ہے جیسے پاکستان بننے کے بعد مسلمانوں نے کی بلکہ دوسرے ایسے ذرائع بھی ممکن ہو سکتے ہیں جس کے ذریعہ ہندوستانی مسلمان اپنے پورے تہذیبی، سیاسی، سماجی شناخت کے ساتھ مادر وطن میں سکون کی سانس لے سکیں۔

اس ناولٹ پر اپنے خیالات کا اظہار کرنے کے بعد قاضی عبدالستار زمیندارانہ نظام کے کچھ اصول وضوابط پر بھی بات کی ہے کیونکہ قاضی عبدالستار سیتاپور تحصیل مچھرہٹہ کے ایک بڑے زمیندار گھرانے سے

1: قاضی عبدالستار: اسرار و گفتار۔ راشدانور راشد۔ عرشیہ پبلی کیشنز، نئی دہلی۔ 2014ء۔ ص: 271

تعلق رکھتے تھے اور انھوں نے بچپن سے اس نظام کے بارے میں جو کچھ دیکھا اور سنا اس کو اپنی پوری فنی باریکی کے ساتھ ادب میں پیش کرنے کی کوشش کی۔ان کے اس بیان کو ایک تاریخی حیثیت حاصل ہے کیونکہ اس نظام کے ختم ہونے کے بعد قلم کی روشنائی دے کر تاریخی دستاویز میں کو چمکتے ہوئے جو ہر نظر آتے ہیں بے شک وہ قاضی صاحب کے قلم کا حصہ ہیں۔

راشد انور راشد سے گفتگو کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ:

''میرا اودھ کے نظام زمینداری کا جو مطالعہ ہے اس میں زمین دار صرف اپنے بیٹے کا قاتل ہی نہیں، بلکہ اپنی حکومت اور ریاست کو برقرار رکھنے کے لئے مذہب کو بھی قتل کر سکتا ہے۔ایک زمین دار زادہ آیا جس کا باپ اچانک مر جاتا ہے۔ ہما شما اس کے اقتدار پر قابض ہونا چاہتے ہیں وہ کسی نہ کسی طرح ان پر حاوی رہتا ہے لیکن ایک آزاد کردار جو آزاد ہندوستان میں ہندو ہونے کی حیثیت سے اس کی رقابت، اقتدار طاقت کو چیلنج کرتا ہے اور اسے یہ محسوس ہوتا ہے کہ میں مسلمان رہ کر نہ صرف اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا بلکہ مسلمانوں کی حفاظت بھی نہیں کر سکتا اپنی مسجدوں اور درگاہوں کو محفوظ نہیں رکھ سکتا اور جھام پور گاؤں کے رئیس کی حیثیت سے ہندو ہو جاتا ہے اور اپنا نام جھام سنگھ رکھ لیتا ہے اور اب جھام پور میں کسی کی مجال نہیں کہ اس کے اقتدار کو چیلنج کر سکے۔''[2]

قصہ: یہ ناولٹ تقسیم ہند کے قبل اور اس کے بعد کے عرصے پر مبنی ہے۔ تقسیم ہند سے پہلے اور اس کے بعد جس تیزی سے ہندوستان میں تبدیلی ہوئی تھی ان تمام پہلوؤں کی بہترین عکاسی کی گئی ہے۔ سیاسی، سماجی اور تہذیبی زندگی جس طرح عام انسانوں پر اثر انداز ہو رہی تھی ان تمام موضوعات کو قاضی عبدالستار نے اس مختصر ناولٹ میں سلیقے سے برتنے کی کوشش کی ہے۔ یہ ناولٹ آج کے ہندوستانی معاشرے کی جیتا جاگتا ثبوت ہے کہ تقسیم کے اتنے عرصہ گزرنے کے باوجود بھی ہندوستان میں فرقہ واریت فسادات سیاسی چپقلش اپنے عروج پر دکھائی دیتی ہیں۔ یہ ضرب و تقسیم صرف زمینی حدود اور خطوں تک ہی محدود نہ تھی بلکہ اس نے دل و دماغ کو بھی بانٹ دیا۔تہذیبی، مذہبی فرق سب سے زیادہ اثر انداز ہوئے مشترکہ کلچر جو ایک طرح سے ہندوستان کی پہچان اور رواداری بھائی چارگی کی علامت تھے تیزی سے مجروح ہونا شروع ہو گئے۔مگر

---

[2] قاضی عبدالستار: اسرار و گفتار۔راشد انور راشد۔عرشیہ پبلی کیشنز، نئی دہلی۔2014ء۔ص:272

دونوں گر پوں میں ابھی بھی کچھ لوگ ایسے تھے جو بنا مذہبی تفریق کے اپنے روایت سے جڑے تھے انھیں اپنے مذہب کی فکر نہیں بلکہ اپنے مالک ملک زمین سے ابدی لگاؤ اور محبت تھی وہ کسی بھی قیمت پر وفاداری رواداری کو مذہبی لبادے میں لپیٹ کر ملک وقوم کی خدمت سے پیچھے نہیں ہٹ رہے تھے۔''غبار شب'' ایسی ہی ایک کہانی ہے جس میں تقسیم ہند کے بعد اقبال نارائن جیسے لوگوں کے دلوں میں اقتدار کی خواہش ابھرتی ہے اور وہ تمام بھائی چارگی اور روایت کو بالائے طاق رکھ کر اقتدار پر اپنے ہوس، حرص وقتل وخون کے ذریعے نفرت پھیلانا چاہتے ہیں اور رام سنگھ جیسے لوگ ہیں جو مالک جمیل بھیا کے وفادار ہیں جو کسی بھی قیمت پر اپنے روایت سے دستبردار نہیں ہونا چاہتے ہیں۔ کچھ ذرا ذرا سی بات پر فساد و دنگے کرانے کی سیاسی سازش ہے اس کا بیان ملتا ہے۔ یہاں کے لوگ بڑے چین وسکون سے بلا تفریق مذہب وملت رہ رہے تھے اچانک سے ایک دوسرے کے دلوں پر خون سوار ہو جاتا ہے اور انھیں ایک اچھا موقع مل جاتا ہے جمیل بھیا اس کے اسی شطرنجی چال سے واقف ہیں کیونکہ اس کے باپ کے دور اقتدار میں بھی پیپل اور تعزیے کو لے کر منافرت پھیل گئی تھی۔ شیخ مظفر جو جسمانی طور سے کمزور اور اس ناول ایک باوقار شخصیت کے حامل شخص کے انداز میں پیش ہوئے ان کے دور اقتدار میں محرم کا جلوس نکلتا ہے راستے میں پیپل کی مہادیو جن پیڑ اور قصائیوں کے بڑے تعزیے کو راستے سے نکالنے کو لے کر بحث ہو جاتی ہے کہ بغیر پیپل کی شاخ کاٹے تعزیہ نکل نہیں سکتا مگر چودھری اقبال نارائن بضد ہے کہ شاخ نہیں کاٹی جائے گی۔ مگر جب یہ مسئلہ جھگڑے تک پہنچتا ہے تو لالہ اقبال شیخ جی کی عیادت کو آتا ہے قصائیوں کے بڑے تعزیے اور پیپل کی شاخ کو کاٹنے کا موضوع اٹھاتا ہے اور کہتا ہے کہ قانون ہوگا خاں صاحب ان پیپل نہیں کٹے گا۔

تفضّل حسین نے عنایت خاں کو دیکھا اور عنایت خاں نے کہا پیپل تو کٹے گا چودھری جی تو میں بحث ہونے لگتی ہے اور یہ موضوع جھام پور کے شیخ کے پاس جاتا ہے اور انھوں نے اپنی سمجھ بوجھ سے اس مسئلہ کا آسانی سے حل نکال لیا اور جھام پور ایک بڑے ہنگامے اور فساد کی چپیٹ سے بچ گیا۔ مگر ایک افسوس ناک واقعہ ہوتا ہے کہ اس کے فیصلے کے بعد ہی شیخ مظفر اس دار فانی سے کوالوداع کہہ دیتے ہیں اور پیپل کی ڈالی کاٹنے کے بعد جلد از جلد سمیٹ لیا جاتا ہے۔ شیخ کی تدفین ہو جاتی ہے۔ دوسری طرف جمیل بھیا جو ابھی تعلیم حاصل کر رہے تھے ابھی درجہ دہم کے طالب علم تھے ان کے ناتواں کندھے پر اقتدار کو سنبھالنے کا بوجھ آتا

جاتا ہے غرض وہ اپنی کتابیں سمیٹ لیتے ہیں اور پنچایت کی مسند پر بیٹھ جاتے ہیں۔ تقسیم ہند کے بعد ان کا اثر و رسوخ دھیرے دھیرے گھٹنے لگتا ہے مگر ابھی بھی لوگ ان سے وفاداری کا ثبوت دیتے ہیں کیا ہندو کیا مسلمان سبھی ان کے در پر ان کے فیصلے منتظر ہوتے ہیں۔ زمینداری کے خاتمے کے اعلان کے ساتھ اقبال نارائن اور جمیل بھیا الکشن لڑتے ہیں مگر اقبال نارائن کو بری طرح شکست کھانی پڑتی ہے اور وہ موقع کی تلاش میں ہوتا ہے کہ کس طرح جمیل بھیا کو اقتدار سے ہٹا کر خود قابض ہو جائے۔ جب معاملہ ملو قصائی کے گابھن گائے کو ذبح کرنے کا آتا ہے تو ہزار کوشش کے باوجود بھی فساد ہو جاتا ہے اور ہزاروں مسلمانوں کے کھیت کھلیان اور مکان لوٹ لئے جاتے ہیں مگر جمیل بھیا ملو قصائی کو پولیس کے حوالے کر دیتا ہے۔ اور دوسرے دن ایک ذہنی نفسیاتی کس مکش کا شکار ہو جاتا ہے۔ بالآخر اس نے یہ فیصلہ کیا کہ جمیل بن کر وہ اپنے گاؤں اور اپنے لوگوں کی حفاظت نہیں کر سکتا جو پاکستان جانے سے رہ گئے۔ دوسرے دن وہ کھدّر لباس پہن کر گائے کی قبر پر ڈنڈوت سلام کرتا ہے اور اقبال نارائن کے جمیل بھیا پکارنے پر بولتا ہے جمیل نہیں جھام سنگھ اور اس طرح اس نے اپنا مذہب تبدیل کر کے ایک ایسا فیصلہ کیا جس کی مثال ناممکن ہے۔ اس ناولٹ کا قصہ یہی ہے۔

پلاٹ: پلاٹ سازی ایک ایسا عمل ہے جسے برتنے اور بخوبی سے سنوارنے سجانے کا سلیقہ ایک ناول یا ناولٹ کامیاب کرتا ہے۔ موتی میں لڑی پرونے کے مانند ہی پلاٹ جب ایک دوسرے سے منسلک ہوتے ہیں تو قاری بھی اس قصے یا کہانی سے جڑا رہتا ہے۔ بے ربط اور غیر ضروری بیانیہ سے جہاں پلاٹ سازی مجروح ہوتی ہے وہیں قاری کا ذہن بھی بھٹکتا رہتا ہے۔ وہ تمام مناظر کو اتنی آسانی اور قصے کی ترتیب کو ذہن میں ودل میں نہیں اتار پاتا جس سے ناول کے تمام فنی لوازم کے ساتھ اس کے باریک پہلو سامنے آسکیں۔

قاضی عبدالستار نے ''غبار شب'' کو ایک بڑے کینوس کو چند صفحات میں سمیٹنے کی کوشش کی اور ماسٹرز کی یہی خوبی ہوتی ہے کہ وہ بڑے سے بڑے واقعہ کو اتنے مختصر اور اتنے سلیقے سے ترتیب دیتے ہیں کہ بلا وجہ لفظوں اور جملوں اور کہانیوں کی بحث وتکرار سے ضخامت میں اضافہ نہیں کرتے بلکہ ایک ایک جملے میں وہ تاریخ سے ایسے باریک پہلو بیان کرتے جاتے ہیں کہ سرسری نظر سے پڑھنے والا قاری آسانی سے اسے سمجھ نہیں پاتا نتیجۃً وہ اس ناول یا قصے سے اتنا لطف اندوز نہیں ہوتا جتنا ایک باشعور قاری اور غور وفکر کرنے والا

قاری ہوتا ہے۔ساتھ ہی ناواقفیت بھی ایک بڑا نکتہ ہے اکثر ہم تاریخ کے کسی بڑے واقعے سے سب سے یا تاریخ وتہذیب کے باریک چیزوں کونہیں جانتے ہیں تو ہمیں مصنف کی باتیں سمجھ میں نہیں آتیں کہ اس نے ایک جملے میں کیا بیان کر دیا ہے اور قاضی صاحب کے معاشرتی ناول ہوں یا پھر تاریخی قدم قدم پر ایسے واقعات چندلفظوں اور چند جملوں میں لکھے ملتے ہیں جن کی آسانی سے گرفت نہیں ہوتی۔الغرض لوگ ان کی تخلیق اتنی آسانی سے نہیں سمجھ پاتے۔ساتھ ہی انداز بیان اسلوب اور نادر الفاظ کا استعمال بھی ان کے فن کو مشکل اور پیچیدہ بنا دیتا ہے۔مگر اس میں تخلیق کار کی غلطی نہیں ہے کیونکہ وہ جولکھتا ہے اس کو اپنے نظریہ ذہن و دل کی آواز پر لکھتا ہے یہ تو قاری کی نااہلی ثبوت ہے جو وہ ان کی تخلیق سے محظوظ نہیں ہوتا ہے۔

اس ناول میں بھی پلاٹ کو ترتیب وار بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔کہیں کہیں شعور کی رو سے واقعات کا بیان ملتا ہے اور کردار کے شعور کے حوالے سے قصے کو آگے بڑھانے کی کوشش کی گئی ہے۔قاضی صاحب نے واقعات کی ترتیب میں فنی حسن بصیرت سے کام لیا ہے۔جھام پور کے تعزیہ کے جلوس کے ساتھ ہی گنبد بہادر لو جی کے پیپل کی شاخ کو کاٹنے سے پیدا شدہ صورت حال کی وجہ سے ایک طرح کی فرقہ وارانہ فساد کی نوبت آگئی۔چودھری نارائن کو ایک سودی کا کاروباری اور الکشن میں جمیل بھیا سے ہارا ہوا نفرت سے بھرا ہوا انسان ہے اپنی قیادت میں ایک ہجوم لے کر آتا ہے اور دھمکی آمیز انداز میں بولتا ہے کہ پیپل کی شاخ کاٹی نہیں جائے گی چاہے تعزیہ کا جلوس اٹھے یا نہ اٹھے۔جب اس تنازع کی خبر شیخ جی کو ملتی ہے تو وہ کہتے اقبال نارائن سے کہہ دو ابھی وہ زندہ ہے۔مگر شیخ جی کے حکم کے آگے اقبال نارائن کی نہیں چلتی ہے اور وہ سارا الزام عنایت خاں اور تفضّل حسین پر ڈال دیتا ہے۔اس طرح پیپل کی شاخ کاٹ کر جلوس آگے بڑھا ہے مگر اس کے فوراً بعد ہی شیخ جی اس دنیا سے کوچ کر جاتے ہیں قاضی عبدالستار نے شیخ کی موت کو دردناک انداز میں پیش کیا ہے اور ساتھ ہی مشترکہ تہذیب کے خاتمے ایک عمدہ نشانی کے طور پر ناول کے پلاٹ میں سجایا ہے۔جہاں مانک پور میں ان کے مرنے سے ایک حشر برپا ہوتا ہے وہی سترکھ کے ٹھاکر بھارت سنگھ کے اوپر بھی شیخ جی کی موت کا گہرا اثر پڑتا ہے۔مانک پور کے لالہ سدگرو اور بھارت سنگھ شیخ جی کی خوبیوں کو بیان کرتے ہیں اور ان کی موت پر دکھ کے آنسو بہاتے ہیں اس کے علاوہ کفن بھی اپنے ہاتھوں سے پہناتے ہیں۔اقتباس ملاحظہ ہوں:

''آج باون برس کا ساتھ چھوٹ گیا گرو!

آج جوار اجڑ گیا۔

وہ چیختے رہے اور روتے رہے۔

پھر چودھری اقبال نارائن نے دونوں کو چھڑایا شیخ نہلانے گئے جب ان کو کفن پہنایا جارہا

تھا تب ٹھاکر نے لالہ سدگر کا بازو پکڑ کر کہا۔

اس کی شادی کے کپڑے بھی ہم دونوں نے پہنائے تھے۔۔۔آؤ کفن پہنا دیں۔

جھام پور کی مسجد سے جھام پور کے رئیسوں کے قبرستان تک دو میل کا کچا راستہ آدمیوں سے بجک رہا تھا۔سارے راستے ٹھاکر بھارت سنگھ تعلقد ار ستر کھا اور لالہ سدگر نرائن رئیس مانک پور نے کاندھا نہیں بدلا۔''3؎

شیخ کی موت کے بعد اس کا بیٹا جمیل بے سہارا ہو گیا اور ساری ذمہ داریوں کا بوجھ اس کے ناتواں کندھوں پر آ گیا عنایت خاں تفضّل حسین کو اپنی سیاست چمکانے کا موقع مل گیا اور جمیل کی حیثیت کمزور ہونے لگی۔مسلمانوں کے آپسی مسائل عنایت خاں کے یہاں طے پانے لگے اور اقبال نارائن ہندوؤں کا نیتا بننے کی کوشش کرنے لگا۔ایسی حالت میں جمیل نے اپنے اقتدار کو قائم رکھنے کی کوشش کی۔بکر قصاب جو شیخ جی کی زندگی میں بنا کہے ہمیشہ گوشت بھیجتا تھا اس نے جمیل کے گھر خراب گوشت بھجوائے۔جب جمیل کو اس بات کی جانکاری ملی تو غصے میں آ کر اس نے بکر قصاب کی خوب پٹائی کی اور خراب گوشت بیچنے کے جرم میں جیل بھجوا دیا۔اس سانحے کے بعد سماج میں جمیل بھیا کی دھاک بیٹھنی شروع ہوئی۔

مسر کھ کے ہولی کے میلے میں لالہ سدوگرو کی بیٹی اوشا کا ذکر ہے جس کا شوہر فوج میں ہے اور ولایت پڑھنے گیا ہے مگر جمیل بھیا سے اس کے تعلقات بن جاتے ہیں اور وہ جمیل بھیا سے پاکستان جانے کو کہتی ہے۔مگر جمیل بھیا اپنی ذمہ داریوں سے منھ موڑ کر جانا نہیں چاہتے جب کہ اچھے اچھے لوگ پاکستان جا کر ایک اچھی زندگی گزار رہے تھے۔اس پلاٹ میں قاضی صاحب نے ہندوستانی کلچر اور اس کے رسم و رواج میلے ٹھیلے کا ذکر کیا ہے ساتھ ہی اپنی اپنے وطن کی مٹی سے لگاؤ اور اپنی ذات سے نفی کر کے ایک اجتماعی زندگی کو خوش رکھنے کی ہندوستانی ذہنیت کی بھی عکاسی ملتی ہے۔

پلاٹ کے اس حصے میں اوشا کی محبت اور جمیل بھیا کی نجمہ سے محبت کی کہانی پڑھنے کو ملتی ہے جو انھیں

3؎ غبار شب۔قاضی عبدالستار۔ص181-180

چھوڑ کر پاکستان جاچکی ہےاور اپنا گھر بسا چکی ہے۔ پلاٹ کے اگلے حصے میں الکشن کا ذکر ہے جس نے ایک ایک دل زبان تہذیب اور تاریخ کو منتشر اور تقسیم کر دیا۔ اور زمینداری نظام کو دری کی طرح لپیٹ کر رکھ دیا گیا۔ میرا مساوات کے قانون اور آئین بننے کے بعد بکر قصاب بھی حاجی بن گیا اب وہ کسی زمیندار کے گھر مفت کا گوشت دینے سے سر عام انکار کرنے لگا اور کسی کو بھی الیکشن میں نامزد ہونے کی آزادی مل گئی۔ زمینداروں کا اثر رسوخ دھیرے دھیرے کم ہونے لگا۔ پاکستان جانے والے مسلمانوں نے ہندوستان سے بہتر زندگی گزارنے کی حسرت ہجرت کرنے لگے۔ مسلم لیگی لوگ مسلمانوں کو برغلانے کی کوشش کرنے لگے ایک بنا بنایا نظام ایک تہذیب دم توڑنے لگی۔ مشترکہ تہذیبی روایت آخری سانسیں لے رہی تھی اور اقبال نارائن جیسے لوگ اس دئے کو بجھانے کی جی توڑ کوشش کرنے لگے جمیل بھیا کو مسلم لیگیوں سے سخت نفرت تھی اور کانگریس کے سیکولر نقطے کے حمایتی تھے۔ ناول کے پلاٹ میں قاضی صاحب کے الیکشن کی گہما گہمی اور ہندوستانی لوگوں کی ہر ایک موقع کو میلے ٹھیلے میں بدلنے کی فطرت کی خوبصورت عکاسی کی ہے اور الیکشن کے تمام مناظر اور نیتاؤں کی بنتی بگڑتی دھڑکنوں کو باریکی سے پیش کیا ہے۔ آج بھی یہ منظر ہر الیکشن کے وقت دکھائی دیتے ہیں۔

مگر رزلٹ آنے سے پہلے ہی سیتاپور کے آس پاس ہندو مسلم فساد ہو گیا مگر جمیل کا گاؤں اس فساد سے بچا رہا۔ اوشا جب ان کی خیریت لینے آتی ہے تو اسے کہتی ہے وہ بھی اس کے ساتھ پاکستان جانے کے لئے تیار ہے مگر وہ نہیں جاتے۔ مگر اوشا کے شوہر جب ولایت سے واپس آتا ہے تو وہ اس کو چھوڑ کر چلی جاتی ہے۔

اقبال نارائن کسی بھی طرح جمیل کو پریشان کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ کبھی سور کو اس کے گھر کے پاس ہکا دیتا ہے اور کبھی اس کے لوگوں کو جمیل کے خلاف کان بھرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس طرح عنایت خان کو اپنی طرف ملا لیتا ہے۔ زمینداری کے خاتمے کے اعلان کے ساتھ ہی اس کا اثر رسوخ بڑھنے لگتا ہے اور جمیل بھیا کی حیثیت کمزور ہونے لگتی ہے۔ اقبال نارائن کسی طرح فساد کرانے کی کوشش کرتا ہے اور ملو قصائی کے ایک برہمن کی گابھن گائے کو کاٹنے کے بعد فساد پھوٹ پڑتا ہے۔ لوگ ڈر جاتے ہیں اور جمیل کے گھر پناہ لیتے ہیں بعد میں امن کمیٹی بنا دی جاتی ہے اور امن قائم ہو جاتا ہے مگر جمیل پر ان واقعات کا گہرا اثر پڑتا ہے۔ رام سکھ کے واقعات کی تمام باریکیوں کو سننے کے بعد لگتا ہے کہ وہ مسلمان ہے اس لئے اقبال نارائن جیسے لوگ

اس کے اور مسلمانوں کے خلاف دس ہزار آدمی اکٹھا کر کے فساد کرا سکتا ہے اور اگر اس نے اپنا مذہب تبدیل کر لیا تو کسی اقبال نارائن کی ہمت نہیں ہوگی جو اس کے اقتدار کو چیلنج کر سکے۔ اس پلاٹ میں انھوں نے ایک مسلمان کی ذہنی کیفیت کو خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ اور ایک مسلمان کو مذہب تبدیل کرتے ہوئے بہتر انداز سے بیان کیا ہے۔ اس طرح جمیل بھیا جام سنگھ بن جاتا ہے اور اقبال نارائن سے بولتا ہے کہ تم جھام نگر چھوڑ کر بھارت ورش کے کسی اور گاؤں میں چلے جاؤ۔ الغرض ایک تنازعے کو خوبصورت انداز سے حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ وارث علوی قاضی عبدالستار کے پلاٹ سازی کی خوبی پر لکھتے ہیں:

'' قاضی صاحب کے یہاں پلاٹ کی تعمیر میں ایسے واقعتاً کا بڑے فطری ڈھنگ سے استعمال ہوا ہے جو سماجی تضادات اور سیاسی تصادمات اور انفرادی پندار کے ٹکراؤ کا نقشہ پیش کرتے ہیں۔ ان واقعات کو دل دھڑکانے والے ڈراموں میں تبدیل کر دینے کا غیر معمولی فنکارانہ سلیقہ قاضی صاحب کی قدرت کی طرف سے عطا ہوا ہے۔ اس کا انھوں نے بہت فائدہ اٹھایا ہے اور اکثر ڈراموں کو میلوڈراما بنانے سے بھی وہ نہیں ہچکچاتے ہیں ۔ظاہر ہے اس سے سنسنی خیزی تو پیدا ہوگی لیکن کردار کی نفسیاتی گہرائی کی قیمت پر۔'' 4

ہندو مسلم تنازعہ کے ساتھ ناولٹ کے پلاٹ بہت سے دوسرے واقعات سلسلے وار جڑے ہوئے اور شیخ مظفر کی موت ناولٹ کے لیے ایک المیہ کی طرح ہے۔ جو ناولٹ کے آخر تک محسوس ہوتی ہے کیونکہ ان کے جیتے جی کسی بدمعاش بدفعال کی ہمت نہیں ہوئی کسی غریب کے گھر اور عزت پر ہاتھ ڈالنے اور انھیں جلانے اور برباد کرنے کی۔ ان کی موت کے بعد ان کا بیٹا زمینداری نظام سنبھالتا ہے مگر اس کو ابھی کوئی تجربہ نہیں وہ درجہ دہم کا طالب علم ہے اور باپ کی موت نے اس کو تعلیم سے دور کر دیا اور اس کے کندھوں پر ذمہ داریوں کا بوجھ آ گیا۔

'' پھر اندر آ کر لکڑی کی سیڑھیوں پر بجھی ہوئی گھسی پٹی چٹائی پر آہستہ آہستہ قدم رکھتا اوپر اپنے کمرے میں آ گیا۔ تخت پر ڈھیر ٹھنڈے پتلونوں اور گرم شیروانیوں کے انبار صندوقوں میں قید کر کے وزنی تالوں کا پہرہ لگا دیا۔ ان کتابوں کو الماریوں میں ٹھونسنے لگا جن پر شیخ محمد جمیل کلاس دہم گورنمنٹ اسکول، سیتاپور کے قلمی مونوگرام بنے تھے۔ ان کے خاک سے اب بھی اس مستقبل کی بشارت کی خوشبو آ رہی تھی جو بی۔ اے کی سرحد کے

4: گنجیفہ باز خیال۔ وارث علوی۔ ماڈرن پبلیشنگ ہاؤس۔ سن اشاعت-2007۔ ص16-15

پار کھڑے تھے۔تھوڑے دنوں قبل جس طرح اس نے اپنے باپ کو قبر میں اُتارا تھا اسی
طرح ان کاغذی لاشوں کو دفن کر کے وہ اپنے ہاتھ جھاڑتا نیچے اُتر آیا۔''5

کردار نگاری: قاضی عبدالستار کے بیشتر کردار زمیندارانہ نظام سے تعلق رکھتے ہیں۔انھوں نے اپنی تخلیقات کا زیادہ حصہ اس نظام کے پیچ وخم اطراف و جوانب ہی پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔مگران کے کردار اپنے آپ ایک بھر پور نمائندہ نظر آتے ہیں انھوں نے اپنے سماجی ناولوں اور ناولٹوں میں منفرد انداز کے کردار پیش کئے ہیں۔''غبار شب'' میں جتنے بھی کردار ہیں سبھی فعال اور متحرک کردار ہیں۔ناولٹ میں ہیرو کردار کے روپ میں جمیل بھیا کا نام لیا جاسکتا ہے۔جھام پور کے آس پاس کی زندگی کے زیر نظر جمیل بھیا کا کردار گڑھا گیا ہے ممکن ہے کہ یہ سچ بھی ہو کہ انھوں نے اپنی زندگی کسی ایسے واقعے یا حادثہ سنا یا دیکھا جب جمیل بھیا جیسا شخص تقسیم ہند کے بعد پاکستان نہ جا کر اپنے آس پاس موجود لوگوں کی حفاظت اور کفالت کے لئے اور چین وسکون کی زندگی دینے کے لئے اپنے مذہب کو تبدیل کر لیتا ہے اور اس طرح وہ ہندوستان کے مسلمانوں کی هفاظت کرتا ہے۔

جمیل بھیا کے والد جھام پور کے زمیندار اور شیخ تھے اور پنچایت کے مکھیا بھی تھے ان کے دروازے پر ہی تمام طرح کے مسائل کا تدارک ہوتا تھا۔مگر اچانک ان کی موت کے بعد جمیل بھیا پر ساری ذمہ داریاں آجاتی ہیں اور وہ درجہ دہم کی تعلیم چھوڑ کر سارا کاروبار سنبھال لیتا ہے۔اسے اس زمینداری کا کوئی تجربہ نہیں کیونکہ باپ کے جیتے جی اس نے کبھی یہ کام نہیں کیا اور عیش کی زندگی گزارتا رہا۔باپ کے مرنے کے بعد چودھری اقبال نارائن شر کا مخزن ہے جمیل کے راستے کی رکاوٹ بنتا ہے۔اور ہر صورت پریشان کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

شیخ مظفر کے بعد سماج میں جمیل کا اثر ورسوخ سبھی پر قائم ہے یہی بات اقبال نرائن کو کھٹکتی ہے اور وہ ہندوؤں کے دلوں اور دماغوں میں زہر بھرتا رہتا ہے اور کوئی موقع تلاش کرتا ہے کہ کسی طرح وہ جمیل کے اقتدار کو چیلنج کر سکے۔

جمیل نجمہ نام کی لڑکی جو اس کے ماموں کی بیٹی ہے اس سے محبت کرتا ہے مگر وہ پاکستان چلی جاتی ہے اور وہاں جا کر شادی کر لیتی ہے۔مگر جمیل بھیا ثابت قدم رہنے میں اپنے دل کو سمجھاتے ہیں اور دکھوں کا مداوا

5: غبار شب۔قاضی عبدالستار۔ص188-187

کرنے کی کوشش کرتے ہیں اوشا نام کی لڑکی سے محبت کرنے لگتے ہیں اس کے ساتھ جسمانی تعلق بھی قائم ہو جاتا ہے اوشا ان کو پاکستان چلے جانے اور دونوں وہاں جا کر شادی کرنے کا مشورہ دیتی ہے مگر جمیل بھیا کو اپنی ذات سے زیادہ اپنی ذات سے منسلک لوگوں کی فکر رہتی ہے انھیں اپنی تہذیبی وراثت کی فکر ہوتی اپنی مسجدوں مدرسوں اور درسگاہوں کی فکر ہوتی ہے انھیں مولانا آزاد کے تاریخی خطبے کا نمائندہ قرار دیا جاسکتا ہے جب مولانا نے کہا تھا کہ کہاں جا رہے اور کیوں جا رہے ہو دیکھو یہ مسجد کے بلند مینار تم سے سوال کرتے ہیں اور ہجرت کے مقدس نام پر تم نے فرار کا جو راستہ اختیار کیا ہے وہ غلط ہے۔ جمیل بھیا اوشا کو جواب دیتے ہوئے کہتے ہیں:

> ''تم یہ مکان دیکھتی ہو۔۔ یہ جائیداد دیکھتی ہو، یہ نوکر چاکر دیکھتی ہو لیکن تم یہ نہیں دیکھتی کہ میری ایک بیوہ پھوپھی ہیں جو اپنے پاندان کے لئے میرا منھ دیکھتی ہیں، ان کے پاس پانچ بچے ہیں جو اسکول کی فیس کے لئے میرا دامن پکڑتے ہیں میری ایک چچی ہیں جن کی دو بیٹیاں ہیں۔۔ جو تم سے بڑی ہیں، جو مجھ سے بڑی ہیں جن کی جوانی شادی کا انتظار کرتے کرتے سوگئی ہے۔ اس بستی کے بوڑھے بوڑھے آدمی ہیں جن کے سروں پر بہت سی دوسری تلواروں کے ساتھ ایک تلوار یہ بھی لٹک رہی ہے کہ کہیں بھاگ نہ جاؤں۔۔ اور یہ مسجدیں ہیں جن میں کبھی میں نے نماز نہیں پڑی لیکن یہ مجھے اپنا محافظ سمجھتی ہیں۔۔ یہ درگاہیں ہیں جن پر کبھی میں نے فاتحہ نہیں پڑھا لیکن ان کی حفاظت میرا فرض ہے۔۔ میں کہاں جاؤں۔۔۔ میں ان سب کو کہاں لے جاؤں؟''6

جمیل کے اس جملے سے اس کی ذہنی کیفیت کا باقاعدہ اندازہ ہوتا ہے جو ایک مشترکہ تہذیب وتمدن کلچر وثقافت کا نمائندہ کردار ہے۔ جس نے اپنے اسلامی کلچر اور اپنے روایت کو برقرار رکھنے کی کوشش کی۔ جس نے کبھی نماز تو نہ پڑھی مگر مسجدوں اور بزرگان دین کے مزاروں اور درگاہوں کی فکر کی۔ اسے معلوم تھا گاؤں میں کسی صاحب حیثیت آدمی کے نہ ہونے سے اقبال نارائن جیسے لوگ اپنا تسلط قائم کرلیں گے اور پھر عام انسانوں کی زندگی کا چین وسکون برباد کردیں گے۔ جمیل کا کردار ایک روشن خیال اور وسیع المشربی ذہن کا کردار ہے جنھیں مسلمان لڑکیوں کی شادی کی فکر ہندو ومسلمانوں کے آپسی تعلقات ان کی آپسی لڑائی

6: غبار شب۔ قاضی عبدالستار۔ ص219

جھگڑوں کو دور کر کے آپس میں بھائی چارگی امن وآشتی پیدا کرنے کی فکر ہے۔

عبدالغفور جمیل بھیا کے کرداراوراس کے مذہب کو تبدیل کرنے کے نظریہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے کچھ اس طرح سے تبصرہ کیا ہے:

''جمیل بھیا میں جہاں بہت ساری خوبیاں ہیں وہیں ان کے کردار میں کمزور پہلو بھی پوشیدہ ہے۔ان کی پہلی کمزوری تو یہ ہے کہ وہ آزادی سے پہلے ملک کے بٹوارے کے سخت مخالف تھے لیکن جب پاکستان میں ان کی منگیتر نجمہ کی شادی ہو جاتی ہے تو ان کا دل مچل جاتا ہے اور وہ اپنے نظریات اور اصولوں کو بالائے طاق رکھ کر ''شادی شدہ'' اوشا کو لے کر پاکستان جانے کا من بنالیتا ہے۔اوشا کا شوہر جب آ جاتا ہے تو وہ مایوس ہو جاتا ہے اور اس کا ارادہ دم توڑ دیتا ہے دوسرا کمزور پہلو یہ ہے کہ جب فرقہ پرستی کی بنیاد پر اقبال نارائن کی اہمیت ان سے بڑھ جاتی ہے اور ان کو اپنا اقتدار ہاتھ سے جاتا ہوا نظر آتا ہے تو اقتدار کے حصول کے لئے وہ اپنا مذہب تبدیل کر کے مسلمان سے ہندو ہو جاتا ہے۔انھیں کمزوریوں کی بنا پر جمیل بھیا کا کردار ہلکا ہو جاتا ہے۔قاری شروع میں ان کے متعلق اعلی خیال رکھتے ہیں لیکن ناول کے اختتام پر ان کی قدر ومنزلت گھٹ جاتی ہے۔وہ ایک ایسا انسان نظر آنے لگتا ہے جس کا نہ کوئی مذہب ہے نہ کوئی اصول۔وہ اقتدار کو برقرار رکھنے کے لئے کچھ بھی کر سکتا ہے۔قاضی صاحب نے تو انھیں ایک آئیڈیل اور نمائندہ کردار بنانے کی کوشش کی مگر وہ ناکام ہو گئے ہیں۔''7

اس اقتباس میں جس طرح عبدالغفور صاحب نے پاکستان جانے کو لے کر تبصرہ کیا ہے ان کا دل مچل جاتا ہے۔دل تو ہر کسی کا مچل جاتا ہے ہر انسان کو ایک چین وسکون بھری زندگی کی خواہش ہوتی ہے نہ معلوم کتنے بڑے بڑے محبّ وطن پاکستان بننے کے بعد ہجرت کر گئے اور جمیل بھیا تو ایک عام سے گاؤں کے ایک عام سے زمیندار تھے وہ چاہتے تو پاکستان جا سکتے تھے مگر انھوں نے اپنی ذات سے زیادہ اپنے سے جڑے لوگوں کا خیال رکھا اور پاکستان جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔

جہاں بات اقتدار کو ہاتھ سے جانا دیکھ کر مذہب تبدیل کرنے کی ہے جمیل کوئی مولوی یا مولانا یا مجاہد نہیں تھا ایک گناہوں کی چکی میں اوشا جیسی عورت سے تعلقات قائم رکھنے والا انسان تھا اس کے اس فیصلے

7: قاضی عبدالستار: بہ حیثیت ناول نگار۔عبدالغفور۔دانش کدہ پٹنہ۔2016ء سن اشاعت:۔ص269

کے پیچھے کوئی لاشعوری کوشش نہ تھی کہ وہ ہندو دھرم سے بہت متاثر ہو گیا ہے بلکہ وہ چاہتا تھا کہ ہزاروں لوگوں سے عام مسلمانوں کی جان کیسے بچایا جائے وہ ملوقصائی کے گائے ذبح کے معاملے کے بعد حواس باختہ ہو گیا اور جب اس نے اپنے وفادار نوکروں سے پوچھا کہ اس چودھری اقبال نارائن نے کیسے اتنی بھیڑ اکٹھا کر لی تو لوگوں نے بتایا کہ اصل میں ہندو ہے اور یہاں ہندو کی اکثریت ہے ساتھ ہی اس نے مسلمانوں کے ظلم کے جھوٹے پرچے چھپوا کر جو لوگوں میں تقسیم کئے ہیں اس کی وجہ سے بھی لوگ اقبال نارائن کے ساتھ ہو گئے اور جمیل ہندو ہوتا تو اقبال نارائن کی ہمت نہیں ہوتی آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی۔ یہ باتیں سننے کے بعد جمیل بھیا قبروں پر جا کر فاتحہ پڑھتے ہیں مزاروں پر چراغاں کرتے ہیں پھر کھدّر کی ٹوپی اور کھدّر کا کرتا پہن کر اس گائے کی قبر پر چلے جاتے ہیں جہاں اقبال نارائن کی سازش میلے میں ہنگامہ کر کے فساد کرنے کی تھی اس طرح وہ دانستہ طور پر ہندو بن جاتے ہیں، اس واقعہ کو قاضی عبد الستار نے ناول میں اس طرح پیش کیا ہے۔

اقتباس:

> ''جمیل میاں کا ادھا گائے کی قبر کے پاس رک گیا۔ وہ کھدّر کی ٹوپی کھدّر کا گرم کرتا اور جواہر کٹ کی صدری پہنے کلف دار گاندھی ٹوپی لگائے اترے۔ مجمع کو سانپ سونگھ گیا۔ ان کی چوڑی پیشانی پر چندن اور تلک کی دھاریاں تھیں ان کے خوبصورت گھنگھرالے بال معلوم نہیں کہاں کھو گئے تھے چھلی ہوئی گدی پر براق ٹوپی سے چوٹی کا سرا ذرا سا جھانک رہا تھا۔ قبر کے قریب پہنچ کر انھوں نے جوتے اتارے اور قبر کو ڈنڈوت کیا۔ گردیال جوشی ''پرشاد'' کا تھال لئے بیٹھا تھا۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہوا بوڑھے پنڈت نے پاٹ ختم کر دیا۔ اقبال نارئن کے ہکلا کر کہا۔
>
> ''جمیل میاں!''
>
> کل کے جمیل نے اس کو کھا جانے والی نگاہوں سے دیکھا
>
> جمیل میاں نہیں۔۔۔جھام سنگھ۔۔۔اقبال نارائن!۔۔۔جھام سنگھ
>
> پھر اس نے اپنا ہاتھ فضا میں لہرایا۔۔اور کڑک کر بوال
>
> ''بولو گئو ماتا کی''
>
> ''جے''[8]

---

[8]: غبار شب (ناول)۔ قاضی عبد الستار نصرت پبلشرز، لکھنؤ۔ سن اشاعت: 1974ء۔ ص 247

اور پھراس نے اقبال نارائن سے کہا جھام نگر میں جھام سنگھ رہے گا وہ اپنے گزر بسر کے لئے بھارت ورش میں کہیں بھی چلا جائے۔اس طرح سے قاضی عبدالستار نے ایک مسئلے کو اتنی خوبصورتی سے حل کیا ہے جس کی نظیر کم ہی دکھائی دیتی ہے جو ہندوستان میں مسلمانوں کے اچھے مستقبل کے لئے جگنو کی طرح تھی۔ جمیل کا کردار جامد کردار نہیں ہے وہ متحرک اور سماج کا جیتا جاگتا کردار ہے اور نہ ہی کسی آدرش وادی نظریہ کو لے کر چلتا ہے۔اس نے ایک شر کے فن کو کچلنے کی کوشش کی ہے کیونکہ یہ شرہ ہزاروں مسلمانوں قصائیوں کے مکان کھیت کھلیان جلانے کے بعد جمیل بھیا کا مکان اور ڈیوڑھاں جلا ڈالتے ہیں کیوں رام سنگھ جیسے لوگ ہمیشہ نہیں ملتے ہیں جو اپنے مالک کی جان بچانے کے لئے اپنی جان کی پرواہ نہ کریں۔اس طرح قاضی عبد الستار نے ایک زندہ اور فعال کردار کو غبار شب کا ہیرو بنا کر زندہ جاوید کر دیا ہے۔وارث علوی جمیل کے کردار پر روشنی ڈالتے ہوئے ''گنجیفہ بار خیال'' اپنے نظریات کا اظہار اس طرح کیا ہے:

''جمیل کو افسانہ نگار نے کوئی تمیر معمول کردار کے طور پر پیش نہیں کیا ہے۔وہ نہ بہت ذہین اور فطین ہے۔نہ طاقتور اور سورما وہ لوگوں کے بڑھتے ہوئے جم غفیر کو دیکھ کر گھبرا بھی جاتا ہے۔سمجھ نہیں پاتا کہ مقابلہ کیسے ہوگا۔اس کی ہمت بندھی رہتی ہے تو رام سکھ اور اسی کے قبیلے کے جری آدمیوں سے جو اس کے لئے جان نچھاور کرنے کو تیار ہیں جب امن کمیٹی قائم ہو جاتی ہے اور وہ دس بیس معزز آدمیوں کے ساتھ گشت پر نکلتا ہے تو وہ خود کو فاتح اور سرخ رو نہیں سمجھتا۔کمال نفسیاتی بصیرت سے قاضی عبدالستار نے اسی لمحہ میں جمیل کی دلی کیفیت کو بیان کیا ہے آگے آگے اقبال نارائن ہیں اور جمیل پیچھے پیچھے اور جمیل محسوس کرتا ہے کہ وہ اقبال نارائن کا محکوم ہے،مفتوح ہے۔یہ احساس جمیل کے لئے بڑا جاں کاہ ہے اس کی عزت نفس اس کے غرور کو بڑا دھچکا پہنچتا ہے لیکن یہ زخم ایک اتنے بڑے سانحہ کا حصہ ہے کہ اسے اپنی ذات کا خیال ہی نہیں آتا۔ذات تو اگر امن قائم کرنے میں بستی کو فساد کی آگ سے بچانے میں،مفسدوں کے منصوبوں کو زک پہنچانے میں کام بھی آجائے تو یہ جہد عمل کا حاصل ہوگا۔جمیل ان لوگوں میں سے ہے جن کے جذبات ٹھکانے پر ہیں تعقید اور الجھن نہیں۔وہ اضطراری طور بھی جو قدم اٹھاتا ہے وہ صحیح سمت میں ہوتا ہے۔چنانچہ اقبال نارائن کے ساتھ اقتدار کی اس جنگ میں جمیل کا جھام سنگھ بننے میں کوئی بہت سوچ بچار کرنا نہیں پڑتا وہ کسی بڑی اندرونی کشمکش سے نہیں

گزرتا۔ وہ ایک قالب میں جا رہا ہے ویسے ہی کسی ایک شہر سے ہجرت کر کے دوسرے
شہر جا رہا ہے۔ چنانچہ بڑے اطمینان سے قبرستان جا کر ایک ایک قبر پر فاتحہ پڑھتا ہے۔
درگاہوں میں لوبان اور موم بتیاں جلاتا ہے۔ پھر ادھا نکال کر چل دیتا ہے اور جب لوٹتا
ہے تو جھام سنگھ کا قالب اختیار کیا ہوتا ہے۔ اس کا یہ قدم بستی کے ہندو مسلمانوں کے لئے
چین و امن سکون اور سلامتی کا قدم ہے ظاہر ہے ایسا قدم مذہبی اور مولوی نہیں اٹھا سکتے۔
وہ جہاد اور شہادت کو ترجیح دیں گے۔ اور فی الحقیقت دوسرے لوگوں کو ایسا قدم اٹھانے کی
ضرورت بھی نہیں۔ جمیل کو ایک ترجیحی مقام حاصل ہے وہ ایک زمیندار کا بیٹا ہے اور اس
کی رعایا اسے چاہتی ہے۔ اندریں حالات اس نے اپنی رعایا اور زمینداری کے خاتمے
کے بعد اپنی بستی کے ہندو مسلمانوں کی یک جہتی اور سلامتی کے لئے اقبال نارائن جیسے
فتنہ پرداز کی طاقت کو توڑنے کے لئے جو قدم اٹھایا وہ اس کی نظر میں صحیح اور اس کے خدا
کی نظر میں قابل عفو قدم تھا۔'' 9

''غبارِ شب'' ناول کا یہ کردار ایک ایسا کردار ہے جو ازلی دنیا میں اپنی شناخت رکھتا ہے اس لئے وارث علوی نے بھی جمیل کو ایک مثالی کردار گردانا ہے۔

جمیل بھیّا کے بعد چودھری اقبال نارائن کا کردار اہمیت کا حامل ہے جو رقیب کی طرح ناولٹ میں موجود ہے اور وہ شر کا مکمل مجموعہ ہے۔ سود کا کاروبار کرنے والا انسان ہے۔ تقسیم ہند سے پہلے جب جھام پور میں اس کی کوئی بھی حیثیت نہیں تھی اس وقت بھی کسی نہ کسی طرح فساد برپا کرنے کی کوشش کرتا رہتا اور ناولٹ کی شروع میں ہی وہ تعزیہ کو روک کر پیپل نہ کاٹنے کا ارادہ کرتا ہے مگر شیخ مظفر کے آگے بے بس ہو جاتا ہے:

''قانون ہو چکا خاں صاحب۔۔۔۔ اب پیپل نہیں کٹے گا۔''
تفضّل جس نے پاؤں اتار لیا اور عنایت خاں کو دیکھا۔ عنایت خاں نے پرسکون آواز
میں تھم تھم کر کہا۔
''پیپل تو کٹے گا چودھری جی!''
''نہیں کٹ سکتا'' چودھری کی آواز پھٹ گئی۔
''تو تعزیہ نہیں اٹھیں گے۔''

9: گنجفہ بازِ خیال۔ وارث علوی۔ ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی۔ سن اشاعت: 2007ء۔ ص: 44-43

''نہ اٹھیں۔''10؎

چودھری کے اس لہجے سے اس کے رعب اور شر کا آسانی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ جو جمیل کے الیکشن جیتنے کے بعد کوئی نہ کوئی موقع تلاس کرتا تھا کہ انھیں نیچا دکھا کر اس کی جگہ پر اقتدار حاصل کر لے۔ حرص وہوس اور سیاست کا لالچی یہ انسان ہے جو مخالف پارٹی سے الیکشن میں کھڑا ہوا اور ایم۔ پی۔ ایم۔ ایل۔ اے کی حمایت حاصل کر کے چناوٗ جیتنا چاہتا ہے۔ ملو قصائی کے گابھن گائے حلال کرنے کے بعد وہ کھل کر سامنے آجاتا ہے اور خون کا بدل خون کا نعرہ لگاتا ہے۔

وہ سازش کے تحت ملو قصائی کو رنگے ہاتھوں پکڑ لیتا ہے اور اس کو مارتے مارتے ادھ مرا کر دیتے ہیں جب جمیل بھیّا وہاں پہنچتا ہے تو کہتا ہے:

''آدمی کی جان لے لی اب اور کیا لوگے اقبال نرائن؟''

وہ اتنے زور سے چیخا کہ خاموشی چھا گئی۔

''ایک دیوی کی جان کے بدلے ایک ہزار جانیں بھی تھوڑی ہیں بھیّا جی۔۔۔۔ اور آپ کا قصائی تو ابھی زندہ ہے۔''

اقبال نارائن نے زہریلے لہجے میں جواب دیا۔

''تو کاٹ دوگلا۔''

''کاٹ بھی دیں گے تو کون مائی کا لال روکے گا۔''

پھر جے کار شروع ہوگئی۔''11؎

اقبال نارائن کی زبان زہر میں بجھی ہوئی رہتی ہے۔ اس کے جملوں سے ہی ایک طبقے کے لیے نفرت کا آسانی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے اور جتنے دھمکی اور نفرت کے ساتھ اس نے جمیل کو مخاطب کیا ان سبھی کا اثر یہ ہوتا ہے کہ ہزاروں جانیں بچانے کے لیے جمیل بھیّا کو اپنا مذہب تبدیل کرنا پڑتا ہے۔

جمیل اور اقبال نارائن کے بعد ضمنی کرداروں میں اوشا، رام سکھ، عنایت خاں، تفضّل خاں اور شیخ کا کردار بھی اہمیت کا حامل ہے۔ رام سکھ ایک پاسی ہے اور جمیل کا وفادار نوکر۔ وہ ہر قدم پر جمیل کا ساتھ دیتا ہے۔ اگرچہ وہ بوڑھا ہے مگر اس کے اندر ہمت اور حوصلہ ہے۔ اس نے پوری زندگی شیخ مظفر کی خدمت کی اور

10؎ غبارِ شب (ناول)۔ قاضی عبدالستار نصرت پبلشرز، لکھنؤ۔ 1974ء سن اشاعت:۔ ص183

11؎ غبارِ شب (ناول)۔ قاضی عبدالستار نصرت پبلشرز، لکھنؤ۔ 1974ء سن اشاعت:۔ ص237

اب جب جمیل بھیّا پر مصیبت کی گھڑی آئی اور اقبال نارائن کے فسادی مسلمانوں کے گھر، کھیت کھلیان جلانے لگے تو وہ اپنے ساتھ تمام پاسیوں کو لے کر اقبال نارائن کا راستہ روک کر کھڑا ہو جاتا ہے اور اس طرح سے وہ فسادیوں سے جمیل اور اس کے گھر والوں کی حفاظت کرتا ہے:

''پھر رام سکھ نے اپنے کالے کمبل کو سنبھال کر اوڑھا، اپنا مریٹھا کھینچ کر باندھا پاؤں سے کمان جھکا کر چڑھالی اور تیر جوڑ کر للکارا!

''بس چودھری جی۔۔۔۔نہ آئیو۔''

''کیا؟''

''یہ گھر ملّو کسائی کا نائیں ہے۔۔۔ای گھر کی ایک ایک اینٹ کے لیے لاٹھی چلی۔''

''تو تم روکو گے؟''

''ہاں۔۔۔ہاں۔۔۔ہم روکب۔''[12]

رام سکھ کے اس جملے اور لہجے سے اس کی وفاداری ثابت ہوتی ہے جس نے بلاتفریق مذہب وملت جمیل کی حفاظت کی اور اس نے اقبال جیسے فسادی سے جمیل کی جان و مال کی حفاظت کی۔

جب جمیل بھیّا ایسے ہنگامے میں رام سکھ کے احسان کو یاد کرتے ہیں اور اس سے چلے جانے کو کہتے ہیں تو وہ ان تمام وفاداریوں اور شیخ کے احسانوں کو یاد کرتا ہے اور کہتا ہے کہ شیخ اور جمیل کی حفاظت کے لیے یہ جان ہمیشہ حاضر رہے گی اور اس کے ساتھ پاسیوں کی بھی جان اقبال جیسے لوگوں سے جمیل کو بچانے کے لیے ہمیشہ اپنی قربانی پیش کرے گی اور اپنی نمک حلالی کا ثبوت دیں گے اور وہ فرط جذبات سے گلوگیر بھی ہو جاتا ہے۔ جمیل اس سے کہتا ہے:

''رام سکھ''

''مالک''

''تم نے میری بڑی خدمت کی ہے تم نے مجھے گودوں کھلایا ہے لیکن میں نے تم کو گالیاں بھی دیں ہیں اور مارا بھی ہے۔آج ان تمام باتوں کو بھول جاؤ۔میرا کہنا مانو اور ان تمام ہندو نوکروں کو اپنے ساتھ لے کر بھٹارہ چلے جاؤ۔اگر کر سکو تو یہ کرو کہ مجھے تھوڑے سے کارتوس بھیج دو۔''

12۔ غبارِ شب (ناول)۔قاضی عبدالستار نصرت پبلشرز، لکھنؤ۔1974ء سن اشاعت:۔ص 240

جمیل کی آواز گلوگیر ہوگئی رام سکھ اس کے قدموں میں بیٹھ گیا۔اس کے جوتوں پر ہاتھ
رکھےاور کانپتی آواز میں بولا۔

''ہم اور ہمرا پروار آپ کا نمک کھائیں ہے۔آج وہ نمک ادا ہوئی۔۔۔آپ آپ کی
ایک چھگڑی کے روئیں کے کھاتر (خاطر) آپ کے کھیت کی ایک بالی کی کھاتر سیکڑوں
لٹھ چلے ہیں۔سیکڑوں سر بچے ہیں۔۔۔رام سکھ اکیلا نائیں آوا ہے۔۔۔رام سکھ کے
سنگ پان سو جودھا آئے ہیں۔۔۔ای تماشہ دیکھے نائیں آئے ہیں۔۔۔ای جان دے
آئے ہیں۔۔۔پھاٹک کے باہر رام سکھ کا پروار مری اور پھاٹک کے بھیتر رام سکھ کے
یار، تب کوئی آپ تک پہنچ سکت ہے۔۔۔سترکھ مالک پور اور تھانے کبھر جائے چکی
ہے۔''[13]

اوشا کا کردار جہاں ناول کے رومانی پہلو پر ایک اضافہ ہے وہیں ناول کے واقعات اور ناول کے مواد وموضوع کے اعتبار سے بھی اہمیت کا حامل ہے۔اس لیے کہ یہ ناول تقسیم ہند کے بعد کے واقعات پر مبنی ہے اور پاکستان بننے کے بعد لوگ ہجرت کرنے لگے۔اوشا جو ایک ہندو عورت ہے مگر جمیل بھیّا سے محبت کرتی ہے اور اسے پاکستان جانے پر اکساتی ہے اور خود وہاں جا کر مسلمان بن کر رہنے کا بھی ارادہ ظاہر کرتی ہے۔اوشا دل کی گہرائیوں سے جمیل بھیّا کو چاہتی ہے اور ان سے تعلقات بھی قائم کرتی ہے جبکہ وہ ایک شادی شدہ عورت ہے مگر چپکے چپکے جمیل بھیّا سے ملتی ہے۔اوشا کا کردار ہندوستان کی عام عورتوں کی طرح ہے۔وہ کوئی محبوب کی یاد میں آنسو نہیں بہاتی بلکہ جب اس کا شوہر واپس آتا ہے تو اس کے ساتھ چلی جاتی ہے۔یہ دل چسپ کردار ناول میں اس کی اہمیت جگنو کی طرح ہے جو چمکتا ہے اور لب پر مسکراہٹ اور دلوں میں خوشی کے جذبات پیدا کرتا ہے۔

ان کرداروں کے علاوہ شیخ مظفر،عنایت خاں، بکر قصاب بھی اہمیت کے حامل ہیں۔جو وقتاً فو قتاً ناولٹ میں سامنے آتے ہیں اور اپنی موجودگی درج کراتے ہیں۔عنایت خاں پہلے تو جمیل بھیّا کے ساتھ رہتا ہے مگر وہ اقبال نارائن کی بڑھتی مقبولیت سے اس کی طرف ہو جاتا ہے۔بکر قصاب ایک قصائی ہے مگر اپنے نام کے آگے حاجی لگا کر الیکشن میں مسلم لیگی نظریات کے تحت کھڑا ہو جاتا ہے اور عام لوگوں کے اندر

13: غبار شب (ناول)۔قاضی عبدالستار نصرت پبلشرز، لکھنؤ۔1974ء سن اشاعت:۔ص235-234

کانگریس کے بجائے مسلم لیگ کے نظریے پر اپنی حمایت درج کرائیں۔غرض اس طرح شیخ مظفر بھی ناولٹ میں سامنے آتے اور دکھائی دیتا ہے کہ وہ ایسے کردار کے حامل ہیں جن کی سماج میں الگ شناخت ہے۔جن کے حکم کو مانا جاتا ہے مگران کے مرنے کے بعد جمیل بھیّا پر تمام ناولٹ کا دارومدار ہوجاتا ہے۔ نجمہ ایک کم سن دوشیزہ ہے۔ جو جمیل کی ماموں زاد ہے مگر پاکستان بننے کے بعد اپنے والد کے ہمراہ پاکستان چلی جاتی ہے اور وہاں شادی کرلیتی ہے اور جمیل اس کی محبت میں آہیں بھرتا ہے مگر وہ ناول میں سامنے نہیں آتی۔شعور کی رو کے تحت اس کے کردار کو ناولٹ میں پیش کیا گیا ہے۔

پروفیسر غیاث الدین قاضی عبدالستار کے ناولوں میں فرقہ واریت کے عنوان سے اپنے مضمون میں ''غبارشب'' کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''اگر کسی انسان کا جذبہ اس کی عقل کی گرفت میں ہو تو وہ نفرت،انتقام اور فرقہ واریت کو بھی اپنے قابو میں کرسکتا ہے۔فرقہ وارانہ فساد شروع ہوتے ہیں اور کتنی معمولی باتوں پر ہوتے ہیں اور کس طرح ترکیب وتدبیر سے انہیں روکا جاسکتا ہے اسے بڑی حقیقت پسندی کے ساتھ اس ناول میں پیش کیا گیا ہے۔''14؎

فساد ہونے والا ہی تھا کہ یہ خبر جھام پور کے رئیس شیخ محمد مظفر تک پہونچتی ہے تو اقبال نارائن کو طلب کیا جاتا ہے اور اس نے کمال چالاکی سے عنایت خان پر سارا الزام دھر کر خود بچ جاتا ہے اور انھیں یقین دلانے کے لیے خود ہی پیپل کی شاخ کاٹنے کے لیے چل پڑتا ہے۔اس طرح شیخ مظفر کے سمجھ بوجھ سے ایک بڑا فرقہ وارانہ فساد ہونے سے بچ جاتا ہے مگر یہ فرقہ وارانہ فسادات ہندوستان میں تقسیم سے لے کر اب تک جاری وساری ہیں۔مگر اچانک ہی شیخ جی کی موت سے کہرام مچ جاتا ہے اور جلدی جلدی سارے جلوس اور تعزیہ اپنی اپنی جگہ پہنچا کر تدفین کی تیاری ہونے لگتی ہے۔

> ''حکیم غلام حسین نبض پکڑے بیٹھے تھے۔ چودھری اقبال نارائن کا سپاہی نئی سائیکل پر سیتاپور ڈاکٹر لینے جاچکا تھا۔شیخ مظفر رئیس جھام پور کی سانس کا کچا دھاگا ٹوٹ گیا۔ باجے ایک بار پھر رک گئے عورتوں نے کہرام برپا کردیا۔مراثنیں جو نوحے پڑھنے آئی تھیں شیخ کے بین کرنے لگیں۔پیپل کی شاخیں تو کٹ گئیں لیکن جلوس اجڑ گیا۔تعزیے

14؎ نذر قاضی عبدالستار مرتب پروفیسر محمد غیاث الدین۔ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،نئی دہلی۔ص335

مہاجروں کی طرح سر جھکائے مقررہ راستوں پر چلتے ہوئے بارہ بجے رات کے بجائے
دن کے دو ہی بجے دفن ہو گئے چاروں طرف آدمی دوڑنے لگے۔ لالہ سد گرو رئیس مانک
پور پھاٹک کے قریب ادھے سے پھاند پڑے اور شیخ کے جنازے تک پہنچتے پہنچتے کئی بار
گر گر پڑے۔ کئی سپاہیوں نے اٹھایا پھر شیخ کا ہاتھ چادر سے نکال منھ پر رکھ لیا اور چیخ مار
کر کہا۔

''آج کمر ٹوٹ گئی۔''

اور پچھاڑیں کھاتے کھاتے بے ہوش ہو گئے۔''15؎

شیخ کی موت کے بعد اکثر لوگ جمیل سے کنارہ کشی اختیار کرنے لگے اور اقبال نارائن کے پہلو سے لگنے لگے اور ان کی ساکھ کو زبردست نقصان ہونے لگا۔ جمیل کے حمایتی نمک خوار چند ہی لوگ اس کے ساتھ تھے۔ بکر قصاب جو ایک قصائی تھا شیخ کے مرتے ہی گوشت دینے سے انکار کرنے لگا۔ جمیل کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو رام سکھ سے کہا کہ اس کو پکڑ کر میرے پاس لائے۔ بکر قصاب نے حج کر کے خود کو حاجی ثابت کر کے اقتدار سنبھالنے کی کوشش کرنے لگا اور جمیل بھیّا کے خلاف زہر بھی اگلنے لگا۔ رام سکھ جب پکڑ کر اسے لاتا ہے تو اس کی مرمت کرنے کے بعد اسی پولیس کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔

اس واقعے کے بعد جمیل کی ساکھ آس پاس کو لوگوں میں قائم ہونے لگی۔ ہولی کے موقعے پر سرکھ کے میلے کا اہتمام ہوتا تھا اور جب جمیل وہاں جاتا ہے تو اوشا نام کی لڑکی سے ملاقات ہوتی ہے جس کی شادی شیخ نے کرائی تھی۔ مگر اس کا شوہر ولایت پڑھنے کے لیے گیا تھا اور ایک فوجی ہے۔ اوشا کو جب جمیل دیکھتا ہے تو محبت کا حقیقی روپ ایک عورت میں نظر آتا ہے۔ وہ ایک دوسرے کو دل ہی دل میں چاہنے لگے اور ایک دوسرے کی گفتگو سے محظوظ ہوتے ہیں۔ جمیل بھیّا کو پہلی بار کسی عورت کا نشاط آمیز تجربہ ہوا تھا اور وہ مستقبل کے رنگین خواب دیکھنے لگتا ہے۔

مسرکھ میلے نوٹنکی اوشا اور جمیل کے ملن کو قاضی صاحب نے باریکی سے پیش کیا ہے۔ اوشا نے نوٹنکی دیکھنے کا ارادہ ظاہر کیا پھر جب سبھی لوگ وہاں پہنچے تو نوٹنکی دیکھنے سے انکار کر کے جمیل کے ساتھ واپس کیمپ آ گئی۔ پھر اسے اپنی ماں کا خط ملتا ہے اور اس بکر قصاب اور اس میں مسلم لیگی لوگوں کے ساتھ ملاقات کا ذکر

15؎ غبار شب (ناول)۔ قاضی عبدالستار نصرت پبلشرز، لکھنؤ۔ 1974ء سن اشاعت:۔ ص 85-186

تھا۔ جب وہ جام نگر پہنچا تو بکر قصاب کے گھر کچھ مولوی نما لوگ آئے ہوئے تھے اور عشاء کی نماز کے بعد وعظ کرنے والے تھے۔ بکر قصاب نے جمیل بھیّا کو روکنے اور ساتھ کھانا کھانے کی دعوت دی مگر انھوں نے نہایت تیزی سے جواب دیتے ہوئے کہا:

''جھام پور میں چکوؤں اور ڈھنیوں کے یہاں ٹھہرنے والے مولویوں سے مجھے کوئی دل چسپی نہیں ہے اور نہ ہی میں ان کی سلامی مجرئی کرنا پسند کرتا ہوں۔ سنا آپ نے۔'' 16؎

عصر کی نماز کے بعد اس نے دیکھا کہ منشی کے گھر کے سامنے مسلم لیگ کا جھنڈا لگا ہوا ہے اور ایک مولوی صاحب عربی رومال سر پر باندھ کر پاکستان کے فائدے بتا رہے تھے۔ جمیل کی ماں ان کی شادی فقیر ماموں کی بیٹی نجمہ سے کرانے کی بات کرتی ہیں مگر وہ معاملے کو ٹال جاتا ہے۔

جمیل ایک محبّ وطن انسان ہے۔ وہ مسلم لیگ کا مخالف کانگریس اور اس کے سیکولر نظریہ کو پسند کرتا ہے۔ الیکشن کا وقت قریب آتے ہی ایک طرف مسلم لیگ کی سیاست ہوتی ہے وہی منشی چکوا خود کے لیے مسلم لیگی میدان ہموار کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ نتائج آنے سے پہلے ہی فسادات ہو جاتے ہیں۔ ان فسادات میں کسی طرح جھام پور محفوظ رہتا ہے۔ اوشا ہندوستان کی زہریلی سیاست کو دیکھتے ہوئے پاکستان چلے جانے کا مشورہ دیتی ہے کیونکہ مانک پور سے وہ جمیل کو دیکھنے کے لیے آتی ہے۔

پھر وقت کے گزرنے کے ساتھ ہی اس کے ماموں مع اہل وعیال پاکستان چلے جاتے ہیں اور وہاں نجمہ کی شادی ہو جاتی ہے۔ اور اوشا بھی واپس چلی جاتی ہے۔ مانک پور اور پھر پٹواری پنڈت درگا جیرن نے زمینداری کے خاتمے کی خبر سناتا ہے اور جو گوشت مفت میں بکر قصاب دیا کرتا تھا اب بازار کے دام سے خریدا اور اس کے بیر داروں نے سرکاری کھیتوں میں چلتے ہوئے آسامیوں کے ہل کھلوا دیئے۔ کٹھار کی مرمت کرتے ہوئے مزدوروں کو پوری مزدوری دی گئی۔ اور پھر اقبال نارائن جو زمیندار نہیں بلکہ ایک سود کاروباری تھا زمیندار جمیل بھیّا کے خلاف نفرت پھیلانے لگا۔ اور سور بھی رئیس کے گھر کے آس پاس چرنے لگا۔ جس کو دیکھ کر رام سکھ کے بیٹے دلاور نے تیر سے مار ڈالا۔ چودھری اقبال نارائن نے اس واقعہ کو لے کر خوب ہنگامہ کیا مگر کسی کو رام سکھ کے خلاف بولنے کی ہمت نہیں ہوئی اور اس نے سور کو بھون کر کھا لیا۔

اقبال نارائن ابھی بھی اپنے مکاریوں سے بعض نہیں آیا اور وہ موقعے کی تلاش میں رہتا تھا۔ جمیل کے

16؎ غبار شب (ناول)۔ قاضی عبدالستار نصرت پبلشرز، لکھنؤ۔ 1974ء سن اشاعت:۔ ص:211

گھر گائے کی قربانی کبھی نہیں ہوئی تھی اور اس نے جھام پور کے لوگوں کو ڈرا دھمکا اور سمجھا بجھا کر گائے کی قربانی سے روکا اور اس قصے کو ہی ختم کر دیا۔ جھام پور میں پنچایت کا الیکشن آتے ہی جمیل کے مقابلے میں اقبال نارائن بھی کھڑا ہوا اور سیتا پور سے پرچا سوشلسٹ پارٹی کے ایم ایل اے اور ایم پی بھی اقبال نارائن کی حمایت میں آ گئے۔ مگر تمام کوششوں کے باوجود اقبال نارائن ہار گیا اور اس نے دوسرے ذرائع سے جمیل بھیّا کو پریشان کرنے کی کوشش کی۔ ملو قصائی اور منواں میں دوستی تھی لیکن منواں جو ملو قصائی کی بیوی سے عشق لڑاتا تھا اور ایک دن دونوں کو رنگے ہاتھوں ملّو قصائی نے پکڑ لیا اور اسے خوب مارا۔ منواں بھی اپنی بےعزتی کا بدلہ لینے کی فراق میں تھا۔ دان میں ملی ہوئی براہمن کی گابھن گائے کو ملو قصائی نے چوری سے پکڑ لیا اور ذبح کر دیا۔ منواں کو جب پتہ چلا تو وہ سیدھا اقبال نارائن کے پاس گیا۔ اقبال نارائن اپنے ساتھ دس بیس لوگوں کو ساتھ لے کر ملو قصائی کے گھر گیا اور اسے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا پھر ہونا کیا تھا۔ گائے جو ہندو دھرم میں ماتا کی طرح عزت دی جاتی ہے، ملّو قصائی کو مار مار کر ادھ مرا کر دیا اور خون کا بدلہ خون سے لوگ چلانے لگے۔ جب اس بات کی خبر جمیل کو ملتی ہے تو وہ ملّو قصائی کے گھر گیا اور اقبال نارائن کو روکنے کی کوشش اور ملّو قصائی کو پولیس کے حوالے کر دیا اور چماروں کے ہاتھوں گائے کو عزت کے ساتھ دفن کرا دیا۔ مسرکھ سے ٹھا کر آئے اور لوگ ڈر کے مارے اپنے اپنے گھروں میں چھپے ہوئے تھے۔ ظہر کی نماز بھی نہیں ہوئی تھی کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ اذان دے سکے۔ پھر جمیل بھیّا نے خود مسجد میں جا کر پورے لحن کے ساتھ اذان دی۔ مگر تھوڑی دیر کے بعد فسادیوں نے مسلم محلوں پر ہلّہ بول دیا۔ ان کے گھر، کھیت، کھلیان لوٹے جانے لگے۔ مسلمان لوگ اپنی جان بچانے کے لیے جمیل کے گھر میں پناہ لینے لگے۔ جمیل کے گھر کے پاس خطرناک نعروں اور خوفناک آوازوں کے ساتھ پورے فسادی شور مچا رہے تھے۔ چاروں طرف قصائیوں کے مکان جل رہے تھے اور لوگ ذبح ہو رہے تھے۔ جمیل نے دیکھا کہ سڑک پر سیکڑوں لگوا اقبال نارائن کی قیادت میں چل رہے ہیں۔ رام سکھ کی نمک حلالی اور وفاداری کی وجہ سے کسی کو جمیل کے کھیت اور مکان کو چھونے کی ہمت نہیں ہوئی۔ اس خوفناک حادثے کے بعد لوگ ڈر گئے اور معاملہ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ تک پہونچ گیا۔ اور اقبال نارائن نے اس حادثے کا سارا الزام جمیل بھیّا کے سر منڈھ دیا۔ اور مسلمانوں کی پکڑ دھر شروع جیسے آج بھی فسادات کے بعد ہوتی ہے۔ تفضّل حسین، عنایت خاں جیسے لوگ پکڑے گئے۔ جب جمیل بھیّا کو بلایا گیا تو وہ پورے

بن سنور کران کے سامنے پیش ہوئے۔تھانے دار نے چھوٹے صاحب کو کہا کہ اقبال نارائن جیسے لوگ اگر سو بھی پکڑ لیے جائیں تو کوئی چوں نہ کرے مگر جمیل بھیّا کے ساتھ بدتمیزی برداشت نہ کی جائے گی اور اس کے خلاف غریب ہندوستیہ گرہ کریں گے اور امیر ہندو ڈی آئی جی تک معاملہ لے جائیں گے۔

منظر نگاری: قاضی صاحب کو کسی واقعے کسی کردار کسی سماج کی منظر نگاری کا ملکہ حاصل ہے۔وہ کسی بھی منظر کو اتنی باریکی سے بیان کرتے ہیں کہ ایک ایک اشیاء کا مکمل وجود سامنے آجاتا ہے۔عام طور سے بات چیت میں بھی وہی انداز اختیار کرتے ہیں اس لیے ان کی حقیقی زندگی اور ادبی تخلیقی زندگی میں بھی فن داستان گوئی کی خوبی مکمل طور پر موجود ہے۔ان سے بات چیت کرنے والے اس بات سے یہ خوبی واقف ہیں کہ ان کی زبان انداز بیان میں ایک طرح کی دل چسپی موجود ہوتی ہے۔منظر نگاری میں جزئیات نگاری کے فن سے جس طرح فیض اٹھایا ہے اس سے اردو دنیا یہ خوبی واقف ہے۔''غبارِ شب'' ناولٹ میں انھوں نے ہندو مسلم تنازعہ کے ساتھ پیپل اور تعزیہ کے تصادم اور میلے ٹھیلے نوٹنکی کے ذکر کے ساتھ آس پاس کے ماحول کو فنی باریکی کے ساتھ پیش کیا ہے۔محرم ایک ایسا مہینہ ہوتا ہے جہاں عام اور جاہل مسلمان اسے ایک تہوار کی طرح سمجھتے ہیں اور نئے نئے کپڑوں کے ساتھ مٹر گشتی کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں وہی کھیل کھلونے کھانے پینے کی اشیاء بیچنے والوں کی بھی خوب خرید فروخت ہوتی ہے۔اس منظر کو خوبصورتی کے ساتھ قاضی صاحب نے بیان کیا ہے۔اقتباس:

> ''پھر تعزیے رکھ دئے گئے۔ان کے اٹھانے والے ہندو مزدور بیڑیاں پینے لگے۔ خوانچے والے بھاگ کر اس مسجد کے نیچے آگئے جہاں دور کھڑی عمارتیں تماشا دیکھ رہی تھیں۔بھڑکدار کپڑے اور کھنک دار زیور پہنے چمکتی کھنکتی عورتیں مٹھائی کے دونے اور گود میں بچے سنبھالے اپنے اپنے گھروں کی طرف بھاگیں۔قصائیوں اور گویّوں کے چودھریوں نے تعزیوں کے گرد لاٹھیوں کا حلقہ کھڑا کر دیا۔اور اطمینان سے چلمیں پینے لگے۔''17؎

قاضی صاحب جہاں انسانی زندگی کے مناظر کو خوبصورتی سے بیان کرتے ہیں وہیں قدرتی مناظر کو بھی تشبیہات و استعارات سے سجاتے ہیں۔تضاد کے ساتھ قول محال کی قدرت ان کے اندر بدرجۂ اتم موجود

17؎ غبارِ شب (ناول)۔قاضی عبدالستار نصرت پبلشرز، لکھنؤ۔1974ء سن اشاعت:۔ص182

ہے۔غبارشب میں بھی یہ خصوصیت مختلف مقام پر دیکھنے کو ملتی ہے:

''اساڑھ پھر چکا تھا لیکن آسمان نیلے شیشے کی مانند کھڑا تھا۔سورج تاریخ کے جبر کی طرح بے گناہ انسانوں پر برس رہا تھا۔''18

''درختوں کے پھل آنسو بن کر ٹپک گئے۔زرد پتوں کے لاشوں سے بچھونے بچھ گئے۔جوگن پروائی نگر نگر دکھ کے بھجن گا گا کر تھک گئی۔آخر آخر وقت کے طلسمیں چشمے میں جمیل نے اپنے دل دھو لیے غم کی گھٹا برس کر کھلی تو نئے روشن آسمان پر یہاں سے وہاں تک مستقبل کی دھنک کھڑی تھی۔''19

مکالمہ نگاری: قاضی عبدالستار نے جہاں اپنی تخلیقات میں زبان و بیان کے عمدہ نمونے پیش کئے ہیں اور انھیں خوبصورت مناظر کے ساتھ سجایا ہے وہیں انھوں نے مکالمہ نگاری میں بھی اعلیٰ مثال قائم کی ہے۔قاضی صاحب کا کمال یہ ہے کہ وہ جس سماج کی بات کرتے ہیں وہاں کے کرداروں کو بھی وہی زبان بلواتے ہیں اس لیے کہتے ہیں کہ اکبر بدھو کی زبان نہیں بول سکتا اور بدھوا کبر کی زبان نہیں بول سکتا ہے۔اس لیے داراشکوہ پر جہاں پرشکوہ زبان استعمال کی گئی ہے وہیں دوسرے سماجی ناولوں میں ان کے سماج اور ماحول کے مطابق زبان استعمال ہوئی ہے۔اس لیے مکالمے میں ایک طرح کی فطری روانی اور چابک دستی دکھائی دیتی ہے۔قاضی صاحب کے یہاں جہاں اردو معلّیٰ کی زبان موجود ہے تو وہیں پر اودھی زبان کا بھی خود استعمال ہوا ہے۔یہاں مکالمہ نگاری کے ایک نمونے کے طور پر اقتباس پیش کیا جا رہا ہے:

''بلّوا ہے''

''کا ہے؟''

''بھیّا برجھا گئے ہیں۔''

''کی پر؟''

''چکوا(بکر قصاب)سارے بدماس ہیں۔''

''ہوں۔۔۔تم تو چل رکھو۔۔۔ہم آیت ہیں۔''20

18:غبارشب(ناول)۔قاضی عبدالستار نصرت پبلشرز،لکھنؤ۔1974ءسن اشاعت:۔ص186

19:غبارشب(ناول)۔قاضی عبدالستار نصرت پبلشرز،لکھنؤ۔1974ءسن اشاعت:۔ص187

20:غبارشب(ناول)۔قاضی عبدالستار نصرت پبلشرز،لکھنؤ۔1974ءسن اشاعت:۔ص189

جب جمیل بھیّا کو بکر قصاب خراب گوشت بیچتا ہے تو انھیں غصہ آتا ہے۔اس واقعے کی قاضی صاحب نے ڈھیٹ اودھی زبان سے بیان کیا ہے۔

مکالمہ نگاری کی عمدہ مثال ناولٹ میں جا بجا موجود ہے:

''رام سنگھ''

''مالک''۔۔۔

''کیا یہ سب کچھ صرف ایک گائے کے لیے ہوا؟''

''اوہوں'' اس نے بڑی گمبھیرتا سے اپنا سر نفی میں ہلایا۔

''پھر۔۔۔''

''یو ای لئے بھوا۔۔۔ کہ آج تک آپ کا حکم کیسے چلت ہے۔۔۔آپ کی چھائیں مان یہاں مسلمان بے کھٹکے کیسے رہت ہیں۔۔۔یہاں تو او ہوئے جو اکبال نارائن کہین،،،سب اکبال نارائن کا سلام کریں۔۔۔سب اکبال نارائن کے دروزے جائیں۔''

''اوہو۔۔۔تو اقبال نارائن نے میرے خلاف دس ہزار آدمی اس لیے جمع کر لیے کہ میں مسلمان ہوں اور وہ ہندو ہے۔۔۔''

''ای ماں کا سند پھ ہے''۔۔۔

''اور اگر میں ہندو ہوتا تو اقبال نارائن مسلمان ہوتے۔۔۔۔تو۔''

''اوں ہوں۔۔۔اوئی تو ہندو ہے ہیں۔۔۔آپ ہندو ہوتے تو بٹھارہ کے لونڈے اکبال نارائن کا بس ناس کیے دیتے۔''21ؔ

غرض قاضی عبدالستار کو زبان کے بیان اور مکالمے کی جان پر مکمل عبور حاصل ہے۔وہ جہاں قلعی معلّٰی کی زبان اور اودھی بیان سے اپنے فن میں حسن کا جادو بھر دیتے ہیں اور اس میں چار چاند لگا دیتے ہیں۔

نقطۂ نظر: اس ناولٹ کو نقطۂ نظر کے پس منظر میں دیکھا جائے تو سماج اور سیاست کے ساتھ مذہب سب سے بڑا موضوع ہے۔وارث علوی نے ''غبارِ شب'' کے بارے میں اس کے سماجیاتی موضوع پر ہندو مسلم کے پس منظر میں ایک معنی خیز بات لکھی ہے:

21ؔ: غبارِ شب (ناول)۔قاضی عبدالستار نصرت پبلشرز، لکھنؤ۔1974ء سن اشاعت:۔ص 245-244

''صرف جمیل ہے جس کا عمل بے غرض اور سماجیاتی ہے اور اس سماج کا سب سے بڑا مسئلہ پیپل اور تعزیہ کا تصادم اور ہندو مسلم نزع ہے جس کی دل دل میں گاؤں کے سب ہندو مسلم مقتدر لوگ ڈوبے ہوئے ہیں۔ ان اقلیتی طاقتوں کا مقابلہ ایک ایسے نوجوان کو کرتا ہے جو ابھی اپنے با اثر باپ کو دفنا کر آیا ہے جس کی جاگیر کی رعایا ہندو ہے۔ جان چھڑ کنے والے ملازم ہندو ہیں جو دراصل ہندو مسلم بھید بھاؤ کو سمجھ ہی نہیں پاتا۔''22؎

''غبارِ شب'' کا مقصد جہاں ہندوستان میں پھیلی ہوئی فرقہ واریت ہے اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر انسانیت کو شرمسار کرنے والے فسادات ہیں اور مذہب کی ایک زرا سی چنگاری سے کس طرح ایک پورا گاؤں آگ کی لپیٹ میں ڈال دیا جاتا ہے۔ کھیت کھلیان کسان انسان بچے بوڑھے عورتیں کسی کو بھی مارنے اور جلانے سے گریز نہیں کیا جاتا ہے۔ اس کی خوبصورت عکاسی کی گئی ہے۔ جہاں ایک سیکولر سماج میں رہنے کے لیے بھی مذہب کو تبدیل کرنا پڑتا ہے تا کہ اس کے پاس کے لوگ امن کے ساتھ رہ سکیں۔ ساتھ ہی قاضی صاحب نے یہ بھی پیغام دیا ہے کہ سماج میں زہر گھولنے ولاے ہندو مسلمان کے بیچ فساد کرانے والے کو بھارت میں رہنے کی جگہ نہیں ہونی چاہیے تا کہ پھر کسی جمیل کو جھام سنگھ نہ بننا پڑے۔

ڈاکٹر احمد خاں ''غبارِ شب'' میں جمیل کے مذہب تبدیل کرنے کو ایک دانستہ کوشش مانتے ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے کہ یہ کوئی غیر شعوری عمل نہیں بلکہ پورے ہوش وحواس میں ایک ایسا کام تھا جس سے ہزاروں مشکلوں کو آسان بنایا جا سکتا ہے۔ لکھتے ہیں:

''کسی بھی تخلیق میں مصنف کی اپنی ایک فکر پنہاں ہوتی رہتی ہے۔ اس کا اپنا ایک نظریہ ہوتا ہے۔ وہ قاری کو ایک پیغام دینا چاہتا ہے۔ ''غبارِ شب'' میں مصنف نے مخصوص نقطۂ نظر کی ترجمانی کی ہے۔ اس ناولٹ کے اختتام میں جمیل کا جھام سنگھ بننا ایک غیر شعوری عمل نہیں ہے بلکہ ایک دانستہ کوشش ہے۔ جمیل اپنے رفیق نوکر رام سنگھ سے ہوئے فساد کی وجہ دریافت کرتا ہے اور اسے جب معلوم ہوتا ہے کہ چودھری اقبال نارائن صرف اس وجہ سے اتنی بڑی بھیڑ اکٹھا کر لیتا ہے کہ جمیل ایک مسلم ہے اور وہ ہندو ہوتا تو وہ اس صورت حال کا جائزہ لینے کے لیے ایک انقلابی قدم اٹھاتا ہے۔''23؎

22؎ گنجیفہ بازِ خیال۔ وارث علوی۔ ص134

23؎ قاضی عبدالستار۔ فکرِ فن اور فنکار۔ ڈاکٹر احمد خاں۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی۔ سن اشاعت: 2005ء۔ ص:105

قاضی عبدالستار نے ''غبارِ شب'' میں عصری سیاست کے دل دوز واقعات کو اپنے فکر وفن کے امتزاج کے ساتھ خوبصورتی سے پیش کرنے کی کوشش کی۔ سیاست انسانی زندگی پر کس طرح اثر انداز ہوتی ہے ایک عام انسان کیسے اس سے دوچار ہوتا ہے اور کس طرح اپنی روایت اپنے مذہب اور اپنے معاشرتی پہلوؤں کو نظر میں رکھ کر اسے زندگی گزارنی پڑتی ہے اس کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔

''غبارِ شب'' میں آزادی کے فوراً بعد کی سیاسی تبدیلیوں اور زمیندارانہ نظام نے خاتمے کے بعد کی صورت حال کو اس کے پیچیدہ اور بدلتے سماجی تناظر کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

''غبارِ شب'' اردو ادب کی دنیا میں ایک خوبصورت اضافہ کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ اس کا نقطۂ نظر عام ناولٹوں سے منفرد اور انوکھا ہے جس میں تبدیلی مذہب کو مرکز قصہ بنایا گیا ہے۔

حضرت جان

قاضی عبدالستار کا ناول ''حضرت جان'' ۱۹۹۰ میں ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڈھ سے شائع ہوا۔ جس کو انھوں نے ''زرینہ'' کے نام انتساب کیا ہے۔ پیش تحریر میں انھوں نے لکھا ہے کہ:

''غالب لکھ چکا تھا ''خالد بن ولید'' لکھنے کی تیاری کر رہا تھا ''غالب'' کے اسلوب کی روشنائی سے شرابور قلم کو خشک کرنے کے جتن بھی ہو رہے تھے کہ ایک بزرگ افسانہ نگار نے ''حضرت جان'' کے موضوع سے تعارف کرا دیا۔ کچھ تحریری مواد بھی عطا کر دیا۔ میں سب کچھ خاموشی سے سنتا رہا۔ سکون پر جھنجھلا کر فرمانے لگے کہ اس موضوع پر لکھنے کے لئے منٹو کے آتش خانے کی روشنائی بھی ڈھونڈھنا پڑے گی جو یقیناً آسان کام نہیں ہے جب وہ چلے گئے تو میں نے نوٹس کو دوبارہ پڑھا اور بھیگے ہوئے قلم کو خشک کرنے پر رضا مند ہو گیا۔ لکھتے وقت خیال آتا رہا کہ زندگی کی حقیقتیں افسانوں کے مقابلے میں کتنی عجیب اور حیرت ناک ہوتی ہیں۔'' [1]

قاضی عبدالستار نے زندگی کو قریب سے دیکھا اور محسوس کیا اگرچہ انھیں اپنے خاص انداز زمیندارانہ نظام کے خاتمے کو بیان کرنا اور تاریخی ناولوں کے اسلوب کو ہی اپنے فکر و فن کا خاص حصہ بنا رکھا تھا مگر جب انھوں نے زندگی کی حقیقتوں کو قریب سے دیکھا اور دلّی کے ماحول اور ہندوستانی مسلمانوں کی زبوں حالی کی داستان کو پڑھا تو ان کا قلم ایک ایسے موضع کا انتخاب کرتا ہے جس کے لئے ان کا ذہن موضوع کی مناسبت سے ہم آہنگ نہیں تھا اس لئے انھوں نے اس ناول کو مکمل طور پر اپنی قلم کی گرفت پر رکھنے سے مجبور دکھائی دیتے ہیں۔ اس ناول کے صفحۂ قرطاس پر آنے کے بارے میں قاضی عبدالستار نے کچھ اس طرح فرمایا ہے۔

''جہاں تک حضرت جان کا تعلق ہے تو اس کے حوالے سے بھی کچھ بنیادی باتوں کا انکشاف ضروری سمجھتا ہوں۔ بہت دن ہوئے جب حیات اللہ انصاری صاحب راجیہ سبھا کے ممبر ہوئے تھے اور ویسٹرن کورٹ میں قیام فرماتے تھے، میں ان سے ملنے گیا۔ ہمیشہ کی

---

[1]: حضرت جان (ناول)۔ قاضی عبدالستار۔ ایجوکیشنل بک ہاوس، علی گڈھ۔ 1990ء، ص: 1

طرح وہ بہت خوش ہوئے۔ اصرار کر کے کھانا کھلایا۔ چلتے وقت فرمایا کہ اب کی جب آیئے تو ایک دن ہمارے پاس قیام کیجئے۔ میں دوسرے یا تیسرے مہینے جب دہلی گیا تو سیدھا ان کے پاس پہنچ گیا۔ ویسٹرن کورٹ میں وہ اپنے بیٹے اور بہو کے ساتھ قیام کئے ہوئے تھے میرا بستر انھیں کے کمرے میں تھا۔ جب ان کے بیٹے سدرت اپنی بیگم کے ساتھ خواب گاہ میں چلے گئے۔ تب انصاری صاحب اٹھے، کنجی سے ایک دراز کھولی اور ایک فائل جو ایک بڑے لفافے میں بند تھی، نکال کر مجھے دی اور کہا میں نے یہ نوٹس لیے ہیں یہاں کی ہولناک زندگی کے متعلق۔ خواہش تھی بلکہ آرزو تھی کہ میں اس پر ایک ناول لکھوں، لیکن عمر جیسے تخیل پر اور تخلیقت پر غالب آچکی ہے۔ ہمت نہیں پڑتی، نہ میں اتنی محنت کرنے کی قابل رہ گیا۔ اکثر یہ خیال آیا کہ آپ اس پر لکھ سکتے ہیں۔ ہر چند کہ جنس آپ کا موضوع کبھی نہیں رہا، لیکن استعاروں کی دولت تو آپ کے پاس ہے۔ اس کے وسیلے سے آپ کیسی بھی کوئی بھی بات خوب صورتی کے ساتھ کہہ سکتے ہیں۔ اس کو اپنے بیگ میں رکھ لیجئے۔ اطمیان سے پڑھئے اور ضائع کر دیجئے۔ یہ آپ کو وعدہ کرنا ہوگا۔ میں نے عرض کیا انصاری صاحب اگر آپ حکم دیں تو میں اسی شب میں اسے پڑھ لوں۔ اور آپ کے سامنے اسے ضائع کر دوں۔ نہیں ایسی کوئی ضرورت نہیں۔ آپ اسے اپنے ساتھ لے جائیں اور اطمیان سے پڑھیں میں نے بڑی محنت سے بہت وقت لے کر حضرت جان لکھا۔ اس کی اشاعت کو کافی دن ہو چکے تھے جب تم قرۃ العین حیدر کی حدمت میں حاضرت ہوا اور دورانِ گفتگو عرض کیا کہ میرا جی چاہتا ہے کہ میں Horror پر ایک ناول لکھوں۔ قرۃ العین حیدر نے برجستہ فرمایا، وہ تو آپ لکھ چکے۔ حضرت جان سے بڑھا Horror اور کیا ہوگا۔ ایک چھوٹا سا جملہ ہے لیکن مجھ پر ایک کیفیت طاری ہوگئی اور یہ محسوس ہوا کہ میری محنت سوارت ہوگئی۔ قرۃ العین حیدر، بڑے بڑوں کو نظر انداز کرتی رہیں یا ٹیڑھے میڑھے جملوں میں ٹرخا دینے کی عادی رہی ہیں۔ لیکن مجھے فخر ہے کہ میری تحریروں کو انھوں نے ہمیشہ ہی پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا اور اس کا برملا اظہار بھی کیا۔ یہاں میں اس بات کا ذکر بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ انصاری صاحب کے پورے نوٹس کا میں استعمال نہیں کر سکا، اس لئے کہ مجھے اپنے بیوی بچوں کو منھ دکھانا تھا۔'' [2]

---

[2] قاضی عبدالستار: اسرار و گفتار۔ راشد الذراشد۔ عرشیہ پبلی کیشنز دہلی۔ 2014ء۔ ص:270-269

جیسا کہ قاضی عبدالستار کے مزکورہ بالا بیان سے عیاں ہوتا ہے کہ ''حضرت جان'' ناول حیات اللہ انصاری کے دئے گئے نوٹس اوران کی فرمائش پر لکھی گئی اورادب میں عام طور پر یہ خیال رائج ہے کہ فرمائشی چیز ناقص ہوتی ہےاور جب تک کسی موضوع سے ہمارے ذہن کومناسبت نہ ہوتب تک تخلیقی کرب ظاہر نہیں ہوتا ہے اگر چہ اس ناول کا موضوع ایک طرح نہایت ہی پیچیدہ اور ضروری ہے مگر قاضی صاحب کے برتنے کا اندازا لگ ہےاس لئے یہ ناول منفرد نہیں بن سکا۔ ویسے ناول کی شروعات بہت خوبصورت ڈھنگ سے ہوتی ہےاور قاضی عبدالستار کا اسلوب دکھائی دیتا ہے مگر جیسے جیسے ناول آگے بڑھتا ہے موضوع کی مناسبت سے ان کا انداز بدلنے لگتا ہے۔ یہ ناول اس عہد کا ایک المیہ ہے جس نے سارے تہذیبی اور اخلاقی بندھنوں کو کاٹ کے رکھ دیا۔ ناول میں جگہ جگہ ایسے مناظر دیکھنے کو ملتے ہیں جو قاری کو کچھ دیر کے لئے بے حس وحرکت دیتے ہیں اور وہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ جامع مسجد کے بلند میناروں کے قرب و جوار میں کیسے کیسے حالات بن گئے جن کے فاتح کے لئے جامع مسجد اپنے بلند ہاتھوں کو اٹھائے دعا مانگ رہی ہے مگر قبولیت کے تمام دروازے بند ہو چکے ہیں۔

''جامع مسجد صدیوں کی طرح آج بھی دوزانو بیٹھی میناروں کے ہاتھ اٹھائے اپنے فرزندوں کی سلامتی کی دعا مانگ رہی ہے مدت ہوئی کہ بابِ قبول بند ہو چکا ہے مگر کیسا یقین ہے کہ بیٹھے بیٹھے پتھر ہوگئی مگر ایک لمحے کے لئے بھی ہاتھ دعا سے مایوس نہ ہوئے۔'' [3]

غرض ناول میں قاضی عبدالستار مٹتی ہوئی اخلاقی قدریں اوران قدروں پر بڑھتی ہوئی جنسیت اور عریانیت اورفحاشی کے بڑھتے ہوئے بازار کو پیش کیا ہے کسی طرح آج فرزندانِ توحیدا پنے مقصد کو بھول کر صرف جسمانی لذتوں سے کھیلنا ہی زندگی کا مقصد بنالیا ہے جن کے لئے پیسہ اورعیش ہی بنیادی مقصد ہیں اور اس کے حصول یابی کے لئے وہ کچھ بھی کرنے کے لئے تیار ہیں۔ اس ناول میں قاضی عبدالستار نے تمام پہلوؤں پر قلم کھول کر لکھا ہے جس کی وجہ سے کئی واقعات دوہرائے گئے ہیں اور بھرتی کے واقعات اور بلا ضرورت ناول میں پھیلاؤ ہونے کی وجہ سے ناول کی ضخامت بڑھ گئی اور قدر و قیمت گھٹ گئی ہے۔

حضرت جان کی کہانی موجود منظرنامے کے تحت لکھی گئی ہے جس میں مادہ پرستی اور ہوس پرستی کا چاروں

3: حضرت جان (ناول)۔ قاضی عبدالستار۔ ایجوکیشنل بک ہاوس، علی گڈھ۔ 1990ء، ص:3

طرف بازار گرم ہے۔اس کہانی میں باہری ملک سے ''حضرت جی'' کی آمد سے ہوتا ہے جو تجارت کے واسطے ہندوستان آئے ہی مگر اپنے ہوس کی تجارت کم سن عورتوں لڑکیوں کے ساتھ عیاشی کرتے ہیں اور بس پر ''حضرت جی'' کو دلی کی تنگ وتاریک گلیوں میں ''حاجی جی'' ملتے ہیں ان کی غریبی اور کمزوری کا فائدہ اٹھا کر ان کے ذریعہ اور اپنی جنسی خواہشات کی تکمیل کے لئے استعمال کرتے ہیں حاجی جی کی بیوی حضرت جی کی خوب خاطر مدارات کرتی ہے اس کے علاوہ حضرت جی کے لئے نئی نئی عورتوں کا انتظام حاجی جی کرتے ہیں اور اپنی عیش پرستانہ مزاج کے لئے اور جنسی آسودگی کے لئے خوب مال و دولت خرچ کرتے ہیں۔حاجی جی کے کردار کے علاوہ دلال گری کا کام بلاقن بوا کے ذریعہ بھی ہوتا ہے جو حاجی جی کے لالچ دینے پر بجو نامی شخص کی بیٹوں کو اپنے چنگل میں پھنسا کر انھیں حضرت کے لئے مالِ غنیمت کی طرح فراہم کرتی ہیں۔ جب حضرت جی کو اپنی من پسند لڑکیاں اور عورتیں نہیں ملتی تو یہ ہر حضرت حاجی جی کو خوب سخت سُست کہتا ہے۔اور بجو نامی شخص کو خرید کر اس کی تمام لڑکیوں سے عیش کرتا ہے اس کی لڑکیوں میں اشن بشمن ، کشن ہیں کشن جن کی شادی پہلے ہی ہو چکی ہے اور اس کو اپنے شوہر سے طلاق دلوا کر اسے اپنے شیشے میں اتار لینا ہے مال و دولت زیور اور گہنے کے لئے ان عورتوں کی آنکھیں چوندھیا جاتی ہیں اور دلی کے بڑے بڑے فائیو اسٹاڑ ہوٹلوں میں جا کر خوب عیاشی ہوتی ہے۔اس کے علاوہ یہ دلال لوگ عورتوں کے جسموں سے کھیلنے کے لئے فلیٹ بھی خرید لیتے ہیں اور اس فلیٹ میں جدید ٹکنالوجی اور جدید قسم کے عیاشی کے تمام سامانوں کو آراستہ کرتے ہیں اور دھیرے دھیرے اپنا کاروبار بڑھاتے ہیں اور اس کاروبار میں اب حاجی جی کا بیٹا راجہ بھی شامل ہو جاتا ہے راجہ بھی مادہ پرست اور لالچی انسان ہے جو حضرت جی کی دولت کا خوب فائدہ اٹھاتا ہے اور اپنے دیگر دوستوں کو اپنے ساتھ اس کاروبار میں جوڑ لیتا ہے حاجی جی کی لڑکیوں کا اپنے دوستوں سے نکاح کرا دیتا ہے چاند اور جان نامی لڑکے بھی اس دھندے میں شامل ہیں اور شمن اور کشن سے نکاح عیاشی کرنے کے لئے کر لیتے ہیں راجہ دھیرے دھیرے دوسری لڑکیوں سے تعلقات بڑھانے کے لئے بلاقن بوا کی مدد لیتا ہے اور اچھی جان نامی عورت اور اس کی لڑکیوں تک پہونچ جاتا ہے دُردانہ افسانہ اور سلطانہ نامی عورتیں بھی اس دھندھے میں ملوث ہو جاتی ہیں۔اور ان کے شوہروں کو خرید کر ان کی بیویوں کو عیاشی کا سامان بنا دیا جاتا ہے۔اس کے علاوہ پروجیکٹر کے ذریعہ پورن فلمیں دیکھی جاتی ہیں ان پورن فلموں کو حضرت جی دیگر عورتوں

کے ساتھ آزماتے ہیں ساتھ اپنی عیش پرستی کی بھوک کو بڑھاتے رہتے ہیں اس کے علاوہ نام کے تمام مرد ہندوستانی کردار بھی تمام عورتوں کے ساتھ جسمانی رشتہ بناتے ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ پھیر بدل کے ساتھ رشتہ بنانے پر قباحت محسوس نہیں کرتے راجہ، چاند، جان کاظم یہ تمام نوجوان کردار بھی ان عورتوں کے ساتھ عیش کرتے ہیں اور ان کی غریبی کا فائدہ اٹھا کر ان کی عزت وعظمت سے کھیلتے رہتے ہیں۔

راجہ اپنے اس دھندھے کو بڑا کرتا رہتا ہے اور وہ راقم علی نامی شخص کو بھی خریدنا چاہتا ہے جب وہ اس دھندھے کو کرنے کے لئے انکار کرتا ہے تو اسے راستے سے ہٹا کر اس کی بیٹیوں اور بیوی کو بھی اپنے دھندھے کی چوکھٹ پر لاکر کھڑا کر دیتا ہے مشتری اور ناہید نامی لڑکیاں بھی راجہ کے جال میں پھنس جاتی ہیں۔ اور انھیں اپنے دھندھے اپنے شیشہ میں اتار کر انھیں ننگا بنا کر حضرت جی اور ان کے دوستوں کے سامنے پیش کرتا ہے اور ان سے کہتا ہے حضرت جی اور ان کے دوست یوروپ سے پڑھے اور بڑھے ہیں ان کے سامنے انٹر ویو بھی لینا مزاق بنوانے کے مترادف ہے۔ اس عیاشی کے لئے ہوٹل بک کرائے جاتے ہیں اور ان عورتوں کو حضرت جی کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔ ساتھ اس ناول میں راجہ کے دوست آتے ہیں اور لڑکیاں اور عورتیں ہمہ وقت خریدی اور بیچی جاتی ہیں حضرت جی ہندوستان آتے ہیں دادِ عیش دیتے ہیں اور اپنے دلالوں کے ذریعہ نئی نئی عورتوں کو پھانستے ہیں انھیں لالچ دیتے ہیں۔ یہاں تک ماں بیٹوں میں بھی تفریق نہیں ہوتی ہے اور انھیں اپنی جال میں پھنسا کر بلیک مارکٹینگ ہوتی رہتی ہے۔ مذہب انسانیت کو جسمانی حیوانیت کے ہاتھوں نوچا جاتا ہے۔

اس ناول میں قاضی عبدالستار نے سماجی موضوعات پر نہایت کھلے طور پر بحث کی ہے اس کے علاوہ سماج میں ہونے والے متعدد سیاسی اور سماجی واقعات وحادثات کی پیش کش ملتی ہے۔ فرقہ ورانہ فسادات ہندو مسلم تفریق دنگے لڑائی جھگڑے کرفیو وغیرہ کا بیان لوٹ کھسوٹ اور اس فسادات کے پیچھے سیاسی اثر ورسوخ کے لوگوں کے ذہنی کیفیات کی عقاسی ملتی ہے انھیں کسی فساد کے پیچھے کس طرح مالی امداد ہوتی ہے اس کا ذکر ملتا ہے۔

جسم فروشی اور سیکس ریکٹ کے علاوہ اس ناول میں اخلاقی قدروں کے زوال مسلم گھرانوں کی زبوں حالی فحاشی اور عیاشی کے سبب مٹتی ہوئی تہذیبوں کی نوحہ خوانی اس ناول میں دکھائی دیتی ہے۔

حضرت جان قاضی عبدالستار کی اُس صحت مندانہ اسلوب اور رعب دارانہ مزاج کے فن کا غماز کرتا ہے۔ جہاں ایک قاضی عبدالستار کا قلم جاگیر دارانہ اور زمین دارانہ شان وشوکت اور تاریخ نگاری کے جاہ و جلال کو بیان کرنے کے لئے جانا جاتا ہے وہیں پر قاضی عبدالستار نے اپنی قلم سے حضرت جان جیسا ناول لکھ کر سفید صفحہ پر ایک سیاہی کے نقطہ کی طرح نشان بنادیا اسی سیاہ نقطے کو قاری اور نقاد اپنے مختلف نظریات واعتقاد کے سبب کوئی بھی فیصلہ صادر کر سکتے ہیں۔ جہاں ایک طرف اسی ناول کو فحش نگاری کی نظر سے دیکھا جاتا ہے وہیں دوسری طرف قاضی عبدالستار نے اس میں دور حاضر کی سفاک حقیقتوں پر سے پردہ اٹھا کر اسے بنا کسی ملمع سازی سے چوں کا توں پیش کر دیا ہے ایک طرف قاضی عبدالستار کا قلم جنس کے موضوع پر جس طرح سے دلہن کے چہرے کو ڈھکے ہوئے گھوگھنٹ کی طرح پیش کرتے تھے اوران کے قلم میں اتنی طاقت تھی کہ اپنے اسلوب کے ذریعہ نہ صرف گھوگھٹ بلکہ اس کے اندر بند خوبصورت یا بدصورت دلہن کو اتنے خوبصورت اورادبی لطیف پیرائے میں بیان کرتے تھے کہ لطف وانبساط کی لہر ہر رگ وریشے میں دوڑ جاتی تھی وہیں قاضی عبدالستار نے اس ناول میں پھوہڑ طریقے سے جنس کا بیان کیا ہے۔ جوان کے انداز قلم سے بالکل منفرد دکھائی دیتا ہے۔

اگر چہ قاضی عبدالستار نے اس ناول کو صفحہ قرطاس پر لانے کے وجوہات کو بیان کیا ہے۔ مصنف کا قلم دوسرے کے سجھائے گئے مواد پر اتنی شرست اور گہرائی سے نہیں بیان کیا جاسکتا جس طرح مصنف کا ذہن از خود کسی مسئلے یا نقطے کی طرح متوجہ ہو۔ اس کے علاوہ قاضی عبدالستار کے فن کا خاص وصف زمیندارانہ عہد اور تاریخی عہد کے بیان میں زیادہ پھیلتا اور کھلتا ہے اس لئے اس ناول کو انھوں نے اتنی خوبصورتی سے نہیں برتا کہ موضوع سے انصاف کر پاتے۔

قاضی عبدالستار کے اس ناول کے ادب کے قرطاس پر منعکش ہونے کے پیچھے جہاں ایک طرف بزرگ ناول نگاری حیات اللہ انصاری کا ہاتھ ہے وہیں دوسری طرف دروغِ گردن برراوی کہ نوجوان نسل کے قلم سے ''مکان''، ''ندی''، ''پانی'' وغیرہ ناول نکل رہے تھے اس لئے قاضی عبدالستار کا قلم زمیندارانہ نظام کے بیان کے خاتمے کے بعد ہندوستان کی آزادی اور آزادی کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کی زبوں حالی کی زندگی کو پیش کرنا اور اس پیش کش میں فحاشی اور عریانیت کے بڑھتے بازار کو پیش کرنا ایک مقصد تھا جہاں جامع

مسجد کی شاندار ماضی اپنے سپوتوں کے کالے کارناموں کو ختم کرنے کے لئے لگا تار خدا واحد کے سامنے ہاتھ پھیلا کر دعا گوں ہے تا کہ جنسی اور فحاش بازار کا خاتمہ ہو سکے کوئی حاجی جی پاک سرزمین سے کسی دوسری سر زمین پر اپنی جنسی خواہشات کی تکمیل اور عورتوں کے جسموں کو کھلونوں کی طرح نہ کھیل سکیں۔

اگر چہ اس ناول میں انھوں نے ''کیبر ے'' کا بیان کیا جو ایک طرح کا جنسی طرز کا ڈانس ہوتا ہے مگر اس شو کی نقل و حرکت کو مکمل طور پر پیش کرنے سے عاجز رہے۔ اگر قاضی عبدالستار اس ناول کو ذرا ٹھہر کر اور نقاد کی حیثیت سے عجلت کے بغیر اس ناول پر نظر ثانی کرتے تو ممکن ہے 500 صفحات پر مشتمل یہ ناول 200 سو صفحات تک پہونچ آتا اور ایک خوبصورت اور عمدہ ناول بن سکتا تھا جو قاضی عبدالستار کے جاگیر درانہ مزاج کا ایک نیا انداز ہوتا۔

قاضی عبدالستار راقم الحروف کی ملاقات کے بعد اس ناول کا مطالبہ کیا گیا جو قاضی عبدالستار کے پاس سے ناپید ہو چکا تا اور انھیں اس ناول کی Xerox کاپی کو قاضی صاحب کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے بہت خوشی ہو رہی تھی۔ ایک عہد ساز فکشن نگار کو ان کی خدمت میں ان کا ہی ناول پیش کرنا جو میرے استاد پروفیسر علی احمد فاطمی کی مرہون منت میرے پاس موجود تھا۔

غرض اس ناول کو فحش ٹھہراتے ہوئے میں اپنے عہد کے چاروں طرف نگاہ ڈالنے کی ضرورت ہے جہاں ہر 10 سال کے بچے کے ہاتھ میں موبائیل فون ہے جہاں پر وہ رات دن کے کسی بھی اوقات میں اسکرین کے ایک پچ پر دنیا و جہاں کے فحش و عریانیت بھرے مناظر کو پلکے جھکائے بنا دیکھتا ہے اس لئے اگر اس ناول کو فحش قرار دیا جائے تو ہمیں آج کے عہد کے بیشتر بچوں کو فحش اور عریاں پسند نام دینا پڑے گا جن کے ہاتھوں میں سیل فون موجود ہے۔

بہر کیف اگر اس ناول کو انھوں نے اپنے اسلوب کے اسی خوبصورت امتزاج تشبیہات و استعارات کے خوبصورت تال میل کے ساتھ پیش کرتے تو اس ناول میں پھوہڑ پن کے بجائے ادبی شان پیدا ہو جاتی ہے اور حضرت جان ناول کو فحش اور شہوت انگیز ناول اور اردو ادب کا بدنام ناول نہیں قرار دیا جاتا۔

حضرت جان میں جتنے بھی کردار ہیں وہ ایک طرح کے جامد کردار ہیں کسی کے اندر اِن تمام حادثات و واقعات سے ٹکرانے کی کوئی ہمت نہیں ہے خاص طور سے عورتوں کے بارے میں یہ بات بہ آسانی کہی جاسکتی

ہے۔حضرت جان ناول میں عورتوں کے تمام کردار مٹی کے مادھو کی طرح ہیں کسی کے اندر حالات سے ٹکرانے اور اپنی عزت وعصمت کی حفاظت کرنے کا کوئی جذبہ موجود نہیں ہے یہ تمام کردار مادہ پرست ہیں اور سب کے اندر تیعش پسندی ہوس ولالچ ہے ماں اور بیٹی کی ساتھ ساتھ عزتیں نیلام ہوتی ہیں اور اس کاروبار میں باپ بھائی بہن ماں سبھی شامل ہیں لیکن پیسے کی لالچ کی بدولت کو وہ اپنے جسموں کو آسانی سے فروخت کرنے کے لئے تیار ہیں۔نہ ہی ان کے اندر کوئی اخلاقی انداز دکھائی دیتا ہے اور نہ مذہبی ڈروخوف یہ دن رات عیش کوشی میں مصروف رہتی ہیں اور اپنے جسموں کو حضرت جی جیسے عرب تاجروں نما گدھوں کو پیش کرتی رہتی ہیں۔

یہ تمام نسوانی کردار غریبی اور وقت کی ستم ظریفی کا شکار ہیں۔جن میں خاص طور سے بلاقن بوا بجوکشن، رشن سمن اور ناہیہ سلطانہ دردانہ وغیرہ ہیں ایک اور کردار کا نام بار بار ناول میں آتا ہے جو شادی شدہ ہے جس کے حسن کے چرچے خاص وعام کے زبان پر ہے صوفیہ لارن جس کے جوان بچے ہیں مگر اس عورت کے پیچھے تمام تر کردار گدّھوں کی طرح نظر جمائے بیٹھے رہتے ہیں۔غریبی اور بے چارگی ان کو جسم فروشی کے دھندے میں دھکیل دیتی ہے۔مسلم گھرانوں کی غریب عورتوں کے استحصال کو قاضی عبدالستار نے بہت خوبصورتی سے دکھانے کی کوشش کی ہے۔یہ دو وقت کی روٹی کے اپنی عزت بیچتی ہیں یہ تمام کردار وقت کے ہاتھوں بے بس ہیں۔ان کی تہذیب ان کا مذہب ان کی اخلاقی قدریں سبھی مٹی میں ملتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔

اس ناول میں نسوانی کرداروں کو اپنی عزت وعصمت کو سامنے سے لٹتا ہوا دیکھتی ہیں مگر کچھ بول نہیں پاتی ہیں ان کے زبان نہ کھولنے کے کیا اسباب ہو سکتے ہیں اس بات پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے کیا صرف دو وقت کی روٹی کے لئے ایک انسان کا احساس اتنا مرجاتا ہے کہ ایک شخص کے ساتھ ماں اور بیٹی دونوں عیاشی کرنے میں مست رہتی ہیں کیا یہ کردار اتنے محتاج تھے کہ دو وقت کے کھانے کے لئے کوئی محنت و مزدوری نہیں کر سکتے تھے کیا ان کے پاس کام کرنے کے لئے کچھ بھی نہیں تھا کہ یہ اپنی بیوی اور بیٹیوں کو جسم فروشی کے دھندھے میں دھکیل دیتے ہیں اور ان کے جسموں کی کمائی سے عیش وآرام کی زندگی گذار رہے ہیں؟ یا ان کے خاموشی کی وجہ اور احتجاج نہ کرنے کا سبب ان کا خود کا ہوس پرست اور لالچی ذہن ہے اس ناول میں کہیں بھی احتجاج کی کوئی کرن دکھائی نہیں دیتی بلکہ تمام کردار مل جل کر بدفعالیاں کرنے میں محو رہتے

ہیں اور خود کو سجا سنوار کر حضرت جی جیسے گدّھوں کے سامنے اپنے مردہ جسموں کو پیش کرتے ہیں۔ یہ ناول پڑھتے ہوئے راقم الحروف کو اس بات کا انتظار رہا کہ کوئی کردار تو ایسا ہوگا جو اس جسم فروشی کے دھندلے کے خلاف لب تو کھولے گا مگر پورے ناول میں صرف عیاشی کا سامان بنی پھرنے والی عورتوں کے زبان سے اپنی عفت وعصمت کو بچانے کے لئے کوئی جملہ ادا نہیں ہوا وہ صرف دھن دولت گہنے کی لالچ اونچے اونچے بڑے ہوٹلوں میں گھومنے اور سیر کرنے کو پسند کرتی رہیں۔ گہنے اور روپیے کے نقلی ہونے کے ثبوت ملنے پر بھی کسی کی طرف سے کوئی احتجاج نہیں ہوتا ہے بلکہ ہر چیز نا قابلِ برداشت فعل بھی برداشت کیا جاتا ہے اور انھیں اپنے لوٹے جانے کا کوئی احساس نہیں ہوتا ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہوں۔

> ’’پھر بھوک لگی جو تمام عشرتوں پر بھاری پڑتی ہے۔ روٹی کی بھوک گوشت کی بھوک سے اور گوشت کی بھوک روٹی کی بھوک سے اسی طرح لڑتی رہی ہے ایک بھوک دوسری بھوک سے پار جاتی ہے۔ لیکن جیت ہمیشہ بھوک کی ہی ہوئی ہے وہ نمکین چمکدار اٹھتے ہوئے گوشت کے قد آدم مجسمے کی طرح فریج کے سامنے کھڑی تھیں اور اوپر سے نکلے ہوئے تازے مہکتے ہوئے سفید سلائیں کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ ایک بھوک سے آسودہ ہو کر دوسری بھوک مٹا رہے تھے۔ دوسری بھوک سے آسودہ ہونے کے لئے پہلی بھوک مٹا رہے تھے۔‘‘ 4

اس اقتباس میں قاضی عبدالستار نے جسمانی اور نفسیاتی بھوک کو خوبصورت ڈھنگ میں پیش کیا ہے اس اقتباس میں انھوں نے جس طرح پیٹ کی بھوک کی اہمیت دکھائی ہے اس کو تمام دوسری بھوکوں پر بھاری قرار دیا ہے کیوں کہ جب تک روٹی کی بھوک مکمل نہیں ہوتی ہے اس وقت کسی دوسری بھوک سے لطف اندوز ہونے کے لئے انسان کا من راغب نہیں ہوتا پیٹ کی بھوک مٹنے کے بعد ہی جسمانی اور نفسیاتی بھوک کی تکمیل ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ خالی پیٹ لوگ خدا کو بھول جاتے ہیں اور ایک کہاوت ہے خالی پیٹ تو بھجن نہیں ہوتا ہے یہ بھجن اگر نہیں ہوسکتا ہے تو ایک عورت اگر ننگی ہو کر کسی بھوکے انسان کے پاس چلی جائے تو اسے اس کے جسم میں کوئی دل چسپی نہیں ہوگی جب تک روٹی کی بھوک مکمل نہیں ہو جائے۔

اس ناول میں ہندوستانی لوگوں کی صورت حال کو قاضی عبدالستار نے جسم فروشی کے دھندے میں

4: حضرت جان (ناول)۔ قاضی عبدالستار۔ ایجوکیشنل بک ہاوس، علی گڈھ۔ 1990ء، ص: 157

ملوث ہونے کی وجہ بھوک کو قرار دیا ہے کہ جب انسان کو کھانے کی بھوک ہوتی ہے تو وہ کوئی کام کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے اور وہ اچھا خراب حرام اور حلال کی تفریق بھی بھول جاتا ہے۔

ناول میں حضرت جی بحرین کے ایک تاجر ہیں حاجی جی نے انھیں ہندوستان میں اپنے گھر میں پیر کی طرح بنا کر پیش کیا تھا۔ اپنی حقیقت سے واقف کراتے ہوئے حضرت جی کہتے ہیں کاظم سے جب وہ کہتا ہے کہ۔

''کم پڑھا لکھا ہوں حضرت جی... یہ بھی نہیں جانتا کہ آپ پہنچے ہوئے ہیں کہ دھتکارے ہوئے... لیکن اتنا جانتا ہوں.... کہ پیسہ کتے کو خرید تو سکتا ہے.... لیکن وفا کا سبق محبت ہی پڑھاتی ہے۔'' 5

مگر مادہ پرست اور عیاش حضرت جی کو عشق و محبت اور وفا کے نام سے کوئی آشنائی نہیں ہے وہ تو صرف ہندوستان میں اور جنسی خواہشات کی تکمیل کے لئے آتے ہیں اور محبت اور وفا جیسے الفاظ اس بیسویں صدی میں کھلونے کی طرح لگتے ہیں حضرت جی اپنی باتوں سے ہندوستانیوں کی سادہ لوئی پر بھی گفتگو کرتے ہیں جو آسانی سے ہر کسی کی بات پر ایمان لے آتے ہیں حضرت جی جیسے ہوس پرست انسان کو بھی اپنا پیر سمجھنے لگتے ہیں اور عورتیں ان کو کوئی پیر فقیر سمجھ کر اولاد کی نعمت حاصل کرنے کے لئے ان کے پاس آتی ہیں مگر وہ تو صرف ایک تاجر ہیں اپنی حقیقت پر انھوں نے صاف لفظوں میں اس طرح بیان کیا ہے۔

''محبت اور وفا یہ سب کھلونے ہیں جن سے ہم فرصت کے وقت کھیل لیتے ہیں۔ لا گلاس بھر دے.... ایک بات کہوں اچھی جان... مجھے ناچ بہت پسند ہے لیکن تم جیسی عورتوں کا پیشہ کرنے والیوں کا نہیں۔ وہ ناچتی نہیں ہیں اپنے بدن کے پیالے کھول کر بھیک مانگتی ہیں وہ ناچتی ہیں تو ہر گھڑی احساس رہتا ہے کہ بل بڑھ رہا ہے۔ تم ناچو گی تو سمجھوں گا کہ دہکتی ہوئی آنکھوں پر آسمانی شبنم گر رہی ہے۔

''تم سمجھتی ہوگی کہ میں پیر ہوں... میں پیر نہیں ہوں، تاجر ہوں راجہ کے باپ نے جب اپنی بیوی کو مجھے دے ڈالی.... تو مجھ کو یہ خطاب بھی دے ڈالا جہاں میں نہیں جا سکتا وہاں یہ خطاب پہونچا دیتا ہے۔ جو اکیلی نہیں آسکتی وہ اس خطاب کی انگلی پکڑ کر چلی آتی ہے۔ انڈیا میں اس خطاب کی اتنی قدر ہے جتنی پوری دنیا میں کہیں نہیں ہے۔ تو پھر میں کون

5: حضرت جان (ناول)۔ قاضی عبدالستار۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڈھ۔ 1990ء، ص: 474

ہوں؟ میں بحرین کا تاجر ہوں مال سستے داموں خریدتا ہوں مہنگے داموں بیچتا ہوں لیکن دھوکا نہیں دیتا۔ ریا کاری نہیں کرتا... یہ کپڑے محض ہیں۔ جیسے تمھارے کپڑے صرف کپڑے ہیں۔ جس طرح تم یہ کپڑے پہن کر نئی نویلی باکرہ دولھن نہیں بن سکتیں۔ اسی طرح میں یہ کپڑے پہن کر پیر نہیں بن سکتا... میں دنیا کا کتا ہوں۔ تم آسمان سے ستارے مانگو۔ میں تم کو خوش کرنے کے لئے تمھاری خوشی سے اپنی لذت نچوڑنے کے لئے وعدہ کرلوں گا اور بازار سے ہیرے خرید کر دے دوں گا۔ تم نے مجھ سے اولاد مانگی ہے۔ جب سے اولاد مانگی ہے میں بے قرار ہوں۔ میں تم کو بالکل نئے بالکل موڈرن لیٹسٹ ''روبو'' خرید کر دے سکتا ہوں لیکن اولاد نہیں دے سکتا۔ اگر میں اولاد دینے پر قادر ہوتا تو سب سے پہلے اپنی بیوی کو دیتا۔ وہ بھی تمھاری طرح اولاد کے لئے یوروپ اور امریکہ کے چکر لگایا کرتی ہیں۔ میں یہاں ہوں میری بیویاں یوروپ میں ہیں...وہ کسی پیر کے پاس نہ سہی کسی ڈاکٹر کے پاس اسی طرح پڑی ہوں گی جس طرح تم میرے پاس ہو۔'' 6

قاضی عبدالستار نے اس ناول میں جہاں عورتوں کی نفسیات کا ذکر کیا ہے وہ کسی طرح سے ایک عورت سے بیر رکھتی ہیں وہیں دوسری طرف نئے زمانے کے لوگوں کے ذہنی رویوں پر بھی نظر ڈالی ہے آج کے مارکیٹ کلچر میں کس طرح سے لوگوں کے سوچنے کا رویہ بدل گیا ہے اب نہ تو کوئی عورت خود کو چھپا کر رکھنا چاہتی ہے اور نہ ہی مرد چاہتا ہے کہ اس عورت کا سات پردوں کے پیچھے رہے بلکہ وہ اپنی خوبصورت عورت کو آدھا ننگا کر کے کسی پارٹی اور ہوٹلوں میں اس لئے لے جاتا ہے کہ لوگ اس بیوی یا محبوبہ کے حسن اور جسم کی داد دے سکیں اور دوسرے لوگ اس قسمت پر رشک کرنے کے علاوہ جلن بھی محسوس کریں۔

عورتوں کی نفسیات کا ذکر انھوں نے اس طرح مختصر لفظوں میں کیا ہے کہ آج ہر عورت کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ ایک سے زیادہ مردوں کی منظور نظر بن کر رہے صرف ایک کے ساتھ رہنا اور اس کے ساتھ وفا کی قسمیں کھانے آج کی عورتوں کے لئے مشکل کام ہے وہ عورت کوئی نیک پارسا بیوی بن کر زندگی گزارنا نہیں چاہتی بلکہ اپنی پسند اور مرضی کے ساتھ ایک سے زیادہ مردوں کے ساتھ رشتہ بنانے پر فخر محسوس کرتی ہے اور اس کو جھجک یا قباحت محسوس نہیں ہوتی۔ ساتھ ہی اپنے شوق پورا کرنے کے لئے مہنگے اور قیمتی خواہشوں کی

6: حضرت جان (ناول)۔ قاضی عبدالستار۔ ایجوکیشنل بک ہاوس، علی گڈھ۔ 1990ء، ص: 475

تکمیل کے لئے اپنے جسمانی اعضاء کی خرید وفروخت کرنا بھی آسان ہو گیا ہے وہ اپنے جسم کے ذریعہ نہ صرف عیش کی زندگی گذارنا چاہتی ہیں بلکہ نئے زمانے کے ساتھ کسی بھی پچھڑے پن کا کوئی داغ اپنے اوپر نہیں لگانا چاہتی اس ناول میں بھی قاضی عبدالستار نے اس پہلو پر بحث کی ہے برقعہ سے نکل کر دھیرے، دھیرے سرکتے ڈوپٹوں کے ساتھ آخر کار کار کے اندر ڈوپٹہ چھوڑ کر ہوٹل کے اندر داخل ہونا اسی نفسیات کی عکاسی کرتا ہے۔جن کے اندر کوئی ڈر خوف یا جھجھک کا کوئی سامان موجود نہیں ہے۔

اکبر بادشاہ اس ناول میں ایک کردار جو کہتا ہے:

''آخری بات یہ ہے کہ آج کی رات سب اکبر ہیں سب حضرت جان ہیں ہر عورت چاہتی ہے کہ اس کے چاہنے والے ایک سے زیادہ ہوں۔ ہر مرد چاہتا ہے کہ اس کی عورت کو دیکھ کر دوسرے جلیں ورنہ تاج میں آنے والی ننانوے فیصد عورتیں اپنے یاروں کے ساتھ نہ آتیں۔اور آدھی ننگی نہ آتیں۔ایک بات اور پورا مرد اپنی عورت دوسرے مرد کو دے دیتا ہے۔آدھا مرد اپنی عورت اس لئے چھپا کر رکھتا ہے کہ کہیں اس کے اھورے پن کی ڈگی نہ پٹنے لگے...اور عورت پورے مرد ہی کہ نہ رہ جائے۔ 7

آج کے اس سابقے کی زندگی اور ایک دوسرے کو سبقت لے جانے کی فکر نے لوگوں کو کس طرح سے بدل دیا۔آج ہر شئے جسم سے ناپی اور تولی جاتی ہے۔کسی طرح دنیا ایک گلیمرس بازار بنتی جارہی ہے یہاں تک کہ بزنس کو بڑھانے کے لئے عورت اور عورت کے جسم کا استعمال خطرناک حد تک آگے بڑھ گیا ہے ان تمام رموز ونکات کی عکاسی اس ناول میں دکھائی دیتی ہے ساتھ ہی اپنے سوچ کو خوبصورت فلسفے کے لبادے میں ڈھاکنے کی بھی کوشش کی جارہی ہے۔ناول کا ایک کردار راجہ کی ذہنیت اس ناول میں عیاں ہوتی ہے جس نے بڑی خوبصورتی سے عورت کو ننگا دیکھنے کی خواہش ظاہر کی...کہتا ہے۔

''اچھی جان تم ان عورتوں میں جن کو تہذیب نے کپڑے پہنا کر مرد کے مذاق حسن اور احساس جمال پر ظلم کیا ہے۔میرا جی چاہتا ہے کہ میں اپنے دوستوں کے دسترخوان پر اسی طرح رکھ دوں۔ وہ تمھیں سونگھیں، چومیں، چکھیں اور اپنی قسمت پر ناز کریں کہ میری دوستی کے طفیل میں تمھاری ایسی عورت انھیں نصیب ہوئی۔'' 8

7: حضرت جان (ناول)۔قاضی عبدالستار۔ایجوکیشنل بک ہاوس،علی گڈھ۔1990ء،ص:443

8: حضرت جان (ناول)۔قاضی عبدالستار۔ایجوکیشنل بک ہاوس،علی گڈھ۔1990ء،ص:122

یہاں نئے زمانے میں اپنی بیوی بہن اور محبوبہ کو بے لباس کر کے خود کو شاباشی دلانا مقصد ہے انسان اپنی انا کے لئے کس طرح سے دوسروں کو جھوٹا کمزور اور نامکمل ثابت کرنے کے لئے اپنی ذاتی حسینہ بھی دوسروں کو آسانی سے دینے کے لئے تیار ہے۔شوہر اور بیوی جو ایک دوسرے کے لئے لباس ہوتے ہیں یہاں ایک دوسرے کو بے لباس کرنے کا شوق اس ناول میں دکھائی دیا ہے جو سماج پر اور ہمارے بدلتے ہوئے معاشرے کے ذہنیت کی سچی عکاسی کرتا ہے۔

مشرقی تہذیب جو مغرب سے بالکل الگ تھی جہاں عورت کو باپردہ اور گھونگھٹ میں رکھنے کی روایت تھی مگر مغرب پسندی نے انھیں اس حد تک متاثر کیا کہ وہ ان کے نقشِ قدم پر چلنے لگے اور اپنی ذاتی زندگی کو بھی بزنس کا ایک حصہ بنالیا۔

بہر کیف ''پہلا اور آخری خط''،''شب گزیدہ''،''داراشکوہ''،''صلاح الدین ایوبی''،''غالب'' کے بعد ادب کے قارئین کو امید تھی کہ قاضی عبدالستار کی قلم سے پھر سے ایسا ہی کوئی ناول ان کی قلم کی زینت بنے گا جو ان کے اسلوب نگاری کے آسمان کو ایک نئے ستارے کو پیش کرے گا مگر اس ناول نے ادب کے قاری کو مایوس کیا اور اس ناول میں قاضی عبدالستار کا کوئی رنگ وڈھنگ کہیں بھی دکھائی نہیں دیتا ہے۔

زبان و بیان کے سلسلے میں یہ ناول اپنے موضوع کے اعتبار سے اچھا ہے اس ناول میں نئے زمانے نئے طور طریقوں کے ساتھ جنسیت اور عریانیت کو بیان کیا ہے اس لئے اس ناول میں ''داراشکوہ'' کی شاہانہ زبان دکھائی نہیں دیتی ہے اور یہی ''خالد بن ولید کی تلوار کی کاٹ یا اسلوب اور نہ ہی صلاح الدین ایوبی کا جاہ وجلال اور نہ ہی غالب'' کی تہذیبی شان وشوکت کا بیان اور نہ ہی شب گذیدہ اور ''آخری خط'' کی طرح زمیندارانہ زوال۔اس ناول میں مکالماتی منظر کو پیش کیا ہے اور تمام کردار کے آپسی تعلقات کی وجہ سے مکالماتی انداز اس ناول کی خوبی ہے۔

اس ناول میں جذباتی اور جنسی کیفیات کو بھی ایک عام انسان کے بول چال کے الفاظ اور مکالموں اور آپسی گفتگو کی طرح جملے استعمال کئے گئے ہیں جو اس ناول کے موضوع کی ضرورت تھی۔

حضرت جان ناول پر گفتگو کرتے ہوئے محمد غیاث الدین صاحب لکھتے ہیں:

''حضرت جان کا ہر صفحہ آگ ہے۔یہ آگ قاری کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے اور قاری

آخری صفحے تک آگ کے دریا میں تیرتا رہتا ہے اس آگ کے شعلوں میں دلی کے دو متوسط طبقے کے مسلم خاندان خاکستر ہوجاتے ہیں۔ جہاں سات لڑکیوں کو اس طرح برباد وخراب کیا جاتا ہے کہ وہ کسی کو اپنا منھ نہیں دکھاسکتیں۔اس جماعت میں بیٹیوں کے ساتھ ماں بھی شامل ہے۔'' 9؎

اس ناول میں اگرچہ عریانیت کی تمام حدوں کو پار کیا گیا ہے اور قاضی عبدالستار اپنے اسلوب سے الگ ہٹ کر اس ناول کو لکھا ہے جس میں ان کا اسٹائل کم ہی کم دکھائی دیتا ہے۔

مگر قاضی صاحب کا استعاراتی انداز کہیں۔کہیں اپنے پورے آب وتاب کے ساتھ موجود ہے۔ یہاں اس اقتباس میں انھوں نے عورت کی نفسیاتی کیفیت کو اس طرح بیان کیا ہے:

''دیکھ ہر عورت قلعہ ہوتی ہے۔فتح ہونے کے لئے تیار...اب تو یہ دیکھ کہ فصل کہاں کہاں سے ٹوٹی ہے۔ برج کون سا کمزور ہے، دروازہ کہاں سے گھن گیا ہے، پہرے دار دارو پیتے ہیں کہ افیم کھاتے ہیں اور خود تیرے ہتھیار کیسے ہیں آدمی کتنے ہیں اور روپیہ کتنا ہے۔'' 10؎

یہاں قاضی صاحب تاریخی ناولوں میں استعمال شدہ الفاظ ان کے استعارات وتشبیہات کو کس طرح پیوست کیا عورت کو قلعہ سے تشبیہ دینا اسے فتح کرنے کے لئے اس کے آس پاس گھر والوں کے بارے معلوم کرنا یہ ایک طرح سے قاضی صاحب کا تاریخی اندازِ بیان ہے۔

اس ناول کا اقتباس پیش کرتی ہوں جس میں قاضی عبدالستار نے بیانیہ اور بلواسطہ انداز میں فحاشی اور عریانیت سے بھرپور انداز میں سیکس کے منظر کو پیش کیا ہے جو ان کا انداز کبھی نہیں رہا ہے:

...کمرے کے دروازے بند ہوگئے۔لالٹین آن ہوگئیں پروجیکٹر چلنے لگا۔کسی مرد نے کسی عورت کو بچھالیا۔کسی عورت نے کسی مرد کو اوڑھ لیا۔توشکوں کی شکنیں نکل گئیں۔لحافوں کی سلوٹیں برابر ہوگئیں جو کچھ فلم میں ہورہا تھا، اسکرین پر ہورہا تھا وہی بیڈ پر ہورہا تھا قالین پر ہورہا تھا صوفے پر ہورہا تھا۔'' 11؎

9؎: نذرِ قاضی عبدالستار، مرتب پروفیسر محمد غیاث الدین، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، دہلی 2004ء۔ص:340

10؎: حضرت جان (ناول)۔قاضی عبدالستار۔ایجوکیشنل بک ہاوس، علی گڈھ۔1990ء، ص:56

11؎: حضرت جان (ناول)۔قاضی عبدالستار۔ایجوکیشنل بک ہاوس، علی گڈھ۔1990ء، ص:193

قاضی عبدالستار نے یہاں عریانیت کے بہت سے مناظر کو بہت ڈھکے چھپے انداز میں بیان کیا ہے۔

نقطہ نظر: کے لحاظ سے دیکھیے تو اس ناول میں قاضی عبدالستار نے بدلتے ہوئے ہندوستانی معاشرے کی خوبصورت تصویر پیش کی ہے جس میں عورت صرف عیاشی کا ذریعہ بن گئی عورتوں کے تیئں بڑھتے ہوئے جرائم ان کے اوپر ہورہے ظلم و ستم کی خوبصورت داستان ہے۔ ہندوستانی عورت بہت سستے داموں پر یورپ کے مردوں کو دستیاب ہے اس لئے عرب اور یورپ کے تاجر یہاں آ کر عورتوں کے ساتھ عیاشی کرتے ہیں ان کے جسموں کے ساتھ کھیلتے ہیں اور پھر واپس لوٹ جاتے ہیں ہندوستانی عورت بھوک غریبی اور مفلسی کا شکار ہو کر چند پیسوں کی خاطر خود کا جنسی استحصال ہونے دینے پر مجبور ہے۔

ناول کے آخری میں عورتوں کی چیخوں کو قاری کو سنایا گیا ہے۔ مگر کیا یہ چیخ عورتوں کے احتجاج کی تھا یا کسی اور جذبے کی اور آخری میں بچو کے زبان سے یہ جملہ نکلتا ہے۔...نہ مجھ ماں کو چھوڑا نہ ان بہنوں۔'' اس نے آنکھیں اٹھائیں جو نگاہوں سے خالی تھیں۔

مگر حیرت کی بات ہے کہ اگر بچو کا کردار احتجاج کرتا ہے افسوس کرتا ہے تو کس بات کا کیوں ناول کے آخر تک استحصال کرنے والے حضرت جی موجود ہوتے ہیں اور راجہ جیسا نوجوان بھائی بھی رہتا ہے۔

غرض اس ناول کے تمام کردار مٹی کے مادھو کی طرح ہیں وہ ایک طرح کے ٹائپ کردار ہیں جنھیں عجلت میں قاضی عبدالستار نے پیش کیا ہے اگر ان کرداروں کو مضبوط بنا کر پیش کرتے تو ممکن ہے کہ اس ناول کی اہمیت کچھ اور ہی ہوتی ہے۔

اگر چہ یہ ایک ناول ہے مگر آج پورا ہندوستانی سماج پوری دنیا میں عورتوں کے تعلق سے انھیں نظریات کی کم و بیش عکاسی ہوتی ہے جہاں عورت کا احتجاج بھی ایک شواف بن گیا ہے اور اس میں بھی لوگ لذت محسوس کرتے ہیں۔ غرض اس ناول کو صرف جنسی نقطہ نظر سے نہ دیکھ کر بدلتے ہوئے سماجی اقدار، مٹتی ہوئی تہذیب اور اخلاقی قدروں کے زوال کی نظر سے دیکھنا چاہئے تا کہ اس ناول کا فکری پس منظر کو حاصل کیا جاسکے۔

تاجم سلطان

قاضی عبدالستار کا ناول ''تاجم سلطان'' ایک رومانی عشقیہ ناول ہے جو ان کے دیگر ناولوں سے ہر لحاظ سے مختلف ہے جس کے بارے میں انھوں نے کہا ہے کہ یہ ان کے خود کے عشق کی واردات پر مبنی ہے۔

راشد انور راشد کو دیئے گئے انٹرویو میں انھوں نے اس ناول کی مختصر روداد بیان کی ہے اور کہا ہے کہ پورا ناول ''تاجم سلطان'' پڑھیے۔ لاحقے اور سابقے جو ناول کے بنت میں استعمال ہوئے ہیں، انھیں نظرانداز کر دیجئے۔ باقی تمام کہانی ایک ایک حرف سچ ہے۔ یہ ناول 2005 میں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی سے شائع ہوا۔

یہ ناول کسی رومانی داستان کی طرح محسوس ہوتا ہے جہاں چاروں طرف عیش وعشرت کی فروانی ہے۔ دکھ درد اور مصیبت کا کوئی شائبہ تک نہیں ہے۔ ناول میں سب کچھ خوشی خوشی چل رہا ہے جس طرح داستانوں میں شہزادی پر کوئی جن یا دیو عاشق ہوتا ہے اور اسے اپنے ساتھ اڑا لے جاتا ہے اسی طرح تاجم سلطان اچانک بیمار ہو جاتی ہیں اور طربیہ داستان، المیہ کا روپ لے لیتی ہے۔ فرق یہ ہے کہ داستان میں کوئی ہیرو آتا ہے اور اسے قید سے آزاد کرتا ہے اور دکھوں کا مداوا کرتا ہے۔ ناول کو قاضی صاحب نے المیہ ہی بنے رہنے دیا ہے۔ جب کہ بیان کے مطابق تاجم سلطان، دو ریاست کے مالک ایک راجہ کی بیٹی ہے۔ باپ کی بڑے بڑے لوگوں یہاں تک کہ یوروپ تک کے لوگوں سے جان پہچان ہے۔ دسیوں گاڑیاں دروازے پر کھڑی رہتی ہیں۔ اسے کسی بڑے ڈاکٹر سے علاج کرا کے طربیہ ناول میں بدلا جا سکتا تھا مگر قاضی صاحب نے کمال ہوشیاری سے اسے اپنا حقیقی قصہ کہہ کر پلا جھاڑا ہے۔

''تاجم سلطان'' ناول کا ذکر قاضی عبدالستار نے ''عصمت آپا اور ان کے طفیل میں'' ''نیا دور'' دسمبر 2019 کے اپنے ایک مضمون میں اس طرح کیا ہے۔

> ''میں روشن محل میں تاجم سلطان کے ساتھ بلیرڈ کھیل رہا تھا کہ تاجم سلطان کی خادمہ نے میری طرف فون بڑھا دیا۔ سلام مچھلی شہری صاحب فرما رہے تھے علی منزل میں عصمت

آپا انتظار کر رہی ہیں فوراً پہنچئے۔''1؎

ناول تاجم سلطان کے بارے میں جس طرح قاضی عبدالستار نے مختلف جگہوں پر تاجم کا نام لے کر ذکر کیا ہے اس سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ تاجم نام کی کوئی خاتون قاضی صاحب کی زندگی میں شامل رہی ہوں گی۔

ناول تاجم سلطان کا ذکر قاضی عبدالستار اپنے ایک اور مضمون ''عصمت آپا کے طفیل'' میں ''نیا دور'' دسمبر 2017 میں اس طرح ذکر کرتے ہیں:

''جب سلما آپا اور کرشن چندر پاس پاس بیٹھے ہوئے تھے تو میں سوچتا تھا سلما جیسی حسین و جمیل عورت کو کرشن چندر میں کیا نظر آ گیا جو نچھاور ہو گئیں۔ کہیں سے آواز آتی وہی نظر آیا ہوگا جو تاجم سلطان کو تم میں نظر آیا تھا، قلم۔ قلم کی سلطانی ہوتی ہے باقی رہتی ہیں تمام سلطانیاں فنا ہو جاتی ہیں لیکن قلم کی سلطانی آج نہ سلما آپا ہیں نہ کرشن چندر لیکن ان کے وجود سے چہکتی مہکتی، چمکتی دمکتی محفلیں باقی ہیں۔ ساری عمر محفلیں ہی تو سجاتے رہے باقی سب کچھ تو کارزیاں تھا، رائگاں، گنج رائگاں۔2؎

قاضی صاحب سے اس ناول پر بات کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ تاجم سلطان ناول قاضی عبدالستار نے اپنی ذہنی تحریک پر لکھا اور اس وقت انھوں نے اس ناول کو اس قدر ڈوب کر اور عالمِ جذب کی کیفیت میں لکھا کہ وہ بیمار پڑ گئے۔ اور انھیں ایسا لگتا تھا تاجم سلطان وہی اطلس اور زربفت کے کپڑے، وہی جواہر کے زیور، وہی جڑاؤ سانپ بازو میں باندھا ہوا، وہی چھوٹا سا ہیرے کا تاج بالوں میں لگا کر آ گئی اور وہ اسے دیکھتے ہی لکھنے بیٹھ گئے۔

قاضی صاحب آگے لکھتے ہیں کہ ناول لکھتے وقت انھیں ڈر لگا کہیں ایسا نہ ہو ان کے خاندان کا کوئی فرد اس ناول پر سوال کرے پھر انھوں نے خود کو تسلی دی اور سوچا کہ ان کے خاندان کے سبھی لوگ مر چکے ہیں اور جو باقی تھے وہ پاکستان جا چکے ہیں۔ قاضی صاحب کا یہ پہلا اور آخری ناول تھا جسے انھوں نے لکھتے ہی فوراً چھپنے کے لئے دے دیا جب کہ دوسری تخلیقات کو پال میں ڈال کر رکھتے ہیں پھر چھپنے لائق ہونے پر شائع

1؎: تاجم سلطان۔ قاضی عبدالستار۔ ص:13

2؎: عصمت آپا اور ان کے طفیل میں۔ قاضی عبدالستار۔ مشمولہ۔ نیا دور، دسمبر 2017، ایڈیٹر سہیل وحید، ص20

کرنے کے لئے بھیجتے ہیں۔ ناول مکمل ہونے کے بعد اچانک انھیں خیال آیا کہ تاجم سلطان کی محبت اتنی سستی نہیں ہے جو دوبارہ پڑھا تک نہیں جب کہ محبت یہ تقاضا کرتی ہے کہ آپ اس کے ایک ایک صفحے کو پڑھیں اور اسے درست کریں۔ پھر انھوں نے کمپیوٹر اور اوریجنل دونوں کاپی منگوا کر ایک ایک صفحے کو درست کیا اور اس کے بعد شائع کرنے کے لئے ارسال کیا۔

پریم کمار نے ایک جگہ لکھا ہے کہ جب قاضی صاحب یہ ناول لکھ رہے تھے تب ان کے ذہن و دل پر صرف اور صرف محبت سوار تھی۔ محبت اس کا ہجر اس کا وصل اس کی اختر شماریاں، وہ محبت کا ذکر کرتے رہتے اور خوبصورت جملے تراشتے رہتے۔ نہایت جوش و جذبے سے روز دس بارہ صفحات لکھ رہے تھے اور سناتے رہتے تھے۔ محبت کی تعریف ان الفاظ میں کرتے رہتے تھے:

''محبت کے پاؤں ہاتھی کے پاؤں ہوتے ہیں ــــ محبت آکٹوپس ہے جس کے کانٹوں کا شمار نہیں ــــ محبت کا راستہ انگاروں سے بھرا ہوتا ہے وصل محبت کا قتل ہے جدائی محبت کا باغ ہے ــــ تنہائی جدائی کی دلہن ہے ــــ سب سے حسین وہ عورت ہے جسے فرشتہ دیکھ لے تو وضو ٹوٹ جائے ــــ محبت کی کوئی تعریف نہیں، ہر تعریف محبت سے چھوٹی ہے ــــ پھر بھی محبت مسلسل جدائی ہے ــــ حسن کی سب سے بڑی تعریف یہ ہے کہ نصیب نہ ہو ــــ تنہائی تکلیف کی ماں ہے ــــ محبوب کا ستم محبت کا جھومر ہے ــــ محبوب کے پیار سے خوبصورت خدا نے کوئی پھول پیدا نہیں کیا ــــ محبوب مہربان ہے تو جنت ہے ــــ نامہربان ہے تو جہنم ہے ــــ محبوب کی ایک مسکراہٹ اتنی قیمتی ہوتی ہے کہ ہمارے اختیار میں ہوتا تو ہم سر کاٹ کر دے دیتے۔

ہم نے آسمان کو اس کی جوتیوں میں ستارے ٹانکتے دیکھا ہے ــــ اندھیری رات میں تم نے چہرے سے آنچل ہٹا دیا تو بچے اپنا سبق پڑھنے لگے ــــ شراب کیوں پیتے ہو اس کو چلتے دیکھ لو ــــ محبت میں کفن سے بھی محبت کی خوشبو آتی ہے ــــ محبت کی ابتدا بھی جدائی، محبت کی انتہا بھی جدائی، محبت سر سے پاؤں تک جدائی ــــ حسن کی ایک جھلک حافظے پر سونے کی جو لکیر کھینچتی ہے وہ قبر تک جگمگاتی ہے ــــ ہم نے نشے کو اس کی آنکھوں سے بھیک مانگتے دیکھا ہے ــــ محبت خدا کا پہلا انعام محبت خدا کا

آخری انعام ـــــ''3

''تاجم سلطان'' ناول کو ادب میں کوئی مرتبہ کوئی حیثیت حاصل نہیں ہوئی۔ وارث علوی نے بھی اس ناول کو ''حضرت جان'' کی طرح واہیات ناول کی فہرست میں رکھا ہے۔ راشد انور راشد نے جب اس ناول پر یہ سوال کیا کہ آپ اپنے ناول ''تاجم سلطان'' اور ''حضرت جان'' کے متعلق کچھ فرمائیں جنھیں ہم عصر تنقید نے کچھ حد تک نظر انداز کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے اس کے جواب میں ''تاجم سلطان'' کی محبت کی کہانی بیان کی اور اس ناول کے حقیقی ہونے کے اور اس کے اپنی زندگی پر اثر انداز ہونے کی بات کہی۔ اقتباس حاضر ہے:

''تاجم سلطان ضرورت سے زیادہ بالغ عمر کی کہانی ہے۔ میری عمر 36 سال سے زیادہ ہو چکی تھی جب تاجم سلطان با قاعدہ مجھے میسر آئی۔ آٹھ سال تک ہم دونوں ملنے نہ ملنے کی کشمکش میں مبتلا رہے، لیکن جب وہ ملی تو محسوس ہوا جیسے ہم مدتوں سے اسی کے منتظر تھے۔ اس کی خود سپردگی اور بے محابا محبت، بے پناہ قربت سب خواب ناک تھا۔ میں جب ذرا تنہا ہوتا تو سوچا کرتا کہ ایسا تو کسی افسان میں بھی نہیں پڑھا۔ یہ سب کچھ کیسے ہو رہا ہے، کیوں ہو رہا ہے اور اسی کیفیت میں اس کی قربت سے شرابور رہتا۔ کبھی کبھی یہ محسوس ہوتا کہ جیسے یہ سوب خواب ہے۔ ابھی ہم کو ابوالحسن کی طرح بیدار کر دیا جائے گا اور ہم پھر علی گڑھ کی زندہ بدصورت زندگی میں مبتلا ہو جائیں گے۔ وہ تو بڑی خیریت ہوئی کہا س بیماری نے ایک حقیقت ہم پر واضح کر دی کہ اس کو اس کے نکاح کی بشارت مل چکی تھی۔ اس نے اپنے طعاشق کا استقبال نہیں کیا تھا، اپنے دولھا کا استقبال کیا تھا۔ اپنا آپ اپنے شوہر کو شوہر کو پیش کیا تھا۔ یہ عجیب بات ہے کہ ساری زندگی میں یہ تماشا ہوتا رہا کہ جب ایک خوشی نصیب ہوئی تو اس کے ساتھ غم بھی لگا رہا۔ جب یہ راز فاش ہوا اس کے فوراً بعد زہر کا اثر اس پر طاری ہونے لگا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں اپنی خوش نصیبی پر ناز کروں یا اپنی بدبختی کا ماتم کروں۔ وہ باون دن جو تاجم سلطان کی قربت میں بسر ہوئے، ساری عمر کے لئے ایک روگ بن گئے۔ ساری زندگی اس کی رنج و محن کے تاثر ست غم ناک ہوگئی۔ آج بھی میرے تخیئل پر اور خوابوں پر اس المناک کیفیت کا اثر ہے۔

3: ''مضمون۔ جھوٹ بولنے کے لیے ہے لکھنے کے لئے نہیں۔ نذر قاضی عبدالستار'' مرتب پروفیسر غیاث الدین، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ص 447

ایک مدت گذر گئی لیکن آج بھی کبھی کبھی راتوں کو اٹھ کر بیٹھ جاتا ہوں۔ نیند سے غنودہ آنکھوں میں اس کی پر چھائیوں کا جشن بر پا ہو جاتا ہے۔ سماعت اس کے تکلم کی دولت بے بہا سے امیر ہو جاتی ہے۔ کبھی کبھی تو یہ محسوس ہوتا ہے جیسے اس نے شانے پر سر رکھ دیا اور شانے پر کچھ نمی سی محسوس ہوتی ہے۔ میں اسے سونگھتا تو اس کی خوشبو سے پوری شخصیت معطر ہو جاتی۔ بالکل ایسا محسوس ہوتا جیسے ایک جگمگاتی پر چھائیں دروازے میں غروب ہو گئی۔ جیسے کوئی آہستہ آہستہ دستک دے رہا ہو، دھیرے دھیرے دروازہ کھل رہا ہو، جیسے چپکے چپکے رو رہا ہو، اور میں آنکھیں مل کر جب غور سے دیکھتا تو وہاں کچھ بھی نہ ہوتا، کچھ بھی نہیں۔''4

تاجم سلطان کو قاضی صاحب نے پہلے جان جاناں کے نام سے لکھا بعد میں اس کا نام بدل کر تاجم سلطان کر دیا۔ اس ناول کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے پریم کمار سے کہتے ہیں:

''جان جاناں کی بت آپ نے کہی تو ایک بات اور سن لیجئے۔ میں جھوٹ بولتا ہوں لیکن جانتا ہوں کہ جھوٹ بولنت کے لئے ہوتا ہے، لکھنے کے لئے نہیں ہوتا۔ جو جھوٹ لکھتے ہیں ان سے یہی کہوں گا کہ آپ کو مبارک ہو، ہم کو یہ ہنر نہیں آتا۔ اب آپ ''جان جاناں'' (تاجم سلطان) پڑھیں گے اور آپ یا سریلین کمار کے پی یا نریندر تیواری یا شہر یار مجھ سے پوچھیں گے قاضی صاحب اس میں کتنا سچ ہے تو میں اپنے لاکر سے چار انگل کا قرآن شریف نکالوں گا اس پر ہاتھ رکھوں گا اور کہوں گا اب پوچھئے۔ جب پوچھیں گے تو جواب دوں گا کہ مسملی اور مٹافر کو چھوڑ دیجئے، میرے اسٹائل کو چھوڑ دیجئے باقی ایک ایک لفظ سچ ہے اور اس ایک ایک لفظ کی سچائی کے پیچھے سچائی کا ایک دفتر ہے۔ جو ہم نے نہیں لکھا اس کی ناول کو ضرورت نہیں تھی۔''5

''تاجم سلطان'' اس ناول کا ''جان جاناں'' نام سے ذکر کیا ہے۔ جب انھوں نے یہ ناول لکھا تو کسی نے پوچھا مسلمانوں پر ایسی مصیبت پڑی ہے اور آپ ''جان جاناں'' سکھ رہے ہیں؟ میں نے جواب دیا'' میں جرنلسٹ نہیں ہوں کہ کل جو ہوا اسے آج لکھ ڈالوں اور پھر یہ مصیبت میرے پاس قلم ہے۔ ہائیڈروجن بم نہیں ہے کہ پھینک دوں۔ چالیس برس بعد میں اپنی محبت بیان کر رہا ہوں۔ اردو میں کوئی ناول نہیں ہے جس

4: اسرار و گفتار۔ راشد انور راشد۔ ص269-268

5: نذر قاضی عبدالستار۔ مرتب پروفیسر غیاث الدین۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی۔ ص469

میں کسی حکمراں ریاست کا رہن سہن بنایا گیا ہو۔ میں نے اس لیے بھی لکھا ہے کہ آپ کو تو کسی شہزادی نے ایک پیالی چائے بھی نہیں پلائی۔ہم کو تو جواہر پوش ہاتھوں نے سونے کی پلیٹوں میں کھانا نہیں کھلایا،ایک ایک نوالہ اس طرح کھلایا ہے جیسے متھرا کے چوبے کو شردھا سے لڈو کھلایا جاتا ہے۔

پریم کمار اس ناول کی تخلیق کے وقت قاضی عبدالستار کی حالت کا ذکر اس انداز میں کرتے ہیں:

''جان جاناں کے ذکر نے پچھلے کچھ مہینوں میں ہوئے کئی حادثوں اور واقعوں کی یاددلادی۔ ایسے واقعات جو اس ناول کو لکھنے کے دوران قاضی صاحب پر گزری بے قراری ، بے چینی ، چھٹپٹاہٹ ، گہرے لگاؤ اور گہری دیوانگی کا اظہار کرتے ہیں ۔ میڈیکل کالج میں دل کے مرض کا علاج کرنے کے دنوں میں ''جان جاناں'' ان پر اس قدر حاوی تھی کہ وہاں لکھی جارہی تھی اور اس کے کئی کئی حصوں کو مجھے بھی سنایا گیا جب موقع ملتا وہ لکھنے یا ترمیم کرنے بیٹھ جاتے ۔ان دنوں وہ اس ناول کو تقریباً دوبارہ لکھنے میں مشغول ہیں۔ بیڈ پر ایک ہی ایک مسند،اس کے اوپر رکھا لیٹر پیڈ اس میں لگے لکھے بغیر گندمی رنگ کے کاغذ سجا سنوار کر اردو میں لکھی گئی سطریں۔'' 6

ناول کی شروعات دہلی میں رشید میاں کے گھر سے ہوتی ہے جہاں قاضی عبدالستار یعنی ناول کا راوی موجود ہوتا ہے اور تاجم سلطان جو اکبر پور نصیر آباد ریاست کی کلوتی وارث اور رئیس بابا سرکار کی بیٹی ہے۔ان سے ملنے آتی ہے اور واحد متکلم سے اپنی حالت بیان کرتی ہے کس طرح اس نے عالم ہجر میں آٹھ سال بتائی ہیں راوی کو بھی اس کی بے چینی و بے قراری کا بھرپور احساس ہے۔دونوں اپنے دل کی کیفیت بیان کرتے ہیں اور ایک دوسرے کو علی گڑھ میں وائس چانسلر کے یہاں کی تقریب میں ہی دل دے بیٹھے ہیں۔اس تقریب میں تاجم کی حیثیت مہمان خصوصی کی وہ وہاں اپنے بابا سرکار کے ساتھ مدعو تھیں راوی اسے شہزادی سمجھتا ہے اور اس کے بارے جاننے سے گھبراتا ہے۔اسے لگتا ہے کہ تاجم کسی مسلمان تعلقہ دار کی دس پانچ اولادوں میں سے ہوں گی اور ان سے ملنے کی گزارش کرتا ہے بعد میں معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک حکمراں ریاست کی اکلوتی شہزادی ہیں۔

اور اس شہزادی نے قاضی صاحب کو مسلسل آٹھ برس تک درجنوں خطوط، کتابیں،تصویریں اور زبانی

6: نذر قاضی عبدالستار مرتب۔ پروفیسر غیاث الدین۔ص:446

پیغامات اور انتہا یہ کہ قیمتی تحائف بھی پیش کیے مگر کچھ بھی قبول نہ ہوسکا۔اب اس کی عمر چھبیس سال ہوچکی ہے اور واحد متکلم کے عشق میں اتنی گہری اتر چکی ہیں کہ پا پیادہ ہی ان سے ملنے کے لئے آجاتی ہیں۔ایک ایسی شہزادی جس نے محل سے باہر کبھی بے غیر گارڈز اور بے غیر بندوق سے باہر نہ نکلی ہوں وہ آج جامع مسجد تک پہلی بار کسی گلی میں بغیر کسی عورت کے ہمراہ ہی آ کھڑی ہوتی ہیں۔

واحد متکلم جو علی گڑھ میں لیکچرر ہے اور شادی شدہ ہے وہ بھی ڈنر کی تقریب میں اس کو دل دے بیٹھتا ہے اور تاجم کے آنے پر دل وجان سے اس کے حسن کی تعریف کرتا ہے اور حسرت دیدار کی بے چینی و بے قراری بھی ظاہر کرتا ہے۔ ہر چند اسے معلوم ہے کہ محبت اظہار سے رسوا ہو جاتی ہے مگر وہ تاج کی محبت پا کر اپنی خوش نصیبی پر ناز کرتا ہے۔

اس کے بعد تاجم سلطان محل واپس لوٹ جاتی ہے اور اسے روشن محل میں آنے کی دعوت دیتی ہے۔روشن محل میں راوی کی زبردست خاطر مدارات ہوتی ہے اور تاجم اپنے محبوب کے استقبال میں ایسی پر جوش رہتی ہیں اور انھیں دنیا کا تمام عیش وآرام دینے کی کوشش کرتی ہیں تاجم سلطان کے واحد بھی بھی بیٹی کی چاہت اور راوی سے اس کی محبت سے بخوبی واقف ہیں اور اپنی لاڈلی بیٹی کے عشق میں گرفتار ہیں جس کی وجہ سے وہ بھی راوی کو بھر پور عزت اور پیار کرتے ہیں۔اس طرح تاجم اور راوی ایک دوسرے کے ساتھ پورا وقت گزارتے ہیں، بلیرڈ کھیلتے ہیں اور رنگ برنگ کھانے ، پوشاک، پوشاک اور رنگ رقص وموسیقی کی محفلیں سجاتے ہیں۔دونوں کے بیچ پیار بھری نوک جھونک چلتی رہتی ہے۔تمام واقعات وحادثات کو قاضی عبدالستار نے نہایت باریکی سے بیان کرتے ہوئے اس بے پناہ عشق کو شادی کے مقام تک پہنچایا ہے تا کہ محبت کا جائز حق حاصل ہو سکے اور بابا جی مہاراج اوران کے دوست پتھوراراج کے والی پاپا جی مہاراج نے راوی سے درخواست کی کہ وہ تاجم سے شادی کرلیں۔واحد متکلم بھی ان پر دل وجان سے قربان ہے اور اس کی قربت کے بغیر ایک لمحہ بھی زندہ رہنا اب اس کے لیے ناگزیر بن چکا ہے اس لیے وہ تاجم سے شادی کرنے کے لئے رضامند ہوجاتا ہے اور ایک چھوٹی سی تقریب میں شادی کی رسم ادا کی جاتی ہے۔جب یہ خبر واحد متکلم کے سسرال ان کے خسر اور خوش دامن کو ملتی ہے تو بدکلامی ہونے لگتی ہے اور نہایت برا بھلا انھیں کہا جاتا ہے اور دھمکیاں ملتی ہیں مگر کچھ دنو ں کے بعد ہی خود خوش دامن بچوں کے ساتھ محل میں رہنے آجاتی ہیں

اور بابا سرکار نے انھیں یہ اجازت اس لیے دی تا کہ پتہ چل سکے کہ کیا وہ کسی برے ارادے سے محل میں آئی ہیں مگر جلد ہی تاجم پان کھان کی وجہ سے بیمار پڑ جاتی ہے اور اس کی موت ہو جاتی ہے۔ تاجم کی مدت کے ساتھ ہی ناول کا اختتام ہوتا ہے۔

کردار نگاری

ناول میں کردار واحد متکلم کے روپ میں خود قاضی عبدالستار موجود ہیں ۔قاضی صاحب نے متعدد بار اس بات کو تسلیم کیا ہے جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے۔ قاضی صاحب علی گڑھ کے لیکچرر تھے اور راوی بھی اس ناول میں لیکچرر ہے۔ واحد متکلم کا کردار اپنے فنی اور کائناتی نظریے کے ساتھ موجود ہے جس کے کلاسیکی الفاظ کا خزانہ ہے اور جو حسن وعشق ،انانیت ،غرور ،شراب ،رقص وموسیقی پر اپنا الگ نظر رکھتا ہے۔ قاضی صاحب حقیقی زندگی میں بھی شراب کو حرام نہیں مانتے تھے بلکہ شکر کو حرام مانتے تھے۔شکر کسی بھی چیز کا ہو سکتا ہے علم کا، دولت کا، حسن کا۔ ناول میں قاضی صاحب کے افکار ونظریات کا ذکر ہے اور تاجم سے دور جدید کے مسائل پر بھی گفتگو کرتے ہیں ۔قاضی صاحب الفاظ کے بے تاج بادشاہ تھے اور ناول میں قدم قدم پر تاجم کے حسن کو اپنے الفاظ کی قبا پہنا کر پیش کرتے ہیں ۔قاضی صاحب کا مزاحیہ انداز بھی ناول میں جابہ جا موجود ہے۔

قاضی صاحب کو اچانک سے اپنی محبت پر شک ہونے لگتا ہے۔انھیں لگتا ہے یہ صرف چند جذباتی الفاظ وخیالات کا طوفان ہے جسے کچھ دنوں کے بعد ٹھہر جانا ہے۔انھیں اچانک اپنے وجود سے انکار کی آواز آنے لگی ۔انھیں لگتا ہے کہ ان کی زبان ان کے الفاظ نے خوشامد کی اور وہ خوشامد کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے ہیں ۔اس نے خود کتنی تقریریں کی ہیں خوشامد کے خلاف آج اسے کیا ہوا کہ وہ خود خوشامدی بن گیا۔ غرض انھیں اپنے اندر کی آواز بے چین و بے قرار رکھتی ہے اور متعدد فکر وفلسفے سے آگاہ کرتی ہے۔ آئینہ اور محل کے در و دیوار اس کے اوپر ہنستے ہوئے محسوس ہوتے ہیں اور اسے اس کے خاتمے سے آگاہ کرتے ہیں۔

جب تاجم اس کے عشق میں گرفتار ہو جاتی ہے اور قاضی صاحب بھی اپنے تخیل کے خوبصورت جملوں سے اسے نوازتے رہتے ہیں۔ اچانک ان کا ضمیر ان کے سامنے آ جاتا ہے اور انھیں لگتا ہے کوئی اس کی حیثیت یاد دلانے کی کوشش کر رہا ہے۔قاضی صاحب خود سے ہم کلام ہوتے ہیں:

"کرسی سے پشت لگائے ہم آئینے میں اپنا عکس دیکھ رہے تھے دفعتاً ہمارا عکس ہم سے

سوال کرنے لگا۔

وقت کی بساط پر تمھاری کیا حیثیت ہے ہم شاطر کی یا فرزیں کی؟

یا محض ایک مہرے کا کھیل تم کھیل رہے ہو یا تقدیر کے اشارے پر چالیں چل رہے ہو۔اس کھیل کا انجام کیا ہوگا؟ تاجدانی کا محبت کا یہ نا قابل یقین طوفان جب تھمے گا جب اترے گا تو تم کہاں ہوگے؟ کیا ہوگئے؟ اس عمر میں جسمانی حسن کے قصیدے سچے ہیں یا جھوٹے؟ ایک عمر ہوتی ہے جب تھوڑے سے جگمگاتے دنوں کو ہماری خوش خیالی، خوش اندیشی اور خود پرستی جمال کا کھلیان بنا دیتی ہے وہ عمر تو بہت پیچھے چھوڑ آئے یہ گنگا الٹی کیوں بہنے لگی اور تم سیدھے کیوں کر تیر رہے ہو؟ کہیں ایسا تو نہیں تاجن سرکار کی عمر بھر کی محرومیوں نے تمھاری اچانک قربت کو عشق کا نام دے دیا۔جیسے پندرہ سولہ برس کے لڑکے ذرا سے نسوانی تلطف کو عشق کا نام دے کر جانیں قربان کردینے کو تیار ہو جاتے ہیں اور جب عمر کا سیلاب اتر تا ہے تو اپنے اعمال پر نادم اپنے سنہرے خواب کی مٹیالی تعبیروں پر شرمندہ بیٹھے ہاتھ ملتے رہتے ہیں اور وقت ان کی محبت کے انجام کو روندتا ہوا آگے بڑھ جاتا ہے کیا یہ ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے اور ہمیشہ ہوتا رہے گا۔ہاں فطرت کے آداب فطرت کے قوانین انسان بدل نہیں سکتا۔فطرت پیچھے موڑ کر نہیں دیکھتی۔کیا انسانیت کی یہی تقدیر ہے۔‘‘7

تاجم سلطان ناول کا دوسرا اہم کردار ہے جس کے اوپر ناول لکھا گیا ہے وہ ایک ہی سالہ دوشیزہ ہے دو حکمراں ریاستوں کی اکلوتی وارث جس کی جائیداد کا کوئی حساب کتاب نہیں۔زمن آرا تاج سلطان باپ کی اکلوتی بیٹی علی گڑھ میں راوی سے ملاقات ہوتی ہے اور تبھی سے ان کے عشق و محبت کے سحر میں گرفتار ہو جاتی ہے۔راوی کے ادبی کارناموں سے واقف ہے اور اپنے والد کو بھی ان کا لکھا ناول پڑھواتی ہے۔محبت بھرے اور درد مند دل والی ہے جس کی دولت سے ہزاروں لوگوں کا پیٹ بھرتا ہے۔محل میں سیکڑوں عورتیں کام کرتی ہیں۔لاکھوں یتیموں کی کفالت شعاری کا ذمہ ان کے پاس ہے اور ساتھ ہی بہت سے بچوں کو امریکہ لندن یوروپ میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھی بھیجا ہے۔بھوکوں اور ننگوں کو کھانا کھلانے اور کپڑے پہنانے والی مفلسوں اور ناداروں کو بخش دینے والی ہے۔ساتھ ہی وہ زکوٰۃ و خیرات کا بھی کوئی حساب کتاب نہیں رکھتی ہے

7: تاجم سلطان۔قاضی عبدالستار۔ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،نئی دہلی،ص:194

بے حد و بے حساب دیتی ہے۔

اس کے ساتھ ہی تاجم نماز روزے کی پابند ہے اور ایک خاص وظیفے سے وہ میاں صاحب کے ذریعہ مستقبل کے بارے میں معلوم کرلیتی ہے اور جب انھوں نے راوی کے لیے وظیفہ پڑھا تو اسے خواب میں بشارت دی گئی کہ وہ اس کا محبوب ہی نہیں اس کا دولہا بھی ہے۔ قاضی صاحب نے اس کردار کو عام انسان سے الگ کر کے ایک ماورائی دنیا کے محبوب کے طور پر پیش کیا ہے۔

تاجم سلطان سے شادی ہونے کے بعد راوی کی خوش دامن محل میں آتی ہیں اور اسے زہریلا پان کھلاتی ہیں جس سے تاجم بیمار ہوجاتی ہے اور کچھ دنوں کے بعد اس کی موت ہوجاتی ہے اور وہ مرنے سے پہلے اپنی وراثت کا مالک راوی کو بنانے کی درخواست کرتی ہے اور اس کے والد بولتے ہیں یہ تو تمھارے شوہر ہیں اگر تم نے کسی نوکر کو بھی کہا ہوتا تو منظور ہوتا ہے۔

تاجم سلطان ایک بڑے خاندان اور جاگیردار کی بیٹی تھی۔ بے پناہ دولت کی واحد وارث تھی اور قاضی کی محبت اور ان کے عشق میں گرفتار اور ان کے قلم کی شیدائی۔ قاضی کو اس نے اپنا محبوب بنایا اور اپنے حسن وعشق کی بارش سے انھیں شرابور کیا اور پھر اس رشتے کو خوابی بصارت کی وجہ سے جائز رشتے میں بھی بدل دیا مگر اس کی زندگی بہت کم تھی اور محبوب کا ساتھ چند دن کا ہی تھا اور بہت جلدی ایک خوبصورت خواب آوری زندگی گزارنے سے پہلے اس دارفانی سے کوچ کر گئی۔

اس طرح کے کردار کی المیہ نگاری اور ان کے میلوڈرامیت پر وارث علوی لکھتے ہیں:

> ''ان کے ناولٹوں کے مرکزی کرداروں کے قد نسبتاً اونچے ہیں ان کی ذات کے دائر ہونے والا عمل شدید تیز رو اور سنسنی خیز ہے گویا یہ ناول عمل کی مہمات کے سنسنی خیز واقعات کے ناول ہیں۔ ایسے ناولوں کو مردانہ یا میسکوائن ناول کہہ سکتے ہیں۔ ناول جب تک کرداروں کے اندرون کا اس کے جذباتی ہیجانوں، اس کی نفسیاتی اور اخلاقی کشمکش کا ناول نہیں بنتا کرداروں میں گہرائی اور گیرائی، پیچیدگی اور پہلوداری پیدا نہیں ہوتی۔ اس لیے کردار کسی فکر انگیز مطالعے کا موضوع نہیں بن پاتے۔''[8]

ناول کا اختتام تاجم کی موت سے ہوتا ہے اور ایک دردناک جملے۔ بھیا سرکار اگر آپ اتنے اچھے نہ

8: گنجفہ باز خیال۔ وارث علوی۔ ماڈرن پبلی کیشنز، نئی دہلی، ص:13

ہوتے تو کتنا اچھا ہوتا نا۔اس دردناک جملے کے ساتھ ہو جاتی ہے۔قاضی صاحب اس جملے کے بارے میں لکھتے ہیں کہ کئی راتیں روتے ہوئے گزار کر میں نے یہ جملہ لکھا ہے۔الفاظ میں جو درد و کسک ہوتا ہے وہ تخلیق کار ہی سمجھ سکتا ہے۔کچھ جملے زخم جگر چیر کر نکلتے ہیں اور جس کو لکھنے کے لیے خون جگر کرنا پڑتا ہے۔یہ بات وہی سمجھ سکتا ہے جس نے دل کی گہرائی سے عشق کیا ہو اور اپنے محبوب کو مرتا ہوا دیکھے اور اس کی زبان سے ایسے الفاظ گزرے وہ منظر اس کے لیے قیامت سے بڑھ کر ہوگا۔

چند دوسرے کرداروں میں زمرد سنبل اور دوسری دوشیزائیں ہیں جن کی حیثیت ناول میں کنیز کی طرح ہے اور سب ڈرامے کے کردار کی طرح آتی اور جاتی ہیں جن کا کام تاجم سلطان اور راوی کو پورے عیش و آرام اور چین وسکون پہنچانے کا جن کے ذمہ کھانا کھلانا اور کپڑے،زیورات تیار کرنا ہے۔پاپا جی مہاراج بابا سرکار جو اس ناول میں تاجم کے والد ہیں وہ بھی کردار کی شکل میں بہت تھوڑے وقفے کے لیے آتے ہیں۔ یہ سب ضمنی کردار ہیں۔

ناول میں صرف دو ہی کردار اہمیت کے حامل ہیں جن پر پورا ناول لکھا گیا ہے۔

تخلیق کے نسائی رنگ کے مضمون نگار حقانی القاسمی نے لکھا ہے:

''خودنوشت سوانح پڑھتے ہوئے جارج برنارڈ شاہ کے اس قول کے قریب نہیں پھٹکتا کہ خودنوشت سوانح جھوٹ کا پلندہ ہوتا ہے اور نہ ہی دوستوفلّی کے اس دستک پر دھیان دیتا ہوں کہ ''صداقت اور حقائق پر مبنی خودنوشت کی تخلیق ناممکن ہے۔''
مجھے پتہ ہے کہ ہر کوئی روسو نہیں بن سکتا۔سینٹ اگسٹائن کی طرح Contessions نہیں لکھ سکتا اور پھر آدمی سچ بولے بھی تو کیوں؟ سچ تو صلیب تک لے جاتا ہے اور پھر مشرق کا محجوب منافق معاشرہ اس کی اجازت نہیں دیتا کہ آدمی وہ سچ لکھے جس کی سزا بدنامی ،ذلت اور رسوائی ہوتی ہے۔اب یہاں ہر کوئی میڈونا برگتی جردوت کی طرح Nacked Truth تو نہیں لکھ سکتا۔مشرق میں رہ کر کوئی میرن کی طرح اپنی خود نوشت Faithfull میں یہ تو نہیں لکھ سکتا کہ Greatf---Ihavecvcitrhaol Itwasthe Last یہ لکھنے کے لیے صرف جرأت رندانہ نہیں بلکہ تھوڑی سی مغربی بے حیائی کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔ایک فروغ فرخ زاد اور کشور ناہید کا سچ ہی ہمارا معاشرہ

سہن ہی نہیں کرسکتا تو پھر کسی اور سچ کو کیسے برداشت کرے۔'' 9

یہی بات تاجم سلطان ناول کی حقیقت کے بارے میں پوچھا گیا تو قاضی صاحب نے جواب دیا میں حسین نہیں ہوں جو سچائی کے لیے جان دے دوں۔ ویسے یہاں کربلا بھی نہیں ہے یزید تو بہت ہیں پر کربلا کوئی نہیں ہے اور میں حسین بھی نہیں ہوں مجھ کو میری مرضی کا کھانا ملنا چاہیے اور جو کچھ میں کھاتا پیتا ہوں وہ سب ملنا چاہیے تب میں سچ لکھتا ہوں۔ لکھ سکتا ہوں۔

تاجم سلطان ناول میں جس طرح سے ساز وسامان، آرائش وزیبائش کی اشیاء کا ذکر ہے وہ حیرت انگیز ہے۔ ایک تخلیق کار باریک خوبصورت ساز وسامان کا ذکر اتنی باریکی سے اور اتنے خوبصورت انداز میں کیسے کرسکتا ہے؟ اس ناول میں جو ساز وسامان کا ذکر ملتا ہے وہ بے شک کسی رجواڑے، کسی حکمراں کی ریاست اور راجے کے محل کا ممکن ہوسکتا ہے اور اسے وہی شخص اتنی باریکی سے بیان کرسکتا ہے جس نے بہت قریب سے اس کا بخوبی مشاہدہ کیا ہو صرف مطالعے اور کتابوں کے سہارے ان کا ذکر ناممکن ہے۔ قاضی صاحب نے جتنے جملے الفاظ جزئیات سے محل کے ایک ایک شے کا ذکر کیا ہے اگر اسے کسی جگہ ترتیب دیا جائے تو ایک سو صفحات کی لغت تیار کی جاسکتی ہے جو ایک تہذیب وثقافت اور ایک خاص عہد میں استعمال ہونے والے حسین، عجیب وغریب معرکہ کا ایک منقش خانہ ہوگی۔ چند الفاظ یہاں پیش کیے جاتے ہیں:

بیت کا صوفہ، جواہر پوش ہاتھ، خاصدان، گلوری، گوہر آبدار، صحیفہ کاکل، کتاب نقوش زرنگار، خزینہ حسن روزگار، کرمچ کا جوتا، سبز بانات، ہاتھی دانت کے کیور، تپایاں، دیوارگریاں تک کا مدار، آبنوسی اسکرین، مخلول نقاشی، بہشت پہل یزیں، طلاکار مسند، گاؤ تکیے، گول تکیے اور گل تکیے۔ چھت پر فانوس اور چنڈیلیئر کا پورا باغ لہراتا ہوا، دبیز قالین، بالوں کا تموج، مورچھل، پکھراج، یاقوتی خشت میں طلائی چراغ، چاندنی کی کشتی، گنگا جمنی سیٹ گلا زربفت، چیپاں، آفتابہ، سیلابچی، کارچوب کا فرشی پائجامہ، گجروں کا تکیہ، مرصع مخروطی کلائیاں، پلنگڑی پھولوں کا ستر، پنجۂ مرجان خورشید، گوشہ فردوس بدوش، چھپرکھٹ، زربفت، کم خواب، پوش پہنے اگالدان، حقے، چلم چلم پوس، دست پناہ، چنز منہالیں، اگلدان، عوددان، طباق، فانوس، جھاڑ۔ وغیرہ یہ تمام ساز وسامان کے نام ہیں جن کا استعمال عام بول چال کی زبان میں ہوتا تھا۔

9: حوالہ کلچر بک لیٹ۔ تخلیق کے نسائی رنگ۔ حقانی القاسمی (Urdu.Culturalbooklet.com)

تاجم سلطان میں قاضی صاحب کے نظریے کی کارفرمائی صاف طور سے دکھائی دیتی ہے۔شراب کے متعلق ان کے نظریات جو ہر محفل اور گفتگو میں فرماتے ہیں وہی اس ناول میں تاجم سلطان سے بھی فرماتے ہیں۔

ادب کیا ہوتا ہے، ادب کیسے ہوتا ہے اور ادب کو کیسے پڑھایا جاسکتا ہے اس پر بھی قاضی صاحب نے سیر حاصل بحث کی ہے۔ناول میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

''تاجورانی لٹریچر پڑھ کر لٹریچر نہیں پڑھایا جاسکتا۔لٹریچر پڑھانے کے لیے ضروری ہے کہ پروفیسر کو لٹریچر کے علاوہ موسیقی ،مصوری، رقص، طب، رمل، نجوم، فلسفہ، مذہب ور تہذیب وغیرہ کے بارے میں کم از کم ابتدائی معلومات ہوں۔ جب ہم نے فلسفہ کہا تو ظاہر ہے تھوڑی سی معلومات جنس کے بارے میں بھی ضروری ہیں۔''10؎

موسیقی کے بارے میں کہتے ہیں:

''موسیقی آواز کا رقص ہے اور رقص بدن کی موسیقی۔''11؎

اس کے علاوہ ایک مدرس کی کیا ذمہ داری ہوتی ہے اس پر بھی وہ اپنا نظریہ پیش کرتے ہیں:

''تاجن سرکار کوئی فن ہو اس علم کا کمال حاصل کرنا ایک شے اور اور اس علم کو دوسروں کو سینے میں منتقل کر دینا ایک آرٹ ہے۔یونیورسٹی میں ہم کئی پروفیسروں کو جانتے ہیں جو اپنے موضوع پر حاوی ہیں لیکن ان کے طالب علم کچھ نہیں جانتے۔اس لیے کہ پڑھانے کے فن سے واقف نہیں۔''

''اگر بادشاہ سے اس کا تخت چھین لیا جائے۔اگر سپاہی کی تلوار ٹوٹ جائے، اگر ادیب کا قلم سوکھ جائے تو زندگی موت سے بدتر ہو جاتی ہے۔''12؎

قاضی عبدالستار کے زندگی جینے کے اپنے کچھ نظریات ہیں اور شراب کے حرام اور حلال کے ان کے اپنے طے شدہ فلسفے بھی ہیں جن کو نظر میں رکھ کر وہ شراب پیتے ہیں اور اپنی بات کے دلائل بھی پیش کرتے ہیں۔''تاجم سلطان'' میں بھی انھوں نے شراب کے فلسفے پر بات کی ہے۔شراب کے بارے میں ان کا خیال

10؎: تاجم سلطان۔قاضی عبدالستار۔ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ص:150

11؎: تاجم سلطان۔قاضی عبدالستار۔ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ص:150

12؎: تاجم سلطان۔قاضی عبدالستار۔ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ص:151

ہے کہ ابھی تک طے نہیں ہوا اسلام میں شراب حرام ہے بھی یا نہیں؟ ایک اسکول ہے جو کہتا ہے کہ شراب کو پروفٹ نے نہیں سکندر کیلف حضرت عمرؓ نے حرام کیا اور ایک بات کو اسکول کے لڑکے بھی جانتے ہیں کہ قرآن پاک میں ایک سطر بھی ایسی نہیں ہے جو یہ کہے کہ شراب حرام ہے، ہاں سکر کا لفظ آیا ہے اس کے معنیٰ ہیں نشہ تو نشہ دولت کا بھی ہوتا ہے، حکومت کا بھی ہوتا ہے، حسن کا بھی ہوتا ہے، طاقت کا بھی ہوتا ہے، اکثریت کا بھی ہوتا ہے۔

اسلوب کی رنگارنگی، دلکشی، تشبیہات، استعارات، رنگ برنگے الفاظ کے ہنرمندی اوزار کے ساتھ قاضی صاحب نے جملے تراشے ہیں۔ یہ عشق و حسن کی ایک رومانی داستاں ہے جو قدم قدم پر وصل کا نغمہ بکھیرتی ہے۔

''دروازہ اس طرح کھلا جیسے راز کھلتا ہے۔ وہ اس طرح اندر آئی جس طرح خواب میں معشوق آتا ہے۔ سامنے یوں کھڑی ہوئی جیسے تاج پوشی کی خبر دینے آئی ہوں۔''13؎

''ضرورت سے زیادہ بوڑھے چہرے پر کثیر اور مہین شکنیں جیسے مسالہ پینے والی سل ابھی تل کر آئی ہو۔''14؎

''انتظار کی طوالت نے اعتماد اور یقین کی جان لے لی۔''15؎

''دولت کی فراوانی عمر گھٹا دیتی ہے اور حسن بڑھا دیتی ہے۔''16؎

''رات تو ہو چکی ہے ہمارے لیے تم کو ہماری آنکھوں میں چراغ جلتے نظر آتے؟ تاجورانی کی آنکھ میں دو دو چراغ جل رہے ہیں اور تم کو رات کا انتظار ہے۔''17؎

؎ خوشامد ارادوں کو کھا جاتی ہے۔ خاندانوں کو ہضم کر لیتی ہے۔ قوموں پر ادبار لاتی ہے۔ سلطنتوں کو تباہ کر دیتی ہے۔ 18؎

''آپ ایک خواب، خواب مجسم جس کی گردن میں تعبیر کے جواہر جگمگا رہے ہیں۔ آپ ایک فردوس بدن جو کسی خوش نصیب کو عطا ہو چکی ہے۔''19؎

''ہم ایک آرزو میں مبتلا ہیں۔ آرزو ایک گلستاں طلسم خواہش محض ایک پھل ہم ہی نہیں گلستاں کی سیر میں کسی کو بھی یاد نہیں کرتے۔''20؎

13؎: تاجم سلطان۔ قاضی عبدالستار۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ص:215، 14؎: ایضاً۔ ص:21،

15؎: ایضاً۔ ص:21، 16؎: ایضاً۔ ص:20، 17؎: ایضاً۔ ص:215، 18؎: ایضاً۔ ص:99، 19؎: ایضاً۔ ص:99، 20؎: ایضاً۔ ص:64

''یہ صحیفہ کا کل درفسانہ یہ کتاب نقوش زرنگار یہ خزینہ حسن روزگار اس پر ہمارے وہ تمام
سجدے جو ہمارے ہونٹوں پر مچل رہے ہیں آپ کے محل کی رسائی تک قرض ہیں۔''21

موپاساں کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ جب وہ کسی غیر معمولی گرم اورشہوت انگیز عورت کا ذکر کرتا ہے تو اس کی تحریر کا کاغذ تک گرم گوشت کی طرح پھڑ کنے لگتا ہے۔

قاضی عبدالستار نے اپنی تخلیقی دنیا الگ انداز سے بنائی۔حقیقت نگاری کے خالص تصور کو رد کر کے انھوں نے زبان و بیان سے ایسی فضا پیدا کی جو انھیں ایک الگ تصوراتی دنیا میں لے جاتی ہے۔تاجم سلطان جب حسن کے بارے میں راوی سے دریافت کرتی ہے انھوں نے ایک عورت کے حسن کی تعریف الگ الگ عضو کے مطابق اس طرح کرتے ہیں:

''سب سے اچھی آنکھیں بھیا سرکار کون سی ہوتی ہیں؟''
جو زمین پر گڑی ہوں مگر قاتل ہوں۔
اور رخسار
جس طرح پروانہ دو شمعوں کے درمیان فیصلہ نہیں کر پاتا کہ کدھر جائے اسی طرح نگاہ دونوں میں سے کسی ایک کا انتخاب نہ کر سکے۔
اور ہونٹ
اگر مسکرا دیں تو پتھر ہنسنے لگیں۔
اور سینہ
اگر فرشتہ دیکھ لے تو ان کے پانے کی آرزو میں انسان ہونے کی حسرت کرنے لگے
اور کولہے؟
بازو جب تک زنجیر نہ کر لیں جلتے ہوئے درخت کے تنوں کی طرح دہکتے رہیں۔''22

دراصل تاجم سلطان ایک محبت کی کہانی ہے،ایک ایسی محبت جو چند گھنٹوں کے وصل کے بعد ہمیشہ کے لیے اس دارفانی کو لبیک کہہ دیتی ہے۔تاجم کی موت قاضی صاحب کی زندگی پر ایک عذاب کی طرح مسلط تھی جب انھوں نے اس ناول کو لکھا تو وہ کوئی ناول نہیں بلکہ اپنی محبت کی سچی داستان لکھ رہے تھے جس کا

21: تاجم سلطان۔قاضی عبدالستار۔ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،نئی دہلی،ص:15

22: تاجم سلطان۔قاضی عبدالستار۔ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی،ص:201

خاتمہ ایک عذاب تھا اور اس کو لکھتے وقت قاضی صاحب اس کے ایک جملے پر رات بھر روتے رہتے تھے۔

تاجم کی تعریف اس طرح کرتے ہیں:

''سنیے تاجن سرکار یہ کمر کے نیچے تک چھائے ہوئے تمھارے بال، ایک ایک بال پر شہر ہما اس طرح نثار ہوا کہ معدوم ہو گیا۔ یہ پیشانی کا تب تقدیر جیسے پڑھنے کی اجازت مانگتے مانگتے بوڑھا ہو گیا۔ یہ ابر، جن کی جنبش کے انتظار میں انقلاب عالم صدیوں سے اختر شماری میں مبتلا ہے۔ یہ آنکھیں اگر عمر خیام دیکھ لیتا تو ان کی ایک نیم گاہ پر اپنا سارا کلام قربان کر دیتا۔ یہ رخسار زر الماس سے تراشے ہوئے آئینے اگر زلیخا کو میسر آ جاتے تو وہ ایسی آرائش کرتی کہ اس کے حسن کی تقدیر بدل جاتی۔ چہرے کی آب وتاب کہ حسن وجمال کے تمام صحیفے ایک ہی نگاہ میں جل کر راکھ ہو جائیں۔ طاؤسی گردن کا یہ حسن کی قصر سلیمانی کی مقرب بادگایوں کی نظر پڑ جائے تو گلے کاٹ کر مر جائیں۔ یہ باہر نکلے سانچے میں ڈھلے سینے راجہ اندر کے اکھاڑوں کی پریاں بھی اگر ایک جھلک پا جائیں تو پانی پانی ہو جائیں تا جی سرکار تمھاری بازوؤں کی کاٹ مغل شہزادوں کے کمر میں جگمگاتی بے نیام تلواروں کو منہ چھپانے پر مجبور کر دے۔ تمھاری کمر کا یہ خم بادشاہوں کے پالتو شکاری چیتوں کی کمر پوش ڈھیلے کر دے۔ سلطان جمال جن ہاتھوں میں زمام حکومت سونپ دینے کو مدتوں سے بے قرار ہے انہی آنچل میں چھپائے کیوں بیٹھی ہوں۔ افسانوی دنیاؤں کی گھوڑیوں کی طرح کولہے، سونے کے وہ قرابے ہیں جن میں صدیوں پرانی انگور کی سرخ شراب بھری ہو۔ تمھاری رانیں جیسے دیولوک کے سنہرے ہاتھیوں کی سونڈیں کاٹ کر جڑ دی گئی ہوں۔ پنڈلیوں کی یہ تراش کہ ایرانی شہنشاہوں کے پشتینی زرگروں کو خواب میں نظر آ جائیں۔ تو کاروں کے نام پوچھتے پھریں چوڑی دار سے باہر نکلے ہوئے طلسمی دنیاؤں کے یہ آسمانی پرندے نگاہوں کو سجدوں کے چر چگ کتنے تندرست اور کتنے خوبصورت ہیں تمام بدن جیسے ارجن کی کھینچی ہوئی کمان یہ کاٹ یہ تراش اگر انسان ہوتا تو اپنے آپ پر ناز کرتے کرتے خدائی کا دعویٰ کرنے لگتا۔''[23]

غرض ناول کے تمام صفحات زبان وبیان کے ایسے مرصع جملوں سے سجے ہوئے ہیں حسن کی ایسی

23: تاجم سلطان۔ قاضی عبدالستار۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ص: 161

تعریف جو جمالیاتی خوبیوں سے ممیّز کرتی ہےاورایک الگ دنیا کی سیر کراتی ہےاورزبان کے جادو سے قاضی عبدالستار نےحسن کا زبردست اورایسا دلکش نظارہ پیش کیا ہےجس کی تعریف کرنے سے قاری کی زبان قاصر ہے۔

مکالمہ نگاری

مکالمہ نگاری کےفن سے قاضی عبدالستار بخوبی واقف ہیں مگراس ناول میں لمبے لمبے مکالمے بیان کئے گئے ہیں جن کو پڑھ کر ایسا لگتا ہے یہ کسی سے مکالمہ نہیں ہورہا ہے بلکہ تحریر ہے جو یک طرفہ لکھی گئی ہے۔جہاں قاضی صاحب نےحسن وعشق کا بیان کیا ہے وہاں تحریر وتقریر کئی صفحات تک پھیلی ہوئی نظرآتی ہ۔جو ایک مضمون کے لحاظ سے ممکن ہے موضوع کے مطابق قاضی صاحب نے اپنے فکر ونظریے کو پیش کیا ہے۔

مگر مکالمے میں کہیں کہیں خوبصورتی چابک دستی اور برجستگی بھی دکھائی دیتی ہے جوحسن وبیان کے ساتھ موجود مزاحیہ مکالمہ جاری وساری ہے جوتاجم اورراوی کے درمیان ہوتا ہے۔اقتباس ملاحظہ ہوں:

''آپ ہم کو کب سے جانتے ہیں؟''

جب سے بالغ ہوئے۔

آپ نے ہم کو پہلی بار کب دیکھا

جب سےخواب کی عادت میں مبتلا ہوئے اور یہ بھی سچ ہے کہ ہم نے تم کو آج بھی نہیں دیکھا۔

آپ کی عمر کیا ہے۔

بالکل فضول سوال ہےعمر بدن کی ہوتی ہےاورذہن کی بھی

''بدن کی عمر کیا ہے؟''

وہی جس پر پیغمبری نازل ہوتی ہے۔

آپ پر کیا نازل ہوئی

''ایک طرح دار شہزادی''

''ذہن کی عمر؟''

بلوغت کو بھی نہیں پہنچی۔

اتنی انکساری؟ اس قدر خاکساری۔[24]

نقطۂ نظر

اگر چہ یہ ناول ایک رومانی انداز سے لکھی گئی حسن و عشق کی داستان ہے جو تخلیق کار کے تخلیقی وفور سے پھوڑ کر باہر آئی ہے جس کی وجہ سے تخلیق کار کا ایک طرح سے کھتارسس ہوا جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے اگر اس ناول میں متعدد مقام پر ایسے جملے یا ایسے فکر و فلسفے پیش کیے گئے ہیں جو ہماری دنیا سے بھی تعلق رکھتے ہیں ۔ایک دو مقام پر ایسا لگتا ہے کہ قاضی صاحب نے آج کے ٹیکنالوجی کے دور کی کہانی پیش کی ہے جو ٹک ٹاک سنیک ویڈیوز جیسے اپلی کیشن کے ذریعہ مہذب گھرانوں کی لڑکیاں اپنے حسن کا نظارہ کراتی ہیں جو اپنے جسم کی نمائش حسن اور بدن کی تعریف اور توصیف سننے کے لیے فحش نغمے اور فحش ویڈیوز بنا کر عام انسانوں اور بچوں کے سامنے پیش کرتی ہیں جس سے سماج کا ذہنی اور جنسی تناسب تیزی سے متاثر ہو رہا ہے۔ یہاں اس اقتباس سے آپ آسانی سے آج کے دور سے محاسبہ کر سکتے ہیں۔ جہاں ایک فلم دیکھی جا رہی اور اس کی بازار میں بہت ڈیمانڈ ہے۔

''سرکار اس فلم کی بڑی ڈیمانڈ ہے.....سیکڑوں لڑکیوں نے اسی سے سیکھا اور برباد ہوئیں

اس کا نام ہی کیبرے ہے؟

صنوبر یہ تو بہت معمولی ہیں۔ سب طوائفیں معلوم ہوتی ہیں کیا مل جاتا ہوگا ایک فلم میں ایک لڑکی کو؟''

کم سے کم پندرہ دن میں فلم تیار ہو جاتی ہے۔ روز مرغ شراب تعریفیں اور عیش کبھی کبھی کسی کسی کو پچاس ہزار بھی مل جاتے ہیں۔

ان کی شادیاں؟

بہتوں کی ہو چکی ہیں۔ اگر نہیں ہوئی ہونی ہے تو ہو جانی ہے کہ چار چار پیغام آتے ہیں کل جو لڑکی آئی تھی اس کی تین فلمیں بن چکی ہیں۔ پندرہ بیس تولے کا زیور بنوا چکی ہے۔ دو لاکھ روپے بینک میں جمع ہیں۔ تین پیغام آچکے ہیں مگر ابھی کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے۔ ایک نئی کمپنی آئی ہے۔ دلالوں کے ذریعہ بات کر کے گھروں میں اتر پڑتی ہے

---

[24]: تاجم سلطان۔ قاضی عبدالستار۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ص:165

کھانے پینے کا پورا خرچ اٹھاتی ہے۔ میک اپ کرتی ہے تصویریں لیتی ہے۔ رقص دیکھتی ہے پسند آ گیا تو ہزاروں دے ڈالتی ہے فلم اگل بنی ہے پندرہ بیس دن بعد جب آتی ہے تو کپڑوں اور چھوٹے موٹے زیوروں سے لدی ہوتی ہے دلالوں کی باتوں میں آ کر بڑے بڑے گھرانے برباد ہو گئے۔

''گھر کے مرد دیکھا کرتے ہیں؟''

اگر وہ شراب نہیں پیتے تو ڈرگ عورتوں کی طرح ان کا بھی شکار کر لیتی ہے۔ دس بیس راتوں میں وہ اتنی بے حیا ہو جاتی ہیں کہ کمپنی کے چلے جانے کے بعد خود بن ٹھن کر شکار پر نکلتی اور بدنام ہو جاتی ہیں۔ یہ ان کا مقدر ہے پیسہ کمانے کا لالچ کل بھی تھا آج بھی ہے لیکن اپنے حسن کی جھوٹی تعریفیں سننے کا شوق اور مزے کی ہوس آج کل سے بہت زیادہ ہے۔''25؎

قاضی صاحب کے اس بیان سے موبائل کمرے کے ذریعے لوگوں پر جس تیزی سے نرگسیت حاوی ہوتی جا رہی ہے اور اپنے حسن کی تعریف سننے کی ہوڑ اور بہت جلد امیر بننے اور پیسہ کمانے کا شوق نوجوان نسل کو تیزی سے برباد کر رہی ہے آج کسی دلال کی ضرورت نہیں ہے اور نہ ہی پندرہ دن کا وقت لگتا ہے بلکہ پانچ دس منٹ کے اندر ایک ویڈیو بن جاتی ہے جہاں لوگ کامیابی پانے کے لیے حد سے گزرتے رہتے ہیں اور اپنا وقت ایک ایسی اندھیری جگہ نچھاور کر رہے جس کا بعد میں افسوس ہوتا ہے مگر اس وقت تمام دنیا سچائیوں سے منہ موڑ کر فریب اور حقیقت کے بیچ پھنسی ہے۔ قاضی صاحب کا یہ ناول اگر چہ نقادوں کے کسی کام نہیں آیا مگر اس کے ذریعہ ہم الفاظ کے خوبصورت سنگم اور ان بیان کردہ نظریات سے فیضیاب ہو سکتے ہیں۔

ناول کے آخر میں جس طرح سے تاجم سلطان کو بستر مرگ پر اپنے والد سے اپنی تمام ریاست کا مالک ناول کے ہیرو یعنی قاضی عبدالستار کو بنانے کی خواہش ظاہر کی گئی ہے۔ دل چاہتا ہے کہ یہ قاضی صاحب سے سوال جائے کہ وہ تمام جائیداد اور مال و دولت کہاں ہے جس کا خود مختار مالک تاجم سلطان نے آپ کو بنایا تھا مگر افسوس قاضی صاحب اس دنیا سے کوچ کر چکے ہیں۔

وارث علوی تاجم سلطان پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ چار معنی خیز اور اہم ناولٹ لکھنے کے بعد قاضی

25؎: تاجم سلطان۔ قاضی عبدالستار۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ص: 144

صاحب نے غالب، حضرت جان اور تاجم سلطان جیسی ہر لحاظ سے بے ہودہ ناولیں کیسے لکھیں۔''26؎

یہ امر غور طلب ہے کہ وارث علوی نے تاجم سلطان کو بے ہودہ ناولوں کی فہرست میں رکھا ہے اور ادب میں اس کی کسی بھی قدر و قیمت کے تعین سے انکار کیا ہے قاضی صاحب نے جس طرح سے تاجم سلطان کو ایک محبت کی کہانی بنا کر پیش کیا ہے پھر اس کے بعد تاجم کی موت کی دردناک کیفیت کا ذکر کیا ہے وارث علوی کے نزدیک ایک میلوڈراما ہے جس کے لیے انھوں نے سنسنی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور یہ سنسنی ان کی ناولٹوں کا ایک ناگزیر حصہ بتایا ہے۔

قاضی صاحب سے انٹرویو کے وقت راقم الحروف نے بھی یہی سوال کیا تھا کہ کیا یہ تاجم سلطان آپ کی خود کی کہانی ہے تب قاضی صاحب نے اپنے انداز دل فریبانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا تھا ہاں! میری ہی سمجھو۔

اس ناول پر کسی نقاد نے کوئی خاص نظر نہیں ڈالی اور یہ ناول اردو ادب میں توجہ حاصل نہیں کر سکا کیونکہ اس ناول میں مصنف نے ایسا کوئی قابل ذکر کارنامہ انجام نہیں دیا ہے جو اس سے قبل انھوں نے تاریخی ناول داراشکوہ، صلاح الدین ایوبی یا پھر خالد بن ولید لکھا تھا اس کے علاوہ شب گزیدہ مجو بھیا بادل اور غبار شب بھی ان کے نمائندہ ناولٹ ہیں جس کی وجہ قاضی عبدالستار کا نام ادب میں زندۂ جاوید ہے۔ اتنا کچھ لکھنے کے بعد تاجم سلطان جیسا ناول لکھنے کی انھیں چنداں ضرورت نہیں تھی مگر کبھی کبھی تخلیق کار اپنے اندر کے دباؤ کے آگے مجبور ہو جاتا ہے اور اسے صفحۂ قرطاس پر اتارے بغیر سکون حاصل نہیں کر پاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنے ذہن و دل کے سکون اپنے اندر کی کسک وجلن کو دور کرنے کے لیے ایک محبت بھری داستان لکھ ڈالی۔ کبھی کبھی فل بدیع لکھی تحریریں کسی تخلیق کار کو فن کی بلندیوں پر بھی پہنچا دیتی ہیں مگر ہمیشہ مقدر ایسا نہیں ہوتا کیوں تاجم سلطان سراپا محبت کی کہانی ہے اور یہ محبت اکثر راتوں کو قاضی عبدالستار کو بے چینی و بے قرار رکھا کرتی تھی۔ اس ناول کے بارے میں طارق چھتاری نے اچھی بات لکھی ہے محبت کی اس کہانی کو جگ بیتی کی نظر سے دیکھا ہے لکھتے ہیں:

''قاضی عبدالستار نے تخلیقی نثر کی جس خصوصیت کی طرف توجہ مبذول کرائی ہے، اس کے

26؎ گنجیفہ بازِ خیال۔ وارث علوی۔ ماڈرن پبلشنگ ہاوس نئی دہلی۔ سن اشاعت۔ 2007۔ ص 13

عملی نمونے بھی اپنی تحریروں میں پیش کیے ہیں۔ وہ جس علاقے، زمانے یا طبقے کا قصہ بیان کرتے ہیں، زبان بھی اسی کی مناسبت سے استعمال ہوتی ہے۔انھوں نے اپنے ناول ''شکست کی آواز'' سے تاجم سلطان تک اس کا اہتمام کیا ہے۔ بڑا فکشن نگار جب جگ بیتی سنا رہا ہوتا ہے تو زمانہ اس داستان کو اس کی آپ بیتی سمجھ کر سنتا ہے اور ہر قاری اس میں ذاتی زندگی کی جھلکیاں تلاش کر لیتا ہے اور جب وہ آپ بیتی سناتا ہے تو اس کی ذات کے اتنے پہلو اُجاگر ہونے لگتے ہیں کہ اس کی آپ بیتی جگ بیتی بن جاتی ہے ۔قاضی عبدالستار کا ناول ''تاجم سلطان'' دراصل مصنف کی آپ بیتی ہے مگر قاری اس روداد سے اس درجہ وابستہ ہو جاتا ہے کہ مصنف کی آپ بیتی قاری کی آپ بیتی بن جاتی ہے اس ناول میں محبت کی مختلف جہتوں اور اس پیچیدگیوں کی صداقت کو اس طرح منکشف کیا گیا ہے کہ یہ ناول جذبہ محبت کے وقار کی تمثیل بن جاتا ہے۔''27؎

☆☆☆

27؎ مضمون۔قاضی عبدالستار: ایک منفرد تخلیق کار مضمون نگار۔طارق چھتاری۔مشمولہ۔نذر قاضی عبدالستار۔مرتب غیاث الدین۔ص 104-103

آخری کہانی

قاضی عبدالستار کا ناولٹ ''آخری کہانی'' ان کی زندگی کا آخری ناولٹ ہے اس میں انھوں نے اپنی حیات وخدمات کو ایک تخلیقی رنگ دے کر ناولٹ بنا دیا اور اردو ادب میں اپنی تخلیق کے ذریعہ ایک الگ شناخت رکھنے والا زمینداری تاریخ کو رقم کرنے والا افسانہ نگار، ناول نگار 29 اکتوبر/ 2018 کو دار فانی سے کوچ کر گیا۔

''آخری کہانی'' پہلی بار قسط وار ''تحریر نو'' رسالے میں شائع ہوا ساتھ ہی ''آمد'' رسالے اپریل/ 2015 تا جون/ 2016 کے شمارے میں مکمل ناولٹ کے صورت میں شائع ہوا۔اس کے بعد کتابی شکل میں علیشا پبلی کیشنز کی جانب سے 2015 میں شائع ہو کر گوشہ گمانی کا شکار ہوا۔ یہ قاضی صاحب کا آخری ناولٹ ہے مگر اس سے اہل علم وادب کو کم ہی واقفیت ہے۔

''آخری کہانی'' ناولٹ میں قاضی عبدالستار کی زندگی اور ان کی زندگی میں رونما ہونے والے واقعات وحادثات کا ذکر ملتا ہے۔جن میں ان کے گھر، خاندان، اسکول، کالج کے زمانے کے سیر وشکار اور ان کی ملازمت کا بیان ملتا ہے۔ناولٹ میں قاضی صاحب کی زندگی کے مختلف واقعات پر روشنی پڑتی ہے۔ان کے پی۔ایچ ڈی کی کہانی، لکچر ہونا، پہلی کتاب کا منظر عام پر آنا اور اپنے نگراں کرنے کی کہانی رشید احمد صدیقی سے ان کا والہانہ لگاؤ، رشید احمد صدیقی کا قاضی صاحب کے تئیں محبتوں، ہمدردیوں اور شفقتوں کو بھی یاد کیا ہے۔

کہانی کی ابتدا قاضی عبدالستار کا پہلا افسانہ ''اندھا'' لکھنؤ کے جریدے ''جواب'' میں جس کے ایڈیٹر شارب لکھنوی تھے ان کے تعریفی نوٹ کے ساتھ شائع ہوا۔اس افسانے کی اشاعت نے قاضی صاحب گھر اور اسکول میں نمایاں کر دیا اور وہ مشہور ہو گئے اس جملے سے کہانی کی ابتدا ہوتی ہے۔

قاضی صاحب اس وقت سیتاپور کے راجہ اسکول میں آٹھویں درجے میں پڑھتے تھے۔ ناولٹ میں

تحصیل مسرکھ کے سب سے بڑے تعلقد ارٹھاکر رام پرتاپ سنگھ جن سے قاضی صاحب کے والد کی بہت گہری دوستی تھی اور یہی دوستی ان کے بیٹے بھانو پرتاپ سنگھ اور قاضی عبدالستار میں برقرار رہی ۔اس دوستی اور بھانو پرتاپ سنگھ کے ایثار وقربانی سے متاثر ہوکر قاضی صاحب نے اس ناولٹ کو راجہ دھیریندر پرتاپ سنگھ کے نام معنون کیا ہے۔

ناولٹ میں قاضی عبدالستار نے راجہ بھانو پرتاپ سنگھ کی بیوی شانتی دیوی سنگھ اوران کے درمیان ایک حقیقی اور سچے رشتے کی روداد پرمبنی ہے۔ناولٹ میں کوئی ایسا نقطہ یا حادثہ نہیں جس سے ناولٹ کو ادب کے فن پارے میں کوئی خاص اہمیت حاصل ہو سکے۔ ناولٹ میں ایک المیہ قصے کا بیان ملتا ہے جو قاضی صاحب کی زندگی کے دکھ درد مصائب وآرام میں اضافہ کرتا ہے۔اور کہانی قاضی صاحب کے بچپن کے دوست کی بیوی شانتی دیوسنگھ کے مرنے پر ختم ہوجاتی ہے۔ یہ اس زمانے کی کہانی ہے جب قاضی صاحب نے اپنی پی۔ایچ ڈی مکمل کر لی ورڈاکٹر بن گئے اس وقت کے ریکارڈ کے مطابق دو برس آٹھ مہینے میں پہلی بار کسی اسکالر کو ڈاکٹر کی ڈگری تفویض ہوئی تھی۔

قاضی صاحب کی زندگی کے چند واقعات وحادثات پر مبنی یہ ناولٹ قاضی صاحب کے باطنی پہلوؤں کی عکاسی کرتا ہے۔انا، پسند، بدمزاج اور غصے والے انسان کے پیچھے ایک ہمدرد وسچا اوراچھا انسان بھی چھپا ہوتا ہے اس زاویے سے قاضی عبدالستار کو جاننے کا بہترین موقع ملتا ہے۔ جو ایک نرم مزاج، حساس، پیار اور جذبات میں ڈوبا ہوا مدد کرنے والا انسان جس نے ہمیشہ دوسروں کی خوشیوں کے لیے کوشش کی اور زمانے کے سرد وگرم کو تنہا ہی جھیلا اور اس کو چاہنے والے اس سے محبت کرنے والے بہت جلد ہی اسے چھوڑ کر چلے گئے۔

ناولٹ کو پڑھتے ہوئے ایک ایسے سماج کی عکاسی ملتی ہے۔ جواب ہمارے آس پاس نہیں دکھائی دیتا ہے۔قاضی صاحب کی زندگی کا اکثر پہلو داستانوی اورافسانوی انداز لیے ہوئے ہے۔قاضی صاحب کا اٹھنا بیٹھنا، چلنا پھرنا، بولنا لکھنا پڑھنا نشست وبرخاست سبھی میں ایک خاص وصف کی جھلک ملتی ہے۔ جو ان کی اکثر کہانیوں میں نظر آتی ہے اور قاضی عبدالستار کے اندر ایک عہد ایک سماج چلتا پھرتا نظر آتا ہے جو ایک دستاویز کی صورت رکھتا ہے۔جن سے نکل پانا ان کے لیے خاصہ مشکل ہے اوران سے نکل کر بھی تاریخ کے

میدان کی خاک چھاننی اور ادب کو تاریخی ناول کی شکل میں لافانی شاہکار دے گئے۔غرض ناول بھی اسی طرح کا افسانہ ہے جوان کی زندگی میں رونما ہوا۔اورانھوں نے اپنے ماضی کی سلطنت سے ایک اینٹ اٹھا کر اس ناولٹ کا محل تیار کیا ہے۔

ناولٹ کو پڑھتے ہوئے لگتا ہے کہ یہ یقیناً سچے واقعات پر مبنی ہوگا۔ لاحقے سابقے اور تشبیہات و استعارات کے فن کے ساتھ قاضی عبدالستار نے ناولٹ کو صفحئہ قرطاس پر پیش کیا ہے۔کہانیاں ہمیں مختلف جہان کی پرواز کراتی ہیں کبھی گھر،کبھی آنگن،کبھی خاندان،کبھی ماضی اور تاریخ کے قصے ان کہانیوں میں کوئی روح ہوتی ہے جو تخلیق کار کے اندر پیوست ہوتی ہے اس کے اندر کھلبلی مچاتی ہے اسے بے چین رکھتی ہے جب تک وہ اسے الفاظ کا رنگ دے کر صفوں پر نہ سجائے تب تک اس ادیب کا تزکیہ نہیں ہوتا ہے۔اعلیٰ تخلیق مختلف سطحوں پر تعمیر ہوتی ہے پس اس کو ضرورت ہوتی ہے تخئیل کی بلند پروازی کی حسن و بیان کی جو اسے صحافت سے الگ کرتی ہے اور تخلیق کا درجہ دیتی ہے۔

قصہ: اس ناولٹ میں جو کہانی بیان کی گئی ہے جس میں تحصیل مسرکھ کے سب سے بڑے تعلقدار ٹھاکر رام پرتاپ سنگھ جن سے قاضی صاحب کے والد کی بہت گہری دوستی تھی اور یہی دوستی ان کے بیٹے بھانو پرتاپ سنگھ اور قاضی صاحب میں برقرار رہی راجہ بھانو پرتاپ سنگھ کی بیوی شانتی دیوسنگھ ہے۔جس کی ملاقات قاضی صاحب سے راجہ آنٹ کے کیمپ میں ہوتی ہے۔شانتی دیوسنگھ حسن وادا کی ملکہ ہے جو قاضی صاحب کو بھیا کہہ کر پکارتی ہے اور قاضی صاحب سے ملنے کے بعد اس کو محسوس ہوتا ہے کہ پچھلے جنم میں غالباً ہم دونوں ایک ہی ماں کی کوکھ سے پیدا ہوئے تھے۔ بھانو پرتاپ سنگھ کی موت میلہ میں درشن کے وقت ہو جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے شانتی دیوسنگھ پر دکھوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑتا ہے۔ایسی حالت قاضی صاحب ایک سگے بھائی کی طرح اس کا پورا خیال رکھتے ہیں۔قاضی صاحب شانتی دیوسنگھ کو رانی کہہ کر پکارتے ہیں۔

رانی ایک خوبصورت بچے کو جنم دیتی ہیں اور قاضی صاحب کی شادی شاہدہ بیگم نام کی خاتون سے ہو جاتی ہے اور وہ علی گڈھ میں لکچرر ہو جاتے ہیں۔اس بیچ قاضی صاحب کی ملاقات رانی صاحبہ سے ہوتی رہتی ہے۔ وقت گزرتا رہتا ہے ایک دن پتہ چلتا ہے کہ رانی کو مسلسل بخار رہتا ہے اور بلڈ کینسر ہے اور وہ لاسٹ اسٹیج پر ہیں۔ قاضی صاحب اس خوفناک حقیقت کو سن کر دہل جاتے ہیں کہ رانی صاحبہ صرف چند مہینوں کی

مہمان ہیں۔

غرض یہ ناول رانی صاحبہ کی موت پر ختم ہوتا ہے۔مگر اس کہانی میں جس طرح سے قاضی صاحب نے الفاظ کے گل بوٹے سجائے ہیں جس سے قاری الفاظ سحر میں گرفتار ہو کر پوری ناولٹ پڑھنے کے لئے مجبور ہو جاتا ہے۔ جب کہانی ختم ہو جاتی ہے تو قاری کے ذہن پر رانی کی موت کا شدید زخم لگتا ہے۔اس طرح سے رانی اور قاضی صاحب کے سچے اور پاکیزہ عشق وایثار کی کہانی ختم تو ہو جاتی ہے مگر اس کہانی کے پیچھے صدیوں کے بنے ہوئے ہزاروں رشتوں کی کہانی بھی سامنے آجاتی ہے جس سے اس عالم کا وجود قائم ہے۔اس کہانی میں ایک ایسے عشق کا ہم سامنا کرتے ہیں جس میں کسی طرح کی بوالہوسی شامل نہیں ہے۔ جہاں روایتی قدروں بندھنوں اور اگلے پچھلے جنم کی داستان بھی سنائی دیتی ہے۔ جہاں ایک دوسرے پر اعتماد اور بھروسہ ہے۔اس ناولٹ کا دوسرا پہلو جو سامنے آتا ہے وہ مشترکہ تہذیب کی روداد ہے جہاں ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کی عزت وعصمت کے محافظ ہیں۔جن کے بیچ نہ تو کوئی فرقہ وارانہ تعصب ہے اور نہ ہی نسلی برتاؤ۔

یہ ناول فرقہ وارانہ اتحاد، محبت، مفاہمت، مذہبی رواداری کی عمدہ مثال ہے۔ رانی کے تین قاضی عبدالستار کی محبت ہمیں ایک افسانوی دنیا کی سیر کراتی ہے۔مگر یہ ایک سچے واقعات سوانحی زندگی پر مبنی ہے۔ قاضی عبدالستار کا تعلق سیتاپور کے زمیندار گھرانے سے تھا اس لیے ان کے یہاں بڑے بڑے تعلقداروں، نوابوں، جاگیرداروں اور ٹھاکروں سے آپسی تعلقات تھے۔اور ان کی زندگی شب وروز کا مشاہدہ اور تجربہ بھی انھیں خوب رہا۔ناولٹ پڑھ کر یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ زمیندار تعلقدار صرف ظالم و جابر ہی نہیں ہوتے ،ان کے یہاں بھی انصاف پسندی، انسان دوستی، صلح رحمی پائی جاتی ہے۔ان کی زندگی بھی دکھ درد مصائب وآلام سے عبارت ہے کوئی ٹھاکر یا کوئی رانی جس کے بارے میں ہم سنتے یا دیکھتے یا پڑھتے ہیں انھیں بھی دکھ درد، غم تکلیف برداشت کرنا پڑتی ہے۔ رانی کی بیماری اور ایک بچے کی ماں بننے کے بعد اس کی موت ہونا ایک درد انگیز واقعہ ہے جو قاری کو بے چین رکھتا ہے اور ٹھاکر کے خاندان کے لوگوں کے ساتھ ہمدردی کا جذبہ بھی اپنے اندر پاتا ہے۔

کردار: ناولٹ میں قاضی عبدالستار کا ہی سے اہم کردار ہے جو ایک زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ ماں باپ کے اکلوتے لاڈلے اور ہر فکر غم اور پریشانی سے آزاد تھے۔ بچپن سے ہی باپ کی شفقت و

محبت سے محروم رہے کیونکہ ان کے والد کو سیر و شکار سے عشق تھا۔اس لیے ان کی ماں اور دادا نے باپ کی کمی محسوس نہیں ہونے دیتے تھے اور ان کی ہر خواہش کا احترام کیا جاتا تھا ہر شوق کو پورا کیا جاتا تھا۔قاضی صاحب کی ماں نے ان کی پرورش میں جہاں سب سے زیادہ دخل ہے وہیں جب وہ طالب علمی کے زمانے سے تو ان کے ماموں قاضی جمال الدین احمد نے ان کی دیکھ بھال اور ان کی تعلیم کا پورا خیال رکھا تھا۔اس طرح قاضی عبدالستار کا مکمل کردار ناول میں چلتا پھرتا دکھائی دیتا ہے۔ایک ایسا انسان جو بچپن سے ہی تخلیقی صلاحیت کا مالک تھا جس کے اندر حسن و محبت کا سنگم تھا جو کسی بھی حالت میں بے وفا نہیں بنا۔ایک شفقت اور محبت سے بھرا دل لیے ہوئے فرقہ وارانہ ہم آہنگی انسان دوست اور ہر رشتوں کا احترام کرنے والا انسان دکھائی دیتا ہے۔اور جنھیں راجہ صاحب آنٹ کے محل میں بنا روک ٹوک آنے کی اجازت کے باوجود بھی شرافت تہذیب روایت کا پاسدار جنھیں اپنی فکر اور فن سے لگاؤ ہے۔ناول قاضی صاحب نے اپنے کردار کو خوبصورتی سے تراشا ہے۔ناولٹ میں ہم قاضی صاحب کو ویسا ہی پاتے ہیں جو انھوں نے اکثر لوگوں سے گفتگو انٹرویو اور دیگر جگہوں پر اپنے بارے میں بتایا ہے۔

ناولٹ کا دوسرا کردار شانتی دیوسنگھ یعنی رانی صاحبہ کا ہے جو بھانو پرتاپ سنگھ کی بیوی ہے اور ایک بچے ی ماں مگر بہت جلد ہی اپنے شوہر کی موت کے بعد بیوہ ہو جاتی ہے۔رانی نہایت حسین و جمیل اور نو عمر عورت ہے بیوگی کا دکھ اس کے چہرے سے عیاں ہوتا ہے۔مگر وہ خوش دل انسان ہے۔قاضی صاحب کو اپنا سگا بھائی مانتی ہے اور ہمیشہ قاضی صاحب کے لیے ایثار و قربانی کے لیے تیار رہتی ہے۔رانی جہاں بے پناہ خوبصورت ہے وہیں تعلیم کے میدان میں بھی آگے ہے۔علم و ادب کا شوق ہے اور قاضی صاحب کے ناولوں کو پڑھتی ہے اور ان کی کہانیوں کو سننا ان کا محبوب مشغلہ ہے۔ناولٹ کو جہاں رانی کی موت پر اختتام دیا گیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ رانی قاضی صاحب کے لیے نہایت اہمیت رکھتی تھیں۔وہ جہاں اپنے ماں باپ کی دلاری اور لاڈلی ہے وہیں اس کے سسر بھی اس کو بیٹی سے بڑھ کر پیار کرتے ہیں۔مگر محبوب اتنی کم عمر ہونے کے باوجود بھی اسے کینسر جیسی مہلک بیماری لگ جاتی ہے وہ بھی آخری اسٹیج پر ہوتی ہے اور اسے اپنی بیماری کا اندازہ نہیں ہے۔رانی ایک زندہ دل انسان ہے۔زندگی کی نیرنگیوں رنگینیوں سے لطف اندوز ہونا اسے آتا ہے مسلسل بخار کی شکایت ہونے کے باوجود بھی وہ زندگی کو ہلکے پھلکے انداز میں گزارتی ہے اور اچھے عمدہ کھانوں کی شوقین

ہے۔کہتی ہے طبیعت ہے اور تھوڑی اور خراب ہو جائے گی تو کیا فرق پڑتا ہے۔رانی جہاں قاضی صاحب سے ایک سگے بھائی کی طرح محبت کرتی ہے وہیں ان قاضی صاحب کی بیوی کا بھی پورا خیال رہتا ہے اور قاضی صاحب کو ان کی بیوی سے ناراضگی ہونے کی صورت میں سمجھاتی ہے اس کی خفگی کا بھی خیال رکھتی ہے وہ چاہتی ہے کہ ان کے بھائی کی زندگی میں ایسی کوئی بات نہ ہو جس سے اس کا گھر تباہ ہو۔

ناولٹ کے چند دوسرے کرداروں میں رانی کی ماں اور ان کے بیٹے کا ذکر ملتا ہے۔راجہ صاحب آنٹ کا ذکر خصوصی طور پر اہمیت کا حامل ہے جن کی شاہانہ زندگی کو نہایت خوبصورت انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ راجہ صاحب ایک ٹھاکر تھے اور نہایت نرم مزاج اور محبت کرنے والی شخصیت اور سگے بیٹے کی طرح قاضی عبد الستار کو چاہتے ہیں ہمہ وقت ان کی مدد کو تیار رہتے ہیں۔ان کی شاہانہ زندگی ایک نمونے پیش ہے۔جو شاہی منظر نگاری کی ایک مثال ہے:

''گارڈ''

کئی آدمی لپکے۔کتّے زنجیر کسے تھے۔مچھر دان اتارا گیا۔ایک آدمی آفتاب (بڑا سا ڈھکن دار لوٹا) اور دوسرا تاش (مرادابادی تسلہ) لے کر حاضر ہوا تیسرا صابن دان اور توال کے لر لپکا چوتھے آدمی نے چاندی کے بڑے بڑے کٹورے میں گرم پانی پیش کیا۔ راجہ صاحب نے غرغرہ کیا منھ ہاتھ دھولیا تب ہماری آمد کی اطلاع دی گئی۔۔۔چاندی کی کشتی میں چائے پیش ہوئی شرکت کا حکم دیا گیا۔ پیر نیچے اتارے ایک خادم نے گرکابیاں جھاڑ کر سامنے رکھ دیں۔راجہ واش روم کی طرف چلے گئے۔باہر نکلے تو حجام حاضر تھا۔شیو کرایا اور حمام میں چلے گئے۔باہر نکلے تو دو خدمت گاروں نے ایڑیوں پر کاغذ لگا کر دس منٹ میں چوڑی دار پہنایا۔نو بجے کے بعد ناشتے کی میز پر تشریف لائے۔بارہ کرسیوں کی ہاتھی دانت کے کام سے جگمگاتی میز قابوں اور پلیٹوں سے بھری تھی۔''[1]

اس ناولٹ میں رشید احمد صدیقی کا بھی ایک دو جگہ ذکر موجود ہے اور رشید صاحب کی عنایتوں، بخششوں اور محبتوں کا ذکر قاضی صاحب نے نہایت دردمندانہ انداز میں کیا ہے۔رشید صاحب، قاضی صاحب کو بہت عزیز رکھتے تھے اور ان کی پریشانیوں اور مصیبتوں میں ہمیشہ ان کا خیال رکھا کرتے تھے۔

1: آخری کہانی۔قاضی عبدالستار۔علیشا پبلی کیشنز۔ص 47

مکالمہ نگاری: قاضی عبدالستار کے ناولوں میں مکالمہ نگاری اپنی فنی خصوصیت کے ساتھ موجود ہوتی ہے۔موضوع ومواد وکردار کے لحاظ سے وہ اپنے کردار کو پیش کرتے ہیں وہیں ان کے حسب ومراتب کا بھی خیال رکھتے ہیں۔کسی کردار کی زبان سے وہ جملہ یا وہ فلسفیانہ یا فکری گفتگو کو پیش نہیں کرتے جو قاری کو ہضم نہ وہوسکے یا اس بات کو آسانی سے جھٹلا سکے کہ فلاں کردار یہ بات نہیں بول سکتا ہے۔

ناولٹ ''آخری کہانی'' میں جس طرح سے انھوں نے اپنی سوانحی زندگی پر لکھا ہے اور کردار خود قاضی عبدالستار ہیں اس لیے کردار جب مکالمہ کرتا ہے تو اس کی فکر، فلسفہ اور حسن بیانی صاف طور پر ظاہر ہوتی ہے اور آپ اس سے آسانی سے اندازہ لگا سکتے ہیں اور واقعات اور مکالمہ کو غور سے پڑھ سکتے ہیں۔ایک اقتباس ملاحظہ ہوں جس میں قاضی صاحب کا فکر ونظر صاف جھلکتا ہے:

''بھیا آپ سیتا پور کیسے جائیں گے؟''

''جب ہمارا راجہ بیٹا سو جائے گا تب ہم نکل جائیں گے۔''

''اور جب یہ جاگے گا اور آپ کو نہ پا کر روئے گا تو ہم کیا کریں گے؟''

''چپ ہوجائے گا ہر رونے والے کی طرح چپ ہوجائے گا۔''

''اس کے رونے کے خیال سے دکھ نہیں ہوگا آپ کو؟''

''کیوں نہیں ہوگا لیکن دکھ کا زخم بھی مندمل ہوجائے گا وقت کا مرہم کر دے۔''[2]

ہر رونے والے کی طرح چپ ہوجائے گا یا وقت کا زخم مندمل کر دے گا یہ کسی عام انسان کا مکالمہ نہیں ہوسکتا ہے۔ایسی باتیں وہی بول سکتا ہے جس نے وقت اور زندگی کی ستم ظریفیاں دیکھی ہوں گی اور وقت سے بہتر کوئی مرہم نہیں ہوتا ہے جو بڑے بڑے زخم کو بھی بھلا دیتا ہے۔

زبان و بیان: زبان وبیان کے لحاظ سے یہ ناولٹ قاضی صاحب کی دوسری تخلیقات سے یکسر مختلف ہے۔ناولٹ کو عام اور سیدھے انداز میں لکھا گیا ہے کہیں بھی زبان و بیان کی پیچیدگی نظر نہیں آتی ہے ۔واقعاتی انداز میں قصہ بیان کرتے ہوئے اختتام تک لے جانے کی کوشش کی گئی ہے۔زبان اور بیان میں کوئی مشکل پسندی نظر نہیں آتی ہے''آخری کہانی'' کی زبان قاضی صاحب کے تاریخی ناولوں سے بالکل مختلف ہے۔ جہاں بار بار لغت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔اس ناولٹ میں ایسی کوئی رکاوٹ نظر نہیں آتی ہے

2: آخری کہانی۔قاضی عبدالستار۔علیشا پبلی کیشنز۔ص:50

اور بیانیہ بھی صاف شفاف ہے۔ بیانیہ کی نہ تو بھرمار ہے اور نہ ہی جزئیات کی بوجھل فضا۔ ایک عام سا اور ہلکے پھلکے انداز میں لکھا گیا سوانحی ناولٹ ہے جس میں قاری دل چسپی کا اظہار کر سکتا ہے۔

بیانیہ میں انھوں نے درد و غم اور کہیں کہیں حسن کی خوبصورت منظر نگاری کی ہے۔ تشبیہات و استعارے کے سہارے رانی کے حسن کو بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کچھ مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

''ہمارے سلام کے جواب میں سونے کے کنول تصویر سا ہاتھ پکھراج کی پیشانی پر پہنچا یاقوت کے ترشے ہوئے ہونٹ سے کندنی آواز میں سجا ہوا '' آداب'' اس طرح نکلا جیسے کسی ملکہ نے موتیوں کا لچھا نکال کر ڈال دیا ہو۔ چہرہ مونا لیزا کی مسکراہٹ سے دمک رہا تھا۔''3

اس ناولٹ میں قاضی عبدالستار کا پر جمال اسلوب، صاف و شفاف پانی کی طرح بہتا نظر آتا ہے، جس کی وجہ سے یہ ناولٹ خوبصورت اور نادر تشبیہات اور استعارات کا مرکب بن گیا ہے۔ چند مثالیں پیش کرتی ہوں:

(۱)'' ہمارے سلام کے جواب میں سونے کا کنول تصویر سا ہاتھ پکھراج کی پیشانی پر پہنچا یاقوت کے ترشے ہوئے ہونٹ سے کندنی آواز میں سجا ہوا '' آداب'' اس طرح نکلا جیسے کسی ملکہ نے موتیوں کا لچھا نکال کر ڈال دیا ہو۔ چہرہ مونا ہیرا کی مسکراہٹ سے دمک رہا تھا۔''4

(۲)'' چائے خود بنائی پہلی پیالی ٹھا کر کو دوسری مجھے پیش کی اس طرح خم ہو کر ایسی ادا سے پیش کی جیسے آسمان سے اتاری ہوئی کوئی نعمت ہے جو مجھے صرف مجھے پیش کی جا رہی ہے۔''5

(۳)'' مہاگنی کے چھپر گھٹ کے سفید بستر پر وہ آنکھ بند کئے پڑی تھیں۔ ہجر کی راتوں سے زیادہ کالے ڈھیروں بال بکھرے پڑے تھے۔ وصل کی صحبتوں سے زیادہ روشن چہرہ چمک رہا تھا۔ مہجور راتوں میں جلتے ہوئے چراغوں کی سیاہی سے سجے ہوئے ابرو سیاہ سفید ہیرے کی آنکھوں پر سایہ کئے ہوئے تھے لامبی سیاہ خمیدہ پلکیں ہم آغوش تھیں۔''6

3: آخری کہانی۔ قاضی عبدالستار۔ 18

4:، 5:، 6: آخری کہانی۔ قاضی عبدالستار۔ ص۔ 111-18

(۴) ''آنکھیں اس طرح کھلیں جیسے تقدیر کھلتی ہے۔ ہماری نگاہ نے ان کی نظر کو تھام لیا۔ مرجاں کی سلوں کے جگرے تراشے ہوئے ہونٹ ذرا سے دراز ہوئے۔ سونے کے ہاتھ ہم وصل ہوئے۔ برف پوش پہاڑوں پر سورج کی پہلی کرن کی طرح پاس آواز صبح نشاط کی طرح طلوع ہوئی۔''[7]

(۵) ''ہم نے گھوم کر دیکھا پلکیں آنسوؤں سے وضو کر کے نماز ہجر پڑھ رہی تھیں۔''[8]

(۶) ''سیاہ اور سفید الماس کی پوری کھلی ہوئی آنکھوں کی شمعیں کسی کے انتظار میں فروزاں تھیں۔''[9]

کبھی کبھی تخلیق کاروں کے گاڑھے اور پیچیدہ اسلوب اور الفاظ کے پیچ وخم سے الجھن ہونے لگتی ہے۔ مگر قاضی صاحب کا اسلوب اس عیب سے پاک نظر آتا ہے اور وہ جو کہنا چاہتے ہیں اس کی تصویر پورے طریقے سے واضح ہو جاتی ہے۔

قاضی صاحب کے اسلوب سے متاثر ہو کر ڈاکٹر طارق سعید نے ایک مکمل کتاب 'اسلوب جلیل قاضی عبدالستار کا گرینڈ اسٹائل' میں لکھتے ہیں:

''قاضی عبدالستار کے شعلۂ آگہی قلم جاوداں سے قطع نظر آج کوئی مرد آزاد نہیں جو اردوئے معلیٰ میں گفتگو کرتا ہو اور دنیائے ادب کو حرکت وحرارت اور آتش فشانی کا درس دیتا ہو شاید مذکورہ بالا بیانیہ گنجلک گزیدہ ہو اور ان کی معنیات کی تہ داریاں پریشان کن ہوں تو معلوم ہونا چاہیے کہ جو مقام ویاس کی مہابھارت کو کل حاصل تھا وہ قاضی عبدالستار کے صحیف جلیل کو آج حاصل ہے یہ تحریریں عبارت آرائی کے ہنر کی غماز نہیں اور نہ ہی اس کا مقصد ومطلوب معانی کی علم سازی ہے بلکہ مدعا محض اتنا ہے کہ اگر آزاد، شبلی اور ابو الکلام پیدا نہ ہوئے ہوتے تو بھی اردو آفاق کا کوئی بھاری خسراں نہ ہوتا کیونکہ رحمٰن جلیل نے قاضی عبدالستار کی تخلیق کا منصوبہ روز ازل ہی کر لیا تھا۔''[10]

قاضی عبدالستار کے اندر قصہ بیانی کی جو قوت ہے وہ کشش ثقل کی طرح اپنی طرف کھینچتی رہتی ہے۔ قاری ان کی تخلیقوں میں اور ملاقاتی ان کی محفلوں میں دم بہ خود سارہتا ہے۔ اور اسے احساس نہیں ہوتا کہ وہ

7، 8، 9: آخری کہانی۔ قاضی عبدالستار۔ ص۔111-18

10: اسلوب جلیل قاضی عبدالستار کا گرینڈ اسٹائل۔ ڈاکٹر طارق سعید۔ مکتبہ دانیال۔ سن اشاعت: 1993ء۔ ص: 24

کسی جیتے جاگتے انسان سے کوئی بات چیت یا گفتگو کر رہا ہے بلکہ کسی ریڈیو کی آواز سے چپک کر سننے والی کیفیت طاری ہوتی ہے۔ڈاکٹر پریم کمار قاضی عبدالستار کی اس خصوصیت کے بارے میں ایک واقعہ نقل کرتے ہیں جب ڈاکٹر رمیش کُنٹل صاحب نے انھیں سن کر کہا تھا:

''قاضی صاحب آپ کو پارلیامنٹ میں ہونا چاہیے آپ تو بول کر پانی میں آگ لگا سکتے ہیں۔''[11]

قاضی صاحب کی زندگی میں متعدد ایسے واقعات گزرے جو کسی ناولٹ یا افسانے سے کم دلچسپی نہیں رکھتے ہیں۔ان کی زندگی حادثات وواقعات سے عبارت رہی۔ہمیشہ ایک سکھ سے ساتھ دکھ بھی جڑا رہا جب تھوڑا خوشی کا موقع ملتا ہے دکھ بھی ساتھ آجاتا۔کہتے ہیں کہ جب ہم پیدا ہوتے ہیں تبھی ہمارے دشمن بھی پیدا ہوجاتے ہیں اور دو دکھوں کے بیچ کے وقفے کا نام خوشی ہے۔یہ بات قاضی صاحب کی زندگی پر صادق آتی ہے۔محرومیوں اور ناکامیوں کے ایک سمندر کے ساتھ قاضی صاحب کی شخصیت بنتی اور بگڑتی رہی مگر انھوں نے دکھ کو اپنی زندگی پر حاوی نہ ہونے دیا بلکہ اس المیہ کو زندگی کا رس ملا اسے چین وسکون سے جیتے رہے اور اپنی زندگی اپنی پسند کے مطابق گزارتے رہے۔ان کی اس زندگی اور ان کی شخصیت کے بارے میں پروفیسر ابوبکر عباد نے لکھا ہے:

''غالباً یہ کہنا زیادتی نہ ہوگی کہ ناسٹلجیائی حسیت نے قاضی صاحب کا کبھی پیچھا نہیں چھوڑا۔وہ اپنے عہد کے سوشلسٹ ہندوستان اور اس کے ابھرتے نئے سماج کے ولولوں سے ہمدردی رکھنے کے باوجود غیر شعوری طور پر اُس نظام میں جیتے رہے جس میں انھوں نے آنکھیں کھولی تھیں۔شاید یہی وجہ ہے کہ وہ قلم سے تو جاگیرداروں کے خلاف لکھتے رہے۔لیکن ذہنی طور پر جاگیردارانہ نظام کے حامی اور اس کی جگہ سرمایہ دارانہ نظام کے آجانے سے دل ہی دل میں افسردہ رہے۔قاضی صاحب کی باطنی ٹریجڈی کی یہ ''ڈھنگ رنگ بازگشت'' کل تک اُن کی گفتگو اور تقریروں میں سنائی پڑتی تھی آج کی روپہلی دھوپ چھاؤں ان کے ناولوں اور افسانوں میں ڈوبتی ابھرتی دکھائی دیتی ہے۔ لیکن یقین جانیے کہ اس کی شناخت اتنی آسان ویسی ہی مشکل ہے جیسے یہ طے کرنا کہ

11: اک شاعر کا نام بتایئے جسے پیغمبری ملی ہے۔ڈاکٹر پریم کمار۔مشمولہ۔نذر قاضی عبدالستار۔پروفیسر غیاث الدین۔ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،نئی دہلی۔اشاعت:2006ء۔ص402

قاضی عبدالستار واقعتاً ہماری ہی دنیا کا کوئی انسان تھا، یا فکشن کی دنیا سے آیا ہوا کوئی انوکھا
اور البیلا کردار۔'' 12؎

''آخری کہانی'' ایک عام سا سوانحی ناولٹ ہے جس کی کوئی خاص قدر و قیمت نہیں متعین کی جاسکتی ہے۔ یہ صرف قاضی عبدالستار کی زندگی کا ایک المیہ واقعہ پر مبنی ہے۔ واقعات کی ترتیب دل چسپ ہے جسے عام قاری پڑھ سکتا ہے اور اپنی دل چسپی ظاہر کر سکتا ہے۔ کسی تنقیدی گفتگو اور علامت سے پرے ہٹ کر اس کو پڑھا جاسکتا ہے اور قاضی صاحب کے حسن و بیان کی داد دی جاسکتی ہے۔

☆☆☆

12؎ قاضی عبدالستار، شخص فن اور اسرار۔ مضمون نگار ابوبکر عباد۔ مشمولہ ایوان اردو، دسمبر 2018۔ ص 24

تاریخی ناول

تاریخی ناول کو ادب میں ایک مقام و مرتبہ دیا جاتا ہے۔ تاریخی ناولوں کی ایک خاص اہمیت ہے۔ آزادی کے بعد تاریخی ناول نگاری کے میدان میں زیادہ طبع آزمائی کی گئی اور اس میں نسیم حجازی، التمش، صادق سردھنوی وغیرہ لوگوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ انسانی دماغ کی عجیب صورت حال ہے کہ جب وہ کسی پر آشوب دور سے گزرتا ہے یا کوئی حادثہ یا واقعہ اسے پریشان کرتا ہے تو وہ ماضی میں پناہ لیتا ہے اور ماضی کی زندگی جہاں اسے حوصلہ دیتی ہے وہیں جوش و جذبہ پیدا کرتی ہے۔ مگر جوش و جذبہ کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ وہ اس جوش و جذبے میں آ کر نیند کی آغوش میں چلا جائے بلکہ یہ ضروری ہوتا ہے کہ ماضی کی تابناکیوں سے روشنی لے کر مستقبل کے اندھیروں کو دور کر سکے۔ آزادی سے پہلے تاریخی ناولوں میں افیونی کی جو فضا پائی جاتی تھی آزادی کے بعد لکھنے والوں نے اس اثر کو کم کرنے کی کوشش کی اور عہد حاضر کے مسائل و مصائب کو بیان کرنا شروع کیا اور اس ضمن میں جو سب سے نمایاں نام سامنے آتا ہے وہ قاضی عبد الستار کا ہے۔ قاضی عبدالستار کا خاص وصف یہ ہے کہ انھوں نے تاریخی ناولوں کو حقیقی زندگی کے رنگ و روغن کے ساتھ پیش کیا ہے اور مذہب کی تبلیغ کے بجائے تاریخی حقائق کو موضوع قلم بنایا اور ادب میں تاریخی ناول کی ایک نئی روایت کو جنم دیا۔

تاریخی ناول نگاری کے ضمن میں سب سے پہلا نام جو آتا ہے وہ عبدالحلیم شرر کا ہے۔ انھوں نے اسکاٹ کا ناول Talisman پڑھنے کے بعد ''ملک العزیز ورجنا'' لکھ دیا۔ یہ ناول اسکاٹ کی ان نظریہ کی کاٹ میں لکھا گیا تھا جس میں اس نے مسلمانوں اور اسلامی تاریخی شخصیات کا مذاق اڑایا تھا اور عیسائی بادشاہوں اور جرنیلوں کی بہادری کی خوب تعریف و توصیف کی تھی۔ شرر کے ہاتھ جب یہ ناول لگا تو ان کا جوش ایمان بھڑک اٹھا اور انھوں نے اسکاٹ کا جواب دینے کی کوشش اور کئی درجن تاریخی ناول لکھ ڈالے جن

میں مسلمانوں کے جنگی فتوحات پر روشنی ڈالی گئی تھی اور انھیں ایک بہتر انسان تمام خوبیوں کا مالک اور نہایت طاقتور اور بہادر بنا کر پیش کیا گیا تھا۔شرر کے بعد تاریخی ناول لکھنے والوں کا پورا ایک کارواں آ گیا اور انھوں نے شرر کی تقلید شروع کر دی۔جن میں محمد علی طبیبؔ،منشی سجاد حسین، راشد الخیری، مرزا محمد سعید، رئیس احمد جعفری، صادق سردھنوی، نسیم حجازی، مائل ملیح آبادی، اسلم راہی، قیس رام پوری، عنایت اللہ، التمش غیرہ قابل ذکر تھے۔تقسیم ہند کے بعد خون خرابے اور فرقہ وارانہ فسادات کے بناپر ادب میں جدید مسائل پر ناول لکھنے کی شروعات ہوئی مگر اس پر پیچ فضا میں قاضی عبدالستار ادب میں تاریخی ناول لکھنے کی شروعات کی اور ایک نئے انداز سے تاریخی ناول لکھنے کی داغ بیل ڈالی۔

پروفیسر علی احمد فاطمی اس سلسلے اور اس کے خاتمے اور پھر قاضی عبدالستار کی تاریخی ناول نگاری کی شروعات پر لکھتے ہیں:

> ''تاریخی ناولوں کا ایک دور تھا جو رفتہ رفتہ اس عہد کے ساتھ ختم ہو گیا۔سماج نے کروٹ لی تو ناول کی دنیا بدل گئی۔انگریزوں کی رخصت، ہندوستان کی تقسیم اور جدید دور کے اقتصادی اور سماجی ہنگاموں نے ناول کے ایسے زبردست موضوعات فراہم کئے کہ تاریخ کی طرف کسی کا دھیان بھی نہ جا سکا۔ایسی پر پیچ فضا میں بیسوی صدی کی پانچویں چھٹی دہائی میں قاضی عبدالستار ہی ایسے ناول نگار ہیں جو حال کے اس طوفان کی تاریخ کی شمع روشن کئے ہوئے ہیں۔صلاح الدین ایوبی اور داراشکوہ اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔بیسوی صدی کئے نصف آخر میں تاریخی ناولوں کی بہت کمی ہے۔بڑی حد تک قاضی عبدالستار نے اور کسی حد تک عصمت چغتائی نے ناول کا ایک قطرہ خون یا یعقوب یاور نے ناول'' دل من'' نے اس کمی کو پورا کونے کی کوشش کی ہے۔آج کا ماحول تاریخی ناول نگار پیدا کرنے کے حق میں ہے یا نہیں کچھ کہا نہیں جا سکتا لیکن سچ ہے کہ اردو میں ہی نہیں بلکہ ہر ادب کے تاریخی ناول ایک خاص ماحول اور مزاج کی پیداوار رہے ہیں۔''1؎

تاریخی ناول کیسا ہونا چاہیے؟ اور کیوں ہونا چاہیے؟ ادب کو تاریخی ناول کی کیوں ضرورت ہے؟ ناول کا ایک الگ شعبہ ہے اور تاریخ کو الگ شعبے میں پڑھایا جاتا ہے۔ان دونوں کو آپس میں گڈ مڈ کرنے کی کیا

1؎: ناول کی شعریات۔پروفیسر علی احمد فاطمی۔عرشیہ پبلی کیشنز،نئی دہلی۔سن اشاعت 2016۔ص184

ضرورت ہے۔ ناقدین الگ الگ نظریے کے تحت بحث کرتے رہے ہیں بلکہ کچھ مغربی مفکرین کا ماننا ہے کہ تاریخی ناول سب سے خراب صف ہوتی ہے وہ نہ تو تاریخ سے انصاف کر پاتی ہے اور نہ ناول کے فنی اصولوں کو ملحوظ خاطر رکھتی ہے اس لیے ناول کے کٹر دشمن تاریخی ناول کو سمجھا جاتا ہے۔ اسمتھ کے مطابق تاریخی ناولوں کو ناول کی سب سے گھٹیا قسم کی تاریخ اور خراب قسم کا ناول قرار دیا ہے اور اسے دشمن مانا ہے۔ یہاں تک کہ پروفیسر بیٹر فیلڈ نے تاریخی ناول کو ایک اچھی کتاب ہونا کہا ہے۔ اچھا تاریخی ناول کبھی نہیں ہوسکتا مانا ہے اور تاریخی ناول کو سب سے باریک فن سمجھا ہے کیونکہ دونوں کو ایک ساتھ لے کر چلنا تاریخ سے اور ناول سے بیک وقت انصاف کرنا نہایت مشکل امر کہتا ہے۔

تاریخی ناولوں کا رنگ و روغن کیسا ہونا چاہیے اور ان میں کن کن پہلوؤں پر خاص دھیان دینے کی ضرورت ہے اس کے بارے میں پروفیسر علی احمد فاطمی لکھتے ہیں:

''دراصل تاریخی ناول کے متعلق سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ اس میں تاریخ کیسی ہونی چاہئے اور ناولیت کتنی۔ حقائق کم ہیں اور رنگ و روغن زیادہ۔ ناول کامیاب ہے لیکن تاریخی ناول زخمی ہے۔ ناول نئے دور کا فنی سانچا ہے۔ جس نے زندگی کے ہر موضوع کو اپنے آپ میں دھال لیا ہے اور سماج کی صحیح تصویر پیش کی ہے اور یہی وجہ ہے کہ آج کے دور میں اس سے زیادہ مقبول کوئی اور صنف نہیں۔ اس کی شرائط تاریخ سے بھی زیادہ باریک ہیں۔ اس کی مقصدیت، اس کی فنی نزاکت ہی اسے شہرت بخشتی ہے۔ تاریخ عام طور پر ایک مخصوص طبقے میں پڑھی جاتی ہے، لیکن ناول ہر خاص عام میں مقبول ہوتا ہے۔ اس لیے تاریخ کو سموتے وقت تاریخی ناول میں سب سے لازم اور بنیادی چیز اس کا تاریخی ماحول ہے، اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ ناول پڑھتے وقت یہ احساس ضروری ہے کہ اس کی بنیادیں تاریخ پر رکھی گئی ہیں اور قاری کو پتہ چلے کہ ناول اس کے دور سے ہٹ کر قدیم ماحول کی عکاسی کر رہا ہے۔ تاریخی ماحول پیدا کرنے کے لیے ضروری نہیں ہے کہ صرف تاریخ کا گہرا مطالعہ ہو۔ مطالعہ تو ضروری ہے ہی لیکن اس سے زیادہ اہمیت اس عہد کی روح کی گہرائی میں پہنچنے کی ہے۔ ماضی کو گھنگالتے وقت ظاہری رنگ و روغن کو نہیں دیکھنا چاہیے، بلکہ اس عہد کی زندگی کا پورا نچوڑ حاصل کر لینا چاہیے تاکہ ناول نگار اپنے ناول میں صرف حادثوں کو اکٹھا نہ کرلے بلکہ اس عہد کی زندگی کی ایک لہر دوڑنی

چاہیے۔ زندگی کی سچّی جھلک ہونی چاہیے۔ اس کی سب سے بڑی کامیابی یہی ہے کہ ماحول کو اس انداز سے پیش کرے کہ روح عصر اُبھر کر سامنے آجائے۔ ایسا کامیاب تاریخی ناول نگار اپنے ناول میں جب کسی عہد کا ذکر کرنے لگتے ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ ایک عہد خود اس کی زبان سے بول رہا ہے اور ایسا ماحول پیش کر رہا ہے جس میں تاریخ بھی ہے اور فن کار کی فنکاری بھی۔''2

تاریخی ناول میں کن واقعات و حادثات کو پیش کرنا چاہیے اور کن کو شامل نہیں کرنا چاہیے۔ کیا غیر مستند واقعات بھی تاریخی ناول کا حصہ بن سکتے ہیں۔ ان تمام پہلوؤں پر اہل علم کو درمیان بحث و مباحثے ہوتے رہے ہیں، جب قاضی عبدالستار کا تاریخی ناول ''داراشکوہ'' ''کتاب'' لکھنؤ کے شمارے میں سلسلے وار شائع ہو رہا تھا اس وقت تاریخی ناولوں کے فنی نزاکتوں پر خوب گرما گرم بحث چلی جن میں ادب کی مشہور شخصیت شمس الرحمٰن فاروقی اور شعبۂ تاریخ کے پروفیسر اقتدار عالم نے ایک دوسرے کو لعن طعن کی اور ایک دوسرے کی غلطیوں کی نشاندہی کی کہ داراشکوہ میں کتنے مستند اور کتنے غیر مستند یا غیر تاریخی واقعات شامل ہیں کیا ہونا چاہیے تھا اور کیا نہیں تاکہ تاریخی حقائق مجروح نہ ہوں۔ خیر ایک لمبی بحث ہے اور راقم الحروف کے پاس دونوں کے مباحثے موجود ہیں۔

''ناول کیا ہے؟'' کتاب میں ڈاکٹر محمد احسن فاروقی اور ڈاکٹر سید نور الحسن ہاشمی تاریخی ناولوں کی تاریخی حیثیت اور واقعات کی پیش کش میں اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا ہے:

''تاریخی ناول کے لیے ضروری نہیں ہے کہ اس میں ہر بات تاریخی حیثیت سے صحیح ہو۔ ناول نگار ایسے واقعات کو بھی شامل کر سکتا ہے جو مستند نہ ہوں اور ان واقعات کو خاص اہمیت دے سکتا ہے مگر ایک چیز کا خیال رکھنا ضروری ہے وہ غیر مستند واقعہ ایک حد تک قرین قیاس ضرور ہو۔ اسی طرح تاریخی ناول میں متعدد کردار بالکل فرضی ہو سکتے ہیں اور ان کا تعلق اہم واقعات سے دکھایا جا سکتا ہے۔''3

تاریخی ناولوں کے فنی اصول وضوابط پر روشنی ڈالتے ہوئے خالد اشرف لکھتے ہیں:

''اردو میں تاریخی ناول نگاری کی روایت بہت زیدہ قابل فخر نہیں ہے۔ 1857ء کے

2: عبدالحلیم شرر بہ حیثیت ناول نگار۔ پروفیسر علی احمد فاطمی۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی۔ سن اشاعت 2007۔ ص 91-190

3: ناول کیا ہے؟۔ ڈاکٹر احسن فاروقی۔ ڈاکٹر نور الحسن فاروقی۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ۔ سن اشاعت 2011۔ ص 92

بعد معاشرتی ناولوں کے پہلو بہ پہلو شرؔر اور ان کے معاصرین و مقلدین نے درجنوں ناول لکھے جو تاریخ اور تخیّل کا عجیب و غریب ملغوبہ ہیں ۔ یہ بزرگ اپنے مذہبی جوش اور احیائی ابال کے سیلاب میں بہہ کر نہ تاریخ کے ساتھ انصاف کر سکے نہ ناول کے فنی تقاضوں ہی کو پورا کر سکے۔ان ابتدائی مصنفین نے جن میں مولانا شرؔر، حکیم محمد علی طبیب، حکیم محمد سراج الحق اور موہن لال فہم وغیرہ شامل ہیں، اپنے کرداروں کو اس قدر غیر معمولی ذہنی و جسمانی صلاحیتوں کا حامل دکھایا ہے کہ یہ ناول سے زیادہ داستانوں کے قریب کی چیز معلوم ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں انھوں نے اکثر تاریخ کو بھی اس طرح مسخ کر دیا ہے کہ مسلمانوں کو بہترین صفت سے آراستہ کیا ہے جبکہ ان کے مخالفین عیسائیوں یا یہودیوں کو انتہائی مکار، سازشی ، ہوس پرست اور وعدہ شکن افراد بنا کر پیش کیا ہے۔ ۔۔ظاہر ہے کہ یہ صورت ناول نگاری کے فنی تقاضوں کے اعتبار سے انتہائی مایوس کن ہے کیونکہ مغرب سے مشرق تک آج سبھی ناقدین اس امر پر متفق نظر آتے ہیں کہ تاریخی ناول لکھتے وقت مصنف کا یہ فرض ہے کہ وہ تاریخی حقائق کے FRAME WORK میں رہ کر ہی اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے جوہر دکھائے۔'' 4

تاریخی ناولوں کے لکھنے کا مقصد حقیقت کا آئینہ ہوتا ہے اولین دور کے ناول نگاروں نے جوش، جہاد اور اسلامی ماضی کی سنہری تاریخوں کو نوجوانوں کے ذہنوں میں منتقل کرنے کے لیے تاریخی ناول کے فنی اصولوں کا لحاظ نہیں رکھا اور انھوں نے ان ہیروز کو کسی مافوق الفطری انسان کے روپ میں پیش کیا اور انھوں نے شرر کی تقلید کی اور مغربی فن سے استفادہ کرنے کے بعد دھیرے دھیرے تاریخی ناولوں کی صورت حال بدلنی شروع ہوئی اور ناول کو تاریخی اور فنی اصولوں کی کسوٹی پر تولا جانے لگا۔ قاضی عبدالستار تک آتے آتے تاریخی ناولوں نے کئی منزلیں دیکھیں اور پھر انھوں نے اپنے تاریخی ناولوں کو نہ صرف تاریخ بلکہ عہد حاضر کے مسائل سے جوڑتے ہوئے فنی تقاضوں کا لحاظ کرتے ہوئے ناول لکھا۔ قاضی صاحب کے ناولوں میں جہاں حقیقی منظر کشی نظر آتی ہے وہیں فضا بندی پر خاصا زور ملتا ہے۔

قاضی صاحب کا ماننا ہے کہ فضا بندی تاریخی ناولوں کی ریڑھ کی ہڈّی ہوتی ہے اس لیے انھوں نے صفحے در صفحے فضا بندی میں خرچ کیے ہیں اور جہاں جہاں تاریخی واقعات سے الجھتے ہیں وہاں لفظوں کا سہارہ

4: برصغیر میں اردو ناول۔ ڈاکٹر خالد اشرف۔ کتابی دنیا، نئی دہلی۔ سن اشاعت 2003۔ ص 297

لیتے ہیں اور پھر یہ منزل آسانی سے پار کر جاتے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ:

''فضا آفرینی تاریخی ناول کی ریڑھ کی ہڈی ہوتی ہے۔ اگر کوئی ناول نگار فضا کی تخلیق پر قادر نہیں ہے تو وہ ناکام تاریخی ناول نگار ہے۔ فضا کی تخلیق کے لیے ضروری ہے کہ اس عہد کی چھوٹی سے چھوٹی تفصیلات اور معمولی سے معمولی جزئیات علم بھی ہو اور اس کے انتخاب کا سلیقہ بھی ہو۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ کیا لکھنا ہے، یہ صرف بڑا ادیب جانتا ہے کہ کیا نہیں لکھنا ہے۔''5

قاضی عبدالستار کے تاریخی ناول کے متعلق ڈاکٹر محمد شہزاد ابراھیمی رقم طراز ہیں:

''آزادی کے بعد تاریخی ناول نگاری کے میدان میں کوئی بھی تاریخی ناول نگار ایسا نہیں ہے جو قاضی کے شانہ بہ شانہ کھڑا ہو سکے۔ قاضی کے چار تاریخی ناول جو اردو ادب میں شاہکار کا درجہ رکھتے ہیں نہ صرف اپنی مثال آپ ہے بلکہ قاضی عبدالستار کے بلند خیالات اور ان کے پختہ ذہن کی پہچان بھی ہیں۔''6

قاضی عبدالستار نے اپنے معاشرتی اور تاریخی ناولوں میں غیر متعصب اور معروضی نقطۂ نظر سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے اگر چہ قاضی عبدالستار زمیندارانہ طبقہ سے تعلق رکھتے تھے مگر انھوں نے اس طبقے کی برائیوں کو بیان کرنے سے اجتناب نہیں کیا ہے۔ اور اپنے معاشرے اور فرقے سے بالاتر ہو کر ایک تخلیق کار کے وژن سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ انھیں اس زندگی کا عملی تجربہ بھی تھا اور ان کے ناول کے موضوعات حقیقی زمین پر موجود تھے اس لیے انھیں پیش کرنے میں قاضی صاحب کو آسانی تھی۔ تاریخی ناول کیسی ہونی چاہئے۔ اس بارے میں خالد اشرف نے اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

''اردو میں تاریخی ناول نگاری کی روایت بہت زیادہ قابل فخر نہیں ہے۔ 1857 کے بعد سے معاشرتی ناولوں کے پہلو بہ پہلو شرر اور ان کے معاصرین و مقلدین نے درجنوں ناول لکھے جو تاریخ اور تخیّل کا عجیب و غریب ملغوبہ ہیں۔ یہ بزرگ اپنے مذہبی جوش اور احیائی ابال کے سیلاب میں بہہ کر تاریخ کے ساتھ انصاف نہ کر سکے اور نہ ناول کے فنی تقاضوں ہی کو پورا کر سکے۔۔۔۔ ظاہر ہے کہ صورت حال ناول نگاری کے فنی تقاضوں

5: قاضی عبدالستار۔ اسرار و گفتگو۔ راشد انور راشد۔ عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی۔ 2014۔ ص 278-277

6: قاضی عبدالستار کے تاریخی ناولوں میں ہیرو کا تصور۔ ڈاکٹر محمد شہزاد ابراھیمی۔ ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی۔ ص 87

کے اعتبار سے انتہائی مایوس کن ہے کیونکہ مغرب سے مشرق تک آج سبھی ناقدین اس امر پر متفق نظر آتے ہیں کہ تاریخی ناول لکھتے وقت مصنف کا یہ فرض ہے کہ وہ تاریخی حقائق کے Frame Wrok میں رہ کر ہی اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے جوہر دکھائے۔ لیکن تاریخ کے حقائق کو نبھانا اور اس کے پہلو بہ پہلو فکشن کے اصولوں کو بھی مدنظر رکھنا آسان نہیں اس لیے کچھ نقادوں کا خیال ہے کہ مصنف اچھی تاریخ لکھ سکتا ہے یا ایک اچھا ناوللکھ سکتا ہے لیکن ایک ایسا تاریخی ناول لکھان جو تاریخ کے واقعات اور فکشن کے اصولوں دونوں سے کما حقہ انصاف کر سکے۔ ناممکن ہی ہے۔''7؎

اردو کے تاریخی ناول نگاروں نے جذباتی اور اسلامی نقطۂ نظر سے ناول لکھا جہاں ایک طرح سے ان کا مقصد مسلمانوں کے عہد ماضی کی شاندار تاریخوں کو پیش کرنا تھا جس میں مسلمانوں کے جنگی کارناموں سے نوجوان متاثر ہوں اور ان کے اندر محبت وشفقت کا جذبہ پیدا ہو شاید ہی انھوں نے تاریخی ناول کو اصلاحی اور اخلاقی مقاصد کے تحت بھی لکھا۔

تاریخی ناول کے اسی خوبصورت خواب کے میدان میں قاضی عبدالستار ایک حقیقی تعبیر کی طرح نمودار ہوئے جہاں انھوں نے تاریخی مصنفوں کو خوابوں سے جگانے کی کوشش کی اور انھوں نے اپنی قلم سے جہاں عہد ماضی کی تاریخ کو آئینہ دکھایا جس میں ہمیں صرف مسلمان ہیروز کے جنگی کارناموں سے واسطہ نہیں پڑتا بلکہ مسلمانوں کی ناگزیر حالات اور ان کی مجبوریوں کا بھی اندازہ ہوتا ہے جس سے اُس وقت کا مسلمان دوچار تھا۔ چاہے وہ صلاح الدین ایوبی کے عہد میں مسلمان عورتوں کی سر بازار نیلامی ہو یا پھر ایک مسلمان مرد کا اپنی بیٹی کو صلاح الدین جو ایک پادری کے بھیس میں تھا عیش وعشرت کے لیے اپنی بیٹی کو رات کے وقت پیش کرنا اس کے علاوہ صلاح الدین کو نماز پڑھتے دیکھ کر اس کی شکایت اپنے حکمران سے کرنا کیونکہ اس سے اس کو انعام مل سکتا تھا۔ جھوٹ، فریب، دھوکہ، مکاری، چغلی جو انسانی کی فطری کمزوریاں ہیں ان سب کو بھی انھوں نے اپنے تاریخی ناولوں میں پیش کیا ہے عیسائیوں کے ذریعہ ہزاروں مسلمانوں کا خون بہانہ مگر جب فیصلے کا وقت آتا ہے۔ مسلمان نمائندے آسانی سے حکمرانوں سے ڈر اور خوف کا شکار ہو کر جھوٹ بول جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس ملک میں ہماری جان و مال، عزت وآبرو محفوظ ہے بلکہ غلطی مسلمانوں کی ہوتی ہے

7؎ حوالہ برصغیر میں اردو ناول۔ ڈاکٹر خالد اشرف۔ کتابی دنیا، نئی دہلی۔ ص298

جہاں ہمارے انصاف پسند عیسائی حکمراں اس کی سزا دیتے ہیں۔

تاریخی ناولوں کے حوالے سے اگر بات کی جائے تو یہاں بھی قاضی صاحب کا معروضی نقطہ نظر صاف نظر آتا ہے۔ انھوں نے اپنے مذہب اور اپنے فرقے کے نظریہ سے ناولوں کو نہیں لکھا اور نہ ہی قاری کو کسی افیون کا نشہ دیا بلکہ تاریخی اصول وضوابط کو نظر میں رکھ کر انصاف کرنے کی کوشش کی ہے۔

صلاح الدین ایوبی

صلاح الدین ایوبی قاضی عبدالستار کا لکھا ہوا ایک تاریخی ناول ہے جو 1965ء میں شائع ہوا۔ اس ناول کی پہلی اشاعت جمال پرنٹنگ پریس سے ہوئی۔ اس کے بعد متعدد مرتبہ یہ ناول شائع ہو کر مقبول و مشہور ہوا۔ اس ناول کے صفحہ قرطاس پر آنے کا سبب وہ اپنی ماں کو دیتے ہیں۔ قاضی صاحب کی ماں نے صلاح الدین ایوبی کی طرف توجہ مبذول کرائی اس ناول کو انھوں نے اپنے ماموں صاحب قاضی جمیل الدین احمد ایڈوکیٹ سیتاپور کے نام معنون کیا ہے۔ راشد انور راشد کو دیئے گئے انٹرویو میں اس واقعہ کی تفصیل یوں بیان کی ہے:

> ''جب میری والدہ نے میرا ''بادل'' ناولٹ پڑھا تو انھوں نے برجستہ فرمایا کہ جب تم ہاتھی پر لکھ سکتے ہو تو تمھیں صلاح الدین ایوبی پر ضرور لکھنا چاہیے۔ میں نے وعدہ کیا کہ انشاءاللہ لکھوں گا اور میں نے پڑھنا شروع کر دیا۔ شعبے میں میری تدریس کی بھی شہرت تھی۔ اس شہرت کو برقرار رکھنے کے لئے مجھے پڑھنا پڑتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ میرے شاگرد پورے وقت دم بخود بیٹھے رہیں۔ اس لئے مواد کی خاطر پڑھنے کو بہت کم وقت ملتا تھا۔ پھر بھی صلاح الدین ایوبی کے بارے میں جو کچھ میسر آیا وہ سب میں نے پڑھ ڈالا۔ اس کردار نے مجھے اس لئے متاثر کیا کہ یہ پہلا فاتح ہے جس نے مفتوحہ شہروں کو مکمل امان دی اور ایک ایک فرد کی حفاظت کی۔ حالاں کہ اس زمانے کا رواج تھا کہ عیسائی فاتح جس شہر کی فتح کرتے اسے خاک و خون میں نہلا دیتے۔ ایک بات جو مجھے سلطان کی پسند آئی کہ اس نے مفتوح رعایا پر کبھی ظلم نہیں کیا۔ اس طرح کی مثالیں بھری پڑی ہیں کہ ایک ملک کی عیسائی رعایا دوسرے ملک کے عیسائی حاکم نے جو مظالم کئے مجھے اس کو سزا دینے کے لئے پوری ایک لڑائی لڑی گئی۔ یہ خیال اس لئے بھی آتا تھا کہ سلطان کی رعایا میں تو عیسائی اور یہودی تھے مگر ان کی قتل و غارت گری کا کوئی واقعہ

> پڑھنے میں نہیں آیا۔ ہندوستان کے فسادات نے بھی سلطان کی اس خوبی کو بہت زیادہ روشنی دی اور میں نے لکھنا شروع کر دیا۔'' 1

قاضی عبدالستار نے جب بھی کوئی تخلیق رقم کی اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ اس ضمن میں چاہے ان کا ناول ''شکست کی آواز'' یا افسانہ ''پیتل کا گھنٹہ'' مدیران کرام نے ان کی تخلیقات کو ہمیشہ ایک خاص نوٹ کے ساتھ شائع کیا۔ ''صلاح الدین ایوبی'' کی اشاعت کے سلسلے میں فرماتے ہیں:

> پروفیسر آل احمد سرور جو ''ہماری زبان'' کے ایڈیٹر تھے فرمایا کہ جب ''صلاح الدین ایوبی''، مکمل ہو جائے تو مجھ کو دینا کہ میں ہماری زبان کے تخلیقی نمبر میں پورا ناول شائع کر دوں گا۔ میں نے مکمل کرنے کے بعد ناول ان کی خدمت میں پیش کیا۔ انھوں نے پڑھا اور معذرت کر لی۔ اس زمانے میں سلیمان اریب آئے ہوئے تھے۔ ان کو جب یہ واقعہ معلوم ہوا تو انھوں نے مجھ سے فرمائش کی کہ یہ ناول میں ان کو دے دوں۔ وہ رسالہ ''صبا'' کے ایڈیٹر بھی تھے۔ اور انھوں نے وعدہ کیا کہ ''صبا'' کے پورے ایک شمارے میں وہ ناول شائع کر دیا جائے گا۔ اس کی اشاعت میں اقبال متین کا دخل تھا۔ جب یہ شائع ہوا تو اس کے تعارف میں یہ لکھا گیا کہ یہ دلچسپ ناول ہے۔ تاباں صاحب نے وہ ناول مکتبہ جامعہ دہلی سے شائع کیا جس کے وہ کنوینر تھے اور مجھے بارہ سو روپے دیے۔ اس ناول پر مجھے پہلا ''غالب ایوارڈ'' 1973ء بھی ملا۔'' 2

اخلاق اثر ''ہماری زبان'' یکم تا 7 / جنوری 2019ء شمارہ 1 جلد 78 میں ''پروفیسر قاضی عبدالستار ایک تاثر'' میں لکھتے ہیں:

> ''قاضی عبدالستار کا طرۂ امتیاز یہ ہے کہ وہ مختلف اسالیب کو کمال تک پہنچا دیتے ہیں۔ قاضی صاحب کو اپنی زندگی میں بڑی شہرت ملی۔ اہل حیدر آباد نے ابھی صلاح الدین ایوبی سنانے کے لئے مدعو کیا تھا، میں نے بھی قاضی صاحب سے عرض کیا تھا کہ دارا شکوہ میں نظریاتی مباحث بوجھل ہیں اور فنی طور پر صلاح الدین ایوبی دارا شکوہ سے بہتر ہے۔''
> 3

1: اسرار و گفتار۔ راشد انور راشد۔ عرشیہ پبلی کیشنز۔ نئی دہلی۔ سن اشاعت۔ 2014 ص 260-259

2: اسرار و گفتار۔ راشد انور راشد۔ عرشیہ پبلی کیشنز۔ نئی دہلی۔ سن اشاعت۔ 2014 ص 260

3: پروفیسر قاضی عبدالستار ایک تاثر۔ اخلاق اثر۔ مشمولہ۔ ہماری زبان'' یکم تا 7 / جنوری 2019ء شمارہ 1 جلد 78

صلاح الدین ایوبی تاریخ کے آئینے میں:۔تاریخ کے حوالے سے صلاح الدین ایوبی کے بارے میں چند باتیں پیش کرتے ہیں۔سلطان صلاح الدین ایوبی عرب کی ایک ایسی شخصیت ہے جس پر مشرق ومغرب کے اکثر مصنفوں نے اوراق سیاہ کئے ہیں اور اس عظیم مجاہد کے جنگی کارناموں فتح اقدس اور اس کی شجاعت، بہادری، ہمدردی اور سخاوت پر خوب لکھا گیا ہے۔صلاح الدین ایوبی ''کرد'' خاندان سے تعلق رکھتا تھا اس کے آبا اجداد کسی زمانے میں وسط ایشیاء سے ہجرت کر کے ''آرمینیا'' میں بس گئے تھے۔

صلاح الدین ایوبی کی پیدائش 532ھ میں ہوئی یعنی 1137ء یا 1138ء کے ابتداء میں یہ مجاہد اسلام اس ارضی فانی پر جلوہ نما ہوا۔سلطان صلاح الدین ایوبی جس کے بچپن کا نام ''یوسف'' تھا بہت جلد ہی اس نے حاکم دمشق ''آبک'' کے دربار میں ایک نمایاں حیثیت حاصل کر لی۔اپنی جواں مردی اور بہادری کے سبب افواجِ دمشق کا سپہ سالار بن گیا۔صلاح الدین ایوبی کے والد امیر نجم الدین ایوب جو ''تکریت'' کے قلعے کے حاکم تھے جو نہایت جرّی اور بہادر تھے اور انھیں کی بدولت نورالدین زنگی کے باپ عمادالدین زنگی کا دمشق پر قبضہ ہوا۔

صلاح الدین کے دادا شادی ابن مروان نے اپنے دوست ''بہروز'' جو یونانی النسل تھا اسی کے قلعہ میں پناہ لی۔اسعدالدین شیرکوہ جو نجم الدین ایوب کا بھائی اور صلاح الدین کا چچا تھا۔صلاح الدین کی پرورش و پرداخت میں اسعدالدین شیرکوہ کا بہت ہاتھ تھا صلاح الدین جو علم کا سودائی اور خلوت میں مطالعہ سخن میں ملوث رہتا تھا انھیں شیرکوہ کے کہنے پر مصر میں فرنگیوں کے خلاف پر جنگ میں شامل ہوا۔عمادالدین زنگی کے ساتھ صلاح الدین کے والد نجم الدین ایوب اور اس کے چچا مختلف معرکوں میں شامل رہے۔شیرکوہ کی شجاعت اور تلوار کی طاقت سے خوش ہو کر اس کے بھائی ایوب کو زنگی نے شہر ''بعلبک'' کا گورنر بنا دیا۔جو ایک سرخیز اور سرسبز علاقہ تھا ساتھ ہی دشمنوں سے حفاظت کرنے کے لئے قلعہ موجود تھا۔عمادالدین زنگی کی موت کے بعد اس کے دو بیٹوں میں تخت و تاج کے حصول کے لئے تنازعہ شروع ہوا اور بعلبک کے گورنر ایوب کو بھی اپنی حیثیت کا خوف ستانے لگا لیکن انھوں نے دانش مندی کے ساتھ شہر دمشق میں بعلبک کو شامل کر دیا اور کئی گاؤں کی جاگیر حاصل کر لی۔اس کے بعد ایوب نے بہت جلد ہی شہر دمشق میں اپنی پہچان بنا کر ''آبک'' کے دربار میں ایک ممتاز حیثیت حاصل کر لی۔اور چند سال بعد ہی پامردی اور جوانمری کی بدولت افواج دمشق کا

سپہ سالار بن گیا۔ اس وقت عمادالدین کے بیٹے نورالدین زنگی کی حیثیت ایک بہادر جری اور مسلم مجاہد کی تھی جس نے فرنگیوں کی حکومت کو شکست دی ساتھ ہی صلیبیوں ں کا بھی مقابلہ کیا ''حلب'' میں اس کی خود مختار حکومت قائم تھی۔

صلاح الدین ایوبی کے والد ایوب سمجھدار اور معامل فہم انسان تھے۔ تکریت سے جلا وطن ہونے کے بعد انھوں نے بہت جلد نورالدین کے دربار میں رسائی حاصل کی اور انھیں دمشق کا گورنر بنایا گیا اور شیر کوہ کو صوبہ دمشق کا وائسرائے بنایا گیا۔ گویا ایوب کا بیٹا یوسف دربار دمشق اور نورالدین زنگی کی سرپرستی میں پروان چڑھا۔ جس صلاح الدین نے نورالدین زنگی کے ان تمام احساسات کو تاعمر یاد رکھا اور نورالدین کی وفات کے بعد اس کے نوعمر بیٹے محمد صالح کو اس کی ناسمجھی کے باوجود بھی معاف کیا اور اس کی بیٹی کو بنا کسی سوال و جواب سے حلب کا قلع عطا کیا۔ جس پر صلاح الدین بہت سخت معرکوں کے بعد حاصل کیا تھا۔

ناول صلاح الدین ایوبی کا تفصیلی جائزہ

قصہ: قاضی عبدالستار نے اس ناول کو صلاح الدین ایوبی کی یادداشت اور شعور کی رو تکنیک کے سہارے لکھا ہے جس کی وجہ سے بہت سے واقعات کو مختصر کر کے پیش کرنے مہلت مل گئی اور اس شعور کی رو کی وجہ سے تاریخی واقعات کو حقیقی اور حال کے پیش منظر کو پیش کرنے میں آسانی ہوگئی ہے۔ ساتھ ہی بہت سے واقعات کو بہ طور خاص صلاح الدین کی علالت کا ذکر ناول کے حال کے منظر کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ ناول کی شروعات شہر دمشق کی اہمیت اور عالم طرب میں اس کی سیاسی حیثیت کے بارے میں مختلف مورخوں اور تاریخوں کے حوالے سے لکھا ہے:

> ''خر قبیل کا دمشق، بنی امیہ کا دمشق اور بادشاہوں کے بادشاہ صلاح الدین ایوبی کا دمشق ایسا ہی ایک شہر تھا۔ اسی جلیل المرتبت شہر کو روما کے شہر یار صفیر جولیان نے ''چشم مشرق'' کہا تھا، یونان نے سب سے حسین شہر کا خطاب دیا تھا، عربوں نے ''عروس کائنات'' کی خلعت پہنائی تھی اور اسی کے شہر پر ''باغ عالم'' کا تاج رکھا تھا'' 4

غرض دمشق روئے زمین پر سب سے خوبصورت اور مزیّن شہر تھا یہاں علم و ادب کے مرکز تھے ساتھ

4: صلاح الدین ایوبی۔ ناول۔ قاضی عبدالستار۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس۔ سن اشاعت 2011 ص:5

ہی تجارت، سیاست اور علم کے حصول کے لئے دور دراز سے لوگ شہر دمشق کا رخ کرتے تھے اس علاوہ یہاں کے بزرگی علمائے دین نے علم وادب کی دور دور تک خاک چھانیں مختلف ملکوں کے سفیر اور غیر ممالک کے تاجدار یہاں عقیدت کے ساتھ تشریف لائے تھے۔ ساتھ ہی سیّاح بھی یہاں شوق دیدار ونظارہ قدم رکھتے تھے۔ مگر اس شہر دمشق کے باہر یروسلم اور شام کے ممالک کے حالات نہایت دیگر گوں تھے۔ بہ طور خاص مسلمانوں کے حالات نہایت سنگین اور قابل رحم تھے۔ وہاں کے عیسائی حکمران مسلمانوں پر ظلم وستم کے پہاڑ ڈھائے ہوئے تھے۔ وہ قیدیوں کی طرح زندگی گزارتے تھے اور مسلمانوں کے ہاتھ کا چھوا ہوا پانی اپنے گھوڑے تک کو پلانا پسند نہیں کرتے تھے۔ جب صلاح الدین ایوبی ایک جاسوس کے بھیس میں کرک عسقلان اور دوسرے مقامات کا سفر کرتا ہے تو اسے حالات کی سنگینی کا احساس ہوتا ہے۔ صلاح الدین کو نوجوان پادری سمجھ کر اس کی عزت کی جاتی ہے اور جگہ جگہ مسلمانوں کے اوپر ظلم وستم ڈھائے جاتے ہیں۔ شہر شابک میں جب صلاح الدین نہر زبیدہ کے پاس پہنچ کر اپنے گھوڑے کا پانی پلاتا ہے اور وہاں چند شامی مسلمان ہاتھ منھ دھو اور پانی پی رہے تھے تبھی ادھر سے ایک نائٹ کا گزر ہوتا ہے جو مسیح کے قصیدے کا گیت گاتا ہوا جارہا تھا جب اس کی نظر آدمیوں اور گھوڑوں پر پڑتی ہے تلوار نکال کر ان مسلمانوں کا قتل کر دیتا ہے اور کہتا ہے:

> ''مقدس باپ ان پلید مسلمانوں نے بہاؤ پر بیٹھ کر اپنا نجس پانی گھوڑے کو پلایا ہے۔ اس کے لئے طبقہ داؤد یہ کا یہ نائٹ آپ سے معافی مانگتا ہے۔'' 5

عماد الدین زنگی کے پہلی صلیبی جنگ میں عیسائیوں کو شکست دی کچھ دنوں تک امن وامان قائم رہا مگر اس کے انتقال کے بعد حالات جس کے تس ہو گئے اور صلیبی دوبارہ فوج اکٹھا کرنے لگے اور بیت المقدس پر فتح کے خواب دیکھنے لگے۔ پہلی صلیبی جنگ میں جرمنی نے ساتھ نہیں دیا تھا مگر دوسری صلیبی جنگ میں گرجا کے ''پوپ'' نے یوروپ کے تمام مسیحی تاجداروں کو خط لکھ لکھ کر فرمان بھیج بھیج کر ایک بڑی فوج تیار کر لی۔ اور مشرق میں یہ افواہ سرگرم تھی کہ چار لاکھ افواج اکٹھا ہو چکی ہے اور اس بار فیصلہ کن جنگ لڑی جائے گی۔ اس بات کی تصدیق کرنے اور عیسائیوں کے صحیح حالات کا جائزہ لینے کے لئے صلاح الدین ایوبی اپنے ایک پادری دوست قحطان کے ساتھ عیسائی کے بھیس میں فرانس جاتا ہے اور ملکہ النیود سے ملاقات ہوتی ہے۔

5: صلاح الدین ایوبی۔ ناول۔ قاضی عبد الستار۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس۔ سن اشاعت 2011 ص:5

جس کا ارادہ شہر دمشق پر یلغار کرنے کا تھا جس کے لئے یورپ اور ایشیا کے نصرانیوں نے متحد ہو کر پیش قدمی کرنے کی کوشش کرنے ملکہ ایلنور کے خاص سپاہیوں میں وہ نائٹ کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے اور اس کا منظور نظر بن کر ملکہ ایلنور کے فیصلے کو تبدیل کرا دیتا ہے۔ اس طرح صلیبیوں کی مسلمانوں کو غفلت میں پکڑ لینے کی جو چال تھی وہ ناکام ہو جاتی ہے۔ اور صلیبیوں کا مسلمانوں پر شب خون مارنے کا فیصلہ ناکام ثابت ہوتا ہے۔ ناول پورے ڈرامائی انداز سے آگے بڑھتا رہتا ہے اور ایک جگہ صلاح الدین کی حقیقت عیاں ہو جاتی ہے۔ اس طرح سے قاضی عبدالستار نے ناول میں رومانوی انداز کے ساتھ ناول کو آگے لے جانے کی کوشش کی ہے۔ یہاں پر ملکہ ایلنور کا صلاح الدین کے تئیں جذبات سے کام لے کر کسی طرح سے اسے فرار کرا دیتی ہے اس کو بھی بڑے دلچسپ اور رومانوی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

صلاح الدین کے دربار میں ایک پادری قدم رکھتا ہے یہ وقت ایسا ہے جب صلاح الدین بستر علالت پر لیٹا ہوا ہے وہ صلاح الدین کو ایک خط پیش کرتا ہے اور صلاح الدین کی طبیعت کی ناسازی کا حال دریافت کرتا ہے۔ اور وہ خط پیش کرتا ہے جس کو پڑھنے کے بعد صلاح الدین پریشان ہو جاتا ہے اور شش و پنج میں مبتلا ہو جاتا ہے یہ مراسل ملکہ ایلنور سابق مہارانی فرانس اور انگلستان کے بادشاہ رچرڈ کی ماں کا ہے جس سے صلاح الدین نے پادری کے بھیس میں ملاقات کی تھی۔ خط کی عبارت کچھ اس طرح تھی:

> ''اے نائیٹوں کے نائٹ تو نے ان گنت ماؤں کو بیٹے، لاتعداد بہنوں کو بھائی اور بے شمار بیویوں کو شوہر عطا کئے ہیں۔ اے شجاعوں کے شجاع.....مشرق سے مغرب تک تیری تلوار کے گیت گائے جاتے ہیں۔ اے بادشاہوں کے بادشاہ یورپ کے ہر کنگرہ سلطانی پر ہم نے تیرے پرچم کی پرچھائیاں دیکھی ہیں۔ ہم کو یقین ہے کہ تیرے لشکر کے گھوڑوں کی ٹاپوں کی دھمک سے جرمنی کا غرور لرز جائے گا اور رچرڈ کو تاجداروں کے اعزاز کے ساتھ رخصت کیا جائے گا۔۔
>
> ہم فرانس کی سابق ملکہ، انگلستان کے بادشاہ کی ماں آپ سے اپنے بیٹے اور آپ کے حلیف کو مانگتے ہیں۔'' 6

صلاح الدین کو اس خط کو پڑھنے کے بعد صلیبی جنگوں کی تمام کہانیاں یاد آنے لگیں جب اس نے رچرڈ

6: صلاح الدین ایوبی۔ ناول۔ قاضی عبدالستار۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس۔ سن اشاعت 2011 ص 11

کی ان گنت بار مدد کی جب رچرڈ بیمار ہوا تو اسے تازہ پھلوں اور ٹھنڈے پانیوں کے ساتھ دمشق کے بہترین طبیبوں سے اس کا علاج کروایا۔ یہاں تک کہ اس عیّاری اور چالاکیوں کو بھی نظر انداز کر کے اس کے ساتھ میدان جنگ کے باہر ہمیشہ خندہ پیشانی سے پیش آیا۔ اور میدان جنگ میں جب اس کا گھوڑا قتل ہو گیا تو ایک بادشاہ کو دوسرے بادشاہ کے ساتھ جیسا سلوک کرنا چاہیے اس نقطہ کو دھیان میں رکھتے ہوئے اپنی سواری کا خاص گھوڑا اسے عنایت کیا۔ اور صلاح الدین نے خود کلامی کے انداز میں کہا:

''ایلنور...... سپاہی جانتا ہے کہ میدان جنگ میں اس کی مہلت کا دوسرا نام زندگی ہوا کرتا ہے۔ مگر.....'' 7

اس کے بعد صلاح الدین نے ملکہ ایلنور کا خط پڑھ کر ان تمام باتوں کو یاد کرنے لگتا ہے۔ ماضی کی یاد صلاح الدین کی آنکھوں کے سامنے فلم اسکرین کی طرح چلنے لگتی ہے۔ دوسری صلیبی جنگ کا آغاز تھا۔ مجاہدین اسلام کے دل میں بیت المقدس کو فتح کرانے کی آگ سلگ رہی تھی اور ان کے اندر ہمت و حوصلے کی چنگاری بھری ہوئی صلاح الدین افرنجیوں کے لشکر کا سہی اندازہ لگانے کے لئے ان کے لشکر میں چلا جاتا ہے۔ اور فلک نما چوٹی کے پاس پہونچتا ہے جہاں زرافشاں اپنی پوری خوبصورتی اور جوانی کے نشے میں چور ہو رہی تھی۔ فرانسیسی فوجیں زرہ بکتر پہنے ادھر ادھر ٹہل رہے تھے۔ تبھی اس کی نظر عورتوں کے جھنڈ پر پڑتی ہے جو صلاح الدین اور اس کے دوست کو گرفتار کر کے اپنی ملکہ کے حضور پیش کرتی ہیں۔ جو صلاح الدین سے اس کا نام اور پیشہ دریافت کرتی ہے۔ یہاں صلاح الدین ملکہ اور اپنا نام جون بتاتا ہے اور وطن کے بارے میں اس طرح گویا ہوا۔ اقتباس:

''میرے دادا پہلی صلیبی لڑائی میں برگنڈی سے آئے تھے۔ یروشلم کی فتح کے بعد انھوں نے ایک شامی امیر کی بیٹی سے شادی کر لی اور دمشق میں سکونت اختیار کر لی۔ میرے باپ نے بھی دمشق کو اپنا وطن بنائے رکھا۔'' 8

دمشق کا نام سنتے ہی ملکہ فرانس اپنی خوشی کا اظہار کرتی ہے اس پادری میں دلچسپی لینے لگتی ہے۔ اور اس کے بارے میں مزید جانکاری لیتی ہے اور صلاح الدین نے اس طرح ملکہ کو اپنے اعتماد میں لے کر اس کے

7: صلاح الدین ایوبی۔ ناول۔ قاضی عبدالستار۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس۔ سن اشاعت 2011 ص: 12

8: صلاح الدین ایوبی۔ ناول۔ قاضی عبدالستار۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس۔ سن اشاعت 2011 ص: 16

فوجی دستے میں شامل ہو جاتا ہے۔ پھر ملکہ اس پادری سے جو دراصل صلاح الدین دمشق کی فوج کے بارے میں جاننا چاہتی ہے۔ یہاں بھی صلاح الدین نے نہایت صفائی سے دمشق کی افواج کے بارے میں غلو سے کام لیا۔ ملکہ فرانس جو اس جنگ میں پیش پیش تھی۔ وہ اس کی باتوں کو سن کر مضمحل ہوتی ہے ساتھ ہی اپنی افواج سے موازنہ کرنے لگتی ہے اور اس سے کہتی ہے:

''ہمارا خیال ہے کہ کمسنی کی اس رہبانیت کے مقابلے میں بادشاہوں کی خدمت میں رہ کر اور بڑے بڑے کام انجام دے کر مسیح کی زیادہ خوشنودی حاصل کی جاسکتی ہے۔'' 9

اس طرح ملکہ اس کی شجاعت اور صلاح الدین کی صاف گوئی سے متاثر ہو کر اس کو اپنے ذاتی دستے میں شامل کر لیتی ہے۔

دوسرے دن صلاح الدین کے ساتھ ملکہ جبل لبنان کی شکارگاہ کو جاتی ہیں مگر راستہ بھٹک کر چیل کے تاریک جنگل کی طرف نکل جاتے ہیں۔ اور ان کا ایک ساتھی چھوٹ جاتا ہے۔ صلاح الدین جب اس کو تلاش کرنے کے لئے جانے کے لئے کہتا ہے تو ملکہ کہتی ہے ہم چاہتے ہیں۔ تب صلاح الدین ملکہ سے کہتا ہے کہ یہاں تھوڑی دور پر ایک چشمہ ہے جسے عرب کے لوگ ''جام بہشت'' کہتے ہیں اگر آپ سواری کرنے کی ہمت رکھتی ہوں چلتے ہیں اور صلاح الدین نے اپنا سہارا دے ملکہ کو گھوڑے پر سوار کرا دیتا ہے۔ ان تمام واقعہ پر قاضی عبدالستار نے رومانوی رنگ سے پیش کیا ہے۔ جو ناول کو سجانے سنوارنے کے کام آتا ہے۔ آگے چل کر چشمہ کے پاس دونوں پہنچتے ہیں اور صلاح الدین چشمے میں اتر کر دونوں ہاتھوں میں پانی بھر کر پینے لگتا ہے۔ اور سوچتا ہے کہ ملکہ کو کیسے پانی پلایا جائے جب تیسری بار صلاح الدین دونوں ہاتھوں میں پانی بھر کے سینے تک لے جاتا تو ملکہ آگے بڑھ کر اس کے ہاتھوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیتی ہیں۔ غرض رومانی سین کو قاضی عبدالستار نے اپنے خوبصورت الفاظ کے گل بوٹے سے قارئین کے دل میں لذت رومانی اور احساس زندگانی کا رنگ بھرنے کی کوشش کی ہے۔ تبھی صلاح الدین کے دل میں یہ آرزو پیدا ہوتی ہے کہ وہ اس چشمے کے کنارے کھڑا رہے اور قیامت تک ملکہ اسی طرح پانی پیتی رہے۔ تھوڑی دیر گزرتی تھی کہ گھوڑے کے ہنہنانے کی آواز آنے لگی۔ چرند پرند کی چیخوں سے سارا جنگل گونج اٹھتا ہے۔ دیکھنے پر پتہ چلتا ہے کہ جنگل کا بادشاہ شکار کی تلاش میں اپنے حرم سے نکل کر آیا ہے۔ جس کو دیکھ کر ملکہ اس کے سینے سے لگ جاتی ہیں۔ غرض

9: صلاح الدین ایوبی۔ ناول۔ قاضی عبدالستار۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس۔ سن اشاعت 2011 ص:19

جب صلاح الدین اس موقع کو دیکھتا ہے تو ملکہ کی نظروں اعتبار حاصل کرنے کے لئے شیر سے ٹکرانے کا ارادہ کر لیتا ہے تلوار گھسیٹ کر شیر پر جھپٹ پڑتا ہے۔ اس چکّر میں وہ خود گھائل ہوتا ہے تھوڑی دیر میں شیر کا کام تمام کر کے ملکہ کے پاس آتا ہے اور ملکہ جو بدحواس ہو کر ڈری سہمی کھڑی تھیں ان کو دلاسہ دیتا ہے۔ پھر ملکہ اس کے زخموں کو دیکھ کر قبا جلا کر اس کے زخموں میں بھرتی ہیں اور اس کا خون صاف کرتی ہیں۔ اور اس کو لٹا کر سر اپنے زانوں پر رکھ لیتی ہیں۔ صلاح الدین کے بالوں میں اپنی انگلیاں پھیرنے لگتی ہیں۔ اور صلاح الدین کا دل اس لذت دوام کو حاصل کرنے کے لئے عمر پر شیر سے زخمی ہونے کی تمنا کرنے لگتا ہے۔ غرض تھوڑی دیر بعد جنگل کے پھل اور کند مول کھا کر اپنی بھوک کو مٹاتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد ملکہ کے سوار اس کی تلاش میں وہاں آتے ہیں۔ اور ملکہ کو صحیح سلامت دیکھ کر شکر بجالاتے ہیں مگر ملکہ ناگواری کا اظہار کرتی ہیں اور صلاح الدین کی تعریف کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ اگر اس نے شیر کے منھ میں خود کو ڈال نہ دیا ہوتا تو ہم کب کے ختم ہو چکے ہوتے۔ چند اثنا کے بعد سبھی محل کی طرف لوٹ جاتے ہیں۔ غرض وہاں پہنوچ کر صلاح الدین سکون کے ساتھ سو جاتا ہے اور صلاح الدین کی تیمار داری ملکہ پورے دل و جان سے کرتی ہیں جب تک کہ اس کا زخم پوری طرح ٹھیک نہ ہو گیا۔ صلاح الدین کو اس کی تیمار داری میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک ملکہ جو عظیم الشان سلطنت کی مالک ہے۔ ایک عام شامی عورت کی طرح کتنی پُر محبت اور خدمت گزار ہے۔ اور ملکہ نے اس کو شراب پیش کی صلاح الدین پہلے پینے سے جھجھکتا ہے مگر موقع و محل ایسا نہیں تھا کہ وہ انکار کر سکے کیونکہ وہ ایک عیسائی کے بھیس میں اس کے سامنے تھا انکار کرنے سے ملکہ کو شک ہو سکتا تھا کیونکہ عیسائیوں میں شراب حرام نہیں سمجھی جاتی ہے۔ اس منظر کو قاضی عبدالستار نے اپنے پُر رنگینی اسلوب اور نادر تشبہات و استعارات سے ایسے پیش کیا ہے کہ بار بار سطریں پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ اقتباس:

> ''اس نے مسرور آنکھیں اٹھا کر دیکھا ملکہ اپنے شفق گول لباس میں جمع کے سورج کی مانند آنکھیں خیرہ کئے دے رہی تھیں۔ دراز پلکیں نیم باز آنکھوں پر لڑکھڑا رہی تھیں۔ گہری آنکھیں اور گہری ہو گئیں۔ مشرق کی افسانوں کی عاشق ملکہ طلوع ہوتے ہوئے مشرق کے سب سے بڑے سلطان کی بے پناہ دلکشی سے مسحور ہو چکی تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھایا تو ملکہ ٹوٹ کر اس کی آغوش آ گئی۔'' 10؎

10؎ صلاح الدین ایوبی۔ ناول۔ قاضی عبدالستار۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس۔ سن اشاعت 2011 ص: 24

شہنشاہ فرانس لوئی ہفتم کے آنے کے بعد صلاح الدین کی اس بہادری اور ملکہ کی حفاظت کی خوشی میں نائٹ ہوڈ کا خطاب دیا جاتا ہے۔اگر چہ اس ناول میں صلاح الدین کو عیسائی سرداروں کی طرف سے نائٹ ہوڈ کا خطاب دلایا ہے مگر تاریخ میں اسکندریہ کی مہم کے بعد صلاح الدین کو نائٹ ہوڈ کا خطاب دیا جانا لکھا ہے۔اس واقعہ کا مختصر ذکر اس طرح ہے۔اسکندریہ کا صلاح الدین کو گورنر بنا دیا جاتا ہے جب شہر کو وہ صلاح الدین ایوبی کے چچا نہیں ہوتے تب اسکندریہ کا محاصرہ عیسائی افواج کی طرف سے کر لیا جاتا ہے اور منجنقیں شہر پر آگ برسانے لگتی ہیں۔چاروں طرف دشمنوں کی فوج کو دیکھ کر جب شہر والوں کے حوصلے پست ہو چکے تھے ایسی حالت میں صلاح الدین کے عزم و حوصلے میں کوئی کمی نہیں آتی بلکہ وہ دشمنوں کے حملوں کو ناکام بناتا ہے۔ پچھتر دن کے اس خطرناک محاصرے اور فاقہ کشی کی حالت میں ہونے کے بعد بھی صلاح الدین عیسائیوں کے سامنے صلح نہیں رکھتا ہے۔جب کو وہ اسکندریہ میں واپس آتا ہے تو دونوں کے بیچ مصالحت ہوتی ہے۔صلاح الدین ایوبی کے عزم و حوصلے کو دیکھتے ہوئے عیسائی سردار اس کی بہت تعریف کرتے ہیں ساتھ ہی اس کو ایک عمدہ دعوت پر مدعو کرتے ہیں اور اسے 'نائٹ ہوڈ' اور 'سر' کا خطاب عطا کیا جاتا ہے۔اس ناول کو قاضی عبدالستار نے افسانوی رنگ دیتے ہوئے ناول میں پیش کیا ہے۔

غرض ملکہ کا یہ خاص منظور نظر نائٹ خاص برداروں کے ساتھ رات میں گشت پر نکلتا ہے اب صلاح الدین کو فرانسیسی افواج کے ظلم و ستم کا تماشہ دکھتا ہے اور اسے حقیقت سے آشنائی حاصل ہوتی ہے۔کس طرح سے شامی اور عراقی عورتوں کو پکڑ کر یہ سپاہی اپنی ہوس شیطانی پیاس بجھاتے ہیں ساتھ ہی ایک مسلمان بزرگ کے ساتھ ظلم و بربریت کرتے ہیں۔اس کے علاوہ عورتوں کو برہنہ کر کے رقص ابلیس کی طرح مزے لے رہے تھے۔ یہ سب دیکھتے ہوئے صلاح الدین کا خون کھولنے لگتا ہے اور وہ خدا کے حضور میں دعا کرتا ہے تا کہ انھیں عزت کی زندگی دے سکے۔

لوئی ہفتم کے ساتھ جرمانیہ کا بادشاہ شہنشاہ کونریڈ سب مل کر دمشق پر شب خون مارنے کا پلان بناتے ہیں۔صلاح الدین ایوبی یہ خبر سن کر نہایت بے چین و بے قرار ہو جاتا ہے کہ کسی طرح سے یہ خبر دمشق تک پہنچ جائے تا کہ اپنی حفاظت اور شب خون سے پہلے دمشق افواج شب بیدار ہو جائے غرض وہ اپنے ذہن میں کئی طرح کے منصوبے بنا کر برج فتح تک آتا ہے اور دو کبوتروں کو پکڑ کر ایک کو قتل کر کے دوسرے کو اس کے خون

میں لپٹا کر دمشق کی طرف اس کو اڑا دیتا ہے اور اس طرح وہ ایک خطرناک خبر کو دمشق تک پہنچا دیتا ہے۔

غرض رات ہوتے ہی پچاس ہزار سواروں کا یہ لشکر دمشق کی طرف کوچ کرتا ہے مگر دمشق کے لوگ صلاح الدین کی ہوشیاری اور چالاکی کو سمجھ کر پہلے ہی سے تیار تھے اس طرح سے ان کا شب خون کا منصوبہ ناکام ہو جاتا ہے۔ ساتھ ہی صلاح الدین ملکہ کو اپنے اعتماد میں لیتے ہوئے غلط مشورے سے ان کے سارے کھیل کو بگاڑ دیتا ہے اس طرح صلاح الدین کو ایک بڑی کامیابی ملتی ہے۔ اور اس نے خدا کا شکر ادا کیا۔ غرض اس جنگ کی شرمناک ہار اور اکتا دینے والی مصیبت سے ملکہ واپس جانا چاہتی ہے۔ غرض یہاں بھی صلاح الدین ملکہ کو دوسرے راستے پر ڈال کر ملکہ شاہ سلجوقی کے قلعہ کے سامنے لے آتا ہے تا کہ وہاں ملکہ کو آرام مل جائے۔ ملکہ کے محافظ دستے آرام کی غرض سے قلع میں قیام کرتے ہیں۔

جب ملکہ غسل کرنے چلی جاتی ہیں تو صلاح الدین موقع پا کر خدا کے حضور کھڑا ہو جاتا ہے اور نہایت خصوع وخضوع سے نماز پڑھنے لگتا ہے۔ جب سلام پھیرا تو دیکھا ملکہ سامنے بیٹھی تھیں۔ اور ان کے چہرے پر اجنبیت اور آنکھوں میں بے اعتمادی اتر آئی تھی اور وہ صلاح الدین سے سوال کرتی ہیں:

''تم........تم مسلمان ہو؟

اس نے گویائی کی ساری طاقت سمیٹ کر بھاری اور مضبوط آواز میں جواب دیا۔

''ہاں خدا کا شکر ہے ہم اس کے سچے دین اسلام کے نام پھول ہیں''

''جھوٹے بھی ہو۔''

''غدار بھی ہو۔''

''جاسوس بھی ہو۔'' 11؎

اس کے علاوہ وہ الزام لگاتی ہیں کہ اس نے ہمارے شب خون کے منصوبے کو ناکام کر دیا اور لشکر کو پیاسا مار دیا۔ اور اسے اندیشہ ہوتا ہے کہ یہ ہمیں اب دمشق لے جا کر ذلیل ورسوا کرے گا کیونکہ اس وقت بڑے سے بڑے امیر مسلمانوں کی عورتوں کو ذلیل ورسوا کیا جاتا تھا اور انھیں برہنہ کر کے سرعام بازار میں بیچا جاتا تھا جس کا اس ناول میں بھی ذکر ہے۔ ملکہ کے اندیشوں کو دور کرتے ہوئے صلاح الدین اس طرح گویا ہوتا ہے:

11؎ صلاح الدین ایوبی۔ ناول۔ قاضی عبدالستار۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس۔ سن اشاعت 2011 ص 34

''قبل اس کے کہ بیان کیئے ہوئے اندیشوں میں سے کوئی اندیشہ مکمل ہونے کی جسارت کرے۔۔۔قبل اس کے کہ ملکہ کے ناچیز سواروں کے گھوڑوں کی طرف کوئی ناپاک ہاتھ بڑھے۔۔۔قبل اس کے کہ ملکہ عالم کے راستے پر کوئی بے ادب نگاہ اٹھے ہمارا سر آپ کے قدموں میں لوٹتا ہوگا۔ 12

غرض اس کے بعد وہ تلوار نکال کر ملکہ کے قدموں میں رکھ دیتا ہے اور کہتا ہے:

''ملکہ عالیہ مسلمان اپنے دین کے بعد اپنی تلوار کی ناموس کے لئے جیتا اور مرتا ہے۔'' 13

غرض اس کے بعد ملکہ اس کے سینے لگ کر رونے لگتی ہے جس کا یہ ثبوت ہے کہ ملکہ کے دل میں صلاح الدین کے لئے ایک نرم گوشہ بن چکا تھا اور پھر ملکہ اس کو دمشق واپس بھیجنے کا منصوبہ بناتی ہیں اور ایک دن اسے بہانے سے فرانس کی حدود سے باہر بھیج دیتی ہیں۔اس کے علاوہ اس نے پہلے صلاح الدین کو اینٹیک کی سربراہی دینے کا اور تخت پیش کرنے کہتی ہے اور صلاح الدین سے فرماتی ہیں کہ مذہب ذاتی چیز ہے۔تم اس کو اپنی ذات تک محدود رکھ سکتے ہو اور اسے اپنانے کے لئے کہتی ہے۔کہتی ہے:

''یوسف۔۔۔اگر تم مشرق میں ایک سلطنت پیدا کر سکو اور ہم کو مذہب کی ذاتی آزادی دینے کا وعدہ کرو تو ہم مغرب کا یک جلیل المرتبت تاج اتار کر ایشیائی گورنر کے چھوٹے سے ولی عہد کی سوتی پگڑی قبول کع سکتے ہیں۔'' 14

مگر وہ انکار کر دیتا ہے ملکہ کو نہایت افسوس ہوتا ہے لیکن وہ صلاح الدین کی چاہت میں گرفتار ہو کر اسے آزاد کر دیتی ہے اور اس کو خود سے جدا کرنے کا منصوبہ بنا لیتی ہے۔غرض اردن سے نکل کر صلاح الدین دمشق پہونچتا ہے۔اور ایک جرمن گھوڑا خرید کر رومانیہ کے راہب کا زعفرانی چغہ پہن کر آبنوس کی صلیب گلے میں ڈال کر شابک کی طرف چلا جاتا ہے۔شابک کی طرح پہن کر نہر زبیدہ کو دیکھ کر اس کا گھوڑا اچھلنے لگتا ہے۔غرض صلاح الدین گھوڑے کو پانی پلانے کے لئے اتر پڑتا ہے۔تبھی وہیں پر دس پندرہ شامی مسلمان ہاتھ منھ دھو رہے تھے اور پانی پی رہے تھے۔صلاح الدین گھوڑے کو وہیں چھوڑ کر چہل قدمی کرنے لگتا ہے۔

12: صلاح الدین ایوبی۔ناول۔قاضی عبدالستار۔ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس۔سن اشاعت 2011 ص 35-34

13: صلاح الدین ایوبی۔ناول۔قاضی عبدالستار۔ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس۔سن اشاعت 2011 ص 35

14: صلاح الدین ایوبی۔ناول۔قاضی عبدالستار۔ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس۔سن اشاعت 2011 ص 38

تبھی ادھر سے ایک نائٹ آتا ہے اور جب دیکھتا ہے کہ ایک راہب کا گھوڑا پانی پی رہا ہے اور وہیں پر مسلمان بھی اپنا کام کر رہے تھے غصے سے نہایت آگ بگولہ ہو کر ان تمام مسلمانوں کو قتل کر دیتا ہے۔ اور کہتا ہے:

''مقدس باپ ان پلید مسلمانوں نے بہاؤ پر بیٹھ کر اپنا نجس پانی آپ کے گھوڑے کو پلا دیا ہے۔ اس کے لئے طبقہ داؤدیہ کا یہ نائٹ آپ سے معافی مانگتا ہے۔'' 15

اور سینے پر صلیب بناتے ہوئے بائبل کی آیت پڑھتے ہوئے چلا جاتا ہے۔ اور صلاح الدین حیرت کے ساتھ یہ سب دیکھتا رہتا ہے۔ دس بارہ آدمیوں کو ایک طرح سے ایک اکیلا نائٹ قتل کر دیتا ہے۔ وہ لوگ مل کر بھی کچھ نہیں کر سکے اور نہ ہی بھاگ سکے۔ غرض وہ رات ہونے پر ایک مسلمان بوڑھے کے گھر میں پناہ لیتا ہے یہ شامی عیسائیوں سے بے پناہ خوف و دہشت میں زندگی گزارتا ہے۔ جب صلاح الدین ایک مسیح راہب کی بھیس میں اس رات میں پناہ مانگتا ہے تو وہ کہتا ہے۔۔ یہ تو ہماری نجات کا سبب ہوگا۔ مقدس باپ۔ غرض رات گزرنے پر وہ اپنی بیٹی کو صلاح الدین کی خدمت کو بھیجتا ہے اور کہتا ہے:

''قرآن مجید کی قسم میرے گھر میں یہی ایک بیٹی ہے۔۔۔ جسے میں نے مقدس باپ کی خدمت کے لئے بھیج دیا ہے۔ آپ اس بچے کی فکر نہ کریں۔ یہ اس کے پاس بھی روتا ہے۔ یہ تو اس دن سے روئے جاتا ہے جس دن اس کا باپ اپنے آقا اور خدا کے بیٹے کے سچے خادم سے گستاخی کے جرم میں قتل ہوا ہے۔ یہ تو یوں بھی میرے پاس سوتا ہے آپ سکینہ کے ساتھ آرام کریں سو جائیں۔۔ میں، میں اسے لئے جاتا ہوں۔'' 16

شابک میں مسلمانوں کی یہ حالت دیکھ کر صلاح الدین کا دل خون کے آنسو رونے لگتا ہے اور وہ نماز پڑھنے لگتا ہے جو بوڑھا شخص اسے نماز پڑھتے ہوئے دیکھتا ہے گورنر شابک سے اس کے مسلمان ہونے کا راز فاش کر دیتا ہے۔ مگر صلاح الدین بات کو سنبھال لیتا ہے اور وہ سزا سے بچ جاتا ہے۔ قاضی عبدالستار نے یہاں پر مسلمانوں کی زندگی اور ان پر ہو رہے ظلم و ستم کو خوبصورتی سے دکھانے کی کوشش کی ہے کس طرح مسلمان غداری بھی کر رہے مسلمان کے ساتھی اور ان کا خلیفہ عیش و عشرت میں مبتلا ہو کر کسی کا پرسان حال نہیں ہے۔ قاضی عبدالستار نے ظلم و ستم کی ایک مثال کو خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ شابک سے نکل کر صلاح

15: صلاح الدین ایوبی۔ ناول۔ قاضی عبدالستار۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس۔ سن اشاعت 2011 ص 45

16: صلاح الدین ایوبی۔ ناول۔ قاضی عبدالستار۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس۔ سن اشاعت 2011 ص 45

الدین اپنا گھوڑا بیچ دیتا ہے اور ایک گدھا خرید کر کرک کی طرح چل پڑتا ہے جہاں پر رنجینالڈ کا ظلم وستم مسلمانوں پر ایک طاعون کی شکل اختیار کئے ہوئے تھا جو حاجیوں کے قافلے کو لوٹ لیا کرتا تھا۔اس نے دیکھا عیسائیوں نے کسی مسلمان حاجیوں کے قافلے کو لوٹ کر ان کے سر کو نیزے میں لگائے رنجینالڈ کے پاس لئے جارہے ہیں تا کہ ان کے اس فعل کا انعام مل سکے۔اور مذاق اڑاتے ہوئے کہتے ہوئے جارہے تھے:

''یہ بیچارے جنت جانا چاہتے تھے ہم نے ان کو جسم کی مصیبت سے نجات دلا کر سیدھا جنت روانہ کر دیا۔'' 17؎

غرض مسلمانوں پر ہو رہے اس ظلم کو دیکھتے ہوئے آگے بڑھتا ہے اور رنجینالڈ کے پاس پہونچتا ہے اور بتاتا ہے کہ وہ بیت المقدس کی زیارت کے لئے نکلا ہے۔رنجینالڈ اپنے سپاہیوں کو حکم دیتا ہے آج کے اس جشن میں اپنے اس مقدس باپ کو نہ بھولنا۔اور اس طرح وہ رنجینالڈ کی محفل میں جاتا ہے جہاں مسلمان امیروں کی لڑکیوں کو عیسائیوں کی خدمت کے لئے حلال تصور کیا جاتا ہے اور ان کے ساتھ حیوانیت کی تمام حدیں پار کی جاتی ہیں۔تھوڑی دیر بعد ماریہ نام کی ایک دوسری لڑکی کو جبرن لایا جاتا ہے اور اس کے لباس کو کھینچ کر برہنہ کر دیا جاتا ہے اور اس سے گانے کی فرمائش کی جاتی ہے جو عربی میں گاتی ہے۔غرض جب ماریہ اپنی زندگی کا نوحہ پرسوز آواز میں سناتی ہے تو صلاح الدین کو لگتا ہے کہ کسی نے اس کی سماعت و بصارت پر ہتھوڑے برسائے ہوں۔صلاح الدین اس کے دکھ بھرے نوحے کو سن کر بے بس و بے قرار ہوتا ہے اور مسلمان نوجوانوں کے دلوں میں تلوار اور رکاب کی محبت کی یاد دلانے کا منصوبہ بناتا ہے تا کہ اب کوئی مسلمان عورت اس طرح بے بسی اور بے کسی کی زندگی گزارنے پر مجبور نہ ہو سکے۔یہاں سے صلاح الدین دل پر ایک بوجھ لئے ہوئے عسقلان کے راستے چل پڑتا ہے۔ظلم و بربریت کی حیرت انگیز داستان کو دیکھتے ہوئے عسقلان کے مدرسۂ علوم اسلامیہ کے پاس پہونچتا ہے جو اپنی شکستہ دیواروں سے اپنی قوموں کا مرثیہ پڑھ رہی تھیں اور عظمت پارینہ کی داستان بیان کر رہی تھیں۔یہاں پر قاضی عبدالستار نے قوم کی اس حالت زار پر اس طرح اس پر مغز انداز میں لکھا ہے کہ قاری کو اپنی اس عظمت اور ماضی کی یاد آ جاتی ہے جو اس کے دل میں کچوکے لگاتی ہے اور اس حالت بے یار و مددگار پر آنسو بہاتا ہے اور زبان کی دوری اور بدنصیبی کا یہ عالم ہے کہ عربی زبان کے اس مرکز میں مسلمان بچے فرانسیسی زبان پڑھ رہے تھے تختیاں لکھ رہے تھے۔یہاں قاضی

17؎ صلاح الدین ایوبی۔ناول۔قاضی عبدالستار۔ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس۔سن اشاعت 2011 ص 47

عبدالستار نے فرانسیسی زبان کو پڑھا اور سکھانے کے اس زبان سے یہ عرض کیا ہے کہ اپنی زبان سے دوری کسی ایک قوم کی تہذیب تاریخ اور تمدن کو کھا جاتی ہے۔ پھر انسان کو خود کی پہچان کے لئے در بدر ہونا پڑتا ہے۔ زبان و تہذیب سے دوری ہی ہر قوم کا سب سے بڑا المیہ ہے۔

عقلان کے مسلمان قیدیوں کی سی زندگی گزار رہے تھے اور صلاح الدین کو دیکھ کر اپنے سینے پر صلیب بناتے ہوئے گزر رہے تھے یہاں پر قاضی عبدالستار نے عیسائیوں کی عظمت اور ان کے ڈر و خوف مسلمانوں کے اندر کسی قدر گھر کئے ہوئے ہے اس کی منظر نگاری کرتے ہیں۔ یہاں پر صلاح الدین اپنا گدھا بیچ کر آگے بڑھتا ہے۔ تھوڑی دور کے بعد ہی دل کو چیر دینے اور آنکھوں کو ویران کر دینے والا منظر دکھائی دیتا ہے۔ وہاں پر ایک عیسائی کے ہاتھ میں ایک لڑکی کے کمر میں رسّی پڑی جو برہنہ تھی اور دلال اس کی رسّی پکڑے چلّا رہا تھا:

''صاحبان ہارون الرشید بغداد کا سورج ہے''

''صاحبان!''

''عبدالملک دمشق کا چاند ہے''

''صاحبان۔ یہ وہ چیز ہے جس پر سوسو دربانوں کی تلواریں پہرہ دیا کرتی تھیں''

''صاحبان۔ یہ قاہرہ کے امیر المومنین کا لخت جگر ہے''

''اور صاحبان اس کے دام ہیں پانچ دینار۔۔ پانچ دینار''

''پانچ دینار میں سمندر کی ایک قبا ملتی ہے جو دو برس میں بیکار ہو جاتی ہے''

''صاحبان پانچ دینار میں یہ ریشمی قبا لیجیے اور ہارون الرشید کی طرح بیس برس عیش کیجئے۔۔نہیں ساری عمر عیش کیجئے۔'' 18

اس کے علاوہ دوسرے کئی ایسے دل سوز مناظر کا ذکر قاضی عبدالستار نے اس ناول میں کیا ہے کہ کس طرح عیسائی خود ہی بائبل کے اوراق پھاڑ کر زمین میں پھینک دیتے ہیں اور پھر الزام لگاتے ہیں کہ مسلمانوں نے ہمارے دین ہماری بائبل کی بے حرمتی کی ہے۔

عیسائیوں کی ان تمام کرتوں کے بعد بھی پوپ گرجا کا پادری خود کو صلح و آشتی کا پیغامبر سمجھتا ہے اور درس

18: صلاح الدین ایوبی۔ ناول۔ قاضی عبدالستار۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس۔ سن اشاعت 2011 ص 53

دیتا ہے کہ ہم خون ریزی کو پسند نہیں کرتے۔ اس کے علاوہ اس گرجا میں کس طرح مسلمانوں کے خلاف منصوبے بنائے جاتے ہیں انھیں ہمیشہ کے لیے نیست و نابود کرنے کے ارادے بنائے جاتے ہیں اس کی خوبصورت عکاسی اس ناول میں نظر آتی ہے۔ جب پادری کہتا ہے۔ اقتباس:

''یروشلم کے مسیحی سلطنت کی آدھی آبادی اب بھی مسلمان ہے اور یہ مسلمان ہیں جن کے اجداد نے یہاں صدیوں تک حکومت کی ہے اور ان کی حکومتیں آج بھی ہندوستان سے افریقہ تک اور یمن سے سمرقند تک قائم ہیں۔ اگر ان کے ذہن سے ان کے شاندار ماضی کو فراموش نہ کیا گیا اور انھیں تلواریں ٹیک کر کھڑے ہو جانے کا موقع دیا گیا تو یاد رکھو کہ پڑوسی مسلمان حکومتوں کی مدد پا کر یہ تمہیں بحرِ روم میں غرق کر دیں گے۔ اس لیے ہماری ہدایت ہے کہ ایشا کے اس مسیحی سلطنت کو اپنی مسلمان آبادی نابود کر دینی چاہیے۔ سلطنت سے فارغ کر دینا چاہیے۔ بچی کھچی آبادی کو اپنی حقیر خدمت کے لیے قبول کر کے ان کی خود اعتمادی کو اس حد تک کچل دینا چاہیے کہ وہ اپنے مسلمان ہونے پر شرمندہ ہو جائیں، عاجز ہو جائیں اور ترک مذہب پر آمادہ ہو جائیں۔''[19]

غرض اس مذہبی فسادات پر گفتگو قاہر کے فاطمی خلیفہ کا سفر وائی عسقلان کے پاس آتا ہے اور جو نہایت سج دھج کر پانچ سو کنیزوں کے ساتھ ہوتا ہے مگر یروشلم کا گورنر اتنے بڑے خلیفہ اور امیر المومنین سے سفیر جوان کا بھتیجہ بھی تھا تین دن تک ملنے کا موقع نہیں دیتا ہے۔ اس بیان سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس وقت خلیفہ وقت اور اس کے احکامات کی کیا حیثیت رہی ہوگی۔ اب وائی عسقلان اس سفیر کے سامنے اپنے زر خیز خریدے گئے مسلمانوں کے وفد کو سفیر کے آگے کرتا ہے جو حمائل قرآن پر ہاتھ رکھ کر اعلان کرتا ہے:

''ہم کو مسیحی سلطنت میں وہی حقوق حاصل ہیں جو بغداد میں فاطمیوں اور قاہرہ میں عیسائیوں کو نصیب ہیں۔ ہماری عبادت گاہیں محفوظ ہیں۔ ہماری زبان اور ہمارا تمدن زندہ ہے۔ ہم اپنی مسجدوں میں نماز پڑھتے ہیں اور گھروں میں روزہ رکھتے ہیں اور بازاروں اور سیر گاہوں میں مسّاویانہ انداز میں ٹہلتے ہیں۔ اس فساد کا سبب خود مسلمان ہیں۔''[20]

19: صلاح الدین ایوبی۔ ناول۔ قاضی عبدالستار۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس۔ سن اشاعت 2011 ص 58

20: صلاح الدین ایوبی۔ ناول۔ قاضی عبدالستار۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس۔ سن اشاعت 2011 ص 56

غرض فارغ البال اور عیسائیوں کے دلال کی تقریر سن کر سفیر واپس چلا جاتا ہے۔اس کے بعد وہ اپنے بیٹے کے لیے والیٔ عسقلان سے خوشامد کرنے لگتا ہے۔جس کے بارے میں کچھ لوگوں نے شکایت کی تھی کہ وہ عربی جانتا ہے۔وفد کا سربراہ کہتا ہے قرآن مجید کی قسم وہ عربی کے حروف سے بھی ناواقف ہے اور خواب میں بھی کوئی زبان بولتا ہے تو فرانسیسی بولتا ہے۔اس کے بعد گورنر نے پادری جو صلاح الدین تھا اس کا تعارف کراتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ ہمارے مہمان اور دوست جون ہیں جو دمشق سے آرہے ہیں اور بیت المقدس کی زیارت کو جارہے ہیں۔غرض یہ وفد کا سربراہ جو پادری عبادہ بن عباس تھا اس کو اپنے گھر جانے کی دعوت دیتا ہے یہاں پہنچ کر صلاح الدین دیکھتا ہے کہ اس کی لڑکیاں خود کو فرانسیسی ثابت کرنے کے لیے بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی ہیں اور اسی انداز میں بات چیت کر رہی ہیں صلاح الدین کے نام پوچھنے پر کہتی ہے میرا نام المینیا ہے۔

صلاح الدین کہتا ہے المینا؟ اچھا امینہ ہے۔۔۔۔خوب خوب۔اس نے فصیح عربی لہجہ میں بولتا ہے۔

صلاح الدین دیکھتا ہے کہ یہ لوگ خود کو غیر تہذیب میں کس طرح ڈھال کر خود کو فرانسیسی ثابت کرنے پر لگی ہوئی ہیں۔اور کہتی ہیں کیا مقدس باپ بالکل فرانسیسی نہیں جانتے؟

صلاح الدین کہتا ہے:

''ہاں اسی طرح جس طرح فرانسیسی عربی سے نابلد ہیں۔میں دمشق میں پیدا ہوا ہوں اور دنیا کی سب سے مشہور تہذیب اور دولت مند زبان کو مادری زبان کہنے کا شرف رکھتا ہوں۔''21ؔ

یہاں سے نکلنے کے بعد صلاح الدین بیت المقدس پہونچتا ہے اور حضرت ابوخیر انصاری گنبد کی طرف چل پڑتا ہے اور موقع کی غنیمت جان کر نماز ادا کرتا ہے۔مسجد اقصیٰ کی زیارت کرنے کے لیے آگے بڑھتا ہے جہاں ٹوٹے ہوئے فرش ٹوٹے ہوئے ہلال کے ساتھ شکست خوردہ قدموں کے نشان کی مثال پیش کر رہے تھے وہاں سے مسجد عمر کا پتہ پوچھتے ہوئے ایک محراب میں داخل ہوتا ہے جس کے دالانوں میں عامیوں کے حمام تھے اور صحن میں گھوڑے بندھے ہوئے تھے۔محراب کے کڑوں میں گندمی عبارتیں جھول

21ؔ: صلاح الدین ایوبی۔ناول۔قاضی عبدالستار۔ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس۔سن اشاعت 2011 ص59

رہی تھیں۔ دیواروں پر دھوئیں کی دھاریوں کے سانپ لپیٹے ہوئے تھے،فرش پر غلیظ برتن بھٹک رہے تھے۔ وہ ان تمام ہیبت ناک منظروں کو دیکھتا ہوا ایک مسقفی کی طرف بڑھا جس کو حضرت عمرؓ سے نسبت دی جاتی تھی۔ یہاں پہنچ کر اکابرین خلیفہ اسلام کے مقدس پتھر ''صحرا'' جس پر حضرت ابراھیمؑ،حضرت داوٗدؑ اور حضرت سلیمان نے قربانیاں پیش کی تھیں ان تمام مقدس مقامات کو دیکھ کر خون کے آنسو بہاتے تلاوت قرآن پاک کرتے ہوئے قسم کھائی کہ جب تک ان مقدس بیت کو صلیبیوں کے ناپاک ہاتھوں سے پاک نہ کردوں گا سکون وراحت سے نہ بیٹھوں گا۔

اس کے بعد صلاح الدین مصر پہونچتا ہے جہاں کا خلیفہ خود کو عورتوں کی لذت کے آگے تباہ وبرباد کر چکا ہے۔ یہاں پر پہونچ کر صلاح الدین سلطنت کا اختیار اپنے ہاتھوں میں لے کر اپنی محنت ولگن سے بہت جلدی بدنظامی کو ختم کر کے حلب کا محاصرہ کرلیتا ہے جہاں نورالدین رگی کا کم سن بیٹا امیر گمشگین کے ہاتھوں کا کھلونا بن کر سلطنت سنبھال لیتا ہے۔حمص اور دوسرے مقام کو جیتتے ہوئے شیخ الجبال جو فداعیہ گروپ کا سرغنہ تھا اوران کا کام خفیہ طریقے سے لوگوں کو موت کے گھاٹ اتارنا تھا۔ یہ فرقہ فرقہ باطنیہ کہلاتے تھے جس کو حسن بن صباح نے بنایا تھا۔مصاف کے قلعہ پر حملہ کر کے اس کو اپنا مطیع بنایا۔اس کے بعد کرک کا ریجنالڈ جو حاجیوں کے قافلے کو لوٹ لیا کرتا تھا اس کو شکست دیتا ہے۔ جو نبی کریمؐ کے جسم اطہر پر اپنی ناپاک نظر رکھتا ہے۔

اس کے بعد صلاح الدین اسلامی لشکروں کو آراستہ کرتے ہوئے بیت المقدس پر فتح حاصل کرتا ہے۔ صلاح الدین نے جس دن بیت المقدس فتح کیا وہ چاہتا تو تمام عیسائیوں کے ظلم وستم کا بدلہ وہ لے سکتا تھا مگر اس نے زرفدعیہ لے کر تمام عیسائیوں کو آزاد کردیا۔اس کے علاوہ ملک العادل صلاح الدین کا بھائی اور دوسرے لوگوں نے غریب عیسائیوں کا زرفدعیہ ادا کر کے انھیں آزاد کردیا۔صلاح الدین کی اس رحم دلی، شجاعت اور بہادری کی چاروں جانب داستان پھیل گئی۔

جب صلیبی افواج میں کہرام بپا تھا اور تمام ممالک بیت المقدس پر حملہ کر کے اس کو حاصل کرنا چاہتے تھے اس وقت صلاح الدین بیمار پڑجاتے ہیں اور دشمنوں نے اس کی موت کا ہنگامہ کر کے عکہ کے قلعہ کو فتح کر لیتے ہیں۔ جب صلاح الدین کو یہ بات معلوم ہوتی ہے تو بیماری کی حالت میں ہوتے ہوئے بھی میدان

جنگ میں آ جاتا ہے لشکر کے اندر قوت ایمانی جذبہ جوش جگا دیتا ہے اور کہتا ہے کہ عکہ ایک مورچہ ہے جسے دشمن کے حوالے کر دیا گیا ہے اور اس طرح بیس ہزار کا صدقہ دے کر مغربی فوج کے حوصلے پست کر دتے ہیں عکہ حسّین نہیں ہے جس نے بیت المقدس کے دروازے کھول دیئے تھے تم کو اس سلسلے میں زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہارے سامنے اس وقت جنگ عظیم آزمائش ہے ہم جانتے ہیں کہ ہم کو بیت المقدس دوبارہ فتح کرنا پڑے گا۔ ایک بار مشرقی مسیحی سلطنت سے لڑ کر دوسری بار مغرب کے پانچ بادشاہوں سے جنگ عظیم کر کے۔ عکہ کی بازیابی کے بعد ملکہ ایلنیور کا بیٹا شاہ انگلتار رچرڈ جس کو مغرب میں شیر دل رچرڈ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ من مانی صلح نامہ لکھ کر بھیجا تھا اور اس نے اپنی بہن جین کی شادی ملک العادل سے کرنے کی خواہش ظاہر کی مگر صلاح الدین اس کی چالوں سے بہ خوبی واقف تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ملک العادل اپنی بہن کی شادی کر دے تو یروشلم کی ریاست اس کے ہاتھوں میں آ جائے اور ملک العادل جیسا سپہ سالار اس طرح اپنی بیوی کے دام میں آ کر افرنجیوں پر اس مضبوطی کے حملہ نہ کر پائے اور دھیرے دھیرے ہماری حکومت مصر وشام تک پھیل جائے۔

غرض ان تمام اندیشوں کو سجائے ہوئے صلاح الدین فیصلہ کرتا ہے کہ وہ خود ملک العادل کے بھیس میں رچرڈ سے ملاقات کرے گا، فیصلہ ہونے پر وہ ملک العادل کے بھیس میں رچرڈ کے منصوبے کو جاننے کے لیے نکلتا ہے۔ اس طرح سے جب وہ اس کے خیمے میں جاتا ہے تو اور رچرڈ کو گلے لگاتا ہے تو اسے محسوس ہوتا ہے کہ یہ میرا بیٹا افضل ہے۔ یہاں قاضی عبدالستار نے صلاح الدین کی نفسیات کی عکاسی کرنے کی کوشش کی ہے۔ ناول کی شروعات میں جس طرح ملکہ ایلنیور کے عشق کی داستان پیش کی ہے اس کے علاوہ ملکہ کا صلاح الدین پر عاشق ہونا دکھایا ہے اور ملکہ صلاح الدین کے ساتھ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہونے کی خواہش مند ہے۔ یہاں اس بات کی اس انداز میں قاضی عبدالستار نے دکھایا ہے کہ اس کو کے بیٹے کو گلے لگانے پر اپنے بیٹے کا احساس ہوا۔ یہ صرف افسانوی رنگ کو چمکانے اور سجانے کے لیے قاضی عبدالستار نے ایک نکتہ بیان کیا ورنہ صلاح الدین ایک دین دار اور تعلیم یافتہ سچا اور پکا مسلمان تھا ساتھ ہی رچرڈ کی ایسی ملاقات کا کوئی ذکر تاریخ میں نہیں ملتا ہے۔ ساتھ ہی ملک العادل کی بہن جو بیوہ صقیلہ کی مہارانی سے ملک العادل کی شادی جس کو دیکھ کر صلاح الدین کو لگتا ہے کہ یہ میری بیٹی عفت زمانی ہے۔ رچرڈ ملک العادل کو جہیز میں صقیلہ اور

عکہ دینا چاہتا ہے۔اس کے علاوہ صلاح الدین کو ملک العادل سمجھ کر رچرڈ اس کو دوسری باتوں کے لیے بہکا تا ہے۔نائب سلطنت سے سلطنت کے بادشاہ کا خواب بھی دکھا تا ہے۔

بیت المقدس کی فتح کے بعد جب عیسائیوں کو شکست نصیب ہوئی اور اہل ایمان کے جوش وخروش کے آگے انھوں نے اپنی ہار تسلیم کر لی تو کونریڈ بالیان سلطان صلاح الدین کے حضور جا کر اس سے رحم وآشتی کی درخواست کی۔صلاح الدین نے اس کی بات مان لی اور اس نے اہل شہر کو امان عطا کی جو ہر شخص کو دس اشرفیاں فدیہ ادا کر کے امن وامان آزادی دی گئی۔عورتوں کے لیے پانچ اشرفی لڑ کا لڑکی کی صرف دو دینار اور ساتھ ہی یہ کہا گیا کہ چالیس دن کے اندر وہ شہر خالی کر دیں۔اپنا مال واسباب جس قدر لے جانا چاہتے ہیں لے جاسکتے ہیں۔ساتھ ہی غریبوں، مفلسوں اور ناداروں نے ادا کیا اس کار خیر میں بہت سے لوگوں نے حصہ لیا۔صلاح الدین نے بھی بہت سے غریب صلیبیوں کو فدیہ ادا کر انھیں آزاد کیا جس کے بعد تمام صلیبی اور دوسرے مذاہب کے لوگ بھی صلاح الدین کی اس وضع داری اور فیاضی سے بہت متاثر ہوئیاور اس کے حق مہں دعائیں دینے لگے اس ناول منتہا ومقصد صلاح الدین کی اس رحم دکی کی کہانی کو پیش کرنا ہے۔

اقتباس:

''شہنشاہا!

تو نے میری تین بیٹیوں کی جان اور آبرو کی حفاظت کی۔ان کے شوہروں کو سولی کے تختے سے اتار کر انھیں بخش دیا۔اور پورب کے آخری خطّے تک اپنے خرچ سے ان کے مراتب کا لحاظ فرما کر پہنچا دیا۔اس کی شکر گزاری میں اگر میں اپنے خنجر سے اپنا سر اتار کر تیرے قدموں میں ڈال دوں تو بھی کم ہے۔''

''میں نے عہد کیا تھا کہ مشرق کے سب سے بڑے اور دنیا کے سب سے فیاض شہنشاہ کے قدموں میں سر رکھ کر اس کے احباب عظیم کا شکریہ ادا کروں گا۔مسیح کی رحمت کے صدقے میں آج میرا عہد پورا ہوا۔''

فاتحوں کے فاتح! ہزاروں عورتیں پورب کے اس سرے سے اس سرے تک تری عدیم المثال فیاضی کے گیت گا رہی ہیں جن کا تو نے یروشلم کی بازیابی کے دن اظہار کیا تھا اور جن کی رمق کے سامنے پڑے۔بڑے رئیسوں کی عمر بھر کی کمائی ہیچ معلوم ہوتی ہے۔''

22ؔ

سلطان کی اس فیاضی اور سخاوت کا صلیبیوں نے بے جا فائدہ اٹھایا اور بہت سے لوگ اپنا قیمتی سامان لے کر بھاگ گئے اس کے علاوہ بیت المقدس پر فتح کی خبر سن کر مسیحی دنیا میں آگ لگ گئی۔ پوپ اور پادری عیسائیوں کے دل میں آگ لگانے والے بیان دینے لگے اور بیت المقدس کی بازیابی کے خواب پھر سے سجانے لگے۔تمام دنیا کے عیسائیوں نے ہتھیار اٹھا لیے تھے جن میں قیصر فیریڈرک کے شاہان انگلستان، فرانس وصقلیہ، اسٹریا کا کیو پولڈ برگڈی کا ڈیوک، فلانڈر روز کا کاوٹ مشہور شہسوار جنھوں نے کبھی خود کو ایک نہیں سمجھا صلاح الدین کے ہاتھوں سے بیت المقدس کو پھر سے واپس پانے کے خواب سجانے لگے ان سب کی پادریوں نے جنت کی سیر کے بہانے بھی اکٹا کیا گیا تھا اس طرح تیسری صلیبی جنگ کا خطرہ پھر سے منڈلانے لگا جب لوگوں نے صلاح الدین کی اس فیاضی کی شکایت کی تو اس نے کہا۔

''بادل جب برتسا ہے تو یہ نہیں سوچتا کہ اس کی بوندوں سے عدن کی سیپوں میں موتی جنم پائیں گے یا دمشق کے نرکل میں زہر پروان چڑھے گا وہ برستا ہے اس لیے کہ برسنا اس کی فطرت ہے۔۔۔''23ؔ

امیروں نے جب تیسری صلیبی جنگ کی شکایت کی آنے والے پادری نے پورب کے بادشاہوں کے احوال سنائے تو صلاح الدین نے کہا کہ۔

''رب کعبہ کی قسم ہماری تلوار اس عظیم الشان لشکر کو خوش آمدید کہے گی اور اتنا شاندار استقبال کرے گی کہ تاریخ کی کتابوں میں قیامت تک یاد رہے گا۔''24ؔ

سلطان کی اس فیاضی اور رحم دلی سے نصرانی بہت متاثر ہوئے اور انھوں نے صلاح الدین کے قصیدے پڑھنے شروع کر دیئے۔ تاریخ عالم میں یہ پہلا موقع تھا جب فاتح مفتوح کو بنا زک پہونچائے انھیں بے غیر ستائے رحم دل دکھا کر ہارے ہوئے لوگوں کو فدعیہ ادا کر رہی تھی ہوتا تو یہ فاتح مفتوح پر عرش حیات تنگ کر دیتے تھے انھیں جانوروں سے بھی بدتر زندگی ملتی تھی یا ان کی موت پر کھیل تماشے کئے جاتے جس طرح سے اس ناول میں بیان کیا گیا۔ بیت المقدس کے قرب وجوار کے لوگوں کی زندگی ایک قیدی کی

22ؔ: صلاح الدین ایوبی۔ناول۔قاضی عبدالستار۔ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس۔سن اشاعت 2011 ص 97

23ؔ: صلاح الدین ایوبی۔ناول۔قاضی عبدالستار۔ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس۔سن اشاعت 2011 ص 97-96

24ؔ: صلاح الدین ایوبی۔ناول۔قاضی عبدالستار۔ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس۔سن اشاعت 2011 ص 97

طرح ہوتی تھی مگر جیسے ہی صلاح الدین نے اس پاک زمین کو زیر نگیں کیا اس نے اپنی سخاوت، رحم دلی اور فیاضی کی بدولت عالم میں ایک مثال قائم کیا۔

جب سلاطین یورپ نے سلطان کی فیاضی اور رحم کی داستان سنی تو ندامت سے سر جھکا لیا اور سچ تو یہ ہے کہ تاریخ عالم میں فیاضی اور رحم دلی کی ایسی نادر مثال ڈھونڈنے سے بھی نہ ملے گی۔

ناول اس طرح آگے بڑھتا رہتا ہے اور پھر قحطان صلاح الدین کے سامنے ملکہ ایلنیور کا خط لے کر حاضر ہوتا ہے جس میں دونوں کے رشتے کو یاد دلا کر رچرڈ کی رہائی کے بارے میں لکھا گیا تھا۔ صلاح الدین ملکہ کی مدد کرنا چاہتا ہے مگر بیت المقدس کی حرمت پر آنچ نہیں آنے دینا چاہتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ اگر میں اپنی تلوار کو دین کی حرمت کے بجائے جہان کی بازیابی کے لیے نکالوں تو یہ مجھے زیب نہیں دیتا ہے۔ اس طرح دنیا اسے یاد نہیں رکھے گی غرض قحطان ملکہ کے عشق کی داستان صلاح الدین کے سامنے پیش کرتا ہے۔ قحطان بتاتا ہے کہ ملکہ چاہتی ہیں کہ وہ اسٹریا اور مشرقی یورپ کو زیر کرتے ہوئے انگلستان پہونچے جہاں رچرڈ کا بھائی سلطنت کو اپنے قبضے میں کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ قحطان نے یہ بھی کہا کہ جب بیت المقدس کی خبر سے سارے یورپ میں زلزلہ آ گیا تھا اس وقت ملکہ کے چہرے پر اطمینان وسکون تھا۔ اس کے علاوہ قحطان خانہ جنگی میں گھرے ہوئے یورپ کی حالت زار کی داستان بھی بیان کرتا ہے اور صلاح الدین کی تلوار کی ہیبت اور مسیحی دنیا میں جو ڈر وخوف ہے اس کو بھی بیان کرتا ہے۔ اس کی بات سن کر صلاح الدین اپنی طاقت کے زعم میں مبتلا نہیں ہوتا بلکہ کہتا ہے کہ ہم نے ہمیشہ دین کے لیے تلوار نکالی ہے اور گھوڑا اٹھایا ہے کشور کشائی کبھی شرف کبھی نہیں بخشا گیا۔

اس کے بعد ناول میں صلاح الدین کی بیماری کا ذکر ہوتا ہے اور بارش میں بھیگنے کی وجہ سے صلاح الدین کی طبیعت بہت بگڑ جاتی ہے۔ مسجدوں اور گھروں میں آنسو کا سیلاب آ جاتا ہے اور اس کی صحت یابی کے لیے دعا کی جاتی ہے مگر قدرت کو منظور نہیں تھا کہ یہ سپاہی اب دنیا میں رہے۔ خدا تعالیٰ اسے اپنے پاس بلا کر قبلہ اول کی حفاظت کے بدلے میں بہتر انعام عطا کرنے والا تھا۔

جب صلاح الدین بستر علالت پر ہوتا ہے تبھی ایک پادری جو روم کا اسقف کا رہنے والا تھا اپنی کرامتوں اور دعاؤں کی قبولیت کی وجہ سے تمام مسیحی دنیا میں عزت واحترام کی نظر سے جانا جاتا تھا۔ صلاح

الدین سے ملنے آتا ہے اوراس کی کسی خواہش کو جاننا چاہتا ہے تا کہ اس کے پورا ہونے کے لیے دعا کر سکے مگر صلاح الدین جس کو دنیا جہاں کی بادشاہت ہونے کے باوجود کوئی شوق نہیں تھا فرماتا ہے:

''ہم نے چاہا تھا کہ مسجد اقصیٰ کے کلس ہمارے سامنے ہوں۔محمدی پرچم کا مقدس سایہ ہمارے سر پر ہو، ہمارا کفن ہمارے خون سے گل راہ ہو چکا ہو۔ہم گھوڑے پرسوار سرخ تلوار علم کیئے جنگ سلاطانی لڑ رہے ہوں۔اس گھڑی جس گھڑی ہمارا سپہ سالار ہمیں فتح کی نوید دے ہم جان حان آفریں کو سپرد کردیں اور شہید کہلائیں۔''25

غرض اس اقتباس کے ذریعہ قاضی عبدالستار نے صلاح الدین کی خواہش کا اظہار کیا۔ اس نے شہادت کی موت چاہی مگر اسے نصیب نہیں ہوئی اوراس پادری سے کہتا ہے:

''جس یورپ کے باقی بادشاہوں کی لاکھوں تلواریں ہماری ایک خواہش کو پورا نہ کرسکیں ایک بوڑھے پادری سے ہم کیا مانگیں۔''26

اس کے بعد پھر صلاح الدین ماضی میں گم ہوجاتا ہے اور شعور کا ایک لامتناہی سلسلہ چلنے لگتا ہے۔ اسے معلوم ہے اس کی زندگی کے بہت کم دن بچے ہیں اس لیے اس نے اپنے سبھی رشتے داروں اور گھر والوں کو اکٹھا کر کے سب کا شکریہ ادا کرتا ہے اور فرماتا ہے کہ میں کسی کو اپنا نائب نہیں بنا رہا ہوں تمہیں جس پر اتفاق ہو اس کو بادشاہ چن لو۔

صلاح الدین کی موت کے پہلے قاضی عبدالستار نے اسے بہت کشمکش میں مبتلا دکھایا ہے۔انھیں بار بار ملکہ ایلینور کی یاد آتی ہے جو اپنے بیٹے کی رہائی کے لیے آرزومند ہوتی ہے۔جس کے لیے صلاح الدین دعا کرتا ہے کہ اسے اس آزمائش سے نکال دے۔

اس کے بعد صلاح الدین وصیت کرتا ہے کہ دمشق کا خزانہ شاید دنیا کا سب سے بڑا خزانہ ہے جو ہم پر حرام ہے۔ہماری ذاتی ملکیت میں سات درہم ہیں جو ہمارے سفر آخرت میں کام آئیں گے۔

''حطین کی لڑائی میں ہم نے جو کفن پہنا تھا جسے پہن کر ہم بیت المقدس میں داخل ہوئے اسی خون آلود کفن میں ہم کو دفن کیا جائے کہ اس کی برکت سے قبر کی مصیبت آسان ہوجائے گی۔''27

25: صلاح الدین ایوبی۔ناول۔قاضی عبدالستار۔ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس۔سن اشاعت 2011 ص 267

26: صلاح الدین ایوبی۔ناول۔قاضی عبدالستار۔ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس۔سن اشاعت 2011 ص 167

27: صلاح الدین ایوبی۔ناول۔قاضی عبدالستار۔ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس۔سن اشاعت 2011 ص 173-172

اس کے بعد صلاح الدین وصیت کرتا ہے کہ اس کی موت کے بعد اس کی تلوار کو قبر میں دفن کر دیا جائے۔قاضی عبدالستار نے سلطان کی تلوار کو قبر میں رکھنے کا نکتہ خود ہی پیدا کیا ہے کیونکہ سلطان کی موت کے بعد کسی کو نہیں معلوم کی اس کی تلوار کا کیا ہوا اس ضمن میں قاضی عبدالستار لکھتے ہیں:

''مصر کے صدر جمال عبدالناصر نے ایک اشتہار دیا تھا کہ دنیا میں کوئی شخص اگر سلطان کی تلوار دے سکے یا اس کا پتہ بتا سکے تو ہم اسے دس لاکھ ڈالر دیں گے۔ میں نے یہ ذکر جب پڑھا تو میں سوچتا رہا کہ میں سلطان کی تلوار کا کیا کروں اور میرا یہ دعوی بھی تھا کہ میرا ناول تاریخی حقیقت پر مبنی ہے۔ مجھے ایک دم خیال آیا کہ تلوار کو دفن کر دینا چاہیے اور میں نے تلوار کو دفن کر دیا۔''28ؔ

غرض قاضی عبدالستار نے اپنی تخلیقی ذہانت کا ثبوت دیتے ہوئے ایک مسئلہ کو خوبصورتی سے حل کر دیا ہے تا کہ اس پر کوئی سوال قائم نہ ہو سکے اور تخلیقی یا تاریخی بددیانتی کو کوئی الزام ان پر عائد نہ ہو سکے۔

صلاح الدین کی موت کا ذکر قاضی عبدالستار نے نہایت اندوہ ناک انداز سے کیا ہے اور دمشق کی گلی کوچوں میں جس طرح صلاح الدین کی موت پر کہرام مچا ہوا تھا اور اس کی موت پر آنسو بہائے جا رہے تھے اس کا منظر بھی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔

الغرض اس ناول میں قاضی عبدالستار نے مکمل طور پر صلاح الدین کی شخصیت کے مختلف گوشوں کی رونمائی کی ہے اور اسے ایک فیاض سلطان کی حیثیت سے پیش کیا ہے جو حقیقت پر مبنی ہے اس کے علاوہ انھوں نے پلاٹ کو منظّم اور ترتیب وار پیش کیا۔

اسلوب نگاری کی حیثیت سے یہ ایک لافانی تخلیق ہے جو اپنے نادر انداز بیان، پر شکوہ تشبیہات و استعارات کے سبب قاری کو متوجہ کرتی ہے۔ناول کی ابتدا میں مشکل الفاظ کا سامنا کرنا پڑتا ہے مگر جیسے ناول آگے بڑھتا ہے الفاظ آسان، اسلوب گڑھے ہوئے دکھائی دینے لگتے ہیں۔کم سے کم الفاظ میں کسی واقعہ کو کتنی خوبصورتی سے پیش کیا جا سکتا ہے یہ ناول اس کی بہترین مثال ہے۔

ڈاکٹر طارق سعید قاضی عبدالستار کا گرینڈ اسٹائل اسلوب جلیل میں لکھتے ہیں:

''دراصل لانجائنس جس شان و شکوہ کا متلاشی تھا اس کا ظہور بعد میں قاضی عبدالستار میں

28ؔ:اسرار و گفتار۔راشد انور راشد۔ص:261

ہوا۔طرز نگارش کی اسی قوت وشوکت کہ سماعت کے پیرا کھڑ جائیں، یا قاری کے الفاظ کے سیلاب میں بہہ جائیں۔یا مواد کے انتخاب اوراس کی تنظیم کوطرز نگارش کے ذریعہ ہی وحدت تاثر کی ایسی شکل دینا جیسے ایک متحدہ زندہ وجود ہواور اس میں کسی عاشق کے اضطراب وجنون کی ایسی لہریں پیدا کریں جس سے اثر انگیزی میں بے شمار اضافہ ہوجائے۔صرف اسلوب جلیل کے ذریعہ ہی ممکن تھا جو بے شبہ قاضی عبدالستار نے تن تنہا سے انجام دیا۔29؎

ڈاکٹر عبدالغفور ''قاضی عبدالستار بہ حیثیت ناول نگار'' میں صلاح الدین کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

'' قاضی صاحب کے دوسرے ناولوں کی طرح ''صلاح الدین ایوبی'' بھی مقصد سے خلای نہیں ہے ان کا مقصد سلطان صلاح الدین ایوبی کے کارنامے، اس کی بہادری، انسان دوستی، مساوات، اخوت اور سادگی کو بیان کر کے تاریخ کوادب وفن کا روپ دنیا تو ہے،ہی ساتھ وہ ان کے حقائق کے آئینے میں موجود اسلامی دنیا کے مسائل کو دیکھتے ہیں۔ کہانی صلاح الدین ایوبی کی بیان کرتے ہیں لیکن ان حالات کو پیش نظر رکھتے ہیں جو آج اور قدیم دور میں مشترک ہیں اور ہم کوٹھوس ذہن سے سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔''30؎

پروفیسر صغیر افراہیم قاضی عبدالستار کے تاریخی ناولوں کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''قاضی صاحب کا طرز تحریر موضوع اسلوب کے ساتھ بدلتا رہتا ہے۔تاریخ کوفکشن کا موضوع بنا کر ادیب بہت بڑی ذمہ داری قبول کرتا ہے۔وہ کرید وجستجو جو قاری کو صفحات الٹنے پر مجبور کرتی ہے، تاریخی موضوع میں ناپید ہو جاتی ہے۔اس لیے کہ پڑھنے والا تاریخی کرداروں کے انجام سے آشنا ہوتا ہے اور مصنف کا طرز فکر تاریخی حقائق سے چشم پوشی اختیار نہیں کرسکتا۔۔۔قاضی عبدالستار نے اپنے تاریخی، طبقاتی اور تہذیبی شعور اور مطالعے ومشاہدے کی وسعت کے ذریعے تاریخی ناولوں میں تابناکی پیدا کی ہے۔ماضی کی تہذیب، اس کا جاہ وچشم، رزم وبزم اوراس کے پس پردہ اقتدار کی دیوانی خواہشوں اوراس کی تکمیل کے حربوں کے جواز کو قاضی صاحب نے نہایت فنکارانہ ڈھنگ سے

29؎ اسلوب جلیل قاضی عدلستار کا گرینڈ اسٹائل۔ڈاکٹر طارق سعید۔حوری نورانی لاہور۔سن اشاعت 1993 ص 60

30؎ قاضی عبدالستار: بحیثیت ناول نگار۔دانش کدہ پٹنہ۔سن اشاعت 2016 ص 217

پیش کیا ہے۔تاریخی حقائق کوتخیلی قوت سے آراستہ کرنے کے لیے انھوں نے ایک ایسا اسلوب وضع کیا ہے جو اپنی آراستگی اور اجنبیت کی بنا پر قاری کو نہ صرف ماضی کی محل سراؤں اور رزم گاہوں میں لا کھڑا کرتا ہے بلکہ ذہنی کچوکے بھی لگا تا ہے۔'' 31؎

منظر نگاری: منظر نگاری میں قاضی عبدالستار کوملکہ حاصل ہے۔قاضی عبدالستار کا یہ ناول منظر نگاری سے بھرا پڑا ہے قاضی صاحب نے پورے ناول میں ہر ایک مناظر کوسبھی جزئیات کے ساتھ پیش کیا ہے جس کو پڑھ کر حیرت انگیز مسرت ہوتی ہے اوراس کی تخلیقی اپج اور ذہنی استعداد کی تعریف کرنی پڑتی ہے کہ انھوں نے کس سے ایک ایک مناظر کوخوبصورت الفاظ کے گل بوٹے سجا کر پیش کئے ہیں۔ یہاں ایک منظر پیش کیا جا رہا ہے جب صلاح الدین بیمار ہے اوراس کے نین ونقشہ سے جلالی روعب ودبدبہ جھلک رہا ہے۔اقتباس:

''وہ چاندنی کے دوگز اونچے ایوان پر تکیوں کا سہارے نیم دراز تھے۔نصف جسم پر زرد الوان پڑا تھا۔ زرد مخمل کی صدری سے کفنان کا گلو بند نظر آ رہا تھا۔صدری کی چست آستینوں کے تنگ کف مشکی مخمل کے تھے۔ پتلی نوکدار داڑھی کے دونوں کنارے سیاہ تھے۔طر پوش کے نیچے کالے گنجان ابروؤں کے سائے میں نیم خفدری سی بیمار آنکھوں میں شہنشاہی کا جلال چمک رہا تھا۔ زردی مائل گندمی ستے ہوئے چہرے پر پسینے کے قطرے نظر آ رہے تھے۔مصوروں کے سے خوبصورت ہاتھ پہلوؤں میں پڑے تھے۔ سرہانے کھڑے ہوئے دو حسین غلام بادشاہوں کا لباس پہنے مور چھل ہلا رہے تھے۔'' 32؎

اکثر ناقدین ادب نے یہ شکایت کی ہے کہ قاضی عبدالستار نے اس ناول میں کوئی میدان جنگ بیان نہیں کیا ہے جبکہ صلاح الدین بیت المقدس کا ایسا فاتح بیان ہے جس نے یورپ کی پوری سیاست کو بدل دیا اور بیت المقدس کوصلیبیوں سے آزاد کرا کے مسلمانوں کے ہاتھ میں دے دیا جو ایک فیصلہ کب جنگ تھی جبکہ داراشکوہ میں انھوں نے ساموگڈھ کی جنگ کو زیادہ اہمیت دی ہے۔میرا خیال ہے کہ قاضی صاحب نے اس ناول میں اکثر جگھوں پر مناظر کے اذکا کئے ہیں اس کے علاوہ تاریخ میں یہ شواہد موجود ہیں کہ اکثر صلاح الدین نے محاصرے کے ذریعہ جنگ میں جیت حاصل کی اس کے علاوہ انھوں نے رچرڈ سے کھلے میدان

31؎ افسانوی ادب کی نئی قراءت۔پروفیسر صغیر افراہیم۔ایجوکیشنل بُک ہاؤس علی گڈھ۔سن اشاعت 2011 ص 77

32؎ صلاح الدین ایوبی۔ناول۔قاضی عبدالستار۔ص 165

میں جنگ کرنی چاہی مگر رچرڈ جو اکثر لڑائی سے گھبراتا تھا وہ کبھی میدان میں صلاح الدین سے روبرو ہو کر لڑائی نہیں کی اس کے علاوہ اس ناول کا فوکس زیادہ بیت المقدس پر اس کی فتح یابی کے بعد کی صورت حال سے اس لیے جنگی مناظر کم دکھائی دیتے ہیں

ڈاکٹر یارون ایوب قاضی عبدالستار کے ناول ''صلاح الدین ایوبی'' پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''صلاح الدین ایوبی کی کمزروی یہ ہے کہ اس میں کوئی لڑائی اس طرح پیش نہیں کی گئی ہے جس طرح داراشکوہ میں ساموگڈھ کی لڑائی پیش کی گئی ہے۔ شاید اس کا سبب یہ رہا ہو کہ اس میں صلاح الدین ایوبی کے عہد کی عکاسی کی گئی ہے اور جس میں ایسی کوئی فیصلہ کن جنگ ہوئی ہی نہیں جو ہندوستان کی تاریخ کی طرح اسلامی تاریخ کا رخ موڑ دیتی۔''33

صلاح الدین تاریخی مجاہدین کا ایسا کردار ہے جس نے بیت المقدس حاصل کرنے کے بعد صلیبیوں، یہودیوں اور دیگر مذاہب کے لوگوں کا ایک قطرہ خون بہائے بغیر سب کو امن کے ساتھ مقدس زمین چھوڑنے کی دعوت دی۔ تاریخ میں ایسی نظیر کہیں بھی دکھائی نہیں دیتی۔ صلاح الدین ایوبی کے اس عمل انسانیت نے تاریخ نگاروں اور بڑے سے بڑے سپاہیوں، جرنلوں اور سپہ سالاروں کو آج بھی محو حیرت میں ڈالے ہوئے ہے اور اس کے اوپر ریسرچ کے دروازے کھلے ہوئے ہیں کیا ایسا کوئی کردار ہوسکتا ہت جس نے اتنے امن اور شانتی کا ثبوت دیا ہے۔

اگرچہ ناول ہم جیسے قارئین کو مشکل میں بھی ڈال دیتا ہے اور اکثر الفاظ کے معنی لغت میں تلاش کرنے پڑتے ہیں اور قدم قدم پر لغت کا سہارا لینا پڑتا ہے اس کے بارے میں ناقدین بہتر فرمائیں گے کہ ایسی حالت میں ناول کو کسی مقام و مرتبہ پر پرکھا جائے۔ اس کے علاوہ قاضی صاحب کا یہ خاص وصف ہے کہ وہ کم سے کم جملوں میں بات کہہ جاتے ہیں اگر ان کا قاری کم توجہ سے ناول پڑھتا ہے تو اکثر واقعات کا سرا ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے جس کو سطر بہ سطر دوبارہ پڑھنے کی ضرورت ہوتی ہے اس لیے قاضی عبدالستار کے ناولوں کو بہ غور پڑھنے کی ضرورت پڑتی ہے تاکہ جو بات بیان کی ہے وہ مکمل طور پر سمجھ میں آجائے۔

33: اردو ناول پریم چند کے بعد۔ ہارون ایوب اردو پبلیشر لکھنوب۔ سن اشاعت 1978 ص 237

بہر کیف قاضی عبدالستار کا یہ ناول جس نے انھیں پہلا غالب ایوارڈ دلایا اپنے آپ میں اہمیت کا حامل ہے اور ایک فاتح اور سپہ سالار پر خوبصورت ناول لکھنے کے لیے قاضی عبدالستار مبارک باد کے مستحق ٹھہرائے جاتے ہیں۔

پروفیسر سعید الظفر چغتائی صلاح الدین ایوبی ناول کی مختصر مگر جامع تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''صلاح الدین ایوبی پر پوری کتاب شعور کے دھارے (Stream of Consciousness) کی تکنیک میں تحریر ہے اور ایک وقتی اور ایک مقامی کی اس شرط پر ڈھالی گئی ہے جو برنارڈ شا نے ڈرامے کے لیے لازمی قرار دی تھی۔ فرانس کے سفیر کی بات سن کر مرض الموت میں صلاح الدین پوری رات اپنے ماضی پر نظر ڈالتا ہے اور ''اب کچھ نہ کر سکنے'' کی حسرت میں دم توڑ دیتا ہے۔ مختصر سائز کے 192 صفحات کا لفظ لفظ پکارتا ہے کہ مجھے قاضی کے قلم نے جنم دیا ہے آج پڑھتے وقت ایوبی کے دمشق کے تمول کے داستان بہت مبالغہ آمیز لگتی ہے اور پر یقین نہیں آتا۔ مگر تحریر کا بہاؤ جب تک کتاب ختم نہیں ہو جاتی،۔ پڑھنے والے کو کمبل چھوڑنے نہیں دیتا۔ صنفی طور پر ناول میں ابن صباح کی قائم کردہ اس باطنی تحریک عذا یتاں کا دل بذ نہ بیان ملتا ہے جو آج کی دنیا میں ست میں جو طلسماتی دنیا بسا دی ہے اس کا بدل عالمی ادب میں کہیں اور نہیں مگر صلاح الدین ایوبی کے چند صفحوں میں جنت ارضی کی ایک جھلک ضرور مل جاتی ہے۔''[34]

پروفیسر عبدالمغنی قاضی عبدالستار بحیثیت ناول کے موضوع کے تحت قاضی عبدالستار کے فنی واقعہ یا قصہ نگاری کے متعلق لکھتے ہیں:

''ناول نگاری میں اصل اہمیت ماجرا سازی اور قصہ خوانی کی ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے قاضی عبدالستار نے اپنے موضوعات کے ماحول کی حقیقی جزئیات کو جس تفصیل وتشریک کے ساتھ بیان کیا ہے وہ بہت دلچسپ اور حقیقت اگروز ہے اس کو پڑھتے ہوئے ایک گزرے ہوئے زمانے اور معاشرے کی تصویر نگاہوں کے سامنے روشن ہو جاتی ہے۔ ماضی زندہ ہو کر حال بن جاتا ہے یا قاری کا ذہن ماضی کے جلووں میں گم ہو جاتا ہے۔

34: نذر قاضی عبدالستار۔ پروفیسر محمد غیاث الدین۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی۔ سن اشاعت: 2006ء۔ ص: 233-232

اس طرح گزشتہ واقعات اور مردہ کردار چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ ادب کا منظر نامہ ایک فلم کی اسکرین بن جاتا ہے اور ہم گردوپیش سے بے نیاز ہوکر تھوڑی دیر کے لیے اس میں کھو سے جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں خاص کر میدان جنگ کے ساز وسامان اور شاہانہ درباروں کی رسوم وروایات سے ناول نگار کی واقفیت حیرت انگیز ہے۔''35

تاریخی ناولوں کی اہمیت اور معنویت کے لحاظ سے ڈاکٹر محمد شاکر نے اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

''اردو کے تاریخی ناولوں میں اسلاف کے کارنامے فتوحات کے نغمے اور جنگوں کے نقشے پیش کئے گیے ہیں اور ان کارناموں کی یاد تازہ کر کے خواب غفلت سے قوم کو بیدار کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن وہی ناول شہرت ومقبولیت کے حامل ہوتے ہیں جن میں مخصوص دور میں عوامی زندگی اور سیاسی حالات وواقعات کی آئینہ سامانی کے ساتھ ساتھ تاریخی اور ذاتی مسائل کی ہم آہنگی اور تاریخی واقعات سے افراد کی فطرتوں میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کے علاوہ اس خاص دور میں تاریخ کی عظیم شخصیات کے اثرات پیش کئے جاتے ہیں۔ لیکن اردو میں ایسے ناول شاذ ونادر ہیں۔ عام طور پر تاریخی ناول نگار تاریخ کے پس منظر میں کوئی نہ کوئی داستان عشق سناتے دکھائی دیتے ہیں۔''36

☆☆☆

35: نذر قاضی عبدالستار۔ پروفیسر محمد غیاظ الدین۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی۔ ص 202

36: اردو میں تاریخی ناول نگاری (آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد)۔ ڈاکٹر محمد شاکر، کتابستان چندوارہ، مظفر پور۔ 2003۔ ص 137

داراشکوہ

''داراشکوہ'' قاضی عبدالستار کا ایک عمدہ تاریخی ناول ہے اپنی پیش کش اور زاویے نگاہ کے سبب اردو کے تاریخی ناولوں اپنی ایک الگ شناخت اور شان رکھتا ہے۔ یہ ناول 1968 میں علی گڑھ میں شائع ہوا اور اس کے شائع ہوتے ہی قاضی عبدالستار کا نام تاریخی ناول نگاروں کی فہرست میں اول مقام پر پہنچ گیا۔ محض ایک ناول کی بدولت اس مقام پر پہنچنے کا سبب یہ ہے کہ قاضی عبدالستار نے فیکٹ اور فکشن کے دونوں کے ساتھ انصاف کیا۔ تاریخ کی اہمیت کو بھی برقرار رکھا اور فکشن کے حسن کو بھی مجروح نہیں ہونے دیا۔ دونوں کے پیش کش میں فنکارانہ توازن سے کام لیا اور دونوں کے امتزاج سے فن کاری کا خوبصورت نمونہ پیش کیا۔ ادبی حسن کے بیان میں تاریخ کی حقیقت کے دامن کو کہیں بھی ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے اس کی بھرپور کوشش کی ہے یہ وہ قاضی عبدالستار کا وہ وصف ہے جس کی بدولت وہ اپنے پیش رووں پر شفقت لے گئے۔ قاضی صاحب سے پہلے جو ناول نگار تاریخی میدان کے ماہر سمجھے جاتے تھے ان کے یہاں جذباتیت اور ہیرو پرستی کی ایک لامتناہی داستان دکھائی دیتی تھی۔ لیکن قاضی عبدالستار نے تاریخ کو ناول کے پیرائے میں بیان کرنے سے پہلے معروضیت کو پیش نظر رکھا اور انھوں نے عہد مغلیہ کے ایک مشہور شہزادے اور ولی عہد دارا شکوہ کی سیاسی زندگی کے عروج وزوال کو بہترین انداز میں پیش کیا۔ ڈاکٹر انوار احمد لکھتے ہیں:

> ''اردو میں تاریخی ناول کا ذکر آتے ہی قاری کی یادداشت میں ماروائی کردار، محیرالعقول واقعات اور عقیدے کی جذباتیت سے بندھی تاریخ اس طرح ابھرنے لگتی ہے کہ ہجوم کو وقتی طور پر نعرے فراہم کرنے والے شعبدہ ساز ادیب کے منصب پر براجمان دکھائی دینے لگتے ہیں، حالانکہ تاریخی افسانے اور تخلیقی عمل کے باہمی تعلق پر غور کرنے سے موجود موہوم اور ممکن کے پیچیدہ رشتے کا احساس ہوتا ہے۔ اور دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کا وہ ڈرامہ رزمیہ (شاہنامہ) اور افسانہ شاہکار شعروادب کی مثال کے طور پر نمایاں ہوتا ہے جس نے اپنے تانے بانے تاریخ سے فراہم کئے۔''

جس طرح تاریخ، شعور و فلسفہ تاریخ اور تاریخ کے دائرے کار کو درباری مورخ محدود پابند کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ اسی طرح تاریخی ناول کو منشیات کے درجے پر لے جانے والے اس صنف ادب کے امکانات کی ہمیشہ کے لیے ختم یا مشکوک کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ عزیز احمد قاضی عبد الستار، انتظار حسین اور قرۃ العین حیدر میرے دعوے کی روشن دلیلیں ہیں۔''[1]

قاضی عبد الستار نے راشد انور راشد جو دیئے گئے اپنے انٹرویو میں انھوں نے ناول دارا شکوہ پر لمبی بات کی ہے۔ قاضی عبد الستار کہتے ہیں:

''داراشکوہ کے بارے میں مشہور ہوا کہ پاکستان میں اس کی جلدیں جلائی گئیں اور کراچی پریش کلب میں جلائی گئیں۔ جب میں کراچی گیا اور مجھے کراچی پریس کلب میں مدعو کیا تو مجھے ڈر تھا کہ دیکھیے کیا سلوک ہوتا ہے لیکن ڈیڑھ دو سو کا مجمع تھا۔ میرا خیال ہے کہ فرداً فرداً ہر شخص نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور تقریر کی فرمائش کی۔ تقریباً ہر مورخ نے اورنگ زیب کی مذہبی حیثیت کی پیش کش میں زمین و آسمان کی قلابے ملا دیے اور اس کی عظمت کے بیان میں چار چاند لگا دیے میں نے جب پڑھا تو مجھے محسوس ہوا کہ اورنگ زیب غاصب تھا۔ اس لیے کہ ساموگڈھ کی لڑائی داراشکوہ سے تھی شاہ جہاں سے نہیں تھی۔ اس کا فرض تھا کہ وہ داراشکوہ کو شکست دے کر آگرے آتا اور اپنے باپ کے قدموں پر سر جھکا دیتا لیکن اس نے اپنے بیٹے کو بھیج کر قلع پر قبضہ کر لیا، باپ کو نظر بند کر دیا۔ پانی بند کر دیا تا کہ قلع کے ملازمین کی اکثریت قلعہ چھوڑ کر بھاگ جائے۔ حکم دیا گیا کہ قلع سے جو جانا چاہتا ہے وہ جائے لیکن کوئی شخص قلعے کے اندر نہیں جا سکتا۔ ایک بہت بھیانک واقعہ ہے جس کی روایت موجود ہے کہ اورن زیب نے داراشکوہ کا سر کاٹ کر سونے کے برتن میں بند کر کے آگرے بھیجا اور حکم دیا کہ جب شاجہاں دسترخوان پر بیٹھے تو یہ سر پیش کیا جائے۔ چونکہ اس بیان کی شہادت پر مجھے شبہ ہے، میرے پاس کوئی سند نہیں ہے۔ اس لیے میں نے اپنے ناول میں اس کا ذکر کیا ہے، لیکن اس واقعے پر مجھے یقین ہے کہ مولوی صاحب (اورنگ زیب) نے یہ حرکت یقیناً کی ہوگی مجھے پوری Mughal Dynsty میں اورنگ زیب سے زیادہ ظالم اور جابر، قرآن پر ہاتھ رکھ کر وعدہ فراموش

1: قاضی عبد الستار کے تین ناولٹ۔ ایک تنقیدی مطالعہ۔ ڈاکٹر انوار احمد۔ مشمولہ طلوع افکار کراچی۔ فروری 1993

کرنے والا اور کوئی شخص نظر نہیں آتا۔ یعنی جب داراشکوہ کا بڑا بیٹا سلیمان شکوہ گرفتار ہو کر آیا تو اس نے اورنگ زیب سے یہ گزارش کی تھی کہ مجھے قتل کر دیا جائے، لیکن قید کر کے پوست (افیون کی کلیاں) نہ پلایا جائے۔ پوست اس لیے پلائی جاتی تھی کہ دماغی توازن خراب ہوتا جاتا تھا اور آہستہ آہستہ آدمی مر جاتا ہے۔ اورنگ زیب نے وعدہ کیا کہ نہیں تمھارے ساتھ ایسا کچھ نہیں ہوگا لیکن سلیمان شکوہ کو گوالیار کے قلعے میں قید کیا۔ ایک سال تک اسے پوست پلائی گئی جب وہ نہیں مرا تو اسے گلا گھونٹ کر مارا گیا۔ یہ تھے ہمارے اورنگ زیب عالمگیرؒ۔ اس سے زیادہ ظالم اور جابر تو شاید چنگیز اور تیمور بھی نہیں تھے کہ چنگیز اور تیمور کے بارے میں ظلم کی کوئی ایسی نظیر نہیں ملتی جس میں اس نے باپ، بھائی اور بھتیجے کے ساتھ یہ سلوک کیا ہو۔

پوری مغل تہذیب میں داراشکوہ سے زیادہ سیکولر مزاج کا عالم فاضل کوئی شخص نہیں تھا۔ اس کے یہاں اکبر کی وسیع النظری اور وسیع القلبی کے ساتھ ساتھ علم و فضل کی جو شان ملتی ہے وہ مغلوں کے کسی کردار کو میسر نہیں آتی۔ اورنگ زیب کا سارا علم Sectarian تھا۔ وسعیت قلبی اور سرچشمی کے الفاظ سے وہ شخس ناواقف تھا۔ اس کے علاوہ شگن مولوی صاحب (اورنگ زیب) بھی لیتے تھے اس کے ثبوت بھی موجود ہیں۔''2

قصہ: ''داراشکوہ'' ایسا ناول ہے جہاں اس نے قاضی عبدالستار کو بہ حیثیت ایک تاریخی ناول نگار شناخت قائم کی ساتھ ہی ناول تنازعہ کا سبب بھی رہا۔ جب یہ ناول ''کتاب'' رسالے لکھنؤ سے قسط وار شائع ہو رہا تھا اس وقت اس کے تاریخ اور تاریخی واقعات کو لے کر شعبۂ تاریخ کے پروفیسر اقتدار عالم اور عہد حاضر کے ممتاز نقاد شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کے بیچ خوب تلخ و شیریں بحث و مباحثے ہوئے اور دونوں نے ناول میں پیش کیے گئے مختلف واقعات پر اپنی اپنی رائے رکھی۔ ذاتیات پر بھی حملے ہوئے ساتھ ہی یہ بحث بھی سامنے آئی کہ تاریخی ناول کو کتنی آزادی ہونی چاہیے کہ وہ حقیقی تاریخی واقعات پر قدغن نہ لگا سکے۔ بعد میں یہ نتیجہ نکلا کہ ان واقعات کو پیش کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں جس کی پیش کش سے تاریخی حقائق پر کوئی آنچ نہ آئے اور اس کا تاریخ پن مجروح نہ ہو۔ ساتھ ہی ناول نگار کو اتنی آزادی ہونی چاہیے کہ وہ ناول کی دلکشی میں اضافہ کرنے کے لیے کچھ ایسے واقعات کو گڑھ سکتا ہے مگر یہ تاریخی واقعات صرف تخئیل کی پرواز نہیں ہونا

2۔ اسرار و گفتار۔ راشد انور راشد۔ عرشیہ پبلی کیشنز۔ نئی دہلی۔ سن اشاعت 2014 ص 258-257

چاہئے۔ بلکہ اس کی زبانی روایت یا سینہ بہ سینہ داستان موجود ہو۔ داراشکوہ یا مغلیہ سلطنت کا تاریخی سورج اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ روشن ہے اس لیے ناول نگار کے غیر تاریخی واقعات کی ذرا سی سیاہی زیادہ بڑی دھبّہ نظر آنے لگتی ہے۔ اس ناول میں مختلف ایسے تاریخی واقعات بیان کیے گئے ہیں جس پر شبہ ہے اور نقادوں نے اپنی آرائے رکھی ہیں۔ ساتھ ہی تاریخ دانوں نے بھی اپنے قلم خشک کئے ہیں۔ ناول میں یہ صاف نظر آتا ہے کہ داراشکوہ کو لے کر قاضی صاحب کے ذہن و دل میں ہمدردی کے جذبات تھے وہ صاف طور پر عیاں ہے۔ قاضی عبدالستار اورنگ زیب کو ظالم اور جابر حکمراں مانتے تھے ان کے مطابق پوری مغل سلطنت میں اورنگ زیب جیسا مذہبی اور کٹر انسان کوئی نہ تھا جس نے سلطنت اور حکومت کے لیے اپنے بھائیوں کا قتل کیا اور باپ کو قیدی بنا کر رکھا بھتیجے کو وعدہ کرنے کے باوجود افیم کی پوست پلائی گئی جس کی وجہ سے دھیرے دھیرے پاگل ہوتے ہوئے نشے کی حالت میں مرا۔ داراشکوہ جیسے روحانیت سے لگاؤ رکھنے والے بھائی کو قتل کے بعد بغیر غسل و کفن اور جنازے کے دفن کرا دیا۔ قاضی صاحب نے بچپن سے ہی اورنگ زیب کے ان تمام غیر انسانی اور ظالم و جابر شخصیت کے بارے میں اسکول اور کالج میں پڑھا اور سنا تھا۔ قاضی صاحب ناول کی دنیا میں وارد ہوئے تو اپنی اس ذہنی فکر اور نفرت کے اظہار کے لیے داراشکوہ لکھ ڈالا۔ تاریخی اور نیم تاریخی واقعات کی کشمکش سے ناول کی فضا بندھی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ داراشکوہ کے بارے میں تاریخ کا طالب علم اس بات سے اچھی طرح واقف ہے کہ دارا نے کسی بھی جنگ یا فوجی کاروائی میں دست بہ دست شریک نہیں ہوا وہ ہمیشہ محل میں اپنے باپ شاہجہاں کے قریب اس کا منظور نظر بنا رہا۔ دارا شکوہ کی علمیت، اس کی روحانیت اور اس کی مذہب کے تئیں مساویانہ سلوک سے قطع نظر ایک حاکم کو مغل سلطنت کا حکمراں بننے کے لیے ضروری تھا کہ وہ اپنے اندر سیاسی سوجھ بوجھ دانش مندی، ہوش مندی کو جلا دے مگر اس کے کردار کی فطری کمزوریاں نہ تو اسے ہیرو بننے دیتی ہیں اور نہ ہی اس کو المیہ کردار بننے دیتی ہیں اور ناول میں کوئی خاص توجہ حاصل نہیں کر پاتا ہے۔

داراشکوہ نے قندھار کی مہم کی باگ ڈور سنبھالی مگر ایک وسیع فوج، ساز و سامان کی فراوانی کے باوجود ناکام رہا ساتھ ہی ساموگڈھ کے میدان میں بھی اس کے پاس شاندار اور بڑے بڑے فوجی سپہ سالاروں کا ایک کارواں تھا مگر اس کے باوجود بھی اپنی تقدیر کی سیاہی کو اپنے مقدر پر انڈیل دیا۔ ان تمام ناکامیوں کا ٹھیکرا

پھوڑنے کے لئے قاضی عبدالستار نے سازشوں کا سہارا لیا تا کہ اپنے ہیرو کی ناکامی کو چھپایا جا سکے۔اس کے علاوہ شاہ جہاں داراشکوہ کو بہت زیادہ عزیز رکھتے تھے اور اس حد تک انھوں نے داراشکوہ کو ہمیشہ اپنے قریب رکھا باقی تینوں بیٹوں کو وہ الگ الگ مہم پر بھیجتے تھے مگر دارا کو انھوں نے ایسے فرائض سے بعض رکھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دارا کے اندر فوجی صلاحیت دھیرے دھیرے سلب ہوتی گئی۔

قندھار کی مہم جو اورنگ زیب سر نہ کر پایا وہ مہم داراشکوہ مکمل کرنا چاہتا تھا اور اس نے زبردستی شاہ جہاں کو اس مہم کے لیے تیار کیا۔کروڑوں خرچ کرنے کے بعد بھی وہ ناکام رہا۔شاہ جہاں کو اس ناکامی کی امید پہلے سے ہی تھی۔اس مہم کے بارے میں بنارسی پرساد سکسینہ لکھتے ہیں:

''بالآخر محاصرہ کو طول دینے کی بے اثری کا یقین شاہ جہاں کو آ گیا یہ بھی وہ مان گیا کہ قندھار نا قابل تسخیر ہے۔اس پر چڑھائی کرنا پاگل پن ہے اس لیے اس نے دارا کو واپس بلا لیا۔دارا 27 ستمبر کو قندھار سے روانہ ہو کر اکتوبر میں ملتان پہنچا۔اس کے ایک ماہ کے بعد لاہور آ گیا۔''3

اس مہم کی ناکامی کو قاضی عبدالستار نے اپنے ہیرو کو بچاتے ہوئے اس انداز میں لکھا ہے۔اور انھوں نے دارا کی اس ناکامی کا ٹھیکرا اورنگ زیب کی سیاسی چالوں کو ٹھہرایا ہے۔جہاں روشن آرا اور اورنگ زیب قندھار کی مہم پر بات کرتے ہوئے دیکھائی دیتے ہیں مگر دوسری مہم کی ذمہ داری خود اورنگ زیب کے پاس تھی اور اس وقت وہ مارچ 1647 میں ملتان کا گورنر تھا اور یہیں سے اس نے دونوں مہمیں انجام دیں تھیں۔دوسری مہم کی ناکامی کے بعد 17 جولائی 1652 کو دکن کا گورنر بنا دیا جاتا ہے اس بات کا ذکر یہاں اس لئے کیا جا رہا کہ جو مہم اورنگ زیب سر نہ کر سکا وہ بھلا داراشکوہ جیسے جنگی علوم وفنون سے نابلد شہزادے سے کیسے ممکن تھی ناول کو افسانوی موڈ دینے کے لئے قاضی صاحب نے لیلا اور میر آتش سید جعفر غداری کا بیان کرتے ہیں یہ صرف ایک فرضی واقعہ ہے بنارسی پرساد سکسینہ نے میر آتش سید جعفر نام کے کسی ایسے شخص کا نام ہی نہیں لیا ہے جو تاریخ میں موجود ہو۔اس کے علاوہ قاضی عبدالستار نے خود داراشکوہ کو بالواسطہ طور پر ایک جرنل کی خوبیوں سے مبرا دکھایا ہے۔اس کو اپنی فوج کو حکم اور فیصلہ کرنے کی کمی ہے اور وہ ضعیف اعتقادی سے گھرا ہوا انسان ہے جو جنگ کی فتح کے لیے صرف پنڈتوں جیوتسیوں پر یقین رکھتا ہے اور میدان جنگ میں

3: تاریخ شاہجہاں۔بنارسی پرساد سکسینہ۔مترجم اعجاز حسین۔قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان۔سن اشاعت 2015 ص 293

ہوتے ہوئے شعر وشاعری سنتا ہے۔اقتباس ملاحظہ ہو:

''جوگیوں اور ساحروں کے ہجوم میں گھوڑے پر سوار دارا اس تاریخ ساز محاصرے کے لیے فیصلہ کن احکام صادر کر رہا تھا۔لیکن معلوم وہتا تھا جیسے وہ قہار لشکر کے امیروں کو حکم نہیں دے رہا ہے بلکہ سرمد کی خانقاہ میں مسند پر کھڑا ہوا وجودیت کے موضوع پر خطبہ دے رہا ہے اور حاضرین دم بخود بیٹھے ہیں۔گھوڑوں کے مہمیز سواروں کے نیام اور ہاتھیوں کی سونڈوں میں لپٹی ہوئی زنجیریں کھنک اٹھیں تو معلوم ہوتا جیسے سننے والوں نے پورے ادب اور احترام کے ساتھ کسی نازک نکتے پر داد دی ہو۔اس کے دماغ میں ایک ہلچل مچی ہوئی تھی۔رگ وید کی عبارت، اپنشدوں کے ترجمے، جوگیوں کے بچن اور ساحروں کے قول سب ایک دوسرے سے گڈ مڈ ہوگئے۔''4

داراشکوہ کی شہرت عوام کے بیچ ایک کمزور سپاہی کی تھی اس میں منظّم اور حاکم کی بھی کمی تھی۔اس بات پر شاہ جہاں بھی پیار سے سمجھاتے تھے۔دارا قندھار کی مہم سے پہلے اپنے سپہ سالاروں سے مشورہ لینے کے بجائے تانتدکوں اور مولویوں سے مشورہ کر کے حملے کا دن متعین کرتے ہیں۔دارا ان تمام ضیف اعتقادی پر خطیر رقم خرچ کرتے ہیں۔اس کے علاوہ وہ آسانی سے ہر کسی کی بات پر یقین کر لیتا تھا۔ساموگڈھ کی جنگ میں بھی خلیل اللہ خاں جو اورنگ زیب کارساز تھا اس نے دارا سے کہا کہ آپ یہ جنگ جیت رہے اس لیے ہاتھی سے اتر جائیں اور گھوڑے پر سوار ہوکر لڑائی کریں جب کہ ناول میں یہ بات موجود ہے کہ داراشکوہ کو ناول کی ہیروئین لیلا نے مطلع کیا تھا خلیل اللہ خاں کی غداری کے بارے میں پھر وہ اس کی بات پر اتنی آسانی سے یقین کیوں کر لیتا ہے؟ اورنگ زیب کی بنائی اس چال کو دارا سمجھ نہیں پاتا اور ہاتھی سے اتر گیا۔دارا کی معصومیت اور جنگی ناتجربہ کاری اس کی شکست کا سبب بنتی رہی اس کا ہاتھی سے اترنا تھا کہ فوج کو لگا کہ دارا شکوہ مارا گیا اور پھر ان کی فوج میں افراتفری مچ گئی۔اس کے دارا کے اعلیٰ اور بہترین سپہ سالار مارے جا چکے تھے اور اس کا ہاتھی بھی زخمی ہو چکا تھا دارا کے پاس پیشہ ور فوجی بھی نہیں تھے اور وہ جلدی پیچھے ہٹنے لگے اس طرح سے اورنگ زیب کی فوجوں نے بری طرح سے دارا کی فوج کا قتل عام کیا۔اور اس کے بعد وہ چند سپاہیوں کے ساتھ میدان جنگ چھوڑ کر بھاگ گیا اور پھر وہاں سے فرار ہوکر افغانستان چلا گیا۔جہاں ملک

4: داراشکوہ (ناول) قاضی عبدالستار۔ص39

جیون نے دھوکے سے اسے اورنگ زیب کے حوالے کر دیا۔تخت وتاج کے حصول یابی کی جنگ کے بعد دارا کو زبردست ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور ایک غدار ملک جیون کی غداری کے بعد اسے دہلی لاکر ایک چھوٹے ہاتھی کی پشت پر بٹا کر گلی اور چوراہوں پر پھیرا گیا تا کہ دارا ایک عبرت کا نشان بن کر عوام کے دلوں پر چھا جائے۔قاضی عبدالستار نے اس عبرت آمیز منظر کو بھی اپنی بے پناہ الفاظ واسلوب کی بدولت نہایت رقت آمیز انداز میں پیش کیا۔اور پھر بازاروں میں یہ افواہ پھیلا کر کہ دارا کو گوالیار کی جیل میں لے جارہا ہے۔نذر بیگ نامی جلاد کو حکم دے کر دارا کا سر کٹوا دیتا ہے اور اس کے دھڑ کو ہمایوں کے مقبرے میں بے غسل وکفن کرا دیتا ہے اور شاہ جہاں کو اس کا سر پیش کرتا ہے تا کہ اپنے لاڈلے بیٹے کا انجام وہ اپنی زندگی میں ہی دیکھ لیں۔قاضی صاحب رقم طراز ہیں:

> ''لاہوری دروازے پر دھڑ کالٹکا دیا گیا اور چاندنی چوک کے چوراہے پر آویزاں کر دیا گیا۔تین دن کے بعد دارا کی میت کو غسل وکفن دیئے بغیر نماز جنازہ ادا کئے بغیر ہمایوں کے مقبرے میں دفن کر دیا گیا۔اسی مقبرہ کے سائے میں وہ دوسو برس بعد عالمگیر کا ایک جانشین ایک پوتا۔۔۔بہادر شاہ ظفر امان کی بھیک مانگتے آیا۔اسی مقبرہ کی فیصلوں کے نیچے دودماں عالمگیر کے چشم وچراغ مرزا مغل،مرزا قریش سلطان اور مرزا ابو بخت کو سمندر پار سے آئے ہوئے ایک نذر بیگ نے بے رحمی اور بے دردی کے ساتھ قتل کیا۔
> اس مقبرہ کی گود میں صرف ایک ایسا شہنشاہ آرام فرمائیں ہے جس کی اولاد نے ہندوستان کی تاریخ میں ایک سنہری جلد کا اضافہ کیا تھا بلکہ وہ دارا شکوہ بھی سو رہا ہے جو ایک ''تہذیب''ایک ''تمدن''ایک ''کلچر'' کو زندہ کرنے اٹھا تھا لیکن تقدیر نے اس کے ہاتھ سے قلم چھین لیا اور تاریخ نے اس کے اوراق پر سیاہی پھیر دی۔''[5]

دارا شکوہ اپنے تمام ظاہری اور باطنی نظریہ کے ساتھ ناول میں موجود ہے۔جہاں اس ظاہر رنگ و روغن قاضی عبدالستار نے نہایت عرق ریزی سے سجاتے ہیں وہیں چند ایک مقام پر اس کی فطری کمزوریوں کو بھی اجاگر کیا ہے۔دارا شکوہ کے جذباتی اور ایمانی مناظر کے ساتھ قاری کو بھی مجبور کیا ہے کہ وہ دارا کے تئیں اپنے ہمدردانہ جذبات کا اظہار کر سکے مگر جہاں دارا اپنے وسیع النظری کے ساتھ سامنے آتا ہے وہیں اس کے

5: دارا شکوہ(ناول)قاضی عبدالستار۔ص:164

کردار کی کمزوری بھی سامنے آجاتی ہے۔

اس بات کو بیان کرتے ہوئے شمس الرحمان فاروقی لکھتے ہیں:

''دارا کے کردار کی بنیادی کمزوری اسے المیہ کردار بننے نہیں دیتیں۔نتیجہ یہ ہے کہ ناول اپنے کردار کی رنگا رنگی، واقعات کی ہما ہمی ہی بن کے رہ جاتا ہے۔۔۔قاضی عبد الستار نے اپنی تمام تر ہمدردیاں دارا شکوہ کے لیے وقف کر دی ہیں اور کوشش یہ کی ہے کہ ان کا قاری بھی ان کے ہیرو سے اسی درجہ محبت رکھے جس درجہ وہ رکھتے ہیں۔لیکن خود کردار میں کسی ڈرامائی کشاکش کے نہ ہونے کی وجہ سے ہمیں ان کے ہیرو سے کوئی خاص ہمدردی نہیں ہوتی۔''6

اس نقطہ کے پیش نظر ناول میں مختلف مقامات پر ایسے ڈرامائی جذباتی منظر پیش کیے گئے ہیں جہاں باپ بیٹے کو جنگ کے لیے رخصت کرتے ہوئے آنسو بہاتا ہے یا پھر دارا کی بہنیں اس کو الوداع کہتی ہیں اس کے علاوہ آخر میں جب دارا قید کر کے لایا جاتا ہے ان تمام مناظر میں قاضی صاحب نے دارا کو ایک مظلوم شخص کے روپ میں پیش کیا ہے۔

مشرف عالم ذوقی لکھتے ہیں:

''دارا شکوہ پڑھتے ہوئے لگتا ہے کہ شاہ جہاں کا پانچواں بیٹا جس نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا، وہی یہ روداد رقم کر رہا ہے۔ یہ ماضی کا قصہ نہیں یہ آج کا قصہ ہے۔ لکھنے والے قاضی صاحب تاریخ کے محافظ قاضی صاحب اور اس دور کے عینی شاہد قاضی صاحب وہ حقیقت میں بادشاہ تھے جلال و جمال کی شاہانہ مثال۔''7

ساموگڈھ کی جنگ کسی ہندو مسلم نظریہ پر نہیں لڑی گئی تاریخ میں یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہیں اورنگ زیب اور دارا شکوہ دونوں طرف ہندو مسلم کی مخلوط فوجیں تھیں ۔ یہ سیاست کی جنگ تھی ناول کے آخر میں قاضی عبد الستار نے ناول کو قلم اور تلوار کی جنگ بنا کر پیش کیا ہے۔ جو ان کے نقطۂ نظر کی غمازی کرتا ہے۔۔ جہاں انھوں نے صرف یہ نہیں دکھایا کہ یہودی اور عیسائی ہی مکار، سازشی ، ہوس پرست اور وعدہ شکن ہوتے ہیں بلکہ ایسے لوگ کسی بھی مذہب میں مل سکتے ہیں۔اس ناول میں قاضی عبد الستار نے

6: فاروقی کے تبصرے۔شمس الرحمان فاروقی۔شب خون کتاب گھر الہ آباد۔سن اشاعت۔1968۔ص78

7 M.A Zauqi page Facebook date of post 19 september 2020

اورنگ زیب کوکٹر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے مگر تاریخ میں بہت سے ایسے شواہد ہیں جہاں اورنگ زیب کی وسعت قلبی اور وسیع النظری کے قصے موجود ہیں۔ اورنگ زیب کے اندر صلاحیتوں کا اندازہ کرنے اور انسان کے اندر کی خوبیوں کو پہچاننے کی قوت تھی اور اس نے ان تمام لوگوں کو دربار جگہ دی جو اس کے مستحق تھے اور اس نے ہندوؤں کو جاگیریں بھی پیش کی اس کے علاوہ کہا جاتا ہے کہ اورنگ زیب کے دربار میں جتنے ہندو وزرا تھے وہ کسی مغل سلطان کے پاس نہیں تھے اور بلاتفریق مذہب وملت لگان کے وصولی بند کرادی اور مفت میں اناج دینے کا سلسلہ شروع کیا۔

اورنگ زیب نے نشہ آوار چیزوں کی پیداوار اور کی خرید وفروخت پر پابندی لگادی ساتھ ہی ستی کی بے رحم رسم مختلف تہواروں عرس، محرم اور جاتراوں اس کے تہوار جس کو منانے سے عوام کو روکا جہاں جھگڑا اور فساد کا ڈر ہوتا تھا۔

''داراشکوہ'' ناول میں قاضی عبدالستار نے دارا کے کردار کے مختلف پہلوؤں پر زیادہ حصہ رقم کیا ہے وہیں اورنگ زیب کو وہ اہمیت حاصل نہیں ہوئی جس کا وہ حقدار تھا۔ ناول میں کے نام کے مطابق دارا کے احوال اور اس کے زندگی کے مختلف گوشوں پر نظر پڑتی ہے مگر آخر میں اورنگ زیب کا ہی نقشہ ذہن پر اپنی چھاپ چھوڑ دیتا ہے۔ ناول میں اورنگ زیب کا داخلہ روشن آرا سے بات چیت کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے اور یہاں پر قاضی عبدالستار نے جو نقشہ کھینچا ہے وہیں سے اسے ایک سازشی انسان کے روپ میں دکھایا گیا اس کے انداز تکلم ہی اس کے کردار کے مختلف گوشوں پر روشنی پڑتی ہے جہاں قندھار کے مہم کی ناکامی سننے کو ملتی ہے اور دوسری مہم کے لیے دارا کی پیش قدمی کو اس ساتھی اور راز دار بہن روشن آرا اپنی تشویش کا اظہار کرتی ہے کہ اگر قندھار کو دارا نے فتح کرلیا تو وہ تخت وتاج کے اور قریب ہوجائے گا۔ روشن آرا کا تشویش کرنا اس بات کا اظہار تھا کہ وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا نہ ہو بلکہ اس کی مہم کی ناکامی کی کوشش کرے۔

ناول کا آغاز: شاہ جہاں آباد قلعہ معلیٰ کی تعریف وتوصیف سے شروع ہوتا ہے۔ ایک پورا منظر لفظوں کا لباس پہنے چلتا پھرتا دکھائی دیتا ہے۔ ہندوستان کا سب سے شاندار فنون لطیفہ کا دلدادہ شخص ظل سبحانی کا دربار عام میں بلند اقبال پر وقار انداز میں پیش ہونا قاضی عبدالستار نے ایک بادشاہ کو ایسے خوبصورت الفاظ جملوں کی بندش کے ساتھ پیش کیا ہے کہ اصلی منظر بھی ہیچ معلوم ہونے لگے۔ رنگ ونور کی محفل کے

ساتھ داراشکوہ کو مہین پور کی خلافت شاہ بلند اقبال اور ولی عہد سلطنت کے خطابات سے نوازا جاتا ہے۔شاہ جہاں اپنے پیارے بیٹے دارا کو وہ اعزازات اور انعامات عطا کرتے ہیں جو جنت آشیاں جہانگیر نے انھیں عطا کئے تھے۔

مغل دربار امراء نامدار، راجگاںِ جلاوت آثار سپہ سالارانِ زماں وغیرہ کے دستہ دستہ آداب بندگی کے ساتھ سجا ہوا ہے ایسا لگتا ہے اسٹیج پر کسی مغل زمانے کا کوئی ڈرامہ پیش کیا جارہا ہے۔

کنیزیں اور خواجہ سرا شاہی حکم کے بجا آوری کے منتظر اپنے اپنے منصب پر براجمان ہیں۔داراشکوہ کو مغلیہ سلطنت کا ولی عہد قرار دیا جاتا ہے اور یہ فرمان جاری ہوتا ہے کہ آئندہ سال بلند اقبال اس تخت پر جلوہ افروز ہوں گے۔ ناول کے شروع کے چند صفحات میں قاضی عبدالستار نے زبان کے وہ رقص وشرر دکھائے ہیں کہ مشہور زمانہ رقاص بھی ادنٰی نظر آئیں۔تشبیہات اور استعارات کے استعمال سے پورا ماحول جگمگاتا ہوا نظر آتا ہے۔اور کسی فلم کی ویڈیو گرافی کی طرح منظر قاری کی آنکھوں کے سامنے چھا جاتے ہیں۔

پلاٹ: پلاٹ کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو یہ ایک بہترین مثال ہے۔تاریخ ایک وسیع موضوع ہوتا ہے اور تاریخی ناول لکھنے کے لیے مصنف کے پاس سب سے بڑا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ کس واقعہ کو پیش کرے اور کس کو چھوڑے اس لحاظ سے قاضی عبدالستار نے مغلیہ دور کے ان خاص واقعات کو ناول میں پیش کیا ہے جو ضروری تھے اور اس کی بہترین جزئیات اور منظر نگاری کے ساتھ پیش کیا ہے۔

دربار میں دارا شکوہ کے پاس ایک شاعر سرسوتی آتا ہے اور اس کو محصول کے معاف کرنے کی درخواست کرتا ہے۔داراشکوہ جو ایک نرم طبیعت کا مالک ہے آسانی سے اس سے وعدہ کر لیتا ہے کہ ظلِ سبحانی سے وہ اس محصول کو ختم کرا دیں گے۔ پھر بھرے دربار میں دارا اپنا نقطۂ نظر پیش کرتے ہوئے محصول معاف کرنے کی درخواست کرتا ہے۔شاہ جہاں اگر چہ محصول معاف کر دیتا ہے مگر بعد میں دارا کو سلطنت کے اسرار ورموز سمجھاتا ہے۔

ناول میں پلاٹ کا ایک دوسرے سے منسلک ہونا ناول کی کامیابی کا جز مانا جاتا ہے۔اس ناول میں بھی پلاٹ پر قاضی عبدالستار نے کامیاب کوشش کی ہے۔اورنگ زیب کی قندھار شکست کے بعد دارا قندھار کی مہم کے لیے اپنے باپ کو تیار کرتا ہے۔ناول میں قندھار مہم کا طویل ذکر ہے اس کے بعد شاہ جہاں کی بیماری محل

میں مختلف تقریبات اور پھر داراشکوہ کا ولی عہد کے روپ میں فرامین جاری کرنا نظر آتا ہے۔ جب بھائیوں کو اس بات کی یہ خبر لگتی ہے تو وہ لاؤلشکر کے ساتھ میدان جنگ میں اترتے ہیں۔

شاہجہاں کی صحت یابی کے بعد اورنگ زیب مراد اور شجاع کی کارستانی کا ذکر دارا کو مشکل میں ڈال دیتا ہے اور پھر شجاع کا مقابلہ کرنے کے لیے شاہ جہاں کا دارا کے بڑے بیٹے سلیمان شکوہ کو مہم پر بھیجنا اس کے علاوہ دھرمٹ کے میدان میں شاہی فوج کا شکست کے ساتھ فرار ہونا ان تمام واقعات کی قاضی عبدالستار نے جزئیات نگاری کے ساتھ بہترین انداز میں پیش کیا ہے۔ دھرمٹ کے بعد ساموگڈھ کے میدان جنگ پر خاص توجہ دی گئی ہے اور پورے جنگی مناظر کو بہترین انداز میں پیش کیا ہے۔ ساموگڈھ کے میدان جنگ کو پڑھتے ہوئے ایسا لگتا ہے کہ پورا میدان جنگ کسی فلم کی ویڈیوگرافی کے ساتھ آنکھوں کے سامنے چل رہی ہے۔

ساموگڈھ کے میدان میں دارا کی خوفناک شکست اس کی بہترین سپہ سالاروں کا مارا جانا اور پھر دارا کا فرار ہونا۔ میدان جنگ میں فتح کے بعد اورنگ زیب مال غنیمت کی تقسیم اور محل کا محاصرہ کرنا بیان ملتا ہے۔ اس کے بعد دارا کا پکڑے جانا اور اس کا آگرہ میں ایک چھوٹی ہاتھی پر بٹھا کر ذلت کے ساتھ گھمایا جانا جس کا دردناک انجام دیکھ رعایا نے آنسوؤں کے بندھن توڑ دیئے اور اس کا قتل اور پھر تمام خطرات سے نپٹنے کے بعد اورنگ زیب کی رسم تاج پوشی کو نہایت خوبصورت انداز میں قاضی عبدالستار نے پیش کیا ہے۔ آخر میں دارا کی اہمیت کا اعتراف کرتے ہوئے ایک عہد کے قتل کے مترادف دکھانا ناول میں پلاٹ کے طور پر موجود ہے

تاریخی ناول نگاری میں کردار نگاری کی بہت اہمیت ہوتی ہے۔ یہ مصنف کی بڑی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ کردار کو اس کے اصلی تاریخی واقعہ کے ساتھ پیش کرے کیونکہ قاری تاریخی کردار سے پہلے ہی واقف ہوتا ہے اس لیے یہ تخلیق کار کے اوپر منحصر کرتا ہے کہ وہ اپنے خلاق ذہن کے ساتھ کردار کو خوبصورتی سے ابھارے اور اس کے حسن و قبیح پہلوؤں کو سچائی کے ساتھ پیش کرے کیونکہ تاریخی ناول نگار کسی بھی تاریخی کردار کو تاریخ مسخ کر کے پیش نہیں کر سکتا وہ تیمور یا چنگیز خاں کو رحم دل یا انسانیت سے لبریز نہیں دکھا سکتا کیونکہ قاری کو تیمور اور چنگیز خاں کی ہلاکتوں اور اس کے بے رحم افعال و کردار سے اچھی طرح واقفیت حاصل ہے۔ اس لیے وہ

تاریخی کرداروں کواس کے عہد کی سچائیوں کے ساتھ پیش کرے تا کہ ان کا مکمل ذ ہن ، عادات و اطوار ،فنی خوبیوں کے ساتھ اجاگر ہوجائیں اور پڑھنے والے کوبھی کردار سے انسیت پیدا ہوجائے اورایک طرح فنی ر بطگی پیدا ہوجائے۔

قاضی عبدالستار نے جہاں اپنے تاریخی کرداروں کوفنی خوبیوں کے ساتھ پیش کیا ہے وہیں انھوں نے کرداروں کے ذریعہ ماحول، رہن سہن، عادات واطوار کوبھی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔صلاح الدین یا پھر خالد بن ولید ان کرداروں کو پڑھتے ہوئے قاری ان سے جڑ جاتا ہے اوراس کے دکھ سکھ میں روتا اور ہنستا ہے۔قاضی عبدالستار نے پوری کوشش کی ہے کہ کردار ایک انسانی گوشت پوست کے روپ میں ہی صفحہ قرطاس پرجلوہ افروز ہوں ۔ان کی نہ اتنی خوبیاں بیان کی جائیں کہ وہ بالکل مافوق الفطری اور دنیا و جہاں سے ماورانظر آئیں کیونکہ تاریخی کردار حقیقی کرداراورانسان ہوتے ہیں اور وہی ناول کامیاب ہوتا ہے جس کا کردار جیتی جاگتی دنیا کا حامی معلوم ہو۔ جہاں ان کے ناول ''داراشکوہ'' میں انھوں نے دارااوراورنگ زیب پرخصوصی توجہ دی ہے جونا گزیر بھی۔قاضی عبدالستار نے داراشکوہ کانقش اس طرح کھینچا ہے:

''۔۔۔اس کا قد اونچا اور جسم سڈول تھا۔موتیوں کے سرپیچ سے بوجھل سیاہ مندیل کے نیچے اونچی فراخ پیشانی چمک رہی تھی۔ سروہی کی طرح کھنچے ہوئے سیاہ ابروؤں کے سائے میں سوچتی ہوئی لانبی سیاہ آنکھوں سے فضل اورفکر کا نور ٹپک رہا تھا۔سیاہ شاہجہانی داڑھی نے اس کی جمیل شخصیت کوجلیل بنادیا تھا۔وہ اکبری سلطنت کا سفید کھڑکی دار جامہ پہنے تھا فراخ سینے پر پڑی ہوئی الماس کی آرسی میں ''شیوٗ'' کی تصویر کھدی تھی۔ داہنے ہاتھ کی پہلی لمبی بازک انگلی کی اشرفی کے برابر انگوٹھی میں سنسکرت رسم الخط میں ''پربھوٗ'' کا لفظ کندہ تھا۔ بازوؤں کے جوشن کمر کا پٹکہ راجپوتی طرز آرائش کانمونہ تھا۔اگراس کے چہرے سے داڑھی تراش لی جاتی تو وہ ہو بہو اکبراعظم کی تصویر بن جاتا۔'' 8

قاضی عبدالستار نے جس طرح سے دارا کا حلیہ بیان کیا ہے اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ دارا کوایک سیو پرست شخصیت بنا کر پیش کرنا چاہتا تھے۔ جو اکثریت کی نمائندگی کرتی ہے آگے بھی ناول میں وہ اپنے سیکولر ذہنیت کوثابت کرتا رہتا ہے۔ جب ایک کوی راج اس سے گنگا اسنان کے محصول کومعاف فرمانے کی

8: داراشکوہ (ناول) قاضی عبدالستار۔ص 10

عرض پیش کرتا ہےتو دارا شاہ جہاں سے اس محصول کو ہٹانے کی مانگ کرتا ہےاور کہتا ہے:

''عدلِ جہانگیری اور فضیل شاہجہانی نے غلام کوتعلیم دی ہے کہ ہم کو اپنی رعایا کے ساتھ یکساں سلوک کرنا چاہیے۔نہ صرف یہ بلکہ ہندوؤں کواس طرح نوازنا چاہیئے کہ وہ بھول جائیں کہ ان کا شہنشاہ مغل ہے،مسلمان ہے۔۔۔۔''9؎

شاہ جہاں دارا شکوہ کے نظریات سے بہ خوبی واقف ہے اس لیے وہ دارا کو اکثر سمجھا تا رہتا ہے کہ تم اپنی وسیع النظری ،آزادخیالی اور ہندوؤں کی سر پرستی کی بنا پر مسلمان امیروں میں نا مقبول ہورہے ہو۔دارا شکوہ جتنے اپنے باپ کا لاڈلا تھا وہ بھی اپنے والد کو اسی طرح پیار کرتا تھا۔شاہ جہاں نے اپنے جیتے جی اس کو اپنا جاں نشین مقرر کیا تھا اور''شاہ بلند اقبال'' کے خطاب،مہین پور کی خلافت ،ولی عہد سلطنت ، چراغ دودِمان ، تیموری و چنگیزی شاہ بلند اقبال دارا شکوہ اعظم کا القاب واعزاز بھی حاصل تھا۔قندھار کی ذلت آمیز شکست کے بعد شاہ جہاں مزید بیمار پڑ گیا اور روز بہ روز اس کی بگڑتی صحت کو دیکھ کر جہاں آرا دارا شکوہ سے کہتی ہے:

''ہمارا اب بھی مشورہ ہے کہ اٹھو۔۔۔تاج پہن کر تخت طاؤس پر جلوش کرو۔''

تب دارا ایک فرمابردار بیٹے کی طرح کہتا ہے:

''تخت وتاج کی قسم ہمارا دل کہتا ہے کہ ظّل سبحانی صحت یاب ہوں گے اور جب یہ سماعت فرمائیں گے کہ ان کی اولاد نے جس کو انھوں نے سب سے زیادہ چاہا۔۔بے پناہ نعمتوں سے نوازا،اس اولاد نے اس کی علالت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر تاج پہن لیا تو ان کے دل پر جو شفقت ورحمت کا دریا ہے کیا کچھ گذر جائے گی۔۔۔۔۔دارا شکوہ تخت طاؤس کی حفاظت کے لیے اپنی جان دے سکتا ہے لیکن ظل سبحانی کی زندگی میں اس کی حرمت کو اپنے قدموں سے برباد نہیں کرسکتا۔''11؎

قاضی عبد الستار نے ادارشکوہ کو ایک ایسے کردار میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے جو ایک نیک اولاد ایک مفکر صوفی منصب اسکالر کے روپ میں اس کی تصویر نظر آتی ہے۔

وکیپیڈیا ccBy-5A 3.0 پر دارا شکوہ کے بارے میں لکھا ہے:

''داراشکوہ نے شاہ محمد دلربا کے نام سے ایک خط میں واضح طور پر تسلیم کیا ہے کہ وہ سرمد،

9؎:داراشکوہ'(ناول) قاضی عبد الستار۔ص10

11؎:داراشکوہ'(ناول) قاضی عبد الستار۔ص: 63

بابا پیارے، میاں باری، محسن فانی کشمیری، شاہ فتح علی قلندری، شیخ سلیمان مصری قلندر، شاہ محبّ اللہ الہ آبادی جیسے آزاد مشرب صوفیا کی صحبت کی بدولت اسلام حجازی اس کے دم سے برخاست ہو چکا ہے اور کفر حقیقی رونما ہو رہا ہے اور انہیں کی صحبت کی برکت سے کفر حقیقی کی صحیح قدر سمجھ سکتا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب وہ صحیح معنوں میں زنا پوش بت پرست بلکہ خود پرست و دیر نشین بنا ہے۔''12ؔ

حال ہی میں شائع ہونے والی کتاب The Man Who would be King-Dara Shikoh کے مصنف ایوک چندا لکھتے ہیں:

''داراشکوہ کی شخصیت انتہائی کثیر الجہتی اور پیچیدہ تھی ایک طرف وہ ایک بہت ہی پر جوش انسان، ایک مفکر، باصلاحیت شاعر، اسکالر، ایک اعلیٰ درجے کے صوفی اور فنون لطیفہ کا علم رکھنے والے شہزادے تھے لیکن دوسری طرف انہیں انتظامیہ اور فوجی امور میں کوئی دل چسپی نہیں تھی۔ وہ فطرتاً نرم مزاج تھے اور لوگوں کی شناخت کے بارے میں ان کی سمجھ بہت محدود تھی۔''13ؔ

شاہ جہاں نے وقت سے پہلے پرکھ لیا تھا اور دارا کے اسی نظریات کا فائدہ اٹھا کر اورنگ زیب نے دارا کو اسلامی مغلیہ حکومت کے لیے اس کو خطرہ قرار دیا اور اس نے متھرا کی مسجد کو چھین کر ہندوؤں کو بخش دی اور تباہ ہوئی سنگ مرمر کی جالیوں کو دوبارہ تعمیر کرایا اس کے علاوہ اس نے کشمیر اور بھکٹر کے مندروں کی تعمیر کرا چکا تھا۔ ہندوؤں کو جاگیریں بخش کر چکا تھا ساتھ جزیہ جو ایک ضروری محصول ہوتا ہے اس کو بھی معاف کرا دیا تھا۔ دارا کے انھیں امور نے اورنگ زیب کے لیے موقع فراہم کیا اور کے جامع مسجد کی دیواروں پر عبارت چسپا کرادیا۔

خطرہ جو ہندوستان کی خلافت اسلامیہ کے سر پر منڈلا رہا تھا آج سونتی ہوئی تلوار کے مانند سامنے آ گیا ہے۔ ظل الہٰہ کا چراغ حیات جھلملا رہا ہے اور شاہزادہ بزرگ (داراشکوہ) جس کو نماز سے نفرت، روزے سے عداوت، حج سے بغض اور زکوٰۃ سے کد ہے شہنشاہی کے منصوبے بنا رہا ہے۔ تخت طاؤس پر وہ شخص اپنے ناپاک قدم رکھنے والا ہے جو خدا کا منکر اور رسول اللہ کی رسالت کا انکاری ہے۔ جو پربھو کے نام کی آرسی

12ؔ: رقعات عالمگیری مرتبہ نجیب اشرف ندوی، ص 22

13ؔ: "Ayok chndra''The Man Who would be King-Dara Shikoh۔ ص: 9

انگوٹھی اور مکٹ پہنتا ہے۔ بظاہر یوگیوں اور سنتوں کا مداح ہے لیکن باطن راجپوتوں کی تلواروں کا سہارا لے کر ہندوستان جنت نشان سے اسلام کو خارج کر دینے کا منصوبہ بنا چکا ہے۔

برادرانِ اسلام!

ہندوستان کے قاضیانِ عضام اور مفتیان کبار کا فتویٰ ہے کہ ایسے شخص کے خلاف تلوار اٹھانا جہاد ہے۔ جہاد اکبر ہے آج تمہاری عبادت تہجد کی نمازوں اور نفل کے روزوں میں نہیں گھوڑوں کی ٹاپوں میں ہے اس انداز میں پر جوش خطبہ دیتا ہے کہ رعایا کا جوشِ ایمانی بھڑک جائے۔

سب سے ضروری کردار دارا شکوہ کا ہے جس کو قاضی صاحب نے حقیقی تاریخی پہلوؤں کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی ہے اس کے علاوہ انھوں نے دارا کی حمایت میں بھی جملے تراشے ہیں۔ قاضی عبدالستار پر یہ الزام بھی عائد کیا جاتا ہے کہ انھوں نے اپنے ہیرو کو اپنے نظریات کے پیش نظر قاری کے سامنے رکھا ہے اور کوشش کی ہے جو لگاؤ اور محبت مجھے دارا سے ہے وہی میرے قاری کو بھی ہو جائے۔ دارا کو ایک المیہ کردار بن کر ہمارے سامنے آتا ہے جو باپ کا لاڈلا اور چہیتا وارث تھا جس کو شاہ جہاں پیار سے بابا بولا کرتے تھے جس کو شاہ جہاں نے ولی عہد مقرر کیا تھا۔ ناول میں قاضی عبدالستار نے دارا شکوہ کی ضعیف اعتقادی پر بھی نظر ڈالی ہے اور فنی قبیح پہلوؤں پر بھی نظر کی ہے۔ فاروقی لکھتے ہیں:

> ''قاضی عبدالستار نے اپنے ہیرو کے کردار کے ان پہلوؤں سے نظر بچا کر اس کے ساتھ انصاف نہیں کیا ہے۔ المیہ کردار اپنی کمزوریوں کے باوجود (بلکہ اکثر ان کی وجہ سے) المیہ کردار بن سکتا ہے۔ مثال کے طور پر شیکسپیئر کی قلوپطرہ کی دیکھئے شیکسپیئر نے اس کے عیوب کی پردہ پوشی نہیں کی ہے۔ ان اہم فروگذاشتوں کی وجہ سے ''دارا شکوہ'' ایک کم زور اور ناکام ناول ہے۔۔۔ دارا کے انجام کی المنا کی پوری طرح سامنے نہیں آپاتی لیکن ناول کی ناکامی کی سب سے بڑی وجہ میں اوپر بیان کر چکا ہوں۔ دارا کا کردار المیہ قد و قامت کا نہیں ہے اس میں ایسی خامیاں ہیں جو کسی المیہ کی عظمت تک پہنچے۔ میرا مطلب اخلاقی خامیوں سے نہیں ہے بلکہ دارا میں جرأت مندی، شدت، استقلال اور جلال کی کمی ہے جو انسان کو تقدیر سے ٹکر لینے اور شکست میں بھی ظفر رہنے یا فتح میں شکست یاب رہنے کی عظمت عطا کرتا ہے۔ دارا سے بڑا المیہ تو اورنگ زیب کا تھا۔'' 14

14: فاروقی کے تبصرے۔ شمس الرحمٰن فاروقی۔ شب خون کتاب گھر الہ آباد۔ سن اشاعت 1968۔ ص 85-86

تخت وتاج کے قریب رہنے سلطان باپ کے کان بھرنے اور انھیں حاصل کرنے کے لیے خود کو ایک خاص طبقے کا نمائندہ دکھانا یہ ایک حد تک کام کرتا ہے۔ مشترقہ تہذیب کا نمائندہ لوگوں نے داراشکوہ کو ثابت کیا ہے جس نے اپنی ویس بھوسا جو اس نے اختیار کیا تھا اورنگ زیب کے ذریعہ اسے اسلامی مغلیہ سلطنت کے لیے خطرہ بنائے جانے پر وہ اسی طرح مسجد میں جاتا ہے اور نمازیوں سے خطاب کرتا ہے۔ اسے مشورہ دیتا ہے کہ تم نمازیوں کے بیچ جاتے ہوئے اپنے لباس تبدیل کرو مگر دارا نے ظاہری و باطن کو یکساں رکھنے اور دکھاوا فریب دور رکھنے کی پوری کوشش کی اور اپنے خیالات کا اظہار یوں کرتا ہے:

''رائے رایاں۔۔۔تم داراشکوہ کو مسخرہ سمجھتے ہو؟ جو چند جگمگاتے انعاموں کی خاطر گرگٹ کی طرح ایک وقت میں دس رنگ بدل سکتا ہے۔''[15]

پھر دارا مسجد کے نمازیوں کے سامنے خطبہ دیتا ہے اور کہتا ہے کہ انسان کے اوپر دو فرض عائد کئے گئے ایک خدا اور دوسرا انسانوں کے درمیان سماج کے حقوق کی ذمہ داری ہم پر عائد ہیں۔ خدا اور انسان کے بیچ جو فرائض ہیں وہ پروردگار تک ہی ہیں جو ہمیں اسے ہی سونپ دینا چاہیے۔ اگر ایک شخص نماز نہیں پڑھتا روزہ نہیں رکھتا تو ہم اس پر قدغن ہیں لگا سکتے اس لیے خدا خود اپنا حساب لے گا۔ غرض اس کے ایک جذباتی اور پر جوش تقریر جس میں اس نے اپنے اور رعایا کے حقوق اس کی حفاظت اور اورنگ زیب کی سازشوں سے لوگوں کو دور رہنے کی تلقین کی اور جہاں میں انصاف کی فراوانی کے لیے عہد کیا ہے۔

مشرف عالم ذوقی ''داراشکوہ'' کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

''یہ حضرت میاں میر کی بزرگی کا اثر تھا معجزہ تھا یہ جو بھی تھا، دارا کی زنگی میں حیرت انگیز انقلابوں کا لامتناہی سلسلہ شروع ہوگیا۔ شہنشاہت کے غرور سے بے نیاز دارا کی دل چسپیاں فنون لطیفہ میں پیدا ہوئیں۔ رقص ہو، موسیقی ہو، مصوری ہو یا پھر وید، پران، بھگوت گیتا کے شلوک یا قرآن، حکیم اور حدیث شریف کو جاننے کا اشتیاق، ہندی، سنسکرت، پراکرت کے بڑے بڑے گیانی اور دانشوروں کی محفلیں سجتیں اور دوسری جانب دارا اپنی معلومات میں اضافہ کرتا لیکن اہل علم داراشکوہ کو ایک شہنشاہ سے زیادہ ایک ایسا عالم تصور کرتے ہیں جو اپنی نا قابل فراموش تصانیف کی وجہ سے ہمیشہ یاد رکھا

15: داراشکوہ (ناول) قاضی عبدالستار۔ ص70

جائے گا۔''16؎

ناول کا دوسرا اہم کردار اورنگ زیب کا ہے اورنگ زیب تاریخ کا ایک ایسا حرماں نصیب اور بدنصیب بادشاہ ہے جس کے دور حکومت میں مغل حکومت کا سورج دور دور تک چمکا اور اس بادشاہ نے اپنی پوری زندگی ہندوستان کی حفاظت میں گزار دی مگر تاریخ نویسوں کے قلم کا زور اس بادشاہ کی فتوحات کو قلم کیا اور سب سے زیادہ بدنام کیا گیا اور اسے فرقہ پرست کے لقب سے ہی یاد کیا جاتا ہے قاضی عبدالستار اورنگ زیب کے حلیہ پوشاک کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:

''ہر چند کے اس عمر چالیس سے تجاویز کر چکی تھی تاہم ایشائی شہزادوں کے برخلاف اس کی جفا کوش زندگی نے جسم کو تناسب اور کسی قدر دبلا بنائے رکھا۔ بیضاوی چہرے پر وہ لانبی کھڑی داڑھی تھی جس کے سائے میں تمام ہندوستان کے قاضیوں کے مذہبی منصوبوں کے آشیانے تھے۔ بے شکن بلند پیشانی پر ٹھنڈی، پتھرلی سنجیدہ آنکھیں چمک رہی تھیں جس کی متانت کو نہ دنیا کا کوئی خوف وخطرہ متاثر کرسکتا تھا اور نہ رحم وکرم کا کوئی جذبہ متزلزل کرسکتا تھا۔''17؎

قاضی عبدالستار نے نہایت باریکی سے اورنگ زیب کا نقشہ کھینچا ہے جہاں اس کے ظاہری روپ کو پیش کیا ہے وہیں انھوں نے اس کے حلیہ سے اورنگ زیب کے کردار کے باطنی پہلو کو بھی پیش کیا ہے۔ یہ قاضی عبدالستار کے قلم کا ہی نتیجہ ہے کہ چند سطروں میں مغل سلطنت کے سب سے جلیل و متیع انسان کا نقشہ اتنی خوبصورتی سے ہمارے سامنے ابھر آتا ہے اور قاری کے سامنے کردار کی سبھی پردوں سے آشنائی ہوجاتی ہے۔ کسی بھی بادشاہ کو فرشتہ صفت بنا کر پیش کرنا ٹھیک نہیں ہوتا ہے۔ اورنگ زیب کے بارے میں اکثر لوگوں نے اسی بالکل ولی اور صوفی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے ہمیں بھی اس بات کو ذہن سے نکال دینے کی ضرورت ہے کہ اورنگ زیب میں کوئی غلطی نہیں تھی وہ بالکل سچا اور پکا مسلمان تھا کیونکہ حکمراں کبھی بھی پکا مذہبی تو ہوسکتا ہے مگر اسے حکومت کے لیے بہت سے ایسے فیصلے لینے پڑتے ہیں جو سراسر غلط ہوتے ہیں۔ ابن انشاء ''اردو کی آخری کتاب'' میں لکھتے ہیں:

''اورنگ زیب ایک اچھا حکمراں اور اچھا بادشاہ تھا وہ دین و دنیا دونوں میں یکساں لحاظ

16؎ from Facebook zauqi alam.com:post 19 september2020

17؎: داراشکوہ (ناول) قاضی عبدالستار۔ص:155

رکھتا تھا اس لیے اس نے زندگی میں کوئی نماز قضا نہیں کی اور کسی بھائی کو زندہ نہیں چھوڑا۔''[18]

اورنگ زیب ایک ہمتی بہادر بچپن سے ہی قوت استعداد کا مالک شہزادہ تھا۔اس کے اندر اپنے دوسرے بھائیوں کے مقابلے میں علم حاصل کرنے اور نئے علوم وفنون سیکھنے کا شوق تھا۔ایک واقعہ اورنگ زیب کے لیے مشہور ہے کہ اس نے کم عمری میں ہی ہاتھوں پر قابو کر لیا اور جب کہ اس کے دوسرے بھائی اس کو میدان میں چھوڑ کر بھاگ گئے۔اس کی بہادری سے اورنگ زیب بہت متاثر ہوا اور اس نے اس کو سونے سے انعام کے طور پر تول دیا۔اورنگ زیب کو اس کے باپ شاہ جہاں نے ہمیشہ تخت وتاج سے دور رکھا اور اس کو 1679 میں ہی دہلی چھوڑ کر جنوب ہند کی طرف جانا پڑا جہاں اس نے مختلف مہم میں فتح حاصل کی ساتھ سلطنت اور حکومت چلانے کے اسرار ورموز سے بھی واقفیت حاصل وہتی رہی تخت سے دور ہو کر اس کی اہمیت اس کو پانے کی جد و جہد نے اس کی اندرونی صلاحیتوں کی جلا بخشی۔ناول میں قاضی عبدالستار جہاں دارا کو ہیرو کی طرح پیش کیا ہے اور اورنگ زیب کو ایک غاصب شہزادے اور کٹر بادشاہ کی طرح پیش کیا ہے ان کے اساتذہ نے ان کے تعصب کا نتیجہ ہے جو انھیں اسکول کے وقت میں ان کے اساتذہ نے ان کے دماغ میں انڈیل دیا تھا۔اپنی اس ذہنیت کو وہ خود بار بار لکھتے اور بیان کرتے ہیں۔ریختہ کے اردو پروگرام 2017 میں انھوں نے سید محمد اشرف کو انٹرویو دیتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا ہے:

''بابو سنت پرساد تاریخ پڑھاتے تھے۔انھوں نے اورنگ زیب کی ایسی تصویر کھینچی کہ ان سے جو نفرت پیدا ہوئی وہ آج تک قائم ہے۔بابو سنت پرساد نے مجھے تین باتیں سنائیں۔پہلی بات کہ دنیا میں سب سے ظالم دو آدمی گزرے ہیں چنگیز اور تیمور لیکن اورنگ زیب ان سے دو ہاتھ آگے تھا۔انھو نے بتایا کہ چنگیز اور تیمور نے اپنے باپ پر یزید کی طرح جس طرح اس نے حضرت حسینؓ پر پانی بند کیا تھا اسی طرح انھوں نے پانی بند نہیں کیا اورنگ زیب نے اپنے باپ پر پانی بند کیا۔دوسرء بات چنگیز اور تیمور نے اورنگ زیب کی طرح اپنے بھائیوں سے طور چنگیزی پر جو ان کے لیے قرآن کی حیثیت رکھتا تھا مغلوں کے لیے اس پر قسم کھا کر بدعہدی نہیں کی جو اورنگ زیب نے کی مراد کے ساتھ کی شجاع کے ساتھ کی۔بڑی بات دارا شکوہ کو غسل نہیں دیا گیا کفن نہیں پہنایا گیا جس لباس

---

[18]: اردو کی آخری کتاب۔ابن انشاء۔کتاب والا،دہلی۔سن اشاعت:2002۔ص:74

میں وہ بے چارا مارا گیا سی لباس میں ٹھانس دیا گیا۔ یہ اتنا بڑا ظلم ہے کہ انسانیت تصور نہیں کرسکتی یہ بات میرے کلیجے میں لگ گئی اس وقت میری عمر پندرہ سولہ سال تھی۔''19

یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ بچپن میں بتائی اور سکھائی گئی بات تمام عمر ساتھ چلتی رہتی ہے ایک طرح سے وہ ہماری فطرت میں داخل ہوجاتی ہے چاہے وہ کسی شخص یا پھر مذہب سے محبت یا نفرت یہ بات قاضی عبدالستار کے اوپر صادق آتی ہے کہ انھیں بچپن یا لڑکپن میں جو نفرت اورنگ زیب سے پیدا ہوئی وہ ہمیشہ قائم رہی اور اپنے اسی نظریہ کی بنیاد پر داراشکوہ ناول بھی لکھا جہاں ان کے نظریات کی کارفرمائی صاف طور پر نظر آتی ہے۔

ڈاکٹر اوم پرکاش پرساد نے ''اورنگ زیب ایک نیا زاویہ نظر'' میں اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا ہے:

''لیکن وہ عظیم شخصیتوں یعنی محمد بن تغلق اور اورنگ زیب کے بارے میں ہم دیکھتے ہیں کہ ان دونوں سلطان اور بادشاہ کے کافی اہم کاموں کو نظر انداز کرتے ہوئے تاریخ کی کتابوں میں انھیں اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ سلطان (محمد بن تغلق) ایک پاگل حکمراں اور بادشاہ (اورنگ زیب) ایک کٹر اور ظالم مسلمانوں کے روپ میں شناخت کئے جانے لگے جبکہ ان دونوں حکمرانوں کے عہد میں نہ تو اشوک کی طرح قتل عام ہوا نہ لاتعداد دشمن قیدی بنائے گئے۔ ناہی مذہبی تبلیغ کے لیے سرکاری خزانہ حکومت کی طاقت اور رشتہ داروں کا استعمال کیا گیا محض اپنے ذاتی مذہب کو وسیع دینے کی خاطر۔''20

اس کے علاوہ انھوں نے لکھا ہے کہ ''کسی بھی عہد کا ادھورا مطالعہ جانب دارانہ مطالعہ سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ تاریخ کا صحیح مطالعہ وسعت نظری اور غیر جانبدارانہ ڈھنگ سے مطالعہ کنا انصاف پر مبنی ہوتا ہے۔''

اورنگ زیب کی کامیابی اور ہندوستان میں اسلامی طرز حکومت کی بنیاد کو ایک طرح قاضی عبدالستار مجدد الف تحریک اجاے کی وجہ بتاتے بتاتے لکھتے ہیں:

''ساموگڈھ نے یہی نہیں کیا کہ ہندوستان کا تاج دارا سے چھین کر اورنگ زیب کے سر

19: ریختہ پروگرام 2017

20: اورنگ زیب ایک نیا زاویہ نظر۔ ڈاکٹر ام پرکاش پرساد۔ مترجم۔ فیضان مصطفیٰ۔ خدابخش لائبریری پٹنہ۔ ص 3

پر رکھ دیا بلکہ مغل تاریخ کے زریں باب پر مہر لگا دی جسے اکبر کا عہد کہا جاتا ہے وہ عہد جس
نے سیاست کو قومیت کا اعتبار عطا کیا تھا جس نے ہندوستان کے قدیم ادب کو نئی زندگی
اور نئی تفسیر کا خلعت پہنایا تھا جس نے پرانے فنون لطیفہ کو ثقافت اور اسناد کا حق بخشا تھا۔
وہ مبارک عہد وسنہرا زمانہ مجدّد الف ثانی کی تحریک احیاء کے ہاتھوں ساموگڈھ کے میدان
میں ہار گیا۔''21ے

ساتھ ہی یہ بات حقیقت ہے کہ مغلیہ خاندان میں اورنگ زیب جیسے سنی اسلامی شعائر کے پابند حکمراں کا پیدا ہونا بھی ایک طرح حیران کن بات تھی۔ کیونکہ مغلیہ حکومت میں شیعوں کا اثر ورسوخ بہت زیادہ تھا ایسے میں مجدد الف ثانی کی تحریکات سے اوران کی محنت کا ثمرہ تھا کہ اورنگ زیب نے پچاس سال تک مذہبی طرز پر حکومت کی ساتھ ہی فتاولٰی عالمگیری بھی مرتب کرانے میں ان کے تحریکات کا بڑا ہاتھ تھا۔ اکثر لوگ سوال کرتے ہیں کہ اورنگ زیب کے بجائے داراشکوہ بادشاہ ہوتا تو کیا ہوتا۔ آڈری چرِ جومغربی تاریخ داں ہیں وہ کہتی ہیں کہ درحقیقت داراشکوہ مغل سلطنت کو چلانے یا جیتنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے۔ ہندوستان کے تاج کو حاصل کرنے کی جدوجہد میں یا بادشاہ کی حمایت کے باوجود داراشکوہ اورنگ زیب کی سیاسی سمجھ اور تیزی کا مقابلہ نہیں کر پاتے۔

ناول کے چند دوسرے کرداروں میں شاہ جہاں کا کردار اہمیت کا حامل ہے۔ اور ناول میں ایک اہم شخصیت ہے جس کے بعد ہی دارا اور اورنگ زیب کی کہانیاں ہیں وہ ناول کی بنیاد ہے۔ ناول کی شروعات میں قلعی معلٰی کا ذکر اور اس کے بعد لاڈلے بیٹے کو حکومت کے اسرار و رموز سکھاتا ہوا ہندوستان کا بادشاہ ہمارے سامنے آتا ہے۔ اوراس کی شخصیت کے مختلف گوشوں پر قاضی عبدالستار نے نظر ڈالی ہے۔ شاہ جہاں کے حلیہ، پوشاک اور انداز کا قاضی صاحب نے اس طرح ذکر کیا ہے:

'' شہنشاہ سیاہ جامے پہنے تھا۔ جس کی آستینوں ،نشموں ، دامنوں اور گریبان میں
جواہرات ٹنکے تھے۔ بازوؤں پر جوش اور گلے میں آرسی تھی۔ پاپوش موتیوں سے سفید
تھی۔ سفید نوک دار داڑھی کے نیچے ہار کا ایک پھرا انگارے کی طرح دہک رہا تھا۔ سر پر وہ
تاج تھا جو خاندان مغلیہ کے تاجوں کے منتخب جواہرات سے ترتیب دیا گیا تھا۔ ظل سبحانی

21ے؛ داراشکوہ۔ ناول قاضی عبدالستار۔ ص155

آ رہے تھے جیسے ایک ایک قدم ایک ایک سلطنت پر پڑ رہا ہے۔ حاضرین نے گھٹنوں تک سر جھکا کر اور ہاتھ ماتھے پر رکھ کر کورنش کی ۔شہنشاہ نے گلال بار میں کھڑے ہو کر حاضرین دربار پر نگاہ کی اور ارشاد کیا۔

''فرعون نے ہاتھی دانت کا تخت میسر کیا اور اس پر بیٹھ کر خدائی کا دعوی کیا۔ اہل دربار شاہد رہیں کہ مابدولت اس بے نظیر تخت پر قدم رکھنے سے پہلے خدا کی بندگی اور اس کے آخری پیغمبر کی غلامی کا اقرار فرماتے ہیں۔'' 22؎

داراشکوہ کے محصول معاف کرانے کی عرضی بھرے دربار میں پیش کرنے کے بعد شاہ جہاں اس سے مخاطب ہو کر اس کو سمجھاتا ہے اور کہتا ہے:

''جان پدر! یہ محصول مغل قلمرو کے بے محانا خزانے کی ایک معمولی سی شق ہے ۔اس کی حیثیت اقتصادی نہیں سیاسی ہے۔ مابدولت نہیں چاہتے کہ مذہب کے نام پر لاکھوں کروڑوں انسان کسی ایک مقام پر جمع ہو جائیں اور ضبط و نظم خطرے میں پڑ جائے اور اس طرح یاتری حکومت کے عتاب کا نشانہ بنیں یعنی طبیب کی نگاہ میں ایک کڑوی دوا ہے جو مریض کی صحت کے لیے ضروری ہے۔'' 23؎

یہاں شاہ جہاں کی حکومت کے اسرار و رموز سے واقفیت ہوتی ہے اور کی سلطنت اور سیاست کے احکام و فرمان پر بھی نظر پڑتی ہے کہ حکومت کے ہر کام میں مختلف داؤ پیچ ہوتے ہیں۔

اس کے بعد ناول میں قاضی عبدالستار نے شاہ جہاں کی بیماری کا ذکر کیا ہے۔ اور اس بیماری کی آڑ میں کیسی طرح سیاست ہوتی ہے اس کا خوبصورت منظر کھینچا ہے۔ دھرمٹ کی جنگ کے ساتھ ہی شاہ جہاں رعایا کی نفسیات سے ایک بادشاہ کسی حد تک واقف ہوتا ہے اس کا بھی بیان ملتا ہے۔ جب دارا اس کو جنگ پر جانے کے لیے روکتا ہے تو شاہ جہاں کہتا ہے:

''کون اس نافہم (دارا) کو سمجھائے کہ جب مابدولت میدان جنگ پر نزول اجلال فرمائیں گے تو کم نصیب اور نامراد باغی اپنے ہاتھو سے اپنے ہاتھ باندھ کر حاضر ہو جائیں گے اور اگر جنگ ہوئی تو سرداران عظام مابدولت کی نگاہ میں افتخار حاصل

22؎: داراشکوہ۔ قاضی عبدالستار۔ ص 8

23؎: داراشکوہ۔ قاضی عبدالستار۔ ص 14

کرنے کے لیے اپنا سر ہتھیلی پر رکھ کر دادِ شجاعت دیں گے۔اور بدنصیبوں کے حلیف اپنے
لشکروں کے ساتھ ہماری حضوری کے شرف سے مشرف ہوں گے۔'' 24؎

غرض اس طرح قاضی صاحب نے شاہ جہاں کے کردار کی خوبصورت منظر کسی کی ہے۔

ناول کے ضمنی کرداروں میں جہاں آرا اور روشن آرا کا وجود بھی اہمیت کا حامل ہے۔ جہاں آرا جہاں داراشکوہ کی طرف دار تھی اور بادشاہ بیگم کے لقب کے ساتھ محل اور تخت وتاج کی سیاست میں مکمل حصہ لیتی تھی وہیں اس کو بادشاہ کی بیماری کے بعد تخت پر بیٹھ جانے کی نصیحت کرتی ہے۔اس کو معلوم ہے کہ دارا کی لچک انگیزی اس کو تخت وتاج سے دور کر دے گی اور اورنگ زیب جیسا سازشی انسان تخت وتاج پر قبضہ کر لے گا اپنی اسی سوچ کو وہ دارا کے سامنے پیش کرتی ہے۔کہتی ہے:

''ہمارا اب بھی مشورہ ہے کہ اٹھو۔۔۔تاج پہن کر تخت طاؤس پر جلوس کرو۔منصب
داروں کی نذریں قبول کرو۔۔۔خلعتیں عطا کرو۔اور سلطنت کو پارہ پارہ ہونے سے بچا
لو۔'' 25؎

جہاں آرا نے اپنے بھائی اور سلطنت کی بہتری کے لیے دارا کو تخت پر بیٹھنے کا مشورہ دیتی ہے اور اورنگ زیب کی چالوں سے اچھی طرح واقف ہے۔اسے معلوم ہے کہ زراسی لاپرواہی داراشکوہ کو تخت وتاج سے بہت دور کر دے گی۔مگر دارا کو یہ کہہ کہ اس کی تدبیر جو ٹھکرا دیتا ہے کہ شاہ جہاں سلطان کی صحت یابی کے بعد کیا منھ دکھائے گا اور اس کی اس حرکت سے اس کے باپ کو بہت دکھ ہوگا تب جہاں آرا کہتی ہے:

''ہم تم کو یقین دلاتے ہیں کہ ظلِ سبحانی انشاء اللہ صحت یاب ہوں گے اور ''جشن مہتاب''
برپا ہوگا تو ہم ان کے حضور میں سیاست کے اسرار ورموز پیش کریں گے اور تمہارے لیے
معافی نامہ ہی نہیں مزید شفقت ومحبت مانگ لیں گے۔'' 26؎

غرض ہم دیکھتے ہیں کہ جہاں آرا ایک دوراندیش قابل فہم عورت ہے اس کی نگاہ شاہین نے ہندوستان کے مستقبل کو بہت پہلے ہی دیکھ لیا تھا۔قاضی عبدالستار نے جہاں آرا کے کردار کو ایک پروقار کردار کے انداز سے پیش کیا ہے جو ناول میں اہمیت رکھتا ہے۔

24؎: داراشکوہ۔قاضی عبدالستار۔ص 94

25؎: داراشکوہ۔قاضی عبدالستار۔ص 63

26؎: داراشکوہ۔قاضی عبدالستار۔ص 63

''جہاں آرا بیگم جو مختار بیگم کے وصال کے بعد سے نہ صرف قلعۂ مبارک بلکہ کشور ہندوستان پر احکامات صادر کرنے کی عادی ہو چکی تھی آج خاموش تھی جیسے کسی نا قابل فہم خوف نے وقوت گویائی سلب کر لی ہو جب جی امنڈ نے لگتا اور پلکیں نم ہونے لگتیں تو اپنے آپ کو کسی خیال یا کام میں مصروف کر لیتی۔''27؎

روشن آرا کا کردار بھی ناول میں اہمیت کا حامل ہے۔ وہ اورنگ زیب کی دست خاص اور محل کے اندرون پر گہری نظر رکھتی ہے ساتھ ہی تمام اسرار و رموز کو اورنگ زیب تک پہونچانے کی اس کی ذمہ داری ہے جو نہایت ہی پوشیدہ اور بہترین انداز میں باریک کاموں کو کر لیتی ہے جو ایک وزرا اور امراء بھی نہیں کر سکتے۔ وہ اورنگ زیب کو مشورہ بھی دیتی ہے۔ غرض روشن آرا اورنگ زیب کے ساتھ اس کے تخت و تاج کے حصولیابی تک اسی کے ساتھ رہی اور اس نے بادشاہ بیگم کا لقب اختیار کیا۔

قندھار کی مہم کے لیے جب شاہ جہاں نے داراشکوہ کا انتخاب کیا تو اس نے اورنگ زیب سے اپنے دل سے وسوسے کو اس انداز سے بیان کیا:

''اورنگ زیب۔۔۔۔جو قندھار ''بے شکوہ'' (داراشکوہ) کی روباہی پالوں کی وجہ سے تمہارے ہاتھ پر فتح نہ ہو سکا وہ قندھار اگر دارا کی تلوار نے ریزہ زبر کر دیا تو یاد رکھو۔۔۔کہ تخت طاؤس تمہارے قدموں سے اور دور ہو جائے گا۔''28؎

غرض اس نے اپنے پیارے بھائی کو مستقبل کے خطروں سے بہت پہلے آگاہ کر دیا تاکہ کوئی ایسی بات نہ ہو جائے جو دارا کا ایک قدم بھی سلطنت کی جانب بڑھے۔ اورنگ زیب کے سلطنت حاصل کر لینے کے بعد اس نے اپنی بہن کو ایک لاکھ سونے کے دینا اور سرخ خلعت کا انعام دیا ساتھ ہی جہاں آرا کا جو خطاب افتخار بادشاہ بیگم کا تاج روشن آرا کے سر پر رکھا اور داراشکوہ کے قید ہو جانے اور اس کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے اس بات پر جب روشن آرا سے اورنگ زیب نے اس کی رائے جاننی چاہی تب روشن آرا نے نہایت دلربایانہ اور فخرانہ انداز سے اپنے بھائی کو مشورہ دیا کہ جب تک دارا زندہ ہوگا اس کی حکومت کو انجانہ خوف ہوگا کیونکہ رعایا کا ایک بڑا حصہ اس کے فکر کے ساتھ ہے اس لیے اس کو جتنی جلدی ممکن ہو ختم کر دیا جائے۔ قاضی عبدالستار لکھتے ہیں:

27؎: داراشکوہ۔ قاضی عبدالستار۔ ص 93

28؎: داراشکوہ۔ قاضی عبدالستار۔ ص: 19

''داراشکوہ کے مستقبل کے بارے میں دوراہیں نہیں ہوسکتیں جب تک وہ زندہ ہے ظلِ سبحانی سلطنت کی بازیابی کے خواب دیکھتے رہیں گے اور غدار جو آپ کی تلوار کے خوف سے چپ ہیں سازش بننے لگیں گے اس لیے جلد از جلد اس بد اقبال (دارا) کا قصہ پاک کر دیجئے تا کہ ہمیشہ کے لیے سکون میسر ہو۔''29

روشن آرا کے کردار کی سختی اور اس کے قوتِ ارادی کو قاضی عبدالستار نے خوبصورتی سے پیش کیا ہے کہ مغل شہزادیاں حسن کے معاملے میں ہی نہیں بلکہ سیاست کے داؤ پیچ کو اچھی طرح سمجھتی تھیں ساتھ ہی قیمتی مشوروں سے بادشاہوں کو نوازتی تھیں ان کا خاص ہاتھ ہوتا تھا اقتدار کی جنگ میں۔ کیونکہ ناول انھیں شخصیات پر منحصر ہے۔ ان کے علاوہ کچھ ضمنی کردار بھی ہیں۔ ناول میں واقعات کے پیش منظر میں سامنے آتے ہیں شاہ جہاں کے علاوہ جہاں آرا بیگم، روشن آرا وغیرہ کے کردار بھی اہمیت کے حامل ہیں ان کے علاوہ مختلف وزیر اور جنگی سپہ سالار کے علاوہ میاں میر اور سرمد کا بھی ذکر ہوتا ہے

ان کے علاوہ قاضی صاحب راجہ جسونت سنگھ، خلیل اللہ خاں، راؤ چھتر سال ہاڑا، مہر جعفر کے کردار کو پیش کیا ہے۔ مغل دربار میں خواجہ سراؤں کو ایک خاص مقام حاصل ہوتا تھا وہ ہمیشہ مغل سلاطین کے دست بازوں بنے رہتے تھے۔ اس ناول میں بھی قاضی عبدالستار نے نیلم اور دوسری خواجہ سراؤں کو ان کی خاص ادا، بات چیت کے انداز کے ساتھ پیش کیا ہے۔ روشن آرا کا داروغہ خواجہ سرا نیلم کا بھی اورنگ زیب کے تخت و تاج کے حصول کی جنگ میں ایک بڑا حصہ تھا اور خبریں اور حکومت کے راز آسانی سے ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچایا کرتا تھا۔ اس اقتباس میں خواجہ سراؤں کے اندازِ تکلم کو قاضی صاحب نے دل چسپ انداز میں پیش کیا ہے:

''شہزادی روشن آرا کا داروغہ خواجہ سرا نیلم بھاری لباس پہنے، چاندی کا عصا تھامے جس کے سر پر سونے کا عقاب بنا تھا۔ سامنے آیا اس کے پیچھے حبشی غلاموں کی قطار سروں پر خوان اٹھائے تھی۔ ایک سپاہی نے ٹوکا۔

''شاہی حکم ہے کوئی اندر نہیں جا سکتا۔''

نیلم نے تنک کر سپاہی کو دیکھا ایک جھوٹی ٹھنڈی سانس بھری اور مٹک کر بولا۔ ''ارے واہ

29: داراشکوہ۔ قاضی عبدالستار۔ ص: 158

طرّم خاں۔۔۔ہماری ہی بلّی اور ہمیں سے میاؤں۔۔۔شاہی حکم، سواروں پیادوں کے لیے ہے کہ ''قورمے'' کی قابوں پر بھی پہرے بیٹھ گئے ہیں۔''

پھر اس نے اپنے غلاموں کو بھی حکم دیا۔

''رکھ دو زمین پر خوان چاہے کتے بھنبھوڑیں چاہے بلی کھائیں۔۔۔۔ہماری بلا سے کوئی ہمارے پوت کی کمائی ہے کہ رونے بیٹھیں۔''

سپاہیوں کا افسر سیدھا سادا راجپوت تھا۔ کھڑا ہتھیلی پر تمبا کو مل رہا تھا چٹکی منھ میں داب کر گرجا۔

''ارے کھان صاحب لے جاؤ تم اپنے کھوان۔۔۔۔یہ تو ٹھٹھول کر رہا تھا۔''

نیلم نے سنی ان سنی کر کے اس سپاہی کو نشانہ بنایا۔

''آدمیوں کو گن لو اور چاہو تو تصویریں اتار لو۔ جب لوٹیں تو ملا لینا، اور ہاں قابیں کھول کر دیکھ لو۔ کہیں ہاتھی گھوڑے تو نہیں، زینودیں نہ بند ہوں۔''[30]

قاضی عبدالستار نے ناول میں راو چھتر سال ہاڈا کے کردار اور اس کی شعروشاعری کا بھی ذکر کیا ہے۔ میدان جنگ میں رزمیہ نظمیں سنائی جاتی تھیں اس کو خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔ راجہ رام سنگھ راٹھور اور رستم خاں بھی میدان جنگ میں اپنی شناخت پیش کی۔ راؤ چھتر سال ہاڑا جو ایک بہادر راجپوت سپاہی تھا جو تلوار کا دھنی تھا جس کے شہید ہوتے ہی اورنگ زیب نے آدھی جنگ جیت لی اس کے بارے میں قاضی عبد الستار نے لکھا ہے:

''راؤ سے اگر تقدیر نے یاوری کی ہوتی تو اس کا قلم فیضی سے چشمک کرتا اور تلوار راجہ مرزا امان سنگھ کے افسانے بھلا دیتی۔''[31]

مختلف جنگوں کا جائزہ:

شاہ جہاں نے اپنی سلطنت کو اس لیے چار حصوں میں تقسیم کر دیا کہ خون خرابہ نہ ہو۔ اس خیال کے پیش نظر شجاع کو بنگال۔ اورنگ زیب کو دکن اور مراد کو گجرات کا حصہ دے دیا اور دارا کے پاس کابل اور ملتان کی ذمہ داری تھی۔ یہ تینوں بھائی اپنی اپنی ذمہ داریاں نبھا رہے تھے اور خود کو مضبوط کرنے اور فوجی طاقت حاصل

30: داراشکوہ۔ قاضی عبدالستار۔ ص: 68

31: داراشکوہ۔ قاضی عبدالستار۔ ص 141

کرنے کی کوشش کر رہے تھے مگر دارا شکوہ محل میں بیٹھا صرف کتابی گفتگو کرتا تھا۔ دارا نے شاہ جہاں کے دل میں اپنی جگہ بنالی اور ظل سبحانی بھی اس کو بہت قریب رکھتے تھے اور اسے اپنے تخت طاؤس کے پاس ہی تخت بنوا دیا تھا ساتھ ہی ولی عہد بھی مقرر کیا تھا۔ یہ بات تینوں بھائیوں کے دل میں کھٹکتی تھی اور وہ موقع کی تلاش میں تھے خاص طور سے اورنگ زیب دارا کی چالوں کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔ ان سب حالات میں شاہ جہاں کوئی کسر نہیں چھوڑنا چاہتا تھا اور اس نے اپنے عزیز اور قریبی دوسر داوں کی قاسم خاں اور راجہ جے سنگھ کو فوجی ذمہ داری عطا کی اور ساتھ ہی دارا کو نصیحت دی کہ وہ کوشش کرے کہ اورنگ زیب سے بات چیت سے مسئلہ کا حل ہو جائے مگر دارا کو اپنی فوجی قیادت اور لیاقت خواب خرگوش کی طرح بھروسہ تھا۔ جن میں شاہی خزانہ اور باپ کا ساتھ اس کے اندر اعتماد پیدا کر رہی تھی۔۔ شاہ جہاں کی بیماری کے ساتھ ہی تخت و تاج کے حصول کے لیے بھائیوں کے بیچ تصادم شروع ہو جاتا ہے یہاں سے اورنگ زیب کی مکمل واپسی ناول میں ہوتی ہے۔ جو مختلف صلاحیتوں کے سبب دارا اور شاہ جہاں کے شاہی لشکر کو شکست دے کر دھرمٹ کے میدان کو جیت لیتا ہے۔ اور اس نے مراد کی فوج کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا اور دونوں کے درمیان معاہدہ ہوتا ہے۔ اورنگ زیب نے اپنی افواج اک حوصلہ بڑھانے کے لیے اس کے سامنے جوشیلی تقریریں بھی کیں۔ تاکہ ان کے اندر جوش وخروش پیدا ہو۔ دھرمٹ کی جنگ کے لیے تیار کر لیا۔ اورنگ زیب کو معلوم تھا کہ اگر شاہ جہاں میدان جنگ میں اترے تو وہ آسانی سے یہ جنگ ہار جائیں گے ساتھ ہی اس نے کوشش کی کہ سلطان دربار سے نہ نکلیں دوسری طرف دارا شکوہ جلد از جل کامیابی کا سہرا اپنے سر مڈھنا چاہتا تھا اور اس نے کہا کہ اگر آج وہ اورنگ زیب کی باغیانہ اور غدارانہ حرکتوں کی سرزش نہ کر سکا تو عمر بھی اس کی سازشوں کا شکار رہنا پڑے گا۔ شاہ جہاں نے اورنگ زیب سے شہزاد سلیمان شکوہ کی واپسی تک روکنے اور اس کا انتظار کرنے کے لیے کہا۔ اس نے کہا عالم پناہ یقین فرمائیں کہ راؤ چھترسال ہاڑا کے سوار برق انداز خاں کا توپ خانہ باغیوں کی تباہی کے لیے کافی ہے۔ دھرمٹ کا لڑائی سے پہلے شمس الرحمٰن فاروقی نے دارا کی دشمنی اور گھنڈ کو شکست کی وجہ قرار دی ہے۔ ظہیر الدین فاروقی کی کتاب سے ایک حوالہ نقل کیا ہے کہ اس نے نے کہا کہ ''عنقریب میں اس شرعی پا جامہ داروں کو چھترسال کی اردل میں دوڑادوں گا۔''

شعبہ تاریخ، علی گڑھ۔ مسلم یونیورسٹی کے پروفیسر اقتدار عالم اس اقتباس کا جواب دیتے ہوئے لکھتے

ہیں:

''من یمن قیریب ایں کوتہ پانچہ ہار ادرحلیب چھر سال خواہم دوایید'' سب سے پہلے اس جملے کا جوار دو ترجمہ کیا گیا ہے قابل غور ہے کہ ''نہ پانچہ ہا'' کو جس طرح ''شرعی پاجامہ داروں'' میں بدل دیا گیا ہے۔ وہ کچھ شمس الرحمٰن فاروقی کا ہی حق تھا۔ جہاں تک اس فارسی عبارت کا تعلق ہے اس کے بارے میں بلاشبہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ بعض فاش غلطیوں کی حامل ہے۔ جس لفظ کو''کوتہ پائچہ'' پڑھا گیا ہے وہ دراصل ''کوتاں پاچہ ہا'' کوتاہ پاچہ چھوٹی ذات کے ہرن کو کہتے ہیں بعض اوقات تحقیر آمیز انداز میں چھوٹے قد کے آدمی کو بھی کوتاہ پاچہ کہا جاتا ہے۔''32

دھرمٹ کے میدان میں اورنگ زیب نے اپنی فوج کے نظم ونسق کا خاص خیال رکھا اور دارا کی راجہ جسونت سنگھ مقابل ایک بہترین ترکیب رکھی اور آسانی سے دارا کی فوجیوں کو شکست کا مزا چکھاتے ہوئے دھرمٹ کا میدان فتح کر لیا۔

قندھار کی مہم کو میر آتش سید جعفر کی غداریوں کی وجہ سے ناکام دکھایا گیا ہے بعد میں لالہ جو اس ناول میں ایک خوبصورت دوشیزہ اور دل پسند کنیز کے روپ میں دکھایا گیا ہے اس کے ذریعہ دارا کو اطلاع دی جاتی ہے کہ میر آتش سید جعفر غدار ہے میں شاہ جہاں کی علالت کے ساتھ ہی اس کی موت کی افواہ پھیل گئی۔ اس مایوس کن صورت حال میں شاہجہاں نے داراشکوہ کو اپنا ولی عہد مقرر کر دیا جیسے ہی اس کے دوسرے بیٹوں کو یہ خبر ملی وہ بھی تخت کے حصول کے لیے تگ ودو کرنے لگے۔ مراد نے گجرات میں اپنی بادشاہت کا علان کر دیا۔ اورنگ زیب جوان تمام بھائیوں میں سے تیز اور حکومی ذہن سازی میں ماہر تھا مراد سے کہا کہ تمہیں اکیلے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا اور انھوں نے معاہدہ طے کیا اور شجاع نے بھی بنگال میں بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ اور بہار پر قبضہ کر لیا۔ شاہ جہاں نے شجاع کو روکنے کے لیے داراشکوہ کے بیٹے سلیمان شکوہ کو جے سنگھ کے ساتھ فوجی امداد کے ساتھ اس کی سرکوبی کے لیے بھیجا۔ دوسری طرف اورنگ زیب اور مراد جنھوں نے معاہدہ طے کر رکھا تھا۔ داراشکوہ نے سردار جسونت سنگھ اور قاسم خاں کو مہم پر بھیجا۔ دھرمٹ کے مقام پر اپریل 1658ء میں

32: اقتدار عالم۔ مضمون۔ داراشکوہ کا سیاسی پس منظر مشمولہ نذر قاضی عبدالستار۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس۔ علی گڑھ۔ سنِ اشاعت. 2006 ص 212

دونوں فوجیں آمنے سامنے ہوئیں۔مگر مراد اور اورنگ زیب کی فوج کو فتح حاصل ہوئی۔ان کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنے بیٹے سلیمان شکوہ کو بھی بلایا مگر وہ بروقت نہیں پہونچ سکا۔شاہ جہاں اس اگر ان بھائیوں میں صلح کرادیتا تو ساموگڈھ میں تاریخ ساز جنگ نہ ہوتی۔

ساموگڈھ کی جنگ 29 مئی/1658:

اس جنگ کے بارے میں قاضی عبدالستار کے مشہور جملے رقم طراز کرتی ہوں:

''ساموگڈھ کی لڑائی شاہجہاں کے دو بیٹوں کے مابین تخت وتاج کے حصول ہی کے لیے نہیں لڑی گئی بلکہ یہ دو نظریوں کی جنگ تھی جس کا فیصلہ ساموگڈھ کے صفحے پر تلوار کی نوک سے لکھا گیا۔''33

ساموگڈھ اس وقت فتح آباد کے نام سے جانا جاتا ہے۔ساموگڈھ کے معرکے کی شروعات شاہ جہاں کی بیماری کے بعد ہوتی ہے۔جیسے ہی چاروں بیٹوں کو پتہ چلتا ہے کہ شاہ جہاں کی حالت نازک بنتی جا رہی ہے ویسے ہی اس کے فرزندوں میں تخت وتاج کو حاصل کرنے کی رسہ کشی کی شروعات ہو جاتی ہے۔ساموگڈھ کی یہ جنگ ستمبر 1657 میں جب عوام کو یہ افواہ حاصل ہوئی کہ شاہ جہاں کی موت ہو چکی ہے اس کے سوگ میں عوام حیرت واستعجاب میں مبتلا ہوگئی اور ان کے غم میں دکانیں بند ہوگئیں۔دارا جو ہمہ وقت محل میں ہوتا تھا اس نے شاہ جہاں کے دل میں باقی بھائیوں کے خلاف زہر بوتا رہتا تھا۔دارا کو سب سے زیادہ خوف اورنگ زیب سے لگا رہتا تھا۔راجپوتوں کا قتل عام کرتے ہوئے اورنگ زیب اور مراد اُجین پہنچے اور وہاں سے گوالیار سے دھول پور گئے۔23 مئی/1658 کو اورنگ زیب نے گوالیار چھوڑا اور ندی کے دلدلی علاقے کو پار کرکے تین دن کا سفر طے کرکے آگرہ کے مشرقی سمت میں واقع ساموگڈھ کے نزدیک آیا۔دارا شکوہ کو 28 مئی/1658 کو اس بات کی خبر ملی اور اس نے اورنگ زیب کی افواج کا سامنا کرنے کے لیے ایک بڑا لشکر ساتھ لیا اور شاہ جہاں کی ہدایتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے میدان میں اتر آیا۔

ساموگڈھ کے میدان کو فتح کرنے اور تخت وتاج کے حصول کے لئے اورنگ زیب نے جتنی محنت،مشقت اور کوشش کی اس کا اندازہ مندرجہ ذیل اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے۔جہاں اورنگ زیب دریائے چنبل تک پہونچ چکا تھا اور دلدل کے سہارے سفر کیا جہاں کی زمین دھنسی رہی تھی۔راستہ نہایت

33: داراشکوہ۔قاضی عبدالستار۔ص:146

خوفناک اور پر خطر تھا مگر اورنگ زیب کے مستحکم ارادے نے اس دلدلی راستے کو بھی روند ڈالا اس خطرناک سفر کا ذکر اس طرح قاضی صاحب نے کیا ہے:

''زمین نرم ہونے لگی۔ گھوڑوں کے سم دھنسنے لگے۔ بلندیوں سے دریا نظر آنے لگا، گرم ترین دنوں کی گرد تر دوپہر تپنے لگی۔ تب اورنگ زیب نے امرء کی گذارش پر آرام کا حکم دیا جو سر گوشیوں کے ذریعہ لشکر میں پہنچایا گیا۔ سفارے اور طبل ساتھ ہی نہیں لائے گئے تھے۔ حاجب اور نقیب تک معطل تھے۔ کسی کو زور سے بولنے کی اجازت نہ تھی۔ جب شہزادے نے اپنے گھوڑے کی پاکھر پر بیٹھ کر خود اتارا تو ایک خادم پنکھا لے کر کھڑا ہو گیا لیکن ابرو کے اشارے سے ہٹا دیا۔ اور اس نے عام سپاہیوں کے ساتھ تھوڑے سے خشک میوے چبا کر راجہ جے کار سنگھ کا لایا ہوا پانی پیا۔ ظہر کی نماز کے بعد دریا پر چڑھائی بنفس نفیس گھوڑے سے کود کر دلدل میں پھاند پڑا۔ اور سارا لشکر خاں دوران کے قدموں کے نشانوں پر پاؤں گاڑتا چل پڑا اوپر سیدھا آفتاب تھا۔ اور نیچے گہرا دلدل اور جسم پر فولاد کا لباس اور سامان ضرور تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں قیامت برپا ہو گئی۔ خود شہزادہ کمر تک دلدل میں دھنس گیا۔ میر بخشی اپنے گھوڑے کی لگام چھوڑ کر مدد کے لیے بڑھنے کی کوشش کرتے تو ڈانٹ دیا گیا۔ اورنگ زیب پیٹ کے بل سیدھا ہو گیا۔ آہستہ آہستہ پاؤں نکالے اور کسی نہ کسی طرح کھڑیوں کی شدید جان لیوا محنت و مشقت کے بعد پولے پولے پاؤں رکھتا آگے بڑھنے لگا۔ اور پوری گردن موڑ کر لشکر کو ملاحظہ کیا تو گردن گردن تک دلدل میں دھنسے ہوئے گھوڑے زبانیں نکالے ابلی ہوئی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے اور بے بسی سے مر رہے تھے۔ آدمی پیاس سے تڑپ رہے تھے پانی کی چھاگلیں دلدل میں دھنسی گئی تھیں۔ اشرفیوں اور روپیوں کے اونٹ شہر آسمانی کا شکار ہو کر رہ گئے تھے۔ ان کے بلبلانے اور گھوڑوں کے ہنہنانے اور ہاتھیوں کے چنگھاڑنے کے علاوہ کوئی آواز نہ تھی۔ سپاہی مر رہے تھے لیکن اورنگ زیب کے خوف سے چیخ نہ سکتے تھے۔'' 34

اس طرح اورنگ زیب نے اپنی قوت ارادی پر خطر راستہ اختیار کر کے چنبل کو فتح کر لیا۔ یہ اورنگ زیب کی قیادت اور ہمت تھی اور اس کی دور اندیشی تھی جس نے دماغ کے ذریعہ آدھی جنگ کو جیت لیا

34: دارا شکوہ۔ قاضی عبدالستار۔ ص 105

تھا۔قاضی عبدالستار نے ساموگڈھ کی جنگ کا خوبصورت منظر کھینچا ہے اور اپنے نظر انداز قلم سے دونوں بھائیوں کے درمیان کی جنگ کو بہترین انداز میں پیش کیا ہے۔ساموگڈھ کی جنگ کے مناظر کو پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم بہ نفس نفیس اس جنگ میں شریک ہیں اور داغی جا رہی توپوں، تیر وتلوار کی جھنکار و پھنکار سے خود کو بچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔اس جنگ میں اورنگ زیب کے اپنی چال دوراندیشی اور قیادت وذہانت سے جیت لیا جب کہ اگر اس جنگ کو ساز وسامان کی حیثیت سے دیکھا جائے تو اورنگ زیب کی فوج دارا کے مقابلے میں کمتر تھی ساموگڈھ کے میدان میں خوں ریز جنگ ہوئی۔داراشکوہ جمنا کے کنارے اپنے لشکر کے ساتھ پڑاؤ ڈال دیا اور عماد پور کے پاس ایک گاؤں ساموگڈھ کے میدان میں یہ تاریخ ساز جنگ ہوئی جس نے مغلیہ حکومت کو تبدیل کر کے رکھ دیا۔یہ جنگ جس نے اکبر ثانی کی تاریخ بننے سے روک دیا اور ایک ایسے انسان کو بادشاہ کی خلعت پہنا دی جس نے ہندوستان کی سیاست کا رخ ہمیشہ کے لیے تبدیل کر دیا نہ صرف تبدیل کیا۔دارا نے اس میدان میں مختلف غلطیاں کیں جس کا ذکر قاضی عبدالستار نے خوبصورتی سے کیا۔اگر دارا کے پاس فوجی نظم ونسق کی صلاحیت ہوتی تو وہ آسانی سے یہ میدان فتح کر لیتا مگر اس نے تکبر اور جوش ضعف اعتقادی کے چلتے بار بار غلطی کرتا رہا۔جب کہ اس کے جاں نثار ساتھی آخر دم تک اس کے ساتھ رہے۔اور وہاں اگر نہ جا کر دہلی چلا گیا۔دوسری طرف اورنگ زیب اپنے بیٹے کو بھیج کر قلعے کا محاصرہ کر لیا۔اور خود اعتمادالدولہ میں رک گیا۔

ساموگڈھ کی فتح کے بعد اورنگ زیب کو شاہ جہاں نے قلعہ کے اندر بلایا۔جہاں اس کا ادارہ مصالحت کے بجائے اس کو قتل کرنے کا تھا۔اور اس بات کا علم اورنگ زیب کو ہو گیا اور وہ جو شاہ جہاں سے ملنے جا رہا تھا راستہ میں ہی واپس ہو گیا۔اس کے بعد ناول میں اورنگ زیب کے ذریعہ مراد کے قید ہونے کا ذکر ہے۔ اورنگ زیب نے ہندوستان کے تمام مرزاؤں کو خرامین لکھے کہ سلیمان شکوہ اور داراشکوہ کو کوئی پناہ نہ دیں۔ اس طرح سے دارا کے پاس پناہ کے لیے ایران کے سفر کے علاوہ کوئی راستہ نہ بچ سکا۔راستے میں اس کی بیگم نادرہ بیگم کا انتقال ہو گیا۔اجمیر کی شکست کے بعد دارا کے پاس ان کوئی راستہ نہ بچا تھا وہ داور کے زمیندار ملک جیون سے رابطہ کیا اور اس سے مدد مانگی۔ملک جیون کو دارا نے زندگی سونپی تھی مگر اس نے بھی غداری کی اور دارا کو اورنگ زیب کے حوالے کر دیا۔اورنگ زیب کے پاس کوئی خطرہ نہیں تھا۔اور اس نے نجومیوں کی

بتائی ہوئی تاریخ کے مطابق جشن تاج پوشی آراستہ کیا۔ قاضی عبد الستار نے لکھا ہے کہ اورنگ زیب جیسی خوبصورت تاج پوشی کسی مغل شہنشاہ کے حصے میں نہیں آئی:

> ''مسلم ہندوستان کی پوری تاریخ میں اورنگ زیب کا جشن تاج پوشی اپنی شان وشوکت کے لحاظ سے بے مثل تھا۔ ہر چند کی شاہ جہاں سب سے شاندار مغل شہنشاہ تھا لیکن اس کی تخت نشینی کے وقت تخت طاؤس وجود میں نہ آیا تھا۔ لال قلعہ کی بے نظیر مرقع محلات ابھی تعمیر نہ ہوئے تھے۔ جس کے ویران نظارے آج بھی ہمارے ذہنوں میں طلسمی دریچے کھول دیتے ہیں۔ وہ دل بادل شاہانہ ابھی تیار نہ ہوا تھا جس کے افسانے ساری دنیا میں مشہور ہوگئے تھے۔'' 35

قاضی صاحب لکھتے ہیں:

> ''ساموگڈھ؟
>
> ساموگڈھ کے سینے پر وہ میزان نصب ہوئی جس کے ایک پلڑے میں روایت تھی اور دوسرے میں تجربہ تھا۔ ایک میں عقل تھی، دوسرے میں دل، ایک طرف سیاست تھی، دوسری طرف محبّ، ایک طرف فلسفہ وحکمت تھا، تو دوسری طرف شعروادب اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک طرف تلوار تھی اور دوسری طرف قلم اور یہاں بھی قلم کو تلوار سے قلم ہوتا تھا۔'' 36

دارا شکوہ کو قید کر کے جب لایا جاتا ہے تو اس سے گذارش کی جاتی ہے کہ اس کو قتل کرنے کے بجائے گوالیار کے قلعے میں قید کر دیا جائے مگر اس نے یہ عرضی مسترد کر دی اور دارا اور اس کے بیٹے کو ایک نہایت چھوٹے ہاتھی پر بیٹھا کر آگرہ کی گلیوں میں گھمایا گیا۔ یہاں قاضی عبد الستار نے دارا کا نہایت پرسوز منظر کھینچا ہے جہاں وہ ایک مغل شہزادے بجائے کوئی نادار نامدار گداگر نظر آتا ہے مگی ایسی حالت میں ہونے کے باوجود جب ایک بھیکاری ہاتھ پھیلاتا ہے تو اپنا سوتی کپڑا نکال کر دیتا ہے۔ قاضی عبد الستار نے اس فقیر کا تعارف قندھار کی لالہ کے روپ میں کرایا۔ تاریخ میں یہ واقعہ موجود ہے مگر یہاں قاضی صاحب کے تخئل کے پرواز کی داد دینا پڑتی ہے کہ انھوں اس فقیر کا ذکر قندھار کی لالہ کے روپ میں کرایا ہے افسانہ طرازی کے فن

35: دارا شکوہ۔ قاضی عبد الستار۔ ص: 154

36: دارا شکوہ۔ قاضی عبد الستار۔ ص 114

اور غیر تاریخی واقعات کا خوبصورت امتزاج ناول کے حسن میں چار چاند لگا دیتا ہے المیہ بیان کے ساتھ ہی رعایا کے دکھ اور درد کا بیان جو دارا کے قید ہونے پر میں آنسوؤں کے نالے بہائے گئے۔ اور ایک جلسے میں دارا کو قتل کرنے کا فتویٰ جاری کیا گیا۔ دانش مند خاں نے دارا کی جان بچانے کی کوشش کی باقی لوگوں نے اس قتل کو ٹھیک گردانا۔ آخر میں عبدالوہاب صدر قاضی نے دارا کو اسلامی قوانین کی بے حرمتی میں سزائے موت کا فتویٰ دیا۔ اور اس کا سر دھڑ سے جدا کر کے دہلی کے راستوں پر گھمایا گیا۔

اپنے بھائیوں کو سزا دینے کے بعد اورنگ زیب کے کردار کا ایک اور پہلو ہمارے سامنے آتا ہے کہ جتنے بھی لوگ بھائیوں کے مابین اقتدار کی جنگ میں غداری یا سازش میں شریک تھے سب کو قتل کرا دیا۔ جب دارا کا سر سونے کے طشت میں رکھ کر اورنگ زیب کو پیش کیا گیا تو اس نے حقارت سے نگاہ ڈالتے ہوئے کہا:

''بدبخت۔۔۔ ہم نے زندگی ہی میں تجھ پر نگاہ نہ کی اب تجھے کیا دیکھیں گے۔'' 37؎

غرض اس طرح اورنگ زیب کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر قاضی عبدالستار نے کم مگر گہری نظر ڈالی ہے۔

مورخوں نے لکھا ہے کہ ساموگڈھ کی جنگ دارا جیت جاتا ہے اگر خلیل اللہ خاں دارا شکوہ کو دھوکہ نہیں دیتا۔ خلیل اللہ خاں فوج میں دارا کے ساتھ تھا مگر اس کی تلوار اورنگ زیب کے لیے تھی اور اس نے دارا کو اپنی چال سے آسانی سے ہرا دیا کیونکہ اس نے خلیل اللہ خاں چند سال پہلے جوتوں سے پیٹا تھا اور اس کی بے عزتی کی تھی اور اس کا بدلہ اس نے میدان جنگ میں لے لیا اور دارا کو یقین دلایا کہ میدان جنگ اس کے ہاتھ ہیں موقع ملتے ہی وہ بھی حملہ کریں گے اور اس نے دھوکے سے دارا کو ہاتھی سے اتروا کر گھوڑے پر بیٹھا دیا۔ دارا شکوہ کی فوج کو لگا کہ دارا مارا گیا اور وہ میدان جنگ چھوڑ کر بھاگنے لگے کیونکہ ان کی فوج کے نامی شہ سوار رستم خاں فیروز جنگ، مہراؤ چھتر سال ہاڑا جیسے نامی گرامی فولادی شہ سالار مارے جا چکے تھے۔ مہاراجہ رام سنگھ بھی دارا کے نام پر قربان ہو چکا تھا۔ اس طرح ایک جھوٹ سے دارا نے میدان جنگ میں خلیل اللہ خاں پر بھروسہ کیا جس کے بارے میں اسے پہلے سے علم تھا کہ یہ اورنگ زیب کے ساتھ ہے۔ خلیل اللہ خاں دارا کو ہاتھی سے اتار کر گھوڑے پر بیٹھاتا ہے اس کو قاضی صاحب نے استعارات کے ساتھ بیان کیا ہے جس کو

37؎: داراشکوہ۔ قاضی عبدالستار۔ ص163

آسانی سے مسجھ پانا مشکل ہے اگر ہمیں تاریخی ناموں کا علم نہ ہو تو یہ اقتباس سمجھ پانا ناممکن ہے:

''اگر صاحب ''فتح جنگ'' پر جلوس فرما ہے اور یلغار میں تاخیر ہوئی تو امکان ہے کہ شاہی ملازم شہزادے دوم کے مقابلے سے عاجز ہو جائیں اور باغی کو فرار کا موقع مل جائے۔ اس لیے نمک خوار دولت کی گذارش ہے کہ ولی عہد سلطنت ''برق پا'' پر جلوس آرا ہو کر باگیں اٹھا دیں۔''[38]

یہاں ''فتح جنگ'' داراشکوہ کے ہاتھ کا نام ہے اور ''برق پا'' اس کے گھوڑے کا نام ہے۔

غرض دارا میدان جنگ میں ہار گیا اور اورنگ زیب نے اپنی صلاحیت، تدبیر اور فوجی لیاقت، قیادت اور شجاعت سے ساموگڈھ کے میدان کو فتح کر لیا۔

ساموگڈھ کی جنگ میں خلیل اللہ خاں کی سازشی داستان کو شمس الرحمٰن فاروقی نے فرضی گردانا ہے۔ اس واقع کی اصلیت اور حقیقت بیان کرتے ہوئے اقتدار عالم نے مستند تاریخ کے حوالے سے اس داستان اس واقعہ کو فرضی قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس طرح کا ایک مسئلہ خلیل اللہ خاں کی ساموگڈھ کی لڑائی میں غداری کا ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی کے خیال میں اورنگ زیب اور خلیل اللہ خاں کی سازش کی داستان ''فرضی'' ہے۔ مسز چندا پنت کے غیر مطبوعہ تحقیقی مقالے سے استفادہ کی بنیاد پر وہ دعوی کرتے ہیں کہ خلیل اللہ خاں کے علاوہ اعتماد الدولہ کے خاندان کے دوسرے افراد میں سے میر جملہ اور شائستہ خاں ایسی با اثر امرا بھی موجود تھے جن کے ہوتے ہوئے خلیل اللہ خاں کی غداری اتنی بڑی جنگ کا فیصلہ نہ کر سکتی تھی اس سے پہلے کہ ہم نفس مسئلہ پر کوئی رائے دیں یہ مناسب سمجھتے ہیں کہ شمس الرحمٰن فاروقی سے دور خواست کریں کہ وہ مسٹر چندا پنت کے مقالے کو دوبارہ پڑھیں۔ مسٹر پنت ایک محنتی اور ہونہار اسکالر ہیں ہم کسی طرح یقین کر سکتے ہیں کہ انھوں نے اپنے مقالے میں میر جملہ اعتماد الدولہ کے خاندان کا ایک فرد دکھایا ہوگا۔ میر جملہ کا اس خاندان سے کوئی تعلق نہیں تھا وہ دکن سے آیا تھا اب وہ گیا خلیل اللہ خاں کی غداری کا مسئلہ تو ہم عرض کریں گے کہ ہمیں بار بار یہ کہتے ہوئے شرم آ رہی ہے کہ شمس الرحمٰن فاروقی ایک بار غور سے ان ہی کتابوں کو پڑھ جائیں جن سے انھوں نے

---

[38]: داراشکوہ۔ قاضی عبدالستار۔ ص:145

ڈھڑلے کے ساتھ حوالے دیئے ہیں ۔کئی ہم عصر ماخذ میں خلیل اللہ خاں کی ان مشتبہ حرکات کا ذکر ہے جس کو کسی حد تک ساموگڈھ میں دارا کی شکست کا سبب بنیں مثلاً برنیر نے ساموگڈھ کی لڑائی کا جو حال لکھا ہے اس کو دیکھ لیا جائے تو یہ واضح ہو جاتا ہے کہ کم سے کم اس زمانے میں اکثر لوگ خلیل اللہ خاں کے طرز عمل کو غداری کے مترادف سمجھتے تھے۔اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے کہ خلیل اللہ خاں کا منصب اتنا اونچا نہ تھا کہ اس کے رشتہ دار شائستہ خاں کا۔اہم بات یہ ہے کہ ساموگڈھ میں مینہ کے تیس ہزار سواروں کی کمان اس کے ہاتھوں میں تھی۔ برنیر نے لکھا ہے:

خلیل اللہ خاں جس کے پاس میمنہ کے تیس ہزار سواروں کی کمان تھی اکیلا اتنی استعداد رکھتا تھا کہ اورنگ زیب کی فوج کو تباہ کر دے لیکن وہ لڑائی کے باہر رہا جب کہ دارا میسرہ کے سواروں کی سربراہی میں نہایت دلبری کے ساتھ لڑ رہا تھا اور دشمن پر بھاری پڑ رہا تھا۔ اس غدار نے یہ بہانہ کیا کہ اس کے سوار وقت ضرورت کے لیے الگ رکھے گئے ہیں اور اسے حکم ہے کہ کسی بھی قیمت پر نہ کسی طرف آگے بڑھے نہ ہی تیر چلائے ، چاہے کیسی بھی حالت کیوں نہ ہو لیکن لڑائی سے اس طرح گریز کے پس پشت دراصل نہایت گھٹیا قسم کی دھوکہ بازی کارفرما تھی۔۔۔اس زمانے سے کچھ عرصہ پہلے خلیل اللہ خاں نے دارا کے ہاتھوں جوتے کھا کر یہ ذلت اٹھائی تھی اور اس کا خیال تھا کہ اب اس ذلت کا بدلہ لینے کا وقت آ گیا ہے۔'' [39]

قاضی عبدالستار نے ساموگڈھ میں داراشکوہ کی شکست کو ایک نظریہ کی شکست مانا ہے اور اورنگ زیب کی فتح انھیں ایک کٹر مذہبی اسلامی نظریہ کی جیت قرار دیا ہے۔انھیں لگتا ہے کہ اگر دارا یہ جنگ جیت جاتا تو وہ اکبر ثانی بن سکتا تھا اور ہندوستان ایک ایسا ملک بن جاتا ہے جہاں اسلام ایک الگ مذہب نہ بن کر ہندوستان کی تہذیبی وثقافتی فضا میں رچ بس جاتا ہے۔انھیں لگتا ہے کہ مجدد الف ثانی کی تحریک احیاء نے بھی ایک طرح اورنگ زیب کی جیت میں رول ادا کیا کیونکہ اکبر اعظم نے جس طرح اسلام کی شناخت اور اس کے تشخص کو اپنے دین الٰہی کی وجہ سے ملوا بنا دیا تھا اس طرح سے اصلی اسلام اور سنت کی پہچان مشکل ہو گئی۔ دین کے نام پر لادینت اور شرک وبدعت کا چاروں طرف زور تھا جس کے پیش نظر شیخ احمد سرہندی نے اصل

39: نذر قاضی عبدالستار۔ پروفیسر غیاث الدین۔ص 214

اسلام قرآن وحدیث کے مطابق ہندوستان میں دینے کی کوشش کی۔ساتھ ہی انھوں نے قلم کے ذریعہ مغل دربار کے امراء کو بھی راہ راست پر لانیکی کوشش کی۔ان کوششوں کے نتیجے میں ہی جہانگیر کو تخت وتاج حاصل ہوا۔قاضی عبدالستار لکھتے ہیں:

''ساموگڈھ نے یہی نہیں کیا کہ ہندوستان کا تاج دارا سے چھین کر اورنگ زیب کے سر پر رکھ دیا بلکہ مغل تاریخ کے اس زریں باب پر مہر لگادی جسے اکبر کا عہد کہا جاتا ہے وہ عہد جس نے سیاست کو قومیت کا اعتبار عطا کیا تھا جس نے ہندوستان کے قدیم ادب کو نئی زنگی اور نئی تفسیر کا خلعت پہنایا تھا جس نے پرانے فنون لطیفہ کو نقاہت اور اسناد کا حق بخش دیا تھا۔وہ مبارک عہد وہ سنہرا زمانی مجدد الف ثانی کی تحریک احیاء کے ہاتھوں ساموگڈھ کے میدان میں ہار گیا۔خاک وخون میں نہلا گیا۔وہ علم اس طرح سرنگوں ہوگئے کہ پھر کبھی کسی کاندھے پر اس شکوہ سے نہ لہرا سکے۔''40

''پاکستان کے ڈرامہ نگار شاہد ندیم کے مطابق ساموگڈھ کے میدان میں اورنگ زیب کے ہاتھوں دارا کی شکست نے ہندوستان اور پاکستان کی تقسیم کا بیج بو دیا تھا۔بلکہ برصغیر کی تاریخ اور سیاست کو ایک ایسا آلہ عطا کی جو پاکستان تو جنم دیا اور ہندوستان میں مسلمانوں کے لیے دلدلہ سیاست پیدا کی۔جہاں ہندوستانی مسلمان نہ نکل سکتا ہے اور نہ ہی دھنس سکتا ہے۔سیاست دانوں نے اپنی ضرورتوں کے تحت ان کو کبھی باہر تھوڑا نکالتے ہیں کبھی اور اندر دھنسا دیتے ہیں۔''41

زبان و بیان: ادب میں زبان و بیان کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔اس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ اردو کی پہلی تنقیدی کتاب 'مقدمہ شعروشاعری' میں حالؔی نے لفظ ومعنی، زبان و بیان، مواد ومضامین پر مغز بحث کی ہے جس سے اردو کا طالب علم واقف ہے۔زبان کا یہ اثر ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف صورت حال کی تصویر ابھارتا ہے بلکہ اس صورت حال سے بڑے اور نہ دکھائی دینے والے منظروں کو بھی ابھار دیتا ہے۔یہ کام بہت وقت طلب اور مشکل ہوتا ہے۔مگر ہمارے اردو ادیبوں نے اس مشکل اور جوکھم بھرے کاموں کو بھی بڑی ہنرمندی اور کامیابی سے کرنے کی کوشش کی ہے۔زبان و بیان کی اہمیت کا

40: داراشکوہ۔قاضی عبدالستار۔ص:147

41: داراشکوہ۔قاضی عبدالستار۔ص105

اندازہ اس کی قدر و قیمت کو وہی سمجھ سکتا ہے اور بھرپور داد دے سکتا ہے جو لفظ کی طاقت اور زبان کے طلسم کو سمجھتا ہو۔ اور یقیناً قاضی عبدالستار کی تحریروں کو پڑھتے وقت اکثر قاری داد دینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ ناول کا سب سے اچھا اور قابل تعریف عنصر اس کا اسلوب ہے۔ جہاں منظر نگاری کے تحت مغلیہ دور کی طرز و تہذیب، آرائش و زیبائش، سلام و آداب کے خوبصورت مناظر دلکش انداز سے بیانیہ کی عمدہ مثال کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ قاضی عبدالستار نے اس ناول میں آرائش و زیبائش۔ لباسوں کی سجاوٹ بناوٹ، دربار کے ساز و سامان، آدابِ شہنشاہی کے مختلف جزئیات کا بیان اتنا زیادہ کیا ہے کہ کہیں کہیں ناول میں سست رفتاری پیدا ہو جاتی ہے اور اصل قصہ ذہن سے محو ہو جاتا ہے۔ یہ قاضی عبدالستار کا ایک طرز تخلیق ہے جس کے وہ موجد ہیں۔

قاضی عبدالستار کے انھیں خوبیوں اور حقیقت نگاری کی دولت انھیں تاریخی ناول نگاری میں ایک منفرد مقام حاصل ہوا ہے زبان کی شناخت، جملوں کی دریافت، لفظوں کی موضوع و مواد کے ساتھ الفاظ کی ہم آہنگی قائم کرنے اور اس ہم آہنگی سے محاکات ابھارنے اور تصویروں کو متحرک کرنے میں جتنی محنت قاضی عبد الستار کے یہاں ملتی ہے کسی اور کے یہاں مشکل سے ہی دکھائی دیتی ہے۔ ناول ''داراشکوہ'' میں زبان و بیان کی یہ خوبصورت آمیزش بہت سے مقام پر دکھائی دیتی ہے۔ جہاں ان کا خوبصورت اسلوب کلاسیکی الفاظ کی قبا میں لپٹے معنی و مطلب سے آراستہ و پیراستہ ہو کر مغل دربار میں شاہانہ انداز سے کھڑا نظر آتا ہے۔ ح قاضی صاحب کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے ناولوں میں تشبیہات و استعارات کا جلوس نکال دیتے ہیں۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''حضرت دہلی شاہجہاں آباد کی خلعت زیب تن کی جامع مسجد کی حمائل سینے سے لگائی۔ قلعہ معلیٰ کی مرصع عمارتوں کے زیورات ہاتھ گلے میں پہنے اور دارالسطنت کی مندیل پر تخت طاؤس کا گوہر نگار سر پیچ باندھ کر شہنشاہ ابوالمظفر شہاب الدین محمد شاہجہاں صاحب قران ثانی کے حضور میں سات سلام پیش کیے۔''[42]

ناول داراشکوہ میں جا بہ جا ایسے جملے اور اقتباس دکھائی دیتے ہیں جو اپنے رنگینیوں، رعنائیوں سے قارئین کی آنکھوں کو خیرہ کئے دیتے ہیں۔ جو شاہانہ انداز کے ساتھ جلوہ گر ہوتے ہیں۔ قاضی عبدالستار نے

42: داراشکوہ۔ قاضی عبدالستار۔ ص:1

اپنی بیشتر تخلیقات میں زندگی کے ان موضوعات و معاملات کو مرکز بنایا ہے جن کا تعلق نوابین اور بادشاہوں کے دربار کے حکمرانوں ،امیروں اور رئیسوں گزر برداروں، شہزادوں ،شہزادیوں ،کنیزوں ،مغلانیوں ، منصب داروں ،خدمت گزار، فوجی سپہ سالاروں اور عام سپاہیوں تک پھیلا ہوا ہے، فن کار کی نگاہ ایوانوں سے لے کر غسل خانوں تک پہنچتی ہے ایک ایک جزئیات کو باریکی سے دیکھتی ہے دور اور قریب سے مشاہدہ کرتی ہے پھر انھیں ہو بہو لفظوں میں ڈھال دیتی ہے۔اس عمل میں ایسی چابک دستی اور ہنرمندی دکھائی دی ہے کہ ایک ایک تصویر بولتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔

''وہ غضب سے کانپ اٹھا۔تالی بجانے کے لیے زانو سے اٹھ گئے لیکن لالہ طلوع ہو چکی تھی جیسے آسمان سے زہرہ اترتی ہو۔سیاہ مہین ریشم کی پشواز سے چھلکتی ہوئی بلند و بالا محرم پر موتیوں کی لڑیاں چمک رہی تھیں۔سیاہ چست پائجامے ست جھانکتے ہوئے سفید گول ٹخنوں پر گھنگھرو بندھے تھے۔کمر پر مرصع پٹکا کسا تھا جس کے دونوں سرے گھٹنوں تک نیچے پڑے تھے۔بازوؤں پر الماس کے جوشن، کلائیوں میں جڑاؤ جہانگریاں، گلے میں مروابد، کاسٹ لڑا ہار، آدھے سر پر چھایا ہوا جھومر، پیشانی پر ٹیکا۔ایک ایک انگلی انگریوں سے آراستہ، کولھے پر زرنگا عرصراحی اور سر پوش سے ڈھکا ہوا زریں طشت سر پر رکھا ہوا۔اس دھج سے وہ آ رہی تھی ہر قدم کو ہلکی سی ٹھوکر سے آراستہ کئے ساعت کی گردن میں غنا کے ہار پہناتی ہوئی تھم تھم کر آگے بڑھ رہی تھی۔اسی چھپ سے تخت کا طواف کرتی رہی نگاہ کو پڑھتی رہی۔'' 43

قاضی صاحب نے یہاں جس طرح سے لالہ کے ذکر کے ساتھ اس کی منظر کشی کی ہے اور جملوں کو الفاظ کے خوبصورت امتزاج سے پرو دیا ہے وہ قابل رشک ہے۔ایک ایک چیز کو اتنی صلاحیت کے ساتھ اسی طرح بیان کیا ہے کہ ایک جیتی جاگتی تصویر بھی پھیکی لگنے لگے۔قاضی صاحب کے اس باریک بینی کی داد دیئے بغیر ایک کامیاب مصور بھی نہیں رہ سکتا۔انھوں نے الفاظ سے جتنی خوبصورت تصویر بنائی ہے وہ حقیقت کی تصویر سے بھی خوبصورت نظر آتی ہے۔اگر قاری جلدی جلدی قاضی صاحب کے ناولوں کا مطالعہ کرنا چاہتا ہے تو وہ یقین اتنا لطف اندوز نہیں ہو پائے گا جتنا صبر و سکون سے مطالعہ کرنے والا ان قاری محسوس کرے گا

43: داراشکوہ۔قاضی عبدالستار۔ص: 111

کیونکہ قاضی صاحب ایک ایک فقرے میں اکثر ایسی باتیں یا واقعات لکھ جاتے ہیں جو آسانی سے سمجھ میں نہیں آتی جو دوسروں کے یہاں وہی واقعہ لکھنے کے لیے کئی صفحات درکار ہوتے ہیں مگر کبھی منظر نگاری اور جز ئیات نگاری میں قاری الجھ کر رہ جاتا ہے اور وہ الفاظ کے طلسم میں واپس گرفتار ہو جاتا ہے۔ کہ اس کا ذہن واقع سے ہٹ کر الفاظ کی بھول بھلیاں میں کھو جاتا ہے اور ناول کی فضا بوجھل ہونے لگتی ہے۔ قاضی صاحب کے بیان میں یہ خامیاں نظر آتی ہیں مگر ایسا مشکل سے چند جگہوں پر ہی دکھائی دیتا ہے بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ قاضی صاحب نے مناسب وموزوں لفظوں کا نہ صرف انتخاب کیا ہے بلکہ انھیں اس طرح سجایا اور سنوارا ہے کہ ان سے روشنی پھوٹ پڑتی ہے ساتھ ہی بعض صورتوں میں موسیقی کی جھنکار بھی سنائی دینے لگتی ہے۔ ویسے یہ وصف قاضی عبدالستار کی تمام تحریروں میں موجود ہے مگر اس کا زیادہ نمونہ ''داراشکوہ'' میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ داراشکوہ پڑھتے وقت قدم قدم پر واہ واہ کے جملے خود بہ خود نکل پڑتے ہیں۔

فضا آفرینی: کسی ناول کے نہایت ضروری ہوتا ہے۔ تاریخی ناول لکھتے وقت اگر تخلیق کار فضا آفرینی نہیں کرسکتا تو وہ کسی بھی قیمت پر ایک بہترین ناول خلق نہیں کرسکتا ہے۔ اس لیے ناول لکھنے کے لیے ایک تخلیق کار کو اس پر بطور خاص دسترس ہونی چاہیے۔

قاضی عبدالستار لکھتے ہیں:

> ''تاریخی ناول کا معاملہ یہ ہے کہ وہاں کوئی چیز نظر کے سامنے نہیں ہے۔ سب کچھ الفاظ کے پردوں میں گم ہوتا ہے اور آپ کو وہ پردہ ہٹا کر کردار کی زندگی میں جھانکنا پڑتا ہے۔ فضا آفرینی تاریخی ناول کی ریڑھ کی ہڈی ہے۔ اگر کوئی ناول نگار ہے فضا کی تخلیق پر قادر نہیں ہے تو وہ ناکام تاریخی ناول ہے فضا کی تخلیق کے لیے ضروری ہے کہ اس عہد کی چھوٹی سے چھوٹی تفصیلات اور معمولی سے معمولی جز ئیات کا علم بھی ہو اور اس کے انتخاب کا سلیقہ بھی۔''[44]

غرض اس کے بعد انھوں نے ٹالسٹائے کے ناول War and Peace کی مثالیں پیش کی ہیں۔

اس طرح قاضی عبدالستار کے تاریخی ناولوں میں فضا آفرینی کی ایک عمدہ مثال نظر آتی ہے جہاں ایک

44: اسرار و گفتار۔ راشد انور راشد۔ عرشیہ پبلی کیشنز۔ نئی دہلی۔ سنِ اشاعت۔ 2014 ص 277

ایک منظر صاف صاف دکھائی دیتا ہے اور مصنف جس طرف چاہتا ہے قاری کو بہالے جاتا ہے۔

ساموگڑھ میدان جنگ کا ایک منظر پیش کرتی ہوں یہاں قاری قاضی عبدالستار کے بیانیہ کا بہ حسن خوبی اندازہ لگا سکتا ہے:

''برق انداز خاں کو حکم دیا جائے کہ دشمن پر آگ کی بارش کر دے۔نصرت خان بذات خود صفوں کو چیرتا نکلا اور ساتھ ہی نقادوں پر چوٹ پڑی اور جنگ کے آغاز کا اعلان ہو گیا۔

برق انداز خاں نے اپنے سرخ بھاری جھنڈے کو جو بندھا ہوا تھا زمین پر گاڑ دیا۔اور توپیں جو بارود اور گولوں سے بھری انتظار کر رہی تھیں فلیتہ دیکھتے ہی دغنے لگیں۔ان کی بھیانک آوازوں سے زمین ہلنے لگی۔ ہاتھی چنگھاڑنے لگے۔گھوڑے الیلیں کرنے لگے۔اور چشم زدن میں تمام آسمان سیاہ گاڑھے دھوئیں سے بھر گیا۔دھوئیں کے اس موٹے نقاب کے اس طرف سے دشمن کی توپوں کی ایک باڑھ سنائی دی پھر آوازیں گونجنے لگیں۔آدمیوں اور جانوروں کی سمجھ نہ آنے والی آوازوں کے حسب توفیق معنی پہچانے جانے لگے۔''45

جنگ ایک دوسرے کے مقابلے کی تھی ایک طرف جہاں داراشکوہ کے پاس راجپوتوں کی شجاعت اور بہادری کے قصے تھے وہیں دوسری طرف جہاد کے نام پر دل کے ساتھ لڑی جارہی جنگیں تھی۔ جہاں ہمت حوصلہ تھا اور ایک نئے زمانے اور نئی سیاسی حکومت کو بنانے کی آرزو تھی۔

دارا نے اپنی فوج کو تین حصوں میں تقسیم کیا تھا سامنے توپ والا حصہ تھا اور دائیں جانب خلیل اللہ خاں کی قیادت میں 30 ہزار فوج بھی اور بائیں جانب رستم خاں کو ذمہ داری دی گئی تھی۔

الفاظ سے نظر نہیں ہٹی واقعے ہم کیا دیکھیں کہ صورت حال اس اقتباس میں نظر آتی ہے جہاں قاضی عبدالستار نے یاقوتی بجرہ کے بیان کو اتنے رنگ وروغن کے ساتھ پیش کیا ہے:

''25 اپریل 1658 کے غروب ہوئے آفتاب نے ایک بار پھر وہ جلیل الشان نظارہ دیکھا جو پھر کبھی اور کہیں دیکھنا نصیب نہ ہوا۔سیکڑوں اونٹوں اور خچروں پر دوہرا ''پیش خانہ'' رخصت ہو چکا تھا۔آہستہ خرام جمنا کی باادب لہروں پر شاہی پہرہ اتر چکا تھا۔قلعۂ

45: داراشکوہ۔قاضی عبدالستار۔ص:124

معلّٰی کے بالکل سامنے شہنشاہ کا یاقوتی بجرہ گھڑا تھا جس کا نام ''عقاب سرخ'' تھا شکل ایسی
تھی جیسے عقاب پانی میں تیر رہا ہو۔اس کا بہت بادہ گز لانبا اور کم سے کم چار گز چوڑا تھا۔
اوپر سے نیچے تک یا خوف سے مرصع سنہرے پروں سے جڑا ہوا تھا۔اندورونی حاشیوں
پر زریں دستوں کے شمعدان اور کنول نصب تھے۔ بیرونی حاشیوں پر ملاحوں کی قطار
سونے کے زیور روپہلے کام کی سرخ قبائیں اور سرخ مندیلیں پہنے، چاندنی کے چپو لیے
کھڑی تھی ۔ مذہب ستونوں پر استادہ سرخ زربفت کی چھت مرصع فانوسوں مزین تھی۔
اس کے آگے سونے چاندنی کے ساتھ بجرے اور عقے جن پر آفتاب گیر،کوکبہ، چتر طوغ،
طومان طوغ ، ماہی مراتب ،شہر مراتب اور شاہجہانی علم کھڑا تھا۔جس پر سورج بنا تھا۔
عقاب سرخ کے گرد چھوٹی چھوٹی کشتیوں کا حلقہ تھا جو سونے چاندنی کے ہاتھیوں،
گھوڑوں،شیروں اور چیتوں کی صورتوں سے آراستہ تھیں اور جن پر منظورِ نظر والا شاہی
سیاہ دل گزرز برادرا چیلیے اور خواجہ سرا ریشمی لباس اور سنہرے ہتھیار پہنے مستعد
تھے۔''46

ناول کی پہلی شرط ہے یہ دل چسپی سے پڑھا جائے پوری ہو جاتی ہے اس ضمن ڈاکٹر طارق سعید کا یہ جملہ صادق آتا ہے:۔

''اس شرط کی تکمیل میں سب سے بڑا ہاتھ قاضی صاحب کے اسٹائل کا یہ اسٹایل محمد حسین
آزاد کے اسٹایل کا جدید رنگ کہا جا سکتا ہے جو ماضی کو زندہ کر دینے کے ہنر سے آشنا ہے
،بھولی ہوئی تفصیلات کھوئے ہوئے مشاہدات سب اس میں اس طرح زندہ ہو جاتے
ہیں کہ ہم اس عہد کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں۔''47

قاضی صاحب کا مخصوص اسٹائل جو ناول کے موضوع کے ساتھ تبدیل ہوتا ہے۔ یہ حیرت انگیز قوت اور صرف ان تک ہی محدود ہے اور ان کو اس بات کا بجا اعتراف بھی ہے اس کا جا بہ جا وہ اظہار بھی کرتے رہتے ہیں جتنے اتنے ہفت موضوع منفرد اسٹائل کے ساتھ زبان استعمال کی ہو۔

ان کی اسی خوبیوں کا اعتراف کرتے ہوئے شمس الرحمٰن فاروقی رقم طراز ہیں:

''قاضی عبدالستار کے قلم میں گزشتہ عظمتوں اور کھوئے ہوئے ماحول کو دوبارہ زندہ کرنے

46: داراشکوہ۔قاضی عبدالستار۔ص:88

47: اسلوب جلیل قاضی عبدالستار کا گرینڈ اسٹائل۔ڈاکٹر طارق سعید۔حوری نورانی مکتبہ دانیال۔سنِ اشاعت۔1993 ص 234

کی حیرت انگیز یہ قوت ہے۔''48

پروفیسر عبدالمغنی قاضی عبدالستار کے ناولوں کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''قاضی عبدالستار کی انفرادیت کا اظہار خاص کر ان کے تاریخی ناولوں میں ہوتا ہے۔وہ اپنے فن پر پوری قدرت رکھتے ہیں اور ان کا اسلوب نگارش دوسروں سے ممتاز ہے۔ان کے موضوعات کے مواد کی تحقیق بروقت مقصود نہیں اور اس سلسلے میں کئی سوالات بھی اٹھ سکتے ہیں لیکن ہمارے مدنظر یہ نکتہ ہے کہ ناول نگار نے افسانہ (Fiction) لکھا ہے نہ کہ تاریخ یا سوانح لہٰذا واقعات میں رنگ آمیزی بھی ہوسکتی ہے۔مبالغی آرائی بھی۔ بہرحال فن کار کا اپنا ایک خاص نقطۂ نظر ہے، جو بعض قارئین کی نگاہوں میں مغالطہ آمیز ہوسکتا ہے لیکن ادبی تنقید کا سوال یہ ہے کہ قاضی عبدالستار نے ناول نگاری کا حق کسی حد تک ادا کیا ہے اور ان کے فن کا پیمانہ کیا ہے۔''49

نقطہ نظر:۔ ناول اپنے تاریخی اور نیم تاریخی واقعات کی کشمکش کے ساتھ چلتا رہتا ہے اور مختلف نظریات کی کارفرمائی بھی نظر آتی ہے قاصی صاحب کا کیا زاویہ تھا وہ اپنے کردار کو کس انداز سے دیکھتے ہیں مگر جب یہ ناول قارائین کے ہاتھوں میں پہنچتا ہے تو وہ کس انداز میں لیتا ہے یہ قارہ کہ فہم پسند و ناپسند پر مبنی ہے۔

اردو ناول پریم چند کے بعد میں ڈاکٹر ہارون ایوب لکھتے ہیں:

''اردو کے کسی تاریخی ناول میں کوئی مکمل جنگ یہاں نہیں کی گئی ہے۔داراشکوہ کی یہ خصوصیت کہ اس میں ہمیں پوری ساموگڈھ کی لڑائی اس طرح نظر آتی ہے کہ گویا ہم فلم دیکھ رہے ہیں اور ظاہر ہے اس فنی مرحلے کی تکمیل کے لیے سیدھی اور سپاٹ نشتر کی نہیں رزمیہ نثر کی ضرورت ہوتی ہے اور جہاں تک رزمیہ نثر کا تعلق ہے یہ ایک سلسلہ کے ساتھ شروع سے آخر تک کسی ایک مصنف کے یہاں نہیں ملتی آزاد اور شبلی دو فنکار ہیں جو رزمیہ کے ہفت خواں طے کر سکتے ہیں لیکن اس کا موضوع اس کا متحمل نہ ہوسکا یہ خصوصیت اردو کے تمام تاریخی ناولوں میں ''داراشکوہ'' کو ممتاز کرتی ہے۔''50

48:۔فاروقی کے تبصرے۔شمس الرحمٰن فاروقی۔شب خون کتاب گھر الہ آباد۔سن اشاعت:1968۔ص80

49: نذر قاضی عبدالستار۔پروفیسر محمد غیاث الدین۔ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،نئی دہلی۔ص199

50:اردو ناول پریم چند کے بعد۔ہارون ایوب۔اردو پبلیشر لکھنو سن اشاعت۔1978 ص235

فاروقی نے داراشکوہ کواس کے آزاد خیالی اور وسیع المشر بی کی وجہ سے اسے تاریخ کا انوکھا کردار قرار دیتے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ اگر دارا کو ہندوستان کی حکومت مل گئی ہوتی تو ممکن ہے کہ ہندوستان کی تاریخ کچھ اور ہوتی اکبر کی آزاد خیال کی جڑیں سیاسی مصلحتوں میں پیوست تھی لیکن دارا کے بارے میں ایسا کوئی شبہ غالباً نہیں کیا جا سکتا پھر بھی دارا اورنگ کی بنائے مخاصحت یہ نہ تھی کہ دارا ہندو پرست تھا اور اورنگ زیب نسبتاً کٹر مسلمان۔ یہ دونوں سیاست کے وسیع بساط پر اپنی اپنی چالیں تخت وتاج کے حصول کے لیے چل رہے تھے۔"

اس ناول پر اظہار خیال کرتے ہوئے خالد اشرف رقم طراز ہیں:

> "داراشکوہ کی شکست اس Liberal اور غیر متعصب نظریے کی شکست ثابت ہوئی جس کو اکبر نے ہندوستان کی سرزمین پر دین الٰہی کے ذریعے مروج کیا تھا اکبر اور داراشکوہ کی یہ شکست اس قدر تاریخ ساز ثابت ہوئی کہ کٹر اور تنگ ذہن اورنگ زیب نے مغلیہ سلطنت حاصل کرتے ہی تمام ملک میں تنگ نظری اور تعصب کی عملداری قائم کی جس کے نتیجہ میں شیواجی وغیرہ کی تنگ نظری نے جنم لیا اور بعد میں اسی تنگ نظری نے دوقومی نظریے کی شکل اختیار کی۔ ناول "داراشکوہ" میں مصنف نے ان دو نظریات کے تصادم کی کامیابی کے ساتھ پیش کیا ہے۔"[51]

خالد اشرف نے داراشکوہ ناول پر اپنے خیالات کا ظہار کیا ہے اورنگ زیب سازشی ذہن کا بتایا ہے۔ یہ بات ہر انسان جانتا ہے کہ سیاست میں چال چلنا ضروری ہوتا ہے اور سیاسی سازش کا استعمال غلط وہاں ہوتا ہے جہاں دوسروں کے حق مارے جائیں کوشش کرنے اور اپنا حق حاصل کرنے کی تگ ودو کو سازش کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ ہوس پرست کا نام دینا اورنگ زیب کے لیے میرے خیال میں قابل قبول نہیں ہے۔ اورنگ زیب نے کبھی زر اور زن کی لالچ نہیں پالی بلکہ اپنا ذاتی خرچ بھی ذاتی محنت سے کرتا تھا اور عوام کے پیسے کو اپنے اوپر کبھی خرچ نہیں کیا۔ دیکھا جائے تو سیاست یا حکمراں گدی اور حکومت حاصل کرنے کے لیے اپنی پوشاک ویس بھوسا تبدیل کرتے ہیں داراشکوہ نے بھی ہندوستان کے ایک بڑے طبقے کو اپنا ہمنوا بنانے کی کوشش کی۔ مذہبی رواداری کا صرف یہ مطلب نہیں ہوتا ہے کہ آپ ان کے لباس پہن لو ٹوپی لگا لو یہ ایک وطیرہ ہوتا ہے عوام کو گمراہ کرنے جو آج ہمارے سیاست داں اپناتے ہیں۔ دارا ایک پڑھا لکھا اور تصوف پسند

51: برصغیر میں اردو ناول۔ خالد اشرف۔ کتابی دنیا۔ 2003۔ ص 310

انسان تھا اسے سیاست سے زیادہ مذہب میں دل چسپی تھی۔ ایسے میں وہ سیاست کے داؤ پیچ کو کم ہی سمجھتا تھا ایسے میں کوئی دوسرا بھائی حکومت کو اپنے اختیار میں کر لے تو اسے گنہگار نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔

خالد اشرف نے اس ناول کے تبصرے میں ایک دو غلطیاں بھی کیں ہیں۔ روشن آرا اورنگ زیب کی حلیف تھی خالد اشرف نے دارا شکوہ کی حلیف دکھایا ہے۔ اس کے علاوہ اورنگ زیب نے صرف دارا کو قتل کرایا اس کے بیٹے کو نہیں۔

قاضی عبدالستار نے جس طرح اس ناول میں دارا اور اورنگ زیب کے بیچ جنگ اور حصول اقتدار کے تصادن کو نظریوں کی جنگ سے تعبیر کیا ہے وہ سراسر غلط ہے۔ کونکہ دونوں نے اطراف مذہب کا کوئی بٹوارہ نہیں تھا اور نہ ہی دونوں کی افواج میں کسی الگ الگ مذہب کے لوگ تھے۔ بلکہ دونوں فوجوں میں ایک دوسرے کے وفادار جاں نثار سپاہی تھے انھیں ہندو اور مسلمان کے نظریہ سے دیکھنا سراسر تاریخی نقطہ نظر سے غلط ہے۔

ڈاکٹر پبن چندرا نے بھی یہی بات لکھی ہے کہ یہ جنگ جرنلل شب کی تھی دونوں فوجیں تقریباً برابر تھیں اور یہ جنگ مذہبی بنیاد پر نہیں لڑی گئی کیونکہ دونوں کی افواج میں ہندو اور مسلمان فوجی تھے۔

یہ جنگ اورنگ زیب اور دارا شکوہ کی سیاسی جنگی عسکری حکومت کے بیچ ایک طرح قائدانہ صلاحیت پر منحصر تھی۔ جس کے اندر یہ خوبیاں موجود تھیں اس نے فتح حاصل کی اور جہاں تک سوال قتل اور سزا کا ہے دنیا جنگی اصول سے بہ خوبی واقف ہے کہ ناکام اور شکست خوردہ بادشاہ یا شہزادہ کے ساتھ کیسا رویہّ رواں رکھا جاتا ہے اور دارا کا بھی مقدر یہی تھا۔ جو سیاسی نقطہ نظر سے حق بجانب ٹھرایا جا سکتا ہے۔

سیکولر ہونے کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ ایک مسلمان بت کی پوجا کرنے لگے اور ایک ہندو مسلمانی ٹوپی پہن کر نماز پڑھے سیکولر ہونے کا ملطب ہوتا ہے سبھی مذاہب کو برابر نظریے سے دیکھنا اور تمام مذاہب کے لوگوں کو اس مساوات اور انصاف وعداوت کے ساتھ حکومت کرنا اور سبھی کو ایک نظر سے دیکھنا۔ اگر کوئی مسلمان کے محلوں میں جاتے ہوئے ٹوپی پہن لے اور کوئی ہندوؤں کے پاس جاتے ہوئے جنئو وڈھارڈ کرلے تو یہ سیکولرزم نہیں ڈھونگ کے مترادف ہوتا ہے جیسا کہ آج کل ہمارے سیاسی اور مکار سیاسی قائد عام طور پر کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

اگر ہم مغلیہ تاریخ کے اوراق سیاہ پر نظر ڈالیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ مغل بادشاہ شاہ جہاں نے بھی اپنے دو بھائیوں خسرو اور شہریار کی موت کا حکم دیا تھا ساتھ ہی تخت نشینی کے بعد اپنے دو بھائیوں اور چچا زاد بھائیوں کو بھی موت کے گھاٹ اتروا دیا تھا۔

یہ روایت شاہ جہاں کے بعد بھی برقرار رہی ۔ اس کے تیسرے بیٹے اورنگ زیب نے بھی اپنے بھائیوں کو مار کر تخت حاصل کیا۔اورنگ زیب کو لگتا تھا کہ وہ تخت کا حقیقی جانشین ہے اور دوسرے بھائیوں میں اتنی صلاحیت نہیں ہے جو عظیم حکومت کو چاک و چوبند رکھ سکیں۔

ڈاکٹر محمد شاکر نے داراشکوہ کو قاضی عبدالستار کا شاہکار ناول قرار دیا ہے۔انھوں نے ''اردو میں تاریخی ناول نگاری: آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد'' قاضی عبدالستار کو ''داراشکوہ'' ناول کے حوالے سے خراج عقیدت پیش کی ہے۔لکھتے ہیں:

> ''قاضی عبدالستار نے ''داراشکوہ'' جیسا شاہکار ناول لکھ کر تاریخی ناول نگاری کو نئے اُفق کا پتہ دیا ہے جس میں تاریخی حالات و واقعات کی صداقت کے ساتھ زبان و بیان کی دلکشی و جاذبیت اس ناول کو ادب سے ہمکنار کر دیتی ہے۔قاضی عبدالستار نے تاریخی شعور کی تربیت کے ساتھ ساتھ ادبی ذوق کا بھی مظاہر کیا ہے۔''52

☆☆☆

52: اردو میں تاریخی ناول آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد۔ڈاکٹر محمد شاکر۔کتابستان چندواڑہ۔مظفر پور سنِ اشاعت 2003 ص 135

خالد بن ولید

خالد بن ولید قاضی عبدالستار کا نہایت اہم اور ممتاز تاریخی ناول ہے اس ناول میں دنیائے اسلام کے عظیم فاتح جرنیل خالد بن ولید کی حالتِ زندگی کے علاوہ ان کے جنگی کارناموں کو نہایت مختصر مگر جامع انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے ویسے تو خالد بن ولید نے کم وبیش ایک سو پندرہ سے زائد جنگیں لڑیں جن کی جواں مردی کے قصےّ دینا کی تاریخ میں بکھرے پڑے ہیں اور جن کا شمار دینا کے عظیم بہادر انسانوں اور جرنیلوں میں ہوتا ہے ناول میں خالد بن ولید کی شخصیت اور جنگی کارناموں کو موضوع بنایا گیا ہے قاضی عبدالستار نے خالد بن ولید کے بارے میں یہ بھی کہا ہے کہ اگر وہ یوروپ میں پیدا ہوا ہوتا تو اس کے فنِ حرب وضرب پر سیکڑوں کتابیں لکھی جا چکی ہوتی مگر ہم لکیر کے فقیر خالد بن ولید ایک ایسے جنگجو تھے جو میدانِ حرب کے ساتھ ساتھ حکمت اور تدبر کے میدان کے بھی ماہر سمجھے جاتے تھے۔ان کے تدبر اور شجاعت کی بدولت مذہب اسلام کو بہت فائدہ پہنچا۔ان کی بہادری کا یہ عالم تھا کہ دشمن ان کے نام سے لرز اٹھتا تھا ساتھ ہی میدانِ جنگ میں دشمن ان کی نام کی ہیبت سے کانپتے تھے اور بہت جلد میدان چھوڑ کر بھاگ جاتے تھے خالد بن ولید کے متعلق دشمنوں میں یہ افواہ پھیلی ہوئی تھی کہ خالد کے لئے آسمان سے تلوار اتری ہے اس لئے ان کو کسی بھی جنگ میں شکست نہیں ہوتی ہے خالد بن ولید اپنے کارناموں کے سبب ایک ایسے ہیرو کے طور پر ابھرتے ہیں جو ہر انسان کے دل و دماغ میں بس جاتے ہیں واقعی ایسے انسان موضوعِ سخن بنتے ہیں قاضی صاحب نے اس لئے ان کا انتخاب کیا تا کہ دنیا کو پتہ چل سکے کہ بہادر انسان کیسا ہوتا ہے اور اس کی بہادری کس طرح لوگوں کے لئے مشعلِ راہ ہوتی ہوسکتی ہے ویسے تو بہت سے واقعات ان کی زندگی سے جڑے ہوئے ہیں مگر اس ناول میں قاضی عبدالستار نے جنگ یرموک کے بعد خالد کی معزولی پر زیادہ توجہ صرف کی ہے اس ناول میں ارتداد کے خلاف ان کی جنگوں کے علاوہ ان کی اور قیصر وکسریٰ کے خلاف لڑی گئی جنگوں کو موضوع تخلیق بنایا گیا ہے۔خالد بن ولید پر کچھ بھی لکھنے کے لیے ایک دفتر کی ضرورت ہوتی ہے مگر قاضی عبدالستار نے اس اس دفتر کو مختصر کر کے پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔جس میں ناول نگار کی محنت ان

کے ذخیرے الفاظ کی گرفت اختصار وایجاز کے ذریعہ صرف دوسوتیس صفحات پر مشتمل ہے۔

قاضی عبدالستار نے اس ناول کو لکھنے کے لیے مختلف تاریخی کتابوں کا مطالعہ کیا ہے جو اسلامی تاریخ سے ان کی دلچسپی اور عرق ریزی کا غماز ہے۔

خالد بن ولید میں جس اسلوب کو اور جس انداز تحریر اور معنی الفاظ میں پیش کیا ہے وہ تاریخی ناول کے فن واصول پر صادق آتا ہے۔ قاضی صاحب کے ناول کا ایجاز واختصار جہاں صفحات کو کم کر کے قاری کا بوجھ ہلکا کرتا ہے وہیں ایک واقعہ کو مکمل طور پر سمجھنے کے لیے متعدد بار پڑھنے کی زحمت بھی دیتا ہے۔ کیونکہ انھوں نے ایک ایک تاریخی واقعہ کو ایک جملے ایک سطر میں لکھنے کی کوشش کی ہے جس کی وجہ قاری کی ذراسی بے توجہی کی وجہ سے وہ منظر پوری طرح سے آنکھوں میں سما جانے سے محروم ہوجاتا ہے۔

ناول میں قاضی عبدالستار نے جنگ یرموک کے بعد خالد کی معزولی پر زیادہ توجہ دی ہے اور ان کا نفسیاتی جائزہ پیش کیا ہے۔ معزولی ایک آزمائش تھی جو خالد بن ولید کے اوپر آئی تھی مگر انھوں نے اس معزولی کو اپنی انا کا مسئلہ نہ بننے دیا۔ بہت سے لوگوں نے خالد بن ولید کی مدد کرنے کی پیش کش کی تاکہ خالد بن ولید حضرت عمر کے خلاف بغاوت پر آمادہ ہوجائیں مگر خالد نے اپنی شجاعت و بہادری میدان جنگ میں دکھائی تھی وہیں نبی کی امت تفرقہ ختم کرنے اور صرف دین کی خدمت کے لیے تمام تجویزات کو ٹھکرادیا۔ اگر خالد بن ولید حضرت عمرؓ کے خلاف تلوار اٹھالیتے تو عالم اسلام میں ایک قیامت صغریٰ برپا ہوجاتی مگر یہ خالد کی عظیم شخصیت کا کارنامہ تھا کہ انھوں نے صبر وتحمل کا ایک مظاہرہ کیا جس کی مثال ناممکن ہے۔

خالد کے سامنے ایران، عراق اور روم کے ہرقل نے غائبانہ طریقے سے مدد کی پیشکش کی مگر خالد بن ولید نے ان تمام صلیبیوں اور اسلام دشمنوں کی عرضیاں مسترد کردیں۔ کیونکہ انھیں معلوم تھا ایک ذراسی چنگاری آگ کا بگولہ بن سکتی ہے اور پورے حجاز اور دنیا سے مذہب اسلام کو نقصان پہنچا سکتی ہے اس لیے خالد بن ولید نے کسی بھی فتنے کو اٹھنے نہ دیا اور ان تمام فتنوں کا سر کچل دیا جو مذہب اسلام کو اپنے نرغے میں لینے کی کوشش کررہے۔ خالد بن ولید نبی کریمؐ کی صحبت اور ان کی محبت میں اسلام کی حفاظت کے لیے ایسے کسی بھی اقدام سے باز رہے۔ اس طرح انھوں نے یہ ثابت کیا جس پیارے آقا کے موئے مبارک کو وہ اپنی خود میں رکھ کر جنگیں لڑا کرتے ہیں اس کی عزت اور عظمت کو پامال نہیں کریں گے۔

میرا کام تحقیقی کام قاضی عبدالستار حیات اور کارنامے ہے اس لئے مجھے قاضی عبدالستار کی تمام تخلیقات کا جائزہ لینا ناگریز تھا اور اس ناول کو سمجھنا اور اس پر خامہ فرسائی کرنا ضروری تھا ساتھ ہی ہر لمحہ اس بات کا احساس کی زراسی بے توجہی سے گناہ کے دائرہ میں شامل ہو جائے اس لیے مجھے اس ناول کو سمجھنے میں کافی دقت ہوئی۔ میں چاہتی تھی کہ ناول کا ہر ایک جملہ، ہر ایک سطری میری آنکھوں میں سما جائے مگر میں اپنی اس کوشش میں مکمل طور پر کامیاب نہیں ہو سکی۔ کہیں کہیں احساس ہوتا تھا کہ قاضی عبدالستار تاریخ کا مطالعہ کرنے کے بعد اس کو مشکل الفاظ کا جامع پہنا کر اس کو ناول کی شکل میں پیش کر دیا۔ اس ناول کو کم لوگوں نے سمجھا اور پڑھا ہے یہاں تک کہ صرف ایک آدھ لوگوں نے اس ناول پر کچھ لکھنے کی کوشش کی ہے اس کی وجہ کیا ہو سکتی ہے۔ معلوم نہیں عین ممکن ہے کہ قاری الفاظ کے بھول بھلیوں میں الجھ کر ناول کی مکمل قرأت نہ کی ایک صاحب کا تحقیقی کام قاضی عبدالستار کے ناولوں پر ہے پر انھوں نے اس ناول کو شجر ممنوعہ سمجھا ہے۔ ڈاکٹر احمد خاں کی کوشش اچھی ہے۔ ناول میں جہاں زبان آسان اور منظر صاف ہے وہاں تک تو ٹھیک ہے مگر قاضی صاحب پیچیدہ جملے کی وجہ سے منظر دھندلا ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے بینائی کام نہیں کرتی ہے اور سامنے آنے والا منظر قاری سے ٹکرا کر واپس چلا جاتا ہے اور قاری آگے بڑھ جاتا ہے۔

قاضی عبدالستار ایک ایسے فنکار ہیں جنھوں نے نہایت عرق ریزی اور محنت و مشقت سے ادب تخلیق کیا ہے۔ انھوں نے بے دریغ الفاظ کا استعمال نہ کرتے ہوئے چند ایک جملوں میں پوری پوری تاریخ بیان کر دی ہے جہاں ہم کوئی تاریخی واقعہ آٹھ سے دس صفحات میں پڑھتے ہیں ہیں انھیں واقعات کو قاضی صاحب نے طند سطروں میں بیان کر دیا ہے یہ ناول، تہذیب الاخلاق کے شمارے میں قسط وار شائع ہوا اور پہلی بار 1995 میں شائع ہو کر مقبول عام ہوا۔

ناول ''ثنیۃ العقاب'' کے عنوان سے شروع ہوتا ہے۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں حضرت خالد بن ولید نے شام کے شہر قیصر روم کے جنت ارضی میں ''واقصوصہ'' کی گھاٹی پر محمدی علم لہرایا تھا۔ معتصم باللہ 833 تا 842 ہارون الرشید کا چھوٹا بیٹا تھا تو مامون الرشید کے بعد خلیفہ بنا۔ یہ آٹھواں عباسی خلیفہ تھا ایک ترکی عورت کا بیٹا جس کا نام خالد تھا رومیوں کی قید میں تھا جب ایک شاعر نے ایک ماں کے روپ میں اس کے سامنے فریاد کی تو اس نے رومیوں پر ایک لشکر لے کر یلغار کی اور رومیوں کو شکست دی اور خالد کا قصاص

لیا۔ معتصم اپنے فاتح لشکروں کے ساتھ بغدادی کی طرف جا رہا تھا کہ ایک سپہ سالار نے اس کو ''ثنیۃ العقاب'' کی تاریخ سے روبرو کرایا۔ تب معتصم باللہ نے یہ حکم دیا کہ تمام لشکر ہماری رکاب میں علم کا طواف کرے اور اس علم کو بوسہ دیا۔ ساتھ ہی یہ حکم صادر کیا کہ اس علم کی توقیر و عظمت و عزت کے لیے جہاں تک یہ علم نظر آئے کوئی بھی لشکر یا فوجی سواری پر نہ بیٹھا ہو بلکہ پیادہ ہو جائے۔ غرض یہ علم اٹھارہویں صدی تک یونہی اپنی اپنی آن بان اور شان کے ساتھ لہراتا رہا اور اپنی عظمت گزشتہ کی یاد دلاتا رہا مگر جب خلافت عباسیہ کو زوال آیا اور مسلمانوں کی آپس میں ہی خاک و خون کی ندیاں بہنے لگیں تو اس علم کو بھی قتل کر دیا گیا۔

اس کے بعد ناول میں قاضی عبدالستار نے ''دشتہ یمامہ'' میں خالد بن ولید کا قیام دکھاتے ہیں جہاں خالد بن ولید ارتداد کی آندھی کی آگ کو اپنی تلوار سے ٹھنڈی کر چکے ہیں اور اپنی زوجہ ام تمیم اور سلمہ کے ساتھ قیام فرمائے ہوئے ہیں ساتھ ہی خلافت مدینے کے کسی حکم کے انتظار میں ہیں۔ تبھی وہاں دربار خلافت سے ایک قاصد آتا ہے جس کو دیکھ کر تمام مجاہدین کے چہرے کھل جاتے ہیں۔

ابھی تمام مجاہدین سیف اللہ کے دست بازو میں ایران و عراق کے معرکے پر گفتگو فرما رہے ہوتے ہیں کہ ایک بدّو حاضر ہوتا ہے جو چمڑے کے سیاہ موزے ریشمی کرتے پر چمڑے کا کمر بند اور سر پر عمامہ باندھے داہنے کندھے پر تلوار لٹکائے حاضر ہوتا ہے۔ اور کہتا ہے:

اے اس بڑے باپ کے بیٹے جس کی بڑائی کے اظہار میں رسول خدا نے فرمایا تھا کہ اگر بنو مخزوم کا بس چلتا تو ولید کو اپنا رب بنا لیتے۔ تجھ پر ایک حق نکلتا ہے۔

قاضی عبدالستار لکھتے ہیں:

> ''وہ اس طرح بول رہا تھا جسے پہاڑی راستوں پر خچر دوڑتا ہے۔ ضرارؓ نے بدو کو تیز نگاہوں سے دیکھا اور اس سے تیز لہجے میں بولے۔ جانتا ہے یہ کون ہیں۔ یہ وہ ہیں جن کا نام سن کر بزاخہ سے یمامہ تک کے گھوڑے اپنے پیروں میں پر باندھ لیتے ہیں۔ یہ سپہ سالار لشکر اسلام ہیں یہ سیف اللہ ہیں۔'' [1]

مگر وہ بدو چپ نہیں ہوتا ہے۔ سیف اللہ کے دریافت کرنے پر بتاتا ہے کہ میں جبال ابن ثابت ہوں۔ موتہ کی لڑائی میں جب آپ کے ہاتھ سے آٹھ تلوار ٹوٹ چکی تھی تو میں نے آپ کو اپنی تلوار پیش کی تھی۔

---

[1]: خالد بن ولید۔ قاضی عبدالستار۔ ایجوکیشنل ہاؤس، دہلی سنہ اشاعت 2017 ص: 19

جب وہ شخص جنگ موتہ کا ذکر کرتا ہے تو سبھی مجاہدین کو جنگ موتہ کی یاد آجاتی ہے جو نبیؐ کی حیات میں لڑی گئی۔ جنگ موتہ ایک ایسی جنگ تھی جو رومیوں سے لڑی گئی جس نے یہ ثابت کر دیا کہ مدینہ اور اس کا مذہب اسلام کمزور نہیں ہے اگر چہ یہ بت پرستی کے مقابلے میں سچا دین ہے مگر اس میں اتنی طاقت ہے کہ یہ کم تعداد ہونے کے باوجود بھی مدینے سے باہر نکل کر مدینے اور اسلام پر غلط نظر ڈالنے والوں کو کچل سکتا ہے۔ اس جنگ میں رومیوں کے لشکر کی تعداد ایک لاکھ سے زائد تھی اور مجاہدین کی تلوار صرف تین ہزار تھی مگر وہ رومیوں کے مقابلے میں سخت تھے اور انھیں سخت ٹکر دے رہے تھے۔ اس جنگ میں نبی کریمؐ نے تین سپہ سالار مقرر کیے تھے اور فرمایا تھا کہ زید بن حارث شہید ہو جائیں تو سپہ سالاری جعفر بن ابی طالب کے ہاتھوں میں ہو گی اگر وہ بھی شہید ہو جائیں تو عبداللہ بن رواحہ محمدی علم تھامیں گے اگر وہ بھی شہید ہو جائیں تو لشکر جسے چاہے سپہ سالار مقرر کر لے۔ جب یہ تین صحابۂ کرامؓ شہید ہو گئے تو بنی مخزوم کے وارث خالد بن ولید جن کو ابھی اسلام میں آئے تین مہینے ہی ہوئے تھے ان کو سپہ سالاری کا عہدہ پیش کیا گیا۔ اہل قریش اور بنی مخزوم کے لوگ ان کے فن حرب وضرب اور جنگی لیاقت سے بخوبی واقف تھے یہیں سے خالد کی سپہ سالاری کی شروعات ہوتی ہے جس نے اپنی تلوار سے قیصر وکسریٰ کے غرور کو کاٹ کر ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا اور اسی جنگ کے بعد نبیؐ نے ان کو سیف اللہ کا لقب عطا کیا تھا جس کے بعد خالد بن ولید کا نام ہمیشہ کے لیے خالد سیف اللہ ہو گیا جس نے اپنی شجاعت، بہادری اور جنگی لیاقت سے یہ ثابت کر دیا کہ صحیح معنوں میں وہ سیف اللہ کے درجے کے مستحق ہیں۔

غرض سیف اللہ اس بدو کی باتوں کو سن کر مسکرانے لگے اور انھوں نے کہا تو نے صحیح فرمایا چاندی کے قبضوں کی جتنی تلواریں تو اٹھا کر لے جا سکتا ہے تو لے جا۔ اس نے کہا میں پیدل نہیں سوار ہوں یا امیر تب خالد نے کہا باہر کھڑے ہوئے گھوڑوں سے چار گھوڑے پسند کرے اور ایک گھوڑے پر جتنی تلواریں لے سکتا ہے لا دلے۔ غرض یہ بدو اپنے من کی مراد پانے پر خوشی خوشی اپنا انعام لے کر چلا گیا جس نے جنگ موتہ میں اپنی تلوار دے کر خالد سیف اللہ کی جان بچائی تھی اور خود زخمی ہوا تھا۔ ایرانیوں سے ٹکر لینے سے پہلے ابو بکر صدیقؓ نے کہا تھا ہم یہ جنگ خالد بن ولید کے بغیر نہیں جیت سکتے ہیں۔ جس کی جنگی قوت سے زمین کانپتی ہے ساتھ ہی انھوں نے محسوس کر لیا تھا کہ ایرانیوں سے ٹکر لینا ناگزیر ہو گیا ہے ورنہ یہ آگ کے پجاری مدینہ

پر چڑھ آئیں گے کیونکہ ایران وعراق میں رہنے والے مسلمانوں کی زندگی ان زرتشتوں نے اجیرن بنا رکھی تھی جب جس عورت یا لڑکی کو چاہتے ان کے گھر سے اٹھا لے جاتے تھے ساتھ ہی ان کے مال و دولت، ان کی کمائی پر ہاتھ صاف کیا کرتے تھے اور ان کو ان کی پیداوار کا صرف اتنا ہی حصہ دیتے تھے جس کو کھا کر وہ زندہ رہ سکیں۔ ان سب وجوہات سے عاجز آ کر مثنیٰ بن حارث نے خلیفہ ابوبکرؓ سے گزارش کی کہ ایرانیوں کے ظلم وستم سے مسلمانوں کو آزاد کرایا جائے۔ لشکر اسلام کے سامنے نائب رسول کی طرف سے فرمان کے مطابق ضرار بن آلازور نے اس طرح گویا ہوئے:

''دربار خلافت سے فرمان آیا ہے کہ سیف اللہ تمھارے سپہ سالار کے نام۔ نائب رسول کا حکم ہے کہ دشت یمامہ سے اٹھو۔ تمیم اور قیس اور اسلم کے قبیلوں کو روند ڈالو۔ ان کی گردنوں میں ہیبت اسلام کا قلادہ ڈال دو۔ عراق پر یلغار کرو۔ بندرگاہ ابلّہ کو گرفتار کرلو۔ جس سلطنت کبریٰ کے غرور میں کسریٰ نے تمھارے آقائے دوجہاں کی تحریر کے پرزے اڑائے تھے اس کی سلطنت کے ٹکرے اڑادو۔ درفش کاویانی کے تکبر کو اپنے گھوڑوں کی ٹاپوں سے کچل ڈالو۔''[2]

نائبِ رسول کا فرمان ملتے ہی یہ سرفروش ایران کی طرف چلے پڑے تھے عساکر اسلام نے اپنے مستقر سے اتنی دور آ کر تاریخ ساز جنگ کا آغاز کیا تھا اور روئے زمین کی سب سے بڑی شہنشاہی کے اپنے قہار و جبار کی تلوار سے پرزے اڑادیے تھے۔ قاضی عبدالستار نے اس جنگ کا پورا نقشہ نہایت کامیابی سے کھینچا ہے۔ کس طرح جنگ سلاسل میں ہرمز کے مارے جانے کے بعد سلاسل میں قید ایرانیوں کو لشکرِ اسلام کی تیزی طرّاری اور پھرتی سے پیٹھ دکھانے پر مجبور کردیا۔ ہرمز جو نہایت عیار اور مکار فطرت کا انسان تھا اور ضرب المثل کی طرح جانا جاتا ہے اپنی عیاری اور مکاری کے لیے اپنے شہنشاہ کو خوش کرنے کے لیے آیا تھا مگر سیف اللہ کی تلوار سے اپنے زرہ بکتر کے باوجود بھی جہنم رسید ہوا۔ جنگ کے خاتمے کے بعد سیف اللہ نے ہرمز کی قیام گاہ میں قدم رکھا ایرانی حاکم وشہنشاہ عیش وعشرت کی جو زندگی گزارتے تھے یہ خیمہ اس کا نمونہ تھا جس میں چاندی کے تخت کرسیوں اور تپائیوں سے بھرا ہوا تھا۔ کروڑوں کا مال غنیمت سامنے پڑا تھا۔

اس جنگ کے بعد بہت سے فوجی کشتیوں کے سہارے بھاگ گئے تھے۔ خالد کو یقین تھا کہ آگے

---

[2]: خالد بن ولید۔ قاضی عبدالستار۔ ایجوکیشنل ہاؤس، دہلی سنہ اشاعت 2017 ص:19

اس سے بھی بڑی جنگ لڑنی ہے اس لیے انھوں نے مفتوح علاقوں کے باشندوں پر توجہ دی اور انتظامی امور اپنے ہاتھوں میں لے کر عدل وانصاف کی الخ جگائی۔

خالد بن ولید اور دشمنانِ اسلام کے مابین لڑی گئی دیگر جنگوں کا تفصیلی جائزہ:۔سب سے پہلے جو جنگ لڑی گئی وہ ایران کے حاکم ہرمز اور خالد بن ولید کے مابین پہلا معرکہ کاظمہ کے مقام پر ہوا اس ناول میں قاضی عبدالستار نے حفیر کے مقام کا ذکر کیا ہے جہاں ہرمز پہلے پہنچ کر پانی پر قبضہ کر لیتا ہے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ جب خالد بن ولید کی آمد کی خبر ہرمز کو ملتی ہے تو وہ کاظمہ پر چلا جاتا ہے اور پانی کے مقام پر قبضہ کر لیتا ہے جب خالد بن ولید کو معلوم ہوتا ہے کہ ہرمز کاظمہ پر پہنچ کر پانی پر قبضہ کر چکا ہے تو امیر عساکر نے اپنی فوج کو حفیر کے مقام پر پڑاؤ ڈالنے کی بات کرتے ہیں جب اسلامی شکر حفیر کے مقام پر پہنچتا ہے تو دیکھتے ہیں کہ ہرمز نہایت تیز رفتاری کے ساتھ پہنچ کر پہلے ہی سے پانی پر قبضہ کیے ہوئے ہے۔ یہاں پر یہ بات قابل ذکر ہے کہ عنایت اللہ التمش اور ابوزید شبلی نے یہ معرکہ کا مقام یعنی کاظمہ بتایا ہے اور واقعہ کا ذکر اس طرح کرتے ہیں کہ جب خالد کی فوج نے دیکھا کہ ہرمز حفیر کے مقام پر بھی پہلے پہنچ کر قبضہ کر لیا ہے اور عساکر اسلام میں پانی کو لے کر بے چینی پھیل رہی ہے تو انھوں نے کہا کہ ہماری پہلی جنگ پانی کے لیے ہوگی جو فوج کامیاب ہوگی پانی اسی کو ملے گا اس کے بعد خالد نے دیکھا کہ ہرمز کی افواج ایک زنجیر میں خود کو باندھ رہی ہیں تو اسلامی لشکر نے طنز کیا۔ یہ دیکھ کر یہ لوگ ہمارے لیے خود کو تیار کر رہے ہیں ایرانی افوج بھاری بھرکم زرہ پہنتے تھے جس کی وجہ سے انھیں نقل وحرکت کرنے میں پریشانی ہوتی تھی اور ذرا سے وقفے میں وہ تھک جاتے تھے جب خالد نے یہ حالت دیکھی تو پھر حفیر سے کاظمہ کے مقام پر کوچ کرنے کا حکم دے دیا۔ جب کاظمہ ایرانی فوج پہنچی تو کافی تھکی ہوئی تھی تبھی اسلامی لشکر تازہ دم تھا کیونکہ ان کے پاس کوئی بھاری بھرکم سامان نہ تھا۔کاظمہ میں پہنچ کر خالد نے ایرانی فوج کی تھکن کا فائدہ اٹھایا اور فوراً حملے کا حکم دے دیا۔زنجیروں میں بندھے ہوئے دستے جن کو اسلامی مجاہدین دوڑا رہے تھے اور تھکا تھکا کر مارنا چاہتے تھے غرض یہ آسانی سے شکست کھا گئے۔اس جنگ کو جنگ ''سلاسل'' کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔قاضی عبدالستار نے حفیر کے مقام پر بارش ہونے اور جنگ کے بارے میں لکھا ہے:

''ایک ایک کوچ میں دو منزلیں لپیٹے اور دھاوے پر دھاوا کرتے جب حفیر کے سامنے

پہنچے تو ہرمز کی تیزی اور طراری پر حیرت زدہ رہ گئے کہ پچاس ہزار فوج کے ساتھ پانی پر قبضہ کے تمام بلند مقامات پر مورچے جمائے انتظار کر رہا تھا۔ پانی پر دشمن کے قبضے کی خبر نے لشکر اسلام میں ہراس پھیلا دیا۔ سیف اللہ نے مضطرب ہو کر لشکر کو نشیب میں اتار دیا اور ظہر کی نماز پر خطبہ دیا۔'' 3

نماز کے بعد تمام مجاہدین اسلام نے خدا کی بارگاہ میں ابر رحمت کے لیے ہاتھ اٹھایا اور خدا کی رحمت کی غیرت نے گوارا نہ کیا کہ اٹھے ہوئے ہاتھ کو خالی لوٹا دیں تبھی موسلا دھار بارش ہونے لگی اور تمام عساکر اسلام نے خدائے ذوالجلال کے آگے نذرانۂ شکر ادا کیا اور پانی کے ذخیرے بنا لیے۔ وہیں ہرمز کی فوج کو اس بارش نے پریشان کر دیا اور اس کے قیمتی عیش و عشرت بھرے خیمے کیچڑ سے لد گئے اور پھر ہرمز کی فوج اور عساکرِ اسلام کے بیچ معرکہ ہوا۔ اس وقت جنگوں کا یہ قائدہ تھا کہ پہلے انفرادی طور پر سپہ سالاروں کے بیچ مقابلہ ہوتا تھا ہرمز نے یہاں پر دھوکے سے خالد بن ولید کو شہید کرنا چاہتا تھا اور اپنی فوج کے کچھ محافظ دستے خالد بن ولید کو پھنسانے کے لیے تیار رکھے تھے دونوں سپہ سالاروں کے بیچ مقابلہ ہوتا ہے ہرمز زرہ بکتر پہنے ہوئے مقابلہ کر رہا ہوتا ہے خالد بن ولید کسی خاص نازک وقت کے انتظار میں تھے دفعتاً ہرمز نے تلوار چلانے کے لئے اپنا ہاتھ اٹھایا ادھر خالد بن ولید کی تلوار ہرمز کے بغل سے ہوتی ہوئی باہر نکل گئی۔ اس طرح ایرانی فوج کا سپہ سالار مارا گیا تو اس کی فوج میں افراتفری مچ گئی اور جنگ بہت آسان ہوگئی مگر پھر بھی فارسی فوج دلیری سے لڑتے ہوئے میدان جنگ چھوڑ کر بھاگ گئے۔ ہرمز کے مرنے کے بعد ویسے بھی اس فوج کا دم خم ختم ہو چکا تھا۔ ہرمز کے ایک لاکھ دینار کی ٹوپی خالد بن ولید کے پاس آ چکی تھی جو ایرانی میں سپہ سالاروں یہاں پر دوسرے لوگوں کو ان کی حیثیت کے مطابق پہنائی جاتی تھی جن پر قیمتی جواہرات لگے ہوئے ہوتے تھے اس جنگ میں بے شمار مال غنیمت حاصل ہوا۔ خالد نے اس کے چار حصے کیے اور پانچواں حصہ مدینہ خلیفۂ اسلام کے لیے بھیج دیا۔ اس جنگ میں ایرانی فوج کی ہاتھی اور ہرمز کی ٹوپی بھی شامل تھی۔ مدینے کے لوگ ہاتھی جیسے جانور کو پہلی بار دیکھ رہے تھے اور حیرت زدہ ہو رہے تھے اور اسے خدا کی عجیب مخلوق سمجھتے تھے۔ ہرمز کی ٹوپی کو نائب رسول صدیق اکبرؓ نے خالد کو واپس بھیج دی۔ کیونکہ خالد بن ولید نے اس ٹوپی کو انفرادی مقابلے میں جیتا تھا اس لیے اس پر ان کا حق بنتا تھا۔

3: خالد بن ولید۔ قاضی عبدالستار۔ ایجوکیشنل ہاؤس، دہلی سنہ اشاعت 2017 ص: 28

اس طرح سے ہرمز جیسا سپہ سالار مارا گیا اور اس کے غرور و تکبر کو اسلامی مجاہدین نے شکست فاش عطا کی۔اس وقت ایران کے شہنشاہ اردشیر کو اس پسپائی کی خبر ملی تو وہ ڈپریشن میں آ گیا۔ یہ پہلا موقع تھا جب کسریٰ نے شکست کھائی وہ بھی مدینہ کے لشکر سے جنھیں وہ بدو اور صحرائی لٹیرا سمجھتا تھا اسے اپنی طاقت پر اتنا تکبر تھا کہ یہی کسریٰ سلطنت روم کے خسرو پرویز نے نبی کریمؐ کے خط کے پرزے اٹھائے تھے جب خالد بن ولید کی سپہ سالاری نے ایران و عراق کی سرزمین پر قدم رکھا تو انھوں نے تہیہ کرلیا تھا کہ کسریٰ کے غرور کو خاک میں ملادے گا جس نے اپنی حکومت کے نشے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خط کو پھاڑا تھا۔

غرض حضیر کی فتح کے بعد وہاں کا نظم ونسق کی ذمہ داری خالد نے قبول کی۔شہر کے لوگ اپنی جان ومال کی حفاظت کے لیے ان کے سامنے آئے اور خالد نے انھیں جزیہ مقرر کر کے سب کو امان دی۔انھوں نے کہا:

> ''تم عرب ہو،لیکن ایرانیوں کے کتوں کی طرح زندگی بسر کرتے رہے۔تمھاری بیٹیاں ایرانیوں کا بستر سامان اور بیٹے باورچی خانے کے خادم،تمھارے کھیت ان کے کھلیان ،تمھارے باغ ان کی ڈالیاں،تمھاری آبرو ان کی تفریح ،تمھارا وجود ان کی سہولت جاؤ۔ہم نے تم کو امان دی۔تمہارے کھیت تمہارے باغ تمہارے ہیں تمہاری بیٹیوں کی عصمت اور تمہارے بیٹوں کی عزت کے ہم محافظ اس تمہارے آتش خانے تک ہماری حفاظت میں ہیں۔اگر تم اسلام قبول نہیں کرتے تو ہم تندرست کمانے والے شخص سے چار درہم سالانہ جزیہ لیں گے۔جس طرح سے ہم مسلمان سے زکوٰۃ لیتے ہیں۔ہم زکوٰۃ ہزاروں درہم بھی وصول کر سکتے ہیں لیکن جزیہ مقرر ہے اس میں کوئی تبدیلی ہمارے اختیار سے باہر ہے۔تاہم بیمار مفلس بوڑھے بچے عورتیں جزیے سے محفوظ ہیں۔''[4]

ایرانیوں نے جب یہ شرائط سنیں تو وہ حیرت زدہ رہ گئے۔انھیں معلوم نہ تھا کہ اتنی آسان اور محبت آمیز کسی فاتح کی شرائط ہوتی ہیں کیونکہ اس دور کا رواج تھا فاتح قوم مفتوحوں پر ظلم وستم کے پہاڑ ڈھاتی تھی۔ان کی عورتوں کی عزت،مال ودولت تمام ساز وسامان فاتح قوم لوٹ کر لے جایا جاتی تھی مگر مدینہ کی فاتح قوم جس کے نام ایرانیوں نے ڈرایا تھا،خوف زدہ کیا تھا اتنی فیاض اور رحم دل ہوسکتی ہے۔

4: خالد بن ولید۔قاضی عبدالستار۔ایجوکیشنل ہاؤس،دہلی سنہ اشاعت 2017 ص:38

غرض ایران کے مختلف علاقوں میں سیف اللہ نے اپنی لیاقت عدل وانصاف کی ایسی مثال قائم کی جس سے دور دور تک کے علاقے روشنی سے فیضیاب ہونے لگے اور ایرانیوں کے ظلم وستم کے اندھیرے سے عاجز بھی آ چکے تھے اس لیے اسلام کی روشنی میں انھیں آ کر کچھ نے جزیہ ادا کر کے چین وسکون کی زندگی جینے کو ترجیح دی اس طرح سے خالد بن ولید نے ثابت کر دیا کہ رسول اللہ کی تعلیم میں عدل وانصاف کو سب سے اونچے مقام پر رکھا گیا ہے۔علاوہ ازیں کسی عربی کو کسی عجمی پر کوئی دسترس نہیں ہے،سب برابر ہیں۔مسلمان مفتوح علاقے کے لوگوں کے ساتھ ایک جیسا برتاؤ کرتے تھے کہ کوئی سامان خریدتے تو اس کی پوری رقم ادا کرتے تھے۔بازاروں میں مساویانہ انداز میں رہتے تھے۔خالد بن ولید کی ان تمام فتوحات کے بعد امیر شہراور بہت سے رئیس امیر وکبیر لوگوں نے ان کے پاس بڑے مہنگے اور قیمتی تحفے پیش کیے مگر مدینہ کی طرف سے فرمان آیا کہ ان تمام تحائف کی مکمل قیمت ادا کی جائے۔غرض خالد بن ولید نے ان تمام تحفے وتحائف کی قیمت ادا کی۔جزیہ کی رقم بہت تھوڑی تھی اس لیے انھیں ایرانیوں کے ظلم سے نجات ملی۔جب کوئی جزیہ کی رقم ادا کرتا تو اس کی حفاظت کی ذمہ داری مسلمانوں پر عائد ہو جاتی تھی اس لیے اردگرد کے علاقوں کے لوگوں نے اپنی حفاظت کے لیے جزیہ دینا منظور کر لیا۔اس کے علاوہ شرائط میں یہ بھی لکھا ہوتا کہ بوڑھے،عورتیں،بچے، تارک دنیا،راہبوں محتاجوں کو جزیہ کی رقم نہیں ادا کرنا ہوگا۔اگر مسلمان ان علاقوں کی حفاظت کے لیے ناکام رہے تو جزیہ نہیں لیا جائے گا یا اگر قول وفعل میں بدعہدی کی گئی تو ذمہ داری ختم سمجھی جائے گی۔

ایرانیوں کو اسلام کے اس بے مثال عدل وانصاف نے اپنا گرویدہ بنالیا۔ساتھ ہی اسلام کے محافظوں کا یہ سلوک ایران کے دوسری جگہوں پر فتح کے لیے راہ ہموار کر دی۔بہت سے ایسے مقام تھے جنھوں نے خود آ کر صلح کی درخواست کی۔صلح ہونے پر اس جگہ کے لوگوں کے جان ومال کی حفاظت کی ذمہ داری مسلمانوں کی ہو جایا کرتی تھی اور پھر وہ جزیہ دے کر سکون کی زندگی گزار سکتے تھے۔

مگر خالد بن ولید کی راہ اتنی آسان نہیں تھی۔انھیں معلوم تھا ایران کا شہنشاہ اتنی آسانی سے ہار ماننے والا نہیں ہے اس لیے اس نے اپنے دوسرے عظیم سپہ سالار قارن بن قریانس کو دربار میں بلایا۔کاظمہ کی شکست کے بعد یہ شہنشاہ نیم پاگل ہو گیا تھا اور اس نے قارن کو بلا کر اسے کسی بھی طرح جیت دلانے اور خالد بن ولید کے سر کو دیکھنے کا عزم کیا۔غرض قارن نے انوشجان اور قبّاذ جو ہرمز کے ساتھ فوج میں شامل تھے

انھیں لے کر پھر سے جنگ کرنے کی کوشش کی قارن اپنے جنرلز کے ساتھ اس تاریخ ساز جنگ کا منصوبہ بنا رہا تھا جس کے مطابق خالد کو زندہ یا مردہ گرفتار کر کے اپنے شہنشاہ کے آگے پیش کرنا تھا۔ خالد بن ولید نے ایک خط کے ذریعہ جنگ سے دور رہنے کی صلاح دی۔ انھوں نے کہا کہ اگر تم اپنی سلامتی چاہتے ہو تو اسلام قبول کر و یا جزیہ منظور کرو ورنہ تمھارے مقابلے پر ایسی قوم اتری ہے جو موت کو اتنا ہی پسند کرتی ہے جتنا تم زندگی کو محبوب رکھتے ہو۔ قارن نے دونوں شرطوں کو ٹھکرا دیا اور جنگ کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔

یہ لڑائی مذار کے مقام پر ہوئی جس میں قارن کے ساتھ بے شمار افواج تھیں ساتھ ہی انوشجان اور قباذ بھی میمنہ اور میسرہ کے ساتھ اس کے ہمراہ شامل تھے اس فوج میں بہت سے ایسے بھاگے ہوئے سپاہی تھے جنھوں نے مسلمانوں کے ساتھ جنگ لڑی تھی اور پسپا ہوئے تھے ان کے اوپر مسلمانوں کا خوف غالب تھا اور وہ اپنی فوج میں خوف وہراس پھیلا رہے تھے۔ انھیں معلوم تھا مسلمانوں کو شکست دینا اتنا آسان نہیں ہے۔ مگر مسلمانوں کا خوف اس کے اوپر مسلط ہو چکا تھا۔ خالد بن ولید ایسی ہی جنگ لڑتے تھے وہ دشمنوں کے اندر نہ صرف جسمانی خوف بلکہ نفسیاتی خوف میں بھی مبتلا کر دیتے تھے اس لیے پسپا ہونے کے بعد دشمنوں کی فوج میں ان کا خوف غالب آ جاتا تھا۔ خالد بن ولید ایک ایسی طاقت بن چکے تھے جس میں وہ کسی بھی جنگ میں شریک ہوتے تو فتح یقینی تصور کی جاتی تھی قارن نے اپنے دو سپہ سالاروں کو ساتھ میں لے کر مذار میں تھا اور اس نے دوسرے دن انفرادی مقابلے کے لیے خالد بن ولید کی فوج کو للکارا۔ اس کی للکار کا جواب دینے کے لیے خالد بن ولید آگے بڑھے مگر اس سے پہلے معقل بن اعشیٰ نے خالد سے کہا کہ یہ شکار مجھے عنایت ہو اور انفرادی مقابلے کے لیے اس کے آگے آ گئے۔ ساتھ ہی دائیں اور بائیں بازوؤں کے اس کے سالار بھی آگے بڑھے اور قباذ اور انوشجان نے عدی بن حاتم اور عاصم بن عمرو اسلامی فوج کے میمنہ اور میسرہ کے سالار آگے بڑھے۔ یہ تینوں زرہ پوش تھے مگر چند وقفے کے بعد ہی ایرانی افواج کے یہ تینوں خطرناک سپہ سالار مارے گئے۔ ایرانی اپنے سپہ سالار کی یہ حالت دیکھ کر سراسیمہ ہو گئے اور مسلمانوں کا عزم اور جوش اور زیادہ بڑھ گیا۔ ہم اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ جب سپہ سالار ہی مر جائے تو اس جنگ کو جیتنا آسان ہو جاتا ہے کیونکہ فوج کا نظم ونسق بکھر جاتا ہے وہ صرف مسلح بھیڑ بن جاتی ہے ایسی ہی کچھ حالت ان کی بھی تھی نفری کی بدولت تھوڑی دیر تک یہ جنگ چلتی رہی اور ایرانی اپنی شجاعت کا امتحان دیتے رہے وہ

یہ جنگ بلا کسی منصوبے کے صرف اپنی سلامتی کے لیے لڑ رہے تھے۔غرض تھوڑی دیر کے بعد درفش کا ویانی خالد کے آگے سرنگوں ہوگیا شام ہوتے ہی پورا میدان خالد کے قدموں میں پڑا تھا۔اس میں دشمنوں کی تعداد تقریباً اسّی ہزار تھی مال غنیمت کا ڈھیر لگا تھا دو دن تک اس کو اکٹھا کیا جاتا رہا۔خالد بن ولید کو اگلی جنگ بہمن جازویہ کے ساتھ لڑنی پڑی بہمن جازویہ کی فوج ابھی راستے میں تھی ادھر اندرزغر کی فوج اپنے انجام پر پہنچ چکی تھی اور اس کے سپاہی تیزی کے ساتھ بھاگ رہے تھے۔ وہ بہمن کی فوج سے راستے میں ملتے ہیں تو اپنی شکست کی کہانی سناتے ہیں۔بہمن جازویہ کے پاس پہنچ کر وہ بتاتے ہیں کہ جس لڑائی میں آپ کو شامل ہونا تھا وہ ختم ہو چکی ہے۔ان تمام باتوں کو سن کر بہمن کا بچا کھچا جوش بھی ٹھنڈا ہو گیا اور اس نے اپنے نائب جابان سے کہا۔اردشیر بیمار ہے اور اس نے نیا حکم لانے کے بہانے مدائن بھاگ گیا اور کہا کہ جب تک وہ نہ آئے جنگ سے بچا جائے۔بہمن کی فوج کے ساتھ بہت سے عرب قبائل عیسائی شامل تھے جو اپنے اپنے مختلف طرح کے جھنڈوں کے ساتھ تھے۔خالد بن ولید کا خفیہ نظام بہت مضبوط تھا اور اس نے ایرانی لشکر میں بھی بہت سے جاسوس چھوڑ رکھے تھے جب خالد کو معلوم ہوا کہ ولجہ پہنچنے والا بہمن کا لشکر الیس نامی مقام پر موجود ہے تو اس نے لشکر کو کوچ کرنے کا حکم دیا۔الیس ایک خوبصورت علاقہ تھا۔ یہاں پہنچ کر خالد نے بلند اور مسطح مقام پر قبضہ کرلیا۔صبح سے دوپہر تک دشمن کی فوج میں کوئی نقل وحرکت نہ ہوئی تبھی ایک جاسوس نے خالد کو خبر دی کہ جابان اپنی شاہی فوجوں کے ساتھ دفاعی جنگ لڑنے پر آمادہ ہے۔ساتھ ہی قبیلے کے سردار عبدلاسود عجلی کی درخواست ہے دونوں ساتھ مل کر لڑے مگر ایرانی شاہی فوج لڑنے کے لیے تیار نہیں۔خالد نے یہ سن کر جنگ مغلوبہ کے ساتھ جنگ کا آغاز کیا مگر شاہی افواج پیچھے ہٹنے لگیں۔عیسائی عرب عجلی کی کمان میں بنو تیم اور بنوضبیعہ جیسے قبیلوں نے اپنی روایتی شجاعت اور بہادری کے ساتھ مسلمانوں سے جنگ کرتے رہے۔خالد نے ابھی تک تمام ایرانی جنگ میں فتح حاصل کی تھی اس لیے ان کی تلوار ایک مثال بن چکی تھی اور دشمن کو معلوم تھا کہ ہم اس فوج کو شکست نہیں دے سکتے۔ جنگ جاری تھی تبھی دیکھا کہ شاہی افواج پر تکلف دسترخوان پر بیٹھی ہیں اور عیسائیوں کا قتل عام دیکھ رہی تھیں۔موج طبری ابن ہشام اور محمد حسین ہیکل کے حوالے سے التمش نے لکھا ہے کہ فارس کی فوج کو سانڈوں کی طرح پالا جاتا تھا۔سپاہیوں کو مرغن کھانے کھلائے جاتے تھے۔ فارس کے شہنشاہوں کا اصول تھا بلکہ عقیدہ تھا کہ مضبوط اور مطمئن فوج ہی سلطنت اور تخت وتاج کی

سلامتی کی ضامن ہوتی ہے۔نائب سالار جابان نے سوچا کہ آج فوج کو پرتکلف کھانا کھلایا جائے اس لیے بے شمار جانور ذبح کیے گئے اور گوشت کے علاوہ کئی چیزیں پکائی گئیں اس لیے کھانا تیار ہونے میں کافی وقت لگ گیا۔لشکر بھوک سے بے تاب ہور ہا تھا۔لشکرابھی کھانا کھانے کے لیے بیٹھا تھا کہ عین اس وقت سنتریوں نے اطلاع دی کہ مسلمانوں کی فوج سر پر آ گئی۔خالد اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے اور ان کی بے خبری کے عالم میں دشمن کو جالیا تھا اس لیے ان کی فوج میں افراتفری مچ گئی۔شاہی فوج کھانا کھانے میں مست تھی اور صرف عیسائی فوج مسلمانوں کو روکے ہوئے تھی۔غرض اس میں مسلمانوں نے پہلی بار میدے کی پرتکلف روٹیاں دیکھی تھیں اور جو کھانا جابان نے اپنے لشکر کے لیے تیار کیا تھا اس پر مسلمان مجاہدوں کا نام لکھا تھا ۔دشمن کوشکست دینے کے بعد اطمینان سے کھانا کھانے لگے۔غرض اس جنگ میں بہت زیادہ تعداد میں عیسائی اور آتش پرست مارے گئے۔

جب ایرانی کسریٰ اردشیر کو معلوم ہوا ہمارے یہ تینوں سپہ سالار انوشجان اور قباذ مارے گئے ہیں تو وہ نیم پاگل ہوگیا۔اس نے کہا کیا یہ مدینے والے بھوت ہیں یا جن ہیں ایسا کیا ہے جو بہت ہی تھوڑی نفری کے ساتھ ہمارے بھاری لشکر کوشکست دیتے ہیں۔اردشیر نے بتایا کہ ان کے پاس لڑنے کا جذبہ موجود ہے۔وہ اپنے نعرے میں خدا ورسول کو پکارتے ہیں۔وہ اپنے عقیدے کے پکے اور ان کے اندر مذہب کا جنوب ہے۔یہی ان کی طاقت ہے تب اردشیر نے اپنے ایک اور سپہ سالار اندرزغر کو بلایا اور کمانداروں سے کہا کہ تم اس کو بتاؤ کہ ہماری فوج کی کیا کمزوری ہے۔تب کمانداروں نے اس کو ساری باتیں بتائیں۔اس نے کہا کہ میں ان سے صحرا کے بجائے سرسبز واور دلدل علاقے میں لڑوں گا۔اردشیر نے ایک اور سالار بہمن جازویہ کو بھی خط کے ذریعہ جنگ لڑ.نے اور تیاری کرنے کے لیے کہا اور لکھا کہ اپنی تمام فوج کو لے کر فرات کے کنارے ولجہ کے مقام پر آجائے اور وہاں پر پہنچ کر دوسری فوج کا انتظار کرے۔ساتھ ہی اندزغر نے عیسائیوں کو اپنی فوج میں رکھنے کی کوشش کی جو بکر بن وائل قبیلے کے تھے۔اندرزغر نے عیسائیوں کو ان کے مذہب کے نام پر اکٹھا کیا ساتھ ہی مسلمانوں سے ڈرایا کہ وہ جس علاقے کو فتح کرتے اسلام قبول کرنے کے لیے کہتے ہیں اور عیسائیوں کو مذہب کی خاطر جنگ پر آمادہ کیا اور انھیں اتنا مشتعل کیا کہ عیسائیوں کے گھروں کے بچے بچے جنگ لڑنے پر آمادہ ہو گئے اور مذہب کے نام پر لڑنے کے لیے تیار ہو گئے۔

اندرزغر کی جو فوج مدائن سے آ رہی تھی وہ مسلمانوں سے کئی گنا تھی مگر خالد ہر جنگ کو عقل وفہم کے ساتھ ساتھ لڑتے تھے یہ دونوں فوجیں ولجہ کے مقام پر اکٹھا ہونے والی تھیں مگر قاصد کے پیغام ملنے پر بہمن جازویہ نے کوچ کیا اس لیے ان دونوں کے ملنے میں کافی دن لگ سکتے تھے اس لیے خالد نے یہ چال سوچ لی کہ اس کی فوج کے آنے سے پہلے ہی اندرزغر کی فوج کو شکست فاش دے دے تا کہ پیچھے آنے والی فوج کا جذبہ کمزور ہو جائے۔

خالد نے اپنی فوج کی ترتیب اس طرح کی۔ دس ہزار سواروں کو اپنی رکاب میں رکھ کر تین ہزار سوار بشر بن ابی رحم اور تین ہزار سوار سعید بن مرہ کی کمان میں دے دیا اور کہا کہ کل تم دونوں اندرزغر کی پشت پر حملہ کرنا۔ ساتھ ہی اپنی فوج کو یہ بتا دیا کہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد نعرے لگانا تا کہ دشمن کو ایسا لگے کہ ہماری نفری آ رہی ہے۔ ولجہ میں بوڑھے اندرزغر کی فوج کے ساتھ نا تجربہ کار بوڑھے بھی تھے جو صرف تاج ایران کی آواز پر نکل پڑے تھے۔ جب اندرزغر نے خالد کے لشکر کو دیکھا تو حیرت زدہ ہو گیا۔ اس کی فوج میں نہ میسرہ تھا نہ میمنہ نہ ہراول نہ سراقہ۔ وہ اسے دیر تک دیکھتا رہا۔

قاضی عبدالستار نے یہاں خالد بن ولید کی ان تمام جنگی فہم وفراست کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> ''بوڑھے جنرل کو کیا معلوم تھا کہ سیف اللہ عسکری دنیا کا واہ نابغۂ روزگار ہے جس کی اسی جنگی تکنیک کا سبق چودہ سو برس بعد دوسری جنگ عظیم میں اتحادی فوجیں دہرائیں گی اور نازیوں پر فتح پائیں گی۔'' 5

غرض صبح ہو گئی خالد کے لشکر کی طرف سے کوئی جنبش نہیں ہوئی اندرزغر کا لشکر جنگ کے لیے تیار کھڑا تھا۔ جب سورج سر پر آ گیا اور ایرانی فوج بھوک سے بے حال ہونے لگی تو خالد نے حملے کا حکم دے دیا۔ اندرزغر کا حوصلہ قارن ہرمز اور دوسرے سالاروں کے انجام دیکھ کر ٹوٹ چکا تھا مگر وہ اپنی کوئی ہوئی آبرو کو بچانے کے لیے پوری شجاعت کا اظہار کر رہا تھا۔ قلب سے لڑائی ہو رہی تھی کہ پشت سے بھی حملہ ہونے لگا۔ غرض اس خونریز جنگ کو اندرزغر مرتے مرتے بچا اور میدان چھوڑ کر بھاگ گیا اور کچھ دنوں کے بعد شرم سے خودکشی کر لی اور بہت سے سپاہی کٹ گئے باقی بچے ہوئے بھاگنے لگے۔ اس جنگ میں عیسائیوں کے بے شمار افراد مارے گئے ساتھ ہی صحرا کی طرف بھاگنے لگے۔ جب خالد بن ولید کے سپاہیوں نے بھاگتی ہوئی فوج

5: خالد بن ولید۔ قاضی عبدالستار۔ ایجوکیشنل ہاؤس، دہلی سنہ اشاعت 2017 ص: 45

کا تعاقب کر کے قتل کرنے کی اجازت مانگی تو خالد بن ولید نے کہا:

''بوڑھی اور عیاش قوموں کے بھاگے ہوئے سپاہی دوبارہ میدان جنگ میں بھاگنے کے لیے آتے ہیں۔ دولت کسریٰ ابھی کئی لشکر نکالنے کی طاقت رکھتی ہے۔اگر تم ان کو قتل کر دو گے تو ان کی جگہ نئے رنگروٹ بھرتی ہو کر سامنے آئیں گے ہو سکتا ہے وہ ان سے زیادہ سخت جان ہوں۔'' 6

خالد کا یہ قدم دانشمندانہ تھا۔ یہ بھاگے ہوئے سپاہی اپنے لشکر میں جا کر مسلمانوں کے لشکر کے بارے میں حیرت انگیز اور عجیب وغریب باتیں کرتے تھے جس سے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ انسان نہیں کوئی اور مخلوق ہوں جن سے جنگ جیت پانا ناممکن ہے ۔اس طرح سے دوسرے لشکر کے اندر خوف وہراس پھیلاتے تھے ان کا بھاگنا ایک طرح سے خالد کے حق میں ثابت ہوتا تھا لہٰذا وہ دوسری جنگ میں بھی شامل ہو کر سب سے پہلے بھاگتے تھے اس لیے غنیم کی فوج میں افراتفری پھیل جاتی اور وہ سراسیمہ ہونے لگتے تھے۔

الیس کا مشہور اور خوبصورت شہر خالد بن ولید کے قدموں میں پڑا تھا اس کے علاوہ خالد یہاں سے کوچ کرتے ہوئے امنیشا پہنچ گئے قبل اس کے کہ بھاگی ہوئی فوج ایک اور جنگ کی تیاری کرے۔تھوڑی دور کے بعد حیرہ کا مشہور تھا جہاں تک پہنچنے کے لیے کشتیوں کا سہارا لیا گیا کیونکہ امنیشا کے لوگ شہر خالی کر کے بھاگ گئے تھے۔ حیرہ امنیشا سے کچھ دور پر تھا وہاں کا حاکم ازادیہ تھا۔امنیشا کے لوگ خالد بن ولید کا نام سن کر اس طرح بھاگے تھے کہ سارے گھر میں قیمتی سامان ہیرے جواہرات موجود تھے۔ مال غنیمت مدینے بھیجا گیا۔ جب خلیفۃ المسلمین نے مسلمانوں کو مسجد میں بلایا اور انھوں نے خالد کی فتوحات کی تفصیل سنائی اور تاریخی جملہ کہا:

''اے قریش! تمھارا شیر ایک اور شیر پر جھپٹ پڑا اور اسے مار گرایا ہے۔اب عورتیں خالد جیسا بیٹا پیدا کرنے سے قاصر ہیں۔'' 7

شہنشاہ اردشیر نوشیرواں عادل کا پرپوتا تھا۔کسریٰ جو اپنی سلطنت اور دولت کے نشے میں چور رہتے تھے اور خود کو ناقابل تسخیر سمجھتے تھے خالد کی پے در پے فتوحات اور ایرانی فوج کی شکست کو سن سن کر بیمار ہو گیا اور

6: خالد بن ولید۔قاضی عبدالستار۔ایجوکیشنل ہاؤس، دہلی سنہ اشاعت 2017 ص:46

7: خالد بن ولید۔قاضی عبدالستار۔ایجوکیشنل ہاؤس، دہلی سنہ اشاعت 2017 ص:49

ڈپریشن میں آکر مر گیا تھا۔

غرض اسلامی عسا کر نے کشتیوں سے حیرہ تک پہنچنے کا ارادہ کیا کیونکہ یہ راستہ آسان اور چھوٹا تھا ۔دریائے فرات سے یہ کشتیاں گزر رہی تھیں ۔ازادیہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ وہ کشتیوں سے آرہے ہیں تو اس نے اپنے بیٹے سے کہا کہ فرات کا پانی بند کر دے۔غرض یہ اسلامی لشکر کی کشتیاں پانی بند ہونے کی وجہ سے پھنس گئیں۔مثنیٰ بن حارثہ جو خالد بن ولید کے ساتھ تھے انھوں نے مسلمانوں کے لشکر کو بتایا کہ دشمن نے پانی بند کر دیا اور وہ اپنے ساتھ چند سوار لے کر بند تک پہنچے اور دشمن کو مار کر بند کھول دیا اور اس طرح سے فرات کے پانی کو مسلمانوں کی کشتیوں کو بند کرنے والا ازاویہ کا بیٹا مارا گیا۔اپنے بیٹے کی یہ خبر سن کر ازادیہ نہایت غمگین ہوا اور سکتے کی حالت میں تھا اور اس نے کسی سے ایک لفظ بولے بغیر مدائن کی طرف جانے والی تارک راہوں میں کھو گیا۔

مگر الحیر ہ کی فتح اتنی آسان نہیں تھی۔الحیر ہ قصر ایران کا ایسا مرکز تھا جہاں سے شہنشاہ کو خراج اور عیش وعشرت کا سامان مہیا کرایا جاتا تھا۔خالد بن ولید نے قصر الیس،قصر العدسین اور نبی زماں کو حراست میں لے لیا اور الحیر ہ کو حکم بھیجا کہ ایک دن کے اندر ہتھیار نہ رکھا جائے گا تو قلعے کو زمین کے برابر کر دیا جائے مگر اہل قلعہ اتنی جلدی ہار ماننے والے نہیں تھے۔قلعے کے اوپر سے لگا تار تیروں کا مینہ برسایا جاتا تھا۔سیف کے حکم کا جب کوئی اثر نہیں ہوا تو انھوں نے الیس اور امنیشا کی فتح میں آئی ہوئی منجنیقوں اور دبابوں کو حاضر کرنے کا حکم دیا۔شور سن کر سفارش اور صلح کی درخواست کی جانے لگی۔

یہاں پر قاضی عبدالستار نے الحیر ہ کی خوبصورت منظر نگاری اور ان کے بنائے گئے دنیاوی عشرت پر عبرت پر عبرت کی نگاہ ڈالی انھیں لگتا ہے کہ خالد بن ولید نے جب ان آرائش وزیبائش کے ساز وسامان کو دیکھا تو انھیں محسوس ہوا زندگی کی یہی نعمتیں زندگی سے محبت اور موت کا خود پیدا کر دیتی ہیں اور بزدل بنا دیتی ہیں اور میدان جنگ سے فرار کا سبق پڑھانے لگتی ہیں۔

حیرہ کی فتح کے بعد خالد بن ولید سکون سے نہیں بیٹھ گئے۔انھیں لگتا تھا فارس کی شہنشاہی جیسے ہی مضبوط ہی ہوگی اسلام کو خطرہ پہنچانے کی کوشش کی جائے گی اس لیے انھوں نے حیرہ کے آس پاس کے علاقوں دور دراز کے مقام جہاں عیسائی اور ایرانی فوج بھاگ بھاگ کر اکٹھے ہو رہے تھے ان پر یلغار کرنے

کی کوشش کی تا کہ دشمن سے حفاظت ہو جائے اور مسلمان ہر طرح کی پریشانیوں سے محفوظ ہو جائیں۔غرض عین التمر اور انبار ایسی جگہیں تھیں جہاں سے خطرہ تھا۔عین التمر میں مہران جو سالار تھا اس کی سرپرستی میں فوجیں اکٹھی ہو رہی تھیں جو انبار سے بھی بھاگے ہوئے تھے یہ فرات سے قریب کا علاقہ تھا انبار تھوڑا زیادہ دوری پر تھا اور تجارتی مرکز تھا۔جو انبار کے لوگوں نے سنا کہ مدینے کی فوج آ رہی ہے تو قلعے کے چاروں طرف خندق کھود دی اور خود قلعے کے اندر چھپ گئے۔انبار کا سپہ سالار شیرزاد جو ایک عیاش رئیس بھی تھا۔مؤرخوں نے لکھا ہے کہ انبار کا قلعہ دیکھنے میں نا قابل تسخیر لگتا تھا جس کے چاروں طرف خندق کھودی ہوئی تھی اور اس کے چاروں طرف محافظ گھوما کرتے تھے جیسے ہی کوئی مجاہد آگے بڑھنے کی کوشش کرتا اس کے اوپر تیروں کی بارش ہونے لگتی تھی مگر مقابلے میں سیف اللہ تھے جن کے فن حرب وضرب کا ایران نے لوہا مان لیا تھا۔جنھوں نے کسریٰ کے پاؤں تلے زمین کھینچ لی تھی اور اسی کے ملک میں رہتے ہوئے اس کو شکست دی تھی۔غرض ایک دن خالد خندق کے چاروں طرف چکر لگا رہے تھے انھوں نے دیکھا کہ ایک ایسی جگہ ہے جہاں خندق کی چوڑائی کم ہے ۔غرض حکم دیا کہ بیمار بوڑھے اور پرانے اونٹوں اور گھوڑوں کو ذبح کر کے خندق پاٹ دیا جائے۔اس طرح گوشت اور ہڈیوں اور پل کے سہارے لشکر گزر گیا۔یہ ایسی چال تھی جو صرف سیف اللہ کو ہی اللہ نے عطا کی تھی ۔غرض جب شیرزاد نے دیکھا کہ خالد سے فتحیاب ہونا ناممکن ہے تو قلعہ کا دروازہ کھول دیا اور تمام شرائط مان لیا۔

مہراں چوبیں جو بہرام چوبیں کا بیٹا تھا اور آزمودہ کار سپاہی تھا اس کو معلوم تھا خالد کی فوجیں ایک کے بعد ایک فتح حاصل کرتی جا رہی ہیں ۔غرض اس نے سوچا کہ جو خالد کی فوج کو شکست دے کر تاریخ میں نام پیدا کرے اور اس نے عربی عیسائی قبیلوں بنی تغلب اور ایاد کو عین التمر میں اکٹھا کیا۔جن کے سردار عقہ بن ابی عفہ تھے،لیکن مہراں بن بہرام نے چالاکی کے ساتھ عیسائی عربی قبیلوں کے لوگوں کو مسلمانوں کے سامنے بھیج کر خود کو بچالیا اور عقہ کی سپہ سالاری میں عیسائیوں نے خالد بن ولید کے سامنے آ گئی۔دونوں کے بیچ سخت مقابلہ ہوا لیکن باطل کو شکست فاش ہوئی اور عقہ نے ہتھیار ڈال دیا،لیکن ابھی فوجوں کی جو تعداد تھی وہ برابر مقابلہ میں آ رہی تھی مہراں قلعہ میں چھپ کر بیٹھ گیا اور جب فتح کی کوئی امید نہیں بچی تو تمام خزانے مدائن بھجوا کر خود بھاگ گیا اور عرب عیسائیوں کو عرب مسلمانوں سے مقابلے کے لیے بھیج دیا۔

تمام شہر کی جب تلاشی لی جا رہی تھی تب خالد بن ولید نے دیکھا کہ ایک گرجا میں بہت سے بچے قید ہیں۔معلوم ہوا کہ یہ سب عیسائی مذہب کے لیے وقف ہیں اور انھیں پادری بننے کی تعلیم دی جاتی ہے۔ان بچوں میں سے بیشتر نے اسلام قبول کیا۔ان ہی میں سے ایک نصیر بھی تھا تاریخ اسلام کا ایک نامور یادگار شخصیت جس کا بیٹا موسیٰ بن نصیر تھا جو شمالی افریقہ کے امیر مقرر ہوئے جنھوں نے طارق بن زیاد کو اندلس فتح کرنے کے لیے بھیجا تھا۔

عنایت التمش نے شمشیر بے نیام میں لکھا ہے کہ جب خالد کا لشکر حیرہ پہنچا تو تمام فوج قلعہ خالی کر کے چلی گئی تھی۔خالد بن ولید کو لگ رہا تھا کہ کہیں ایسا تو نہیں یہ ان کی کوئی چال ہو مگر کئی بار اعلان کرنے پر کوئی فوج باہر نہیں آئی تھی تبھی شہر کے معززین اور سرکردہ افراد کا ایک وفد خالد کے پاس آیا اور اس نے بتایا کہ فوج مدائن چلی گئی اور حاکم ازادبہ بھی چلا گیا اور شہر کی رعایا امن وامان چاہتی ہے۔

> انھوں نے کہا ''حیرہ آپ کا۔'' حیرہ کے ایک سردار نے خالد سے کہا ''لیکن آپ اس شہر پر قبضہ کر کے امن وامان سے نہیں رہ سکیں گے۔آپ کو شاید معلوم ہوگا کہ حیرہ کے اردگرد چار قلعے ہیں جن کے قلعہ دار مختلف قبیلوں کے سردار ہیں اور ہر ایک قلعے میں عیسائی عربوں کی فوج موجود ہے۔'' 8

حیرہ کے محاصرے کے ساتھ چار قلعے قصر ابیض ضرار ابن الازور کو حکم دیا گیا۔قصر العدسین ضرار ابن خطاب، قصر بن بقیلہ کو مثنیٰ بن حارثہ اور قصر بنو مازن تھا۔ قلعے والوں نے بڑی کوششیں کیں اپنے دفاع کے لیے مگر اہل شہر کی پریشانیوں اور ان کے بار بار صلح کی شرائط پر ان قلعے داروں نے باہر نکل کر خالد بن ولید کے سامنے صلح کر لی۔ یہاں پر ایک قصہ قابل ذکر ہے جو بہت دلچسپ بھی ہے۔قاضی عبدالستار نے اس کو بہت خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔خالد بن ولید ابھی سفارت اور دوسرے امور کی خدمات انجام دے رہے تھے تبھی ایک بوڑھا عرب ان کے سامنے آ گیا اور کہنے لگا ''یا سیف اللہ ارشاد نبویؐ کی تکمیل کا وقت آ گیا۔''

دریافت کرنے پر بتایا کہ نبی نے کہا تھا کہ جب حیرہ فتح ہوگا تو کرامہ کو شویل کے عقد میں دے دیا جائے گا اور اس نے خود کو شویل بتایا اور اس نے بتایا کہ کرامہ عبدالمسیح کی بیٹی ہے جو نہایت حسین وجمیل ہے اور اس کا حسن ضرب المثل بن گیا تھا۔

8: شمشیر بے نیام۔التمش۔حصہ دوم ص:14

غرض اس بوڑھے عرب کے قول کی صداقت کئی اصحاب رسولؐ نے کی اور بتایا کہ ایک بار ایران کا ذکر ہو رہا تھا اور بات ہو رہی تھی اگر حیرہ فتح ہو جائے تو اس کو فوجی اڈہ بنالیا جائے گا تبھی رسول کریمؐ نے کہا کہ تھوڑے عرصے بعد حیرہ ہمارے قبضے میں ہوگا اور تبھی ثویل نے کہا یا رسول اللہ! جب حیرہ فتح ہو گیا تو عبدالمسیح کی بیٹی مجھے دے دی جائے۔

رسول کریمؐ نے مسکراتے ہوئے اور از راہ مذاق کہا" حیرہ فتح ہو گیا تو کرامہ بنت عبدالمسیح تیری ہوگی۔"

ان واقعات کا ذکر بلاذری اور طبری کے حوالے سے التمش اور زید شبلی نے بھی کیا ہے۔ قاضی عبدالستار نے بھی اس واقعہ کا ذکر اس ناول میں کیا ہے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ نبی کریمؐ کو اس بات کا اندازہ تھا کہ حیرہ فتح ہوگا اور جو بات نبی کی زبان سے نکلے وہ ممکن ہی نہیں کہ قبول نہ ہو۔ غرض بہت جلد کسریٰ کی سلطنت بکھرنے لگی اور نبی کے قول کی تصدیق ہوگئی۔ خالد بن ولید نے اس عرب کی باتیں سن کر امیر سفارت عبدالمسیح سے کہا کہ رئیس الحیرہ کی بیٹی کرامہ کو پیش کر دی جائے۔

ثویل کے سامنے جب کرامہ پیش ہوتی ہے تو وہ کوئی نوخیز دوشیزہ نہیں ہوتی بلکہ ایک بڑھیا ہوتی ہے۔ کرامہ نہایت حسین و جمیل خاتون تھی مگر جب حیرہ فتح ہوتا ہے تو ظاہر سی بات ہے ایک مدت گزر چکی ہوتی ہے۔ غرض کرامہ ثویل کو بتاتی ہے کہ اسے معلوم تھا کہ نبی کریمؐ نے یہ بات کہی ہے مگر اس وقت میں جب بوڑھی ہو چکی ہوں چاہو تو تم مجھے فدیہ دے کر آزاد کر سکتے ہو جتنی رقم مانگو گے وہ تمھیں ادا کی جائے گی۔ کسی بھی مؤرخ نے یہ بات تاریخ کے ساتھ نہیں درج کی ہے کہ الحیرہ کی بات نبی کریمؐ کب کی۔ غرض ثویل نے دس ہزار درہم لے کر کرامہ کو آزاد کرنے کا عرض کیا۔ قاضی عبدالستار نے دس ہزار کی رقم لکھی ہے جبکہ عنایت اللہ التمش نے ایک ہزار کے بارے میں لکھا ہے۔ اس طرح سے کرامہ دس ہزار دے کر آزاد ہو جاتی ہے مگر یہ شخص دوبارہ خالد بن ولید کے پاس آتا ہے اور کہتا ہے یا سیف اللہ میں لٹ گیا۔ برباد ہو گیا۔

خالد پوچھتے ہیں کیا ہو گیا؟ کہنے لگتا ہے کہ کرامہ اتنی امیر ہے یا امیر کی بیٹی کہ وہ اس سے مزید رقم دے سکتی تھی۔ خالد بن ولید نے کہا بے شک دے سکتی تھی مگر اب کیا ہوا وہ کہنے لگا مجھے معلوم نہیں تھا کہ دس ہزار دینار سے اوپر بھی کوئی رقم ہوتی ہے۔

لیکن یہاں سیف اللہ اپنی دیانت داری کا فرض ادا کرتے ہوئے بولے تم نے جو رقم مانگی وہ پیش کی گئی اب دوبارہ اس شرط میں کوئی بدلاؤ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ مسلمان ہی نہیں عرب شرافت کی شان کے خلاف ہے۔

عیاض بن غنم جو ایک قابل سپہ سالار تھے جنھیں دومۃ الجندل کی فتح کے لیے بھیجا گیا تھا مگر یہاں عیاض بن غنم کو دشمن کی فوجوں کے آگے ہزیمت اٹھانی پڑی۔ خلیفہ ابوبکر نے ولید بن عقبہ سے کہا کہ خالد سے کہو کہ عیاض کی مدد کو پہنچے۔ دومۃ الجندل پر تجارتی شہر تھا۔ رسول اللہ کی وفات کے بعد یہاں ارتداد کا جو فتنہ اٹھا تھا اس کو سر کرنے کے لیے عیاض کو بھیجا گیا تھا جس کا رئیس اکیدر بن عبدالملک تھا۔ عیسائیوں کا ایک طاقتور قبیلہ کلب اس کے ساتھ تھا۔ غرض خالد کے پہنچتے ہی اکیدر بن عبدالملک کے ہوش ٹھکانے آ گئے۔ اکیدر جو رسول اللہ کے ساتھ بدعہدی کرتے ہوئے مرتدوں کا مالک بن بیٹھا تھا خالد نے اسے قتل کر دیا اور عیسائیوں کے قبیلوں کے ساتھ جنگ ہوئی جو اپنی فتح سے عیاض بن غنم کے ساتھ ہوئی معرکہ آرائی میں جوش میں تھے بہت جلدی خالد کے پھیلائے ہوئے جال میں آ گئے اور خالد نے انھیں اپنے حرب وضرب میں لیتے ہوئے شکست دی۔ اس طرح دومۃ الجندل کا قلعہ مسلمانوں کے زیر نگیں آ گیا۔

دومۃ الجندل کے بعد حصیر اور فناس کے ساتھ البشر اور الزمیل کے قلعے کو فتح کر لیا۔ الغراض کے ساتھ ایک خونریز معرکہ ہوا۔ الغراض کی جنگ میں تقریباً ایک لاکھ غنیم مارے گئے جب سیف اللہ کو ایران وعراق میں چاروں طرف سے سکون واطمینان ہو گیا تو انھوں نے بیت اللہ کی زیارت کا ارادہ کیا۔ خالد نے حج کا ارادہ کیا اور دومۃ الجندل جو مکہ سے ہزاروں میل کی مسافت پر ہے اس کو اپنے نیک ارادے سے ناپنے کی کوشش کی۔ قاضی عبدالستار نے لکھا ہے:

> ''حج کی تاریخ میں یہ پہلا حج تھا۔ یہ آخری حج تھا جو کسی جنرل نے ہزاروں میل کے محاذ جنگ سے اٹھ کر چشم زدن میں انجام دیا اور قبل اس کے کہ کسی کو خبر ہوا اپنے مرکز پر قائم ہو گیا۔ پندرہ سو سال کی شاندار تاریخ بھی ایسی کسی دوسری مثال سے خالی ہے۔'' [9]

مگر خلافت مدینہ کی نظر سے کوئی چیز بچ نہیں سکتی اور مجاہدوں کی نظر نے عمامے کے نیچے سے نظر آنے والے خوبصورت بال کو نہ دیکھ کر حج کی مبارک باد کا نعرہ بلند کر دیا۔ ابھی کچھ لمحہ بھی نہیں گزرا تھا کہ خلافت

---

[9] خالد بن ولید۔ قاضی عبدالستار۔ ایجوکیشنل ہاؤس، دہلی سنہ اشاعت 2017 ص:66

سے خط آ گیا۔

''تمھاری سپہ سالاری پوری دنیا کی عسکری تاریخ میں بے مثال ہے اور مردانگی بے نظیر ہے لیکن خبردار آئندہ ایسی حرکت سرزد نہ کہ ہزار ہا مسلمانوں کی جانوں کا خطرہ پیدا ہوجائے۔''10

خالد بن ولید نے جو عسکری دنیا میں اپنے فن حرب وضرب کا لوہا منوایا اس نے جب سلطنتوں کو فتح کیا تو اپنے نظام سیاسی تدبیر حکمت عملی سے نظم ونسق کی ایک بہترین بنیاد ڈالی۔ کسانوں اور غریبوں کو بھاری بھرکم لگان سے نجات دی۔ نہروں اور آب پاشی کا انتظام بہتر کیا۔ اس کے علاوہ تمام مذاہب کو آزادی کے ساتھ رہنے اور انھیں اپنے دین پر قائم رہنے کے لیے آسانیاں پیدا کیں۔ اس کے علاوہ انصاف کے ساتھ بین المذاہب کے لوگوں کو عطا کیا۔ مدائن جو ایران کی بادشاہی کا مرکز تھا مدائن میں بہمن جاذویہ شیرزاد جو حاکم ساباط انبار سے بھاگا تھا اس کے علاوہ مہراں بن بہرام جو عین التمر سے بھاگا تھا وہ سبھی مدائن میں موجود تھے۔ جسے بچانے کے لیے کسریٰ اپنی تمام دولت کو لگا سکتا تھا۔ ابھی خالد بن ولید مدائن پر یلغار کرنے کی اجازت حاصل کرنے والے تھے کہ مشہور زمانہ شاعر اعشیٰ آیا اور اس نے شام کی فتح کی مبارک باد دی اور کہا کہ:

''رومۃ الکبریٰ کی سلطنت کبیر تیرے جھنڈے کی پرچھائیوں کے نام رہیں رکھ دی گئی ہرقل اعظم کے قتل کے لیے سیف اللہ کی تلوار نامزد ہو چکی۔''11

پھر اس نے بتایا کہ وہ مسجد نبوی میں تھا نائب رسول نے امین الامۃ کا خط شام کے قاصد نے پڑھا جس میں ہرقل کے ایک بڑے لشکر کے ساتھ مدینۃ النبیؐ پر چڑھائی کا منصوبہ تھا جس کے لیے ہرقل نے ایک بہت لشکر اکٹھا کیا ہے۔ تبھی نائب رسول نے نہایت جلال کے ساتھ کہا کہ خدائے ذوالجلال کی قسم خالد بن ولید کو بھیج کر تیری ایسی مار لگواؤں گا کہ صدیوں کی شہنشاہی عظمیٰ کا نشہ دلوں میں اتر جائے گا۔ یہ خبر سب سے پہلے سنانے کے لیے اعشیٰ نے ہزاروں میل کا سفر طے کرتے ہوئے مدینے کے قاصد سے پہلے خالد بن ولید کے پاس پہنچ گیا تھا۔

10: خالد بن ولید۔ قاضی عبدالستار۔ ایجوکیشنل ہاؤس، دہلی سنہ اشاعت 2017 ص:67

11: خالد بن ولید۔ قاضی عبدالستار۔ ایجوکیشنل ہاؤس، دہلی سنہ اشاعت 2017 ص:68

شام کا فاصلہ ہزاروں میل کا تھا پر جانے کے لیے رافع بن مرہ الطائی کو رہبری کے لیے بلایا گیا۔ رافع بن مرہ کو جب خالد نے بتایا کہ انھیں شام تک پہنچنے کے دشوار گزار صحرا کو چنا ہے تو رافع نے بتایا۔

''لیکن آپ یہ نہیں جانتے کہ سیکڑوں برس کی تاریخ میں کسی شہنشاہ نے بھی اس راستے پر قدم رکھنے کی جسارت نہیں کی۔ آپ نہیں جانتے کہ یہ وہ راستہ ہے جس کو دس برس میں ایک آدھ مرتبہ قتل کے مفرور ملزم ریگستانی ڈاکو اور شہنشاہوں کے گنے چنے جاسوس استعمال کرتے ہیں اور اکثر راستے میں ختم ہو جاتے ہیں۔ آپ نہیں جانتے کہ سیکڑوں کوس کے راستے میں صرف ایک جگہ پانی ملنے کی امید ہے۔ صرف امید۔ آپ یہ بھی نہیں جانتے کہ آدھا راستہ اتنا تنگ ہے کہ ایک وقت میں صرف ایک سوار گزر سکتا ہے۔''[12]

لیکن اتنا دشوار گزار راستے کے بارے میں سن کر بھی خالد نے اپنی فیصلہ تبدیل نہیں کیا کیونکہ خالد بن ولید ایک ایسا سپہ سالار تھا جو چاہتا تھا کہ قیصر و کسریٰ کے گلے میں ہیبت کا وہ قلادہ ڈال دے تاکہ وہ کبھی مدینے کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی جسارت نہ کر سکیں۔ غرض اس دشوار کٹھن مہم کے لیے اونٹوں کو تیار کیا گیا اور انھیں پیالہ میں رکھ کر پھر پانی پلایا گیا۔ اس کے علاوہ پانچ سو اونٹوں پر پانی لادا گیا۔ یہ صحرا جان لیوا تھا جہاں قدم قدم پر سراب دکھائی دیتا ہے جہاں پر بھٹکنے والا راستہ بھول جاتا ہے تو صحرا میں دوڑتے دوڑتے مر جاتا ہے اور اس کے جسم کا گوشت اور ہڈیاں لکڑوں کے مانند سوکھ کر جل جاتی ہیں مگر سیف اللہ راستے کے تمام دشوار گزار اور جان لیوا خطرات کو کھیلتے ہوئے مجاہدوں، اونٹوں اور گھوڑوں کا نذرانہ ادا کرتے ہوئے چل پڑے۔ ہرقل کے فرشتے کو خبر نہیں تھی خالد بن ولید سیف اللہ کی سرحد میں داخل ہو چکا ہے۔

یہاں قاضی عبدالستار نے جس رہبر رافع بن مرہ الطائی کا ذکر کیا ہے اس کو ایک عیسائی کے طور پر پیش کیا ہے مگر التمش نے انھیں خالد بن ولید کا داماد اور انھیں مسلمان کے طور پر پیش کیا۔ مگر ہم یہاں اب زید شبلی کی کتاب خالد سیف اللہ میں اس کے مسلمان یا عیسائی ہونے کا کوئی ذکر نہیں ملتا ہے۔ حضرت خالد حیرہ سے چل کر قراقر پہنچے۔ قراقر عراق کی سرحد کے قریب سحاوہ کے علاقے میں بنو کلب کا چشمہ تھا وہاں سے آپ نے سویٰ پہنچنا چاہا کیونکہ آپ کا خیال تھا اگر آپ معروف اور آسان راستے سے گئے تو نہیں پہنچ سکتے ہیں اور راستے میں جنگ کا بھی خطرہ تھا۔ وہ رومیوں کو عقب سے جا لیں گے۔ اس طرح انھوں نے نہایت پریشانیوں

12: خالد بن ولید۔ قاضی عبدالستار۔ ایجوکیشنل ہاؤس، دہلی سنہ اشاعت 2017 ص: 48

سے سویٰ تک کا سفر کیا۔ رافع جو رہبر تھا خود تین سال بعد اس راستے سے گزرا تھا۔ وہاں انھوں نے منیٰ پر حملہ کیا اور اس کے بعد ارک پہنچے جو صحرائے حلب کے آخر میں تدمر کے قریب ہے۔ تدمر سے حلب پانچ دنوں کی مسافت پر ہے۔ یہاں کے باشندوں نے قلعہ میں قید ہو کر جنگ کرنی چاہی مگر بعد میں صلح کر لی۔ تدمر سے قریتین پہلے جو حمص کے علاقے کے قریب ہے۔ اس کے بعد حوارین کا رخ کیا۔ وہاں سے آپ قصم پہنچے جو عراق کی سرحد پر صحرائے شام کی ایک بستی ہے۔ ''ثنیۃ العقاب'' جس عنوان سے اس ناول کا ذکر ہوتا ہے جہاں معتصم باللہ نے اپنے سواروں کو عقاب کے علم کا طواف کرنے اور وہاں سے پیدل گزرنے کا حکم دیا تھا۔ ''ثنیۃ العقاب'' پر پہنچ کر آپ نے رسول اللہ کا دیا ہوا سیاہ علم ''عقاب'' کو لہرایا۔ یہ دمشق کے شمال میں ایک درہ ہے۔ مرج راہط سے غوط جہاں غسانیوں سے آپ کی خونریز جنگ ہوئی۔ مرج رہط سے بصریٰ جہاں کے لوگوں نے جنگ کرنے کے بعد صلح کر لی۔ خالد بن ولید کے شام پہنچنے سے پہلے ابوعبیدہ بن الجراح ،شرجیل بن حسنہ اور یزید بن ابوسفیان موجود تھے جو الگ الگ مقام پر چند ہزار نفری کے ساتھ موجود تھے۔ یہ سپہ سالار مختلف جگہوں پر رہتے ہوئے ہرقل کی بڑی اور تازہ دم فوج کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے اس لیے نائب رسول خلیفۂ اول نے ان سبھی کو یرموک کے مقام پر اکٹھا ہونے کا پیغام بھیجا تھا غرض نائب رسول کا دوسرے دن فرمان ملتے ہی مثنیٰ بن حارث کے زیر کمان لشکر کو دے کر مدائن پر یلغار کا حکم دیا اور خود کو شام کی طرف جانے کے لیے تیاری کرنے لگے۔ ماہ ربیع الاول میں آپ یرموک پہنچے۔ یہی وہ تاریخ ساز مقام ہے جسے جنگ یرموک کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہاں ہرقل کی فوج کے ساتھ باہان بھی رومی سپاہیوں سے مل گیا تھا ۔دشمن کی فوج تقریباً دو لاکھ کے قریب تھی اور اسلامی لشکر چالیس ہزار کے آس پاس تھا۔

ہرقل کے پاس خلیفۂ اول نے قاصد بھیجا مگر اس نے مدینہ کے قاصد کے ساتھ بہت برا سلوک کیا تھا۔ ہرقل سے مسلمانوں کی نبرد آزمائی رسول اللہ کی حیات میں ہی جنگ موتہ میں ہو چکی تھی جس میں کئی مسلم سپہ سالاروں نے شہید ہو کر اسلام کے نام خود کو زندۂ جاوید کر لیا مگر مسلمانوں کی تعداد رومیوں کے مقابلے نہایت ہی کم تھی اس لیے مسلمانوں کو اس جنگ میں خالد کی سربراہی میں واپس لوٹنا پڑا۔ اپنی اس نامکمل فتح پر رومیوں کا بادل چھا گیا تھا۔ کچھ وقت تک خلیفۂ اول نے ارتداد کی آندھی کو خالد سیف اللہ کی سیف سے کاٹ کر موسم کو صاف کیا جب ادھر سے کچھ خطرہ ٹل گیا تو ایران و عراق کی شہنشاہیت کے غرور کو

خاک میں ملا کر خلیفۂ اول نے حضرت خالد بن سعید کی سپہ سالاری میں اک لشکر روم بھیجا مگر ان کی لغزش کی وجہ سے مسلمان عسکری میں ہزیمت اٹھانی پڑی۔ رومیوں کی طرف سے اسلام کو ہمیشہ سے خطرہ تھا جس کی شروعات موتہ میں ہو چکی تھی جس کا سد باب بہت ضرورت تھا۔ ہرقل نے ایک فوج اکٹھی کر رکھی تھی۔ غرض سپہ سالاروں کی قیادت میں شام کی طرف کوچ کرنے کا حکم ملا۔ جن میں یزید بن ابوسفیان کو دمشق، شرجیل بن حسنہ کو اردن، ابوعبیدہ بن الجراح کو حمص اور عمرو بن العاص کو فلسطین کے لیے امیر بنایا گیا۔ ہرقل جو اس وقت بیت المقدس میں تھا جو مسلمانوں کی فوجوں کے بارے میں بتا چلا تو سب کے مقابلے کے لیے الگ الگ سپہ دستہ بھیج دیا۔ رومیوں کے پاس فوجوں کی کمی نہیں تھی اور انھیں ہر قسم کے سامان حرب واسلحہ سے لیس کیا گیا۔ رومیوں کی اس عظیم الشان تیاری کو دیکھ کر مسلمانوں کو بہت خود محسوس ہوا۔ غرض ان تمام امیروں نے حضرت ابوبکرؓ کے قاصد بھیجا۔ حضرت ابوبکرؓ نے جواب بھیجا کہ سبھی دستے اکٹھے ہو کر رومیوں کے خلاف نعرۂ جہاد بلند کریں۔ یرموک کے میدان میں اکٹھے ہونے کی بات لکھی ساتھ ہی ہر امیر اپنی فوج کے ساتھ نماز ادا کرے۔ اس کے ساتھ ہی حضرت صدیق نے خالد بن ولید کو بھی پیغام بھیجا اور رومیوں پر تلوار بن کر گرنے اور اپنے بھائیوں کی مدد کے لیے پہنچنے کے لیے کہا۔

عنایت اللہ التمش نے حضرت ابوبکر صدیق کی طرف سے بھیجے گئے خط میں لکھا دکھایا ہے کہ خالد بن ولید کو سپہ سالار تمام فوجوں کا مقرر کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ ابو زید شبلی نے لکھا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے کہا تھا کہ اگر ساتھ میں تمام دستوں کو مل کر لڑنے کی نوبت آئی تو ابوعبیدہ بن الجراح فوج کے سپہ سالار ہوں گے۔

یرموک کے میدان میں مہینوں سے اسلامی اور رومیوں کے درمیان جنگ کے حالات بنے ہوئے جس میں زیادہ تر نقصان مسلمان دستوں کا ہو رہا تھا کیونکہ رومیوں کا انبوہ کثیر آتا تھا اور مسلمانوں پر حملے کر کے چلا جاتا اور میدان یرموک میں سبھی امیر اپنے اپنے دستوں کے ساتھ الگ الگ سے لڑتے تھے۔ جب خالد بن ولید وہاں پہنچے تو حالات کا جائزہ لیا۔ انھیں اندازہ ہوا کہ اگر مسلمان فوجیں اس طرح الگ الگ لڑتی رہیں تو پسپائی کا خطرہ ہو سکتا ہے اس لیے انھوں نے ایک دن تمام سپہ سالاروں کے سامنے ساتھ مل کر لڑنے کی تجویز رکھی اور فرمایا:

''اے محمدی علم کے پاسبانو!

میں تمھارے لشکر کے جائزے اور رومیوں کے نظارے سے فکر مند ہوں۔ ہرقل کے سائے میں موجیں مارتا یہ سیلاب لشکر میدان جنگ کے تجربوں اور فنون حرب کی مہارت سے امیر ہے۔اس کی عسکری طاقت میں دین مسیح کے نامداروں نے نعرۂ جہاد لگا کر اور طاقت ور بنادیا ہے۔ مجھے بتاؤ کہ تم نے اس قلعہ آہن کو زیر کرنے کا کون سا نقشۂ جنگ مرتب کیا ہے تاکہ میں بھی اس تدبیر میں شریک ہوسکوں۔''13

دیرتک سکوت کے بعد جب کسی نے قابل قبول تجویز نہیں رکھی تو یزید بن ابوسفیان نے کہا:

''یا ابا سلمان! آپ نقشہ جنگ بنائیے۔ہم تعمیل حکم کریں گے۔''14

پھر خالد بن ولید نے وہ نقشہ ملک کا بنایا جس کو رہتی دنیا تک عمل میں لایا جائے گا اور اس نقشہ کی بدولت دو سے تین لاکھ کی فوجوں کو ایسی شکست فاش نصیب ہوئی جس نے کبھی دوبارہ اسلام کو مٹانے کی سازش نہیں تیار کی۔

''میں تمام لشکر کو چالیس دستوں میں تقسیم کرتا ہو اور ہر دستے پر ایک سپہ سالار تعینات کرتا ہوں اور ہر سپہ سالار سے توقع کرتا ہوں کہ وہ اپنے ہزار سپاہیوں کی کارکردگی کا جوابدہ ہوگا۔ نہ صرف یہ بلکہ ہرروز صدر سپہ سالار بدلتا رہے گا تاکہ ہر نامزد سپہ سالار کو انی صلاحیت کے اظہار کا موقع مل سکے۔''15

قاضی عبدالستار نے اس تجویز کے بارے میں لکھا ہے:

''صدیوں کی عربی عصبیت، قبیلائی رقابت اور خاندانی عداوت جس پر ظہور اسلام نے غلاف ڈال دیا تھا جو تحت الشعور میں موجود تھی، زندہ تھی اور نئے نئے بھیس بدلتی تھی اس تدبیر سے اس کا چراغ بجھ گیا۔ یرموک کی تاریخ ساز جنگ کی فتح کارزار اسی تدبیر میں پوشیدہ تھا۔''16

اس کے علاوہ حضرت خالد بن ولید نے لشکر کا جائزہ لیتے ہوئے یہ دیکھ لیا تھا کہ عراق سے آئے

13: خالد بن ولید۔قاضی عبدالستار۔ایجوکیشنل ہاؤس، دہلی سنہ اشاعت 2017 ص:87

14: خالد بن ولید۔قاضی عبدالستار۔ایجوکیشنل ہاؤس، دہلی سنہ اشاعت 2017 ص:87

15: خالد بن ولید۔قاضی عبدالستار۔ایجوکیشنل ہاؤس، دہلی سنہ اشاعت 2017 ص:89

16: خالد بن ولید۔قاضی عبدالستار۔ایجوکیشنل ہاؤس، دہلی سنہ اشاعت 2017 ص:89

ہوئے فاتحوں اور یرموک میں بڑے ہوئے مجاہدوں میں زبردست فرق ہے۔ ساز وسامان کے بغیر بھی فاتحوں کے بدن مسلسل لڑائیوں سے ایک سانچے میں ڈھل گئے اور ان کے جسم میں پھرتیلا پن صاف دکھائی دے رہا ہے اور ان کے چہروں پر نمازی کی چمک ہے اس کے باوصف یرموک کے سپاہیوں کے چہروں پر تھکن اور اکتاہٹ ہے ساتھ ہی ان کے بدن پر چربی کی پرت دکھائی دے رہی ہے اور آنکھوں میں اکتاہٹ صاف نظر آتی تھی اور جنگ کے انجام کا خوف ڈیرہ ڈالے ہوئے ہے جو ہرقل کی کثیر تعداد کا ہے۔

اس تاریخ ساز جنگ میں ایک طرح عیسائی راہب اپنی فوجوں کو عیسائیت اور مسیح کے نام پر کٹنے اور مرنے کی قسمیں دلوا رہے تھے۔ انجیل مقدس اور صلیب کی قسمیں دلوا رہے تھے وہیں مسلمانوں کے لشکر میں سورۂ انفال پڑھی جا رہی تھی جس میں جہاد کا ذکر ہے اس کے علاوہ مجاہدوں میں جوش وخروش بڑھانے کے لیے خطبے ہو رہے تھے۔

دورانِ جنگ یرموک کے میدان میں 20 اگست 646 کو ایک تاریخ ساز خوبصورت واقعہ پیش آیا رومیوں کے فوج کے ایک دستے کا سپہ سالار جرجیس اپنے لشکر سے نکل کر خالد سیف اللہ کے سامنے آ گیا اور اس نے پوچھا کیا میں تم سے کچھ پوچھوں گا تو جھوٹ نہیں بولو گے کیونکہ شریف آدمی جھوٹ نہیں بولتا ۔سیف اللہ نے فرمایا کہ مسلمان جھوٹ نہیں بولتا۔ اس نے کہا کہ کیا اللہ تعالیٰ نے تمھارے نبی پر آسمان سے کوئی تلوار اتاری تھی جو انھوں نے تمھیں دے دی اور اسی کی برکت ہے کہ جس قوم پر تم تلوار استعمال کرتے ہو وہ شکست کھا جاتی ہے؟ حضرت خالد بن ولید نے کہا نہیں ۔اس نے پوچھا پھر تمھیں سیف اللہ کیوں کہا جاتا ہے؟ خالد بن ولید نے فرمایا: رسول اللہ نے مجھے فرمایا کہ تم اللہ کی تلوار ہو جسے اس نے مشرکین پر مسلط کیا ہے ساتھ ہی آپؐ نے میری فتح مندی کی دعا بھی فرمائی اس وجہ سے میرا لقب سیف اللہ پڑ گیا۔ قاضی عبدالستار نے اس شخص کا نام مرجیس لکھا ہے پھر اس نے ایک دو اور سوال کیے اس کے بعد اس نے اسلام قبول کر کے مسلمانوں کے ساتھ مل کر اس جنگ میں شریک ہوا اور شہید ہو کر دائمی جنت حاصل کر لی۔

یرموک کے میدان میں ابھی جنگ جاری وساری ہوتی ہے کہ خلافت مدینہ کی طرف سے قاصد آتا ہے اور ابوعبیدہ بن الجراح کو پروانۂ خلافت پیش کرتا ہے جس میں درج ہوتا ہے۔

''امین الامت ابوعبیدہ بن الجراح کو اس تحریر کے ذریعہ یرموک پر موجودہ تمام عساکر

اسلام کا صدر سپہ سالار مقرر کیا جاتا ہے۔حکم دیا جاتا ہے کہ خالد بن ولید کے ہاتھ سے
لشکر اسلام کی قیادت چھین کر اپنے ہاتھوں میں لے لو۔''17

یہ جنگ حضرت عمر کے دور خلافت کی پہلی جنگ تھی اور حضرت ابوبکر صدیق کی وفات کے بیس روز بعد وقوع میں آئی۔ یہ جنگ رات کے اوقات میں بھی ہوتی رہتی تھی۔اس میں مجاہدوں نے موت پر بیعت کرتے ہوئے غنیم کی فوج میں گھس گئے اور شہادت حاصل کی۔اس جنگ میں عورتوں نے بھی حصہ لیا۔ دوران جنگ حضرت عمر کا قاصد آیا تھا اور اس نے معزولی کی خبر سنائی تھی جب لشکر نے مدینے کے قاصد کو دیکھا تو حالات دریافت کرنے لگے۔امین الامت ابوعبیدہ موقع کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے خالد کی معزولی کا ذکر نہیں کیا۔انھیں معلوم تھا کہ حضرت ابوبکر کی وفات اور خالد کی معزولی کو سن کر لشکر کے اندر جو جوش وجذبہ ہے وہ پست ہوجائے گا۔غرض جنگ جاری رہنے تک خبر کو مشتہر نہیں کیا گیا بلکہ خالد کو تمام باتیں ابوعبیدہ نے بتائیں۔اپنی معزولی کا سن کر حضرت خالد نے کہا آپ میرے مقام کا تعین کرنا ہوگا لیکن ابوعبیدہ نے کہا:

تم جس طرح لڑرہے تھے اسی طرح لڑو۔میں صدر سپہ سالار۔تم کو حکم دیتا ہوں کہ میرے نائب کی حیثیت سے سارے لشکر اسلامی کی سپہ سالاری قبول کرو۔

حضرت خالد بن ولید جو سپہ سالار اعظم تھے اتنی بڑی بات سن کر بھی غصہ کا اظہار نہیں کیا اور ابوعبیدہ کی بات مانتے ہوئے سپہ سالاری کے فرائض انجام دیتے رہے کیونکہ ابھی جنگ جاری وساری تھی۔

عنایت اللہ التمش نے خالد کی معزولی کا ذکر دمشق کی جنگ کے دوران کیا ہے۔جب دمشق کے قلعہ کا محاصرہ جاری تھا تب لشکر اسلام کو حضرت ابوبکر کی وفات اور حضرت عمر کی خلافت پر مستند ہونے کے بعد خالد کو معزولی کا حکم نامہ بھیجا گیا۔غرض ہم یہاں قاضی عبدالستار کی تحریر پر بات کرتے ہوئے ابوزید شبلی کی کتاب خالد سیف اللہ پر نظر ڈالتے ہوئے یرموک کے میدان میں ملے خط اور خالد بن ولید کی معزولی کو مانتے ہوئے تجزیہ کرتے ہیں۔یرموک کے میدان میں خونریز معرکہ اپنے عروج پر تھا۔مجاہدوں کے اندر جتنا جوش وخروش تھا ویسا ہی صلیبیوں کے اندر بھی تھا۔انھوں نے بھی اس جنگ کو عقیدے اور مذہب کے نام پر لڑنا چاہا تھا۔ان کے راہبوں نے کہا تھا کہ اس میدان جنگ سے یہ ثابت ہوگا کہ کون سا مذہب باقی رہے گا اور کون سا مٹ جائے گا۔غرض انھوں نے اپنی زندگی کو اپنے اعتقاد پر مٹادینا ضروری سمجھا تھا۔میدان جنگ سجا ہوا تھا،

17: خالد بن ولید۔قاضی عبدالستار۔ایجوکیشنل ہاؤس، دہلی سنہ اشاعت 2017 ص:99

تلواریں اور نیزے چل رہے تھے۔سیف اللہ کے زیر سایہ مجاہدین اپنی تمام تر قوتوں کا مظاہرہ کررہے تھے ۔جذبۂ جہاد سے مجاہدین کٹ رہے تھے اور جنت کے شیدائی شہید ہونے کے لیے تیار تھے۔اسی دوران تیز آندھی آتی ہے۔اس ہولناک آندھی نے جہاں ایک مسلم مجاہدوں کے لیے فتح ومسرت کی بصیرت لائی وہیں بڑے بڑے صحابۂ کرام اور سپہ سالار شہید ہو چکے تھے۔عکرمہ ابن ابوجہل اور ان کا بیٹا دونوں اس جنگ میں اپنی شہادت دے کر محمد پرچم کو اور ہمیشہ کے لیے زندۂ جاوید اور کبھی نہ جھکنے کی مثال دی۔

میدان جنگ کے خونریز منظر کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے حباش نامی ایک مجاہد کا پیر کٹ گیا اور دوران جنگ ان کو اس بات کا احساس بھی نہیں ہوا بعد میں وہ پورے میدان میں اپنا پیر تلاش کرتے پھر رہے تھے۔

غرض ہزاروں مجاہدوں کا نذرانہ دے کر جنگ یرموک نے ایک تاریخی مقام کی حیثیت اختیار کرلی۔ اس جنگ میں مسلمانوں کی فتح صرف اور صرف اللہ کی مہربانی تھی جو دشمن کی تعداد سے چار گنا کم ہونے کے باوجود بھی فتح حاصل کی گئی۔اس جنگ میں مسلمانوں نے جس بہادروں ، جوش اور صبر واستقامت سے دشمنوں کا مقابلہ کیا وہ اپنی مثال آپ ہے۔

جنگ یرموک کی فتح سے قیصر روما کا اقتدار واس کا غرور ہمیشہ کے لیےٹوٹ گیا ساتھ شام میں اسلامی فتوحات کا دورازہ بھی کھل گیا۔اس جنگ میں جس طرح خالد بن ولید نے اپنے فن حرب وضرب کا مظاہرہ کیا تھا وہ آنے والے تمام فنون جنگ اور امور قیادت کے لیے ایک مثال بن گیا اور ان کے بنائے اصول وضوابط پر دوسری تمام جنگوں میں اپنایا گیا۔جس میں اتحادی فوجیں ایک کمانڈران چیف کے ماتحت تھیں اور تمام ممالک نے ایک کمانڈران چیف کا مقام اس جنگ کے نقشۂ جنگ سے حاصل کیا۔اس سے ایک تو دشمن کو صحیح تعداد کا اندازہ نہیں ہو پاتا دوسرے لشکر میں کم نفری ہونے کے باوجود زیادہ لگتی ہے۔آج سے چودہ سو سال پہلے بنا کسی عظیم جنگی تربیت گاہوں میں تربیت نہ لینے کے باوجود خالد بن ولید نے یہ تجویز بنالی وہ اپنے آپ ایک باعث حیرت اور مسرت ہے۔

اس فتح کے بعد ابوعبیدہ نے ابوبکر کی رحلت اور اپنی سپہ سالاری کے بارے میں تمام مجاہدین کو خط پڑھ کر سنایا۔ یہ سن کر جہاں مجاہدین کے بیچ میں ایک طرح سے کہرام مچ گیا وہیں تمام حالات جاننے

اور سوالیہ نظریں بہت کچھ جاننے کی کوشش کرنے لگیں۔

ہرقل یہ شکست آسانی سے ہضم کرنے والا شہنشاہ نہیں تھا اس نے جب سنا کہ یرموک ہاتھ سے نکل گیا اور باہان مارا گیا۔ وہ آپے سے باہر ہو گیا۔ اس کے بعد اس نے حمص میں جا کر پھر نئے سرے سے لشکر کی تیاری کرنے لگا۔ ہرقل کے پاس حمص میں تقریباً ساٹھ ہزار اور القدس میں تقریباً ستر ہزار فوجیں تھیں اس وقت صلیب کے پجاری انجیل ہاتھ میں لے کر آنکھوں میں آنسو لے کر مسیح کی حفاظت کی بھیک مانگ رہے تھے۔ نا آزمودہ جوانوں کو فوجی تربیت دی جا رہی تھی۔ بچے کھلونوں کے بجائے ہتھیار خرید رہے تھے اور عورتوں نے اپنے بال کاٹ کر جنگی ہتھیار خرید رہی تھیں جب امین امت کو جاسوسوں کے ذریعہ عیسائیوں کی ہونے والی اس عظیم الشان تیاری کے بارے میں معلوم ہوا تو وہ بہت پریشان ہوئے اور فوراً ایک میٹنگ بلائی جس میں انھوں نے آنے والے طوفان سے سب کو روبرو کرایا اور مشورہ جاننا چاہا پھر انھوں نے خالد سے کہا کہ سیف اللہ آپ کا کیا خیال ہے۔ انھوں نے کہا کہ:

> ''یا امین امت! اگر آپ نے یرموک کے بعد فوراً مجھ سے مشورہ مانگا ہوتا تو میں آپ کی اجازت سے حمص پر حملہ کرتا۔ ہرقل کو باندھ لینا یا شام خالی کرا لینا اور وہ سارے تماشے جواب ہونے والے ہیں ان سے آپ کو محفوظ کر دیتا۔'' 18؎

خالد بن ولید کی یہ خوبی تھی ساتھ ہی فن حرب کی ایک بہترین چال تھی کہ وہ دشمن کو آرام کرنے کی مہلت نہیں دیتے تھے وہ ایک جگہ سے فتح یاب ہونے کے بعد دشمن جہاں اکٹھا ہوتا اس کی تیاری سے پہلے ہی حملہ ہی کر دیا کرتے تھے اس طرح سے انھیں دوسری جنگ عظیم بھی فتح حاصل ہوتی تھی پورے ایران و عراق میں انھوں نے ایک کے بعد دیگرے مقام پر لگاتار حملہ کرتے ہوئے ایران و عراق کی سرحد کو مشرکین کے خطرے سے اسلام کی حفاظت کر دیا تھا۔ غرض یہاں بھی انھوں نے یہ بات کہی اگر چہ آپ وہ سپہ سالار نہیں تھے اس لیے کوئی فیصلہ ذاتی طور پر نہیں لے سکتے ان کی معزولی کی یہ سزا ہوتی کہ مجاہدین کو پھر سے ایک ہولناک جنگ کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہونا پڑا۔ غرض امین الامت نے پوچھا اب ایسی حالت میں کیا کرنا چاہیے تو انھوں نے کہا کہ اب انھیں دمشق پر یلغار کرنا چاہیے۔ اس طرح ہرقل جو تیاری کر رہا ہے اس کا ذہن بھٹک جائے گا کیونکہ کو لگتا ہوگا کہ ہم القدس پر مائل ہوں گے۔ جنگ کے نقطۂ نظر سے شام میں تین بڑے شہر

18؎ خالد بن ولید۔ قاضی عبدالستار۔ ایجوکیشنل ہاؤس، دہلی سنہ اشاعت 2017 ص: 123

ہیں بیت المقدس حمص اور دمشق ۔ دمشق جو ساری دنیا میں محفوظ سمجھا جاتا ہے ابھی ہرقل کی نظر ادھر نہیں ہے ۔ دمشق کی فتح ایک بڑی فتح ہوگی ۔ دمشق پر یلغار کرنے سے پہلے سیف اللہ نے عمارہ بن مخفش کو دس ہزار دے کر فحل کے راستے پر ڈال دیا تاکہ ادھر سے دشمن کو کوئی مدد نہ ملے ۔ اس کے علاوہ ذوالقلاع کو دو ہزار سواروں کے ساتھ صفر اعلقمہ بن حکم اور مسروق دو دو ہزار سواروں کے ساتھ حمص اور بیت المقدس کی شاہراہوں پر قابض کر دیا ۔ غرض سیف اللہ نے تمام شکر کا بٹوارہ اس طرح سے کیا اور الگ الگ شہروں پر جانے والی شاہراہوں پر ڈال دیا تاکہ ہرقل کو اندازہ نہ ہو سکے کہ اصل مقصد دمشق پر ہے ۔

دمشق کا محاصرہ اتنا آسان نہیں تھا یہاں ایک مضبوط قلعہ تھا اور قلعہ کا دروازہ دو سے تین میل کی دوری پر تھا ۔ قلعے کی دیواریں نہایت مضبوط تھیں ۔ صفر سے جب یہ لشکر چلا تھا تو دشمن کے پہنچنے کے تمام راستے مسدود کر دیے گئے تھے ۔ حضرت عمرو بن العاص کو باب فراویس کے سامنے متعین کیا گیا ۔ شرجیل بن حسنہ کو باب توما، قیس بن ہبیرہ کو باب مرج اور ابوعبیدہ کو باب جابیہ کے سامنے یرموک اتارا گیا ۔ یہ محاصرہ تقریباً مہینوں تک چلا ۔ اہل دمشق کو لگا کہ مسلمانوں کو دمشق کی سردی بہت جلد پگھلا دے گی اور وہ یہاں سے چلے جائیں گے اس لیے قلعے کا دروازہ نہ کھولنا بہت آسان تھا ۔ مجاہدین تیروں اور منجنیقوں کے ذریعہ شہر پر حملہ کرتے رہے ۔ ساتھ ہی انھیں لگتا تھا کہ ہرقل کمک بھیجے گا مگر اہل دمشق کو معلوم نہیں تھا کہ چاروں طرف سے راستہ بند ہے ۔ سیف اللہ کسی ملک کسی شہر پر فتح حاصل کرنے سے پہلے یا پھر یلغار کرنے سے پہلے اپنا جاسوس وہاں بھیج دیا کرتے تھے اس لیے انھیں ہر نئی بات اور پراسرار راز آسانی سے معلوم ہو جاتا تھا اس کام کے لیے انھوں نے ذہن آدمیوں کو تیار کر رکھا تھا جو انھیں باخبر رکھتے تھے ۔ دمشق کے محاصرے کے دوران ان کے ایک جاسوس نے بتایا کہ آج لارڈ پادری کے بیٹے کی شادی ہے اس لیے تمام شہر اور فوج کی دعوت ہے خالد سیف اللہ کسی ایسے ہی موقع کے انتظار میں تھے جب رات گزرنے لگی تو مجاہدوں نے سروں پر گٹھریاں باندھ کر رسیوں کی سیڑھیاں بنا کر قلعے میں اتر گئے ۔ اس طرح تقریباً پانچ چھ ہزار فوجیں شہر میں داخل ہو گئیں اور رومیوں کا قتل عام شروع ہو گیا ۔ یہاں رومیوں نے مسلمانوں کو دھوکہ دیا تھا ایک طرف جب خالد اپنی محنت اور مشقت سے پانی سے بھری ہوئی خندق کو نہایت جاں سوزی کے ساتھ پار کر کے قلعہ میں اترے تھے وہیں دوسری طرف اہل دمشق کے کچھ لوگ چالاکی سے ابوعبیدہ سے اپنی من مطابق صلح کرالی ۔ اگر خالد نے

تلوار کے زور پر یہ فتح حاصل کی جس سے انھیں جزیہ اور دیگر مال غنیمت بنا کسی مصلحت سے حاصل ہوتا یہاں مسلمانوں کے سپہ سالاروں کے بیچ بحث وتحیص ہونے لگی اور رومی اس نا اتفاقی کا مزہ لے رہے تھے۔ خالد کو ان کی چال سمجھ میں آ گئی اور انھوں نے مصالحت کی شرائط کو منظور کرلیا۔ جس میں مفتوحین چاندی سونے اور جائداد کا پانچواں حصہ ادا کریں اور فی کس ایک دینار اور فی جریب زمین ایک جریب گیہوں سالانہ ادا کریں۔ لیکن شاہی خاندان اور اس کے ملحقین کی تمام زمینیں اور مملوکہ سامان مال غنیمت قرار دیا گیا۔

کیونکہ قومیں جب عروج پر ہوتی ہیں تو ان کا سب سے بڑا طرۂ امتیاز تنظیم ہوتا ہے۔ نظم وضبط ہوتا ہے۔ بڑوں کا ادب اور ان کے غلط احکامات کی بھی تعمیل ہوتا ہے۔ یہاں سیف اللہ کو امیر شہر توماشاہ کی اس چالاکی سے بدلہ لینا تھا اور اس جنگ کے ذریعہ شکست دینی تھی۔ کیونکہ توماشاہ اور اس شاہی فوجی جنرل ہرلیس امان پائے ہوئے تھے اس لیے اپنے تمام قیمتی ساز وسامان گھوڑے خچر پر لاد کر لے جا رہے تھے اور انھیں رومیوں کی عیاری سے آشنائی تھی وہ اپنا قیمتی عسکری سامان لے جا رہا تھا جو مسلمانوں کے لیے باعث ملحق ہوسکتا تھا اس لیے انھوں نے تین دن کی اماں جو دی گئی تھی اس کے بعد توماشاہ کے لشکر پر حملہ کر کے انھیں شکست دینا چاہتے تھے۔ توماشاہ ہرقل کا داماد تھا اور یہ آرائش وزیبائش کا دلدادہ تین دن کے بعد خالد سیف اللہ نے توماشاہ کو شکست دی اور اس کے مال غنیمت کو حاصل کرلیا۔ ساتھ ہی ہرقل کی بیٹی کو ہرقل کے مانگنے پر پوری عزت وتوقیر کے ساتھ واپس کر دی گئی جبکہ اس وقت چند لوگوں نے کہا ہرقل کی بیٹی کے بہانے اس سے من مانی شرطیں منوائی جاتی ہیں مگر سپہ سالار اسلام سیف اللہ نے کہا کہ کسی عورت کو وسیلہ بنانا فاتحان عرب وشام کی شان کے خلاف ہے۔

اس کے بعد یہ لشکر فحل کی جانب روانہ ہوا۔ وہاں پہنچ کر دیکھا کہ زمین پانی اور دلدلوں سے بھری ہوئی ہے۔ ہرقل کے حکم سے تمام دریاؤں کے بند توڑ دیے گئے تھے لیکن اہل اسلام نے پانی سے دور ہٹ کر وہاں ڈیرہ جمالیا۔ رومیوں کو لگا کہ اسلامی لشکر بے خبر ہے تو انھوں نے اچانک حملہ کر دیا مگر مسلمان مجاہدین سیف اللہ کی قیادت میں کبھی بے خبر نہیں رہتے تھے اس طرح سے رومیوں نے حملہ کر کے غلطی مول لے لی تھی۔ آخر شکست کھا کر بھاگنے لگے اور خود ہی دلدل کا شکار ہو کر کٹنے لگے۔

معرکہ فحل کے بعد جنگ مرج الروم ہوئی جس کا سپہ سالار توذر خالد کے ہاتھوں قتل ہوا۔ ہرقل کو

جب اپنی فوجوں کے پے در پے شکست کا حال معلوم ہوا تو وہ حمص کی جانب بھاگ گیا۔ حضرت ابوعبیدہ بعلبک کے راستے حمص روانہ ہوئے اور خالد کو بقاع کو فتح کرنے کے لیے بھیجا تھا اور کہا کہ اس کے بعد وہ حمص میں آجائیں۔ حمص شہر کا محاصرہ ہوگیا۔

حمص میں اہل شہر کے ساتھ خالد بن ولید اچھا سلوک کیا اور انھیں برابری کے حقوق دیے۔ حمص کی فتح کے بعد ابوعبیدہ نے قنترین کی طرف بھیجا۔ راستے میں حاضر کے مقام پر رومیوں کے ساتھ ان کی ایک جنگ ہوئی۔ یہاں پر رومیوں کی اہم شخصیت میناس کے ساتھ لڑائی ہوئی۔ پرانھوں نے اس جنگ میں شرکت کی اس لیے انھوں نے خالد کے پاس جاں بخشی کا پروانہ بھیجا جو قبول ہوا۔

غرض اس طرح چند چھوٹی بڑی جنگیں فتح کرتے ہوئے قنترین پر یلغار کی۔ قنترین شام کا ایک اہم شہر تھا جو شمالی سرحدی صوبے کا درالحکومت تھا۔ شہر والے قلعے بند ہو کر اندر چھپ گئے۔ خالد نے محاصرہ کرلیا اور اہل شہر کو پیغام بھیجا کہ اس طرح قلعہ بند ہو کر بیٹھنے کا کوئی مطلب نہیں ہے۔ اس طرح اگر تم آسمان پر بھی جاؤ گے تو خدا یا ہمیں تمھارے پاس پہنچادے گا۔ ہمارے پاس اتار لائے گا۔ خالد کی اس بات کا شہنشاہ قنترین پر نہایت خوف بھرا اثر ہوا۔ خالد نے قلعہ کے چاروں طرف خندق کھود دی اور اس میں سارا لشکر اتار دیا۔ صبح اہل شہر کو پتہ چلا کہ محاصرہ اٹھالیا گیا مگر اچانک سے زمین کے اندر سے ایک لشکر نکلنے لگا اور گورنر نے اپنی تلوار پھینک کر اطاعت قبول کرلی۔ قنترن کی فوجی اہمیت کو دیکھتے ہوئے شہر کو ڈھانے کا حکم دے کر الرہا کے لیے روانہ ہوگئے۔ سیف اللہ قنترین میں تھے کہ امین الامت کا قاصد آتا ہے جس میں ہرقل کے بارے میں اطلاع دی جاتی ہے وہ حمص کی طرف یلغار رنے کے لیے آگے بڑھ رہا ہے۔ جس میں کئی لاکھ فوجیں ہیں اس لیے انھوں نے دمشق اور حمص سے جتنا جزیہ وصول کیا تھا سب واپس کردیا ہے اور حالت نہایت نازک ہے۔ سیف اللہ نے خط ملتے ہی کوچ کا اعلان کیا اور حمص کے مقام پر عیسائی عربوں سے معرکہ ہوا مگر یہ کوئی تربیت یافتہ شکر نہ تھے بلکہ ایک ہجوم تھا جن پر بہت جلدی قابو پالیا گیا۔ اس طرح شام میں اسلامی لشکر پوری طرح سے محفوظ ہوگیا۔

ہرقل کو جب قنترین کے فصیل کے انہدام اور دوسری شکستوں کی خبر ملی تو وہ ناامیدی اور یاس نہایت دکھ کے ساتھ حیرت وافسوس کی حالت میں شام کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چلا گیا اس کو معلوم تھا کہ اب اس کی

بادشاہت اور سلطنت کے دن پورے ہو چکے ہیں۔اس نے الوداعی انداز ہی شام پر نظر ڈالی اور کہا رخصت ہونے والے کا سلام قبول کرائے شام یہ ایسی جدائی ہے جس کے بعد ملاقات ممکن نہیں اے شام تو کتنا خوبصورت شہر ہے مگر افسوس میں تم سے جدا ہو رہا ہوں ۔الربا کے حاکم نے خالد بن ولید کی اطاعت قبول کر لی۔

جب دربار خلافت میں حضرت خالد بن ولید کی فتوحات اکبر کا ذکر پہنچا تو خالد بن ولید کے تئیں ان کی رائے تبدیل ہوگئی اور انھوں نے کہا خالد نے اپنے کارناموں کی وجہ سے خود ہی اپنے آپ کو سپہ سالار بنالیا ہے اللہ ابوبکر پر اپنی رحمت نازل کرے۔وہ مجھ سے زیادہ مردم شناس تھے۔خالد انطاکیہ کے محل میں اس وقت تھے قنسترین کے تمام علاقے ان کی امارت میں دے دیے گئے۔

شام میں تمام علاقے مسلمانوں کے زیر نگیں آ چکے تھے صرف بیت المقدس نبیوں کی سرزمین ایسی تھی جو جہاں عیسائی تھے اور یہ ہمیشہ دس بارہ ہزار سواروں کے گھیرے میں رہتا تھا فحل اور مرعش تک ساری سلطنت اور فتح اور ہرقل کے فرار نے بیت المقدس کی راہ بہت آسان بنادی تھی۔عیسائی راہبوں اور عالموں کو یہ علم تھا کہ نبی کریمؐ نے بیت المقدس کی پر امن فتح کی بشارت دے چکے ہیں اور یہ جگہ ان کا قبلۂ اول رہا ہے اس لیے وہ اس سرزمین پر کوئی لڑائی بھی نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے جب اس نے سنا امین الامت ابوعبیدہ بیت المقدس کی طرف بڑھ رہے ہیں تو پیغام بھیجا کہ وہ یہ صلح نامہ خلیفہ دوم کے ہاتھوں کرنا چاہتے ہیں۔اسقف اعظم کی اس گزارش پر حضرت عمرؓ کو پیغام بھیجا حضرت عمر کو جیسے ہی یہ پیغام ملا وہ اپنے غلام کے ساتھ چل پڑے۔بیت المقدس پہنچے تو نہایت سادگی اور انکساری جھلک رہی تھی۔حضرت عمرؓ کے شام میں پہنچنے سے پہلے ایک پورا جہاں خلیفہ دوم کو دیکھنے کے لیے بے تاب تھا انھیں لگتا تھا قیصر و کسریٰ کے تکبر کو کچلنے والا ہرقل اعظم کو شہر بدر کرنے والا دیکھنے میں بادشاہوں کا بادشاہ لگتا ہوگا مگر جب لوگوں نے حضرت عمرؓ کی سادگی پیوند لگے کپڑوں کو دیکھا تو حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

قاضی عبدالستار نے اس طرح سے اس منظر کو پیش کیا ہے:

''امیر المومنین ننگے گرد آلود راستے پر پاپیادہ چل رہے تھے جیسے ہر ایک قدم ایک سلطنت پر پڑ رہا ہو...... پیوند سے آراستہ لباس، جفاکشی سے ستا ہوا بدن، نور ایمان سے پر جلال چہرہ، جس کی طرف نگاہ اٹھ جاتی، نگاہیں سجدوں میں گری رہتیں۔درویشی اور قلندری کا وہ

جلال الشان نظارہ تھا کہ بطریق اعظم کی رہبانی رعونت اور مذہبی کدورت کا پورا قلعہ گر پڑا۔19

غرض انھوں نے صلح نامہ کے بعد ایک پراثر تقریر کی اور عجمی انداز اختیار کر چکے سپہ سالاروں کو تنبیہ کی ۔عیسائیوں کے گرجا میں ابھی تھے کہ ظہر کی نماز کا وقت ہوگیا۔ وہاں کے راہب نے عرض کیا اگر خلیفہ وقت کا حکم ہوتو یہیں نماز کی ادائیگی کا انتظام کر دیا جائے۔حضرت عمر نے اس پیشکش کو ٹھکرا دیا اور کہا اگر آج میں نے گرجا میں نماز پڑھ لی تو مسلمان جس ملک کو بھی فتح کریں گے اس کی عبادت خانوں کو مسجد بنالیں گے۔غرض نماز باہر نکل کر پڑھی اور آنے والے وقت میں لوگوں نے اس جگہ مسجد بنالی جس کو حضرت عمر سے نسبت ہے۔اس کے علاوہ انھوں نے محراب داؤدیہ اور دوسری جگہوں کی زیارت فرمائی۔

خالد کی معزولی:۔قاضی عبدالستار نے خالد بن ولید کی معزولی اور ان کے نفسیاتی اثرات کا ذکر کیا ہے جو ناول کا کلائمکس کے طور پر ابھرتا ہے کہ قاضی عبدالستار معزولی کو کس نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں جب خلیفۂ دوم نے ان کو مدینے بلایا اور ان سے اشعث بن قیس کو دیے گئے انعام کے بارے میں سوالات کیے جاتے ہیں۔بہت سے مؤرخوں نے خالد بن ولید کی معزولی کا ذکر کیا ہے مگر قاضی عبدالستار نے خالد بن ولید کے نفسیاتی پہلو پر نظر ڈالی ہے۔

خالد کی معزولی کوئی اچانک نہیں ہوی تھی جب ابوبکر مسند خلافت پر تھے تب حضرت عمر نے ان سے مالک بن نویرہ کی بیوی سے شادی کے سلسلے میں ان کو واپس مدینے بلانے کی بات کہی تھی اور ان کے عمامے میں لگا ہوا تیر نکال لیا تھا۔حضرت عمر نہایت نظم ونسق کے پابند تھے۔ان کو یہ لگا کہ خالد بن ولید کی اس حرکت سے سپہ سالاروں میں کوئی غلط رواج نہ پیدا ہو جائے۔اس کے علاوہ مضیح کی جنگ میں مدائن عیسائی قبیلے کے دو مسلمانوں کو عیسائی سمجھ کر مجاہدین نے مار ڈالا۔جب حضرت عمر خالد بن ولید نے یہ خبر مدینے حضرت ابوبکر کو بھیجی تو حضرت عمر نے کہا دو مسلمانوں کا خون ہوگیا اس کی سزا خالد کو ملنی چاہیے۔ابوبکر نے کہا خلافت مدینے کی طرف سے دونوں مقتولین کے پسماندگان کو خون بہا ادا کیا جائے گا اور یہ خون بہا اسی قاصد کے ہاتھوں بھیج دیا جائے جو خبر لایا ہے۔

عمرؓ نے پھر سزا کی بات کہی۔

19: خالد بن ولید۔قاضی عبدالستار۔ایجوکیشنل ہاؤس، دہلی سنہ اشاعت 2017 ص:158

عمرؓ!خلیفۃ المسلمین نے گرج کر کہا۔خالد بن ولید واپس نہیں آئے گا۔اس شمشیر کو نیام میں نہیں ڈال سکتا جس کو اللہ نے کفار کے خلاف بے نیام کیا ہے۔

یہ بات شمشیر بے نیام میں عنایت اللہ التمش نے اس ہشام، ابوسعید، حسن ہیکل کے حوالے کے ساتھ نقل کی ہے۔

اشعث بن قیس جو نامی گرامی شاعر تھا جس کا نام قصیدے اور مدح سرائی میں اول درجے کا تھا جب اس نے سنا کہ خالد بن ولید نے قیصر وکسریٰ کے غرور وتکبر کو اپنے گھوڑوں کی ٹاپوں کے نیچے کچل گیا ہے۔وہ حمص میں آیا اور اس نے خالد کی مدح سرائی پیش کی جس میں اس نے خالد کی تلوار کی ہیبت اور جلال کو پیش کیا۔خالد بن ولید نے اس کو ایک ہزار درہم پیش کیے۔جب خلیفۂ دوم حضرت خالد کو اس بات کی جانکاری ہوئی تو انھوں نے خالد سے اس بارے میں تصدیق کے لیے لکھا اور کہا کہ خالد نے جو پیسے شاعر کو دیے ہیں وہ کہاں سے دیے ہیں! اگر یہ رقم بیت المال سے دی گئی ہے تو خیانت ہے۔اگر خالد نے اپنی جیب سے دی ہے تو یہ اسراف کا مرتکب ہوئیں۔غرض یہ خبر خالد کو ملتی ہے دوسرے دن مسجد میں خالد کے ایک مجرم کی طرح خالد کے سر سے خود اتارلیا گیا اور ان کے عمامے سے ان کے ہاتھ باندھ دیے گئے۔کیونکہ انھوں نے سوال کے جواب میں خاموشی اختیار کر لی تھی۔حضرت بلال نے کہا:

> ''تمھارا سکوت بیت المال کی خیانت پر استدلال کرتا ہے یا اگر یہ ممکن نہیں تو تمھاری خاموشی اسراف کا اقبال کرتی ہے اس لیے میں بلال امیر المومنین عمر بن خطاب کے حکم پر تم کو سیف اللہ شیر اسلام خالد بن ولید کو معزول کرتا ہوں۔'' 20؎

سیف اللہ جس نے مشرق ومغرب میں اسلام کا پرچم لہرایا تھا اتنا بڑا الزام لگنے کے باوجود انھوں نے خاموشی اختیار کی اور ملت کی تنظیم کی اور ان کے اتحاد کی دعا کی۔اس کے بعد قاضی عبدالستار نے بہت سے واقعات کا ذکر کیا ہے جس میں خالد بن ولید کے ہم رکابوں کا غلبہ اور خالد کی معزولی سے افراتفری یا س ناامیدی کی فضا پیدا ہوگئی تھی اس کو خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔اس کے علاوہ خالد بن ولید کے بیٹے عبداللہ بن خالد نے جس طرح سے اپنے والد کے بچاؤ اور ان کی پاکبازی اور ان پر لگے الزام کی تردید کی ہے اس کی خوبصورت عکاسی ملتی ہے۔جس میں انھوں نے بتایا ہے کہ کروڑوں کے مال غنیمت باہان اور ہرمز

20؎ خالد بن ولید۔قاضی عبدالستار۔ایجوکیشنل ہاؤس، دہلی سنہ اشاعت 2017 ص:169

کی ٹوپی جوایک لاکھ درہم سے قیمتی تھی جس کو میرے باپ نے انفرادی جنگوں میں حاصل کی جس کو خلیفہ اول نے یہ کہہ کر واپس کر دیا تھا کہ اس پر خالد کا حق ہے جس کو اس نے اپنی ہمت اور بہادری سے انفرادی جنگوں میں حاصل کیا ہے اس کے ساز وسامان کی قیمت سے دس ہزار درہم اشعث بن قیس کو عطا کر دیے اور اگر آپ میرے بیان کی تصدیق کرتے ہیں تو میرے باپ کو خیانت کے الزام سے بری کر دیجیے۔اس کے علاوہ انھوں نے اسراف کے معنیٰ ومطالب پر بھی گفتگو کی ہے۔

خالد بن ولید ایک بڑے خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ان کے والد نہایت دولت مند تھے۔ وہ شہزادوں کی طرح زندگی گزارتے تھے اس لیے ان کے پاس دولت کی کوئی کمی نہیں تھی۔ یہاں پر عبداللہ بن خالد نے بھی اپنے باپ کے بارے میں ذکر کیا اواسراف کے سیاق وسباق پر گفتگو کی ہے اور انھوں نے عمر بن خطاب کے بی بی ام کلثوم کو نکاح میں چالیس ہزار درہم کا مہر ادا کیا تھا اس کا بھی ذکر کیا ہے۔جب یہ ساری باتیں حضرت عمر کو معلوم ہوئیں تو انھوں نے مجلس شوریٰ کے مشورے کے مطابق خالد بن ولید کو مدینے طلب کیا جہاں مختلف طرح کے خیالات کے لوگوں کا سامنا ہوتا ہے۔لوگ اپنی اپنی رائے پیش کرتے ہیں اور خالد کی معزولی کو عمر کا غلط فیصلہ سمجھتے ہیں ساتھ ہی عمر کے خوف سے کوئی زبان سے باہر نہیں نکالتا مگر سب کو خالد کے کارنامے اور ان کی پے درپے فتوحات کو اچھے الفاظ کے ساتھ یاد کرتے ہیں۔

> جب فرمان خلافت حضرت خالد کے سامنے پیش کیا جاتا ہے تو وہ مسکراتے ہوئے سوچتے ہیں۔ابن حنتم (حضرت خالد) کا خیال تھا کہ جب ہمارے کاندھے سے سپہ سالار کا علم اتارا جائے گا ت ہم بنی مخزوم کے روایتی غیظ وغضب کا اظہار کریں گے اور ایسی حرکت کے مرتکب ہوں گے جو تربیت رسول کی شان کے خلاف ہوگی ہم نے اس خیال کو باطل قرار دیا۔جامع دمشق میں ہمارے ساتھ جو سلوک ہوا وہ اگر احد پہاڑ کے ساتھ ہوا ہوتا درہم ہو جاتا لیکن ہم نے اس طرح انگیز کر لیا جس طرح اصیل اونٹ ساربان کی مار برداشت کرتا ہے۔'' 21؎

حضرت عمر کو یہ شکایت تھی کہ حضرت خالد بن ولید کسی بھی جنگ کے بعد شاہی حکام کا جھانواں جو شراب کی آمیزش سے تیار ہوتا ہے اس سے غسل فرماتے ہیں اس لیے انھوں نے خالد بن ولید سے دریافت

21؎: خالد بن ولید۔قاضی عبدالستار۔ایجوکیشنل ہاؤس، دہلی سنہ اشاعت 2017 ص:189

کیا اور کہا کہ اللہ نے شراب کو ظاہری اور باطنی طور پر اسی طرح حرام کیا ہے جس طرح اس نے ظاہری اور باطنی گناہوں کو اس لیے آئندہ اس کو اپنے جسم پر استعمال نہ کرنا جس کا جواب خالد بن ولید نے لکھا کہ شراب اپنی اصلی شکل میں اسی شدت اور نشہ پیدا کرنے والی حالت میں تو حرام ہے جس اس سے یہ صفات زائل ہو جائیں تو اسے شراب کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ جانویں کی مٹی میں ملی ہوئی شراب کی تاثیر کو آگ میں پکا کر ضائع کر دیا گیا او وہ شراب کی خاصیت سے مبرا ہو گیا ہے۔

جب خالد کی معزولی پر چاروں طرف سے سوالات اٹھنے لگے تو انھوں نے خطبہ دیتے ہوئے فرمایا:

''میں ذاتی طور پر خالد کو پسند کرتا ہوں، عزیز رکھتا ہوں وہ اس لیے نہیں معزول کیے گئے کہ انھوں نے بیت المال میں خیانت کی تھی، وہ اس لیے بھی معزول نہیں ہوئے کہ اسراف کے مرتکب ہوئے، وہ اس لیے معزول کیے گئے کہ مسلمان ان کی سپہ سالاری کو ان کی ذات کو فتح کا مترادف سمجھنے لگے اور یہ فہم امت کی صحت کے لیے خطرناک تھی ان کو معزول کر کے امت کو یہ تعلیم دی گئی کہ زندگی کا مدنی بازو عسکری ہاتھوں پر غالب رہتا ہے اسے غالب رہنا چاہیے۔''22؎

خالد بن ولید کو ہر ایک جنگ میں فتح حاصل ہوئی تھی اس لیے مجاہدین کے اندر یہ اثر گھر کر گیا تھا کہ خالد جس جنگ میں شامل ہوں گے اس کو شکست نہیں ہو سکتی۔ حضرت عمر کو نظم و نسق اور ڈسپلن کے حد درجہ پابند تھے وہ نہیں چاہتے کہ مسلمانوں کے اندر توکل کی کمی ہو جائے۔ کیونکہ مسلمانوں کو فتح اللہ کی رحمت سے عطا ہوتی ہے ان کے عقیدے اور ایمان میں شخصی تصور نہ حائل ہو جائے اس لیے وہ خالد کو معزول کر کے مسلمانوں کے عقیدے کو خدا کی طرف مبذول کرانا چاہتے تھے ساتھ ہی شخصیت پسندی کے تصور سے بچنا چاہتے تھے۔ یہی بات الفاروق میں شبلی نعمانی نے بھی لکھی ہے۔

لکھتے ہیں:

''حقیقت یہ ہے کہ حضرت عمرؓ خالدؓ کی بعض بے اعتدالیوں کی وجہ سے مدت سے ناراض تھے تاہم آغاز خلافت میں ان سے کچھ تعرض کرنا نہیں چاہا لیکن چونکہ خالدؓ کی عادت تھی کہ وہ کاغذات حساب دربار خلافت کو نہیں بھیجتے تھے اس لیے ان کو تاکید لکھی کہ آئندہ

22؎ خالد بن ولید۔ قاضی عبدالستار۔ ایجوکیشنل ہاؤس، دہلی سنہ اشاعت 2017 ص:222

سے اس کا خیال رکھیں۔ خالد نے جواب لکھا کہ ''میں حضرت ابوبکر کے زمانے سے ایسا ہی کرتا آیا ہوں اور اس کے خلاف نہیں کر سکتا۔'' حضرت عمرؓ کو ان یہ خود مختاری کیونکر پسند ہوسکتی تھی اور وہ بیت المال کی رقم کو اس طرح بے دریغ کیونکر کسی کے ہاتھوں میں دے سکتے تھے۔ چنانچہ خالدؓ کو لکھا کہ ''تم اسی شرط پر سپہ سالار رہ سکتے ہو کہ فوج کے مصارف کا حساب ہمیشہ بھیجتے رہو'' خالد نے اس شرط کو نامنظور کیا اور اس بنا پر وہ سالاری کے عہدے سے معزول کر دیے گئے۔''23؎

سنہ 17ھ/سنہ 638ء میں یہ واقعہ پیش آیا کہ حضرت خالد نے ایک شاعر کو دس ہزار روپیہ انعام میں دے دیے۔ پرچہ نویسوں نے اسی وقت حضرت عمرؓ کو پرچہ لکھا'' حضرت عمرؓ نے ابوعبیدہ کو خط لکھا کہ خالد نے یہ انعام اپنی گرہ سے دیا تو اسراف کیا اور بیت المال سے دیا تو خیانت کی، دونوں صورتوں میں وہ معزول کے قابل ہیں۔

حضرت عمر نے جب کہا تمھارے پاس اتنی دولت کہاں سے آئی خالد نے کہا مال غنیمت سے اور یہ کہہ کر کہا کہ ساٹھ ہزار سے جس قدر زیادہ رقم نکلے وہ میں آپ کے حوالے کرتا ہوں چنانچہ بیس ہزار روپے زیادہ نکلے وہ بیت المال میں داخل کر دیے گئے۔ حضرت عمر نے خالد کی طرف مخاطب ہو کر کہا:

''خالد! واللہ تم مجھ کو محبوب بھی ہو اور میں تمھاری عزت بھی کرتا ہوں'' یہ کہہ کر تمام عمالان ملکی کو لکھ بھیجا کہ ''میں نے خالد کو ناراضی سے یا خیانت کی بنا پر موقوف نہیں کیا لیکن چونکہ میں یہ دیکھتا تھا کہ لوگ ان کے مفتون ہوتے جاتے ہیں اس لیے میں نے ان کو معزول کرنا مناسب سمجھا تا کہ لوگ یہ سمجھیں کہ جو کچھ کرتا ہے خدا کرتا ہے۔''24؎

قاضی عبدالستار راشد انور راشد کو دیے گئے انٹرویو میں کہتے ہیں پروفیسر ڈاکٹر سعید الظفر چغتائی نے خالد بن ولید پر مضمون لکھا اس میں ان سے سہو ہوا اور انھوں نے ہندہ کو سیف اللہ کے تعلق خاطر کا مرکز بنایا۔ یہ بات حقیقت پر مبنی ہے خالد بن ولید ناول میں قاضی عبدالستار نے نہایت کم کم الفاظ میں ایک ایک جملے میں پوری پوری تاریخ بیان کر دی ہے جس کو مکمل طور پر سمجھنے کے لیے دس بیس صفحات پڑھنے کی ضرورت ہے۔ اگر کسی نے ٹھیک سے خالد بن ولید کو نہیں پڑھا ہے یا کسی دوسری تاریخی کتابوں سے استفادہ نہیں کیا ہے

23؎ الفاروق۔ علامہ شبلی نعمانی دارالمصنفین اعظم گڑھ، ص:112

24؎ الفاروق۔ علامہ شبلی نعمانی دارالمصنفین اعظم گڑھ، ص:129

تو یہ ناول سر کے اوپر سے گزر جائے گا اس لیے جہاں معزولی کا بیان ہو یا دوسرے واقعات نہایت احتیاط سے پڑھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ قاضی عبدالستار لکھتے ہیں:

''جتنی کتابیں میں نے پڑھی ہیں ان کے بین السطور میں یہ بات موجود تھی کہ اگر سیف اللہ نے حضرت عمر کے خلاف تلوار کھینچ لی ہوتی تو عرب میں قیامت صغریٰ برپا ہو جاتی، لیکن یہ سب سیف اللہ کے کردار کی عظمت تھی کہ ایسا کچھ بھی نہیں ہوا......ابوسفیان نے خاص کوشش کی کہ سیف اللہ امیر المومنین حضرت عمر کے خلاف بغاوت پر آمادہ ہو جائیں اور بنو اسد بھی ان کے ساتھ حضرت عمر کے خلاف تلوار چلائے۔''25؎

ناول میں ہندہ اور ابوسفیان کے غصے کا اظہار جس طرح سے کیا گیا جس کو پڑھ اندازہ ہوتا ہے کہ خالد کی معزولی پر الگ الگ قبیلے والوں کی کیا آرائیں تھیں۔ اقتباس ملاحظہ ہوں:

''ہندہ کے ساتھ ابی سفیان آ گئے۔ ہندہ کے بال منزلوں کے غبار سے میلے ہو چکے تھے، لیکن چہرے پر قریش کی سرداری کی روایتی شان کی چمک موجود تھی۔ اپنے بیٹوں کے ساتھ بیٹھتے ہی گرجنے لگے۔

''اہل مکہ کو نئے خلیفہ کا تحفہ مبارک ہو۔ عکرمہ اور اس کے جوان بیٹے کے سر کا صدقہ مبارک ہو۔

آواز جیسے دانتوں سے پس کر نکل رہی ہو۔

یمن سے حجاز تک اور عراق سے شام تک کون سی فتح ہے جس پر ہمارے شیروں کا نام لکھا ہے......آج کی لڑائی میں خالد کو چھوڑو......خالد تو خالد ہیں۔ کون سا محاذ تھا جس پر ہمارے جگر کے ٹکڑے اپنا خون نہیں بہا رہے تھے۔ کون سا معرکہ تھا جس میں ابوعبیدہ نے اپنی صدر سپہ سالاری کا اظہار کیا......لیکن وہ مدینے کے منظور نظر ہیں۔ ابن خطاب کے دوست ہیں وہ حاکم ہیں ہم محکوم ہیں فاتحان عرب و عراق و شام محکوم ہیں۔

سب سن رہے تھے۔ سب خاموش تھے۔

قبا کی آستین ہٹا دیا ابا سلیمان مجھے زخم دیکھنے دو۔ نہیں تو گریبان پھاڑ کر خیمے سے نکل جاؤں گی۔

25؎ اسرار و گفتار۔ راشد انور راشد۔ مدینہ پبلی کیشنز 2024 ص: 262-261

وہ زخم دھوتی جاتی آگ اگلتی جاتی۔

اگر کوکھ سچی ہوتی تو اس بازو کے ہر زخم پر ایک بیٹا نثار کر دیتی۔

یزید بن ابوسفیان نے لقمہ دیا۔

''آپ کی امامت میں نماز اور سیف اللہ کی امارت میں جہاد کا مزہ ہی کچھ اور ہوتا ہے۔

''اے ابن ابی سفیان شیر اسلام جب جہاد کی امارت میں نماز پڑھتے ہیں تو تاریخ ہوتے ہیں سیف اللہ تاریخ بنا چکے ہیں یا امیر......خلیفۂ دوم کی ہزار کوششیں بھی اسے مٹا نہیں سکتیں۔''[26]

علامہ شبلی نعمانی حضرت خالد بن ولید کے معزول ہونے کے بارے میں تفصیل سے ''الفاروق'' میں رقم طراز ہیں:

''شام کی فتوحات اور سنہ 17ھ/سنہ 638ء کے واقعات میں حضرت خالد رضی اللہ عنہ کا معزول ہونا ایک اہم واقعہ ہے، عام مؤرخین کا بیان ہے کہ حضرت رضی اللہ عنہ نے عنان خلافت ہاتھ میں لینے کے ساتھ پہلا جو حکم دیا، وہ خالد رضی اللہ عنہ کی معزولی تھی، ابنالاثیر وغیرہ سب یہی لکھتے آتے ہیں لیکن ان کی سخت غلطی ہے، افسوس ہے کہ ابن الاثیر کو خود اپنی اختلاف بیانی کا بھی خیال نہیں، خود ہی سنہ 13ھ کے واقعات میں خالد رضی اللہ عنہ کا معزول ہونا لکھا ہے اور خود ہی سنہ 17ھ کے واقعات میں ان کی معزولی کا الگ عنوان قائم کیا ہے اور دونوں جگہ ایک سے واقعات نقل کر دیے ہیں۔''[27]

حقیقت یہ ہے کہ حضرت عمرؓ خالدؓ کی بعض بے اعتدالیوں کی وجہ سے مدت سے ناراض تھے تاہم آغاز خلافت میں ان سے کچھ تعرض کرنا نہیں چاہا لیکن چونکہ خالدؓ کی عادت تھی کہ وہ کاغذات حساب دربار خلافت کو نہیں بھیجتے تھے اس لیے ان کو تاکید لکھی کہ آئندہ سے اس کا خیال رکھیں۔ خالد نے جواب میں لکھا کہ ''میں حضرت ابوبکر کے زمانے سے ایسا ہی کرتا آیا ہوں اور اس کے خلاف نہیں کرسکتا۔'' حضرت عمرؓ کو ان کی یہ خودمختاری کیونکر پسند ہوسکتی تھی اور وہ بیت المال کی رقم کو اس طرح بے دریغ کیونکر کسی کے ہاتھوں میں دے

26ے: خالد بن ولید۔ قاضی عبدالستار۔ ص119-118

27ے: الفاروق۔ حصہ اول۔ علامہ شبلی نعمانی۔ دارالصنفین اعظم گڈھ۔ ص129-127

سکتے تھے۔ چنانچہ خالدؓ کو لکھا کہ ’’تم اسی شرط پر سپہ سالار رہ سکتے ہو کہ فوج کے مصارف کا حساب ہمیشہ بھیجتے رہو۔‘‘ خالدؓ نے اس شرط کو نامنظور کیا اور اس بنا پر وہ سالاری کے عہدے سے معزول کر دیے گئے۔ چنانچہ اس واقعہ کو حافظ ابن حجر نے کتاب الاصابہ میں حضرت خالد رضی اللہ عنہ کے حال میں بہ تفصیل لکھا ہے۔

بایں ہمہ ان کو بالکل معزول نہیں کیا، بلکہ ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے ماتحت کر دیا، اس کے بعد سنہ 17ھ/سنہ 638ء میں یہ واقعہ پیش آیا کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے ایک شاعر کو دس ہزار روپیہ انعام میں دے دیے، پرچہ نویسوں نے اسی وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو پرچہ لکھا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو خط لکھا کہ خالد رضی اللہ عنہ نے یہ انعام اپنی گرہ سے دیا تو اسراف کیا اور بیت المال سے دیا تو خیانت کی، دونوں صورتوں میں وہ معزول کے قابل ہیں۔

خالد رضی اللہ عنہ جس کیفیت سے معزول کیے گئے، وہ جاننے اور پڑھنے کے قابل ہے، قاصد نے جو معزولی کا خط لے کر آیا تھا، مجمع عام میں خالد رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ ’’یہ انعام تم نے کہاں سے دیا؟‘‘ خالد رضی اللہ عنہ اگر اپنی خطا کا اقرار کر لیتے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا حکم تھا کہ ان سے درگزر کی جائے لیکن وہ خطا کے اقرار کرنے پر راضی نہ تھے، مجبوراً قاصد نے معزولی کی علامت کے طور پر ان کے سر سے ٹوپی اتار لی اور ان کی سرتابی کی سزا کے لیے ان ہی کے عمامہ سے ان کی گردن باندھی، یہ واقعہ کچھ کم حیرت انگیز نہیں کہ ایک ایسا بڑا سپہ سالار، جس کا نظیر تمام اسلام میں کوئی شخص موجود نہ تھا اور جس کی تلوار نے عراق وشام کا فیصلہ کر دیا تھا، اس طرح ذلیل کیا جا رہا ہے اور مطلق دم نہیں مارتا، اس واقعہ سے ایک طرف تو خالد رضی اللہ عنہ کی نیک نفسی اور حق پرستی کی شہادت ملتی ہے اور دوسری طرف حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سطوت وجلال کا اندازہ ہوتا ہے۔

خالد رضی اللہ عنہ نے حمص پہنچ کر اپنی معزولی کے متعلق ایک تقریر کی، تقریر میں یہ بھی کہا کہ ’’امیر المومنین عمر رضی اللہ عنہ نے مجھ کو شام کا افسر مقرر کیا اور جب میں نے تمام شام کو زیر کر لیا تو مجھ کو معزول کر دیا، اس فقرہ پر ایک سپاہی اٹھ کھڑا ہوا اور کہا کہ:

’’اے سردار! چپ رہ، ان باتوں سے فتنہ پیدا ہو سکتا ہے۔‘‘ خالد رضی اللہ عنہ نے کہا’’ ہاں لیکن عمر رضی اللہ عنہ کے ہوتے فتنے کا کیا احتمال ہے؟‘‘ 28؎

28؎: کتاب الخراج، قاضی ابو یوسف ص: 87 تاریخ طبری ص: 2527

خالد رضی اللہ عنہ مدینہ آئے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوکر کہا کہ:

''عمر رضی اللہ عنہ! خدا کی قسم تم میرے معاملہ میں ناانصافی کرتے ہو۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ''تمھارے پاس اتنی دولت کہاں سے آئی؟'' خالد رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ''مال غنیمت سے۔'' اور یہ کہہ کر کہا کہ ساٹھ ہزار سے جس قدر زیادہ رقم نکلے، وہ میں آپ کے حوالے کرتا ہوں، چنانچہ بیس ہزار روپے زیادہ نکلے اور وہ بیت المال میں داخل کردیے گئے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خالد رضی اللہ عنہ کی طرف مخاطب ہوکر کہا کہ ''خالد! واللہ تم مجھ کو محبوب بھی ہو اور میں تمھاری عزت بھی کرتا ہوں'' یہ کہہ کر تمام عمالان ملکی کو لکھ بھیجا کہ ''میں نے خالد رضی اللہ عنہ کو ناراضی سے یا خیانت کی بناپر موقوف نہیں کیا لیکن چونکہ میں یہ دیکھتا ہوں کہ لوگ ان کے مفتون ہوتے جاتے ہیں، اس لیے میں نے ان کا معزول کرنا مناسب سمجھا، تا کہ لوگ یہ سمجھیں کہ جو کچھ ہوتا ہے خدا کرتا ہے۔'' (طبری ص:2528) ان واقعات سے ایک نکتہ بین شخص بآسانی یہ سمجھ سکتا ہے کہ خالد رضی اللہ عنہ کی معزولی کے کیا اسباب تھے اور اس میں کیا مصلحتیں تھیں۔''[29]

غرض اس ناول میں قاضی عبدالستار نے خالد بن ولید کی زندگی، ان کے جنگی کارناموں کو اس طرح سے پیش کیا ہے کہ ابتدا تا انتہا ایک بہترین سچے قصے کی طرح ایک دوسرے سے پیوست ہوگیا ہے۔ اگرچہ خالد بن ولید ایک تاریخی شخصیت ہیں اور اسلامی تاریخی واقعات فکشن کا آزاد استعمال باعث گناہ ہوتا ہے اس لیے انھوں نے نہایت سنبھل سنبھل کر قدم رکھنے کی کوشش کی ہے تا کہ ناول میں کوئی ایسا پہلو نہ پیش ہوجائے جو قابل گرفت ہو یا جس کے لیے تاریخ کی عدالت میں پیش ہونا پڑے۔ اس کے علاوہ انھوں نے متعدد مقامات پر تاریخی کتابوں کا حوالہ دیا ہے جس سے تاریخی حقیقت نگاری پر کامل یقین کرنے کو جی چاہتا ہے مگر انھوں نے چند ایک واقعات فکشن میں رنگ و روغن لگانے کے لیے بھی استعمال کیے ہیں۔ جہاں خالد بن ولید کے عشق کا ذکر ہوتا ہے خالد بن ولید اس واقعہ کو خوبصورتی کے ساتھ بیان کیا ہے کیونکہ قاضی اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ وہ ناول لکھ رہے ہیں اس لیے ناول کے فنی اصول وضوابط کے تحت اس میں دلچسپی پیدا ہونا اور دلچسپی پیدا کرنا ایک تخلیقی فن ہوتا ہے ورنہ قاری تاریخ کو تاریخ کی کتابوں میں پڑھ لے گا

---

[29] الفاروق حصہ۔ علامہ شبلی نعمانی۔ دارالمصنفین اعظم گڑھ، ص:129-127

۔اس نقطہ کو ذہن میں رکھتے ہوئے انھوں نے عشق و عاشقی کے ذریعہ ناول میں دلچسپی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔غرض یہ ناول پلاٹ کی سطح پر مکمل اور اصول وضوابط کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔کہیں کہیں ناول میں شعور کی رو اور ماضی کے واقعات کے ذریعہ پلاٹ کو آگے بڑھانے کی کوشش کی گئی ہے۔قصہ میں انھوں نے کہیں بھی بے ربطی پیدا نہ ہونے دینے کی کوشش کی ہے اس لیے ناول پڑھتے ہوئے قصہ اور واقعات میں ایک تاریخی تسلسل بھی قائم رہتا تھا واقعات جس طرح سے پیش آئیں اسی طرح سے برتنے کی کوشش ملتی ہے۔

تاریخی ناول کو پلاٹ اور واقعات کے تناسب میں باندھنا ایک مشکل امر ہوتا خاص طور سے جب بات اسلامی تاریخ کی ہو یا عہد ماضی کی ایسی داستان جس کے تاریخی حقائق وشواہد مکمل طور سے موجود ہوں ایسے موقع پر ذرا سی غلطی یا چوک سے مصنف کی جگ ہنسائی ہوتی ہے اور تنقید کی باڑ اس کے اوپر لگ جاتی ہے اس لیے ناول نگار کو بہت بچ بچ کر اور پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتا ہے۔خالد بن ولید میں مصنف نے پوری کوشش کی ہے کہ کہیں جو واقعات تاریخی ترتیب کے ساتھ موجود ہیں وہ اسی تناسب میں سامنے آئیں نیز جگہوں میں انھوں نے اپنے اسلوب کی رنگ آمیزی کے ساتھ بڑے بڑے ضروری واقعات کو چند جملوں میں لکھ کر آگے بڑھنے کی کوشش کی ہے جو مصنف اکثر و بیشتر طوالت سے بچنے کے لیے ایسا کرتا ہے۔

ڈاکٹر محمد شہزاد ابراہیمی لکھتے ہیں:

> ''غرض خالد بن ولید میں واقعات کا ایک سیل رواں ہے جو اپنی فطری روانی اور تسلسل کے ساتھ بہتا رہتا ہے اور قاری اس کی لہروں کے ساتھ ساتھ ناول کے اختتام تک رواں دواں رہی ہے پورے ناول میں کہیں پیچیدگی یا الجھاؤ نظر نہیں آتا بلکہ قصے کو واقعہ در واقعہ کے ذریعہ ناول نگار نے منطقی اتمام تک پہنچایا ہے۔''[30]

کردار نگاری

کردار کی سطح پر یہ ناول کامیاب ہے جیسا کہ ناول کے عنوان سے ظاہر ہے خالد بن ولید اس لیے قاری کو اس بات کا بخوبی اندازہ ہے کہ ناول خالد بن ولید کے حیات وسیرت پر مبنی ہوگا اس لیے اس بات کی شکایت کرنا بے معنیٰ ہو جاتا ہے کہ دوسرے کردار کھل کر سامنے نہیں آسکے ہیں۔قاضی عبدالستار کا مقصد خالد بن ولید اور ان کے جنگی کارناموں کا بیان تھا اس لیے انھوں نے مکمل طور سے اپنی توجہ خالد بن ولید پر مرکوز کی

30: قاضی عبدالستار کے ناولوں میں ہیرو کا تصور۔شہزاد ابراہیمی ص 136

ہے۔ایک آدھ جگہ چند دوسرے کردار سامنے آتے ہیں مگر خالد بن ولید پورے ناول میں دکھائی دیتے ہیں ۔یزید ابن ابوسفیان ،عبداللہ بن خالد،عبداللہ بن حضرت عمر اس کے علاوہ حضرت عمر کے کردار کا بیان ملتا ہے۔اگر چہ قاضی صاحب نے حضرت عمر کے کردار کو سنبھل کر لکھنے کی کوشش کی مگر ناول میں صاف طور سے خالد بن ولید کے کردار اور ناول میں پیش ان کے جری اور بہادری کے کارناموں پر پورا ناول مبنی ہے اس طرح خالد بن ولید کی شخصیت کا مکمل جائزہ اس ناول میں پیش ہے۔یقیناً خالد بن ولید اسلام کی وہ عظیم شخصیت ہے جو اپنے صبر واستقلال اور بہادری بھرے کارناموں سے رہتی دنیا تک یاد کیا جائے گا۔

منظر نگاری

منظر نگاری میں قاضی عبدالستار کو ملکہ حاصل ہے۔انھوں نے اپنی تمام تخلیقات میں جزئیات نگاری کی بہترین مثال پیش کی ہے تو یہ کیسے ممکن تھا کہ یہ ناول اس بات سے اچھوتا ہوتا۔ناول میں جنگی مناظر جنگی اصول وضوابط کے ان تمام واقعات کی جزئیات بیان کی گئی ہیں جو قاضی عبدالستار کا خاصہ ہے جن میں خوراک و پوشاک کے فنی لوازمات کا بیان ملتا ہے۔

اندازہ ہوتا ہے کہ قاضی عبدالستار بھی حضرت عمر کے خالد کی معزولی کے فیصلے کے خلاف تھے اور قاضی عبدالستار کی نظر میں حضرت عمر کی شخصیت امیرالمومنین سے زیادہ آمرالمومنین کی تھی اور انھوں نے اپنے اس نظریہ کا اظہار بھی کیا ہے اور عبدالرحمٰن بن خالد کی زبان سے حضرت عمر کی زندگی کے بارے میں ان واقعات کا ذکر ہے جس سے حضرت عمر کی آمریت کے پہلو کا اندازہ ہوتا ہے جیسے کہ قاضی صاحب خالد کی زبان سے یہ خطاب ادا کرتے ہیں۔

> ''اے امیرالمومنین عمر بن خطاب !تم نے مسند خلافت پر متمکن ہوتے ہی مجلس شوریٰ کے مشورے کے بغیر مجھ کو لشکر کی عملداری سے معزول کر کے جمہوریت سے آمریت کی طرف پہلا قدم رکھا۔''31

یا پھر وہ خطاب فرماتے ہیں:

> ''اے عمر بن خطاب وہ دن یاد کرو جب تم نے اس مسجد میں قسم کھا کر اعلان کیا تھا کہ ذات رسالت زندہ ہے تو اس نے جو تم سے افضل تھا تم کو ڈانٹا تھا اور کہا تھا کہ اے قسم

31: خالد بن ولید۔قاضی عبدالستار۔ایجوکیشنل ہاؤس، دہلی سنہ اشاعت 2017 ص:228

کھانے والے جلدی نہ کرو اور تمھاری قسم باطل ہوگئی تھی۔''32

اس طرح سے جتنے دیر تک خالد کا خطاب چلتا ہے حضرت عمرؓ کی شخصیت کے کئی پہلو بھی سامنے آتے جاتے ہیں۔

اسراف کے متحمل دیے جانے کے بعد عبدالرحمٰن بن خالد جس طرح سے تقریر کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ قاضی صاحب نے حضرت عمرؓ کے کردار کے الگ الگ رنگ کو ناول میں پیش کیا ہے جیسے کہ حضرت عبدالرحمٰن بن خالد کہتے ہیں:

''اے امیر شام! عمر بن خطاب سے لفظ اسراف کا مفہوم سمجھنے میں خطا ہوئی، اسی کا سبب ہے۔ سبب یہ ہے کہ جب امیر المومنین کا باپ خطاب اپنی ننگی پیٹھ پر لکڑیوں کا گٹھر لاد کر اپنی اور اپنے عیال کی روٹیاں فراہم کرتا تھا، اس وقت خالد بن ولید اپنے باپ ولید، وحید قوم ولید صاحب الاعند ولید، کے اسراف کا تماشہ کر رہا تھا۔''زاد الراکب'' اور بیت الضیافت کا نظارہ کر رہا تھا۔ ہر دوسرے سال غلاف کعبہ کی تبدیلی کا منظر دیکھ رہا تھا۔
اے امیر شام! جب میرا باپ خالد زربفت کی قبا پر جواہرات پہن کر دس دس ہزار کے گھوڑوں پر غلاموں کو چڑھا کر شکار کو نکلتا تھا اس وقت امیر المومنین کمبل کا کرتا پہن کر اونٹ چرایا کرتے تھے اس لیے عمر بن خطاب سے امیر المومنین سے اسراف کے معنیٰ سمجھنے میں قصور ہوا۔''

''اے امیر شام! میں آپ کی عدالت میں استغاثہ پیش کرتا ہوں کہ عمر بن خطاب نے مسند خلافت پر قدم رکھتے ہی بی بی ام کلثوم سے نکاح کیا اور چالیس ہزار درہم کا مہر ادا کیا۔ یہاں ایسے حضرات موجود ہیں جن کے سامنے مہر ادا کیا گیا۔''33

غرض خالد بن ولید کے ساتھ مختلف کرداروں کو قاضی عبدالستار نے ان کی نفسیاتی پیشکش کے ساتھ بیان کیا ہے۔

قاضی عبدالستار کی اسی نثری اسلوب کی افسانہ طرازی کو دیکھتے ہوئے شمس الرحمٰن فاروقی نے انھیں paradox کا بادشاہ قرار دیا اور انھیں فضا کا جادوگر بھی سمجھا۔

32: خالد بن ولید۔ قاضی عبدالستار۔ ایجوکیشنل ہاؤس، دہلی سنہ اشاعت 2017 ص:226

33: خالد بن ولید۔ قاضی عبدالستار۔ ایجوکیشنل ہاؤس، دہلی سنہ اشاعت 2017 ص:177-176

مندرجہ ذیل جملوں سے آپ کو اس بات کا بخوبی اندازہ ہوگا۔

''جہاں شہرت واقبال کی سواری اترتی ہے وہیں حسد کے کتے بھونکنے لگتے ہیں۔''

''خوف۔ یہ کس چیز کا نام ہے؟ بنی ہاشم کے گھوڑے خوف کا چارہ کھاتے ہیں۔''

''عمرو بن العاص سے کہتا رہتا ہوں کہ شہادت بہادری کا ثبوت نہیں ہے۔ بہادری کے غلط استعمال کی شہادت ہے اور سیف اللہ کی ذات میرے دعویٰ کی دلیل اور یہ بھی کہ جتنے شیر شکار کیے جاتے ہیں اتنی لومڑیاں نہیں ماری جاتیں۔''34

قاضی عبدالستار کے یہاں جدلیاتی نثر اپنی خوبیوں کے ساتھ موجود ہے ساتھ ہی جدلیاتی نثر کے خوبصورت نمونے دکھائی دیتے ہیں۔ انھوں نے صنعت تجنیس کا بہترین استعمال اپنے ناولوں میں کیا ہے۔ جیسے

''میں نے موت سے پوچھا تو کراہتی کیوں ہے۔

بولی سیف اللہ کی خدمت کرتے کرتے تھک گئی ہوں۔''35

قاضی عبدالستار کے اسلوب میں انانیت بدرجۂ اتم موجود ہے۔ ناول خالد بن ولید میں بھی اسلوب کی یہ انانیت اپنی تمام تر رعنائیوں اور رنگینیوں کے ساتھ درآئی ہے۔ خطیبانہ اسلوب ااور انانیت پسندی کے خوبصورت امتزاج کے عہد فاروقی کا جاہ وجلال نگاہوں کے سامنے آنے لگتا ہے۔

مسجد نبوی کے بحث ومباحثے خالد بن ولید کی تقاریر اور اپنی صفائی میں پیش کیے عذر ناول کی فضا پہ ہیبت طاری کرتے ہیں۔ جب خالد بن ولید حضرت عمر فاروق سے مخاطب ہوتے ہیں:

''جب تم خلیفہ ہوئے تو تم نے پہلا فرمان اس تلوار کو غلاف کرنے کے لیے لکھا۔ لیکن اس سے تمھاری تسلی نہیں ہوئی بالآخر تم نے اس تلوار کو توڑ ڈالا۔ پوری ذلت کے ساتھ توڑ ڈالا۔ تم نے مجھے اس لیے معزول کیا کہ تم میری مقبولیت اور شہرت سے ڈرنے لگے......اے امیر المومنین عمر بن خطاب......تم نے مسند خلافت پر متمکن ہوتے ہی مجلس شوریٰ کے مشورے کے بغیر مجھ کو لشکر کی عملداری سے معزول کر کے جمہوریت سے آمریت کی طرف پہلا قدم رکھا۔''36

34: خالد بن ولید۔ قاضی عبدالستار۔ ایجوکیشنل ہاؤس، دہلی سنہ اشاعت 2017 ص:193-192

35: خالد بن ولید۔ قاضی عبدالستار۔ ایجوکیشنل ہاؤس، دہلی سنہ اشاعت 2017 ص:167

36: خالد بن ولید۔ قاضی عبدالستار۔ ایجوکیشنل ہاؤس، دہلی سنہ اشاعت 2017 ص:228

قاضی عبدالستار کی تحریریں بدیعاتی اور جمالیاتی عنصر جگہ جگہ صاف اور شفاف منظر پیش کرتا ہے۔ قاضی صاحب کا پرشکوہ اور بلند آہنگ اسلوب اسے شعری آہنگ عطا کرتا ہے اور قاضی صاحب کی نثری فسوں کاری نئے رنگ و آہنگ سے قاری کو نئے نئے جہان معنیٰ کی سیر بھی کراتی ہے۔

خالد اشرف ''خالد بن ولید'' ناول پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مصنف نے عربوں کی مذہبی اور قبیلائی شناختوں کے تصادم کو چابکدستی سے اجاگر کیا ہے۔عربوں میں دور جہالت کی پشتینی رقابتیں ، نصرتیں اور محبتیں صدیوں پرانی ہیں۔جبکہ وسیع تر اسلامی مساوات یہ چند دہائیوں قبل ہی متعارف ہوئی تھی۔اسلام نے عرب قبائل کو علاقائیت کی تنگنائے سے نکال کر اسلامیت کے ایک وسیع تر تصور میں پرونے کی کوشش کی۔اس تصور کی ناکامی کا ایک مظہر خالد بن ولید کی معزولی میں نظر آتا ہے۔تاہم وہ اس سازش کو بھی کامیابی سے انگیز کر لیتا ہے اور عالم اسلام کو اجماع امت کی تقسیم سے بچالے جاتا ہے۔''37؎

ڈاکٹر احمد خاں قاضی عبدالستار فکر فن اور فنکاری میں لکھتے ہیں:

''قاضی صاحب کا بڑا کمال یہ ہے کہ انھوں نے شروع سے آخر تک ناول میں تاریخی فضا کو قائم رکھا ہے۔ناول کو ایک پل کے لیے بھی بوجھل ہونے نہیں دیا ہے۔قاضی صاحب اسلام کی ابتدائی تاریخ کو جس پیرائے میں اور ڈرامائیت کے ساتھ پیش کیا ہے یہ انہی کا حصہ ہے۔موصوف نے خلیفۂ اول ابوبکر صدیق کے زمانے سے خلیفۂ دوم عمر فاروق کے زمانے تک کی تاریخ اور خالد بن ولید کے جنگی معرکوں کو کچھ اس طرح بیان کیا ہے کہ مدینہ، مکہ، ایران، عراق اور شام کی جیتی جاگتی تصویر سامنے آجاتی ہے۔قاضی صاحب کی بڑی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے تاریخی حقائق کو مجروح ہونے نہیں دیا ہے بلکہ انھوں نے اکثر تاریخی واقعات کا نفسیاتی تجزیہ کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔38؎

قاضی عبدالستار کے تاریخی ناولوں میں ہیرو کا تصور کتاب میں ڈاکٹر محمد شہزاد ابراہیمی لکھتے ہیں کہ:

''قاضی عبدالستار کے تاریخی ناولوں میں معروضیت اور حقیقت پسندی کو اولیت حاصل ہے جس سے نہ صرف مصنف اور تصنیف کا علمی اعتبار بڑھ جاتا ہے بلکہ اس میں مصنف

37؎: برصغیر میں اردو ناول۔خالد اشرف۔کتابی دنیا، نئی دہلی، سنہ اشاعت 2003 ص: 308

38؎: قاضی عبدالستار فن اور فنکار۔ڈاکٹر احمد خاں۔ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، سنہ اشاعت 2005 ص: 209

کی وہ تخلیقی قوت سامنے آتی ہے جو علم، معتقدات، اپنے دور کے سوال اور تخیل کو وحدت میں سمو کر ایک ایسے نگارخانہ کی تشکیل کرتی ہے جس میں ایک مخصوص عہد کی تاریخ وتہذیب، برصغیر ہندوپاک کے مسلمانوں کے لیے ایسے فاتحوں اور غازیوں کی فتح مندیوں سے بڑھی ہوئی دلچسپیوں کا نفسیاتی سبب غیر معمولی انسانی اوصاف رکھنے والے شخص کی بشریت، کامرانی پر سایہ فگن موت، مغلوب کی ذہنی مغلوبیت کے پہلو بہ پہلو اور تاریخ کا رخ موڑ دینے والے وہ لمحے جو کسی کی بھی گرفت میں نہ آسکے۔ ایک ایسے پرشکوہ اور دلچسپ اسلوب میں اپنا حسن معنیٰ دکھاتی ہے جو موجودہ دور کے بہت کم ناول نگاروں کو حاصل ہے۔"[39]

خالد بن ولید کے بارے میں مختلف شخصیات کے مشہور جملے

(1) کیا ہی بہترین غلام ہے اللہ کا خالد بن ولید۔ اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار جو کفار کے خلاف ہمہ وقت بے نیام رہتی ہے۔ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم)

(2) عورتیں اب قیامت تک خالد بن ولید جیسا فرزند نہیں جنیں گی۔ (سیدنا ابوبکر صدیقؓ)

(3) وہ جنگی امور کا گرو ہے اور موت کو دوست کی طرح عزیز رکھتا ہے۔ اس کی یلغار شیر کی اور صبر بلی کا سا ہے۔ (حضرت عمرو بن العاصؓ)

(4) وہ نہ خود سوتے اور نہ دوسروں کو سونے دیتے اور ان سے کچھ بھی چھپا نہ ہوتا۔ (مظہری)

(5) میں خالد سے متعلق باقیوں سے زیادہ جانتا ہوں اس سے زیادہ خوش نصیب کوئی نہیں ہے۔ جنگ میں کوئی ان کا ثانی نہیں جس کسی قوم نے خواہ طاقتور یا کمزور خالد کا مقابلہ کیا، وہ شکست کھائی میری رائے مانو تو خالد کے ساتھ معاملہ کرتے وقت اس کا انتخاب کرو۔ (دومۃ الجندل کا شہزادہ اکیدر)

(6) اگر اس فوج کا پرچم سیاہ ہے اور اس کا سپہ سالار دراز قامت، مضبوط جسامت کشادہ سینہ، لمبی داڑھی والا ہے کہ جس کے چہرے پر چیچک کے داغ ہیں تو خبردار اس فوج سے مت لڑنا۔ (بازنطینی پادری)

(7) سب سے تندخوار و کامیاب عرب جنگجو (ایڈورڈ گبن)

☆☆☆

39: قاضی عبدالستار کے تاریخی ناولوں میں ہیرو کا تصور۔ محمد شہزاد ابراہیمی۔ ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، سنہ اشاعت 2008 ص: 204

غالب

''غالب''اردو کے مشہور فکشن نگار قاضی عبدالستار کا ایک تاریخی ناول ہے۔تاریخی ناول نگاری میں قاضی عبدالستار کا نام مستند اور معتبر سمجھا جاتا ہے کہ انھوں نے اپنے تاریخی ناولوں میں اس بات کی کوشش کی ہے کہ فکشن اور فیکٹ میں توازن اور ہم آہنگی قائم رہے اگر صرف حقائق کا بیان ہوں تو پھر وہ بیان تاریخ کے قریب پہونچ جاتا ہے اور فکشن اس میں غائب ہوجاتا ہے۔اور اگر حقائق کو نظر انداز کر کے صرف افسانوی واقعات وحادثات پر قصے کی تعبیر کی جائے تو فکشن سے تاریخ نکل جاتی ہے۔اور تاریخی حقائق نکل جاتے ہیں تو پھر کرداروں کی زندگی افسانوی ہو کر رہ جاتی ہے۔اس لیے تاریخی ناول لکھنا آسان نہیں ہوتا کہ ذرا سا پلڑا ادھر اُدھر ہو گیا تو ادب اپنا حقیقی اور فنی توازن کھو سکتا ہے اوپر سے نقادوں کی ناک بھاؤں چڑھنے لگتی ہیں پھر وہ ایسے ایسے حقائق کھوج کر لاتا ہے جو محض روکھا پھیکا ہوتا ہے جس کا ذکر نہ تو ادب کو تازگی دے گا اور نہ فیکٹ میں اضافہ ہوگا۔اچھا تاریخی ناول نگار یا فکشن نگار بڑی فنی چابکدستی سے کام لیتا ہے اور بڑی فن کاری کے ساتھ فکشن اور فیکٹ کو ملا کر ناول کا تانا بانا بنتا ہے تاکہ قاری کو یہ نہ لگے کہ وہ محض تاریخ پڑھ رہا ہے یا تاریخی ناول نہیں محض افسانوی قصہ پڑھ رہا ہے۔جو تاریخی ناول کے دائرے سے ہٹا کر صرف ناول کے مقام تک لے جاتی ہیں۔

اردو میں تاریخی ناولوں کی ایک مربوط روایت بھی رہی ہے۔اس روایت کو اختیار ووقار بخشنے میں جن فکشن نگاروں کے نام سامنے آتے ہیں ان میں سرفہرست قاضی عبدالستار کا نام آتا ہے۔قاضی عبدالستار نے چار تاریخی ناول لکھے جن میں ''صلاح الدین ایوبی''،''خالد بن ولید''،''داراشکوہ''اور''غالب''شامل ہیں۔

ان میں تین شخصیتیں صلاح الدین ایوبی،خالد بن ولید،داراشکوہ تاریخی ہیں مگر غالب کی شخصیت ان تینوں سے مختلف ہے۔اس لیے غالبؔ کی شخصیت پر جو ناول قاضی عبدالستار نے لکھا ہے اس میں انداز نظر نہیں ملتا جو خالص تاریخی شخصیتوں میں ملتا ہے چونکہ غالب ایک شاعر تھے اور ان کی شاعری میں ان کی

شخصیت کے کچھ نمایاں پہلو ضرور نظر آتے ہیں اور کچھ حالات و واقعات ان کی خطوط نگاری میں ملتے ہیں۔ ان کی زندگی کا مرقع اتنا بڑا مرقع نہیں ملتا کہ اس پر ناول بن جائے۔ ناول بننے کے لیے فکشن نگار کو فیکٹ کے علاوہ فکشن سے بھی کام لینا پڑتا ہے۔ قاضی عبدالستار نے حالاتِ غالبؔ ناول میں ڈھالنے کے لیے فکشن سے زیادہ کام لیا ہے اور بہت سے ایسے واقعات جو Authentic نہیں ہیں ان کو بھی شامل کیا ہے تاکہ غالبؔ کا افسانوی کردار دلچسپ بن کر سامنے آسکے۔ تاریخی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو یہ عیب کہ کسی شخصیت سے ایسی چیزوں شامل کرلے جو براہ راست اس کی زندگی سے تعلق نہ رکھتی ہوں مگر فکشن پوری طرح فیکٹ نہیں ہوتا اس لیے فکشن میں اس کی گنجائش رہتی ہے اس کو گلوریفائی کرنے کے لیے ایسے قصے شامل کئے جائے جس کسی بھی تخلیق کے وجود میں آنے کے کچھ محرکات ہوتے ہیں کبھی راہ چلتے چلتے تخلیق کار کو کوئی موضوع مل جاتا ہے یا اس ایسی کوئی امر ہوتا جاتا ہے یا پھر کسی کی خواہش کے احترام میں بھی کچھ لکھنا پڑتا ہے۔ یا پھر کسی کی فرمائش کی بدولت معرض وجود میں آتا ہے۔ قاضی عبدالستار کے ناول ''غالب'' کے بھی محرکات و عوامل ہیں جس کا ذکر مصنف نے اپنے ناول کے دیباچے میں گذارش احوال واقعی سے کیا ہے اور اس ناول کے محرکات وعوامل پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے یہ کہا ہے:

> ''1973ء میں جب مجھے اردو فکشن کا پہلا ''غالب ایوارڈ'' تفویض ہوا تو عزت مآب فخر الدین علی احمد نے عزت مآب مسز اندرا گاندھی وزیر اعظم ہند سے میرا تعارف کراتے ہوئے فرمایا تھا کہ غالب انعام کمیٹی نے متفقہ طور پر قاضی صاحب کو غالبؔ ایوارڈ اس لیے دیا ہے کہ یہ غالبؔ پر ناول لکھیں گے اس ارشاد پر میں خاموش رہا۔
> 1974ء میں جب میں پدم شری ہوا اور عزت مآب سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے فرمایا ایک بنگالی ناول نگار (میں نام بھول گیا) نے میرے اصرار ناول پر ناول لکھنے کی حامی بھر لی اور چھ مہینے تک دہلی میں قیام کیا اور کچھ کام بھی کرلیا۔ لیکن اچانک ان کا انتقال ہو گیا اور میرا خواب پورا نہ ہوسکا۔ میں چاہتا ہوں آپ نے جس طرح ''صلاح الدین ایوبی'' اور ''داراشکوہ'' لکھی ہے اسی طرح غالب پر بھی لکھئے میں پھر بھی خاموش رہا۔ جنوری میں آخری بار جب میں حاضر خدمت ہوا تو وہ راشٹر پتی بھون کی اسٹڈی میں تشریف فرما تھے۔ اپنی قریب بیٹھا کر فرمایا، میں گرمیوں میں حیدرآباد جاؤں گا اگر آپ سرسالار جنگ

میوزیم سے فیض اٹھانا چاہیں تو میرے ساتھ چلیں۔کوئی زحمت نہیں ہوگی، میں انکار نہیں کرسکا لیکن گرمیاں آنے سے قبل وہ اس جہاں آباد سے چلے گئے اور میرا سفر حیدرآباد ساکت ہوگیا۔انتقال نے ان کے شفقتوں رعنائیوں کو جیسے صیقل کردیا۔عزت مآب کی ہدایت تھی کہ جب میں دہلی اپنے کام سے آؤں تو وقت نکال کر ان کے سکریٹری کو فون کر دوں، مجھے باریاب کیا جائے گا میں نے کبھی اس سہولت کا فائدہ نہیں اٹھایا لیکن صرف ایک بار۔جب راشٹر پتی بھون پہنچا تو ایک افسر نے سکریٹری کے کمرے میں بیٹھا دیا۔ نگاہ اٹھائی تو ایک طرف وائس چانسلر علی محمد خسرو اور پروائس چانسلر شفیع انتظار کرتے نظر آئے۔میں نے کھڑے ہوکر دونوں کو آداب کیا۔گفتگو کے دوران یہ علم ہوا کہ ایک بجے کا وقت مقرر ہوا ہے ابھی سلسلۂ کلام جاری تھا کہ وہ خادم ایک ٹرالی کے ساتھ آئے۔ چاندی کا چھوٹا سا سٹ، دوطشتریوں میں سرخ اور سبز مٹھائی اور ایک پیالی۔ایک شخص نے جائے بنائی مجھے پیش کی۔میں پیتا رہا اور انجام سے ڈرتا رہا۔چائے ختم کر کے انڈیا کنگ دوسرے آدمی کے دی ہوئی لائٹ سے لگائی تھی کہ ایک تیسرا شخص کمرے میں آیا میرے قریب جھک کر بولا۔

''قاضی صاحب!''

''جی!''

''تشریف لائیے۔''

اسٹڈی میں قدم رکھنے سے قبل گھڑی دیکھی تو ایک بجنے والا تھا۔صدر جمہوریہ نے کھڑے ہوکر ہاتھ ملایا۔مسکرا کر خیریت پوچھی اور اپنے پاس بٹھا لیا۔پندرہ منٹ بعد میں نے اجازت چاہی تو بیٹھنے کا حکم ملا۔دوسری بار کی اجازت پر باہر نکلا تو پینتس منٹ ہو چکے تھے۔

صدر جمہوریہ علی گڑھ آرہے تھے تو کانوکیشن کو خطاب کرنے۔ہفتوں پہلے سے انتظامات شروع ہوگئے۔علی گڑھ کے چند فن کاروں نے کہا کہ میں ان کے ساتھ صدر سے ملوں اور ان کا تعارف کرواؤں۔میں نے وائس چانسلر خسرو صاحب سے ملاقات کی۔انھوں نے آدھے گھنٹے کے ڈائیلاگ کے بعد معذروری کا اظہار کردیا۔میں آفس سے نکلتے ہی صدر جمہوریہ کی خدمت میں ایک خط ارسال کردیا۔ایک ہفتے میں جواب کے ساتھ پورا

پروگرام آ گیا۔جس میں میرے نام کے ساتھ چالیس منٹ لکھے ہوئے تھے۔ میں نے کلکٹر سے مل کر پروگرام کی توسیع کی۔ وقت مقررہ پر حاضر ہوا۔ وائس چانسلر کی کوٹھی کے گہرے سبز لان میں سرخ پتھر کے نیچے تشریف فرما تھے۔خسرو صاحب نے میرا نام پکارا۔صدر جمہوریہ کھڑے ہوئے۔ ہاتھ ملایا۔خیریت پوچھی۔میں نے اپنے ساتھیوں کا تعارف کرایا جو اردو اور ہندی کے فن کار تھے۔کافی آئی۔اطہر پرویز نے کافی کی پیالی پیش کی مسکرا کر لے لی۔اچانک کسی کو خیال آیا کہ تصویر لی جائے۔میں نے ایک لپک کر خسرو صاحب سے اجازت مانگی۔انھوں نے بڑی خشکی سے انکار کر دیا۔میں نے عزت مآب سے گزارش کی۔انھوں نے فوراً منظور کر لیا۔وہی جگہ بنائی گئی اور گروپ فوٹو لیا گیا۔

ترقی اردو بورڈ کے چیئر مین کے انتخاب کا سلسلہ زیرِ غور تھا۔عجیب عجیب نام سننے میں آرہے تھے۔میں چاہتا تھا کہ اسی منصب پر وہ فائز شخص بیٹھے جس نے اردو کے لیے کچھ قربان کیا ہو۔ میں دہلی گیا، بیگم حمیدہ سلطان صاحبہ جن کو میں آپا کہتا تھا اور جو صدر جمہوریہ کی ہم شیرہ تھیں۔مشورہ کیا انھوں نے چھوٹتے ہی جواب دیا۔آ کا بھائی (صدر جمہوریہ) سے کون کہہ سکتا ہے؟ تم کہہ سکتے ہو تو کہو۔صدر جمہوریہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔حسب دستور چائے پی اور اردو ناول کا ذکر چھیڑ کر وہ نام پیش کر دیا جو میرے نزدیک سب سے محترم اور سب سے زیادہ حقدار تھا۔ وہ ساعت فرما رہے ایک دو سوالات بھی کئے جن کے جوابات عرض کرتا رہا۔ چند روز گزرے تھے کہ ایک صبح ریڈیو پر انھیں صاحب کے تقرر کا اعلان ہو گیا۔

جب یہ عنایتیں یاد آئیں تو میں نے طے کیا کہ میں غالب پر ناول لکھوں گا اور صدر جمہوریہ کے نام سے انتساب کروں گا۔‘‘[1]

احوال میں انھوں نے جو بھی عرض کیا اس پر مکمل ایمان لانا یا کفر کرنا یہ اپنے اپنے نظریات ہو سکتے ہیں: مگر میرے خیال سے اس ناول کی تخلیق کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ قاضی صاحب جس معاشرے سے تعلق رکھتے تھے وہ نوابین اور تعلقداروں کا معاشرہ تھا۔اور یہ معاشرہ جہاں بھی اور جب بھی زوال کا شکار

1: غالب (ناول) قاضی عبدالستار۔عرشیہ پبلی کیشنز، نئی دہلی۔سن اشاعت: 2016ء۔ص:9-8

ہوا۔ قاضی عبدالستار نے ''صلاح الدین ایوبی'' کا زمانہ ہو یا ''ادارشکوہ'' کا یا مرزا غالب کا۔ غالب بھی اسی معاشرے کے ایک فرد تھے جس طرح کے معاشرے میں قاضی عبدالستار کی پرورش و پرداخت ہوئی اور جس طرح قاضی عبدالستار کا یہ دور معاشرتی زوال کا شکار رہا اسی طرح غالب اس تہذیب کا ایک اہم اور نمائندہ فرد نظر آیا اور چونکہ غالب کی ذات سے اس معاشرے کی بہت سارے تہذیبی سلسلے جڑے ہوئے تھے اس لیے قاضی عبدالستار کے ذہن میں غالب کا کردار ایک فکشن کا کردار لگا اور اس پر ناول لکھنے کا سوچا ہوگا اور بات یہ ہے کہ ان کی اس سوچ کو فخر الدین علی احمد کی خواہش نے مہمیز دے دی۔ اگر پہلے سے غالب ان کے ذہن میں ایک افسانوں کردار کے طور پر نہیں بیٹھا ہوتا تو شاید فخر الدین علی احمد کی خواہش کی تکمیل اتنی آسانی سے نہیں ہو پاتی اور فخر الدین علی احمد نے بھی اگر قاضی صاحب کو غالب پر لکھنے کے لیے تیار کیا تو اس کی وجہ بھی یہی ہے جس کا اوپر بیان ہوا ہے۔

ناول اردو زبان کے مشہور شاعر مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ کی زندگی کو مرکزی کردار بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ اس لیے اس کا نام غالب رکھا گیا۔ حالاں کہ اس میں مرزا غالبؔ کی حیات و شخصیت کے ساتھ ان کے عصر کی تہذیبی صورت حال کی عکاسی بھی خوب کی گئی ہے۔

یہ ناول ''غالبؔ'' ہندوستان کے صدر جمہوریہ فخر الدین علی احمد کی ایما پر لکھا گیا جیسا کہ ناول کے دیباچے سے ظاہر ہے۔ دیباچے میں اس حقیقت کی تفصیل سے وضاحت کی گئی ہے۔ تفصیل کی وجہ غالباً یہ ہو سکتی ہے کہ مصنف پہ یہ الزام نہ عائد ہو جائے کہ یا اس طرح کا اعتراض نہ ہونے لگے کہ یہ ناول صدر جمہوریہ کو خوش کرنے کے لیے لکھا گیا ہے۔ کیونکہ ناول کا انتساب صدر جمہوریہ فخر الدین علی احمد کے نام ہے۔ 210 صفحات پر مشتمل یہ ناول 1986ء میں لکھا گیا۔

قصہ: ناول کا قصہ تفصیل اور تجزیاتی انداز میں یہاں پیش کیا جا رہا ہے۔ کہانی کی ابتدا منظر نگاری سے ہوتی ہے جیسا کہ قاضی صاحب کا اسلوب خاص ہے۔ جہاں آباد اور جامع مسجد کی تصویر اور تصور سے انھوں نے غالب ناول کی شروعات کی۔ ان کے اس بیان پر جہاں ایک طرف دہلی اور جامع مسجد مغل اور مسلمانوں کی زوال کی جیتی جاگتی داستان پیش کرتی ہے۔

منگل شاہ کے پیغام موت نے ناول کو پہلے ہی پر زور بنا دیا اور پھر چغتائی بیگم کی محفل رقص و سرور آتا

ہے جہاں چغتائی بیگم کے غزل خوانی سے پورا ماحول جگمگا رہا ہوتا ہے۔اس چغتائی بیگم کی محفل میں نواب تجمل حسین خاں بھی شریک ہیں اور چغتائی بیگم غالب کی غزل گا رہی ہیں۔مگر جب ولی عہد کے مرنے کی خبر ملتی ہے تو پورے ماحول پر ماتم چھا جاتا ہے۔

ترک بیگم اور غالبؔ کے عشق کو قاضی عبدالستار نے بیگم حمیدہ سلطان کے بیان کردہ ہونے کے بارے میں راشد انور راشد سے محو گفتگو ہیں:

''اپنی منھ بولی بہن بیگم حمیدہ سلطان کی زبان مبارک سے جب میں نے یہ سنا تھا کہ غالبؔ کسی ایرانی رسالدار کی بیوہ کی اصلاح فرماتے تھے اور اچانک اس کا انتقال بھی ہو گیا تو مجھے غالب کی محبوبہ مل گئی۔ میں نے اس عہد کے سب سے بڑے محقق قاضی عبد الودود صاحب سے اس ایرانی بیوہ کا ذکر کیا تو انھوں نے فرمایا کہ میں بیگم حمیدہ سلطان کے بیان پر یقین نہیں کرتا،لیکن آپ کو ناول لکھنے کی اجازت دے سکتا ہوں۔اس لیے کہ آپ غالبؔ کی سوانح عمری نہیں لکھ رہے ہیں غالبؔ پر ناول لکھ رہے ہیں اور غالبؔ کے معاشقے کے لیے ایرانی رسالدار کی بیوہ یقیناً بہت مناسب کردار ہے۔ میں نے جب منٹو کی لکھی ہوئی فلم غالبؔ دیکھی تو مجھے افسوس بھی ہوا اور اس کی وہ غزل۔

''شرم رسوائی سے جا چھپنا نقابِ خاک میں\
ختم تھی اس پر وفا کی پردہ داری ہائے ہائے

جب پڑھا تو جیسے دل کو یقین نہیں ہوتا تھا کہ یہ شعر ڈومنی کے لیے کہا گیا ہے۔ابھی میں اس کش مکش میں مبتلا تھا کہ غالب کا ایک اور شعر مل گیا۔

''ہاں غالبؔ خلوت نشین بیم چنا عیش چنیں\
جاسوس سلطاں در کمیں معشوق سلطان در بغل

اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ ڈومنی غالبؔ کی معشوقہ تھی تو ہم یہ کیسے مان لیں کہ وہی ڈومنی سلطان کے بغل میں تھی۔رہا یہ اعتراض کہ شعر ہمیشہ حقیقت پر مبنی نہیں ہوتا تو اس شعر کا کیا جواز ہے۔۔۔

''شعروں کے انتخاب نے رُسوا کیا مجھے''

ہمارے پاس شاعروں کے اشعار کے علاوہ ثبوت نام کی اور کون سی چیز ہوسکتی ہے۔یہ

ضروری نہیں کہ ہر زمانے میں خطوط بازی ہوئی ہو اور اگر خطوط بازی ہوئی بھی تو اس کا ملنا ناممکن ہے اس لیے میں نے غالبؔ کی ہیروئن ترک بیگم کو مان لیا ہے۔''[2]

زیر مطالعہ ناول 210 صفحات پر مشتمل ہے جس میں جہاں آباد کی افسردگی اور ویرانی سے ناول کی شروعات ہوتی ہے جو قاضی عبدالستار کا خاص اسلوب ہے۔ جہاں منظر نگاری کی ابتدا ہوتی ہے ایک افسردگی اور کرب ناکی کا ماحول دیکھنے کو ملتا ہے۔ ساتھ ہی منگل شاہ کی زبان سے دہلی جو رنگوں میں قید تھی ہر قید سے چھوٹ گئی یعنی بہادر شاہ ظفر کی رحلت کی خبر سنائی جاتی ہے اور پھر چغتائی خاں کا مجرا محفل میں رنگ اور روشنی بھرتا ہے ساتھ چغتائی بیگم جو غالبؔ کی غزل گا رہی ہیں ولی عہد کے سامنے غالبؔ کے مصرع کو تحریف کے ساتھ پیش کرتی ہیں ۔

دیا ہے شاہ کو بھی تا اسے نظر نہ لگے
بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لیے

نواب کے سامنے جب یہ مصرع پیش کیا جاتا ہے تو وہ ناراضگی کا اظہار کرتے ہیں کہ خلق کا ہاتھ اتنا دراز ہو گیا ہے کہ وہ شاہ کی گردن تک پہنچ گیا۔ جب غالبؔ کا اصلی مصرعہ کچھ اس طرح تھا

ے دیا ہے خلق کو بھی تا اسے نظر نہ لگے

غرض نواب کی ناراضگی سے محفل جو ابھی چمک رہی تھی دمک رہی تھی اچانک سے بجھ جاتی آواز اور بدن کی موسیقی کا سوز و ساز اور راگ رک جاتا ہے اور جب ولی عہد سلطنت کی خلد آشیاں ہونے کی خبر ملتی ہے تو پورے ماحول پر افسردگی اور موت کا ماتم چھا جاتا ہے محفل برخاست ہو جاتی ہے۔

چغتائی بیگم کے بعد غالبؔ ماضی سے نکل کر سامنے آتے ہیں اور امراؤ بیگم اپنی خاص بیویوں والے انداز میں سامنے آتی ہیں اور پھر ترک بیگم کا ذکر شروع ہوتا ہے۔ یہ وہی ترک بیگم ہیں جن کا ذکر غالبؔ نے بیگم حمیدہ سلطان سے سنا تھا اور پھر غالبؔ نے ڈومنی کے بجائے ترک بیگم کو اپنے ناول کی ہیروئن مان کر اس کے حسن و عشق سے ایک تہائی حصے کو سرابور کیا ہے۔ ترک بیگم کے بارے میں احوال گذارش میں انھوں نے کچھ اس طرح بیان کیا ہے:

''غالبؔ پر لکھنا اس لیے مشکل سے بھی مشکل تھا کہ مرزا غالبؔ نام کی فلم بن چکی تھی۔ فلم

2: اسرار و گفتار۔ (گفتگو کی شکل میں سوانح عمری)۔ راشد انور راشد۔ عرشیہ پبلیکیشنز۔ 2014۔ ص 266

کی کہانی منٹو جیسے صاحب قلم نے لکھی تھی اور ایک ڈومنی کو میرزا کے کندھوں پر سوار کر دیا تھا اور سب اسی محبت کی کہانی سننا چاہتے ہیں جو میری نزدیک سراسر بہتان ہے۔ غالبؔ تہذیب کا فرزند جلیل ہے جس کی آستینوں سے اس تھکے ہوئے زرنگار کلچر کا پسینہ بہہ رہا ہے جو شاعر ہے، نثر نگار ہے، شرابی ہے، جواری ہے، گنہہ گار ہے، صوفی ہے، موحد ہے، شیعہ ہے، سنی ہے، کافر ہے، عالم ہے، ہنسوڑ ہے، نواب ہے، عاشق ہے خود غرض ہے۔ چٹکی بھر مسرت کی تلاش میں احسانوں کا کھلیان پھونک دیتا ہے وہ سب کچھ ہوسکتا ہے لیکن ہم چشموں کی صحبت میں ایک ڈومنی کی کمر میں ہاتھ ڈال کر نہیں آسکتا ہے کہ یہ اس کی تہذیب کی شریعت کا سب سے بڑا کفر ہے۔ مجھے ایک شعر ملا جس کی روشنائی نے پلاٹ منور کر دیا۔ بیگم حمیدہ سلطان نے ترک بیگم کا ذکر کیا، جس کا افسانہ انھیں اپنے خاندان کی وراثت میں ملا۔ اور جس کی صداقت پر اپنے عہد کے سب سے بڑے محقق قاضی عبدالودود نے شک کا اظہار کیا انکار کا نہیں۔'' [3]

ناول غالبؔ میں 85 صفحات تک غالبؔ اور ترک بیگم کے عشق سے رنگینی ہے جہاں ہر عبارت میں حسن و عشق کی سرمستیاں غالبؔ کو سر سے پیر رک ڈبوئے رکھتی ہیں اور ترک بیگم کے سرتا پا تذکرے سے حور و غلماں بھی شرمندہ نظر آتے ہیں۔ ترک بیگم غالبؔ کی شاگردہ تھیں اور ایک شاعرہ تھیں وہ اپنی غزلوں کی اصلاح غالبؔ سے کراتی ہیں اور ان سے پردہ کرتی ہیں مگر غالبؔ نے گروڈ راجا رایہ کے گرود چھیرا کے نام پر ان کا پردہ اتروالیتا ہے اور انھیں مہا بھارت کی کہانیاں سناتا ہے ساتھ ہی یہ بھی بتاتا ہے کہ یہ جو پردہ ہے وہ مسلمانوں کا یا اسلامی پردہ نہیں ہے بلکہ یہ پردہ ہندوستان کے ہندوؤں کا پردہ ہے جو ان کی عورتوں نے مسلمان لٹیروں سے اپنی ناموس کی حفاظت کے لیے مجبوراً اوڑھ لیا تھا۔ غالبؔ اور قاضی عبدالستار کے نظریات اس ناول میں گڈ مڈ نظر آتے ہیں۔

غالبؔ ایک وعظ کی طرح تقریر بھی کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اور ایک جید عالم کی طرح علم و ادب پر فلسفہ بگھارتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ جیسے

'' آپ کو معلوم ہے ہم مسلمانوں نے دین کے عالموں کی حرمت کے لیے اپنے بادشاہوں کے تاج اتار دیئے، لیکن دنیا کے عالموں کو بکرے کی اور جھڑی پکانے والوں

---

[3] غالب (ناول) قاضی عبدالستار۔ عرشیہ پبلی کیشنز، نئی دہلی۔ سن اشاعت: 2016ء۔ ص: 10

سے بھی حقیر جانا نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا کا علم ہمارے ہاتھوں سے پھسلتا چلا گیا دنیا ہمارے ہاتھ سے نکلی چلی گئی یہی نہیں دین بھی ہماری مٹھویوں کی گرفت میں نہیں رہا۔ہم بھول گئے کہ مسلمان کے لیے دین و دنیا ایک ہی سکّے کے دو رخ ہیں۔''4

ترک بیگم جب اپنا پردہ اتار دیتی ہیں تو غالبؔ کو ان کے بارے میں جاننے کی مزید خواہش ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں:

''ترک بیگم محبت کی تکمیل اُس وقت ہوتی ہے جب دونوں اپنے اپنے خفیہ قلعوں کے دروازے ایک دوسرے پر کھول دیتے ہیں۔''5

ترک بیگم اپنی عزت و ناموس کی حفاظت کے لیے کوشاں ہیں۔وہ غالبؔ کو کچھ بھی بتانے سے کتراتی ہیں مگر غالبؔ کی بے پناہ محبت اور چاہت کے آگے بے بس ہو جاتی ہیں اور غالبؔ ان کو ہر جملے سے اپنی بات منوانے کے لیے قائل کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں:

''ترک بیگم بدن کی موسیقی کا نام رقص اور آواز کے رقص کا نام موسیقی ہے۔''6

غالبؔ نے ترک بیگم سے زندگی، حسن و عشق اور حیات کائنات جیسے موضوعات پر بات کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔اور تہذیب، روایت اور سماج کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں:

''مرد اور عورت کی زندگی میں صرف ایک رات آتی ہے جب مذہن اور سماج اور تہذیب اور خاندان جیسے تمام ادارے پوری آزادی کے ساتھ مدتوں سے دہکتے ہوئے جذبات کی تسکین کی اجازت دے ڈالتے ہیں اور دونوں اپنے جسم کی دنیاؤں سے روشناس ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کو روشناس کراتے ہیں اور یہ سب کچھ ایک معمولی رسم کے سرانجام پر مبنی ہوتا ہے۔۔۔رسم اور روایت تو یہ ہے۔''7

ترک بیگم مرہٹہ فوج کے جوانا مرگ ایرانی رسالدار کی کمسن بیوہ ہے اور اس کے والد سپاہی تھے اور فوجیں لڑاتے تھے۔ترک بیگم کی پرورش ایک بنگالن نے کی تھی جو فن رقص و موسیقی میں یکتا تھی اسی سے ترک

4: غالب (ناول) قاضی عبدالستار۔عرشیہ پبلی کیشنز، نئی دہلی۔سن اشاعت: 2016ء۔ص: 22

5: غالب (ناول) قاضی عبدالستار۔عرشیہ پبلی کیشنز، نئی دہلی۔سن اشاعت: 2016ء۔ص: 43

6: غالب (ناول) قاضی عبدالستار۔عرشیہ پبلی کیشنز، نئی دہلی۔سن اشاعت: 2016ء۔ص: 43

7: غالب (ناول) قاضی عبدالستار۔عرشیہ پبلی کیشنز، نئی دہلی۔سن اشاعت: 2016ء۔ص: 43

بیگم نے رقص کرنا اور شاعری کا ہنر سیکھ لیا تھا۔ غالبؔ کے کریدنے اور اس کے پاؤں دیکھنے کے بعد ترک بیگم نے راز فاش کیا ہے۔

ترک بیگم کو دیکھنے کے بعد بوا سبز قدم اور کنور گردھاری سنگھ برجیسی کے سہارے ترک بیگم سے مزید معلومات کی سبیلے نکالی جاتی ہیں۔ غرض غالب ایک رومانی سفر کی ابتدا کرتے ہیں اور عشقیہ جذبات کا مختلف رنگ و ڈھنگ سے اظہار ہوتا ہے۔ متھرا مین کرشن اور رادھا کی نگری سے ان کا جنون عشق سر چڑھ کر بولنے لگتا ہے اور غالب اپنی خواہشات کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ کبھی اس کی ہتھلیوں کے بوسے لیے جا رہے ہوتے ہیں اور کبھی پاؤں چومنے کی درخواست کی جاتی ہے۔ ساتھ ہی بچے کی موت پر جب ترک بیگم ملنے ان کے گھر آتی تھیں تو غالبؔ کو اپنے مرے بچے کے دکھ سے زیادہ ترک بیگم کے دیدار کی خوشی تھی۔ شراب، مجریٰ اور انواع و اقسام کے کھانے کے ساتھ ہی یہ ناول کے 85 صفحات مکمل ہو جاتے ہیں۔ ترک بیگم کی عزت و عصمت کی حفاظت کی قسمیں کھائی جاتی ہیں ساتھ ہی تلوار کو بیچ میں رکھ کر رات گزاری جاتی ہے۔ ان صفحات کو قاضی عبدالستار نے نہایت خوبصورت جملوں میں سجایا ہے۔ جیسے:

> ''جس رات کے بطن سے تمہارے قرب کا سورج طلوع ہو وہ ہمارے لیے چھپاتے ہوئے دنوں سے زیادہ روشن ہے۔''8

ان صفحات میں عشقیہ زندگی کی رنگینی، رعنائی، بے کیفی کی جھلک ملتی ہے۔ جب ایک عاشق و معشوق ساتھ ہوتے ہیں انھیں زندگی کا ایک ایک لمحہ ہنستا مسکراتا نظر آتا ہے انھیں اپنی زندگی پر رشک آتا ہے دنیا خوبصورت لگنے لگتی ہے۔ غم روزگار کی فکر ختم ہو جاتی ہے۔ اس لیے شاعر غالبؔ کہتا ہے قاضی عبدالستار کی زبان میں:

> ''تم نے دیکھا ترک بیگم اس شمع کی آمد سے پہلے کمرے میں تاریکیوں کے ڈھیر لگے تھے۔ لیکن اس کے طلوع ہوتے ہی وہ کافور ہو گئے۔ اسی طرح تمہارے قرب کی چھوٹی سی شمع جلتے ہی ہماری تمام سیاہ بختیاں حافظے سے رخصت ہو گئیں۔ تین دن اور تین رات مسلسل محبوب کے ساتھ گزرتے ہیں ترک بیگم کے کہنے کے باوجود باہر ٹہلنے کے لیے جانا غالبؔ کو بے چین کرتا ہے۔ عاشق کہتا ہے۔

8: غالب (ناول) قاضی عبدالستار۔ عرشیہ پبلی کیشنز، نئی دہلی۔ سن اشاعت: 2016ء۔ ص: 39

''ہم وہ پیاسے ہیں کہ اگر آپ سمندر ہوتیں تو بھی پی جاتے۔ آپ تو شبنم کی طرح نصیب ہورہی ہیں۔ چھوڑ کر اٹھنے کے خیال سے ہی دل بیٹھنے لگتا ہے۔''9

پھر ساتھ میں محبت کی سب سے بڑی نشانی تاج کا دیدار کیا جاتا ہے۔ اور پھر شاہ جہاں اور سورج مل جاٹ کی کہانیاں سنائی جاتی ہیں کس طرح اس نے تاج محل میں بھونسا بھروا دیا تھا۔ اور ترک بیگم سے کہا جاتا ہے:

''بیگم اگر ایک طرف تاج ہوتا اور دوسری طرف آپ تو ہم تاج کو چھوڑ کر آپ کو تھام لیں۔''10

ترک بیگم کے حسن و عشق کی تعریف کرتے کرتے غالبؔ سیاست، قصیدے کی ابتدا اور ان مشہور شاعروں کا ذکر کرتے ہیں اور قوموں کے زوال کے بارے میں بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم مسلمان قوم پر بھی زوال آچکا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اکبر آباد سے جہاں آباد تک کوئی پڑھا لکھا مسلمان نہیں مل سکتا ہے اور یہاں قاضی عبدالستار اپنے نظریے کی کارفرمائی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

دن آفتاب اور راتیں مہتاب کی طرح محبوب کی بانہوں میں گزر رہی تھیں۔ اب زندگی کی حقیقتوں سے سامنا ہوتا ہے جہاں امراؤ بیگم پنشن نہ ملنے سے گھر چلانے کی مشکلات کا ذکر کرتی ہیں۔ گھر میں مفلسی ڈیرہ جمائے ہوئے تھی۔ امراؤ بیگم غالبؔ کو صلاح دیتی ہیں کہ وہ بھی فیروز پور چلے جائیں اور ان کو خط دکھائیں جو ان کے خسر الٰہی بخش نے پنشن کے سلسلے میں لکھ رکھیں تھے مگر وہاں پہونچنے پر نواب احمد بخش خاں کی اچانک بیماری اور موت نے پنشن کے کام کو گردوپیش میں ڈال دیا۔ نواب کی موت نے غالبؔ کو بحر بیکراں میں چھوڑ دیا اور وہ بے یارومددگار واپس آ گئے۔ اور شمس الدین خاں کے نواب بننے کے بعد غالبؔ کی پنشن امید بھی کم ہونے لگی۔ اور غالبؔ پر پریشانیوں کا بوجھ بڑھ گیا۔ ایک طرف خبر ملتی ہے کہ ان کے خسر نواب الٰہی بخش خاں معروف بیمار ہو گئے اور دوسری طرف ترک بیگم کا بھی انتقال ہو گیا۔ ترک بیگم کی موت کی خبر کو سن کر اس کا دل ودماغ سن ہو گیا اور اسے محسوس ہوتا تھا کہ دن قیامت کا اور حشر کا میدان ہے۔ اسے نہ کچھ دکھائی اور نہ کچھ سنائی دیتا تھا۔ اور بوا سبز قدم سے پوچھنے پر پتا چلتا ہے کہ وہ اپنے اور غالبؔ کے عشق کو راز رکھنے کی کوشش میں

9: غالب (ناول) قاضی عبدالستار۔ عرشیہ پبلی کیشنز، نئی دہلی۔ سن اشاعت: 2016ء۔ ص: 71

10: غالب (ناول) قاضی عبدالستار۔ عرشیہ پبلی کیشنز، نئی دہلی۔ سن اشاعت: 2016ء۔ ص: 73

مر گئی۔ دونوں مجبور تھے۔ اچانک خون کی الٹی ہوئی اور چٹ پٹ ہوگئی۔ بوا سبز قدم کہتی ہیں مجھے لگتا ہے اس نے ہیرا چاٹ کر خودکشی کر لی ہے۔

غالبؔ کی زندگی ایک آبلے کی طرح بن گئی جس کے رات دن انگاروں کے مانند تھے۔ غم نے ان کی زندگی کو غمگین بنا دیا۔ رات دن انگاروں پر لوٹتے ہوئے گزر جاتی تھیں۔ دن بھر لکھنے پڑھنے کو باوجود بھی دل کا زخم کم نہیں ہوتا تھا۔ پھر امراؤ بیگم غالب کو کسی طرح نواب فرخ آباد کا خط لے کر صاحب بہادر بیڈلے کی خدمت میں جانے کے لیے کہتی ہیں یہاں پر قاضی عبدالستار نے غالبؔ کے کلکتہ جانے کا ذکر کیا ہے۔ مگر انھو ں نے چند صفحات میں اس خوبصورت سفر کو تمام کر دیا ہے۔ کلکتہ کی زندگی نے غالبؔ کے فکر کے پہلوؤں کو یکسر تبدیل کر دیا تھا۔ کلکتہ میں انھوں نے دیکھا کہ انگریزوں کی زندگی حرکت اور حرارت سے بھرپور ہے۔ وہ اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ کام میں استعمال کرتے ہیں۔ دنیا جہاں اور ہندوستان کے کونے کونے سے لوگ ان سے ملنے آتے ہیں اور اپنی درخواست پیش کرتے ہیں وہ جہاں بھی جاتے ہیں مع اہل وعیال جاتے ہیں۔ انھیں اپنی بیوی بچے بوجھ نہیں لگتے بلکہ انھیں وہ زندگی کا ساتھی سمجھتے ہیں۔ عورت پوری طرح آزاد خیال اور کم کپڑوں میں بھی نہایت اعتمادی کے ساتھ بازاروں میں پھرتی ہیں۔ انھیں یہ عریانیت نہیں لگتی۔ انگریز عورتوں کی نازکی غالبؔ نے نہایت غور سے محسوس کیا۔ غالبؔ کا جس طرح سے گرم جوشی سے خیر مقدم ہوا اس کا بھی ذکر ملتا ہے۔ لکھنؤ میں حاتم اور حاتم کی محفل نے ان کے دلّی کے دیے غم کو تھوڑا رفو کیا اور وہ کلکتہ آ کر زندگی کی طرف لوٹنے لگے۔ راستے میں انھوں نے لکھنؤ اور کعبۂ ہندوستان بنارس میں جس گرم جوشی سے غالب کا استقبال ہوا وہ بیان بھی قابل دید ہے۔ راستے میں کانپور الہ آباد سے ہوتے ہوئے وہ کلکتہ پہونچے۔ جہاں انھیں اندازہ ہوا کہ مٹھی بھر انگریز کیسے ہندوستان پر چھا گئے۔ کلکتہ کی زندگی کا ذکر قاضی عبد الستار کی زبان سے پڑھئے:

> ’’کلکتہ پہنچ کر سمندر کو دیکھا تو پہلی بار انکشاف ہوا کہ مٹھی بھر انگریز کروڑوں ہندوستانیوں کے اس براعظم پر کیوں چھا گئے۔ پانی زندگی کا جنم داتا، پانی آفات سماوی میں زندگی کرنے کا درس کا مدرس اور پانیوں کے پالے ہوئے پانیوں پر فتح پائے ہوئے۔ پانی میں ڈوبے ہوئے دشمن کو بچانے کی کوشش نے ان کو اجتماعی ہمدردی اور قربانی کے صحیفوں کا حافظہ بنا دیا۔ اور ہم خشکی کے کیڑے اپنی اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنا رہے ہیں اور

دوسروں کے گنبد و مینار دیکھ دیکھ کر اپنے سر پھوڑ رہے ہیں کسی کے جلتے گھر کی آگ
سے اپنا اندھیارے روشن کر رہے ہیں۔جھیلوں اور دریاؤں سے ڈرنے والے سمندروں
کو اپنی بغل میں لپیٹ لینے والوں کے سامنے ہار گئے۔یہی ان کا مقصد تھا ٹھنڈی سڑک
پر جوان عورتیں ایسے کپڑے پہنے جن میں برہنہ پنڈلیوں کے دوشانے روشن ہیں اور
بازوؤں کے خنجر فروزاں ہیں۔اپنے بزرگوں اور بچوں کے ساتھ اس طرح ٹہل رہی ہیں
جیسے کائنات ان کی ہے۔اپنے مردوں کی کمر میں ہاتھ ڈالے اٹکھیلیاں کر رہی ہیں گویا یہ
زندگی اور یہ زمین انھیں کی ہے پانی میں نہا رہی ہیں، نہ کھلنے کا ہوس نہ ڈھکنے کی فکر۔اپنے
اوپر پورا اعتماد ہے۔کہ ہماری مرضی کے بغیر کوئی آنکھ ہمارے بدن کو میلا نہیں کر سکتی۔
عورت ہماری شریک بستر ہے اور ان کی شریک حیات، شریک زندگی۔زندگی اور بستر
میں فرق ہے وہ بھی ہم نہیں جانتے کہ ہماری زندگی کی بہار کا نام بہار بستر ہو کر رہ گیا
ہے۔''11؎

غرض کلکتہ کی پوری زندگی کو غالبؔ نے فلسفیانہ انداز سے دیکھنے کی کوشش کی۔کلکتہ جو ایک صرف شہر نہیں تھا بلکہ حکومت کا مرکز تھا جہاں فورٹ ولیم کالج نظم ونثر کی نئی تاریخ لکھ رہا تھا اور اسی تاریخ کے بہانے حکومت کو قائم رکھنے کی نئی تدبیریں اپنائی جا رہی تھیں۔وہ نئے میزان بنا رہا تھا، نئے قلم بنا رہا تھا۔ہماری تاریخ جو تلوار کے بھروسے تاریخ داں نے ٹانگ رکھی ہے اس سے دور قلم کے ذریعہ غلام بنانے کی کوشش فورٹ ولیم کالج سے شروع ہو چکی تھی۔تلوار ایک بات میں جسم کو کاٹ دیتی ہے مگر قلم کی کاٹ نسلوں اور پشتوں تک چلتی رہتی ہے۔اس بات کا بہ خوبی اندازہ غالبؔ کو کلکتہ کی زندگی کو دیکھ کر ہو رہا تھا۔

اقتباس نقل کرتی ہوں جس میں قاضی عبدالستار نے ایک معنی خیز نقطہ بیان کیا ہے:

''علم کے نئے چاک سے اتری ہوئی نسل شعروادب اور انشاء سے دور ہوتی جا رہی ہے۔
ہمارے اپنے شعروادب سے تو بہت دور نکل آئی ہے کہ علم کا نام صرف شعروانشاء نہیں ہے
شاعروں میں ہمارے باکمال شاعروں کے تیرونشتر بھی اسے تڑپانے سے عاجز ہیں۔ان
کی زبانوں کی خاموشی اور آنکھوں کی نیازمندی میں بھی ہمارے لیے ایک تحقیر ہوتی جسے
پشتوں کے خط مراتب برملا ظاہر نہیں ہونے دیتے۔''12؎

11؎ غالب (ناول) قاضی عبدالستار۔عرشیہ پبلی کیشنز، نئی دہلی۔سن اشاعت:2016ء۔ص:93

12؎ غالب (ناول) قاضی عبدالستار۔عرشیہ پبلی کیشنز، نئی دہلی۔سن اشاعت:2016ء۔ص:94

قاضی عبدالستار نے غالبؔ کی ایک ایسی دکھتی رگ کو بھی خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔ مسلمانوں میں بڑھتی فرقہ واریت کی منافرت، سنی شیعہ، وہابی، بریلوی جو اپنے اعمال واقوال سے اپنے اپنے الگ الگ ملک بنائے گھوم رہے اور کلیسا کے کھلتے ہی سارے عیسائی اتوار کو دنیا و مافیا سے بے خبر عبادت کے لیے موجود ہوتے ہیں۔

قاضی عبدالستار نے اس ناول میں کلکتہ کے ذکر کو چند صفحات میں ختم کیا جبکہ غالب تقریباً دو سال تک وہاں رہے اور ادبی معرکے اور چشمک بھی ہوئی اور وہیں انھوں نے مثنوی ''بادِ مخالف''، لکھی۔ ان سب باتوں سے قاضی عبدالستار نے دامن بچانے کی کوشش کی ہے۔

کلکتہ میں غالبؔ کی پنشن کا مسئلہ حل نہیں ہوا۔ اور دہلی واپس لوٹ گئے۔ وہاں انھیں مشاعرے میں شرکت کی دعوت ملی اور وہاں ناول میں قاضی عبدالستار نے لال قلعہ کے مشاعرے کا ذکر اور عہد کے بڑے بڑے شاعروں کا ذکر کیا ساتھ ہی ذوق کی ان کی چشمک بھی دکھائی دیتی ہے۔ لال قلعہ کے معاشرے کے بعد چغتائی بیگم ناول کے پردے پر داخل ہوتی ہیں ایک بار پھر سے غالبؔ کو ترک بیگم کے بعد نیا محبوب حاصل ہوجاتا ہے۔ اس کے قرب سے غالبؔ اپنی نگاہوں کو روشنی بخشتا ہے۔ اور چغتائی بیگم کے حسن کی دلفریب دادیوں سے غالبؔ بہاریں لوٹنے لگتے ہیں۔ پھر وہی شراب و کباب کا ذکر ہونے لگتا ہے۔ اس کے بعد غالبؔ کی ملاقات نواب شمس الدین والی ریاست فیروز پور سے غالبؔ کی ملاقات ہوتی ہے اور غالبؔ کو چغتائی بیگم نے پسند غالبؔ کو کیا اور نواب کو یہ بات پسند نہیں آتی ہے۔ معاشی تنگ دستی میں اضافہ ہوا باورچی کھانے کا خرچ اور چولہے کی آگ ٹھنڈی پڑنے لگی تو امراؤ بیگم نے دوشالہ بیچ کر چولہے کو گرم کیا اور پھر نواب حامد علی سے غالبؔ کی ملاقات ہوتی اور کی ملاقات ریزیڈنٹ دہلی فریڈر صاحب سے ہوتی ہے۔ مگر ان کے قتل کے بعد غالبؔ کی امید کا دیا پھر سے بجھ جاتا ہے۔

چغتائی بیگم کے ساتھ غالبؔ کے شب و روز بسر ہو رہے تھے جو ایک طرح ان کے غم کا مداوا کر رہے تھے وہیں دوسری طرف معاشی بدحالی میں روز افزوں اضافہ ہو رہا تھا۔ بہادر شاہ ظفر نے غالبؔ کو نجم الدولہ دبیر الملک اور نظام جنگ کا لافانی خطاب عطا کیا اور تنخواہ مقرر ہوئی خلعت سے سرفراز ہوئے۔ ساتھ ہی خاندان تیموری کی خدمت میں تاریخ نویسی تفویض ہوئی اور اسی تاریخ نویسی غالبؔ نے اپنی پسندیدہ بحر ماہ

نیم روز اور مہر نیم روز میں لکھا:

''شاہی فرمان دیکھ کر غالبؔ سوچتے ہیں تاریخ کو بین السطور میں پڑھنے والے عالم پر ان منشیوں اور منصوبوں کو ترجیح دی گئی جو تاریخ کو طوطے کی طرح رٹنے کے قائل تھے۔''[13]

اب غالبؔ شاہی وظیفہ خوار بن گئے اور یہ شعر کہتے ہیں۔

غالب وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دعا
وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں

ابھی بادشاہ سے تنخواہ ملی بھی نہیں تھی کہ ان کا بھانجا عارف مرجاتا ہے اور امرءبیگم نے عارف کے کم سن بچے کو پالنے کی ذمہ داری اٹھائی۔ جس کو دیکھ کر غالبؔ کا اپنا غم رفو ہونے لگتا ہے ساتھ ہی خدا قادر مطلق کے دربار میں شکایت کی عرضی داخل ہوئی کہ یہ خدائے رحیم و کریم کے صحیفۂ انصاف کی کون سی آیت ہے جو ان معصوموں پر نازل کی گئی ان شیر خواروں سے کون سے گناہ ہیں جن کی یہ سزا تجویز ہوئی۔

غالبؔ ناول میں قحط سالی کا بھی دردناک منظر پیش کیا گیا ہے جب لوگ ایک ایک دانے کے لیے ترس رہے تھے۔ ناول کا آخری حصہ بہت دردناک انداز میں لکھا گیا ہے۔ غالبؔ ایک احساس انسان تھے۔ کوئی بھی تخلیق کار جو حیات و کائنات کے اسرار و رموز کو اپنی تخلیق کا حصہ بناتا ہو وہ بے غیر احساس سے کچھ بھی درج نہیں کر سکتا۔ قاضی عبدالستار نے ناول کے آخری حصے میں غالبؔ کے کردار کے نفسیاتی پہلوؤں پر زور دیا اور انھوں نے مغل تہذیب کے خاتمے اسلامی طرز حکومت کے ختم ہونے اور بہادر شاہ ظفر کے رنگوں جانے کے واقعہ کو نہایت دردمندی سے لکھا ہے۔

دلّی جو عالم میں انتخاب ایک شہر تھا پھر 1857ء کی جنگ آزادی کا خوفناک منظر پیش کیا گیا ہے کہ کس طرح سے بے یار و مددگار چھوڑ دیا گیا جس کی گلیوں اور کوچوں رنگینیاں اور روشنیاں ہمہ وقت چمکتی رہتی تھیں ایک دن شہر خموشاں کے اندھیروں میں ڈوب گیا۔ چاروں طرف فساد کی وبا پھوٹ پڑی تھی۔ گھر اور دوکان تک جلائے گئے، عورتوں اور بچوں کو قتل کر دیا گیا۔ عورتوں کی عصمت کو پامال کیا گیا۔ ظلم و بربریت کا ایسا ننگا ناچ تھا کہ جہاں انسانیت شرمار ہو رہی تھی اور شیطان بھی منھ چھپا رہا تھا۔

13۔ غالب (ناول) قاضی عبدالستار۔ عرشیہ پبلی کیشنز، نئی دہلی۔ سن اشاعت: 2016ء۔ ص: 153

’’بے آبرو ہوتی ہوئی عورتوں کی چیخوں، قتل ہوتے ہوئے مردوں کی فریادوں اور جلتے ہوئے مکانوں میں پھنسے ہوئے بچوں کی پکاروں کے درمیان اس نے اپنی سلامتی پر اطمینان کا سانس لیا۔‘‘ 14؎

ایسی نازک حالت میں کوئی بھی پرخطر اور بڑے سے بڑا تیس مار خاں حوصلے ہار کر خوشامد کرنے اور جھوٹ بول کر زندہ رہنے پر مجبور ہو جاتا ہے کیونکہ جان ہے تو جہان ہے۔ غالبؔ زندہ شخصیت کے مالک تھے ان کی یہی 1857 کو اس ناول میں جامع انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ غالبؔ کو تحریک آزادی کے ذریعہ بھی سمجھنے کا موقع ملتا ہے۔ غالبؔ کا ان کے عہد کے حکمرانوں، شاعروں، نوابوں سے تعلقات کا ذکر بھی ہوتا۔

1857 کے واقعہ کو قاضی عبدالستار نے غالبؔ کے نقطۂ نظر سے بڑے جامع انداز میں پیش کیا ہے۔ اس تحریک میں غالبؔ کی عملی و فکری وابستگی کو بھی بہ خوبی پیش کیا گیا ہے۔ انھیں لگتا ہے کہ مسلمان قوم اس قابل نہیں رہ گئی جو حکومت کر سکے۔

شمیم طارق نے غالبؔ اور ہماری تحریک آزادی میں غالبؔ نقطۂ نظر اور ان کی داستان بیان ڈائری ’’دستنبو‘‘ کے حوالے سے آج کے دور میں سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ ہر ایک سانحہ یا واقع کو ہم اپنے ماحول اور پس منظر کے مطابق نہیں دیکھ سکتے۔ غالبؔ جس وقت کے جیسے حالات کا شکار تھے۔ ویسے ہی ماحول میں اگر انھو ں نے انگریزوں کی حمایت کی تو یہ ایک طرح کی دانشمندی تھی کیونکہ انھوں نے انگریزوں کی طرز زندگی اور ان کی ترقی کا بہ غور مطالعہ کیا تھا۔ انھیں معلوم تھا کہ آنے والے وقت میں وہی قوم ترقی کرے گی اور دوسروں پر حکومت کرے گی جو محنت کرے گی یہی کام اور یہی بات سرسید نے بھی کی اور لکھی۔ جب سرسید نے آئین اکبری کی تقریظ لکھنے کے لیے غالبؔ کو دی تو انھوں نے کہا کہ مردہ پروری بند کرو۔ انگریزوں کو دیکھو کیسے وہ سیاسی ترقی پر زور دے رہے ہیں۔

1857ء کا سانحہ اس وقت رونما ہوا جنگ پلاسی کے سو سال مکمل ہوئے تھے۔ انگریزوں کا تسلط دھیرے دھیرے پورے ملک پر قائم ہو رہا تھا مغلیہ سلطان کے فرمان قلعہ معلیٰ تک محدود ہو کر رہ گئے تھے۔ تبھی متھرا کی چھاونی میں کارتوس کو لے سپاہیوں کے بیچ ایک طرح کی بغاوت کے آثار دکھائی دینے لگے تھے۔ اور دو انگریز سپاہی فریزر اور ڈوگلس لاہوری دروازے پر مارے گئے اور باغی سپاہی دیوان خاص تک

14؎ غالب (ناول) قاضی عبدالستار۔ عرشیہ پبلی کیشنز، نئی دہلی۔ سن اشاعت: 2016ء۔ ص: 193

پہونچ گئے۔

بادشاہ نے سپاہیوں کے سر پر ہاتھ رکھ دیا کیا ہندو کیا مسلمان سبھی اس بغاوت میں شریک ہوگئے اور ایک طرح کا یہ طوفان تھا جو انگریزوں کے اوپر آ گیا۔ جگہ جگہ انگریز عورتیں بوڑھے بچے قتل ہونے لگے۔قاضی عبدالستار ناول ''غالب'' میں لکھتے ہیں:

''مہابلی یہ سپاہی ہیں دربار کے آداب نہیں جانتے لیکن کلکتہ سے کابل تک فرنگیوں نے انھیں کے ہاتھوں پر فتح پائی ہے ظل الٰہی ان کے سر پر ہاتھ رکھ دیں یہ سارا ملک فتح کر کے آپ کے قدموں میں ڈال دیں گے۔سارے خزانے جیت کر نذر میں گزار دیں گے۔''15؎

مذہبی نعروں کے ساتھ ایک خون سوار تھا جو انگریزوں کی پوری میگزین تباہ کر رہا تھا۔اس حالت میں غالبؔ کا نقطہ نظر الگ تھا انھیں لگتا تھا بیاسی برس کا یہ بوڑھا نہ تو شیر دکن ٹیپو سلطان ہوسکتا ہے اور نہ ہی سراج الدولہ جیسے ہی انگریز سمجھنے لگے وہ اس حرکت بدلا نہایت خطرناک انداز سے لیں گے۔اس کے بعد غالبؔ کے پاس ظل الٰہی کا فرمان آتا ہے کہ بادشاہ کا سکہ لکھا جائے۔ناول میں 1857ء کے حالات بہادر شاہ ظفر کی فوجیں مغل سلطنت کے خاندان کے لوگوں کی آپسی تلخیاں اور نااہل لوگوں کے احوال کا بھی ذکر ملتا ہے۔

ہندوستانی عوام انگریزوں سے لڑنے کے لیے بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی تھی اور پھر بہادر شاہ کے بیٹے میرزا ظہیر الدین محمد عرف میرزا کو مغل افواج کا سپہ سالار بنا دیا گیا جو سپہ سالاری کے سارے فن سے عاری تھا۔جن شہزادوں نے ہمیشہ عیش وعشرت کی زندگی گذار دی تھی ایک منھ بھری تھی وہ انگریز کے توپ خانے سے لڑنے کے لیے سالار اعظم بن گئے، دراصل یہ محل کی اندرون سیاست تھی جو بہادر شاہ ظفر کی کم سن اور نئی بیوی زینت محل کی کوششوں کا نتیجہ تھی۔

سکہ لکھنے کی بات یہ ہے کہ انھوں نے

یہ زر زد سکہ نصرت طرازی!

سراج الدین بہادر شاہ غازی

لکھ کر بادشاہ کو پیش کیا گیا اسی سکّہ لکھنے کے واقعے کو لے کر انگریزوں نے مرزا غالبؔ سے باز پرس کی

15؎ غالب (ناول) قاضی عبدالستار۔عرشیہ پبلی کیشنز،نئی دہلی۔سن اشاعت:2016ء۔ص:157

جس کا ناول میں بیان ملتا ہے۔اور جب انگریزوں نے دریافت کیا کیا انھوں نے بادشاہ کا سکہ لکھا ہے تو انھوں نے انکار کر دیا۔خلیق انجم نے ایک نہیں دوسکوں کے الفاظ کی نشاندہی کی ہے اوراسی کے چلتے انگروںؑ نے بعد میں غالبؔ کوطلب کر کے پوچھ تاچھ کی۔

اس کے بعد ناول میں غداروں کا بیان ملتا ہے۔مغل دربار میں بہت سے اپنے غدار تھے جو اپنی ضیافت اور چند روپیوں کی لالچ میں کبھی انگریزوں اور کبھی سلطان سے غداری کر دیتے تھے۔راجہ کشن گڈھ کی حویلی میں بہت سے انگریز چھپے ہوئے منشی مہر اسلام نے غداری کر دی جو چودھری نے آگ لگا دی سیکڑوں انگریز مع عورتوں اور بچوں سمت جل کر مر گئے ۔کیونکہ 1857 کی جنگ آزادی کی تحریک شروع ہو چکی تھی آگرہ سے تمام پلٹنیں طلب کر کے دہلی کے قرب وجوار میں پھیل گئی تھی اور نواب شمس الدین خاں کو فریزر صاحب کے قتل کے الزام میں پھانسی دے دی گئی۔ پھر غالبؔ کی پنشن کا بقایا مل جاتا ہے اور دن گلاب اور راتیں مہتاب ہو جاتی ہیں۔ باورچی کھانے میں رونق آجاتی ہے۔ایک دن فضل حق خیر آبادی نے آموں کی دعوت دی جہاں غالبؔ کے دوستوں جیسے مصطفٰے خاں شیفتہ، مفتی شرف الدین آزردہ، راجا قاہرہ سنگھ والی ریاست بلبھ گڈھ اور حکیم آغا جان کے ساتھ مغل جان سے ملاقات ہوتی ہے۔ یہاں پر غالبؔ کے نظریات کو قاضی عبدالستار نے اپنے نقطہ نظر سے پیش کیا اور محمود غزنوی کے موضوع جو لے کر آغا جان عیش اور غالبؔ سے نوک جھونک ہو جاتی ہے اور غالبؔ محمود غزنوی کو لٹیرا اور غاصب سمجھتے ہیں جو صرف ہندوستان لوٹنے کی غرض سے آیا۔

قاضی عبدالستار نے اس کے بعد غالبؔ کی دہلی کالج کی پروفیسری ٹھکرانے کے واقعہ کو پیش کیا ہے مگر غدر نے غالبؔ کی انانیت اور خودداری کو بہت جلد تھکا دیا اور وہ وقت کی جنبش کو دیکھ رہے تھے ان کے پیٹ کی آگ اور ذمہ داریوں نے انھیں انگریزوں کی خوشامد پسند بنا دیا۔ان سب واقعات کا ذکر قاضی عبدالستار نے نہایت حساس اور دردمند بیانیہ اور زندگی کی تلخ حقیقتوں کو سامنے رکھ کر کے ساتھ پیش کیا ہے۔

رمضان کا مہینہ چل رہا تھا۔ دھیرے دھیرے عید آگئی۔عید کی نماز کی مبارک بادلی اور دعا کی جارہی تھی۔اور دوسری طرف میرزا ابوبکر سالار لشکر ہو کر ہنڈن ندی پر انگریزوں سے لڑنے نوشہ بن کر جارہا تھا۔ ہنڈن ندی پر انگریزوں کے توپ خانے کے سامنے ہندوستانی لشکر کچھ دیر ہی میں بدحواس ہو گیا۔اور یہ جنگ

ہار گیا۔

جنگ آزادی کا بیان: اب انگریزوں نے ہندوستانیوں کولڑانے کی آخری حربہ استعمال کیا کہ کس طرح دوقوموں کے بیچ پھوٹ ڈالی جائے بقرعید قریب تھی اور سب سے اچھا حربہ گائے کی قربانی تھی۔ سلطان کوجیسے ہی اس چال کے بارے میں معلوم ہوااس نے یہ فرمان جاری کردیا کہ گائے کی قربانی کرنے پر پھانسی کی سزادی جائے گی دلی کے گلی گلی محلے محلے اور مسجدوں میں بادشاہ کے فرمان پڑھے جانے لگے۔مگر انگریزوں کا جاسوس حکیم احسن اللہ خاں قربانی کے فضائل بیان کرکے لوگوں کو گائے کی قربانی پرابھار رہا تھا۔ انگریزوں کی یہ چال تھی کہ بقرعید کے دن جب ہندومسلمان گائے کی قربانی پرآپس میں لڑرہے ہوں گےتو وہ چپکے سے ان پرحملہ کردیں گے۔دھیرے دھیرے شاہی خزانہ خالی ہونے لگا بادشاہ کے پاس اتنی دولت نہیں بچی کہ وہ اپنی فوج کا پیٹ بھرسکے اورانھیں بندوق فراہم کرسکے۔انگریز جاسوس جوپورے شہرمیں پھیلے ہوئے اورساتھ دربار میں اور لال قلعہ میں موجود تھےایک ایک کی جانکاری اورخفیہ معلومات انگریزوں کو دیا کرتے تھے۔جن کا ذکر رجب علی نام کاشخص شہرمیں چوہدسن کی طرف سےشہر کی پرامن فضا میں انتشار پھیلانے کی کوشش کرر ہا تھا۔

نکلسن کی سربراہی میں مزید فوج شہرمیں داخل ہورہی تھی۔جیسے جیسے دن گزرر ہا تھا شہر کےعوام میں ہرطرف بےچینی بڑھ رہی تھی باقی فوجی اتنے تعداد میں اب نہ تھے کہ جوانگریزں کوروک لینےخزانہ بھی خالی تھا۔ان سب صورت حال کی بہترین عکاسی غالبؔ نے کی۔اپنے ہی لوگ کیسے ایک دوسرے کولوٹ رہے تھے،گھرمیں گھس کرساز وسامان اٹھالے جارہے تھےان سبھی پہلوؤں پرقاضی عبدالستار نے غالبؔ کی زبانی بیان کیا ہے۔ساتھ ہی بارود کا کارخانہ کسی غدار نے اڑادیااب ہندوستانی فوجیوں کے پاس توپ اور بارود کا بھی سہارانہیں رہا۔اس سازش کے پیچھےاحسن اللہ کا نام سامنے آتا ہے۔چاروں طرف مایوسی پھیل چکی تھی، اورانگریزوں نے جگہ جگہ حملے شروع کردیئے۔سب سے عظیم امتحان جامع مسجد کو دینا پڑا جہاں ہزاروں مسلمانوں نے خون سے رنگ گئی اور چاروں طرف لاشیں ہی لاشیں بچھی تھیں۔مجاہدین نے جہاد کانعرہ بلند کیااورصفیں کی صفیں کٹتی رہیں اور وہ انگریزوں کا مقابلہ کرتے ہوئے قاضی صاحب لکھتے ہیں۔جامع مسجد ایسے ہی اتنی سرخ دکھائی نہیں دیتی ہے اس نے ہزاروں نمازی مجاہدین کا خون پی رکھا ہے۔دلی کی عوام اور

غالبؔ نے اپنی کھلی آنکھوں سے یہ منظر دیکھا جب دلی کے گلی کوچے خون سے سرخ تھے جامع مسجد، چاندنی چوک، لاہوری دروازے غرض ہر ایک مقام پر خون کی ندیاں بہہ رہی تھیں۔ ناول کا ایک اقتباس:

''سورج اس طرح روشن تھا، دھوپ اسی طرح زندہ تھی۔ بندوقوں کی آوازیں اور مرنے والوں کی چیخیں اسی طرح بلند ہو رہی تھیں۔ ان کے درمیان خاموشی کا چھوٹا سا وقفہ لنا کی تلوار پر تل جانا۔ ایسے ہی ایک وقفے میں ایک گھٹا دھما کا ہوا۔ پھر ایسے دھما کے ہوتے رہے۔ دیر تک ہوتے رہے۔ پھر داروغہ خبر لایا کہ فیض بازار میں عورتوں کیا جتماعی آبرو ریزی کی خبروں نے شریفوں کو بے حواس کر دیا ہے۔ اور اکثر گھرانوں کے مردوں نے اپنے ہاتھ سے اپنی عورتوں کو قتل کر کے کنویں میں ڈال دیا ہے۔''16؎

جنرل بخت خاں بہادر شاہ ظفر کے سامنے آتے اور مورچہ بندی کا حکم مانگا مگر یہ بزرگ بادشاہ جس کے پاس نہ دولت تھی اور نہ ہمت اور جس کے اپنے غداروں نے اس کو ہڈسن کے ہاتھوں گرفتار کرا دیا۔ جب فاقہ کشی بادشاہ ناشتہ کرنے بیٹا تو دستر خوان پر اس کے بیٹوں کے سر پیش کیا مگر اس نے جوش کے ساتھ یہ بات کہی جو تاریخ کے اوراق پر قیمتی نگینوں کی طرح چمک رہی ہیں:

''الحمداللہ! چغتائی شہزادے اسی طرح سرخرو آتے ہیں۔''17؎

اس کے غالبؔ ناول میں ان کی گرفتاری کا ذکر ملتا ہے جب ایک انگریز افسر غالب سے پوچھتا ہے تم مسلمان ہو۔ غالبؔ نے جواب دیا آدھا مسلمان۔ افسر نے پوچھا کیا مطلب۔ اس نے کہا شراب پیتا ہوں سور نہیں کھاتا۔ پھر غالبؔ کے چند سوالات کرنے کے بعد اسے زندہ چھوڑ دیتا ہے مگر اس کا پاگل بھائی مارا جاتا ہے اور گھر کے ہی صحن میں دفن ہوتا ہے۔

غرض اس ناول میں 1857 کی جنگ آزادی کے دل دوز مناظر پیش کیے گئے ہیں۔ آخر میں غالبؔ کے حاسدوں اور ان پر تہمت طرازی کرنے والوں کا چند صفحے کے بیان کے بعد ناول ختم ہو جاتا ہے۔ غالبؔ اپنی موت کے انتظار کرتا ہے اس کے لیے انتظار کرنا ایک موت جیسی ہی اذیت دیتا ہے۔

کردار نگاری: غالبؔ کا کردار ادب کا سب سے انوکھا کردار ہے۔ ڈاکٹر احمد خان نے غالبؔ ناول

16؎ غالب (ناول) قاضی عبدالستار۔ عرشیہ پبلی کیشنز، نئی دہلی۔ سن اشاعت: 2016ء۔ ص: 192

17؎ غالب (ناول) قاضی عبدالستار۔ عرشیہ پبلی کیشنز، نئی دہلی۔ سن اشاعت: 2016ء۔ ص: 196

کے بارے میں کہتے ہیں:

''ناول کا پلاٹ گو غالبؔ اور ان کے حالات زندگی کے ارد گرد گھومتا ہے لیکن ساتھ ہی اس عہد کی سیاسی و سماجی اتار چڑھاؤ بھی نظروں کے سامنے گھوم جاتا ہے۔ ناول میں غالبؔ سے متعلق پوری تفصیل پیش کر دی گئی ہے، کبھی کبھی ایسا لگتا ہے کہ یہ ناول غالبؔ پر تاریخی حیثیت سے نہیں بلکہ سوانحی حیثیت سے لکھا گیا ہے۔ ایسی صورت میں ہم اسے سوانحی ناول کہہ سکتے ہیں لیکن اس کے پلاٹ میں اتنی گنجائش ہے کہ اسے تاریخی ناولوں کی فہرست میں بھی رکھا جا سکتا ہے۔ دوسری طرف یہ ناول اپنی تمام تر خوبیوں اور خامیوں کی بن پر اردو کے تاریخی ناولوں میں جو بھی مقام رکھتا ہو، لیکن اتنا طے ہے کہ یہ صلاح الدین ایوبی اور داراشکوہ کے معیار کو نہیں پہنچ سکا۔''18

احمد خاں نے غالبؔ کو سوانحی ناول کے زمرے میں رکھا ہے۔ اس کی غالباً ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ غالبؔ ایک سدا بہار شاعر ہے۔ اردو ادب کے کورس سے باہر سب سے زیادہ پڑھا جانے والا اور پسند کیا جانے والا متزکرہ شاعر ہے۔ وہ جس زمانے میں پیدا ہوا اور جس دور کو دیکھا وہ بھی ہندوستان کی تاریخ میں ایک یادگار زمانہ تھا۔ ہندوستان کے غلام ہونے سے پہلے مغلیہ تہذیب کا خاتمہ اور جنگ آزادی کی تحریک جس کے بنا پر ہندوستان کی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی یہ تمام موضوعات کورس کا حصہ ہوتے ہیں اور ہمیشہ پڑھے جاتے ہیں اس لیے وہ تاریخ کا حصہ نہ بن کر ہمیشہ حال کی طرح محسوس ہوتے ہیں جس کے بنا پر حکومت کی تاریخ نامکمل ہے اس لیے غالبؔ نہ تو ماضی بن سکتے ہیں اور نہ تاریخ کا حصہ۔ غالبؔ کو کسی ناول کے کینوس پر اتار دینا ایک بہت بڑا چیلنج تھا کیونکہ غالبؔ کی بے شمار تحریریں دستیاب ہیں ایسے میں کسی ایک ناول میں غالبؔ کو سمونا نہایت جگر سوزی کا کام ہے کیونکہ غالب بہ حیثیت شاعر جتنا مشہور و مقبول ہوا اور ایک ایسے عہد میں سانس لے رہا تھا جو بظاہر ایک تہذیبی بدلاؤ کا عہد تھا مگر اس عہد میں پیچیدگیاں اتنی تھیں کہ ہندوستان کا نیا مستقبل لکھ رہی تھیں ایک ایسا ہندوستان جس کا کل آج سے بہت مختلف تھا جہاں ایک پوری حکومت کو تہس نہس کر کے ایک ایسے اقتدار کو لانے کی کوشش کی جا رہی تھی جس میں کوئی بادشاہ نہ تھا مگر اس کے لیے سبھی ہندوستانی غلام تھے۔ ایک ایسا شاعر جس نے جذبات سے زیادہ عقل کو اہمیت تھی جو بدلتی ہوئی سماجی اقدار

18: قاضی عبدالستار: فن اور فنکار۔ ڈاکٹر احمد خاں۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔ اشاعت: 2006۔ ص: 193

سے بہت پہلے آگاہ ہوگیا تھا۔اسے معلوم تھا موجودہ نظام فرسودہ اور بے کار ہو چکا ہے۔اس میں اتنی اہلیت و طاقت نہیں ہے جو حکومتیں کو تندوتوانا رکھتی ہیں وقتی جذبات ایک پانی کے بلبلے کی طرح ہوتا ہے جو 82 سال کے بوڑھے بادشاہ کی طرح جلد ہی قبر میں سما جائے گا۔اس نے مردہ پروری کے بجائے مشنیری اور سائنسی عقلیت کو پسند کیا اوران کے آگے نت مستک بھی ہوا کیونکہ وہ اس کے نئے حاکم نئے بادشاہ تھے جس سے اس کے پیٹ آگ کو ٹھنڈک ملتی۔خصوصیت انھیں دوسروں سے منفرد بناتی ہے۔آپ آج کے دور میں بیٹھ کر 1857 کے غالبؔ کے نظریے کو غلط نہیں ٹھہرا سکتے۔ناول میں غالبؔ کہتے ہیں:

''اب یہ قوم جس کا نام مسلمان ہے، حکومت کے قابل نہیں رہی۔پوری انسانیت کے ساتھ ظلم ہو جائے گا اگر اس قوم کے حکومت سونپ دی گئی۔جس قوم کے حاکم حکم بیچنے لگے، عالم علم فروخت کرنے لگیں اور مصنف ذاتی منفعت کے ترازو پر فیصلے تولنے لگیں اس مقدر ہے غلامی اس کا نصیب ہے محکومی۔''19؎

غالبؔ ایک خاص ذہن کے مالک تھے۔وقت کے نبض شناس بھی تھے۔اس لیے انھوں نے کہا۔

''خدا جس قوم کو عروج چھینا چاہتا ہے فطرت کے اشارے بھی اس کی سہولت کے مطابق ہوتے ہیں۔''20؎

غالبؔ کا جیل جانا اور پھر حکومت کے بیچ ان کی طلبی ہونا اس کے علاوہ دیوانے پاگل بھائی کا نظروں کے سامنے گولی مارا جانا۔ان تمام واقعات کی بازگشت ناول میں سنائی دیتی ہے اس کے علاوہ ناول میں انگریزوں کے سامنے سکّہ لکھنے کو لے کر سوال کئے جانے اور پھر غالبؔ کا انکار کرنا ملکہ ایلزبیتھ کا قصیدہ لکھا اور اس کے جواب میں جو خط وخطابت ہوتی تھی اس کو گھر کے دروازے پر چپکانا تاکہ کسی طرح گھر کی عورتوں کی آبرو کی حفاظت ہوا اور جان بچائی جا سکے۔سبھی کا ذکر ناول میں ملتا ہے اور غالبؔ کا کردار کھل کر سامنے آتا ہے۔

خالد اشرف غالبؔ ناول پر اور غالبؔ کی شخصیت پر 1857 کی جنگ آزادی اور غالبؔ کے کردار کے حوالے سے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

19؎ غالب (ناول) قاضی عبدالستار۔عرشیہ پبلی کیشنز، نئی دہلی۔سن اشاعت: 2016ء۔ص: 184

20؎ غالب (ناول) قاضی عبدالستار۔عرشیہ پبلی کیشنز، نئی دہلی۔سن اشاعت: 2016ء۔ص: 184

''اس ساری جدوجہد اور ہنگامے میں تعجب خیز امر یہ تھا کہ غالب کی ہمدردیاں انگریزوں کے نظام کے ساتھ تھیں، اس لیے انہوں نے کبھی بغاوت کو پسند نہیں کیا اور نہ انقلابیوں کے لیے کوئی ہمدردی روا رکھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ غالب اشراف کی تغیر مخالف روایات کے پروردہ تھے حالانکہ وہ خود قلاشی تھی۔ لیکن ان کا حلقہ اور قرابت دہلی کے امراء روسا، جاگیرداروں اور نوابوں سے تھی۔ اس لیے وہ عوام کے اس طبقے کو جو ناخواندہ مفلس اور ناتراشیدہ تھا حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے اور ان عوام کے ہاتھوں میں ہی 1857ء کے انقلاب کی اصل قوت تھی، چنانچہ غالب جس طبقے سے منسلک تھے اس طبقے کی اشراف پرستانہ ذہنیت کا تقاضہ یہ تھا کہ وہ اس عظیم عوامی جدوجہد کی مخالفت کرتے اور یہی غالب نے کیا اور صرف یہی نہیں کیا بلکہ انگریزوں کی شان میں قصیدہ بھی لکھا اور اپنی پنشن کی بحالی کے لیے انگریز افسران کی خوشامد بھی کی۔ یہ پہلو اردو کے عظیم شاعر و نثر نگار کی ذاتی زندگی کا تاریک پہلو ہے۔'' 21ے

ناول غالب جو ایک سوانحی ناول کے زمرے میں آتا ہے اور ظاہر ہے سب سے مضبوط کردار غالب کا ہی ہے اس کے علاوہ ترک بیگم، امراؤ بیگم، بوا سبز قدم، نواب الٰہی بخش، چغتائی بیگم اور بہادر شاہ ظفر، حکیم احسان اللہ خاں وغیرہ کا کردار قابل ذکر ہے۔

دوسرا کردار ترک بیگم ایک ایرانی رسالے دار کی خوبصورت نوعمر اور کم سن بیوہ ہے۔ قاضی عبدالستار نے ان کا ذکر بیگم حمیدہ سلطان سے سن رکھا تھا اور کسی ڈومنی پر غالب کو عاشق دکھانے کے بجائے انھوں نے ترک بیگم کو غالب کی محبوب کے روپ میں پیش کیا ہے۔

امراء بیگم غالب کی بیوی اور ایک سمجھدار خاتون ہیں جو غالب کی ہر ایک مصیبت میں مدد کرتی ہیں انھیں حوصلہ دیتی ہیں بہترین مشورے سے نوازتی ہیں۔

چغتائی بیگم کا ذکر ناول میں ایک رقاصہ کے طور پر ہوتا ہے یہ ایک رنڈی کی اولاد ہے مگر حسن وفن میں یکتا اور قابل اعتماد شخصیت ہے بڑے بڑے نوابوں اور رئیسوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا ہے۔ وہ غالب کی شاعری پسند کرتی ہیں اور غالب کو نواب پر ترجیح دیتی ہیں۔ ناول میں ان کا ذکر اس طرح موجود ہے۔

''چغتائی بیگم رنڈی نہیں ہے۔ رنڈی کے پیٹ سے پیدا ہوئی ہے ایک غریب

21ے: برصغیر میں اردو ناول۔ خالد اشرف۔ کتابی دنیا۔ 2003۔ ص 317-316

لیکن کھرے مغل کی اولاد ہے۔انصاف ہوا ہوتا تو میرے باپ کی موت ایک بادشاہ کی
موت ہوئی ہوتی۔''22ے

یہ چغتائی بیگم غزل،قصیدہ اور مرثیے کی فنی باریکیوں کو بھی خوب سمجھتی ہیں۔اور جلیل قدر شاعروں کے ساتھ بحث ومباحثہ بھی کرتی ہیں غرض ناول کا بیشتر کردار متحرک اور جیتا جاگتا محسوس ہوتا ہے۔

زبان وبیان: زبان وبیان کے اعتبار سے اگر اس ناول کا جائزہ لیا جائے تو ناول میں جو مخصوص طرز کی زبان استعمال کی گئی ہے وہ قابل توجہ ہے۔قاری اگر صرف ناول کی قرأت زبان کے نقطہ نظر سے کرے گا تو یقیناً قاضی عبدالستار کے ناول کی زبان کی شیرنی سے لطف اندوز ہوگا اور ناول کو پڑھالے جانے کی قوت سے متاثر ہوگا اگر اس ناول کا جائزہ لیا جائے تو ناول میں یہ خصوصیت بہ درجۂ اتم موجود ہے۔

قاری پڑھتے جاتا ہے لطف بیان سے لطف اندوز بھی ہوتا ہے۔عشق عاشقی،شراب وکباب،رقص وموسیقی کے عنوانات کے تحت بہترین جملے تراشے گئے۔تشبیہات واستعارات کے ساتھ اسلوب کی دلکشی ورنگینی متاثر کرتی ہے۔غالبؔ مغلیہ دور کا فرزندہ جلیل تھا اور قاضی عبدالستار زمیندارانہ سماج کے پروردہ اور زبان کی انانیت خود پسندی،موقع ومحل کی مناسبت سے گفتگو تہذیب وتمدن کا خوبصورت بیان قاضی عبدالستار کی خاص ادا تھی۔اس بیان میں اپنے پورے رنگ وآہنگ کے ساتھ موجود ہے۔اقتباس:

''قلم ہمارا کھلونا ہے۔جس سے ہم اپنے دکھ بہلاتے ہیں لیکن تلوار ہماری وراثت کی
نشانی بھی ہے اور آبرو بھی۔''

''دوسترخوان کی شیرنی گھر کے تمدن کی علامت ہوتی ہے۔''

''زندہ قومیں اپنے عروج کے لیے افراد کی لاشوں کا زینہ بنا لیتی ہیں۔''

''غالب تو ایک داغ ہے جسے تم نے اپنے ذہن پر قبول کر لیا۔ایک زخم جو تمہاری آسین پر
لگ گیا۔نہیں تم نے کاغذ کے ایک پھول کو زندہ کر دیا۔تم نے مٹی کے ایک کھلونے میں
روح پھونک دی۔تم جو کچھ ہو زبان اس کا اعلان کرنے سے قاصر ہے۔''23ے

قاضی عبدالستار نے ترک بیگم اور غالبؔ کے معاشقے کا ذکر کرتے ہوئے الفاظ کی ترتیب سے بہترین جملے تراشے ہیں۔

22ے:غالب(ناول)قاضی عبدالستار۔عرشیہ پبلی کیشنز،نئی دہلی۔سن اشاعت:2016ء۔ص:106-105

23ے:غالب(ناول)قاضی عبدالستار۔عرشیہ پبلی کیشنز،نئی دہلی۔سن اشاعت:2016ء۔ص:120-121-158

''تقدیروں کے بننے اور بگڑنے کا وقت مقرر نہیں ہوتا۔'' 24ے

شمس الرحمٰن فاروقی نے قاضی عبدالستار کو Paradox کا بادشاہ کہا ہے ان کے یہاں اسلوب میں رنگینی اور جلاوت جتنی دیکھنے کو ملتی ہے کسی دوسرے نثر نگار کے یہاں مشکل سے نظر آتی ہے۔

قاضی عبدالستار کی زبان کوثر وشبنم سے ڈھلی ہوئی ہے۔ جن سے ہر کوئی استفادہ حاصلہ نہیں کر سکتا۔ زبان کو پڑھنے الفاظ کے معانی ومطالب سمجھنے کے لیے آپ کو لغت کا سہارا لینا پڑے گا۔ فرہنگ کا مطالعہ کرنا پڑے گا۔ تشبیہات واستعارات کے کنوئیں میں جھانکنا پڑے گا۔

''دیکھنا چاہتے تھے کہ یہ تمام روشنیاں آپ کے وجود سے پھوٹتے ہوئے نور کے سامنے کیا حقیقت رکھتی ہیں۔'' 25ے

موقع ومحل برجستہ جملوں کا استعمال قاضی عبدالستار کے بے پناہ صلاحیتوں کا نمونہ ہے۔ جنھیں وہ اسی طرح استعمال کرتے ہیں کہ جملوں کو ہمیشہ کے لیے سجا کر رکھنے اور چوم کر آنکھوں سے لگا لینے کا جی چاہتا ہے۔ 1857 کی تحریک کے بعد غالبؔ کو زندگی کی حقیقت کا ادراک ہوتا ہے اس کو قاضی عبدالستار کی زبان سے سنیے۔

''عرفان ہوا کہ زندگی کی بنیادی ضرورت نہ مذہب ہے، نہ تہذیب، نہ ادب ہے، نہ فن، اگر وہ روٹیاں نصیب نہ ہوں تو دو مٹھی بھنا ہوا اناج ہی سہی۔'' 26ے

نقطہ نظر: جیسا کہ ''گزارش احوال واقعی'' سے واضح ہے کہ یہ ناول عزت مآب صدر جمہوریہ کی فرمائش پر لکھا گیا مگر اس ناول میں قاضی عبدالستار نے اپنے خون جگر سے سینچنے کی کوشش کی۔ یہ الگ بات ہے کہ کوئی تخلیق نقادوں کی توجہ حاصل نہیں کر پاتی مگر اس ناول میں قاضی عبدالستار نے حسن وعشق کے موضوعات سیاسی، سماجی، معاشرتی، تہذیبی عناصر کی بہترین عکاسی کی ہے۔ یہ ایک خاصے کی چیز ہے۔

نئی اور پرانی تہذیبوں کا ٹکراؤ ایک نیا بدلتا ہوا سماج ایک نیا دور، کسی طرح سے فرسودہ نظام پر غالبؔ آتا جا رہا ہے اور فرسودہ سماج کی کھوکھلی سچائیاں اپنے ہی لوگوں کی غداری سے تنگ آ کر خودکشی پر مجبور ہیں۔ نااہل بادشاہ عیش پرست مغل شہزادے جنھیں ہندوستان اپنی پیٹھ پر ڈھو رہا تھا اچانک سے انگریزوں سے آگ، ہوا،

24ے: غالب (ناول) قاضی عبدالستار۔ عرشیہ پبلی کیشنز، نئی دہلی۔ سن اشاعت: 2016ء۔ ص: 30

25ے: غالب (ناول) قاضی عبدالستار۔ عرشیہ پبلی کیشنز، نئی دہلی۔ سن اشاعت: 2016ء۔ ص: 30

26ے: غالب (ناول) قاضی عبدالستار۔ عرشیہ پبلی کیشنز، نئی دہلی۔ سن اشاعت: 2016ء۔ ص: 157

پانی، بجلی، تار، ریل کے ذریعہ عام بوجھوں کو اتار پھینکا۔ اور غالبؔ کو اس کا چشم دید گواہ بنا دیا۔ ایسے میں غالبؔ کا بھی حق تھا کہ دل سے قطع نظر وہ اپنے فہم و ادراک سے کام لیتے ہوئے نئے نظام حکومت کا ساتھ دے اور آنے والے وقت کا خیر مقدم کرے اور پھر یہ آواز ان کے دل سے نکلتی ہے:

''تو یہ ہے وہ نظام حکومت جس کے تم آرزو مند تھے۔ تمھاری تہذیب کے سینے سے جوئے خون بہہ رہی ہے اور اس کا ایک ایک قطرہ تم سے تمہاری دعاؤں کا حساب مانگتا ہے۔ ہر آہ جو کسی دل سے نکلی، ہر فریاد جو کسی جگر سے پھوٹی ان کا کون سا حصہ تمہارے نام سے لکھا جائے۔ یہ پھانسیوں کے چمن یہ سولیوں کے باغ تمہاری چہل قدمی کا انتظار کر رہے ہیں۔ قبرستان جن کے گڑھوں میں زندہ آدمی توپ دیے گئے۔ میدان جوان کو گنت قبروں سے قبرستان ہو گئے طالب ہیں کہ ایک فاتحہ پڑھ کر ان کو نجات بخش دو کہ موجودہ نظام حکومت کے وسیلے سے تم ان کی نجات کے طالب تھے۔ محلوں کو مکانوں سے، مکانوں کو مکینوں سے، بازاروں کو دوکانوں سے، دوکانوں کو خریداروں سے نجات مل گئی کہ تم نجات کے طالب تھے۔''[27]

مغلیہ حکومت کا آنکھوں کے سامنے زوال دیکھ کر کوئی بھی ہمدرد انسان آنسو بہائے گا چاہے آپ کو اپنے وطن کے لوگوں اور حکومت سے سخت اختلاف ہو مگر جب ایک غیر ملکی آپ پر حکومت کرنے لگے تو اس وقت خون کے آنسوں انسان روتا ہے۔

''ہم اپنے اجداد کے بدمستیوں کا خمیازہ بھگت رہے ہیں۔ خرمستیوں کا کفارہ ادا کر رہے ہیں۔''[28]

مگر جب فطرت اپنا رنگ تبدیل کرتی ہے تو وہ آپ کی پسند اور ناپسند نہیں دیکھتی ہے سورج کو غروب ہونا عروج کو زوال ہوتا ہے۔ ازل سے ہوتا آیا ہے کہ جب کوئی حکومت بے حکمت اور ناانصافی سے چلائی جاتی ہے تو اس کا زوال ہوتا ہے اور خدا ایسے لوگوں سے حکومت چھین کر ایسے لوگوں کو حاکم بنا دیتا ہے جو اس لائق ہوتے ہیں کیونکہ حکومت کفر کے ساتھ قائم رہ سکتی ہے۔ ناانصافی اور ظلم کے ساتھ نہیں۔ اس ناول میں باغی سپاہیوں کی حقیقت بیان کی گئی ہے۔ جو گھر میں آئے تھے اور جو کچھ ملتا لوٹ لے جاتے تھے۔

---

[27] غالب (ناول) قاضی عبدالستار۔ عرشیہ پبلی کیشنز، نئی دہلی۔ سن اشاعت: 2016ء۔ ص: 208

[28] غالب (ناول) قاضی عبدالستار۔ عرشیہ پبلی کیشنز، نئی دہلی۔ سن اشاعت: 2016ء۔ ص: 209

انگریزوں کے خوف کا یہ عالم تھا کہ لوگ اپنی عورتوں کو اپنے ہاتھوں سے قتل کر کے کنوئیں میں ڈال دیتے تھے۔ بوڑھے، مرد، عورت، دودھ پیتے بچے سبھی کے خون سے آلودسڑکیں 1857 کی جنگ آزادی کی داستان میں ایک خونی باب کی طرح صفحہ انسانیت پر بدنما داغ کی طرح دکھائی دیتی ہیں۔ اس ناول میں بھی قاضی عبدالستار نے نہایت پرسوز اور کرناک انداز میں یہ خونچکاں داستان بیان کی ہے۔

غالبؔ کی کھلی نظروں نے دیکھا دلی کیسے تباہ و برباد ہو رہی ہے کیسے ولی عہد بادشاہ مغلیہ سلطنت بہادر شاہ ظفر کی دہلی سے دور رنگون لے جایا جا رہا ہے۔ دلی کو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب جس کے لیے لوگ دور دور سے آتے تھے جہاں کے بادشاہ کی اہمیت وعزت پوری دنیا سنتی تھی۔ جیسے نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی نے اپنے خون سے رنگیں ہاتھوں سے اس کے خوبصورت چہرے کو نوچا آج وہاں کا بادشاہ ایک ایسی موت مرنے جا رہا تھا جہاں اسے ایک اندھیری کوٹھری گھوڑے رکھنے کی جگہ اس کا ٹھکانہ بنے گی اور دو گز زمین کے لیے ہمیشہ تڑپے گا جو اسے کوئے یار میں نہ مل سکی۔

اس لیے غالبؔ کو لگتا تھا:

> ''ہندوستان کا مسلمان رجعت قہقری میں مبتلا ہے ایک مدت سے مبتلا ہے برائے نام حکومت کا پردہ پڑا تھا اٹھ گیا۔ سارے داغ دھبے دور سے نظر آتے لگے۔ زوال کی پہچان ہی یہ ہے بڑے بڑے لفظوں کے معانی چھوٹے چھوٹے ہو جائیں اور نظام قدرت یہ ہے کہ تخت چھوٹے ہوں یا بڑے خالی نہیں رہے۔ تو ان تختوں پر چھوٹے چھوٹے معانی رکھنے والے چھوٹے چھوٹے لفظ بیٹھ گئے۔ اس طرح آہستہ آہستہ چھوٹے اور بڑے نیک اور بد خالق اور مخلوق کی تفریق ہونے لگی۔ درجہ بہ درجہ ختم ہونے لگی۔ اس حد تک ختم ہوگئی کہ جو حق کے معانی جانتا بھی ہے وہ اپنے چھوٹے سے ذاتی زبان کے خوف سے خاموش رہتا ہے نہ صرف یہ بلکہ ناحق کو حق مان لیتا ہے اور پھر اپنے مفاد کی حفاظت اور اپنی انا کے تحفظ کے لیے ناحق کی تبلیغ کرنے لگتا ہے۔''[29]

اس ناول پر اقبال مجید نے ''بشری دوستی اور نئی ترقی پسندی'' پر اس کے سوالات قائم کئے ہیں:

> ''ا۔ کیا غالبؔ کے پرآشوب عہد کی تہذیبی، سماجی، طبقاتی اور نفسیاتی الجھنوں کا ادراک یہ ناول کرتی ہے؟

---

[29] غالب (ناول) قاضی عبدالستار۔ عرشیہ پبلی کیشنز، نئی دہلی۔ سن اشاعت: 2016ء۔ ص: 215

۲۔ کیا مصنف اپنے وسیع وژن کے ساتھ ایک عمیق اور حساس بیانیہ کی تشکیل کر کے اسے وہ صنفی وقار عطا کر سکے گا جس کی ایک اچھی ناول مستحق ہوتی ہے۔

۳۔ کیا مصنف ذہن اور باخبر قاری کو ناول کی قرأت کے درمیان اس کا حصہ اسی طرح دیتا رہتا ہے جس طرح سرکس میں کرتب دکھانے والے گھوڑے کو اس کے ہر کرتب کے بعد گڑ کا نوالی دیا جاتا ہے۔

۴۔ کیا غالب کی زندگی اور شخصیت کو دیدہ وری اور شدت احساس کے ساتھ پیش کرنے اور قاری کو اس کے روایتی اور بندھے ٹکے ذوق سے نکال کر ناول اپنی بنائی ایک نئی دنیا کی سیر کرائے گی؟

۵۔ کیا قصے میں بیان کیے گئے واقعات غالبؔ کی شخصیت اور زندگی کی مختلف الجہاتی حقیقتوں کا ادارک کرائیں گے اور واقعات کے محرکات کی اندورنی تہوں میں جس تہذیبی اتھل پتھل، شکست اقدار کی بے بسی اور زوال آمادہ Power Structure کی سسکتیاں پائی جاتی ہیں وہ ناول کے قالب اختیار کر کے اپنا تاثر قائم کر سکیں گے؟

۶۔ کیا ناول میں غالب اردو کی ادبی تاریخ کی ایک شخصیت کا نام ہوگا یا وہ ایک نقطہ نظر اور ایک فنی ومعروضی تلازمہ بنے گا جس کے حوالے سے بقول عتیق اللہ ہم ایک ان کہی اور ان لکھی تاریخ سے متعارف ہوتے ہیں۔'' 30؎

وارث علوی قاضی عبدالستار کے فن پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

'' حقیقت پسند اس معنی میں ثروت مند ہے کہ اس کا تخلیقی وجود کبھی کم نہیں ہوتا اور تجریدی، علامتی، تجرباتی، تاریخی اور تہذیبی والوں کی طرح چند افسانوں ناولوں میں کھک نہیں ہوجاتا ورنہ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ چار معنی خیز اور اہم ناولٹ لکھنے کے بعد قاضی صاحب نے غالب، حضرت جان اور تاجم سلطان جیسی ہر لحاظ سے بے ہودہ ناولیں کیسے لکھیں۔ مجھے ان کی عریانی اور فحاشی پر کوئی اعتراض نہیں کہ میں ایروٹیکا کا بہت دلدادہ ہوں کہ وہی وہانوی کے انداز میں نہیں لیکن کاماسوتر کے انداز میں انگیا کے بند تڑخنے اور بیلا کے پھول کھلنے کی کوئی داستان رقم ہوں۔'' 31؎

30؎: بشریٰ دوستی اور نئی ترقی پسندی۔ اقبال مجید۔ عرشیہ پبلی کیشنز، نئی دہلی۔ سن اشاعت: 2014ء۔ ص: 85-84

31؎: گنجفہ باز خیال۔ وارث علوی۔ عرموڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی۔ سن اشاعت: 2007ء۔ ص: 12

قاضی عبدالستار کا لکھا گیا ناول اگر چہ ہر اعتبار سے مکمل نہیں ٹھہرایا جا سکتا ہے مگر اس ناول کی زبان و بیان اور اسلوب کے فکر و فلسفہ کے ذریعہ ایک نئی جہان معنی کی سیر کراتا ہے اور غالبؔ کی شخصیت کے کچھ نئے عنوانات کو سامنے لاتا ہے۔

باب پنجم

قاضی عبدالستار کی غیر افسانوی نگارشات کا
تنقیدی جائزہ

قاضی عبدالستار کی غیر افسانوی نگارشات کا تنقیدی جائزہ

باب پنجم'' قاضی عبدالستار کی غیر افسانوی نگارشات کا تنقیدی جائزہ'' سے مختص ہے۔قاضی عبدالستار کی اہمیت فکشن کے میدان میں مسلم ہے۔وہ ایسے فکشن نگار ہیں جن کی اہمیت کا اعتراف ان کے دشمنوں کو بھی ہے۔عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ تخلیق کار دوسری اصناف کی طرف خصوصاً غیر تخلیقی اصناف پر توجہ نہیں دیتے۔یہ بہت حد تک سچ بھی ہے مگر قاضی عبدالستار نے فکشن کے علاوہ شاعری اور تنقید پر بھی طبع آزمائی کی ہے۔ان کی کتابیں بتاتی ہیں کہ وہ گہرا تنقیدی شعور رکھتے ہیں اور دوسروں کی تحریروں کو بھی سنجیدگی سے پڑھتے اور پرکھتے ہیں۔''اردو شاعری میں قنوطیت''،''جمالیات اور ہندوستانی جمالیات'' اس کی واضح مثالیں ہیں۔

شاعری بھی انھوں نے اچھی کی۔یہ اور بات ہے کہ ادھر زیادہ توجہ نہ کر سکے۔اگر وہ جاری رکھتے تو اس میدان میں بھی کسی سے پیچھے نہ رہتے۔میری تحقیق اور تلاش کے بعد''شاہراہ'' میں چھپی ان کی پہلی ادبی اور مشہور نظم''گومتی کی آواز'' کو مقالے میں شامل کیا گیا ہے۔ساتھ ہی قاضی عبدالستار کی منتشر غزلوں اور نظموں کو مقالے میں یکجا کرنے کی حتی الامکان کوشش کی گئی ہے جو مختلف مؤقر رسائل وجرائد میں شائع ہو رہی تھیں۔

اس تحقیقی مقالے میں قاضی عبدالستار کے اس اکلوتے تبصرے کو شامل کیا گیا ہے جو انھوں نے ''نکہت شاہجہاں پوری'' کی کتاب''مجاز اور عشق'' پر لکھا تھا جو''ہماری زبان'' میں شائع ہوا تھا۔عمر کے آخری ایام میں لکھے گئے''خورشید اکبر کے نام ذاتی خط'' کو بھی جگہ دی گئی تا کہ قاضی صاحب کی زندگی کے ہر گوشے کو سیراب کیا جا سکے۔

قاضی عبدالستار نے مختلف شخصیتوں کو مختلف انٹرویو بھی دیے اور بحث ومباحثے میں بھی حصہ

لیا ہے۔اس بات کی حتی الامکان کوشش کی گئی ہے کہ ان کی ادبی نگارشات کے ساتھ ساتھ ان تمام متفرق موضوعات پر لکھے گئے مضامین کو یکجا کیا جائے تا کہ ایک بڑے مصنف پر لکھے گئے تحقیقی مقالے کا حق ادا ہو سکے۔اوران کی حیات و کائنات کے تشنہ گوشوں سے ادب کی دنیا کو روشناش کرایا جا سکے۔

☆☆☆

غالب کا غم

یہ مضمون علی گڑھ میگزین میں 1959 میں سید حسن مثنیٰ کے زیر صدارت شائع ہوا۔ اس مضمون کو قاضی عبدالستار نے جامع اور پر مغز انداز میں لکھا ہے۔

جن مصنفوں اور ادیبوں نے غالب کو نشاطیہ شاعر کہا ہے ان سب کے نظریے کا اختلاف کیا ہے اور غالب کے بچپن سے لے کر قلعۂ معلیٰ اور پھر ہندوستان کی جنگ آزادی تک جو اثر پڑتا رہا اس کا خوبصورتی سے ذکر کیا اور اس بات کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ غالب کی زندگی دکھوں اور غموں سے بھری ہوئی تھی۔ انھوں نے اپنی پوری زندگی الگ الگ غموں سے نبرد آزما ہوتے ہوئے گزاری۔

حالؔی نے غالب کو حیوان ظریف کہا ہے۔

نیاز فتح پوری نے کہا اگر غالب کی شاعری سے کوئی فلسفہ مستنبط کیا جا سکتا ہے تو وہ فلسفۂ تفاول و مسرت ہے۔

ڈاکٹر عبداللطیف نے ان کی زندگی کو معاشی آسودہ بتایا۔

شیخ اکرام نے ان کی زندگی کو کامیاب زندگی بتایا ہے۔

غرض ان تمام ادیبوں کے کلام سے قطع نظر قاضی عبدالستار نے لکھا ہے کہ کسی فنکار کے فن کی بنیادی باتوں کا سراغ لگانے کے لیے تین باتوں کو دھیان میں رکھنا چاہیے۔

پہلی بات کہ اس کی اپنی زندگی جس کے چھوٹے بڑے اور اچھے برے تجربات کے آئینے میں وہ اپنے نقش کے گیسو سنوارتا ہے۔

دوم اس کے عہد کی تہذیب وسیاحت جس کا نور اور جس کی ظلمت اسے مواد کا حریر دورنگ دیتی ہے۔

سوم اس کی تقدیر میں آیا ہوا فکری ورثہ جو ایک طرف اسے روایات کے ردوقبول کا شعور دیتا ہے

اور دوسری طرف اس کے ذہن کے دریچوں کو وا کرتا ہے۔

پھر انھوں نے غالب کی ذاتی زندگی کے دکھوں کا ذکر کیا ہے جس میں ان کے چچا کی موت نے ان کی یتیمی کے دکھوں کو اور گہرا کر دیا اور ننھیال میں لاکھ عیش و عشرت ہو مگر ایک زخم ہوتا ہے جو زندگی میں کجی پیدا کرتا ہے وہ دور جو جاگیردارانہ انحطاطی دور تھا۔ غم کا نام غربت ہی نہیں ہے۔ خام عمر میں بھی ان کے حساس دل پر ماں کی عسرت اور اپنی بیچارگی ڈنک مارتی رہی ہو اور ننھیال سے بخشش میں آئی ہوئی مادی عشرت اس زہر سے سوتلاتی رہی ہو۔ غالب نے اس لیے اپنی زندگی کو ''حبس دوام'' کا لقب دیا ہے۔

قاضی عبدالستار نے غالب کی ذاتی زندگی اور ان کی بیوی امراؤ بیگم پر بھی لکھا ہے۔ لکھتے ہیں:

''غالب کی ازدواجی زندگی میں لاعلمی کا پردہ پڑا ہے۔ خطوط کے آئینے میں امرا بیگم کا عکس ''بیڑی اور بلا'' کے روپ میں ابھرتا ہے۔ ہر چند یہ بیان ظرافت کے پیرائے میں ہے تاہم اسے جسم کا نشاط اور روح کا چین نہیں کہا جا سکتا۔ اس کے علاوہ یہ بات قرین قیاس اس لیے ہے کہ ایک عمر کے بعد تنہائی کی شدت سماجی رفاقت کی محرومی کو جان لیوا بنا دیتی ہے۔ اس وقت ناگوار بیوی بھی گوارا ہو جاتی ہے۔ غالب کے ساتھ ایسا نہیں ہوا امراؤ بیگم تو غالب کی جنسی کمزوری اور اوباش زندگی کے لیے زنجیر کا حکم رکھتی ہوں گی۔ غالب کا آزاد اور حساس دل ذمہ داری کے بار سے بوجھل ہو گیا ہوگا۔ اس عالم میں امراؤ بیگم تو کیا کوئی حور بھی ہوتی تو غالب اسے ''بیڑی اور بلا'' سمجھ بیٹھتے۔''[1]

اس کے وہ پدری شفقت سے بھی محروم رہے جس کو پالا وہ بھی داغ مفارقت دے گیا۔ ازدواجی زندگی اور بھی مشکل ہو گئی۔ گھر میں خاک اڑتی رہی۔ غالب نے کھل کر اس کا اظہار نہیں کیا مگر گھر کی ویرانی اور وحشت پر ماتم کیا ہے۔ غالب کی تحریروں میں ان کی ازدواجی زندگی کی ناکامی کا کوئی نشان نہیں ملتا ہے۔ پنشن جوان کی زندگی کا ماحصل تھی پوری زندگی اس کے لیے تگ و دو کرتے رہے۔ پھر غدر نے رہی سہی کسر پوری کر دی۔ وہ زندگی بھر تنگ دست رہے۔ قلعہ کی زندگی جہاد بہادر شاہ ظفر جیسا ادب و شاعری کا دلدادہ بیٹھا تھا اس کے نزدیک ذوق نے ایک خط قائم کر دیا تھا جس کو توڑنا غالب کے لیے آسان نہیں تھا۔ پھر قاضی عبدالستار نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ غم روزگار کی یہ لہر صرف غالب کی زندگی پر ہی کیوں پڑی اور انھوں نے اس

1۔ مضمون غالب کا غم۔ قاضی عبدالستار۔ مشمولہ۔ علی گڑھ میگزین۔ مدیر سید حسن مثنیٰ انور۔ علی گڑھ پریس۔ 1956۔ ص: 97

جواب میں مومنؔ کی زندگی اور ذوقؔ کے احوال کا ذکر کیا ہے جو معاشی طور پر آسودہ تھے جن کے پاس شاعری کے علاوہ دوسرے بھی ذریعہ مُعاش تھے۔

اسی معاشی ناآسودگی نے انھیں تصوف کے انداز راہ پر ڈالا۔ عشق مجازی کی ناکامی بھی ان کے مقدر میں تھی لکھتے ہیں کہ اگر وہ اپنی جذباتی دنیا میں کامیاب ہو جاتے تو ان کی ہستی کے داغوں میں سے ایک داغ کم ہو جاتا۔

قاضی عبدالستار نے یہاں لکھا ہے کہ ان کے دیوان میں ایسے اشعار کا فقدان ہے جس کو ہم مکمل نشاطیہ اشعار کہہ سکتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

> ''غالب کے دیوان میں ایسے اشعار کا فقدان ہے جن کو ہم مکمل طور پر نشاطیہ اشعار کہہ سکیں۔ وہ نشاطیہ کی یاد کا طلسم باندھتے ہیں نشاط کی حسرت کرتے ہیں اور نشاط کے خواب دیکھتے ہیں لیکن نشاط انھیں نصیب نہیں ہوتا۔ وہ غمزدہ دل لے کر نہیں پیدا ہوئے ورنہ غم کے زانو پر انھیں نیند آجاتی وہ ساری عمر بےقرار رہے۔ مضطرب رہے جب بھی کوئی زنجیر ڈھیلی ہوتی یا کوئی راہ مل جاتی وہ فرار ہو جاتے لیکن غم انھیں دبوچ لیتا۔ غالب کا تشکک ان کے غم کی پیدا کردہ بےقراری کا فلسفیانہ نام ہے۔ غم کی یہ بےقراری انھیں عقائد کے بازار میں کشاں کشاں لیے پھرتی ہے۔ طمانیت کی ایک کرن کی امید میں وہ میلوں بھاگتے ہیں لیکن دشت ہستی کا سراب ان کی تشنہ لبی کا درماں نہیں بنتا۔''[2]

غرض مادی ضرورتوں کی ناتکمیلی صرف اسے عقائد پر لے جاتی ہے جہاں دوسری دنیا اور آنے والی زندگی جنت اور صبر سے انتظار کرنا اور مقدر پر اطمینان کرنے کا فلسفہ سکھایا جاتا ہے مگر غالب کو وہاں بھی چین وسکون نصیب نہیں ہوا۔ اس نے اپنے دل کو بہلانے کے لیے کہا ؎

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کو خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

خدا کا تصور جو بڑے بڑے غموں کو ہلکا کر دیتا ہے۔ غم کا یہ اضطراب ان کی ساری زندگی پر محیط رہا۔ وہ تصوف کے فلسفی تھے مگر استغنا و قناعت سے عاری تھے۔ قلعہ مبارک جب ویران ہوا تو غالب نے بلا تکلف

2؎ مضمون غالب کا غم۔ مشمولہ۔ علی گڑھ میگزین۔ مدیر سید حسن مثنیٰ انور۔ علی گڑھ پریس 56-1955۔ ص: 97

اسے ''قلعہ نامبارک'' کا لقب دیا۔

غرض اس مضمون میں قاضی عبدالستار نے غالب کی غم بھری زندگی کو پیش کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ جن حضرات نے غالب کو نشاط و مسرت کی نظر سے دیکھا انھوں نے غالب کے صرف ایک پہلو یا چند مذاقوں کو نظر میں رکھا۔ اگر غالب کی زندگی کو باریکی سے دیکھا جائے تو وہ ہمیشہ ایک غم سے دوچار رہے اور اپنا غم دور کرنے اور نشاط کی جستجو میں وہ سب کیا جو ایک عام انسان کرسکتا ہے مگر وہ اپنی تقدیر لکھنے سے معذور تھے۔ اس طرح ان کے کلام میں جو آہنگ ملتا ہے وہ غم انگیز ہے۔ تاہم یہ غم ان کی صرف ذات کا رونا نہیں بنتا بلکہ غم کائنات بن جاتا ہے۔ انھوں نے انسانیت کو غموں اور دکھوں میں دیکھا۔ غالب نے جنگ آزادی کا زمانہ دیکھا وہ زمانہ جو ہندوستان کی تاریخ میں سب سے زیادہ پر پیچ اور نازک تھا اس لیے غالب نے کہا۔

کون ہے جو نہیں ہے حاجت مند
کس کی حاجت روا کرے کوئی

غالب فہمی میں یہ مضمون اہمیت کا حامل ہے، جس کو قاضی عبدالستار نے اپنے خوبصورت انداز و بیان سے لکھا ہے جو مطالعہ غالبؔ کے نئے در وا کرتا ہے اور غالبؔ تنقید پر ایک نیا نقطۂ نظر پیش کرتا ہے۔

☆☆☆

مجاز اور عشق

یہ قاضی عبدالستار کا ایک تنقیدی مضمون ہے جو علی گڑھ میگزین میں 56-1855 میں شائع ہوا۔ اس وقت قاضی عبدالستار شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ریسرچ اسکالر تھے۔ یہ میگزین مجاز نمبر کے لیے مختص تھا۔ جس کے ایڈیٹر عبدالحفیظ صدیقی تھے۔

قاضی عبدالستار کو مجاز سے بہت زیادہ انسیت تھی اور کافی وقت انھوں نے لکھنؤ میں محفلوں میں ساتھ گزارا وہ زمانہ مجاز کے عروج کا تھا جہاں مشاعرہ میں مجاز کا نام سنتے ہی دھڑکنیں تیز اور رات ٹھہر جاتی تھی۔ مجاز کے ساتھ قاضی صاحب کے کچھ گھریلو تعلقات بھی تھے جس کا ذکر 'مجاز اور لکھنؤ' میں کیا ہے اور قاضی صاحب اکثر یہ کہتے دکھائی پڑتے ہیں کہ جو مجاز کا لکھنؤ تھی وہی میرا بھی لکھنؤ ہے جہاں قاضی صاحب کو عشق تھا ویسے ہی ان کے یہاں اس عشق کا ذکر مکمل نہیں ہوتا جب محبوب مجاز ہو۔ اس مضمون میں بھی انھوں نے مجاز کا ذکر نہایت معنیٰ خیز انداز میں کیا ہے جس نے ایک اردو ادب کی تاریخ میں ایک نیا باب رقم کیا:

> ''انسان کی کوئی نسل خالی الذہن اور سادہ دماغ نہیں پیدا ہوئی لیکن ادبیات کی تاریخ میں ایسی عہد آفریں نسلوں کا فقدان نہیں ہے جنھوں نے اپنے ادبی ورثے کو نئی دنیاؤں کے تاج پہنائے ہوں۔ جب اردو ادب کی تاریخ لکھی جائے گی تو مجاز کی نسل بھی ایسی ہی مقتدر اور خلاق نسلوں کی فہرست میں مرقوم ہوگی جس عہد میں اس نوجوان نسل نے اپنی میراث میں پائی دنیا سے نکل کر نئے جہانوں کی تسخیر کر عزم کیا اور اپنے کاندھوں پر نئے ادبی پرچم سجائے۔'' [3]

قاضی عبدالستار مقالے میں لکھتے ہیں کہ اردو شاعری میں مارکسی نظریہ ادب برائے زندگی نیا ہے بلکہ اردو شاعری اپنی روایت سے ہی دربار سے زیادہ بازار اور خانقاہ سے منسلک رہی ہے جہاں انسانی زندگی کے دکھ درد، تکلیفوں، مصیبتوں، شکستوں اور ناکامیوں سے بھری پڑی ہے اور اردو شاعری کی زبان اتنی ہمہ گیر اور

3: مضمون مجاز اور عشق۔ قاضی عبدالستار۔ مشمولہ۔ علی گڑھ میگزین مجاز نمبر، ایڈیٹر عبدالحفیظ صدیقی 56-1955، ص: 77

وسیع ہے کہ کوئی بھی موضوع آسانی سے سما سکتا ہے مگر وقت کے ساتھ یہ موضوع کہیں کھو گیا تھا اور چھوٹے عشق ومحبت ،آہ ونالے ، مدح سرائی کی وجہ سے کہیں گم ہوگیا جس کا سب سے پہلے ادراک حالی نے کیا اوراس کوعفونت سے دور کرنے کی کوشش کی اور پھر اقبال نے اس میں فکر وفلسفہ کا محل تیار کیا مگر سب سے زیادہ جس شاعر نے اور شدت اور کامیابی کے ساتھ ادب برائے زندگی کے نظریہ کواردو شاعری میں پیش کیا وہ مجاز کی نسل ہے۔قاضی عبدالستار اس نظریے کوادب کے لیے اہم اور پاک خدمت گردانتے ہیں۔

جہاں فیض جیسے شاعر نے مجاز کو انقلاب کا مطرب کہا۔اثر لکھنوی نے کہا کہ ادب میں ایک کیٹس پید اہوئے تھا جسے ترقی پسند بھیڑیے اٹھالے گئے۔اس بات پر قاضی عبدالستار لکھتے ہیں:

> ''اردوادب کے کیٹس کو بھیڑیے اٹھالے گئے یا وہ بھیڑیوں ہی کے لیے پیدا ہوا تھا بحث طلب موضوع ہے۔'' 4

مجاز کی شاعری میں جہاں ترقی پسندیت کا عنصر تھا وہیں انھوں نے رومانیت کا بھی پیرائے اختیار جس نے ایک پوری نسل کے ذہنی رویہ میں خوبصورت بدلاؤ کیا تھا جہاں عصر جدید کے شعرا نے اسی مقدس آتش خانے سے اپنے نغموں کے لیے سوز چرایا ہے۔رومانیت کے تعلق سے لکھتے ہیں:

> ''رومانی کا حسین تخیل اور شدید احساس اپنی مجنوں آرزو کی اسیری میں کبھی روایت کے خواب دیکھتا ہے اور کبھی انفرادیت کے ہاتھوں مجبور ہوکر کسی ایک مروجہ اخلاقی یا سیاسی نظام اقتدار کے خلاف اعلان جنگ کرتا ہے۔اس کی بے چین تخئیل اور فطری اداسی ان قدسیوں کے شبستانوں میں کج کلاہی کے خواب دیکھتی ہے جن کے ذکر سے اس کی مادہ زبان جلتی ہے جب سنگین حقیقتوں کے ٹھوکر سے اس کے ذہنی نگار کے شیشے کھلونے کی طرح ٹوٹ جاتے ہیں تو اس کے لہجے کی تلخی تخئیل کی پرواز اور جذبے کی شدت اور تیز ہوجاتی ہے۔یہ محض اتفاق نہیں ہے کہ رومانی کے ایک ہاتھ میں خون آلودہ شمشیر کا قبضہ نظر آتا ہے اور دوسرے میں کسی قتالہ عالم کا دست حنائی۔'' 5

قاضی عبدالستار نے مجاز کی شاعری میں رومانی پہلوؤں کو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے انھیں صرف ترقی پسند شاعر نہ سمجھ کر ان کے یہاں رومان کا جو ایک نازک احساس ملتا ہے اس کی تشریح کی ہے جہاں عشق

4: مضمون مجاز اور عشق قاضی عبدالستار مشمولہ۔علی گڑھ میگزین مجاز نمبر،ایڈیٹر عبدالحفیظ صدیقی 56-1955،ص:77

5: مضمون مجاز اور عشق قاضی عبدالستار مشمولہ۔علی گڑھ میگزین مجاز نمبر،ایڈیٹر عبدالحفیظ صدیقی 56-1955،ص:80

رومان ایک لطیف احساس میں بدلتا ہے۔جس کی وجہ محمد حسن نے مجاز کے بارے میں کہا کہ وہ قرون وسطیٰ کا نائٹ ہے جو نرم میں خم لنڈھاتا ہے اور رزم میں کفن پوش رہتا ہے۔

مجاز جو ایک رومان اور عشق کا حسین امتزاج تھا وہ بھی سوزفکر کے ہاتھوں مل جاتا ہے۔کیونکہ اس کے خیالوں کی شہناز غیر مساویانہ طبقاتی تقسیم کے آہنی قلعوں میں اسیر ہے۔جس کی وجہ سے وہ کچھ نہیں کرتا ہے آخر کار نرغۂ باطل میں لڑتے لڑتے جان دینے کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہیں ہے اس لیے قاضی عبدالستار لکھتے ہیں۔مجاز کی شاعری میں عشق پر شرمندگی نہیں ملتی حالانکہ ان کے اکثر ہم عصروں نے اپنی محبوباؤں سے جنگ کی آگ میں کودنے کی اجازت مانگی ہے اور یہی وجہ ہے کہ مجاز کی نظمیں پڑھ کر اس کے عشق پر ترش نہیں آتا بلکہ رش رہتا ہے۔غرض یہ مضمون قاضی عبدالستار نے مجاز کی عشقیہ شاعری پر مرکوز کیا ہے زبان اور اسلوب کے لحاظ سے بہترین انداز میں لکھا گیا ایک معنیٰ خیز اور عمدہ مضمون ہے جس کی زبان کسی ماہر زبان اور اسلوب نگار سے چغلی کھاتی ہے جبکہ جس وقت یہ مضمون لکھا گیا اس وقت قاضی صاحب صرف ایک ریسرچ اسکالر تھے۔

سرسید کا اسلوب

یہ ایک مختصر مضمون ہے جو نذر قاضی عبدالستار میں شامل ہے وہیں سے استفادہ کر کے اس مضمون پر تحریر رقم کی جارہی ہے۔اس مضمون میں قاضی عبدالستار نے سرسید کے صاف اور سلیس اسلوب پر بات کی ہے۔

سرسید ایک نابغۂ روزگار شخصیت تھے۔سرسید جیسی کسی ہستی کا پیدا ہونا کسی ملک یا قوم میں فخر کی بات ہوتی۔زمانہ ہزاروں سال گردش کرتا ہے تب ایسی شخصیتیں پیدا ہوتی ہیں۔اپنے افکار و خیالات اور علم و اعمال سے پوری نسل کو کسب فیض عطا کرتی ہیں۔قاضی عبدالستار سرسید کے بارے میں رقم طراز ہیں اور انھیں ان الفاظ کے ذریعہ خراج تحسین پیش کی ہے:

> ''انقلاب 1857 کے پٹے ہوئے، ہارے ہوئے مسلمانوں کے لیے سرسید ایک مسیحا کی طرح نازل ہوئے جنھوں نے مسلم یونیورسٹی کو ایک آیت نجات کی طرح آسمان سے اتارا۔مسلم یونیورسٹی محض ایک یونیورسٹی نہیں ہے، ایک نسخۂ کیمیا ہے، جس کے دامن شفا پر ہندوستانی مسلمانوں کے مستقبل کی کئی صدیاں آباد ہیں۔مسلم یونورسٹی وہ کاسۂ زریں ہے جس کے حاشیوں پر قرآن پاک کی آیتیں کندہ ہیں۔'' [6]

سرسید نے جہاں مسلم یونیورسٹی سے ہندوستان کو ایک نسخۂ کیمیا تھما دیا وہیں زبان و ادب کے سلسلے میں وہ کارنامہ انجام دیا جو ایک صدی تک ناممکن تھا۔انھوں نے اردو زبان کو روایتی جکڑ بندیوں سے آزاد کرایا اور ایک ایسی روایت کو پروان چڑھایا جہاں زبان صرف وسیلہ حسن و عشق نہ بنے جو افیون کھلا کر نیند میں نہ لے جائے بلکہ وہ ہمیں جاگنا سکھا دے۔

اس مضمون میں سرسید کے سادہ اور سہل اسلوب کی ممکنہ اور جامع تعریف کی ہے ساتھ ہی اس سادگی

6: مضمون سرسید کا سلوب۔مشمولہ۔نذر قاضی عبدالستار۔مرتب پروفیسر غیاث الدین۔ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، اشاعت: 2006۔ ص: 504

میں جوحسن تھا جو پرکاری جو دلکشی تھی اس کا بھی اشارہ کیا ہے۔ سرسید کے اسلوب کو قاضی صاحب نے بنیادی اسلوب سے یاد کیا ہے۔ بنیادی اسلوب کی تعریف اس زبان سے کی ہے جو موجود اور امکان اسالیب پر حاوی ہوتا ہے جہاں مصنف کسی ایک خاص اسلوب میں نقطۂ کمال تک نہیں جاتا مگر شفق کے سات رنگوں کے دھندلے رنگ اس میں پائے جاتے ہیں اور اس تعریف کی روشنی میں انھوں نے آثار الصنادید سے لے کر خطبۂ لاہور تک کے تجزیے کی بات کی ہے جس میں کہیں رجب علی بیگ سرور تو کہیں میر امن اور کہیں مکاتیب غالب کی پرچھائیاں دکھائی دیتی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی مولانا محمد حسین آزاد اور شبلی کی گرج اور حالی کی سادگی بھی نظر آتی ہے۔ قاضی عبدالستار نے سرسید کو صلاح الدین ایوبی ،خالد بن ولید کی فہرست میں رکھا ہے، جنھوں نے مٹی کو بھی ہیرا بنا دیا اور ایسے لوگ صرف ہماری قوم میں ہی میسر آئے ہیں اور انھوں نے یہ خواہش ظاہر کی ہے کہ کاش ہندوستانی مسلمانوں کو نہیں بلکہ پوری دنیائے اسلام کو ایک صرف ایک سرسید میسر آ سکتا۔ سرسید کو خراج تحسین ان خوبصورت اور معنیٰ خیز الفاظ میں دیا ہے:

> ''سرسید کی پیروی اس لیے بھی مشکل ہے کہ ان کی جہات انگنت ،ان کا خواب بیکراں، ان کی منزلیں بے حساب۔ ابوالکلام آزاد' الہلال' کے باوجود سرسید سے مختلف رہے۔ محمد علی جوہر اور ان کے قبیلے کے بڑے بڑے نام سرسید سے فروتر ہیں۔ اس لیے ان کے قلم کی روشنائی سرسید کے فراخ سینے میں دہکتے ہوئے جوالامکھی کی ایک کرن کا محض ایک جواب تھی۔ سرسید کو محض ان کی ماں نے پیدا نہیں کیا تھا بلکہ سرسید ایک ''جلیل الشان تہذیب'' ایک ''عظیم الشان تمدن'' کے بے مثال ادبار و انحطاط کی کوکھ سے پیدا ہوئے تھے اس لیے آج تک اردو کا کوئی ادیب، کوئی صحافی، کوئی دانشور، کوئی دردمند اور کوئی سپاہی ان کے گھٹنوں تک بھی نہیں پہنچ سکا ہے۔'' 7

اس مقالے میں قاضی صاحب نے سرسید کے اسلوب پر اپنے جلیل و جمیل اسلوب کے ذریعہ صاف اور شفاف روشنی ڈالی ہے۔ کاش اس مضمون کو تھوڑا اور طویل لکھتے تو یہ مضمون سرسید شناسی میں ایک اہم باب ہوتا۔

☆☆☆

7: مضمون سرسید کا سلوب۔ مشمولہ۔ نذر قاضی عبدالستار۔ مرتب پروفیسر غیاث الدین۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، اشاعت: 2006۔ص:506

فن افسانہ نگاری

یہ مضمون قاضی عبدالستار نے فن افسانہ نگاری کے موضوع پر لکھا جو نذر قاضی عبدالستار میں شامل ہے۔ قاضی صاحب نے افسانہ کے معلق کچھ ایسے نظریات کا اظہار کیا ہے جو ادبی دنیا میں نہایت مشہور و مقبول ہیں۔ افسانہ نگاری ایک ایسا فن ہے جو دوسرے فن سے یکسر مختلف ہے۔ قاضی عبدالستار کے مطابق اکثر لوگ افسانے کو ناول کی ایک چھوٹی تصویر سمجھتے ہیں مگر یہ ایک فطری غلطی ہے۔ افسانہ ناول سے اتنا ہی مختلف ہے جتنا ڈرامہ یا شاعری سے اور افسانہ کو ناول کے میزان پر تولنا ہی غلط ہے جتنا پریم چند کا غالب سے مقابلہ کرنا۔

قاضی عبدالستار نے نہایت باریکی سے یہ بات بتانے کی کوشش کی ہے کہ افسانے لکھنا تمام اصناف ادب لکھنے سے مشکل کام ہے کیونکہ اس کی ابتدا محدود ہے اور کرداروں میں زندگی پیدا کرنا کہانی کو کہاں اور کس طرح کھولنا ہے اور کہاں عروج پر پہنچنا ہے اور پھر افسانے کو اسی خوبصورتی سے سمیٹ لینا یہ سب دس ہزار الفاظ کے آس پاس یہ افسانہ نگار کے لیے ایک مشکل شرط ہوتی ہے۔

جدیدیت کے دور عروج میں جس طرح بغیر تکنیک کے ناول لکھے گئے اس طرح کے افسانے لکھنا مشکل ہے اور پھر لکھتے ہیں:

> ''ایک بہترین افسانے کی تکنیک چاول پر قل ہواللہ لکھنے جانے کی تکنیک ہے۔ یہ اس لیے کہ تکنیک کے بغیر افسانہ ایک ڈھیلی ڈھالی غزل ہو کر رہ جائے گا۔'' 8

ایک افسانہ لکھنا پھر اس کو فنی تناسب کے ساتھ پیش کرنا یہ کسی تلوار کی دھار پر چلنے کے مترادف ہوتا ہے جب کہ ناول نگار ضخامت کے پردے میں پیچھے آسانی سے چھپ جاتا ہے۔

قاضی عبدالستار لکھتے ہیں کہ افسانہ لکھتے وقت اگر افسانہ نگار سے کوئی ایک لفظ بھی غلطی سے لکھ گیا تو وہ

8: مضمون فن افسانہ نگاری۔ نذر قاضی عبدالستار۔ مشمولہ۔ نذر قاضی عبدالستار۔ مرتب پروفیسر غیاث الدین۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، اشاعت: 2006 نئی دہلی، ص: 508-507

لغزش کا مرتکب ہوگا جس سے افسانہ زخمی ہو جاتا ہے۔اس لحاظ سے دیکھا جائے تو افسانہ لکھنے کا فن ناول لکھنے سے زیادہ مشکل ہے۔

کہتے ہیں کہ افسانے کی طوالت اتنی ہونی چاہیے تھا کہ ایک نشست میں ختم کرلیا جائے۔ایک مجموعی تاثر ہونا چاہیے ساتھ ہی بالکل گٹھا ہوا ہونا چاہیے۔پھران تینوں پر انھوں نے تفصیلی بات کی ہے۔

گٹھاؤ تناسب،Fjnality، پلاٹ، کردار، تفصیل Detail،ڈائیلاگ، اسٹائل، ناول اور افسانہ طویل واختصار۔وحدت تاثر۔

گٹھاؤ کے بارے میں قاضی عبدالستار نے لکھا ہے افسانے کا گٹھاؤ کسی ملکۂ حسن کی طرح اس کا جسم نئی بنی ہوئی چارپائی کی طرح تنا اور گٹھا ہونا چاہیے۔کسی کردار یا کسی واقعہ میں کوئی جھول نہیں ہونا چاہیے۔

تناسب کے بارے میں قاضی عبدالستار کا خیال ہے کہ افسانہ کے لحاظ سے بہترین ہونا چاہیے اورحقیقت پر مبنی ہونا چاہیے۔ان کے خیال کے مطابق آج کل جو افسانے شائع ہوتے ہیں ان کا پلاٹ بوڑھوں کے گوشت کی طرح ڈھیلا ہوتا ہے۔کردار لنگڑے ہوتے ہیں اور ڈائیلاگ ہکلاتے ہوئے معلوم ہوتا ہے۔طرز بیاں مجذوب ہوتا ہے۔

قاضی عبدالستار نے افسانے کے متعلق جو اظہار خیال آج سے ساٹھ سال پہلے کیا ہے اگر ان کے اس تنقیدی نظریے پر نظر ڈالی جائے یہ بات صادق آتی ہے جو آج کل افسانے اور جس طرح کے افسانے لکھے جاتے ہیں وہ پلاٹ میں تناسب اور کردار کے لحاظ سے نامکمل ہوتے ہیں۔طرز بیاں بھی سطحی ہوتا ہے۔زبان وبیاں میں کوئی دلچسپی نہیں ملتی ہے۔

پلاٹ کے متعلق بھی اپنے نظریات کا اظہار کیا ہے۔کہتے ہیں کہ افسانہ نگار کا پہلا فرض پلاٹ کی جستجو ہے۔پلاٹ کسی واقعہ کو بنیاد بنا کر بنایا جاتا ہے۔افسانہ محدود ہوتا ہے اس لیے اس کے پلاٹ بھی محدود ہوتے ہیں۔کہانی کا حسن کہانی کے بیان سے زیادہ خود کہانی میں ہی ہوتا ہے۔

کردار کے متعلق انھوں نے اپنی رائے نہایت مدلل انداز میں بیان کیا ہے۔کہتے ہیں کہ جب کردار کا خاکہ بنالیا جائے تو کرداروں کو واقعیت اور زندگی عطا کرنے کا کام ہوتا ہے۔کردار کے لیے ضروری ہے

کہ غیر ضروری تفصیلات کو کاٹ دینا چاہیے چاہے وہ کتنا خوبصورت ہی کیوں نہ ہوا گر کردار کسی رخ کی نقاب کشائی نہ کرتا ہواور افسانہ نگار کو چاہیے کہ مختصر راستے کا انتخاب کر کے افسانے کو تکمیل تک پہنچائے۔

تفصیل

افسانے میں جہاں اس کا دائرہ محدود ہوتا ہے اور چھوٹا ہوتا ہے اس لیے تفصیل بیان کرنے کے لیے ضروری ہے کہ فنکار کو یہ معلوم ہو کہ اسے کیا نہیں لکھنا ہے یہ ہنر نہایت ضروری ہے۔

قاضی عبدالستار کا خیال ہے تفصیل کی تفصیل بنانا نہایت ضروری ہے اور مشکل ہے۔فنکار کو تھوڑی تفصیل دینی پڑتی ہے اس کے بغیر کہانی صرف ایک ہڈیوں کا ڈھانچہ بن کر رہ جائے گی۔ہم ہر وہ چیز نہیں بیا ن کر سکتے جو قاری پسند کرتا ہے۔تفصیل کتنی ہی خوبصورت ہی کیوں نہ ہو ہمیں ہر بیان سے بچنا چاہیے۔ اقتباس نقل کرتی ہوں:

> ”تفصیل افسانے کا جزولاینفک ہے۔دنیا کی کوئی بہترین کہانی تفصیل سے خالی نہیں ہے۔یہ تفصیل ہی ہے جو کہانی کے مرکز خیال کو زندگی عطا کرتی ہے۔کہانی کا مرکزی خیال اگر روح ہے تو تفصیل اس کا جسم ہوتا ہے۔تاہم تفصیل کا منتخب ہونا شرط ہے ورنہ یہ ہوگا کہ ہاتھ پیروں سے لمبے ہو جائیں گے اور آنکھوں کا حجم چہرے کو نگل لے گا۔تفصیل کا انتخاب کہانی کا وہ مشکل ترین مرحلہ ہے جہاں بڑے اور چھوٹے فنکار کا فرق محسوس کر لیا جاتا ہے۔اسی مقام پر فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ کون سی کہانی خوش اسلوبی کے ساتھ بیان کی گئی ہے اور کون سی کہانی بہترین طریقے سے بیان کی گئی ہے۔“ [9]

ڈائیلاگ

افسانے کے باب میں اہم موضوع بات ہے فطری اور متناسب ڈھنگ سے۔

ڈائیلاگ کو پیش کرنا ایک خوبی ہوتی ہے۔اس کے لیے فنی شعور کا ہونا لازمی ہے۔اگر پلاٹ کو آگے بڑھانے کا کام کردار کے مکالمے سے لیا جاتا ہے لیکن قاضی عبدالستار یہ طریقہ ایک ناآزمودہ فنکار کے لیے سمجھتے ہیں جو بڑا تخلیق کار ہوتا ہے وہ مکالمے کا سہارا نہیں لیتا۔

---

[9] مضمون فن افسانہ نگاری۔نذر قاضی عبدالستار۔مشمولہ۔نذر قاضی عبدالستار۔مرتب پروفیسر غیاث الدین۔ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،اشاعت: 2006 نئی دہلی،ص:512

مکالمے میں ایک خاص لمحہ ہوتا ہے جب قاری کردار کے فطری جملے اور بول چال کی زبان ہوتی ہے۔ عام طور سے روزمرہ کی زندگی ہم لوگ بے ربط جملے اور ٹوٹے پھوٹے جملے بدلتے نظر آتے ہیں مگر ایسا نہیں ہے کہ فنکار بھی ہر وقت ربط جملے ہی لکھے کسی خاص لمحے یا خاص واقعہ کو بیان کرنے کے لیے کرسکتا ہے مگر ہمیشہ وہ ایسا نہیں کرسکتا ہے۔ بے جا طوالت سے مکالمے کو ہمیشہ بچانا چاہیے۔

اسٹائل

ہر بڑا فنکار اپنا ایک طرز تحریر رکھتا ہے جو اس کی خوبی ہوتی ہے۔ طرز تحریر سے فنکار آسانی سے پہچان لیا جاتا ہے ۔ ہر فنکار الگ الگ انداز سے لکھتا ہے۔ جیسے کوئی مکالمہ پر اپنا زور صرف کرتا ہے کوئی Descriptoin کے سہارے کوئی کرداروں کے ذریعہ کوئی فضا آفرینی کے انداز میں فنکار اپنے الگ اسٹائل کو پیش کرتا ہے۔

قاضی عبدالستار نے اس مضمون میں ناول اور افسانے کا واضح فرق پیش کیا ہے ساتھ ہی افسانے کا بنیادی جز جو اس کا وحدت تاثر ہوتا ہے افسانہ پڑھنے کے بعد قاری کے ذہن پر جو اثرات مرتب ہوتے ہیں وہ وحدت تاثر ہوتا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ افسانہ ناول کے مقابلے میں ڈرامے سے زیادہ قریب ہوتا ہے اور وحدت تاثر کو افسانے میں وہی اہمیت حاصل ہے جو ڈرامے میں حاصل ہے۔

غرض اس مضمون میں قاضی عبدالستار نے افسانے لکھنے کی تکنیک اس کے طریقۂ کار پر مدلل گفتگو کی ہے ۔ یہ مضمون بڑی بڑی فن افسانہ نگاری افسانہ کیسے لکھیں کے مد مقابل رکھا جاسکتا ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے افسانے سے متعلق بنیادی اور ضروری باتیں مختلف عنوانات کے ذریعہ پیش کی ہیں جس سے ایک تخلیق کار فن افسانہ کی باریکیوں، اس کی ضرورتوں اور اس کے لوازم کا آسانی سے اندازہ ہوسکتا ہے۔ قاضی صاحب کا یہ مضمون بھی افسانہ نگاری کے باب میں اہمیت کا حامل ہے۔

☆☆☆

ملکۂ ترنم نور جہاں

یہ مضمون ملکۂ ترنم نور جہاں پر لکھا گیا ہے۔نور جہاں کے قاضی عبدالستار کے خاندان سے تعلقات تھے۔اس مضمون کو قاضی صاحب نے ایک طرح سے تاریخی سوانحی انداز میں لکھا ہے۔لکھنؤ کی تہذیب کا ذکر کرتے ہوئے اکبر شاہ ثانی پھر نواب وزیر غازی الدین حیدر کے زمانے کا ذکر کیا ہے۔نواب غازی الدین حیدر کا زمانہ لکھنؤ میں عیش پرستی کی فضا اور خوبصورت عورتوں ، ماہر رقاصاؤں ،خواب آفریں موسیقی کا زمانہ تھا اور مچھریٹہ کی طوائفوں میں بلقیس جہاں ایک ایسی طوائف تھی جس نے نواب کے دربار سے بستر تک جگہ بنالی۔

اس مضمون میں قاضی صاحب نے اپنے پشتینی گاؤں مچھریٹہ کا تاریخی ذکر کیا اور اس کی اور وہاں کے لوگوں کے بطور خاص طوائفوں کی جو حیثیت لکھنؤ کے شاہی دربار میں تھی اس کا باریکی سے بیان کیا ہے۔

نواب غازی الدین حیدر جو شیعہ تھا اس نے مچھریٹہ میں فرمان بھیجا کہ جو ریاستیں شیعہ نہیں وہ بھی امام باڑے بنوائیں۔مچھریٹہ کے قاضی صلابت علی کو جب یہ فرمان ملا تو اس نے لکھا کہ اگر چہ ہم شیعہ نہیں ہیں مگر ہم اپنے عقیدے کے مطابق محرم کے ضروری آداب بجالاتے ہیں۔امام باڑہ بنانا ضروری نہیں ہے۔ نواب نے جب یہ فرمان پڑھا تو اسے غصہ آ گیا اور تب اس کی نورنظر طوائف بلقیس جہاں نے بادشاہ سے کہا کہ آپ حکم دیں ہم آن ہی آن میں امام باڑہ بنوادیں۔حکم ملتے ہی وہ شاہی سپاہیوں ، بارہ ہزار نقد روپے اور بارہ گاؤں کی ملکیت لے کر مچھریٹہ پہنچ گئی اور چوبیس گاؤں اپنے زیر فرمان رکھ لیے۔قاضی صلابت علی کا منصب بھی چھین لیا۔

اسی طوائف بلقیس جہاں کی نواسی واجد علی شاہ کے پری خانہ میں آباد ہوگئی اور نواب کو اپنا دیوانہ بنالیا۔نواب اس کی خدمت سے خوش ہوکر اس کے بھائی علی نقی جو ایک سازندہ تھا وزیر افواج بنا دیا۔

لکھنؤ کا الحاق جب برٹش سلطنت میں ہو رہا تھا تب یہ علی نقی انگریزوں کا مخبر بنا پھر رہا تھا

اورانگریزوں کے زیرسایہ آنے کی کوشش نے نمک حرامی کرنے پر مجبور کردیا۔ جب الحاق کا مسودہ انگریزوں نے ان کے سامنے رکھا تھا کچھ پشتینی وزیروں نے مہلت مانگی مگر نہیں دی گئی۔

قاضی عبدالستار نے اس واقعہ کا ذکر اپنے ایک افسانے ''نیا قانون'' میں کیا ہے۔ واجد علی شاہ نے قیصر باغ کی حفاظت کے لیے علی نقی سے فوج کی دریافت کی مگر اس نے نواب کا حکم نہ مان کر انگریزوں کے فرمان پر ایمان لایا۔ غرض اس طرح واجد علی شاہ معزول ہوئے اور کلکتہ میں مٹیا برج میں سکونت پذیر ہوئے۔

علی نقی کے اس اقدام سے جہاں مچھریٹہ کی بدنامی ہوئی وہیں قاضی شجاعت علی حضرت محل کے ایک پیغام پر جوانھوں نے اودھ کے رئیسوں کو لکھا تھا جب ہمارے جھونٹے انگریزوں کے ہاتھ میں ہوں گے تب آ ؤ گے۔ ان کا پیغام پڑھتے ہی قاضی شجاعت علی پانچ سو سواروں کے ساتھ لکھنؤ کی طرف چل پڑے۔ لکھنؤ کے قریب پہنچے تو اطلاع ملی چنہٹ میں لڑائی کا فیصلہ ہو چکا ہے کیونکہ حضرت محل کی فوج ہار چکی تھی صرف چند سپاہی بنارسی باغ میں موجود تھے اور لکھنؤ کے مستقبل کی جنگ لڑ رہے تھے۔ جب قاضی بنارس باغ کی طرف جانے لگے تو لوگوں نے سمجھایا کہ آپ اپنی جان دے کر لکھنؤ اب نہیں بچا سکتے تو انھوں نے ایک تاریخی جملہ کہا۔ 'ہم ہتھیار پہن کر اپنے ہاتھ سے نہیں ارتارتے۔' اس طرح جو ایک مچھریٹہ کی بدنامی علی نقی کے لالچ سے ہوئی تھی شجاعت علی نے اپنی شجاعت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس بدنامی کو دھو ڈالا۔ اگرچہ لکھنؤ تو انگریزوں کے ہاتھوں تباہ ہونے سے بچ گیا مگر مچھریٹہ کو ذہین دور کرنے کا پلان شروع ہوا اور پکی عمارتیں اور محلات گرا دیے گئے اور کچھ آباد بھی کیے اسی وجہ سے اس علاقے کا نام مٹ کٹا ہے کیونکہ سیکڑوں مزدور گری ہوئی عمارتوں کی مٹی کو کوٹ رہے تھے۔

امن قائم ہوتے ہی مچھریٹہ کی طوائفوں کو وہاں سے نکال دیا گیا اور وہ طوائفیں وہاں سے نکل کر پُرسواں حاجی پور اور سریاں میں آباد ہوگئیں۔ پرسواں ایک جھیل کے کنارے تھا۔ اس وقت مشہور زمانہ طوائف افسر جہاں کا زمانہ تھا جس کی دو بیٹیاں تھیں۔ مندر جہا اور سندر جہاں۔ قاضی فیاض جب کورٹ آف وارڈس کے منیجر تھے اور ڈن کے نہایت قریبی تھے انھوں نے قاضی فیاض علی کو معاون منیجر بنا کر اور ''سرکار'' کا خطاب دیا۔ اس کے بھائی قاضی فرخند علی اگرچہ بے اولاد تھے مگر بھائیوں کے بچوں کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ فیاض علی جب افسر جہاں ملے تو انہی کے ہو کر رہ گئے اور لکھنؤ میں ایک حویلی میں رہنے لگے۔ افسر

جہاں کی بیٹی سے راجا نرہی کا نکاح پڑھا دیا اور لاہور لے کر چلے گئے اور نام مسرور جہاں کر دیا۔ 1912 میں منیر جہاں پیدا ہوئی اور ان کے نام پر ہی لکھنؤ میں منیر منزل ہے جہاں قاضی عبدالستار لکھنؤ میں اپنے طالب علمی کے زمانے میں جاتے تھے۔

1928 میں سندر جہاں یعنی مسرور جہاں کے بطن سے نور جہاں پیدا ہوئی وہی نور جہاں جس کو ملکۂ ترنم کہا جاتا ہے۔

قاضی فرخندہ کے مرنے سے پہلے سندر جہاں مچھریٹہ میں آئیں اور وہاں نور جہاں اور منیر جہاں کو قاضی صاحب نے پہلی بار دیکھا۔ سندر جہاں لاہور میں ناچ گانے میں خوب نام کما رہی تھی ۔ بیٹی بھی ہزاروں میں ایک تھی۔ قاضی صاحب کے چچا افسر چچا نے ان سے محبت کی مگر نور جہاں اپنے کریئر میں اس طرح ڈوب گئی کہ اختر چچا کو بھلا دیا۔

اس مضمون میں قاضی صاحب نے یہ بھی بتایا کہ قاضی فرخند علی نے قاضی فیاض علی کی پہلی بیگم قاضی عبدالعلی کے اکلوتے بیٹے یعنی قاضی عبدالستار کو اپنی منقولہ اور غیر منقولہ جائداد ہبہ کر دی۔ اس طرح قاضی فیاض علی کے دوسرے بچوں کے ساتھ قاضی عبدالستار اور قاضی فرخند علی کی خاموش جنگ شروع ہوئی۔

اس کے بعد قاضی عبدالستار نے ملکہ نور جہاں کس طرح ترقی کی منزل طے کر رہی تھی اس کا ذکر کیا ہے۔ نور جہاں نے جس فلم کو گانے دیے ہٹ ہو گئے۔ ''بھائی جان، جگنو'' جیسی فلمیں سپر ہٹ ہوئیں۔ اختر چچا جو نور جہاں کی محبت میں دیوانہ بنے تھے ممبئی چلے گئے مگر نور جہاں اس وقت ستاروں کی طرف بلندیوں پر سفر کر رہی تھی۔ انھیں فرصت ہی نہ ملی کہ وہ اختر چچا سے مل سکیں۔ 1950 میں اختر چچا خاموش محبت کے ساتھ قبر میں دفن ہو گئے۔

غرض اس طرح سے قاضی عبدالستار نے لکھنؤ اور لکھنؤ کے مچھریٹہ کا ذکر کرتے ہوئے لاہور تک بیان کیا ہے۔ جب وہ لاہور گئے اور نقوش کے ایڈیٹر محمد طفیل سے پوچھا نور جہاں کہاں ہے تو معلوم ہوا کہ وہ اس وقت لندن میں ہے۔ منیر منزل میں بھی قاضی صاحب کا آنا جانا تھا۔ وہاں انھیں بھیا راجا پکارا جاتا تھا۔ قاضی صاحب نے اس مضمون میں سبھی خاندان کے لوگوں کا ذکر کیا ہے اور مچھریٹہ کے گرتے ہوئے گھر کا ماتم بھی کیا ہے۔ مچھریٹہ میں قاضی صاحب تھے کہ لکھنؤ کی منی یعنی منیر منزل سے انو آپا جو مندر

دادی کا سازندہ تھا اس نے اخبار نکال کر یہ خبر سنائی کہ نور جہاں مرگئی۔

غرض اس طرح قاضی عبدالستار نے اس مضمون میں ایک تہذیب وثقافت لکھنؤ کی تمدن اور وہاں کی روایت کا خوبصورت ذکر کیا ہے۔ مچھریٹہ جس کا ایک تاریخی مقام ہے اس کو اجاگر کیا ہے ساتھ ہی نور جہاں جس نے فلمی دنیا میں بہت نام کمایا اور ایک زمانے تک لوگوں کے دلوں پر راج کیا اس کے بارے میں اتنی باریکی اور اتنے واقعات کا ذکر جس طرح سے کیا ہے یہ کسی اور سے ممکن ہی نہیں ہے کیونکہ نور جہاں کا تعلق قاضی عبدالستار کے گھر مچھریٹہ اور خاندان سے تھا۔

سوانح خوانی کے آداب

یہ قاضی عبدالستار کا ایک فکری مقالہ ہے جس میں انھوں نے سوانح نگاری کے فن اور اس پر کی گئی تنقید کے بارے میں بات کی ہے۔ سوانح نگاری سب سے مشکل فن ہوتا ہے۔ سوانح لکھنا ہر انسان چہ جائیکہ ایک ادیب کے لیے خارزار پر چلنے کے مترادف ہوتا ہے۔ ذرا سی لغزش اسے مشہور و مقبول نام اور بدنام کر دیتی ہے اور نقاد آسانی سے دیکھ لیتے ہیں کہ اس میں کتنے جھوٹ کے پلندے سجائے گئے ہیں۔ اس مقالے میں قاضی عبدالستار نے لکھا ہے کہ ادب میں تین بت ہوتے ہیں۔ تنقید، تحقین اور تنقیص۔ سوانح نگاری کے فن پر تبصرہ موجود ہے مگر تنقید نہیں ملتی اور جو تبصرہ نگار ہے وہ بھی ہمیشہ ثقہ نہیں ہوتا ہے اور نہ ہی موضوع پر حاوی ہوتا ہے۔ ساتھ ہی تعلق اور تعصب کے خارزاروں چلتا رہتا ہے۔ سوانح نگار کبھی کبھی اپنی زندگی کی تصویر کشی کرنے میں صفحے کے صفحے سیاہ کر ڈالتا ہے مگر اس سے بھی اس کو تشفی نہیں ملتی ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''سوانح ایک پڑھے لکھے شخص کی بسر کی ہوئی زندگی کی ایک حد تک تصویر کشی ہوتی ہے لیکن کیا یہ ممکن ہے کہ بڑے بڑے جادو نگار قلم ایک صرف ایک لمحے کی لہولہان اذیت، صرف ایک لمحے کی تبسم زار مسرت کی پیشکش میں صفحے کے صفحے سیاہ کر ڈالتے ہیں لیکن خود اپنے دل کی تسلی حاصل کرنے سے عاجز رہتے ہیں۔ چہ جائیکہ پوری زندگی۔ زندگی وہ طلسمی آئینہ ہے جس میں یوسف بے مثال مسخرہ معلوم ہوتا ہے اور مسخرہ یوسف نظیر۔ زندگی عجیب قصہ گو ہے جس کے اپنے بھوگے ہوئے قصے خیالی افسانوں سے زیادہ حیرت ناک، مثالی کہانیوں سے زیادہ اچھوتے البیلے ہوتے ہیں۔ زندگی کبھی آنسوؤں کی سبیل لگا دیتی ہے، کبھی خون کی نہریں بہا دیتی ہے کبھی زعفرانی ہنسی کے تختے کھلا دیتی ہے کبھی شیریں قہقہوں کے کھلیان لگا دیتی ہے تو بے چارہ مصنف کیا کرے۔''[10]

غرض اس اقتباس میں انھوں نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ زندگی کی حقیقتیں ایسی ہوتی ہیں ان کو سوانح میں لکھنا آسان نہیں ہوتا ہے اس لیے ایک مشکل فن سمجھا جاتا ہے۔

10۔ مضمون سوانح خوانی کے آداب۔ نذر قاضی عبدالستار۔ مشمولہ۔ مرتب پروفیسر غیاث الدین۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ص:515

مصنف روسوا رر گوری جیسے مصنف جن کی شہرۂ آفاق تصنیف سے اگر ہم روشنی لینا چاہیں تو ہمیں یہ بھی دیکھنا چاہیے ہم میں وہ کتنے ہیں جو ان کے برابر کے منصب پر فائز ہیں۔قرۃ العین حیدر کے مطابق ہمیں سوانح میں ان ہی واقعات کو لکھنا چاہیے جو لائق مطالعہ ہیں مگر یہاں قاضی صاحب نے سوال اٹھایا ہے کہ دلچسپ سے کیا مراد ہے۔

Readabel سے کیا مراد ہے اور کس کے لیے اپنے یا بیگانے عالم کے لیے یا عامی کے لیے۔سوانح میں دوسری بات زمانے کی آتی ہے ۔زمانے کی بات کرنا اور تصویر پیش کرنا ۔زمانہ زخموں کا سوداگر بھی ہوتا ہے اور سچائی بھی دیتا ہے۔زلزلوں ،طوفانوں ،سیاسی وسماجی اور معاشی تحریکوں سے سوانح نگار کی شخصیت دوچار بھی ہوتی ہے تو کیا وہ سبھی کا ذکر کرکے واقعات کی کھتونی تیار کردے۔

دوسرے پیرا میں انھوں نے بہت محبت کا ذکر کیا یعنی سوانح نگار اپنے معاشقے کا ذکر کرے تو کس طرح کرے پھر انھوں نے لال قلعہ دہلی کے ایک مشاعرے اور اس مشاعرے میں جگر مرادآبادی کا ذکر کیا ہے۔جگر جو دیکھنے میں خوبصورت نہیں تھے مگر جب انھوں نے یہ شعر پڑھا۔

کیا عشق نے سمجھا ہے کیا حسن نے جانا ہے
ہم خاک نشینوں کی ٹھوکر میں زمانہ ہے

تو پوری محفل منجمد ہوگئی۔اس وقت جگر سے خوبصورت انسان پوری محفل میں کوئی نہیں تھا۔اس محفل میں پنڈت جواہر لال نہرو بھی موجود تھے جن کا دادمسرت سے ہل رہا تھا۔

اس کے بعد قرۃ العین طاہرہ کا ذکر کیا ہے۔بابی مذہب کی مبلغ نہایت حسین وجمیل خاتون تھیں وہ جس محفل میں ہوتی ہیں اور تقریر کرتی ہوتی جب اپنے چہرے سے نقاب ہٹاتیں تو پوری محفل بابی مذہب کا کلمہ پڑھنے لگتی تھی۔جب اس کو ناصر الدین شاہ قاچار نے موت کی سزا سنائی تو اس وقت انھوں نے یہ شعر پڑھا جس کا ترجمہ اس طرح ہے:

’تو کسی لباس میں آ، تجھ کو تیر یا انداز قد سے پہچانتی ہوں ،تلوار پر اس طرح گردن ڈال دی جیسے بابکا بازو ہو‘

غرض عشق یہ ایسا ہی ہوتا ہے جس کا ذکر زمانے کو گرم رکھتا ہے۔

جوش ملیح آبادی کی خودنوشت یادوں کی بارات شائع ہوئی تو لوگوں نے اس پر خوب تنقید یں کیں اوراس پر غلو کا الزام لگایا۔اس پر جواب دیتے ہوئے قاضی عبدالستار نے لکھا ہے کہ جوش جو جاگیردار خاندان سے تعلق رکھتے تھے باپ کے علاقے کی سالانہ نکاسی ایک لاکھ چالیس ہزار تھی اوران کو زندگی بھر عیش وآرام فراہم تھے۔جوش کے معاشقے بھی حیرت زدہ کرنے والے نہیں کیونکہ ان کے گھروں میں ہی پورے گاؤں سے سب سے خوبصورت عورتوں کو ہی رکھا جاتا تھا جنھوں نے تعلقداروں اور جاگیرداروں کی حالت نہیں دیکھی اوران کی زندگی کو قریب سے نہیں دیکھا وہ ان کی خودنوشت پر یقین نہیں کرتا۔اس مضمون میں قاضی صاحب نے جوش کے متعلق جو باتیں لکھی ہیں ان کا ذکر اکثر وبیشتر دوسری تحریروں میں بھی ملتا ہے۔لکھتے ہیں کہ طالب علمی کے زمانے میں خوش مذاق اورخوش جمال بیگمات کو کہتے سنا ہے کہ جوش کی شخصیت میں آواز میں گفتار میں ایسی کشش ہے کہ نسوانیت مسحور ہو جاتی ہے۔

اس کے بعد لکھتے ہیں کہ جھوٹ بولنے کے لیے ہوتا ہے لکھنے کے لیے نہیں کیونکہ جھوٹ دمہ کا وہ بوڑھا ہوتا ہے جو زیادہ دیر تک اپنے آپ کو بچا کر نہیں رکھ سکتا۔کھانسنے لگتا ہے۔

پھر انھوں نے سوانح میں توازن کا ذکر کیا ہے، لکھتے ہیں:

''نثر کے حسن کا کمال صناعی کی انتہا میں نہیں صناعی کے توازن میں ہے۔ورنہ اعتماد الدولہ کا مقبرہ تاج محل سے زیادہ حسین کہا جاتا۔آنسوؤں کا بیان اس طرح کیجئے کہ دیکھنے والا آبدیدہ ہو جائے۔اسے گوہر مت بنائیے کہ سات سمندروں کے مدتی پانی پانی ہو جائیں۔زخم زخم رہنے دیجئے،شاخ طوبیٰ کا پھول مت بنائیے۔اپنی محبت کے ذکر میں دریا بہا دیجئے لیکن منصوراور سرمد کا نام قلم کی زباں پر مت لائیے۔''[11]

سوانح نگاری تجربہ مانگتی ہے۔یہ ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔محنت اورریاضت کے بعد ہی لکھی جاتی ہے۔اس ضمن میں انھوں نے اطہر صدیقی کی خودنوشت ''میں کیا میری حیات کیا'' کا ذکر کیا ہے اوراطہر صدیقی کے ساتھ اپنے دیرینہ تعلقات کا ذکر بھی کیا ہے۔

لکھتے ہیں کہ یہ خودنوشت کوئی ایک دن میں نہیں لکھی گئی بلکہ اس کے پیچھے مسلسل تفکر مسلسل ریاضت مسلسل محنت کا اثر ہےاورسوانح نگاری کی فہرست اس خودنوشت کے بغیر ادھوری ہے۔

11۔مضمون سوانح خوانی کے آداب۔نذر قاضی عبدالستار۔مشمولہ۔مرتب پروفیسر غیاث الدین۔ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،نئی دہلی،ص:518

غرض اس مضمون میں قاضی عبدالستار نے سوانح نگاری کے ان پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے جس کا جاننا سوانح نگار کے لیے ضروری ہے تا کہ وہ خودنوشت اور سوانح کے راستوں کو طے کر سکے اور تاریکی سے بچ سکے۔

رشید احمد صدیقی کی نثر کا آہنگ

''نذر قاضی عبدالستار'' مرتب ''پروفیسر محمد غیاث الدین'' اس کتاب میں قاضی عبدالستار کے چھ مضامین شامل ہیں جو منفرد نوعیت کے ہیں اور مختلف موقعوں پر لکھے اور پڑھے گئے جن کا ہم الگ الگ ذکر کریں گے اور ان مضامین کے موضوع و مواد پر بحث کریں گے تا کہ یہ واضح ہو سکے کہ انھوں نے اپنے مضامین میں کیا لکھا ہے۔

رشید احمد صدیقی کی نثر کا آہنگ ہے۔اس مضمون میں انھوں نے اپنے استاد رشید احمد صدیقی کی نثر پر پر مغز گفتگو کی ہے۔ یہ مضمون انھوں نے رشید احمد صدیقی آثار مرتب اصغر عباس کی رسم اجرا کے موقع پر پڑھا گیا۔اس کتاب میں ایک مضمون شامل ہے ''رشید احمد صدیقی کا نثری آہنگ'' مقالہ نگار جدیدیت کے بانی مبانی ناول نگار نقاد شمس الرحمٰن فاروقی کا ہے۔قاضی عبدالستار اپنے اس مضمون کو شمس الرحمٰن فاروقی کے مضمون کی تردید میں لکھا ہے کیونکہ فاروقی نے رشید احمد صدیقی کی نثر کے کچھ جملوں اور کچھ فقروں پر سوال قائم کیا تھا جس کا قاضی عبدالستار نے مدلل جواب دینے کی کوشش کی ہے ساتھ ہی انھوں نے اپنے غصے کا اظہار فاروقی کے تبصرے جو انھوں نے داراشکوہ ناول پر کیا تھا جس کا جواب پروفیسر اقتدار عالم خاں نے دیا ان تمام واقعات کو زیر نظر رکھ کر اس مضمون میں فاروقی کے مضمون کے جملوں اور فقروں کی غلطیوں کو زیر بحث لانے کی کوشش کی ہے۔لکھا ہے کہ فاروقی کا مضمون پڑھ کر ان کے اندر علیگیرین کی رگ پہلی بار پھڑکی۔ کیونکہ رشید احمد صدیقی قاضی صاحب کے استاد تھے اور وہ استاد کی شان میں کوئی بھی گستاخی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔انھوں نے لکھا ہے کہ:

> ''فاروقی کے اس مضمون کا ذکر میں نے سنا اور رنجور ہوا لیکن جب میرے کچھ طالب علموں نے اس مضمون سے متاثر ہو کر رشید صاحب کے درجۂ استناد پر شک کا اظہار کیا تو مجھے تشویش ہوئی مضمون پڑھا تو حیرت ہوئی کیا اردو تنقید کی سطح اتنی لچر ہو گئی۔کیا اردو تنقید کے مشہور نام وزن اور آہنگ اور اسلوب کی ماہیت اور مفاہیم سے اس حد تک نا آشنا ہیں

اس لیے بھی حیرت ہوئی کہ یہ مضمون علی گڑھ میں پڑھا گیا اس علی گڑھ میں جس کا ایک
نام رشید احمد صدیقی بھی تھا۔ کیا اب علی گڑھ ایسا ہو گیا کہ اتنے معمولی فاحش غلطیوں سے
بھٹکنے اور متکبرانہ مضمون کے سامنے بے بس ہو جائے۔ اکتیس سال کے طویل قیام میں
پہلی بار اپنے وجود میں اس رگ کا احساس ہوا جسے علیگرین کہا جاتا ہے۔ میں نے مضمون
دوبارہ پڑھا جو پنسل کے نشانوں سے رنگ گی۔''12؎

اس مضمون میں انھوں نے فاروقی صاحب کے مضمون کے ایک ایک جملوں کو نہایت باریکی سے جانچا پرکھا ہے۔ جس جملے یا الفاظ کا فاروقی نے اعتراض کیا تھا جو رشید احمد صدیقی نے استعمال کیا اور انھوں نے زبان و بیان کے ہر اعتبار سے فاروقی کے اعتراض کو جواب دینے کی کوشش کی ہے اور رشید احمد صدیقی کے جملے اور نثر میں استعمال ہوئے الفاظ کو صحیح گردانا ہے۔ ایک طویل مضمون کے تحت اکیس نمبروں تک فاروقی کے اعتراض کی تردید کی ہے ساتھ صرف ونحو، قواعد آہنگ اسلوب صوتی نظام لسانیاتی پہلو ساز و آواز کی مختلف سطحوں پر مختلف حوالوں مثالوں سے مقالے کو ایک طرح سے جوابی مضمون بنا دیا ہے جیسے کسی کشتی کے میدان میں کسی پہلوان کو ہرانے کے لیے حریف اپنے تمام داؤ پیچ آزماتا ہے۔

قاضی عبدالستار نے الفاظ کے پردوں میں فاروقی کی علمیت پر طنز کیا ہے ساتھ مزاحیہ بھی بنا دیا ہے۔

جیسے فاروقی اپنے بچپن کے حوالے سے ایک مضمون کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ'' لڑکپن میں پڑھا تھا'' اس جملے کا صاف مطلب نکلتا ہے کہ لڑکپن بھی بچپن کے ذرا بعد کے زمانے میں اس جملے کا تمسخرانہ انداز میں قاضی صاحب نے اس طرح لکھا ہے:

''لڑکپن میں پڑھا تھا کہ کیا معنی؟ لڑکپن نام کا کوئی مجموعہ مضامین ڈاکٹر احسن فاروقی
نے شائع نہیں کیا۔ لڑکپن نام کا کوئی میگزین منظرشہود پر نہیں آیا۔ لکھیے کہ لڑکپن کے
زمانے میں پڑھا تھا۔''13؎

رشید احمد صدیقی کے ایک جملے'' زندگی اور معاشرے کے ہر پہلو پر'' اس جملے پر بھی دونوں حضرات

12؎ مضمون رشید احمد صدیقی کی نثر کا آہنگ۔ قاضی عبدالستار۔ مشمولہ۔ نذر قاضی عبدالستا۔ مرتب پروفیسر غیاث الدین ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی۔ ص:482

13؎ مضمون رشید احمد صدیقی کی نثر کا آہنگ۔ قاضی عبدالستار۔ مشمولہ۔ نذر قاضی عبدالستا۔ مرتب پروفیسر غیاث الدین ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی۔ ص:487

میں قلمی جنگ ہوتی ہے۔قاضی عبدالستار کے نظریات کی رو سے یہ جملہ بالکل درست اور صحیح ہے اور زندگی اور معاشرہ دو الگ الگ چیزیں ہیں جنھیں رشید احمد صدیقی نے بالکل صحیح لکھا ہے اس پر سوال کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے وہیں پر فاروقی صاحب کا کہنا ہے کہ زندگی اور معاشرے میں ایک لفظ زائد ہے یا صرف زندگی لکھنے یا صرف معاشرہ کسی ایک لفظ کے استعمال سے معنیٰ میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے قاضی عبدالستار لکھتے ہیں:

''رشید صاحب نے تحریر کیا''زندگی اور معاشرے کے ہر پہلو پر''اعتراض یہ ہے کہ زندگی اور معاشرے میں ایک لفظ زائد ہے یا صرف زندگی لکھتے یا صرف معاشرہ، جواب یہ ہے کہ کیوں زائد ہے زندگی کے معنیٰ معاشرہ نہیں ہوتے۔معاشرہ کے معنیٰ زندگی نہیں ہوتے اعتراض کی وضاحت کیجیے جواب رسید کیا جائے گا اور یہ بھی کہ آپ نے ننھے سے ایک فقرے کو حرف کے دوہرے بوجھ سے کچل ڈالا ہے۔''[14]

غرض قاضی عبدالستار اور فاروقی کے اس علمی ادبی اور قواعدی بحث ومباحثے سے بہت سے لفظوں جملوں کی بندش اس کے استعمال کے طریقے سیکھنے سمجھنے اور لکھنے کی ہم جیسے طالب علموں کے لیے مشق کے دروازے کھولتی ہے۔اہل علم کے بحث ومباحثے شاگردوں کے لیے نعمت ہوتے ہیں پس وہ علمی وادبی دائرے میں ہوں کسی کی ذاتی تذلیل نہ ہو یا اخلاقی اور ذاتی کیچڑ نہ اچھالی جائے۔

بہرکیف اس مقالے کے آخر میں قاضی عبدالستار نے علم وادب کی تہذیب کے دائرے کو چھوتے ہوئے نظر آتے ہیں لکھتے ہیں:

''آخر بات یہ ہے کہ ایسے مضامین کیوں لکھے جاتے ہیں عرض ہے کہ ایسے مضامین اس لیے لکھے جاتے ہیں یا لکھوائے جاتے ہیں کہ اردو ادب کا عام بھولا بھالا اچھے اور برے ،بڑے اور چھوٹے ادب میں فرق کرنے سے محروم ہوجائے۔اگر آپ اردو تنقید کی رفتار سے واقف ہیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ مولانا حسین آزاد جیسا دیو افتخار جالب جیسے بالشتیے کے ہاتھوں قتل کرادیا گیا۔عظیم غالب کے کاندھوں پر عزیزی ظفر اقبال سلمہٗ چڑھا دیے گئے۔جوش کا نام آیا لعنتیں پڑنے لگیں۔فراق کا ذکر ہوا صلواتیں سنائی جانے لگیں۔

14۔ مضمون رشید احمد صدیقی کی نثر کا آہنگ۔قاضی عبدالستار۔مشمولہ۔نذر قاضی عبدالستا۔مرتب پروفیسر غیاث الدین ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی۔ص:484

رشید احمد صدیقی کی شہرت اور عزت بھی تراش لی گئی۔ جب اچھے ادب اور برے ادب کی تمیز مٹ جائے گی تو ٹی وی اور ریڈیو اور میگزین کے ذریعہ جس ادب کو پیش کیا جائے گا قبول کیا جائے گا اور صفات کے جو دم چھلے لگائے جائیں گے وہ مقبول ہوں گے او رآہستہ آہستہ اردو ادب کی مقبولیت ختم ہوجائے گی اور زبان کا مسئلہ حل ہوجائے گا۔''[15]

قاضی صاحب کے آخری جملوں سے اتفاق کیا جاسکتا ہے جہاں انھوں نے اردو زبان وادب کے تئیں اپنی تشویش کا اظہار کیا ہے۔

15: مضمون رشید احمد صدیقی کی نثر کا آہنگ۔ قاضی عبدالستار۔ مشمولہ۔ نذر قاضی عبدالستا۔ مرتب پروفیسر غیاث الدین ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی۔ ص:494

اسرارالحق مجاز کا لکھنؤ

''تحریرنو'' مارچ 2012 کے شمارے میں قاضی عبدالستار کا ایک تاثراتی مضمون شائع ہوا جس کا عنوان ''اسرارالحق مجاز کا لکھنؤ'' ہے۔اس مضمون میں انھوں نے ایک جیتے جاگتے چلتے پھرتے تہذیب وتمد ن سے بھر پور لکھنؤ کا نقشہ کھینچا ہے۔مضمون پڑھتے ہوئے مجاز اوران کے ہم جولیوں کے مرقع آنکھوں کے سامنے جگمگاتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔قاضی عبدالستار نے لکھنؤ میں اپنے بی۔اے کے داخلے کے وقت کے ان تمام واقعات وحادثات علمی وادبی محفلوں اور جامعہ لکھنؤ کے سنہرے حروف میں کتابوں کے اوراق پر چمکتے ہوئے اساتذہ کا ذکر کیا ہے جن میں نواب مرزا خضر علی خاں،اثر لکھنوی،آرزو لکھنوی،صفی لکھنوی،سراج لکھنوی،شارب لکھنوی،عبدالماجد دریا بادی،حیات اللہ انصاری،آنند نرائن ملا پرویز مسعود حسین رضوی، پروفیسر احتشام حسین مجاز لکھنوی،سلام مچھلی شہری،رتن سنگھ،اقبال مجید،رام لال،منظر سلیم،احمد جمال پاش، ڈاکٹر عبدالعلیم۔اس کے علاوہ پروفیسر سدھانتا پروفیسر ڈی۔پی مکھرجی،پروفیسر کلی پرساد،پروفیسر رادھا کمل، پروفیسر بلجیت سنگھ وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔

اس وقت لکھنؤ یونیورسٹی کی اپنی ایک الگ آن بان اور شان تھی۔ہندوستان کے علم وادب کے بڑے بڑے نامور حضرات وہاں اپنے علم کے دریا کے گوہر آب سے نئی نسل کو پروان چڑھا رہے تھے اس وقت لکھنؤ یونیورسٹی کو پرانے لکھنؤ اور تانگے والے لوگ ''بادشاہ باغ'' کہا کرتے تھے۔شاہی دور میں آرٹس اور اسٹاف کلب کی عمارتیں تعمیر ہوئی تھیں اور دوسری عمارتیں شاہی ادوار کے گزر جانے کے بعد تعمیر ہوئی تھیں جو اس کے مقابلے میں کسی ملکہ کی طرح دکھائی دیتی تھیں۔ایسا لگتا تھا وہ اپنے درباریوں سے سلام قبول کر رہی ہو۔

قاضی عبدالستار جو اپنی تعلیم کے زمانے ہیوٹ ہاسٹل میں رہتے تھے اس کا اس مضمون میں نہایت دلبرانہ انداز میں ذکر کیا ہے۔اس ہاسٹل سے انھیں عشق تھا اور علی گڑھ میں پوری عمر گزارنے کے باوجود بھی ہیوٹ ہاسٹل اور لکھنؤ کی زندگی ہمیشہ ان کے ذہن ومزاج پر تازہ دم رہی۔لکھنؤ جو طوائفوں کے لیے مشہور ہے

جو اپنے تہذیبانہ رکھ رکھاؤ سے ادب کی دنیا میں ایک الگ مقام رکھتی ہیں اس کا بھی ذکر ملتا ہے۔ مندر جہاں اوران کی بیٹی منیر جہاں کا اس مضمون میں ذکر ملتا ہے۔ لکھنؤ کے چوک میں اصغر علی محمد علی کی عمارت کے قریب ایک منیر منزل ہے جسے بقول قاضی عبدالستار یہ ان کے حقیقی دادا قاضی فیاض علی نے اپنی طوائف بیگم مندر جہاں کے لیے تعمیر کروائی تھی۔

قاضی عبدالستار کے مجاز صاحب سے کافی اچھے تعلقات تھے اور وہ اکثر مجاز کی دعوتیں کیا کرتے تھے اوراس کے لیے انھیں منیر منزل سے پیسہ آسانی سے دستیاب ہوجاتا تھا۔ مجاز کی محفلوں میں شراب وکباب سے نزدیکیاں بھی ہوئیں۔ ساتھ ہی فن تخلیق کی طرف دلچسپی پیدا ہوئی۔

لکھنؤ یونیورسٹی ، وہاں کی خوبصورت زندگی ساتھ ہی صنف نازک کے ذکر سے یہ مضمون مالا مال ہے۔ لکھنؤ حسن وعشق کا ایک خوبصورت مرکز تھا۔ جس کا ذکر خاکے کے انداز میں قاضی صاحب نے کیا ہے۔ شوخی شرارت، عشق وعاشقی کا ایک پورا منظر ابھارا گیا ہے۔

ذرا ان کی شوخی تو دیکھئے لیے زلف خم شدہ ہاتھوں میں
مرے پیچھے سے آئے دبے دبے مجھے سانپ کہہ کے ڈرا دیا
شب انتظار کی کشمکش نہ پوچھ کہ کیسے سحر ہوئی
کبھی ایک چراغ جلا دیا کبھی ایک چراغ بجھا دیا

لکھنؤ کے رہن سہن، طور طریقوں کا ذکر ملتا ہے۔ زمینداری اور تعلقداری نظام کا بیان گنگا جمنی تہذیب کی خوبصورت محفلوں کا ذکر اس لیے قاضی عبدالستار نے اس لکھنؤ کو اپنا لکھنؤ کہا ہے۔ لکھنؤ کے مشہور زمانہ مشاعرے ہزاروں سامعین کا پر تکلف مجمع داد وتحسین کے نعرے انداز بیاں کی پرسکنی ادب وعوام کا رشتہ خوبصورتی سے بیان کیا ہے ساتھ ہی آج کے نام نہاد شاعروں اور نقادوں کے طنز ونشتر سے جس طرح سے اردو شعر وادب کی محفلیں بکھر رہی ہیں اس کا نہایت افسوس کے ساتھ ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اردو تہذیب کا سب سے بڑا نمائندہ شاعر تھا اور شاعروں کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ کڑکڑاتے جاڑوں کی برفیلی ہواؤں کے جھکڑوں میں شامیانوں کے نیچے دری اور جازم کے فرش پر پچاس پچاس ہزار کا شیروانی پوش سامعین کا مجمع صبح تک بیٹھا مشاعرہ سنتا رہتا تھا انہیں داد و بیداد میں شرکت کرتا تھا۔ مشاعرہ اردو تہذیب کا وہ ادارہ ہے جس کی

نظیر پیش کرنے سے دنیا کا ہر ملک عاجز تھا۔معلوم نہیں دنیا کی وہ کون سی طاقت تھی جس کی بدنظر مشاعرے کو کھا گئی۔معلوم نہیں کیسے کیونکر اچانک بی بی جدیدیت کا ظہور ہوا ۔ایسی ایسی قاموس بقراطی بے معنیٰ اور لچر غزلیں سنائی گئیں کہ مجمع بھر کنے لگا بکھر نے لگا۔بکھر گیا۔عوام سے ادب کا رشتہ شعر کا رشتہ پورے انتظام وانصرام کے ساتھ جوڑا گیا۔مٹھی بھر بااثر بااقتدار شاعر جب مشاعروں میں ہوٹ ہوئے تو انھوں نے شاعروں کے خلاف زہر اگلنا شروع کر دیا۔جیسے یہ طے ہوگیا کہ مشاعروں میں دھوم مچانے والے شاعر کم پڑھے لکھے اور بازاری ہوتے ہیں اور جن کو عوام نے ٹھکرا دیا ہے وہ بہت قابل اور بے مثال ہوتے ہیں اس لیے کہ یہ قابل اور بے مثال شاعر یا اوسط درجے کے شاعر اپنے ہی جیسوں کے رسالوں اور میگزینوں میں دھڑا دھڑ شائع ہو رہے ہیں ۔ پکی روشنائی سے چھپ رہے ہیں ۔ بولا ہوا لفظ چھپے ہوئے لفظ سے پوری طرح ہار گیا یہ تو تھا ہی سیاست کے کروٹوں نے مشاعروں کو دھندلانے میں پوری خدمت انجام دی۔'' 16؎

قاضی صاحب کا متذکرہ اقتباس میں درد چھلکتا ہے ساتھ ہی انھوں نے نام نہاد شاعروں پر اپنے طنز کا تیر بھی برسایا ہے جنھوں نے اردو ادب کی مٹی پلید کرنے اور اس کی قبر کھودنے کی پوری کوشش کی۔

مجاز اردو ادب اور اردو مشاعرے کی آن بان اور شان تھے اور تمام اردو کے بڑے بڑے شاعروں کے بیچ جب مجاز کا نام پکارا جاتا تھا تو مشاعرے میں جان سی پڑ جاتی تھی اور نشے کی حالت میں بھی انھیں اپنے حافظے، اپنے نطق، اپنے جسم اور اپنی زبان، اپنی آواز پر مکمل عبور حاصل تھا کہ سننے والے کو یہ احساس بھی نہیں گزرتا تھا کہ مجاز نشے میں دھت حالت میں ''آوارہ'' جیسی نظم پڑھ رہے ہیں۔

اس مضمون میں قاضی عبدالستار نے احتشام حسین کی عزت وتوقیر پر بھی نہایت پرمغز انداز میں لکھا ہے ساتھ ہی اردو ادب میں احتشام حسین جیسے انسان کی جو عظمت تھی اس کو بیان کیا ہے۔ان کے حسن وجمال کی دھوم تھی جس کی وجہ سے اکثر دوشیزائیں انھیں سننے کے لیے آرٹس فیکلٹی آیا کرتی تھیں۔مضمون میں انھوں نے احتشام حسین کے نقش ونگار کا خوبصورتی سے ذکر کیا ہے۔

مجاز کی موت اردو ادب کے لیے ایک بہت بڑا سانحہ تھی۔قاضی عبدالستار نے لکھا ہے کہ جب مجاز کی

16؎ مضمون اسرارالحق مجاز کا لکھنؤ۔قاضی عبدالستار۔مشمولہ۔نذر قاضی عبدالستا۔مرتب پروفیسر غیاث الدین ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی۔ص:9

موت کی خبر یونیوسٹی کو ملی تھی تو یونیورسٹی بند ہونا شروع ہوگئی اور چالیس پچاس منٹ کے اندر ہی اندر پوری یونیورسٹی بند کر کے سوگ منایا گیا۔اس کے ساتھ ہی قاضی عبدالستار مجاز کی دعوت اور کچھ ذاتی تعلقات کا بھی ذکر کیا ہے اور لکھتے ہیں کہ وہ میرے لیے اسرارالحق مجاز نہیں تھے بلکہ میرے خاندان کے کوئی قریبی بزرگ تھے اور پھر انھوں نے قاضی عبدالستار کو شراب نوشی سے دور رہنے کی تلقین کی کیونکہ منیر منزل سے قاضی عبدالستار کو ان کی ماں کا حوالہ دے کر مجاز اور ان کی محفلوں کو چھوڑ کر تعلیم پر دھیان دینے کی تلقین کی گئی تھی۔

قاضی عبدالستار پر مجاز کا بہت اثر تھا۔وہ لکھتے ہیں کہ جو مجاز کا لکھنؤ تھا وہی لکھنؤ ان کا بھی تھا۔یہاں تہذیب وتمدن کی گومتی بہتی تھی۔ایک ایک ادا میں حسن وعشق تھا۔اس کی ہواؤں میں محبوب کی سانسوں کی خوشبو تھی۔اس کی گلیوں میں معشوق کے نغموں کے چرچے تھے۔قاضی عبدالستار نے مجاز اور ان کے لکھنؤ کا ذکر اس مضمون میں نہایت خوبصورتی سے کیا اور ان کی یاد میں غمگین اور افسردہ رہتے تھے اور ان کی شرافت اور دردمندی کا نہایت ہمدردی سے ذکر کیا ہے۔

☆☆☆

ذہین تیز آنکھوں والی عصمت آپا!

نیادور لکھنؤ اگست 2017 میں قاضی عبدالستار کا مضمون عصمت چغتائی خاص نمبر میں ''ذہین تیز آنکھوں والی عصمت آپا'' کے عنوان سے عصمت چغتائی پر ایک شاندار مضمون لکھا۔ عمر کے آخری ایام میں جب اچھے اچھے لوگوں کو ان کی یادداشت دھوکہ دینے لگتی ہے ایسی حالت میں قاضی صاحب نے عصمت چغتائی پر ایک جاندار مضمون لکھا اور انھوں نے ذاتی معاملات کا بیان بھی کیا۔ قاضی عبدالستار کے بیان میں ایسی دلچسپ شیرینی ہوتی ہے کہ ان کے لکھے گئے مضامین میں بھی داستانوی انداز پوری طرح سے ابھرتا ہے اور قاری کو ایک الگ دنیا کی سیر کراتا ہے۔ قاضی صاحب کا بیانیہ انداز قاری کو مکمل جذب کر لیتا ہے ساتھ ہی وہ جس دور کا بیان کرتے ہیں خود وہ اسی دور میں سانسیں لینے لگتا ہے۔

اس مضمون میں بھی انھوں نے عصمت چغتائی کی ذاتی زندگی اور ان سے علی گڑھ اور وہاں کے لوگوں سے ان کے تعلقات کا بہ خوبی ذکر کیا ہے۔ قاضی صاحب کے علی گڑھ آنے اور اپنے افسانے سنانے کا ذکر کیا ہے ساتھ ہی ''داراشکوہ''، جس زمانے میں کتاب میں شائع ہو رہا تھا اس کی شہرت اور مقبولیت سے متاثر ہو کر عصمت نے قاضی عبدالستار سے دارشکوہ کے سالوگڑھ کی جنگ کو پڑھنے کا حکم دیا گیا۔ لکھتے ہیں:

> ''تیسری بار جب وہ تشریف لائیں تو داراشکوہ کی شہرت آسمان پر تھی۔ آتے ہی آتے انھوں نے مسعود محل میں بہت بڑی محفل کا انعقاد کیا۔ اس محفل کی یہ خصوصیت تھی کہ پروفیسر عبدالعلیم صاحب اور پروفیسر نورالحسن صاحب (وزیر تعلیم) کے اصرار پر آپا نے بہت انکار کے بعد صدارت قبول کر لی۔ مجھے حکم ہوا کہ میں دارشکوہ سے ساموگڑھ کی پوری جنگ پڑھوں۔ آپا نے خطبۂ صدارت میں بہت زور دے کر فرمایا کہ داراشکوہ اردو کی پہلی کتاب ہے جس میں ایک مشہور جنگ پوری آب وتاب کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔ ان کا یہ جملہ بہت دنوں تک علی گڑھ کی ادبی محفلوں میں گونجتا رہا۔'' 17؎

17؎ مضمون ذہین آنکھوں والی عصمت آپا۔ قاضی عبدالستار۔ مشمولہ۔ نیا دور، لکھنؤ، اگست 2017ء۔ ص:28

اس مضمون میں انھوں نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ عصمت آپا نے انھیں ممبئی آنے کی دعوت دی اور کمال امروہی فلم ڈائریکٹر رضیہ سلطان فلم بنا رہے تھے اس کی اسکرپٹ زبان و بیاں کو دیکھنے کے لیے انھیں اپنے پاس اسسٹنٹ کے طور پر رکھنا چاہتے تھے مگر قاضی صاحب نے اپنی شرائط کے پیش نظر ان کی عرضی مسترد کر دی۔ اس کے علاوہ انھوں نے عصمت کی زندگی کے آخری ایام 85-1980 کا ذکر کیا جب وہ ان کے گھر آئی ہوئی تھیں۔ عمر کے اثر کے تحت بہکی بہکی باتیں کر رہی تھیں جس کا قاضی عبدالستار پر بہت اثر ہوا اور ان کی یاد میں غمزدہ رہتے تھے۔

''عصمت آپا اور ان کے طفیل میں''

نیا دور کے شمارہ نمبر 9، دسمبر 2019 میں ''عصمت آپا اور ان کے طفیل میں'' قاضی عبدالستار کا ایک مضمون شامل ہوا اس سے پہلے انھوں نے ''ذہین تیز آنکھوں والی عصمت آپا'' کے عنوان سے عصمت اور اپنی ذاتی زندگی علی گڑھ میں ان کی آمد کا مختصر تذکرہ کیا تھا۔ ساتھ ہی عصمت آپا نے ناول داراشکوہ کی جو تعریف وتوصیف کی اس کا بھی بیان ملتا ہے۔

''عصمت آپا اور ان کے طفیل میں'' یہ مضمون کافی وسیع اور طویل ہے اور اس میں انھوں نے سہیل وحید ایڈیٹر نیا دور اور ان کے استاد قمر رئیس کے توسط سے اپنی زریاس زریاس محفلوں کا ذکر کیا ہے اور علمی وادبی محفلوں کا خوبصورتی سے ذکر کیا ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے تنقید ادبی تنقید اور اردو تنقید اور نقادوں کے حوالے سے گفتگو کی ہے۔

علی منزل کی ایک محفل اور قاضی عبدالودود کی صدارت اور ان کی آرا کو پیش کیا ہے۔ قاضی عبدالودود نے افسانے پر اپنے خیالات کا اظہار فرمایا اور کہا:

> ''عصمت چغتائی عورتوں کی زبان لکھنے میں ماہر ہیں اوسط درجے کے خاندانوں کی خواہش کی جذباتی پیشکش اچھی ہے۔ ''چوتھی کا جوڑا'' اردو کے اچھے افسانوں میں شمار ہونے کے لائق ہے۔ اس کے بعد قاضی صاحب نے محفل کو گھور کر دیکھا اور فرمایا میں ایک جملۂ معترضہ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ میں جب کرسئ صدارت پر بیٹھا تو کچھ آنکھوں میں تحیر کی چمک کی دیکھی یعنی جس محفل میں عصمت چغتائی بیٹھی ہوں اس کی صدارت میں نے جو تحقیق کی شد بد رکھتا ہے کیسے قبول کر لی۔ تو سنئے فخرالدین علی احمد بیرسٹر نوارالدین خاکسار نے ایک ساتھ آکسفورڈ سے بی۔اے آنرز کیا ہے۔ ہم تینوں کا مطالعہ خصوصی یورپین فکشن تھا۔ ہم لوگوں نے امتحان میں جو ستر اسی اسی صفحے لکھے ہیں وہ اگر ہمارے پاس ہوتے اور ہم ان کا ترجمہ چھپوا دیتے تو اردو فکشن کی بعض تنقیدی

کتابوں پر بھاری پڑتے۔ مغربی تنقید صفحات کے استعمال میں بہت محتاط ہوتی ہے۔ جبکہ
ہماری ایشیائی تنقید صفات کا استعمال دال بھات کی طرح کرتی ہے۔''18

اس بیان کی روشنی کے بعد قاضی عبدالستار نے تنقید کے تئیں اپنی بھڑاس نکالی اور اپنا مشہور زمانہ جملہ لکھا ہے:

''اردو نثر کی اصناف میں سب سے کمزور صنف کا نام تنقید ہے۔ اردو تنقید اردو ادب کا
بدگوشت ہے۔
ادب کے دوڑتے ہوئے گھوڑے کی پیٹھ کے زخم پر بیٹھی ہوئی مکھی کا نام تنقید ہے۔ تنقید
کے تولد ہونے سے پہلے عظیم شاعری پیدا ہو چکی تھی۔ میر، غالب، انیس اور اقبال کی
شاعری کی رشنیوں کے مینار منور ہو چکے تھے۔ تنقید کے وجود میں آنے کے بعد کوئی عظیم
شاعر پیدا نہیں ہوا۔''19

پھر انھوں نے عصمت آپا کے افسانوی ادب کی تعریف اور ہم عصر تنقید پر لعنت ملامت کی۔ تنقید لکھنے لکھانے اور ایوارڈ شہرت کی خرید وفروخت پر اپنے غم و غصے کا اظہار کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''یہ تو عصمت چغتائی اور ان کے ہم عصروں کا کمال ہے کہ تنقید کی آپا دھاپی کے باوجود
افسانوی ادب کے معجزات سرانجام ہو سکے۔ عصمت چغتائی اور ان کے ہم عصر اگر مغرب
کی کسی زبان میں پیدا ہوئے ہوتے تو ان میں سے ہر ایک پر کم از کم ایک درجن تنقیدی
کتابیں وجود میں آ چکی ہوتیں۔ لیکن ہماری تنقید بے چاری دلالی اور گروہ بندی اور خود
سرپرستی کی دلدل میں دھنسی پڑی ہے۔ اگر آپ بعض پیشہ ور نقادوں کا جائزہ لیجیے تو عجب
تماشا نظر آتا ہے یعنی شعر کی سنا نہیں گیا افسانہ لکھا نہیں گیا۔ دو چار کتابیں سامنے رکھیں
، کچھ کاغذ قینچی اور گوند فراہم کیا ایک کتاب تیار ہو گئی اور نقاد ہو گئے۔ چل نکلے حکام رسی
پیدا کی۔ خوشامد کے ڈھیر لگا دیے۔ ایوارڈ مل گئے۔ گروہ بن گئے۔ جریدے نکلنے لگے۔
عظمتوں کی ریوڑیاں نچھاور ہونے لگیں۔ شہرت کے ڈھول بجنے لگے۔ جب تک جیتے
ہیں حلوہ مانڈہ چل رہا ہے۔ جس دن آنکھ بند ہوئی اردو کی تاریخ کے کوڑے دان میں

18: مضمون عصمت آپا اور ان کے طفیل میں۔ قاضی عبدالستار۔ مشمولہ۔ نیا دور، لکھنؤ، اگست 2017ء۔ ص: 14

19: مضمون عصمت آپا اور ان کے طفیل میں۔ قاضی عبدالستار۔ مشمولہ۔ نیا دور، لکھنؤ، اگست 2017ء۔ ص: 14

پھینک دیے جائیں گے۔''20؎

اس مضمون میں انھوں نے ایک محفل کا ذکر کیا ہے جب جدیدیت کی تحریک پروان چڑھی اور لوگ جدیدیت کے فریب میں ایسے مبتلا ہوئے کہ ترقی پسند تحریک کو برا بھلا کہنا اپنا شیوہ بنا لیا مگر ایسے ماحول میں بھی قاضی عبدالستار جیسے لوگ جدیدیت کے مقابلے میں ترقید پسندیت کے حق میں تقریریں کیں۔اس وقت آل احمد سرور جنھیں مختلف جگہوں پر قاضی صاحب نے انھیں اردو ادب کے اللہ میاں کے نام سے پکارا ہے ان سے ہونے والی آپسی تلخی کا بھی ذکر کیا ہے ساتھ ہی احتشام حسین پنڈت ہربنس لال شرما جیسے لوگوں کی تائید کا اظہار بھی کیا ہے۔تقریر کے بعد احتشام حسین نے قاضی صاحب سے ان کی ریڈر بننے میں آنے والی اڑچنوں کا اظہار کیا ہے کیونکہ قاضی عبدالستار آل احمد سرور اور ان جیسے اردو کے لوگوں سے دشمنی مول لے لی تھی تب احتشام حسین کو قاضی صاحب نے جواب دیتے ہوئے کہا:

> ''سر ہم نے کسٹوڈین اور خاتمہ زمینداری کا عذاب جھیلا ہے۔ریڈر شپ کو بھی دیکھ لیں گے۔'' 21؎

قاضی عبدالستار نے اس مضمون میں کھلم کھلا یہ بھی لکھا ہے کہ وہ افسانہ نگاروں کی ایک راوی نام سے انجمن بنائی تھی جس کے جلسے ہر اتوار کو ہوتے تھے اور وہاں طلبہ وطالبات گرم جوشی سے حصہ لیتے تھے اور جنھیں بند کرنے کے لیے آل احمد سرور صاحب نے آرڈر دیا۔اس کے علاوہ رشید احمد صدیقی کی مشفقانہ ہمدردانہ طبیعت کا ذکر کیا۔ان کے علم وادب ان کی نثر کی تعریف وتوصیف نہایت خلوص کے ساتھ بیان کی ہے۔

ساتھ ہی نثر کی ایک اہمیت وافادیت کے مختلف پہلوؤں کو بیان کرتے ہوئے نیر مسعود کی نثر کی تعریف بیان کی ہے۔نثر کے لیے ان کے یہ جملے کافی مشہور ومعروف ہیں:

> ''کسی زمانے میں کسی آسمان سے ایسی کوئی کتاب نہیں اتری جس میں لکھا ہو کہ یہ نثر کے اوزار ہیں۔یعنی نثر کے زیور ہیں۔نثر کو اپنی آرائش وزیبائش کے لیے کسی دیوانے (شاعر) کے دیوان سے فیضیاب ہونے کی ضرورت نہیں نثر کا شجرۂ نسب آسمانی کتابوں سے جا ملتا ہے۔تمام آسمانی کتابیں نثر میں اتری ہیں جس زبان وبیان کا کوئی کمال ایسا نہیں جو ام الکتاب قرآن میں موجود نہ ہو۔حضرت موسیٰ جب طور پر اللہ سے کلام کرتے

20؎ مضمون عصمت آپا اور ان کے طفیل میں۔قاضی عبدالستار۔مشمولہ۔نیا دور،لکھنؤ،اگست 2017ء۔ص:14

21؎ مضمون عصمت آپا اور ان کے طفیل میں۔قاضی عبدالستار۔مشمولہ۔نیا دور،لکھنؤ،اگست 2017ء۔ص:15

ہیں تو جواب نثر میں ہی آتا ہے یعنی اللہ کی زبان بھی نثر ہے اور پیغمبر کی زبان بھی نثر ہے ۔یہ جوایک فریب خیال ہے کہ شاعری جزو پیغمبری ہے سراسر غلط ہے۔اس لیے کسی شاعر پر پیغمبری نازل نہیں ہوئی کسی پیغمبر نے دیوان تخلیق نہیں کیا۔نثر وہ قالہ عالم ہے جس کی پاپوش گوہر پوش کے ایک ٹوٹے ہوئے موتی کا نام شاعری ہے ۔اردو نثر کے چار اسالیب ہیں۔محاوراتی اسلوب، استعاراتی اسلوب، تمثیلی اسلوب اور صحافتی اسلوب جسے علمی اسلوب بھی کہا گیا ہے۔'' 22ؔ

اس کے بعد قاضی عبدالستار نے اسلوب کی مختلف مثالوں کو پیش کیا ہے اور کہانی اور افسانے کے وجود اور اس کی ضرورت پر بات کی ہے تا کہ لوگ غور وفکر کریں۔نثر کے اسالیب کے ساتھ روز مرہ کی زندگی میں اردو کے خالص محاوراتی زبان کا استعمال اردو کی شیرینی، لطافت کا ذکر کیا ہے۔جہاں قدرتی طور پر تشبیہ، استعارہ اور علامت فطری طور پر موجود ہیں۔صنادی اور سادگی دونوں موجود ہے جیسے کہ تاج محل میں ہے اور اس کے حسن سے کوئی منکر نہیں ہے۔لکھتے ہیں:

''جب معمولی نثر لکھنے والے اپنی مفلس اور کنگال نثر پر سادگی کا الزام لگاتے ہیں اور فن کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں تو درحقیقت وہ اپنی ادبی عربی اور عاجزی پر موہوم سادگی کا پردہ ڈالنے کی احمقانہ کوشش کرتے ہیں۔پھر کہتا ہوں صناعی کی دولت کے بغیر سادگی افلاس ہے۔''

23ؔ

اس مضمون میں قاضی صاحب کی انانیت، ان کی خود پسندی کی بوصاف طور پر نظر آتی ہے۔انانیت ادب کی زندۂ جاوید مثال ابوالکلام آزاد کو کہا جاتا ہے مگر انانیت اسلوب قاضی عبدالستار کے قلم کی مرہون منت ہے۔مضمون کو پڑھتے ہوئے ایسا لگتا ہے کوئی خطیب زور شور سے آسمان کی بلندیوں سے لفظوں کے تیر برسا رہا ہے مگر اس تیر سے زخم بننے کے بجائے پھول اگ رہے ہیں اور پھولوں کی بارش اور اس کی خوشبو سے قاری لطف اندوز اور مدہوش ہو رہا ہے۔زبان و بیان کی لطافت، چاشنی اور شیرینی پل بھر کے لیے نقد و نگاہ کو دور کر دیتی ہے اور صرف قاری داستانوی اساس بن جاتا ہے۔اقتباس ملاحظہ ہوں:

''یہ خیال بھی غلط ہے کہ بہت سے لوگ میری طرح رنگین نثر لکھ رہے ہیں جو دوست

22ؔ: مضمون عصمت آپا اور ان کے طفیل میں۔قاضی عبدالستار۔مشمولہ۔نیا دور، لکھنؤ، اگست 2017ء۔ص:18

23ؔ: مضمون عصمت آپا اور ان کے طفیل میں۔قاضی عبدالستار۔مشمولہ۔نیا دور، لکھنؤ، اگست 2017ء۔ص:19

بنانے کے ہنر سے قطعاً ناواقف اور دشمن بنانے کے فن میں بے مثال جس کی بات روکھی
چال ٹیڑھی فیض پہنچانے والے وسائل سے محروم اور نقصانات پہنچانے والی صلاحیت
معدوم تادم تحریر میری زندگی اور آرٹ پر چالیس مضامین اور سات کتابیں شائع ہو چکی
ہیں۔ کسی ایک صاحب قلم نے دھوکے سے بھی ایک جملہ ایسا نہیں لکھا ہے جس سے یہ
شک پیدا ہو کہ میں نے کسی کے رنگ میں لکھا یا کسی نے میرے رنگ میں ایک صفحہ بھی
مرقوم کیا ہے۔ اردو فکشن کی تاریخ میں کوئی ایک فکشن نگار ایسا نہیں پیدا ہوا جس نے تین
اسالیب میں ناول لکھے ہوں۔ میں نے ایک اسٹائل میں ''شکست کی آواز'' شب گزیدہ
(مجو بھیا) غبار شب بادل (بادل باقر مہدی نے علامتی ناولٹ لکھا ہے) آخری کہانی اور
شب انتظار (زیر طبع) دوسرے اسٹائل میں غالب ،حضرت جان اور تاجم سلطان
لکھے۔ اسلوب جلیل یعنی گرینڈ اسٹائل رزمیہ نثر کے جمال وجلال سے مالا مال صرف
پوری کتاب لکھ دی۔ اس گرینڈ اسٹائل میں ناول صلاح الدین ایوبی، داراشکوہ، خالد بن
ولید لکھی گئیں۔ اردو تنقید نے جو تغافل برتا اس کی تلافی ہندوستان کی ملٹری اکادمی نے
کردی۔ یعنی میری کتابیں اپنے نصاب میں شامل کرلیں۔ آزاد ہندوستان کی دوسری
زبانوں کے بارے میں مجھے نہیں معلوم لیکن اردو ہندی کے کسی فکشن نگار کی کوئی کتاب
ملٹری اکادمی کے نصاب میں شامل نہیں ہے۔ یہ شرف خدا نے صرف مجھے عطا فرمایا۔ اس
میں میرا کوئی شریک نہیں، کوئی حریف نہیں۔
جدید فکشن کی تاریخ میں پریم چند سے لے کر سید محمد اشرف تک کسی فکشن نگار نے ایک
میدان جنگ بیان کرنے کی جسارت نہیں کی۔ خاکسار نے تقریباً ایک درجن میدان
جنگ پیش کیے ہیں۔ اس صفت خاص میں میرا کوئی جواب نہیں۔ میرا کوئی مثل نہیں۔''
24ے

اس مقالے میں انھوں نے رشید احمد صدیقی سے اپنے تعلق خاص اور ان کی بیٹی سلمٰی صدیقی کا بھی
ذکر نہایت پر تمکنت انداز میں کیا ہے۔ ادبی و علمی محفلیں رونقیں نثر و نظم چہل پہل پر لطف محاوراتی جملے یا
داستان زندگی کے خوبصورت دور کی زریں یادیں اس مضمون میں انھوں نے ایک پورے عہد کو زندہ کرنے کی

24ے: مضمون عصمت آپا اور ان کے طفیل میں۔ قاضی عبدالستار۔ مشمولہ۔ نیا دور، لکھنؤ، اگست 2017ء۔ ص: 19

کوشش کی ہے۔لکھنؤ کی تہذیب نشست و برخاست مٹتی ہوئی فضا میں محو خوشبو بدلتے ہوئے سماجی اقدار کا مرثیہ پس مردہ زبان میں جیتے ہوئے نقاد وقار و معیار سے گرتے ہوئے علمی وادبی رسالے بیک وقت سب موجود ہے۔ یہ ان کا آخری مضمون ہے جس میں انھوں نے اپنی زندگی کے خوبصورت پل کے ساتھ وقت کی بدلتی چال کا ذکر کیا ہے۔

مضمون لکھتے وقت انھیں شاید اس بات کا بخوبی احساس تھا کہ یہ ان کا آخری مضمون ہے۔خودداری، زودحسی جو بچپن میں کردار میں شامل تھی اس آخری مضمون میں بھی بدرجۂ اتم موجود ہے اور اپنی علمی زندگی کی ان سچائیوں کو بتا کر وہ اس دارفانی سے کوچ کرتے ہوئے یہ پیغام بھی دیا کہ اب اردو دنیا میں قاضی عبدالستار جیسا انانیت اور قول محال کا بادشاہ دوبارہ جنم نہیں لے گا جو بہ بانگ دہل اپنے دوست و دشمن کا اعلان کرتا ہے، جس کے اندر انانیت کوٹ کوٹ کر بھری ہو جسے نہ ستائش کی تمنا اور نہ صلے کی پرواہ، وہ جو کرتا ہے اور لکھتا ہے اپنے قلم سلطانی کے بل پر کرتا ہے اور ایسے لوگ اعزاز اور ایوارڈ کی آرزو سے کوسوں دور ہوتے ہیں۔

> ''جناب سہیل وحید صاحب ستاسی سال کی عمر ہے۔خیال آتا ہے کہ ممکن ہو یہ آخری تحریر ہو تو مکمل ہی کردوں۔ میں نے آج تک کسی استاد(بشمول استاد معظم، پروفیسر مسعود حسین رضوی، استاد مکرم پروفیسر احتشام حسین، استاد محترم پروفیسر آل احمد سرور، استاد محتشم پروفیسر رشید احمد صدیقی) کو کوئی کتاب پیش کی کہ حضور اپنی قیمتی آرا سے نواز دیجیے۔ کسی نقاد، کسی جریدے، کسی میگزین، کسی رسالے کی خدمت میں کوئی کتاب پیش نہیں کی کہ تبصرے کی دولت سے مالا مال کر دیجیے۔ کسی انعامی یا ایوارڈ کمیٹی کو کوئی کتاب نہیں بھیجی کہ جناب اسے بھی پڑھ لیجیے اس لیے کہ مجھے معلوم ہے کہ اردو دنیا میں جہاں بھی اردو نثری ادب پڑھا جاتا ہے میری تحریریں پڑھی جاتی ہیں۔''[25]

قاضی عبدالستار کی شاعری:

قاضی صاحب نے شاعری بھی کی، نظمیں لکھیں، غزلیں بھی خوب کہیں، ان کی غزلوں کا رنگ کلاسیکی ہے۔ان کے موضوعات اور ڈکشن دونوں میں غزلیہ روایت کی پاسداری ملتی ہے مگر غزل کی تنگ

25۔ مضمون عصمت آپا اور ان کے طفیل میں۔قاضی عبدالستار۔مشمولہ۔نیا دور، لکھنؤ، اگست 2017ء۔ص:20

دامنی کی شکایت کرتے ہوئے لکھا کہ وہ جو کہنا چاہتے ہیں یا جو لکھنا چاہتے ہیں ان کے دل و دماغ میں جو باتیں موجود ہیں وہ غزل کے نفس مضمون میں مکمل نہیں ہوسکتیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ دھیرے دھیرے غزل کی دنیا سے واپس لوٹنے لگے اور مکمل طور سے فکشن کے ہو کر رہ گئے۔

شاعری سے دوری سے متعلق ایک واقعہ بھی اکثر بتاتے ہیں کہ ایک بار کہیں مشاعرے کے لیے گئے ہوئے تھے۔ ادھر کچھ لڑکیاں آنے لگیں پیچھے سے ان کی ماں نے انھیں یہ کہتے ہوئے روکا ارے لڑکیو! ادھر نہ جاؤ ادھر شاعر سویا ہوا ہے۔ غرض انھیں لگا شاعر کی کوئی عزت نہیں ہے۔ قاضی صاحب کی چند مختصر غزلوں کو دیکھ کر کوئی حکم صادر نہیں کیا جا سکتا کہ وہ مستقبل میں کیسا شاعر ہوتے لیکن انھوں نے شاعری کی طرف توجہ کم فرمائی اگر چہ مشاعروں میں باقاعدہ شرکت کرتے تھے۔ لیکن انھوں نے ارادہ کر لیا تھا کہ شاعری کو ادبی اظہار کا وسیلہ نہیں بناؤں گا لیکن شاعری سے ان کی دلچسپی برقرار رہی اور وہ مشاعروں میں شرکت کرتے رہے۔

ان کی نثر میں ان کی شاعری اہم رول ادا کرتی ہے اور نثر کو نثری آہنگ کے ساتھ ساتھ شعری آہنگ بھی فراہم کرتی ہے جس کی وجہ سے ان کی نثری تخلیقات دو آتشہ بن جاتی ہیں۔

ان کی شاعری کے کچھ نمونے یہاں پیش کیے جا رہے ہیں اور ان کی منتشر غزلوں اور نظموں کو اکٹھا کیا گیا ہے جو مختلف مؤقر رسائل و جرائد میں شائع ہوتی رہی تا کہ ان کے فکری و فنی محاسن کو جانچا و پرکھا جا سکے۔

یہ نظم سالنامہ ''شاہراہ'' کی جلد 6 شمارہ 1,2 جنوری۔ فروری 1959 میں شائع ہوئی۔ فراق کی نظم اس شمارے میں شامل نہیں ہے۔ ہاں اس شمارے میں فراق گورکھپوری کی غزل شامل ہے۔ غزل یہ ہے:

پیاس ایسوں کی کسی طرح کم ہو — جس کو آب حیات بھی کم ہوا
جس نظارہ سوز دیکھ سکوں — روشنی جمال مدھم ہوا

اس نظم کے بارے میں غیاث الدین سے گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''1950 میں بی۔ اے میں لکھنؤ یونیورسٹی آئے تو پہلی نظم ''گومتی کی آواز'' کہی۔ بینٹ ہال میں پڑھی تو دھوم مچ گئی۔ وہ ترقی پسندی کے رسالے ''شاہراہ'' میں 1952 میں

شائع ہوئی۔ وامق جونپوری اس کے ایڈیٹر تھے۔ انھوں نے بھی نوٹ لگایا۔ تصویر چھاپی
اور فراق سے پہلے ہماری نظم چھپی۔''[26]

اس رسالے میں قاضی عبدالستار کی کوئی تصویر شامل نہیں ہے اور نہ ہی فراق کی نظم موجود ہے۔ اس نظم سے متعلق راشد انور راشد سے سوانحی گفتگو میں فرماتے ہیں:

''مارچ 1954 میں ترقی پسندوں کے جریدے ''شاہراہ'' میں جس کے ایڈیٹر وامق جونپوری تھے پورے ایک صفحے کے ادارتی نوٹ کے ساتھ میری انقلابی نظم ''گومتی کی آواز'' شائع ہو چکی تھی۔''[27]

اس انجمن گل میں کے عنوان کے تحت وامق جونپوری نے قاضی عبدالستار کے حوالے سے لکھا ہے:

''پہلے حصے میں اٹھائیس نظمیں ہیں جس میں تقریباً اٹھارہ جوش، ندیم اور جذبی جیسے کہنہ مشق شاعروں کی ہیں باقی دس بالکل نوخیز شعراء کی تخلیقات ہیں۔ نئے لکھنے والوں میں قاضی عبدالستار نے اپنی نظم ''گومتی کی آواز'' پیش کر کے اپنی فنکارانہ صلاحیتوں کا بڑا اچھا ثبوت دیا ہے۔'' [28]

گومتی کی آواز (طلبا کی تحریک پر) یہ نظم 1947 میں کے فسادات سے متاثر ہو کر لکھی گئی تھی۔

قاضی عبدالستار

گومتی کی آواز

(طلبا کی تحریک پر)

جانے کیسی سوچ میں ڈوبی ہوئی لیٹی ہے رات — بیکسی جھک جھک کے کرتی ہے لب و عارض کو پیار
خامشی کی بیڑیاں پہنے کھڑی ہے زندگی — کون جانے کیا ہوا گائے ہوئے گیتوں کا ہار
دھیمی دھیمی لے میں لوری دے رہی ہے چاندنی بنیا لگائے — جیسے بوڑھی مطربہ گاتی ہے تھم تھم کر ملہار
آسماں کی گود میں بکھرے ہوئے تاروں کے ڈھیر — ہمدم بستر پہ جیسے ملگجے پھولو ں کے ہار

---

[26]: نذر قاضی عبدالستار۔ پروفیسر غیاث الدین۔ ص: 437

[27]: اسرار و گفتار۔ راشد انور راشد۔ ص: 155

[28]: شاہراہ۔ ایڈیٹر: وامق جونپوری۔ سالنامہ 1954

''ورسٹی'' کے سرمئی گنبد پہ روتا ماہتاب
جانے کس کی راہ تکتی ہے نگاہ سوگوار!

''کاسنی'' کرنوں میں ڈوبا چھتر منزل کا جمال
سوگیا ہے توڑکر اپنی محبت کا ستار

گھاس کی بھیگی ہوئی پلکوں پہ شبنم کے چراغ
جیسے جوگن کررہی ہو دیپ مالا کا سنگھار

گومتی!اے لکھنؤ کی مریم مینا وجام
کس کے ماتم میں کھلی ہے تیری زلف تابدار

جیسے اک بیوہ کی چادر کہہ رہی ہو درد دل
چاندنی اوڑھے کھڑی ہے اس طرح تیری بہار

کل خرام ناز کے جادو سے ان بن تھی.....مگر
آج کیوں چھلچھلا گئے چلتی ہوئی موجوں کے وار

کچھ بتا بھی کیا دل ناشاد گزری ہے آج
میں تو برسوں رہ چکا ہوں تیرے غم کا رازدار

صبر کی کھیتی پہ اب بجلی چمک جانے کو ہے
دیکھ میرے غم کا پیمانہ چھلک جانے کو ہے

کیا کہوں اے شاعر آشفتہ دل برباد غم
تیری تعبیروں نے بھی دیکھا نہ ہوگا ایسا خواب

آج مجھ پر رورہی ہے عصمت شام اودھ !
کون جانے کن گناہوں کاپڑا مجھ پر عذاب

گل کہ شعلہ ہو رہاتھا سینۂ جمنا کا دل
میرے گلشن میں مگر کھلتے رہے میرے گلاب

میرا دامن اوریہ افسانہ تیغ وسناں!
اس بڑھاپے میں پڑی مجھ پر نگاہ انتخاب

''ظلم چنگیزی'' کا میری بزم میں پرچم کھلے
میر ی محفل میں ''ہلاکو'' کی کہانی باریاب

نوک پر خنجر کے یوں جمہوریت تولی گئی
جیسے اک بنیاپکائے اپنے روکڑکا حساب

ہائے وہ امن واماں کے چاندتارے دل کا چین
جن کے ناموں کی قسم کھاکر اٹھے گا انقلاب

گود میں تڑپ کر سوگئے دھرتی کے دل
آسماں سے جو اتاریں گے بغاوت کی کتاب

جن کی چھاتی پر علم گاڑے گئے تاریخ کے
جن کے چہرے صبح فردا کے چمکتے آفتاب

جن کی مٹی سے صنم ڈھاکے گئے تہذیب کے
جن کے آنسو شام بلدا کے دمکتے ماہتاب

شمع آزادی کے پروانے بغاوت کے چراغ
برف کےتودوں کوبخشا ہے جنھوں نے سوز وتاب

بز م افرنگی میں یوں لوح وقلم لے کر اٹھے
بندہوکر رہ گئی جبر حکومت کی کتاب

زلزلوں کے ساز پر اٹھے رجز گاتے ہوئے
فتح نے جھک کر سلامی دی ظفر نے لی رکاب

آتشیں چہروں پہ اپنے فرض کی عظمت کا پاس
جس طرح شبنموں کی باتیں کررہے ہوں آفتاب

اس طرح جھنجلا کے تخت وتاج پر ڈالی کمند
ناچتے طاؤس پر جیسے جھپٹتے ہیں عقاب

خون میں ڈوبے کفن ماضی کے افسانوں پہ بات
رات کے حملوں سے ٹکراتی شفق کا پیچ وتاب

بات پر آتے ہیں تو قسمت سے لڑ جاتے ہیں وہ
چشمۂ حیراں کو بھی ورنہ سمجھتے ہیں سراب

گیس گولی سے نہتوں کی لڑائی کب تلک
چاند کے لشکر پہ غالب آگئی فوج صحاب

موت کی وادی میں آئے تو مگرانداز سے
جیسے دولہن کے شبستاں پر قدم رکھے شباب

ان کی بیتابی کی سوگنداے حریم درد دل
سج رہی ہے صبح نور سر پر کلاہ آفتاب

نو نہالان گلستاں پر شباب آنے کو ہے
ہاتھ میں محضر لئے روز حساب آنے کو ہے

باغباں سے کہہ رہی ہے جنبش لوح وقلم
کل رسن اور دار کے بدلے چکائے جائیں گے

آج تو گلشن نصیب گلر خاں ہے کل......مگر
نرگس بیمار کے بدلے چکائے جائیں گے

آج تو دامن رقیب کہکشاں ہے کل مگر
دیدۂ خونباز کے بدلے چکائے جائیں گے

گولیوں کے بھاؤ پر بکتا تو ہے اپنا لہو
کل اسی بازار کے بدلے چکائے جائیں گے

اپنی محفل ، اپنی مینا، اپنے ساغر اپنی ہے
قبضۂ اغیار کے بدلے چکائے جائیں گے

پیر میخانہ ترے دستور کہنہ کی قسم!
حسرت میخوار کے بدلے چکائے جائیں گے

آج ہنستے ہیں پہن کر طوق بھی زنجیر بھی!
کل انھیں آزار کے بدلے چکائے جائیں گے

ہر چراغ لالہ میں چمکے گا خون باغباں
ہر کھٹکتے خار کے بدلے چکائے جائیں گے

ہر قدم پر پھول اور موتی کے لہرائیں گے گیت
فصل آتشبار کے بدلے چکائے جائیں گے

ہر کلی دولہن بنے گی ہر روش کوئے حبیب
یوں فراق یار کے بدلے چکائے جائیں گے

سکھ بھرے اقرار کی محفل میں پریاں گائیں گی
دکھ بھرے انکار کے بدلے چکائے جائیں گے

کشتیٔ مجبور کا ساحل بھی طوفانوں میں ہے
تیرا افسانہ بھی شامل میرے افسانوں میں ہے

☆☆☆

غزل

لگتی نہیں پلک سے پلک نیند اب کہاں
جاگو کہ ہجر دیدہ ومژگاں کی رات ہے

مہماں سرائے چشم کی آرائش کرو — آخر یہ رات آمد مہماں کی رات ہے
ہرہر پلک کو لعل وجواہر میں تول دو — یہ انتظار خسرو یاراں کی رات ہے
ناخن چلاؤ یار کے کرنے لگے ہیں زخم — داغوں میں آگ دو کہ چراغاں کی رات ہے

حوالہ غزل: شمارہ 2، علی گڑھ میگزین 1957 ایڈیٹر قمر رئیس

نظم جہاں کی زلف ستم پیشہ کھول دو — یہ جاں بہانے عارض تاباں کی رات ہے
دستک جو روزگار زندگی چہ دے — کہہ دو یہ رات مرضی جاناں کی رات ہے
آنسو جلاؤ مانہ ہوئے جاتے ہیں چراغ — پیماں شکنئے وعدۂ پیماں کی رات ہے

غزل

نہ ہم پر انگلیاں اٹھیں نہ تم پر اتہام آئے — ہمارا ہاتھ جب سو جائے تب گردش میں جام آئے
کچھ اتنا ربط باہم ہو اک ایسا مقام آئے — فلک کی چوٹ ابھرے آپ کا ہونٹوں پہ نام آئے
گہر تو کنکروں کے مول بک جاتے ہیں دنیا میں — ہم اس آنسو کو روتے ہیں جو اپنے غم میں کام آئے

حوالہ غزل: علی گڑھ میگزین 1959 شمارہ 1 ایڈیٹر سید حسن مثنیٰ انور

مزاج کفر نے سیماب پا رکھا ہمیں ورنہ — تمھارے آستانے تک کئی بیت الحرام آئے
بڑا شہرہ تھا دنیا کا کہ اک کروٹ نہیں ہوتی — ہمارے گھر تو مدت سے سحر آئے نہ شام آئے
فلک نے سر جھکا کر پانوں سے کانٹے نکالے ہیں — زمیں والوں کی منزل میں کچھ ایسے مقام آئے

ناچ (نظم)

محفل یادوں کی جم گئی ہے
ماضی کی اک حزیں کہانی
پہنے ہوئے پیرہن وفا کا

گھنگھرو پیروں میں آنسوؤں کا

کتنی ہی اداس لمبی راتوں

کا کاجل آنکھ میں لگا ہے

کتنے ہی حسین دنوں کی خوں سے

اک اک ناخن کو یوں رنگا ہے

رسموں کی جراحتوں کے زیور

ریتوں کی رقابتوں کے گہنے

پہنے ہوئے گیت گا رہی ہے

تجدید کا ناچ ناچتی ہے

حوالہ نظم: 61-1960 علی گڑھ میگزین مدیر سید امین اشرف

جتنے بھی غم تھے زندگی کے

سب بیٹھے ہیں دم بخود سے

بے چاری زمین کھوگئی ہے

غزل

افق کے دوش سے اک نازنیں ابھرتی ہے
سحر کا کام نہ لو میری شمع ڈرتی ہے

تیرے خیال سے یوں جگمگا اٹھے خدوخال
کہ نام ودرپہ کہیں چاندنی اترتی ہے

لپٹ لپٹ کے امیدوں سے پہروں روئے ہیں
کرن سحر کی دھندلکوں سے جب ابھرتی ہے

اسے بھلاکے غم زندگی سے الجھے ہیں
کوئی بتائے کبھی آرزو بھی مرتی ہے

تمھاری زلف میں صدیاں پروئیں گے لیکن
ابھی نہ آؤ ابھی زندگی سنورتی ہے

نہ چاند دیکھ کے روئے نہ بولے تاروں سے
ستم کی رات کہیں اس طرح گزرتی ہے

متفرق اشعار

کہاں نصیب کہ دامن پہ سوکھتے دریا
مگر کبھی تو ذرا آستین ڈبو لیتے

جہان میں نصب فریاد کس کو ملتا ہے
تمھیں بہت ہے سلیقے سے خسروی ہی کرو

آنکھ قاتل آنکھ بیگانہ کی بیگانہ رہی
اور وہ کمبخت چہرہ آشنا کا آشنا

میں کاکل و زنجیر کی صحبت میں رہا ہوں
یہ بھی خس وخاشاک ہے وہ بھی خس وخاشاک

نہر خوناب پہ بیٹھے رہو دھوتے رہو زخم
ہو رہا ہے ابھی تاریخ کے مقتل کا حساب

جانے کیا چیز کلیجے کے قریب ٹوٹی ہے
آج اچھی نہیں لگتی مجھے کوئی بھی شراب

تیری آنکھ کھلی جب بھی تو یہ عالم دیکھا
کہیں پھوٹا ہوا گنبد کہیں ٹوٹی ہوئی محراب

رات کی زلف کمر تک ابھی پہنچی بھی نہیں

اور پہلو میں نہ معشوق نہ بوتل میں شراب

یاد آتی ہیں کسی قدر آنکھیں
وقت رخصت وہ تر بتر آنکھی

ہم نے اک شخص کی حیا کے لیے
اپنے لب سی لیے مگر آنکھیں

کیا اس نے کہا تھا کیا ہم نے سنا تھا
اب رات نہیں کٹتی اب نیند نہیں آتی

اٹھ کر تیری محفل سے چلے آئے ہیں لیکن
چلتے ہیں تو لگتا ہے زنجیر پڑی ہے

لکیر جو ورق دل پر جگمگائی ہے
تیرے قدم کے چراغوں کی روشنائی ہے

بحوالہ: نذر قاضی عبدالستار۔مرتب پروفیسر غیاث الدین ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،نئی دہلی،ص:604

مری بات روکھی مری چال ٹیڑھی
مجھے میرؔ جانا ہے یاں کم سو نے

قاضی عبدالستار کا نکہت شاہجہاں پوری کی کتاب پر ایک تبصرہ ہماری زبان میں شائع ہوا جس میں انھوں نے اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا ہے:

مجاز وحقیقت پروفیسر نکہت شاہجہاں پوری صدر شعبۂ فارسی واردو جی ایف کالج شاہجہاں پور کا مجموعۂ کلام ہے۔متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔نظم ونثر دونوں سے یکساں شغف رکھتے ہیں۔زیرِنظر مجموعہ موضوعات کی رنگارنگی کے لحاظ سے انفرادی خصوصیات رکھتا ہے۔مثلاً 270 کا یہ چھوٹا سا مجموعہ مندرجہ ذیل ابواب پر مشتمل ہے۔حقائق، روحانیات، اقبالیات، جلوہ از فطرت، بزم رومان، غزل وتغزل، درس عمل، سیاسیات، شخصی تاثرات اور تجزیہ شعری۔

نکہت شاہجہاں پوری نے تجربات وتجربہ شعری کے عنوان سے ایک الگ باب قائم کیا ہے۔اس میں بارہ واقعات بیان کیے ہیں۔ہر واقعہ تحریک شعری کے اسباب وعلل اور نتیجہ وانعام کی کہانی سناتا ہے۔ان کا مطالعہ وسیع اور مذاق متنوع ہے۔مجموعۂ کلام پڑھنے اور لطف اٹھانے کی چیز ہے جو لالہ رام دیال اگروال، پبلشر الہ آباد سے ڈھائی روپیہ میں مل سکتا ہے۔

اس تبصرے میں اس تحقیقی مقالے میں شامل کرنے کا مقصد یہ ہے کہ قاضی صاحب کی وہ تمام تحریریں جو ادھر ادھر بکھری ہوئی ہیں یکجا ہو جائیں۔ساتھ ہی قاضی عبدالستار کی شخصیت کا ایک اور پہلو جو تبصرہ کی حیثیت سے پردۂ خفا میں ہے وہ بھی نظر آ جائے۔

سہ ماہی آمد کتابی سلسلہ جلد 1 اکتوبر تا دسمبر 2012 شمارہ 1 میں قاضی عبدالستار کا ایک مکتوب شامل ہوا جس کو انھوں نے خورشید اکبر کے نام لکھا تھا۔

''شہر آمد'' کے باب میں ''پدم شری قاضی عبدالستار کا ذاتی خط خورشید اکبر کے نام'' عنوان سے شائع ہوا۔اس قاضی عبدالستار کی ذاتی زندگی کا اندازہ ہوتا ہے ساتھ ہی خط پڑھ کر احساس ہوتا کہ قاضی صاحب ایک دردمند دل رکھتے تھے ان کے دل میں اپنے چھوٹوں اپنے خوردوں سے ہمیشہ ایک والہانہ لگاؤ رہا، محبت کا جذبہ رہا، عمر کے آخری ایام میں انھوں نے خورشید اکبر کے نام اس خط میں اپنے ذاتی تعلقات بیگم حمیدہ آپا سابق صدر جمہوریہ فخر الدین علی احمد کی بہن اور اختر بیگم کا ذکر نہایت مشفقتوں اور محبتوں کے ساتھ اور ان سے جڑی اپنی باتوں کو ساجھا کیا ہے۔

1969 میں پٹنہ یونیورسٹی میں اردو ادب کے کہکشاؤں کے ساتھ غالب ڈے منایا گیا جس میں وقت کے مشہور ادب کے ستارے کلیم الدین احمد، قاضی عبدالودود، پروفیسر اعجاز حسین، پروفیسر احتشام حسین،

پروفیسر آل احمد سرور، پروفیسر خواجہ احمد فاروقی، پرویز عبدالقادر سروری اسٹیج پر موجود تھے اور صدر جلسہ کا اعزاز قاضی صاحب کو بخشا گیا اس خوبصورت اور یادگار جشن کا ذکر ملتا ہے۔

قاضی عبدالستار نے اس خط میں خورشید اکبر سے اپنی ہماری مارچ 2012 میں جب انھیں ہارٹ اٹیک آیا تھا اس کا ذکر کیا ہے ساتھ جگر کی شکایت جدید طب کے مطابق ہارٹ کے علاج کا بیان ملتا ہے۔ یہاں انھوں نے ذاتی باتیں کی ہیں۔ ایک بیمار انسان کی زندگی کتنی مشکل ہوتی ہے۔ وہ کیسے سروائیو کرتا ہے۔ قاضی صاحب زندہ دل انسان تھے۔ وہ اپنی زندگی کے ہر دن کو زندہ دلی سے گزارنے والے انسان تھے۔ کل کی فکر میں آج کو تباہ کرتے تھے۔ اس خط کو پڑھ کر اس بات کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس ذاتی خط کی بدولت قاضی صاحب کی شخصیت سے ایک نیا پردہ اٹھتا ہے۔

(مکالمہ)

احتشام حسین سے رام لعل، قاضی عبدالستار اور عابد سہیل نے ادبی گفتگو کی۔ یہ انٹرویو لکھنؤ سے 1965 ماہنامہ ''کتاب'' میں شائع ہوا۔ اس گفتگو میں رام لعل اور عابد سہیل نے احتشام حسین سے مختلف سوالات کیے۔ جن کو یہاں پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ہم قاضی صاحب ایک بڑے تخلیق کار کے ذہن میں کیا کیا سوالات جنم لیتے ہیں اور وہ ایک بڑے نقاد سے کس طرح کا سوال کرتا ہے اس بات کا اندازہ لگایا جا سکے عابد سہیل اور رام لعل کے سوالات سے قطع نظر یہاں صرف قاضی عبدالستار کے سوالات کو شامل کیا جا رہا ہے۔

پہلا سوال: کیا بڑے ادب کے لیے فرد کی آزادی ضروری ہے؟

جواب: ایک حد تک تاکہ فنکار کی تخلیقی صلاحیتیں گھٹ کر نہ رہ جائیں اور وہ ڈر ڈر کر اپنے خیالات کا اظہار کرنے پر مجبور نہ معلوم ہو۔

سوال: لیکن اگر اردو فارسی کے ادب کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو اندازہ ہوگا کہ جس زمانے میں ظلم واستبداد زیادہ رہا ہے اس زمانے میں ادب کے شاہکار تخلیق پائے۔ مثلاً حافظ کے دور میں اس زمانے میں شعراء نے علامتوں کے ذریعہ جس قدر خوبصورت ادب پارے تصنیف کیے وہ آزادی میں ممکن نہ تھے۔

سوال: نظم میں ابہام خوبی ہوتی ہے نثر میں عیب؟

جواب: نثر اکثر Explantory ہوتی ہے۔

سوال: احتشام حسین صاحب کردار نگاری کے متعلق ایک سوال میرے ذہن میں ہے اس کے بارے میں آپ کی رائے معلوم کرنا چاہتاہوں۔چند سال قبل تک ہمارے ملک کی آبادی Water-tight طبقات میں بٹی ہوئی تھی اور ہمارے یہاں افسانوی ادب میں فرد سے Types پر زور دیاجاتا تھا مثلاً اگر کوئی کسان ہے تو وہ چاہے کیسا بھی خراب کیوں نہ ہو اچھا سمجھا جاتا تھا۔اس طرح اگر کوئی زمیندار ہے تو چاہے وہ کیسی ہی خوبیوں کا مالک کیوں نہ ہو اسے خراب سمجھا جاتا ہے۔ پہلے کے ادیبوں نے ان دونوں کو فرد کی حیثیت سے نہیں بلکہ طبقاتی رشتے کے پس منظر میں دیکھا تھا جبکہ آج کی نسل نے ان کو صحیح طرح سے دیکھا ہے۔کردار کی طبقاتی خوبیوں اور خامیوں کو نہیں بلکہ انفرادی خامیوں اور خوبیوں کو اجاگر کیا ہے۔احتشام حسین نے اس سوال کا اس طرح جواب دیا۔

جواب: اصل بات یہ ہے کہ کچھ دن پہلے تک نہ صرف ہندوستان بلکہ ساری دنیا کے ادب میں Type پیش کرنے کا رواج تھا۔ایک شخص کو لے کر اس کے سارے طبقہ کی تصویر پیش کی جاتی تھی لیکن بعد میں نفسیات نے ہمیں بتایا کہ جہات سو فیصدی درست نہیں Typical کرداروں کے ذریعہ ایک حد تک ہی سچائی کی عکاسی ہوسکتی ہے مکمل طور پر نہیں اس لیے فرد کو فرد کی حیثیت سے پیش کرنا چاہیے۔مثلاً پریم چند کو لیجئے۔وہ کردار کو شروع میں ایک فرد کی حیثیت سے ہی پیش کرتے ہیں لیکن آگے بڑھتے بڑھتے وہ کردار کی عینیت پسندی کو زہر اثر آجاتا ہے۔لیکن فرد پر زیادہ زور اس زمانے میں ممکن نہ تھا فرد اور شخص آزادی پر آج جتنا زور دیا جارہا ہے اتنا پہلے کبھی نہیں دیا گیا تھا اس لیے یہ تبدیلی فطری ہے۔

قاضی عبدالستار: تو فرد کی نمائندگی ترقی پسندی کے خلاف نہیں ہے جیسا کہ بعض لوگ سمجھتے ہیں؟

احتشام حسین: ترقی پسندی پر یہ الزام غلط اور بے بنیاد ہے ہمیں آزادی کی کھوج ایک آدمی کی حیثیت سے بھی کرنا ہے محض طبقے کے فرد کی حیثیت سے نہیں۔رالف فاکس کی مشہور کتاب Novel and thepeople میں ناول کو فرد کی کہانی قرار دیا ہے Type کہانی نہیں ہے۔

☆☆☆

سفر ہے شرط (رپورتاژ)

سفر ہے شرط قاضی عبدالستار کا رپورتاژ ہے جس کو انھوں نے غالب اکیڈمی میں منائے گئے غالب کے صد سالہ جشن کے موقع کی پروگرام پر لکھا اور تمام محفلوں کی روداد بیان کی ہے اس رپورتاژ کو قاضی صاحب نے فنی اور ادبی رنگ سے برتنے کی کوشش کی ہے پروگرام میں شریک ادباء وشعراء کا جیتا جاگتا معرکہ نظر آتا ہے اور محفل کی نشست و برخاشت کا جزئیات نگاری کے ساتھ بیان ملتا ہے۔اس رپورتاژ میں دہلی اور اہل دہلی کے بادشاہوں اور شاعروں پر وقت کی ستم ظریفیوں اور تاریخ کے ان جابرانہ پہلوؤں پر بھی نظر ڈالی گئی ہے جہاں وقت کی ستم ظریفیاں کس طرح بڑے سے بڑے آسمان کو کھا جاتی ہیں اور زمانہ اپنے پنجے میں قید کر لیتا ہے۔

قاضی عبدالستار نے ادب کی دنیا میں اپنی پہچان بنائی اور اردو ناول نگاری کے میدان کو زرخیز بنایا اسی طرح رپورتاژ نگاری میں بھی ایک اہم رول ادا کیا۔اس رپورتاژ کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اگر قاضی عبدالستار سنجیدگی سے اس طرف متوجہ ہوتے تو بڑے بڑے رپورتاژ نگاروں کے ہم پلہ قرار دئے جاتے مگر افسوس انھوں نے اس طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی۔قاضی صاحب کی اس رپورتاژ میں جو ادبی رنگ نظر آتا ہے اس کی بدولت اردو رپورتاژ نگاری کے مقام و مرتبہ کو متعین کرنے میں سفر ہے شرط کا نام ضرور لیا جائے گا۔

کتابیں

اردو شاعری میں قنوطیت

''اردو شاعری میں قنوطیت'' قاضی عبدالستار کا تحقیقی مقالہ ہے، جس پر انھیں پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی گئی۔ ان کے انٹرویو کے بعض بیانات سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ موضوع ان پر تھوپا گیا اور ان کی مرضی کے خلاف انھیں الاٹ کیا گیا، مگر اسے انھوں نے چیلنج کے طور پر قبول کیا اور تحقیق کا بھی حق ادا کیا۔ انھوں نے دو سال آٹھ مہینے میں پی ایچ ڈی مکمل کیا جو اس وقت ایک ریکارڈ تھا۔

ان کو یہ مضمون کیوں دیا گیا اور اس کے پیچھے کیا اسباب وعوامل تھے اس پر راشد انور راشد سے تفصیل سے گفتگو کی ہے۔

قاضی عبدالستار فکشن کے موضوع پر کام کرنا چاہتے تھے۔ اس وقت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی صدر شعبۂ اردو پروفیسر آل احمد سرور تھے۔ قاضی صاحب نے راشد صاحب کو بتایا کہ:

جب وہ لکھنؤ یونیورسٹی میں ایم۔ اے کے طالب علم تھے اردو کا وائیوا ہوا تو رشید احمد صدیقی نے قاضی صاحب سے سوال کیا کہ اردو کا سب سے بڑا نقاد کون ہے؟ انھوں نے کلیم الدین احمد کا نام لیا اور اس وقت آل احمد سرور بھی وہاں موجود تھے۔ ان کو یہ جواب بہت ناگوار گزرا۔ 1954 میں جب انھوں نے پی ایچ ڈی میں داخلہ لینا چاہا اور خواہش ظاہر کی کہ انھیں پریم چند کا موضوع دیا جائے، مگر سرور صاحب نے منظور نہیں کیا بعد میں انھوں نے ترقی پسند ناول موضوع لینا چاہا کیونکہ اس زمانے میں وہ ''شکست کی آواز'' (ناول) لکھ چکے تھے اور انھیں فکشن سے دلچسپی تھی مگر انھوں نے اس موضوع کو بھی رد کر دیا اور ''اردو شاعری میں قنوطیت'' موضوع دے دیا گیا اور رشید احمد صدیقی نگراں بنائے گئے مگر انھوں نے اس ٹاپک پر کام کیا اور جب تھیسس مکمل ہوئی اور ڈپارٹمنٹ میں اس کی اشاعت کا وقت آیا تو معین احسن جذبی اور قاضی عبدالستار نے اشاعت سے قبل رشید احمد صدیقی کے پاس حاضر ہو کر انھوں نے اپنے استاد سے کہا کہ وہ اس

مقالے کو آل احمد سرور کے نام انتساب کرنا چاہتے ہیں۔ رشید احمد صدیقی نے اجازت دے دی اور کہا کہ اگر ارادہ بنالیا ہے تو سلیقے کے ساتھ انتساب کرنا۔ غرض انھوں نے اسی رات ایک موزوں شعر کہا:

لکیر جو ورق دل پر جگمگائی ہے

تیرے قدموں کی چراغوں کی روشنائی ہے

اور پھر انھوں نے اس شعر کے ساتھ اپنے تحقیقی مقالے کو آل احمد سرور کے نام منسوب کیا جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ سے 1863 میں شائع ہوا۔

اس تحقیقی مقالے میں سات ابواب قائم کیے گئے ہیں۔ ابواب کی تقسیم میں تخلیقی اور تحقیقی ضابطے کا مکمل خیال رکھا گیا ہے۔

پہلے باب میں انھوں نے قنوطیت کیا ہے؟ اس پر سیر حاصل بحث کی ہے اور قنوطیت کے معنیٰ مختلف زبان وادب میں کیا ہیں اور یہ اصطلاح ادب میں کیوں اور کیسے استعمال ہوتی ہے۔ مشرقی مغربی ادبیات میں قنوطیت سے کیا معنیٰ مراد لیے جاتے ہیں۔ انگریزی میں قنوطیت کس لفظ سے اور لاطینی زبان میں کس لفظ سے بنا ہے۔ ساتھ ہی مختلف مذاہب کی روشنی میں قنوطیت کے معنیٰ ومفہوم کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

دوسرے باب کا عنوان ''تصوف'' ہے اور اسلام کے نقطۂ نظر سے قنوطیت اور تصوف کے رشتے پر بات کی گئی ہے۔ قرآن وسنت اور مختلف سلسلے جو صوفیائے کرام کے نزدیک اپنائے جاتے ہیں اس کی روشنی میں تصوف میں کہاں اور کس طرح قنوطیت اثر انداز ہوتی ہے اس پر گفتگو کی گئی ہے۔

باب سوم میں ابتدائی عہد کے شاعروں میں قنوطیت کے اثرات کے بارے میں ذکر ملتا ہے اور انھوں نے بتایا ہے کہ ابتدائی شعرا میں قنوطیت کی کوئی واضح شکل نہیں ملتی ہے۔ صرف اس مختلف مقامات پر پرچھائیاں نظر آتی ہیں۔ وجہ انھوں نے یہ لکھی ہے کہ اس وقت فارسی شاعری کا غلبہ تھا اور اردو شاعری فارسی شاعری کا مکمل طور پر عنصر ہی نہ سما سکی۔ اس لیے کوئی حتمی شکل نہیں ملتی ہے۔

باب چہارم میں انھوں نے میر وسودا کے تعلق سے قنوطیت پر بات کی ہے کیونکہ وہ زمانہ مصائب وآلام سے بھرا ہوا تھا۔ معاشی تنگی، بدحالی، فقیری، معاشرتی بدلاؤ نے انسانوں کے اندر ایک طرح سے بے اطمینانی، شکست وریخت، ناکامی ونامرادی گھر کیے ہوئی تھی۔ اس لیے شاعروں کے یہاں ذاتی رنج وغم، فکر

وحزن کی کیفیت نظر آتی ہے۔

باب پنجم میں نظیرا کبرآبادی کو انھوں نے عصری قنوطیت کی اچھی مثال کے طور پر دیکھا ہے۔اگر چہ نظیرا کبرآبادی ایک رجائی شاعر تھے مگر ماحول اور عہد کے مطابق قنوطیت ان کے یہاں جھلکتی ہے اور انھیں قنوطیت ایک روایتی شکل میں ملی تھی۔نظیر کا عہد بھی میر وسودا کا عہد تھا اس لیے معاشی ومعاشرتی فکر، ابتلا مصیبت ان کے کلام میں درآئی۔

باب ششم میں انھوں نے غالب اور ظفر کے حوالے سے بات کی ہے۔جہاں ایک طرف لکھنؤ کا عروج ہوا،عیش پرستی،عیش کوشی،معاشی فراخی اور معاشرتی آزادی نے درباری شاعروں کو پیدا کیا۔اس لیے قنوطیت کی کوئی واضح شکل نظر نہیں آتی ہے۔

غالب جن کے یہاں تصوف کی جھلک ملتی تھی ناسخ اسکول کے زیراثر تھوڑا تبدیلی کا شکار ہوئے مگر بہت جلد ہی جنگ آزادی کی وجہ سے نشاطیہ رنگ پر حزنیہ رنگ غالب آ گیا اور غالب کی شاعری پر بھی اس کا اثر ہونا لازمی تھا جس کی وجہ سے غالب کے یہاں بھی قنوطی رنگ دیکھنے کو ملتا ہے۔

باب ہفتم میں انھوں نے لکھنؤ اسکول اور فانی کے حوالے سے مکمل اور جامع انداز میں بحث کی ہے۔ جہاں لکھنؤ میں عزیز وثاقب جیسے بڑے شاعر تھے وہیں فانی مکمل طور سے ایک قنوطی شاعر مانے جاتے ہیں کیونکہ ان کا مزاج ایک قنوطی شاعر کا تھا جبکہ ان کا ماحول قنوطی نہیں تھا مگر سیاسی تبدیلی ان کے مزاج پر حاوی رہی۔فانی کے علاوہ اقبال بھی شاعری کی دنیا میں وارد ہو چکے تھے اور اردو شاعری میں ایک انقلاب رونما ہو رہا تھا۔یہاں قاضی عبدالستار نے اقبال کی شاعری انجمن ترقی پسند مصنفین ترقی پسند کا بھی ذکر کیا ہے۔حلقہ ارباب ذوق بھی اپنے زمانے کی ایک ایسی تحریک تھی جس کے سب سے بڑے شاعر راشد اور میراجی تھے مگر ان کے یہاں قنوطیت کی ہلکی لہر نظر آتی ہے اور انھوں نے شاعری میں قنوطیت کے علاوہ زندگی کے حسن کا بیان زیادہ کیا۔ان کے یہاں قنوطیت کوئی منفرد انداز سے نہیں آئی اور نہ ہی ان کی قنوطیت شاعری کا میلان ومزاج بنی۔اس کا بھی ذکر قاضی عبدالستار نے کیا ہے۔کتابیات کے بعد مقالے کو مکمل کیا گیا ہے۔

قاضی عبدالستار کا تحقیقی مقالہ اور اردو شاعری میں قنوطیت ایک منفرد عنوان اور موضوع کے تحت لکھا گیا جو شاعری پر کام کرنے والے محقق کے لیے نئے در وا کرتا ہے اور قنوطیت پر کام کرنے والے ریسرچ

اسکالراس سے مستفید ہوسکتے ہیں۔قنوطیت کا مفہوم بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

''قنوطیت جسے انگریزی میں Pessimism کہتے ہیں،لاطینی لفظ Fessimus سے مشتق ہے۔ یہ ایک فلسفیانہ مغربی اصطلاح ہے جس کا مفہوم زندگی اور دنیا کے بارے میں ایک یاس انگیز یا تاریک نقطۂ نظر ہے۔''1؎

قاضی عبدالستار نے لفظ Pessimism کے ذریعہ قنوطیت کے مفہوم کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔قنوطیت جو رجائیت کی ضد ہے اور جس کا خاص نقطۂ نظر یہ ہے کہ یہ دنیا خیر کی جگہ نہیں ہے۔ یہاں شر ہی شر ہے جب رجائیت میں مسرت ،خوشی اور خیر کوملحوظ خاطر رکھا جاتا ہے ۔ان دونوں کی درمیانی کڑی کو Melorism کو سمجھا جاتا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ دنیا چاہے جتنی بھی شر انگیز اور فتنہ پرور جگہ ہومگر دنیا اور زندگی روز بہ روز ترقی کررہی ہے اور خیر کو پانے کی مسلسل کوشش کررہی ہے۔قنوطیت میں بھلے ہی دنیا بری دکھائی جائے اوراسے رہنے کی جگہ نہ بتائی جائے مگر امکانی دنیاؤں سے بہتر تصور کیا جاتا ہے۔کن حقائق پر قنوطیت کی بنیاد رکھی جاتی ہے اس کا ذکر اس انداز سے کیا جاتا ہے:

''عام طور پر جن سنگین حقائق پر قنوطیت کی بنیادیں رکھی جاتی ہیں کوئی بھی رجائی فلسفۂ حیات ان کی المناکی اور ابدیت کو ختم نہیں کرسکا۔ بیماری،موت، بھوک ، پیاس،دنیاوی دکھ درد، جذباتی ناآسودگی، وہ مسائل ہیں جن کی فراوانی انفرادی دماغوں میں قنوطیت کے بیج بوتی ہے۔قنوطیت اپنے غمگین ذاتی تجربات اوراپنی گزشتہ وموجودہ شکستوں سے اس درجہ متاثر اور مغلوب ہوجاتا ہے کہ دنیا میں اسے ہر چیز دکھ بھری نظر آتی ہے۔کرب والم جب نقطۂ نظر بن جاتا ہے قنوطیت کہلاتا ہے ۔جب انسان اپنی جبلی ضرورتوں کی تکمیل کے سلسلے میں مستقل محرومیوں اور پیہم ناکامیوں کا شکار ہوجاتا ہے اور جب یہی محرومی وناکامی اس کی شخصیت کو تباہی وبربادی کی پرپیچ راہوں سے گزار کر موت کے دروازے پر لا کھڑا کرتی ہے اور جب وہی تھکا ہارا درماندہ انسان اپنے تجربات کے آئینے میں کسی نظام فکر کے گیسو سنوارتا ہے یا کسی انفرادی شکست کو آفاقیت کی قبا پہناتا ہے یا تمام دنیا کو اپنے ذاتی ناکام تجربے کے کفن میں لپیٹ کر شعروادب کے سانچوں میں ڈھالتا ہے تو ہم اسے ''قنوطیت'' کہتے ہیں ۔غم کا مستقل احساس وادراک

1؎:اردوشاعری میں قنوطیت ۔قاضی عبدالستار۔علی گڑھ پریس علی گڑھ،ص:1

قنوطیت پر دلالت کرتا ہے۔ یہی ذہنی کیفیت اگر غیر منقطع طور پر موجود ہوتو ہم اسے قنوطیت کہیں گے۔''2

دوسرے باب میں تصوف کے متعلق قاضی عبدالستار نے ہندو ومذہب اسلامی روحانی تصوف کے بارے میں باقاعدگی سے نظر ڈالی ہے۔شوپنہار جو ہندونظام کا قائل ہےاوراس نے ہندوؤں کے تصور کو بیرو نواسپونزااما لیسرانخ کے تصور سے بہتر تسلیم کرتا ہے۔اس نے روحانیت کو اعلیٰ ترین عقل کی پیداوار کہا ہے جیسے:

جب دل خواہشوں سے پاک ہوجاتا ہے تب فانی غیر فانی ہوجاتا ہےاور برہما مل جاتا ہے۔بدھ مذہب کے قنوطیت کے حوالے سے بھی انھوں نے دنیااوردنیا کے عیش وآرام کو سمجھنے کی کوشش کی:

گوتم بدھ جس نے کائنات کے تمام دکھ درد کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔

تصوف کے سلسلے کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''جب ہندوستان میں مسلمان حکمراں کی حیثیت سے آئے تو ہندوسماج بھی ہندی سیاست کی طرح انحطاط پذیر تھا۔ذات پات کی تقسیم اورفرسودہ جاگیردارانہ نظام نے عوام کی مادی مشکلات میں اوراضافہ کردیا۔جہاں مسلمان فوج نے میدان و قلعے فتح کیے وہاں صوفیا نے ہندوستان ی دل ودماغ جیتا۔بابارگھوناتھ سے حضرت خواجہ معین الدین اجمیریؒ کے مناظرے اس سلسلے کی کڑی ہیں۔''3

باب سوم میں ابتدائی عہد کے شاعروں کے حوالے سے انھوں نے سراج اورنگ آبادی،شاہ حاتم خان اورآرزو،مرزامظہر جان جاناں،خواجہ میر درد کے کلام میں قنوطیت کی تلاشکرنے کی کوشش کی ہےاوران کی شاعری جتنے منفرد انداز میں جتنی مقدار میں قنوطیت کہ پہلو سے شاعری ہوئی اس پر گفتگو کی ہے۔لکھتے ہیں''کہ ہماری غزل روایت،موضوع،مواد، ہیئت اور لہجے پر اعتبار سے فارسی غزل کی آوردہ اور پروردہ ہے۔''

میر درد کے حوالے سے قاضی عبدالستار رقم طراز ہیں:

2: اردوشاعری میں قنوطیت۔قاضی عبدالستار۔علی گڑھ پریس علی گڑھ 1963 ص:3

3: اردوشاعری میں قنوطیت۔قاضی عبدالستار۔علی گڑھ پریس علی گڑھ 1963 ص:21

''خانقاہی زندگی کے باوجود درد کے اشعار میں اس دور کے واردات کا پرتو ملتا ہے۔ جو ایک طرف اس بات کے شاہد ہیں کہ شاعر اپنے متصوفانہ افکار و عملی گوشہ نشینی کے باوجود اپنے دور کی پیداوار ہے، دوسری طرف اس بات کی تائید کرتے ہیں کہ سیاست سے بے تعلق عام آدمی بھی اس عہد کے انتشار اور ابتلا کا شکار تھا۔''4

باب چہارم میں انھوں نے میر وسودا کے حوالے سے سیر حاصل بحث کی ہے ساتھ ہی دونوں شاعروں کے عہد کے پس منظر میں ان کے کلام میں جو قنوطیت کے انداز اور بیان میں یاسیت غم غصہ اور بے چارگی کا اظہار ملتا ہے اس کو زمانے کی سیاست کے ساتھ دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ ایک بات انھوں نے صاف لفظوں میں اظہار کیا ہے کہ شاعر کے کلام میں قنوطیت کی موجودگی کے یہ معنیٰ ہرگز نہیں ہیں کہ وہ دراصل مکمل قنوطی شاعر ہے بڑے بڑے رجائی شاعروں کے نغموں میں بھی قنوطیت مل جاتی ہے اور وہیں قنوطی شاعروں کے گیتوں میں بھی رجائی پہلو بھی مل جاتے ہیں دونوں کو بالکل الگ نہیں کیا جاسکتا۔

سودا کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''سودا کی قنوطیت کا اظہار بھی ان کی ہمہ گیر طبیعت کی طرح متنوع ہے۔ وہ میر کے ہم عصر تھے۔ انھوں نے اپنے عہد کے مصائب جھیلے ہیں۔ یہ درست ہے کہ وہ ایک خوش باش ظریف اور خوش حال شاعر تھے، لیکن اپنے دور کی یاسیت سے محفوظ نہ رہ سکے۔''5

باب پنجم میں انھوں نے نظیر اکبرآبادی اور ان کی قنوطی شاعری پر باب رقم کیا ہے اور ان کے عہد ان کی شاعری میں قنوطیت کے اثرات کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ نظیر کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ وہ ایک نظم گو شاعر تھے اور ان کی غزلوں میں قنوطیت کے وہ اثرات نہیں آتے جس طرح سے واضح شکل میں نظموں میں دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے کلیات میں ایسی نظموں کا ایسا سلسلہ موجود ہے جو قنوطی اثرات ونتائج سے مملو ہے، مگر اس کے علاوہ نظیر کے کلام میں بطور خاص نظموں میں رجائی انداز کی شاعری بھی خوب ملتی ہے جو قنوطی رنگ آمیزی سے سجی اور بنی ہے۔

باب ششم کو غالب وظفر کے لیے مختص کیا گیا ہے۔ اس باب میں انھوں نے غالب کے ابتدائی کلام

4: اردو شاعری میں قنوطیت۔ قاضی عبدالستار۔ علی گڑھ پریس علی گڑھ۔ 1963ء۔ ص: 81

5: اردو شاعری میں قنوطیت۔ قاضی عبدالستار۔ علی گڑھ پریس علی گڑھ۔ 1963ء۔ ص: 101

اور جنگ آزادی کے بعد کی شاعری کو قنوطیت کے حوالے سے دیکھا ہے۔ غالب کے زمانے میں تخت طاؤس ہجرت کر کے نادر شاہ کے پاس جا چکا تھا۔ برطانوی اقتدار سیلاب کے مانند ہندوستانی مشرقی تہذیب ومعاشرت کو ڈبوئے جا رہا تھا۔ اقتدار میں جہاں ایک طرف نئے زمانے سے ہندوستان متعارف ہو رہا تھا وہیں برصغیر اور اسلامی حکومت آخری سانسیں لے رہی تھی۔ چراغ سحری کی طرح مغل سلطنت بجھنے والی تھی۔ ایسے دور میں شاعروں کے کلام میں درد، کسک ایک طرح سے بے سکونی کا پایا جانا لازمی تھا، مگر کچھ ایسے شاعر بھی تھے جو آسودہ حال تھے جن کے کلام میں قنوطیت کا عنصر نہیں تھا جیسے ذوق و مومن کے کلام میں آسودگی نظر آتی ہے۔

بہادر شاہ ظفر کے حوالے سے بھی انھوں نے جامع بات کی ہے۔ ان کی بادشاہی زندگی اور پھر اقتدار کا ختم ہونا اور ایک مفلوک الحال زندگی بسر کرنا ہندوستان کا سب سے بدنصیب مغل بادشاہ جس کی زندگی کے آخری ایام کے کلام میں صرف قنوطیت اور مایوسی دکھائی دیتی ہے۔ جس نے اپنی روتی اور غم زدہ زندگی کو بسر کرنے کے لیے تصوف کا سہارا لیا ہے جو آسان اور فطری ہوتا ہے۔ قاضی عبدالستار کے اس فکر و ادب کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

> ''گریہ وبکا قنوطی شاعروں کا اہم موضوع ہے۔ ظفر نے بھی آنسوؤں کا ذکر چھیڑا ہے:
>
> جب اشک آتا ہے مژگاں تلک میرے دل سے
>
> تو ساتھ اپنے ہے لخت جگر لیے آیا
>
> اس روتی ہوئی زندگی کو جھیلنے کے لیے تصوف کا سہارا آسان بھی تھا اور فطری بھی۔ مادی تباہ حالی و ماورائی طلسمات کی پناہ گاہوں میں دل کا سکون ڈھونڈتی ہے۔ ظفر کی شخصیت کا وہ گداز جو غم کے ہاتھوں تخلیق ہوا تھا تصوف کے ہاتھوں پرورش کیا گیا۔''[6]

غالب نے جس اردو شاعری کو فکر کی قبا عطا کی جس نے آنے والے نئے زمانے کی آنچ کو بہت پہلے ہی محسوس کر لیا جس ''آئین اکبری'' کی تقریظ لکھنے سے پہلے سرسید سے کہا تھا کہ مردہ پروری کب تک ہوگی۔ نئے سورج کا استقبال کرنے کے لیے تیا تھے انھیں مغل تہذیب میں اب جھول نظر آنے لگا تھا غالب جس نے بچپن سے دکھ درد دیکھا مگر ایک حد تک معاشی آسودگی بھی جو کبھی کبھی نامکمل بھی رہتی ہے ان کا رجائی انداز

---

[6]: اردو شاعری میں قنوطیت۔ قاضی عبدالستار۔ علی گڑھ پریس علی گڑھ۔ 1963ء۔ ص: 138

قنوطیت کا بھی شکار ہو رہا تھا۔ غالب کی شاعری اور اس پر قنوطیت کے اثرات کے حوالے سے لکھتے ہیں اور غالب کے مندرجہ ذیل شعر کی تشریح کرتے ہیں:

کون ہے جو نہیں ہے حاجت مند
کس کی حاجت روا کرے کوئی

''ذاتی غم اور اور اجتماعی پاس نے اردو شاعری کی عام حزنیہ لے کے واسطے سے غالب کی شاعری کے قنوطی عناصر کو چمکا دیا۔ غم کے شعور نے غور و فکر کا عادی بنایا۔ حیات و کائنات پر انھوں نے غزل اور اپنے عصر کی حدود میں رہ کر نگاہ ڈالی لیکن ان کے دل کی بے قراری نے انھیں کہیں ٹھہرنے نہ دیا۔'' 7

اس کے بعد انھوں نے 1857 کے انقلاب نام نہاد بادشاہت کے خاتمے جاگیردارانہ نظام کا دم توڑنا کا مختصر ذکر کیا ہے۔ اس کے بعد فانی، ثاقب اور عزیر کا بھی ذکر کیا ہے اور فانی کے کلام میں قنوطیت کے اثرات کا جامع انداز میں گفتگو کی ہے۔ فانی جو ایک مکمل قنوطی شاعر ہیں جن کے کلام کا رنگ ہی موت و ملال تھا اور ان کی شاعری قنوطیت کی بہترین مثال سمجھی جاتی ہے۔ فانی کو ''یاسیات کے امام'' کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ یاس، حرماں، مایوسی، ناکامی ان کی شاعری کے عنوان ہیں۔ قاضی عبدالستار نے ان کے قنوطی مسائل ان کی حرماں نصیب زندگی کو ان کے اوائل عمر میں تلاش کیا ہے جس کی وجہ سے ان کی انفرادی زندگی قنوطیت کا شکار رہی۔ جس کی وجہ سے فانی کو لگتا ہے کہ ساری کائنات کی مصیبتیں ان کا مقدر ہیں جس کی وجہ سے ان کی شخصیت میں کمی پیدا ہوئی ہے۔ لکھنؤ کی ماتم پرور فضا کا اثر جو فانی کی زندگی پر اثر انداز ہوا اس کا ذکر ملتا ہے۔

قاضی عبدالستار نے اس تحقیقی مقالے میں قنوطیت کے مغربی مفکرین کے حوالے سے بھی بات چیت کی ہے۔ جرمنی کا مشہور قنوطی فلسفی شوپنہار کے اقتباس کو بھی نقل کیا ہے جس میں وہ کہتا ہے:

''زندگی ایک سمندر ہے جو چٹانوں اور گردابوں سے بھرا پڑا ہے۔ انسان پوری احتیاط اور کاوش سے ان سے بچتا ہے لیکن اندھی مشیت اسے بچنے نہیں دیتی اگر وہ بچ بھی جاتا ہے تو دوسری بڑی مصیبتیں اس کا راستہ روک کر کھڑی ہو جاتی ہیں۔'' 8

7: اردو شاعری میں قنوطیت۔ قاضی عبدالستار۔ علی گڑھ پریس علی گڑھ۔ 1963ء۔ ص: 169

8: اردو شاعری میں قنوطیت۔ قاضی عبدالستار۔ علی گڑھ پریس علی گڑھ۔ 1963ء۔ ص: 194

ایک دوسرے قنوطی فلسفی ہارٹمن کا بھی حوالہ دیا ہے جس میں وہ لکھتا ہے:

''انسانی زندگی میں مسرت وشادمانی کے ذخیرے سے زیادہ غم والم کا ذخیرہ ہے۔''[9]

غرض قاضی عبدالستار کا تحقیقی مقالہ جس کو انھوں نے رشید احمد صدیقی کے زیر نگرانی پایۂ تکمیل تک پہنچایا اردو شاعری میں قنوطیت کے حوالے سے ایک مستند اور پرمغز مقالہ ہے جس میں اردو شاعری کی روایت میں کہاں اور کس طرح قنوطیت کا اثر ملتا ہے اس کا بخوبی ذکر ملتا ہے۔ جو ایک مستقل موضوع پر لکھی گئی۔ علم وادب کے شیدائی کے لیے یہ کتاب کارآمد اور مفید ہے۔

☆☆☆

---

[9]: اردو شاعری میں قنوطیت۔ قاضی عبدالستار۔ علی گڑھ پریس علی گڑھ۔ 1963ء۔ ص: 194

جمالیات اور ہندوستانی جمالیات

جمالیات اور ہندوستانی جمالیات اکیڈمک ضرورت کے پیشِ نظر لکھی گئی۔ یہ کتاب کافی سرخیوں میں رہی کیونکہ چودھری نسیم نے ذاتی اور گھریلو دشمنی کے سبب اس پر سخت تبصرہ کیا تھا اور سرقے کا الزام تک لگایا۔ممکن ہے قاضی صاحب نے اس کتاب کو لکھتے وقت دوسری کتابوں سے استفادہ کیا ہو کیونکہ کسی ایک بڑے موضوع پر اکثر و بیشتر ہم چند دوسری کتابوں کو بھی پڑھتے ہیں جو اس موضوع پر لکھی گئی ہیں۔ اب ایسی حالت میں ہم کسی بڑے فکشن نگار یا مصنف پر سرقہ کا الزام نہیں لگا سکتے۔ سرقے کا الزام تو بڑے بڑے ادیبوں پر بھی لگایا جاتا ہے مگر یہ بات صدفی صد درست نہیں ہوتی ہے۔

جمالیات کے موضوع پر یہ ایک اچھی کتاب ہے جس کو لکھنے میں قاضی صاحب نے کافی محنت وغور وفکر سے کام لیا ہے۔ جمالیات کیا ہوتی ہے اور جمالیات کو کیسے کسی فن پارے سے پوائنٹ آؤٹ کیا جاتا ہے ان تمام پہلوؤں پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

قاضی عبدالستار خود ایک جمالیاتی ادیب ہیں۔ ان کی طرزِ تحریر جمالیاتی حس وفکر کا مظہر ہوتی ہے۔ قاضی صاحب کے کردار منظر واقعہ اسلوب سبھی میں ایک قاضی رنگ پایا جاتا ہے۔ جہاں تک کرداروں کی بات ہے ان کے معاشرتی کرداروں کی جمالیات اور ان کے تاریخی کرداروں کی جمالیات یکسر مختلف ہیں ساتھ ہی منظر نگاری میں بھی ان کے جمالیات جس کا بآسانی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

جمالیات کے معنیٰ ومفاہیم بتاتے ہوئے قاضی عبدالستار لکھتے ہیں:

> ''اردو زبان میں جمالیات کا لفظ انگریزی زبان کے لفظ Aesthetics کے معانی میں استعمال کیا گیا ۔اس لیے اگر Aesthetics کے معانی ومفاہیم کا مسئلہ حل کرلیا جائے تو جمالیات کے معنیٰ ومفاہیم کا مسئلہ خود بخود حل ہوجائے گا۔اس طرح لفظ Aesthetics کی تاریخ پر ممکن اختصار کے ساتھ غور کرنا ضروری ہوجاتا ہے۔ ایستھیکس کا لفظ یونانی زبان سے لیا گیا ہے اور یونانی زبان میں ایستھیکس کی ابتدائی

تصویر ایک لفظ ایٹوٹیکو Atotiko کی صورت میں نظر آتی ہے۔ایک زمانے کے بعد Atotiko ایٹوٹیکو نے ایک دوسرے لفظ ایستھیس Aesthesis کا پیکر اختیار کیا گیا جسے حواس خمسہ کے ذریعہ مسرت کا عرفان حاصل کرنے کے معانی میں استعمال کیا گیا۔ آگے چل کر اس لفظ ایستھیس Aesthesis نے ایستھیٹک Aesthetic کا روپ اختیار کرلیا اور ایک مدت تک یہی لفظ مستعمل رہا۔ جرمن فلسفی بادم گارٹن نے بھی Aesthetics کے بجائے Aesthetic ایستھیٹک ہی کو شرف قبول عطا کیا۔'' 10؎

جمالیات کی اصطلاح پہلی بار 1739 میں مروج ہوئی۔ جرمنی فلسفی بادم گارٹن نے پہلی بار اسے تجزیہ جمال کے معنیٰ میں استعمال کیا جب کہ حسن کی فطرت کا مطالعہ اور مشاہدہ افلاطون اور ارسطو کے زمانے سے کسی نہ کسی طرح غور وفکر کا محور ومرکز بنتا رہا ہے مگر اس کی بنیادی قدریں اٹھارہویں صدی میں سب سے زیادہ فکر کا مرکز نہیں مگر ابھی تک مکمل طور پر جمالیات کی تعریف وتوصیف نہیں کی گئی۔ مجنوں گورکھپوری نے بھی تاریخ جمالیات کے نام سے لکھی ہے اس کے علاوہ باقاعدہ طور پر شکیل الرحمٰن نے بھی جمالیات کے متعدد پہلوؤں پر بحث کی۔انھوں نے تقریباً ایک درجن سے زائد کتابیں اس موضوع پر لکھی ہیں جیسے ''فراق کی جمالیات''، ''بارماسے کی جمالیات''، ''ہندوستانی جمالیات''، '' میر تقی میر کی جمالیات''، مرزا غالب کی جمالیات'' اور ''ہند مغل جمالیات''، ''ادب اور جمالیات''، امیر خسرو کی جمالیات''، کلاسیکی مثنیوں کی جمالیات''، غالب کی جمالیات''، اختر ایمان کی جمالیاتی لیجنڈ''، '' قرآن حکیم جمالیات کا سرچشمہ''، ''اقبال روشنی کی جمالیات'' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

جمالیات کا مطالعہ اور تجزیہ انسانی علم کے تین دائروں کے اندر ہی رہ کر کیا جاسکتا ہے۔ جس میں سائنس، نفسیات اور فلسفے کے دائرۂ کار کا ہی جمالیاتی بحث کی تجربہ گاہ بنتے ہیں مگر ابھی تک جمالیاتی حسن مظہر کو سمجھنے اور اس پر غور وخوض کیا جاتا ہے کیونکہ جمالیات کی تعریف وتوضیح اور تشریح کا کام ہنوز جاری ہے اور اس کی نئی نئی جہتیں الگ الگ معنویت کے ساتھ مکمل نہیں ہوئی ہیں۔

جہاں تک جمالیات لفظ کا ذکر آتا ہے اکثر لوگ اسے بہ معنیٰ حسن سے لیتے ہیں جب کہ جمالیات کا

10؎: جمالیات اور ہندوستانی جمالیات۔قاضی عبدالستار۔آنند بھون دودھ پور علی گڑھ، سنہ اشاعت 1977 ص:11

تعلق انسان اوراس کے سماج سے ہے۔انسان کے حواس خمسہ اسے جمالیات کا ادراک کراتے ہیں۔ساتھ ہی ہمارے شعور یالاشعور میں جمالیات کی جو تصویر بنی ہے اس کے مطابق ہم کسی شے کو پرکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

قاضی عبدالستاراس امر پراپنے خیال کا اظہاراس طرح کرتے ہیں:

''احساس جمال بڑی حد تک داخلی معاملہ ہوتا ہے اس لیے ایک شخص کے احساس جمال کی سطح دوسرے شخص سے مختلف ہوسکتی ہے۔مختلف ہوتی ہے۔تاہم دوہم مذاق انسان کسی ایک پیکر جمال کی صفت جمال کی شدت تاثیر پر متفق ہو سکتے ہیں اور یہ بھی کہ احساس جمال تبدیل ہوتا رہتا ہے یا منزل تکمیل کی طرف گامزن رہتا ہے۔
یہ سب سچ ہے لیکن یہ بھی سچ ہے کہ آج بھی ہمارے پاس ایسا کوئی پیمانہ نہیں ہے جس کے ذریعہ ہم کسی پیکر جمال کی قدر جمال کی پیمائش کرسکیں۔ ہمارے پاس ایسا کوئی فارمولہ نہیں جس پر عمل کر کے ہم کوئی پیکر جمال تخلیق کرسکیں۔'' 11

کتاب میں قاضی عبدالستار نے جمالیات کے انگریزی مفکرین چارلس مورن ،کروچے اور ہیگل لینگر کے نظریہ پر بھی مختصر بات کی ہے۔

جیسے

بادم گارٹن نے جمالیات کو تجزیہ جمال کے معنیٰ میں استعمال کیا۔

چارلس مورن نے جمالیات کو نفسیات کی ایک شاخ ماننے پراصرار کیا۔

ہیگل نے جمالیات کو فنون لطیفہ کا فلسفہ کہا ہے۔

کروچے نے جمالیات کو عمل ابلاغ کی ایک سائنس کہا ہے۔

وچوکو جمالیات کا دوسرا بڑا مفکر تسلیم کیا جاتا ہے اس نے جمالیات کو اظہار کی سائنس کالقب دیا۔

لینگر نے بھی جمالیات پر کام کیا اور اس نے کہا کہ جمالیات فنون لطیفہ کی فلسفیانہ کشمکش اور مسائل کا اصولی مطالعہ کہا جاسکتا ہے فن کی دنیا یہ فلسفیانہ مسائل اکثر ذوق جذبہ ہیئت اونو تخلیقیت وغیرہ سے متعلق ہے۔

11: جمالیات اور ہندوستانی جمالیات۔قاضی عبدالستار۔آنند بھون دودھ پور علی گڑھ،سنہ اشاعت 1977 ص:11

کتاب میں ہندوستانی جمالیات کے عنوان سے ایک الگ باب قائم ہے جس میں انھوں نے قدیم ہندوستانی جمالیات کو فنون لطیفہ کے جن شاخ کو تسلیم کیا جاتا ہے جن میں فن تعمیر، فن موسیقی اور فن شاعری ہیں ۔مسئلہ مغرب کے برعکس ہندوستان میں فن سنگ تراشی اور فن مصوری کو فنون لطیفہ میں شمار نہیں کیا جاتا بلکہ ان دونوں کو فن تعمیر کے شاخ کے اندر ہی تجزئیہ کیا جاتا ہے۔

اس فنون لطیفہ کی پیچیدگیوں سے بحث کرنے کے بعد قدیم ہندوستانی مفکروں کے نظریات پر بات کی گئی ہے اور ڈرامے اور ڈرامے کی اہمیت اور ہندوستان میں اس کی فنی حیثیت پر تفصیلی گفتگو ملتی ہے۔ کس طرح ہندوستان میں ڈرامے کا فن ترقی کرتا ہے اور آسمانی کتابوں، ویدوں کے ذریعہ اس کی معنویت کو برقرار رکھا گیا۔ ہندو مذہب میں فنون لطیفہ کی کیا اہمیت ہے اس کا ذکر ملتا ہے۔

ہندوستان کے کس حصہ میں کس طرح کے ڈرامے لکھے کھیلے جارہے تھے ان کے مابین کیا فرق ہے اس کا بھی غور وفکر کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ اس کے علاوہ ہندوستانی ڈراموں اور انگریزی ڈراموں کے بیچ کیا فرق پایا جاتا ہے اس کا تفصیل سے بیان ہے۔ ساتھ ہی مختلف نظریۂ فکر کے ڈراموں پر بحث کی گئی ہے۔ ان ڈراموں کی کتنی قسمیں ہوتی ہیں جیسے ساوکرا Samavakrra، اہم رگا Ihamrga، دما Dima، ویالوگ Vyayoga، اترستکنکا Utsrstiknka، پرہسنا Prahsana، بھان Bhana، بتھی Bithi جیسے ڈرامے کیسے ہوتے ہیں ان ڈراموں کے عمل اور ان کے کردار کیسے ہوتے ہیں ان کے اندر جمالیاتی پیشکش کیسی اور کس طرح ہوتی ان کا ذکر جامع انداز میں ہے۔ ساتھ ہی سنسکرت ڈراموں کے بنیادی عناصر کا بھی بیان ملتا ہے۔ مختلف طرح اس کا ذکر جو ڈرامے کی خصوصیت ہوتے ہیں اور جن کے بنا ہندی کا کوا و یہ شاستر مکمل نہیں ہوسکتا سب کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ فن تعمیر عنوان کے تحت انھوں نے کسی تعمیر جو جمالیاتی عناصر تلاش کیے جاتے ہیں اس کا بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''فن تعمیر کا نمونہ چاہے وہ محل ہو یا قلعہ یا مندر یا مقبرہ جمالیاتی تجربے کے لیے دو زاویوں سے دیکھنے پر مائل کرتا ہے۔ ایک معروضی، دوسرا شخصی۔ معروضی نقطۂ نظر سے ایک ایسا انفرادی موضوع جمال ہے جو حس بصارت کے سامنے موجود ہے اور حس بصارت تمام دوسرے علائق سے منزہ ہو کر اس کا مشاہدہ کررہی ہے جیسے یہ نمونہ فن تعمیر آسمان سے اتری کوئی عدیم المثال شے ہو اور انسان کے احاطۂ امکان سے باہر ہو۔ اس

لیے اس کا مشاہدہ جذبۂ تحیر کو جنم دیتا ہے اور جذبۂ تحیر کی تخلیق جمالیاتی تجربے کا شعور عطا کردیتی ہے۔"[12]

فن تعمیر کے نمونے مختلف مذاہب میں کتنے مختلف ہوتے ہیں ہندو مذہب اور بدھ مذہب کے فن تعمیر کے نمونوں کو بھی واضح کیا ہے۔فن تعمیر کے کتنے اسٹائل ہوتے ہیں جو مخصوص اہمیت کے حامل سمجھے گئے جیسے ناگرہ، ویلسرا اور ڈراودہ اور ان کی الگ ایک خصوصیات کا ذکر ہے۔

فن موسیقی کے تحت انسان کے احساس سماعت کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔موسیقی جو ہمارے اندرون میں پہنچ کر ہمارے اندر ارتعاش پیدا کرتی ہے ساتھ ہی ہماری سماعت کو محظوظ کرتی ہے اس کے ساتھ مختلف جذبات کو جمالیاتی تجسم بھی عطا کرتی ہے اس لیے موسیقی کو روح کی غذا سمجھا جاتا ہے۔

قاضی صاحب کا یہ جملہ موسیقی آواز کا رقص ہے اور رقص بدن کی موسیقی۔ان کے یہ جملے اکثر ان کی تحریروں میں دکھائی دیتے ہیں۔بطور خاص تاجم سلطان میں رقص موسیقی فن تعمیر شاعری کا مکمل بیان نہایت خوبصورتی اور باریکی سے ملتا ہے۔قدیم ہندوستان کے عقائد کے مطابق بندگی اور خدا کے حصول کے لیے سب سے اچھا ذریعہ فن موسیقی مانا جاتا ہے جس طرح اسلام میں بھی سماع کی روایت ہے۔فن موسیقی کو فنون لطیفہ میں کیا اہمیت ہے اس پر لکھتے ہیں:

> ''یہی وہ مقام ہے جہاں فنون لطیفہ کے وسیلے سے تخلیق کیے ہوئے دوسرے تمام جمالیاتی تجربات فن موسیقی کے عطا کیے ہوئے جمالیاتی تجربات کے سامنے ہلکے اور دھندلے ہو جاتے ہیں اس لیے کہ کوئی فن لطیف اپنے محدود وسیلہ ہائے اظہار کی بنا پر اس روحانی سطح جمالیات کی بلندی پر فائز نہیں ہو پاتا کہ یہی وہ مقام ہے جسے اصطلاح میں ناوابرہما کہا گیا ہے اور جن کا براہ راست تعلق فن موسیقی سے ہے۔"[13]

علامت کے باب کے تحت قاضی عبدالستار نے ادب میں وسیلہ اظہار کے لیے علامت کا ذکر کیا ہے۔علامت کے ذریعہ ہی ہم کسی موضوع پر فرق لاتے ہیں۔ادبی اظہار اور عام اظہار خیال میں فرق علامت کا ہوتا ہے جس کو جتنا علامت، تشبیہات اور استعارات پر عبور حاصل ہوگا اس کا ادبی اظہار اتنا ہی

12: جمالیات اور ہندوستانی جمالیات۔قاضی عبدالستار۔آنند بھون دودھ پور علی گڑھ، سنہ اشاعت 1977 ص:45

13: جمالیات اور ہندوستانی جمالیات۔قاضی عبدالستار۔آنند بھون دودھ پور علی گڑھ، سنہ اشاعت 1977 ص:48

دلکش معنیٰ خیز ہوگا۔اس کے باب میں انھوں نے ایک علامتی سہارے سے اس طرح بیان کیا ہے۔

''عام اظہار اورادبی اظہار میں سب سے بڑا فرق یہ ہوتا ہے کہ عام اظہار ڈاکیے کی طرف خط پھینک کر مطمئن ہوجاتا ہے لیکن ادبی اظہار پیغمبر کی طرح اپنی بات دل پر نقش کرنے کے لیے تقریر اور تحریر کے تمام ہتھیاروں سے تاثیر کی جستجو میں کاری ضرب لگاتا ہے۔'' 14؎

علامت کا ذکر مختلف نقادوں نے اپنے خیال کے مطابق کیا ہے۔کچھ لوگوں نے قدیم اساطیر سے اس کا تعلق جوڑا ہے۔لینگر کے بیان کے مطابق کوئی بھی تجریدی شکل بنا سکیں علامت ہے چاہے کوئی بھی ذریعہ اس کے لیے استعمال کیا جائے۔

علامت کے اس باب میں انھوں نے علامت کا قدیم دیومالائی قصہ کہانیوں سے جو رشتہ جوڑا جاتا ہے اس پر بحث کی ہے۔علامت مکمل ایک ادبی اصطلاح کی طرح استعمال کی گئی اور علامت کا ڈرامے فکشن اور شاعری میں بھی موجود ہوتی ہے۔قاضی صاحب نے مغربی ادیبوں کے حوالے کے ساتھ علامت پر بات کی ہے۔کسی ادبی فن پارے میں جمالیات کی تعریف کیوں اور کیسے مرتب ہوگی اور کس زاویے سے کون ادب پاروں کے معائب ومحاسن بیان کرتا ہے جیسے پریم چند اور جوش کو آپ کس نظریہ سے دیکھتے ہی اس پر بھی مختصر بحث ملتی ہے۔

عام طور پر لوگ دنیا کی تمام اشیاء کو مادیت کے پیش نظر دیکھتے ہیں اس لیے ادب برائے زندگی کا نعرہ عام ہوا اور جب ادب برائے ادب کا چرچا ہوتا تو نقادوں نے اس کی الگ الگ منطق پیش کی۔لکھتے ہیں کہ کوئی بھی شے اپنے آپ میں بدصورت نہیں ہوسکتی۔جمالیاتی محاورے میں اکثر صرف دولفظوں کا استعمال کیا جاتا ہے ۔خوبصورتی اور بدصورتی۔عام طور پر خوبصورتی اس شے میں دیکھی جاتی ہے جو دیکھنے میں متوازن اور دلکش ہو اور بدصورتی میں وہ ان دونوں سے عاری ہو اور اسی نظریہ حسن وقبح وجود میں آتا ہے۔

جب مفکرین نے جمالیات میں حسن یا جمال اور طنز ومزاح کو شامل کیا تو ایک آواز تھی۔اس زمرے میں بدصورتی کو کیوں نہ شامل کیا جائے اور انھوں نے کہا کہ بدصورتی کو جس طرح ہم عام روایتی انداز میں سمجھتے آئے ہیں وہ ہرگز ویسی نہیں ہے۔جب کہ ایک گروہ نے آگے بڑھ کر یہ اعلان کیا کہ دنیا کی کوئی بھی

14؎ جمالیات اور ہندوستانی جمالیات۔قاضی عبدالستار۔آنند بھون دودھ پور علی گڑھ،سنہ اشاعت 1977 ص:70

شے بدصورت نہیں ہے۔ چاہے کوئی فن پارہ ہو یا کسی انسان کی زندگی۔ ایک حسن نظر کسی بھی معمولی چیز کو غیر معمولی بنا دیتی ہے۔

جیسے وینگر کا ڈرامہ ٹن ہاوسر جب پہلی بار کھیلا گیا تو بہت ہنگامہ اور توڑ پھوڑ ہوئی ۔ بعد میں اس ڈرامے کو نہایت اہمیت حاصل ہوئی۔ اس ضمن میں انھوں نے ایک مغربی مفکر بوسینکیٹ کے ''تین لکچرز'' کا حوالہ دیا ہے کہ بدصورتی کی تعریف میں وہ اپنے ڈھنگ سے جو کچھ کیا گیا ہے اس سے اشیاء کی نفی نہیں بلکہ خود تناظر کی اعصابی کمزوری کا اظہار ہوتا ہے ہم کو کوئی اشیاء اس لیے بدصورت معلوم ہوتی ہے کہ ہم درحقیقت جمالیات کی داد دینے کی صلاحیت سے محروم ہوتے ہیں۔

اسی طرح تاجم سلطان ناول میں انھوں نے خوبصورتی اور بدصورتی کو وسیع معنوں میں اس طرح بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''جب سے یہ دنیا بنی ہے انسانیت کا کوئی پیمانہ حسن کو قید نہیں کرسکا۔ حسن کون سا حسن ؟ یوروپین حسن، یوریشین حسن، افریقی حسن، زرد حسن ،سفید حسن، لال حسن، خود ہندوستان میں کہاں کا حسن کشمیر، بنگال، راجستھان، دکن، کہیں کے حسن کو کسی پر کیوں ترجیح دی جائے؟ حسن رنگ نسل قوم اور ملک کی طرح ہندسہ شماری کا پنجرہ توڑ کر باہر نکل آتا ہے۔''15؎

غرض جمالیات اور ہندوستانی جمالیات ایک ایسا موضوع ہے جس پر ابھی مکمل طور سے نقادوں نے نظر نہیں ڈالی ۔ مشرقی روایت میں بالخصوص ہمارے یہاں حسن کا معیار گورا رنگ قرار دیا جاتا ہے اور حسن کو ایک خاص پیمانے میں رکھ کر ہی دیکھا جاتا ہے۔ دراصل ہماری صلاحیت جمالیاتی فکر ونظر میں معدوم ہے جس کی وجہ سے ہم جمالیاتی مباحث سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ کتاب قاضی عبدالستار نے ایک نئے اور اہم موضوع پر لکھی تھی، مگر آج جمالیات پر کچھ کام ہو رہا ہے۔ ہمیں جمالیاتی نقطۂ نظر سے ادبی فن پاروں کو جانچنے کی ضرورت ہے۔ یہ کتاب ایک عمدہ اور ضروری مواد کے تحت طلبا کی رہنمائی کرسکتی ہے۔

☆☆☆

15؎: تاجم سلطان ۔ قاضی عبدالستار۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی۔ ص:29

قاضی عبدالستار اسرار و گفتار

قاضی عبدالستار بنیادی طور پر ایک فکشن نگار تھے اور یہ فنکارانہ صلاحیت اس کو وقت بھی عروج پر نظر آتی ہے وہ سامنے بیٹھے کسی بندے کو انٹرویو دے رہے ہوتے تھے جبکہ انٹرویو کا عمل بات چیت کا عمل ہوتا ہے اور اس میں انٹرویو دینے والا ایک عام ہی روزمرہ کی زبان استعمال کرتا ہے مگر اسرار و گفتار پڑھتے ہوئے حیرت ہوتی ہے کہ قاضی عبدالستار اپنے سوانح کو ایک کہانی کی طرح پیش کر رہے ہیں ایسا لگتا ہے کہ ان کے سامنے ماضی کی کوئی کتاب کھول کر رکھ دی گئی ہو اور وہ اس کو بلا روکے بلا اٹکے پڑھتے جا رہے ہیں اور سامنے والا بھی ان کی اس کہانی کو سن کر کسی بھی قسم کی اکتاہٹ محسوس نہیں کرتا بلکہ اس میں لطف لیتا ہے اور قاضی کے ماضی کے ساتھ سفر کرتا ہے۔

دراصل فنکار کی شخصیت میں تین بنیادی چیزیں شامل ہوتی ہیں جن کے بنا پر وہ کسی بھی واقعہ کو تخلیقیت کا رنگ چڑھا کر خوبصورت بنا دیتا ہے۔ پہلی چیز جو ہے وہ ہے فنکار کے اندر قوت متخیلہ اور احساس شدید اور تیسری اور آخری چیز ہے زبان و بیان کی قوت۔ ان تینوں کی آمیزش سے کوئی فنکار اپنی تخلیق کو پیش کرتا ہے۔ قاضی عبدالستار کے اندر یہ تینوں خوبیاں موجود ہیں جن کی بنا پر انھوں نے اپنے انٹرویو کو ایک خوبصورت قصے کی طرح بیان کیا ہے اور پڑھنے والا ان کی اس قوت متخیلہ کے ذریعہ ایک نئے زمانے کے ساتھ قاضی کے عشق کے قصے پڑھتے قاضی عبدالستار کے ساتھ قاری بھی حسن و عشق کی وادیوں کی سیر کرنے لگتا ہے اور خود کو بھی وہاں محسوس کرتا ہے۔

دوسری قوت جو قاضی عبدالستار کے اندر بہت شدت سے پائی جاتی ہے وہ ہے ان کا زود حسی انداز ان کا یہ احساس شدت انھیں بار بار ماضی کے تلخ واقعات کی جانب موڑ دیتا ہے اور اسی زود حسی کے سبب انھوں نے شعبۂ اردو علی گڑھ یونیورسٹی کے چھوٹے چھوٹے واقعات کو نہایت ہی معنیٰ خیز بنا کر پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ اس قوت کے سبب اس عمل میں مبالغہ دکھائی دینے لگتا ہے اور ایک معمولی بات کو

نہایت بڑی اور پر کشش بنا کر پیش کرتے ہیں۔

معروضی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے اور ان کے سوانحی پہلوؤں پر غور کیا جائے تو قاضی عبدالستار نے اپنی زندگی کے واقعات کو جس انداز میں پیش کیا وہ بہت عجیب وغریب لگنے لگتے ہیں اور سونے پر سہاگہ اپنی زبان وبیان کی وجہ سے وہ سننے والوں کو بھی متوجہ کر لیتے ہیں۔

قاضی عبدالستار کے اندر یہ تینوں خوبیاں موجود ہیں اور بہت ہی پاورفل انداز میں موجود ہیں اس لیے جو وہ لکھتے ہیں یا کسی کے سامنے بیان کرتے ہیں تو ان کے کمالات دکھائی دینے لگتے ہیں۔

اس لیے ان کی غیر افسانوی تخلیق بھی افسانوی تخلیق کا مزا دینے لگتی ہے۔ چونکہ قاضی عبدالستار کی حیات وکائنات کا بیشتر حصہ ایک فکشن جیسا ہے ان کے بچپن سے لے کر جوانی تک تعلیم سے لے کر ملازمت تک، شادی سے لے کر علیٰحدگی تک سبھی کچھ ایک کہانی کا باب لگتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ کبھی کبھی زندگی کی سچائیاں فکشن کی سچائیوں سے زیادہ حیرت انگیز ہوتی ہیں۔ اگر اسرار وگفتار میں بیان کی گئی باتوں پر یقین کیا جائے تو اس قول پر خود بخود یقین ہو جائے گا۔ قاضی صاحب کی پوری زندگی ایک کشمکش عروج وزوال کا شکار رہی اور انھوں نے دوبار با قاعدہ اپنی زندگی ختم کرنے کی بھی کوشش کی۔

اسرار وگفتار میں بہت سے ایسے بیانات بھی شامل ہیں جو قابل گرفت محسوس ہوتے ہیں۔ قاضی صاحب کا دلچسپ بیانیہ کا ہنر بہترین زبان کی بہترین ترتیب کا استعمال وہ عام گفتگو میں بھی کرتے ہیں جس سے ایک داستانوی فضا قائم ہو جاتی ہے اور قاضی صاحب کی عجیب وغریب باتوں پر یقین کر لینے کو جی چاہتا ہے۔ راقم کو اس بات کا بلا واسطہ اندازہ ہے۔

یہ کتاب قاضی عبدالستار اسرار وگفتار (گفتگو کی شکل میں سوانح عمری) کے عنوان سے عرشیہ پبلی کیشنز کی جانب سے 2014 میں شائع ہوئی۔ راشد انور راشد نے فہرست کی ترتیب سے اپنی ہنر مندی کا ثبوت دیا ہے۔ ساتھ ہی اعتراف کے عنوان سے انٹرویو کے بعض ایسے اسرار ورموز پیش کیے ہیں جو انٹرویو کے لیے مشعل راہ کا کام کرتے ہیں جیسے انھوں نے لکھا ہے کہ بعض اوقات جب ہم کسی شخص کا انٹرویو لیتے ہیں تو اس کی شخصیت سے اتنے مرعوب ہو جاتے ہیں کہ بہت سے سوالات تشنہ جواب رہ جاتے ہیں اور انٹرویو دینے والے کے بعض ایسے خیالات کی بھی تائید کرنے لگتے ہیں جس پر سوالات قائم کیے جا سکتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

''کسی بھی انٹرویو کے اچھے برے یا اوسط ہونے میں بنیادی طور پر Intervewer کا رول سب سے زیادہ اہم ہوتا ہے۔ انٹرویو دینے والے یعنی Interviewee کی شخصیت اتنی اہمیت نہیں رکھتی۔غالبًا اردو میں Interviewer اور Interviewee کے لیے کوئی مناسب اصطلاح رائج نہیں ہوسکی ہے۔Interview کے لیے بات چیت، باتیں یا گفتگو جیسے الفاظ استعمال کیے جاتے رہے ہیں جو بہت حد تک رائج ہو چکے ہیں لیکن انٹرویو لینے والا یا جس کا انٹرویو کیا جا رہا ہے اس کے لیے کوئی بہتر لفظ یا ترکیب وضع نہیں کی جا سکی ہے۔سوال کرنے والا اگر چاق وچوبند ہے ۔موضوع پر بہتر گرفت رکھتا ہے یا پھر بات سے بات پیدا کرنے کے ہنر سے واقف ہے تبھی وہ بہتر انٹرویو لے سکتا ہے۔انٹرویو کے دوران بہت سے مرحلے ایسے آتے ہیں جب اسے ذہنی طور پر حاضر ہونے کا ثبوت پیش کرنا پڑتا ہے۔جواب دینے والا بیشتر معاملات میں راہ فرار اختیار کرنے کی کوشش کرسکتا ہے لیکن انٹرویو لینے والے کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ ایسے موقعوں پر اپنی جانب سے کوئی کوتاہی نہ برتے۔ جہاں کہیں بھی اسے محسوس ہو کہ جواب دینے والا پہلو بدل رہا ہے وہیں خوبصورت انداز میں اس کی نشاندہی ضروری ہے۔موضوع پر اگر ایسے گرفت حاصل ہے تب وہ مختلف موقعوں پر کئی ایسی باتوں کا ذکر بھی کرسکتا ہے جس سے جواب دینے والا گفتگو کو آگے بڑھانے کے لیے مجبور ہوجائے۔اگر وہ بات سے بات پیدا کرنے کے ہنر میں طاق ہے تو جواب دینے والے کو مختلف انداز سے مجبور کرسکتا ہے کہ وہ اپنے سینے میں دفن بات کو بھی کسی طرح زبان پر لے آئے۔ جواب دینے والے سے اس نوع کی باتوں کا برآمد کرنا ہی انٹرویو کا اصل مقصد ہے۔'' 16ؔ

اعتراف کے بعد قاضی عبدالستار کے آبائی قصبہ اور جہاں قاضی عبدالستار کی پیدائش و پرداخت ہوئی مچھریٹہ اور سیناپور کے عنوان سے قاضی صاحب کی پیدائش ابتدائی تعلیم گھر خاندان اور زمیندارانہ ماحول کا ذکر ہے جہاں قاضی عبدالستار کی شخصیت ان پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے جو انھیں ایک خاص عہد کے فنکار کے طور پر پہچان دلاتی ہیں۔ راشد انور راشد نے اس باب میں قاضی صاحب سے ان کے سوانح کے انداز میں

16ؔ: اسرار و گفتار۔راشد انور راشد عرشیہ پبلی کیشنز، نئی دہلی، سنہ اشاعت 2014،ص: 11-10

ان تمام باتوں کو معلوم کرنے کی کوشش کی ہے جہاں قاضی صاحب نے آنکھیں کھولیں اور جس ماحول میں بڑے ہوئے تا کہ ایک خودنوشت کی کمی کو پورا کیا جا سکے۔

قاضی صاحب نے اس کتاب میں یہ بتایا ہے کہ بہت سے لوگوں نے ان سے ان کی زندگی نامہ لکھنے پر اصرار کیا یہاں تک کہ قرۃ العین حیدر نے بھی زور دیا مگر انھیں لگتا ہے کہ وہ اس قابل نہیں کہ وہ اپنی زندگی کے بارے میں کچھ لکھیں اور لوگ انھیں مغرور سمجھتے ہیں اور کمیونسٹ بھی مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ قاضی صاحب کو کسی بات سے انکار نہیں۔انھوں نے اپنے مخالفین کی تمام باتوں کو قبول کیا اور اس کی حمایت کی اس طرح سے ان کے مخالفین کی زبان ہمیشہ کے لیے بند ہو گئی۔

اس باب میں انھوں نے اپنے آبائی وطن اپنے ماں باپ دادا زمیندارانہ نظام کے جاہ وجلال کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔قاضی صاحب اپنے باپ کی اکلوتی اولاد تھے اور باپ ہمیشہ سیاحت پر رہتے تھے جس کی وجہ سے ان کے خاندان والے قاضی صاحب کو کچھ زیادہ ہی لاڈ پیار کیا کرتے تھے۔ایک واقعہ کا ذکر انھوں نے اس طرح کیا ہے:

> ''بابا جان مجھے کتنا پیار کرتے تھے اس کا اندازہ آپ ایک واقعہ سے کر لیجئے۔مجھے ربر کی غلیل بنانا تھا،اڈہ اور ربر آ گئی،اب اس کو باندھنا تھا۔اماں کسی تقریب میں کیسی عزیز کے یہاں چلی گئی تھیں۔ان کا زربخت کا غرارہ تخت پر رکھا تھا۔میں نے قینچی سے ان کی گوٹ کاٹ لی اور غلیل بنالی۔اماں نے دیکھا تو کہرام مچ گیا۔بہت پٹائی ہوئی میری۔میں دادا سے فریاد کرتا ہوا بابا میاں کے پاس پہنچا۔بابا میاں عدالت کر رہے تھے وہ فوراً کھڑے ہو گئے۔میرا ہاتھ پکڑ کر اندر آئے۔میری والدہ بہت عبادت گزار تھیں اس لیے بابا میاں ان کو مولویائین کہتے تھے۔بہت غصے سے کہا مولایائین ہم تم کو بہت چاہتے ہیں جب تم بیاہ کر آئی ہو تو ہم نے منھ دکھائی میں تم کو اپنے گھر کی چابیاں دے دیں،لیکن اگر تم نے اب بھیا کو مارا تو خدا رسول کی قسم پہنچے سے ساتھ کٹوالوں گا۔''17

روداد عشق کے باب میں قاضی عبدالستار نے اپنے چار عشق کا ذکر کیا ہے جس میں بیشتر کی ابتدا حیرت انگیز اور انجام خطرناک ہے۔ان کا پہلا عشق جوٹین ایج کے زمانے کا ہے دراصل یہ عشق بھی نہیں

17: قاضی عبدالستار اسرار و گفتگو۔راشد انور راشد۔عرشیہ پبلی کیشنز سنہ اشاعت 2014،ص:47

کہا جاسکتا یہ صرف وقتی جذباتی احساس ہوتا ہے جس سے ہر نوجوان لڑکا لڑکی گزرتا ہے مگر وقت کے ساتھ جذبہ سرد پڑ جاتا ہے۔ جس وقت نوجوان نسل اس جذبے کا شکار ہوتی ہے اس کو محسوس ہوتا ہے دنیا بس اسی تک محدود ہے مگر وقت گزرنے کے ساتھ حقیقت کا سامنا کرنے اور دنیا دیکھنے کے بعد سمجھ آتا ہے یہ صرف وقتی ابال تھا۔ قمر نام کی اس لڑکی سے قاضی صاحب ملتے جلتے ہیں مگر وہ ایک دن پاکستان چلی جاتی ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ یہ قمر قاضی صاحب کے دورۂ پاکستان میں ملاقات ہوتی ہے جس کا ذکر اس کتاب میں موجود ہے۔ جہاں قاضی صاحب نقوش کے ایڈیٹر محمد طفیل کے توسط سے شام افسانہ منعقد ہوتی ہے اور اب یہ قمر ڈاکٹر انور قمر کے نام سے ایک ڈاکٹر بن جاتا ہے اور قاضی صاحب کے گھر پر ملاقات بھی کرتی ہے۔ قاضی صاحب کا یہ عشق بالکل معصوم تھا اور جب لاہور اسٹیشن پر لوگ انھیں چھوڑنے آئے تو قمر انور کی روتی ہوئی آنکھوں کو دیکھ کر یہ شعر کہا۔

یاد آتی ہیں کس قدر آنکھیں

وقت رخصت وہ تربہ تر آنکھیں

دوسرا عشق لکھنؤ کی تعلیم کے دوران قاضی صاحب اپنے ماموں کے گھر رہا کرتے تھے۔ وہاں پڑوس میں ایک شیعہ لڑکی کے ساتھ ہوا۔ اس عشق کا انجام بہت خطرناک تھا جس میں شمیم نام کی لڑکی نے زہر کھا کر خودکشی کر لی۔ اس عشق کا بیان قاضی صاحب نے بڑی باریکی سے کیا اور ایک ایک واقعات کی تفصیل بتائی ہے۔ جہاں وہ شمیم کے ساتھ گھر چھوڑ کر لکھنؤ میں گھوم رہے تھے مگر گھر والوں کی سختی سے دوبارہ نہیں مل سکے۔ نتیجہ میں شمیم نے اپنی زندگی ختم کر لی۔

تیسرے عشق کی جو روداد اس کتاب میں موجود ہے اس پر قاضی صاحب نے ایک ضخیم ناول ''تاجم سلطان'' کے نام سے لکھا ہے اور اس ناول میں انھوں نے نہایت جزئیات کے ساتھ تاجم سلطان اور اس حویلی کی شان و شوکت کا ذکر کیا ہے۔

تاجم سلطان سے ملاقات 63-1962 میں کرنل بشیر حسین زیدی وائس چانسلر کے لاج میں ہوئی تھی۔ اس پروگرام میں تاجم سلطان اپنے باپ کے ساتھ مدعو تھیں اور قاضی صاحب بھی ان کے حسن پر فریفتہ ہو گئے تھے مگر تاجم کی جاہ و حشمت کو دیکھ کر اظہار عشق نہیں کیا۔ مگر تاجم سلطان نے انھیں اپنے گھر دہلی میں مدعو

کیا اوران کی خوب خاطر مدارات کی ۔تاجم سلطان کے خواب میں بشارت ہونے کے بعداس نے قاضی صاحب سے نکاح بھی کرلیامگرانسان کے فطری لالچ کے ہاتھوں ان کا یہ عشق ہارگیا۔ایک عورت جواپنے بیٹے سے تاجم کی شادی کرانا چاہتی تھی اس نے تاجم کو پان میں زہرملاکرکھلادیا جس کی وجہ سے تاجم کی موت ہوگئی۔

تاجم کے باپ تعلقدار تھےاوراکبرآباداورنصیرآبادریاست کے مالک تھے۔تاجم کواس ناول اوراس قصے میں بیٹا سرکار کے لقب سے یاد کیا گیا ہےاورقاضی صاحب کو بھیا سرکار کے نام سے پکارا گیا ہے۔

چوتھا عشق قاضی صاحب کے لکچرر ہونے کے بعد کا ہے۔قاضی صاحب شادی شدہ تھےاوردوبچوں کے والد تھے۔ان کی بیوی میکے چلی گئی تھیں اور بضد تھیں کہ قاضی صاحب لینے آئیں اورقاضی صاحب کا یہ کہنا تھا کہ وہ اپنی مرضی سے گئی ہیں اپنی مرضی سے آئیں۔اس طرح ان کی ازدواجی زندگی کے تعلقات پیچیدہ بنے رہے۔غرض 1971 میں قاضی صاحب کی بہن کے ساتھ ایک لڑکی آئی جواردوایم اے میں داخلہ لینا چاہتی تھی۔قاضی صاحب کو وہ پسند آئی اورانھوں نے اس سے شادی کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔وہ بھی رضامند ہوگئی۔اس طرح سے کوثر مجید کی شادی 1973 میں قاضی صاحب سے ہوگئی اورقاضی صاحب کی زندگی کچھ وقت کے لیے خوشگوار ہوگئی۔

اس شادی کوکرنے میں کافی پیچیدگیاں بھی ہوئیں کیونکہ وہ لڑکی قاضی صاحب کی اسکالرتھی اورطالبہ سے شادی کرنا بداخلاقی یعنیMoral tarpituee میں آتا ہےمگرقاضی صاحب نے ناسازگارحالت پر جلدی قابو پالیا اورکوثر نے اپنا داخلہ کینسل کردیا۔قاضی صاحب لکھتے ہیں کہ ان کی زندگی کا یہ آٹھ سے دس سال خوشگواررہا1980 میں کوثر پر پاگل پن کا اٹیک ہوااور بڑے سے بڑے ڈاکٹرز کو دکھانے کے باوجود بھی وہ ٹھیک نہیں ہوئی۔غرض ایک دن اس دارفانی سے کوچ کرگئی۔قاضی صاحب کی تمام روداد عشق ایک ٹریجڈی بنی رہی اوروصال کچھ وقت کا ہی نصیب ہوا۔دکھ اکیلا پن ان کا مقدر بنا رہا۔

لکھنؤ کے ایام کے تحت قاضی صاحب نے اپنے لکھنؤ کی زندگی ہاسٹل کا ماحول شعروشاعری کا ذکر کیا ہے ساتھ ہی لکھنؤ ڈپارٹمنٹ اردواوردوسرے اساتذہ کا ذکر ہےاوراس باب میں انھوں نے اپنے ناول شکست کی آواز کی تفصیل بتائی ہے۔ناول کب اور کیسے لکھا اوروہ کیسے شائع ہوالکھنؤ کی زندگی قاضی صاحب

کے لیے ایک خواب ناک زندگی رہی وہ اکثر لکھتے ہیں کہ ان کا لکھنؤ بھی وہی ہے جو مجاز صاحب کا لکھنؤ ہے ۔لکھنؤ سے قاضی صاحب کو عشق تھا۔

لکھنؤ اور وہاں کے معاشرے کی ایک ایک روداد نہایت باریکی سے پیش کی ۔ پڑھتے وقت ہم خود قاضی صاحب کی زبان سے لکھنؤ کی تانگے پر بیٹھ کر سیر کرتے ہیں اور مشاعرے میں موجود ہوتے ہیں ساتھ ہی شعبۂ اردو کی دلچسپ روداد سن کر لطف اندوز ہوتے ہیں۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی ،آل احمد سرور اور احتشام حسین چلتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں۔

علی گڑھ کے شب و روز میں قاضی صاحب نے جہاں اپنے پی ایچ ڈی کے واقعہ کو پیش کیا ہے وہیں اپنی ملازمت کے قصے کو تفصیل سے بتایا ہے۔قاضی صاحب بتاتے ہیں کہ علی گڑھ سے تعلق سے ان کے تاثرات نہایت تلخ رہے ہیں۔اس میں کوئی شک نہیں کہ دانشگاہ علی گڑھ قاضی صاحب کی ادبی شناخت کو متعین کرتے ہیں انھیں اس بات کا بھی انکار نہیں ہے علی گڑھ کے بارے میں ایک کہاوت مشہور ہے کہ یہاں سبھی بہت اچھے ہیں بس آپ کو کبھی کسی سے کوئی کام نہ پڑے۔غرض قاضی صاحب نے علی گڑھ کے اپنے تعلقات اور اپنی ملازمت اور دوسرے تمام واقعات کا دلچسپ انداز میں ذکر کیا ہے ۔اس باب میں اجمیر شریف کا بھی ذکر ہے جہاں کی جادوئی فضا سے بھی وہ دوچار ہوئے۔

یہاں وہ یہ بھی بتاتے ہیں کہ وہ علی گڑھ سے مطلق متاثر نہیں صرف پروفیسر رشید احمد صدیقی، پروفیسر ڈاکٹر علیم، پروفیسر نورالحسن نے مجھے متاثر کیا۔ میں نے علی گڑھ کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ اگر وہ لکھتا تو تلخ ہو جاتا۔اس باب میں انھوں نے قاضی صاحب کی ناول شکست کی آواز کے اس جلسے کا بھی ذکر کیا ہے جس میں الہ آباد کے الکا ہوٹل میں ہندی کے جابا ناگار حسین نے قاضی صاحب کے متعلق کہا تھا کہ دیہات پر جس کو لکھنا ہو وہ قاضی صاحب کو Textbook کے طور پر پڑھے اور اس اعلان کے بعد اردو دنیا جو پرترقی پسندوں کا غلبہ تھا گویا Shock میں مبتلا ہوگئی اور اس ناول کا چار پانچ زبانوں میں ترجمہ ہوا۔

اس باب میں انھوں نے نہایت تلخ باتیں بھی بیان کی ہیں جو آل احمد سرور کے بارے میں رشید احمد صدیقی جن کا نام علی گڑھ کے ساتھ لازم و ملزوم ہے ایک واقعہ کا اس طرح ذکر کیا ہے:

''رشید صاحب ریٹائر ہو چکے تھے ۔سرور صاحب شعبۂ اردو کی صدارت ہتھیا چکے

تھے۔سرورصاحب نے پروفیسر رشید احمد صدیقی کو ایک دن کا بھی Extension ملنے نہیں دیا۔رشید صاحب جو سرور صاحب کو اردو ڈپارٹمنٹ میں لائے تھے،ان کی پرورش کی تھی،ان کو اس قابل بنایا تھا کہ ان کے مقابلے پر کھڑے ہوں،انھوں نے کرنل بشیر حسن زیدی وائس چانسلر تھے اور سرور صاحب کی مٹھی میں تھے،انھیں شیشے میں اتار کر رشید صاحب کو ایک دن کا بھی Extension بھی نہیں ملنے دیا۔ یہ سب کوئی نہیں بتا سکتا خدا نے صرف مجھے یہ توفیق دی ہے۔اس یونیورسٹی کی تاریخ میں رشید صاحب وہ پہلے پروفیسر تھے جو ایک طرح سے جبراً ریٹائر کر دیے گئے۔‘‘18؎

اس کتاب میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی بہت سی پیچیدہ سیاست کا ذکر ہے جس کا اندازہ باہر کا انسان نہیں لگا سکتا ہے بہت سے اسرار ورموز جو پردۂ خفا میں ہیں جن کا ذکر کرنے بھی لوگ کتراتے ہیں ان تمام باتوں کو قاضی صاحب نے کھول کھول کر نہایت جرأت مندانہ انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔واقعات پڑھتے ہوئے دلچسپی کے ساتھ حیرت بھی ہوتی ہے افسوس بھی ہوتا ہے دکھ بھی ہوتا ہے۔علی گڑھ اور اردو ڈپارٹمنٹ کا اتنی باریکی سے ذکر وہی کرسکتا ہے جس نے وہاں شب وروز گزارے ہوں اور جس نے یہ سب تجربات کیے ہوں۔قاضی صاحب نے ان تمام سیاست اور قیادت کو بھوگا تھا جس کو انھوں نے بیان کیا۔ایک اور واقعہ کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:

راشد انور راشد کو دیے گئے انٹرویو میں انھوں نے بتایا ہے کہ قدسیہ زیدی نے انھیں Doll'shouse کا ترجمہ کیا ہے مگر Doll's House قدسیہ زیدی کے نام شائع ہوئی ہے اس میں کہیں بھی قاضی عبدالستار کا ذکر نہیں ملتا ہے۔اس واقعہ کا ذکر انھوں نے اس طرح کیا ہے:

’’......سرور صاحب انجمن ترقی اردو کے سکریٹری تھے۔ ہندوستان کی کوئی ایسی کمیٹی نہیں تھی جس کے وہ ممبر نہ ہوں۔ پوری اردو دنیا ان کے ساتھ میں تھی۔

He was the most powerfull person in urdu

میں نے جواب دیا حضور والا آپ کا خادم اردو کے نقادوں کی آرائے محترم کو قبول نہیں کرتا اور چلا آیا۔ سرور صاحب جیسے بیٹھے تھے بیٹھے رہ گئے۔جنگ کھل کر ہوچکی تھی لیکن میں انتہائی ادب

18؎: قاضی عبدالستار اسرار و گفتگو۔راشد انور راشد،عرشیہ پبلی کیشنز،نئی دہلی،سنہ اشاعت 2014ء،ص 175

کرر ہا تھا۔سرور صاحب انتہائی ضبط سے کام لے رہے تھے۔اتنی بات ہوگئی کہ میں اردو کا نہیں ہندوستان کا Steblish writer ہوں۔اب فرمایا گیا بلکہ یہ مہم چلائی گئی کہ ٹھیک ہے انھیں اردو آتی ہے لیکن انگریزی نہیں جانتے۔اس مہم کے پیچھے حقیقت اتنی تھی کہ ریڈر شپ کی پوسٹ آنے والی تھی ڈر تھا کہ میں اپلائی نہ کردوں۔کرنل صاحب کی بیگم قدسیہ زیدی بہت اسمارٹ لیڈی تھیں اور یونیورسٹی کے معاملات میں دلچسپی رکھنے والی خاتون تھیں اور Aristocrdey ان کے مزاج میں شامل تھی۔ان کو خیال آیا کہ معلوم کیا جائے اس یونیورسٹی میں سب سے Well Dressed ٹیچر کون ہے۔پوری خاموشی کے ساتھ ایک دن دو ایک خواتین کے ہمراہ شعبہ ہائے تعلیم کا دورہ کرنے لگیں۔میرے ساتھ مسئلہ یہ تھا کہ میرے والد مستقل سیاحت پر رہتے تھے،شکار پر رہتے تھے اور میں ہڑکتا تھا اور روتا تھا۔میری والدہ وہ سب کچھ کرتی تھیں جس سے میں بہلایا جاسکوں۔کھانے کے علاوہ میں عمدہ لباس کا عادی ہو چکا تھا۔بیگم صاحبہ تشریف لائیں تو میں Tip-Top تھا تھری پیس ٹائی بٹلر سوٹ روز مرہ میں پہنے ہوا تھا۔انھوں نے کن انکھیوں سے دوبارہ مجھے دیکھا پھر پوچھا آپ کا کیا نام ہے؟ میں نے نام بتایا، چلی گئیں۔چند روز بعد ایک خط آیا کہ آپ کل شام کو چائے میرے ساتھ پیجیئے۔میں اب بہترین کپڑے پہن کر پہنچا۔بیگم صاحبہ نے کھڑے ہوکر استقبال کیا۔اپنے ہاتھ سے چائے بنائی۔فرمایا آپ اس یونیورسٹی کے سب سے Well Dressed ٹیچر ہیں اور ایک لفافہ پیش کیا۔اس میں گیارہ سو روپے تھے۔باہر نکل کر سیدھا شہر گیا۔Bata کی دکان سے Ambassdor جوتا خریدا جو باٹا کا سب سے قیمتی جوتا تھا۔یہ میں اس لیے بتا رہا ہوں کہ بیگم صاحبہ سے میرا تعارف ہو چکا تھا۔چنانچہ ایک خط آیا۔کل میرے ساتھ چائے پیجیئے۔ان کو بھی بتایا گیا کہ مجھے انگریزی نہیں آتی۔سلام کے جواب میں انھوں نے فرمایا Ebson کا ڈرامہ Doll's house آپ نے اس کا نام سنا ہے۔میں نے بہت لاپرواہی سے عرض کیا کہ میں پڑھ چکا ہوں۔جی......؟ آپ پڑھ چکے ہیں؟ تو کیا آپ اس کا ترجمہ کرسکتے ہیں۔میں نے کہا انشاءاللہ ہوجائے گا۔کتنے دن میں ہوجائے گا؟ میں نے کہا جو تین دن کی چھٹی آرہی ہے؟اسی میں انشاء اللہ ہوجائے گا۔انھوں نے کتاب جلدی سے میرے حوالے کی۔جب چھٹیاں ختم ہوئیں تو چپراسی کے ذریعہ مجھے فوراً بلایا گیا۔بیگم صاحبہ ہمیشہ کی طرح کھڑی ہوگئیں اور میرا ترجمہ دونوں ہاتھوں سے لیا۔ادھر ادھر دیکھا، چائے پلائی اور فرمایا اتوار کی شام کو آپ تشریف لائیے

گا۔'' میں (ص:177-176)اس طرح انھوں نے ترجمہ لے کرانھیں گیارہ سوروپے دیے مگر Doll's house میں جو سنہ اشاعت لکھا ہے 1957 ہے جس کا پیش لفظ احتشام حسین نے یکم نومبر 1955 کو لکھا۔

اس کے ساتھ ہی قاضی صاحب نے اپنے پروفیسر ہونے کے ذکر کو پیش کیا ہے جس کا وہ ہر محفل میں ذکر کرتے ہیں کس طرح انھوں نے ایک بار پروفیسر شپ میں تقرر نہ ہونے کی وجہ سے دوبارہ انٹرویو دینے سے منع کر دیا اور درخواست کے فارم پر یہ شعر لکھ دیا۔

حد سزا ئے سخن ہے کیا کیجئے

ستم بہائے متاع ہنر ہے کیا کیجئے

ساتھ ہی اس باب میں خلیل الرحمٰن اعظمی کے ساتھ ان کی چپقلش کو بھی یاد کیا جب قاضی صاحب اور خلیل الرحمٰن اعظمی پروفیسر نہیں ہو پائے اور ان کی جگہ دوسرے لوگوں کا تقرر ہو گیا اور خلیل صاحب جو بیمار رہتے تھے انتقال فرما گئے اور اس موت کا ذمہ دار قاضی صاحب کو بتایا گیا۔

اس باب میں معین احسن جذبی کے ساتھ جو زیادتیاں ہوئیں اس کا بھی ذکر ملتا ہے۔ ساتھ ہی خورشید اسلام صاحب کے تعلق سے لکھتے ہیں کہ جب وہ انگلینڈ سے آئے تو بانجھ ہو چکے تھے۔ ساتھ ہی دوسرے دلچسپ واقعات کا ذکر کیا ہے۔ علی گڑھ جو اردو شعر و ادب کی ایک کہکشاں تھا علی گڑھ کے شاعروں وہاں کی علمی ادبی محفلوں کے ساتھ گھریلو زندگی کا بھی خوبصورت بیان ہے جس کو پڑھنے کے بعد مزید تجسس پیدا ہوتا ہے۔ قاضی صاحب کے ایک زمانے میں شاعری بھی کیا کرتے تھے مگر شاعری چھوڑ کر فکشن کی دنیا کی طرف لوٹ آئے۔ یہاں پر انھوں نے ایک مشاعرے کا ذکر کیا ہے جس میں مصرعہ طرح کی پابندی تھی ۔ جہاں قاضی صاحب شعر لکھ کر کامیاب ہوئے اور سرخرو ہوئے۔

وارث کرمانی، اسلوب احمد انصاری، وحید اختر جیسے شاعر و ادیبوں کا حال بھی معلوم ہوتا ہے۔ اختر انصاری جو ایک قطعہ لکھا کرتے تھے ان کی بھی شاعری کا ذکر ملتا ہے جن کا لوگ علی گڑھ میں مذاق اڑایا کرتے تھے مگر وہ اپنے وضع پر زندگی گزاری جس کو قاضی صاحب پسند کرتے تھے۔

قرۃ العین حیدر سے قاضی عبدالستار کا ایک اچھا رشتہ تھا۔ دونوں تخلیق کار ایک دوسرے کی عزت

کیا کرتے تھے۔ ''شب گزیدہ'' کی تعریف بھی قرۃ العین حیدر کیا کرتی تھیں اور انھوں نے لکھا کہ ''شب گزیدہ'' سے بہترین کہانی قاضی عبدالستار ہی لکھ سکتے ہیں۔ غیاث احمد گدی کا قدرے تفصیل سے ذکر ہے۔ ساتھ ہی شہریار سے قاضی صاحب کی ان بن اور شہریار صاحب کی سفارش کا بھی بیان ملتا ہے جب انھوں نے پروفیسر کے لیے کی 1982 میں جس وادی لیکھک سنگھ کی افتتاحی تقریر کا بھی ذکر کیا ہے جہاں قاضی صاحب ایک خوبصورت تقریر کی اور اردو ہندی کے حوالے سے بات کی۔

اپنی تھیسس کو قاضی صاحب نے آل احمد سرور کے نام سے منسوب کیا ہے اور اس کے پیچھے کیا وجوہات تھیں ان کا بھی ذکر کیا ہے۔ علی گڑھ کا اتنا قریبی اور اتنا باریک ذکر جس طرح سے اس گفتگو میں کیا ہے وہ قابل دید ہے۔

دورۂ پاکستان کے تحت قاضی عبدالستار نے پاکستان کے سفر اور وہاں ان کی جو خاطر مدارات ہوئیں کسی طرح قاضی صاحب کے اعزاز میں جلسے ہوئے اور لوگوں نے ان کا دل کھول کر استقبال کیا ساتھ ہی جنرل ضیاء الحق نے انھیں کراچی یونیورسٹی کی پرووائس چانسلر بننے کی بات کی مگر انھوں نے یہ کہہ کر اس آفر کو ٹھکرا دیا کہ جس ملک نے انھیں پدم شری دیا ہے وہ اسے نہیں چھوڑ سکتے۔ دورۂ پاکستان کے وزیراعظم ہند اندرا گاندھی کے ساتھ قاضی صاحب سے ملاقات کا بھی ذکر ملتا ہے۔

ادبی مباحث کے عنوان کے تحت قاضی صاحب نے اپنی تمام تخلیقات کا مختصر مگر جامع ذکر کیا ہے جس میں انھوں نے اپنی محرکات وعوامل پر بھی اپنے تجربات پیش کیے ہیں اس مباحث میں انھوں نے زمیندارانہ نظام اور زمینداروں کی صورت حال کا بھی تفصیلی ذکر کیا ہے۔ اپنے مخصوص علاقے یعنی زمینداروں کی زندگی کے بارے میں اور ان کے طرز عمل کا جتنا باریک ذکر قاضی صاحب نے کیا ہے اس کا دوسرے تخلیق کاروں کے یہاں بیان کافی مشکل ہے۔ زمینداری نظام کے بعد زمینداروں کی حالت جس طرح قابل رحم ہوگئی اور وہ نان شبینہ کے محتاج ہوگئے کل کے زمیندار آج کے نوکر ہوگئے اس کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:

> ''میں نے پہلا ناول ''شکست کی آواز'' کے نام سے لکھا جو 1953 میں شائع ہوا۔ جب وہ ناول شائع ہوا تو ''قومی آواز'' کے ادبی ایڈیشن میں ایک ترقی پسند مولوی رضا انصاری فرنگی محل نے تبصرہ کیا کہ یہ Reactionary اور میلوڈرامہ ہے۔ اس تبصرے کا ردعمل مجھ پر بہت شدید ہوا اور میں نے طے کیا کہ میں اور لکھوں گا اور اسی نقطۂ نظر سے لکھوں گا

۔چنانچہ میں ''شب گزیدہ''،''غبارشب''،''مجوبھیا''اورناول تابڑتوڑ لکھے۔اگر میرا پہلا ناول یعنی ''شکست کی آواز'' Reactioary ہے تو یہ Reactionary ہے۔زمیندار جس کی حالت قابل رحم ہے،وہ گاؤں کی عدالت ،پنچایت کے سامنے جیسے کٹہرے میں کھڑا ملزم ہےاوراس کے مقدمات کا صفایہ آج وہ آدمی کرر ہاہے جو اس کے سامنے کبھی بیٹھکی کی جسارت نہیں کرسکتا تھا ۔اس Torcher کومیں نے افسانوں اورناولوں میں جگہ جگہ پیش کیا ہے۔''19؎

قاضی صاحب جہاں اپنے دوستوں ،خوردوں اور چھوٹوں سے محبت کرتے ہیں وہیں اپنے مخالفین کے معاملے میں نہایت سخت بھی ہیں۔انھوں نے اس ادبی مباحث میں ایک واقعہ کا ذکر کیا ہے جب ان کے ناول شب گزیدہ کوروسی زبان میں ترجمہ کرنے کی بات ہوئی تو سردار جعفری نے ان کی مخالفت کی اور جب یہ بات قاضی صاحب کوکملیشور کے توسط سے معلوم ہوئی تو انھوں نے علی سردار جعفری کوترقی اردو بورڈ کے وائس چیئر مین ہونے سے پہلے ہی صدر جمہوریۂ ہند آنریبل فخر الدین علی احمد سے ملاقات کر کے ہٹوادیا اوران کی جگہ پر حیات اللہ انصاری کا نام پیش کر دیا اوراس واقعہ کی تمام روداد علی گڑھ میں بنا بھی دیا۔واقعہ کچھ اس طرح لکھا گیا ہے:

''جب میرے ناول ''شب گزیدہ'' کوروسی زبان میں ترجمہ کرنے کی بات آگے بڑھی تاشقند میں تو علی سردار جعفری نے اس کی بہت مخالفت کی۔یہ واقعہ میرے دوست کملیشور نے بتایا تو میں بھی پنجے جھاڑ کر علی سردار جعفری کے پیچھے پڑ گیا اوران سے میں نے انتقام لے لیا۔ جب فخر الدین علی احمد صدر جمہوریۂ ہند تھے علی گڑھ میں خبر آئی کہ علی سردار جعفری ترقی اردو بورڈ کے وائس چیئر مین ہونے جارہے ہیں Prione minists کے آفس میں ان کا نام Recommendl ہوکر صدر کے دستخط کے لیے گیا ہے تو میں نے دوسرے ہی دن صدر جمہوریۂ ہند آنریبل فخر الدین علی احمد سے ملاقات کی اور علی سردار جعفری کی مخالفت کی اوران کے مقابلے میں حیات اللہ انصاری کو پیش کیا اوران کے کارنامے بیان کیے۔صدر جمہوریۂ ہند نے سردار جعفری کا نام کاٹ دیا۔حیات اللہ انصاری کا نام لکھ دیا۔''20؎

19؎: قاضی عبدالستار اسرار و گفتگو۔راشد انور راشد،عرشیہ پبلی کیشنز،نئی دہلی،سنہ اشاعت 2014،ص 251

20؎:ضی عبدالستار اسرار و گفتگو۔راشد انور راشد،عرشیہ پبلی کیشنز،نئی دہلی،سنہ اشاعت 2014،ص 252

قاضی صاحب نے اپنے تمام ناولوں کے ساتھ اس کے مضمون اور اس سے جڑے ہوئے واقعات کا مختصر ذکر کیا ہے اور ناول کے محرکات کو بھی پیش کیا ہے۔ ادبی مباحث کے تحت قاضی صاحب کے ناولوں کے نفس مضمون کو سمجھنے میں آسانی ہو جاتی ہے۔ اکثر اوقات لوگ انھیں زمیندارانہ نظام کا حامی سمجھتے ہیں اس خیال کی تردید کی ہے ساتھ ہی انھوں نے کہا ہے کہ زمینداروں کا جتنا سخت بیان میں کیا ہے وہ کسی اور ادیب کے یہاں مشکل ہے وہ زمینداروں کے بارے میں وہ نہیں لکھ سکتا جو میں نے لکھا ہے۔ زمین دار صرف زمیندار ہوتا ہے وہ نہ تو کسی کا باپ بھائی یا بیٹا ہوتا ہے وہ صرف اپنے لیے جیتا ہے۔

داراشکوہ کے حوالے سے انھوں نے لکھا ہے کہ اس ناول کے بارے میں مشہور تھا کہ اس ناول کی جلدیں پاکستان کے کراچی پریس کلب میں جلائی گئیں مگر جب مجھے کراچی پریس کلب نے مدعو کیا تو وہاں تقریباً ڈیڑھ سو کے مجمع نے فرداً فرداً مجھ سے ہاتھ ملایا اور تقریر کی فرمائش کی۔ ساتھ ہی انھوں نے یہاں پر مغل بادشاہوں اور اورنگزیب کے غاصبانہ مزاج کا ذکر کیا ہے۔ تاریخ کو پڑھنے کا قاضی صاحب کا اپنا نقطۂ نظر ہے اور اس حوالے سے انھوں نے اورنگزیب پر بات کی ہے۔

''ناول'' اور صلاح الدین ایوبی تخلیقات کے وجود میں آنے جو پیش خیمہ تھا اس کا بھی ذکر کیا ہے۔ ''بادل'' جو ایک علامتی ناولٹ ہے اور پہلی بار کسی جانور پر لکھی گئی کوئی تخلیق ہے۔ صلاح الدین ایوبی کو انھوں نے اپنی ماں کی فرمائش پر لکھا۔

صلاح الدی ایوبی کی اشاعت کے ذکر کے ساتھ خالد بن ولید ناول کا ذکر کیا ہے اور انھوں نے بتایا کہ انھوں نے بہت احتیاط سے سبھی واقعات کا ذکر کیا ہے۔ اگر آدمی غور سے نہ پڑھے تو سہو ہونے کا امکان رہتا ہے۔

غالب ناول کے سلسلے میں فرماتے ہیں کہ اس ناول کو انھوں نے فخر الدین علی احمد کی فرمائش پر لکھا اور اس ناول غالب کی زبان میں لکھا ہے۔ ساتھ ہی ساز وسامان کے ذکر میں نہایت احتیاط اور چھان بین کے بعد لکھا گیا ہے۔

''حضرت جان'' کے تعلق سے انھوں نے بتایا کہ اس ناول کا مسودہ حیات اللہ انصاری کا پیش کیا ہوا ہے اور اس ناول کا قرۃ العین حیدر نے Horror ناول کہا ہے۔

''ناول''اور غبار شب کے متعلق بھی مختصر گفتگو کی ہے۔قاضی صاحب کے فن کا کمال یہ ہے کہ وہ مختصر لفظوں میں اپنی بات کہنا جانتے ہیں اور اس خوبی اور اس فن کا حقیقی منظر کے تمام تخلیقات میں نظر آتا ہے۔

ادبی مباحث میں قاضی صاحب نے ناول اور رتاریخی ناول کے فرق پر بات کی ہے اور تاریخی ناول کے لیے فضا بندی کو ضروری گردانا ہے۔اس ضمن میں انھوں نے ٹالسٹائے کا ذکر کیا ہے کہ اس نے سوا برس صرف فضا بندی کے لیے خرچ کیے جب وہ اپنا ناول War and Peace لکھ رہا تھا۔کہتے ہیں کہ بہت معمولی باتیں فضا کی تخلیق میں معاون ہوتی ہیں۔فضا آفرینی تاریخی ناول کی ریڑھ کی ہڈی ہے۔اگر کوئی ناول نگار فضا کی تخلیق پر قادر نہیں ہے تو وہ ناکام تاریخی ناول نگار ہے

اسرار و گفتار میں خلیل الرحمٰن اعظمی اور آل احمد سرور کا منفی انداز میں ذکر کیا گیا ہے جس کی وجہ سے حقیقت سے ناواقف شخص کے ذہن میں ان کی منفی شخصیت بنتی ہے۔خلیل الرحمٰن اعظمی کو قاضی صاحب نے چودھری کے لقب سے یاد کیا ہے اور انھوں نے ایک مصرعے کا شاعر کہا ہے۔ساتھ گروہ بند شاعر بھی کہا ہے ساتھ ہی آل احمد سرور کی شخصیت کے کچھ منفی پہلوؤں کو بھی پیش کیا ہے۔

خلیل الرحمٰن اعظمی کے متعلق کہتے ہیں کہ:

> ''جہاں تک خلیل الرحمٰن اعظمی صاحب کا سوال ہے تو میں ان کو ایک مصرع کا شاعر مانتا ہوں......ایک سے ابوجہل ہے، کس کس سے لڑیں۔''
> ان کی نظموں اور غزلوں کو ان کے ہم عصروں کی نظموں اور غزلوں میں خلط ملط کر دیجیے۔ناموں کو مٹا دیجیے، اس کے بعد آپ خلیل الرحمٰن اعظمی کی غزلوں کو نکال سکیں تو میں ان کو شاعر مان لوں گا۔''21

تنقید سے قاضی عبدالستار ہمیشہ بدظن رہے اور نقادوں کو انھوں نے کبھی اہمیت نہیں دی۔تنقید کے تعلق سے ان کے جملے زبان زد خاص و عام ہیں۔کہتے ہیں:

> ''ادب کو تنقید کی ضرورت ہی نہیں ہے ایشیائی ادب کے بہترین شاہکار اس وقت پیدا ہوئے جب تنقید نام کی کوئی چیز وجود میں نہیں آئی تھی۔''22

اس گفتگو میں قاضی صاحب کے دوسرے نظریات کی بھی کارفرمائی نظر آتی ہے جیسے وہ اعزازات یا

21۔قاضی عبدالستار اسرار و گفتگو۔راشد انور راشد، عرشیہ پبلی کیشنز، نئی دہلی، سنہ اشاعت 2014، ص 301

22۔قاضی عبدالستار اسرار و گفتگو۔راشد انور راشد، عرشیہ پبلی کیشنز، نئی دہلی، سنہ اشاعت 2014، ص 300

ایوارڈ کو پری پلان بتاتے ہیں اوران کے مطابق ایسے ایسے لوگوں کو اعزاز دیے جاتے ہیں جو اس کے مستحق نہیں ہوتے ہیں۔

قاضی عبدالستار اور شہریار بھی آپس میں کبھی نہیں بنی۔ اس گفتار میں بہت سے ایسے واقعات کا ذکر کیا جن میں دونوں کے اختلاف نظر آتے ہیں۔ قاضی صاحب شمس الرحمٰن فاروقی کے اس نظریے پر پوری طرح اتفاق کرتے ہیں جب انھوں نے کہا تھا شہریار کی شہرت میں دانشگاہ علی گڑھ کا خاص دخل ہے۔ اگر ان کا تعلق کسی قصبے یا ادب کے غیر مرکزی علاقے سے ہوتا تو وہ بھی ان سیکڑوں ہزاروں شاعروں کی طرح گم نام ہوتے۔

شہریار کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

''استاد محترم آل احمد سرور کو شہریار نے اپنے شیشے میں اتار لیا تھا اور اس طرح اتارا کہ پروفیسر آل احمد سرور نے شہریار کی لکچرشپ کی سلیکشن کمیٹی میں یہ فرمایا کہ شہریار کی تھیسس منظور ہو چکی ہے اس لیے ان کا نام Recommend کرتا ہوں۔ پورا علی گڑھ جانتا ہے کہ شہریار کی تھیسس پروفیسر ثریا حسین کے زمانے میں مکمل ہوئی اور مشہور رہے دروغ برگردن راوی کہ ان کی تھیسس کی تیاری میں پروفیسر نورالحسن نقوی کی قلمی مزدوری کا بڑا دخل ہے۔ سرور صاحب صاحب اختیار تھے اور ساہتیہ اکادمی ایوارڈ ان کے قبضۂ اقتدار میں تھا تو انھوں نے بھی ساہتیہ اکادمی ایوارڈ دینے میں انصاف نہیں کیا۔'' 23؎

جب رشید صاحب شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شاعروں کا ذکر کیا اور ان کی شاعری پر قاضی صاحب کی رائے جاننی چاہی تو انھوں نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا جب اچھے اچھے شعراء علی گڑھ کے شعبۂ اردو میں موجود تھے۔ انھوں نے کہا:

''شاعروں میں آپ میرے سامنے ہیں اور سامنے والے کی تعریف میں نہیں کرتا، لیکن مجبوری ہے۔ آپ شعر کہہ رہے ہیں، سراج اجملی کہہ رہے ہیں اگر کوئی اور کہتا ہے تو میں واقف نہیں ہوں۔'' 24؎

غرض کہ میں نے پہلے ہی لکھا تھا اس گفتار کی بہت سی باتوں سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا ہے اس میں

23؎ قاضی عبدالستار اسرار و گفتگو۔ راشد انور راشد، عرشیہ پبلی کیشنز، نئی دہلی، سنہ اشاعت 2014، ص۔ 308

24؎ قاضی عبدالستار اسرار و گفتگو۔ راشد انور راشد، عرشیہ پبلی کیشنز، نئی دہلی، سنہ اشاعت 2014، ص۔ 319

بہت سی ایسی باتیں کہی گئی ہیں جو قابل گرفت ہیں۔ قاضی صاحب کی شخصیت میں جو کجی تھی اس کا اندازہ اس کتاب میں قدم قدم پر ہوتا ہے ساتھ ہی قاضی صاحب کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ یہ انٹرویو قاضی شناسی کے سلسلے میں ایک اہم دستاویز ہے۔

اسرار وگفتار میں راشد صاحب نے قاضی صاحب سے بہت گہرے سوالات کیے جہاں انھوں نے قاضی صاحب کی ادبی تخلیقات پر بات کی وہیں پر انھوں نے عہد حاضر کے مسائل ایورڈ اعزاز کی بے وقعتی اور معاصر رسائل وجرائد پر بھی بات کی۔ قاضی صاحب کے فن میں انانیت کا جو عنصر آیا ہے اس پر راشد نے سوال کیا۔ قاضی صاحب کا انانیتی ادب کا اپنا ایک نظریہ ہے اور وہ انانیت کی خرابی نہیں سمجھتے بلکہ تعریف کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ انانیت ہر انسان وحیوان میں بھی ملتی ہے اور جانوروں کے اندر بھی یہ وصف موجود ہے۔ انانیت کو ایک اہم تخلیقی اور مقدس جذبہ سمجھتے ہیں۔

قاضی عبدالستار اسرار وگفتار قاضی صاحب کی سوانح زندگی کی آئینہ دار ہے جس میں قاضی صاحب کی زندگی کے نظریہ اوران کے فکر وفن سے گفتگو کی گئی ہے۔ یہ کتاب قاضی صاحب کے بے باکانہ انداز اوران کے انانیتی خیالات کی ترجمانی کرتی ہے ساتھ ہی ان کی شخصیت کو سمجھنے کا موقع دیتی ہے۔

محاکمہ

ممتاز و منفرد فکشن نگار پدم شری قاضی عبدالستار کی حیات اور افسانوی کائنات کو سمیٹنے کے لئے اس مقالے کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ہر باب ان کے فکر وفن کے مختلف گوشوں کے در وا کرتا ہے اور کچھ ایسے نکات وصفات سامنے لاتا ہے جو پردہ خفا میں ہیں یا جن پر ابھی تک تفصیلی گفتگو نہیں کی جاسکی ہے۔ ابواب کے عنوانات سے اندازہ ہو گیا ہوگا کہ اس بات کی حتی الامکان کوشش کی گئی ہے کہ قاضی عبدالستار کی ذات وحیات سے تمام ضروری باتیں اور ان کے فکر وفن کے تمام تر جہات روشن ہو جائیں اگر کہیں پر دھندلکا ہے تو چھٹ جائے اگر کسی گوشے میں جالے ہیں تو وہ ہٹ جائیں یعنی حقائق سامنے آجائیں۔ اس مقالے میں اس بات کی بھی کوشش کی گئی ہے کہ قاضی عبدالستار کی شخصیت کو معروضی نقطۂ نظر سے پرکھا جائے اور اگر کسی گوشے پر مصلحت یا عقیدت کا کوئی پردہ پڑا ہوا ہے تو اسے ہٹا کر قاضی عبدالستار کی اصل شکل وصورت کو سامنے لایا جا سکے۔ اس بات کی پوری کوشش کی گئی ہے کہ جو بات کہی جائے وہ دلائل کی روشنی میں کہی جائے۔

پہلا باب حیات وشخصیت پر مبنی ہے اس باب میں قاضی عبدالستار سے متعلق سوانحی کوائف کو حقائق و دلائل کی روشنی میں جانچنے اور پرکھنے کی سعی کی گئی ہے اور اس بات کا حتی الامکان کوشش کی گئی ہے کہ ان کی پیدائش سے متعلق جو مختلف تاریخیں رہی ہیں ان کا جائزہ اس طرح لیا جائے کہ اصل تاریخ پیدائش تک رسائی ہو سکے۔ ایسا اس لئے بھی کیا گیا ہے کہ ناقدین تو کوئی اور تاریخ پیدائش بتاتے ہیں اور قاضی عبدالستار خود کسی اور تاریخ پیدائش کا ذکر کرتے ہیں۔ عام طور پر مصنف کی بات کو سچ سمجھ لیا جاتا ہے۔ عموماً ایسا مانا جاتا ہے کہ مصنف جو کہے گا وہ سچ ہی ہوگا۔ لیکن یہ بھی ضروری نہیں کہ مصنف اپنے بارے میں جو بات کہتا ہے وہ سو فیصد صحیح ہی ہو۔ کبھی کبھی وہ مبالغے اور مصلحت سے کام لیتا ہے اور حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کرتا ہے۔ قاضی

عبدالستار کی شخصیت اوران کے مزاج کے بعض پہلوایسے ہیں جن کی بدولت یہ امکان پیدا ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی پیدائش کی تاریخ سے متعلق جورائے دی ہے اسے حقائق کی روشنی میں درست نہیں مانا جاسکتا۔اس باب میں دلائل کے ساتھ اس بات کو ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہےاوراصل سنِ پیدائش کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی۔

اس باب میں قاضی عبدالستار کے مزاج کے ان عناصر تک بھی رسائی کی کوشش کی گئی ہے جن سے ان کی شخصیت کی تعمیر ہوئی ہےاور جوشخصیت بعض لوگوں کی نظر میں اچھی تو بعض کی نگاہ میں منفی نظر آتی ہے۔ان کی شخصیت کی اس کجی کو بھی پتہ لگانے کی سعی کی گئی ہے۔اس کے تہذیبی ونفسیاتی عوامل کے اثرات ان کی تحریروں میں بھی دکھائے گئے ہیں۔

دوسرے باب میں قاضی عبدالستار سے قبل اردوفکشن کا عمومی جائزہ پیش کیا گیا ہےاورفکشن کے خدو خال اورعمومی ارتقاء کا جائزہ لیا گیا ہے جو قاضی عبدالستار سے پہلے لکھا گیا۔ یہ جائزہ اس لیے بھی ضروری تھا کہ یہ اندازہ ہوسکے کہ قاضی عبدالستار سے پہلے اردوفکشن کا رنگ وآہنگ کیا تھا،کس طرح کے ناول اور افسانے لکھے گئے۔قاضی عبدالستار کے فکشن کا فن اپنے پیش روؤں سے مختلف کیوں اور کیسے ہے اوران کا انداز واسلوب ان سے منفرد اور جداگانہ رنگ کیوں ہے؟ اس باب میں پریم چند سے لے کرعصمت چغتائی اوران سے بھی قبل ڈپٹی نذیراحمد سے لے کر رسؔوا کی افسانوی کائنات کامختصراً جائزہ لیا گیا ہےاورنمائندہ فکشن نگاروں پرقدرے معروضی انداز سے گفتگو کی گئی ہے تا کہ قاضی عبدالستار سے قبل افسانوی دنیا کی تصویر پوری طرح ہمارے سامنے ابھر سکےاورتصویر سے ہم قاضی عبدالستار کی بنائی گئی افسانوی صورت کا موازنہ کرسکیں اور یہ بتانے میں کامیاب ہوسکیں کہ کیسے قاضی عبدالستار کی افسانوی شکل اپنے پیش روکی افسانوی صورت سے مختلف ہے۔اوران کے فکشن کے امتیازات کونمایاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے تا کہ ان کی روشنی میں قاضی عبدالستار کے فکشن کے امتیازات واضح ہوسکیں۔اس باب میں خاص طور پر پریم چند،اعظم کریوی،سدرشن، سہیل عظیم آبادی،اخترحسین رائے پوری،اپندرناتھ اشک وغیرہ پرتوجہ صرف کی گئی ہے۔

تیسرا باب قاضی عبدالستار کی افسانہ نگاری سے مختص ہے۔اس باب میں زمیندارانہ نظام کی شروعات کا اجمالی جائزہ پیش کیا گیا ہے، جومختلف کتابوں، دستاویزوں اورویب سائٹ پرموجود ہیں اس کے بعد قاضی

عبدالستار کی افسانہ نگاری کے امتیازات اور زمینداری کے خاتمے کے اثرات کی نشاندہی کی گئی ہے جس کی مختلف شکلیں قاضی عبدالستار کے افسانہ نگاری پر دکھائی دیتی ہیں ساتھ ہی ان کے افسانوں کے موضوعات کے انوکھے پن پر مدلل گفتگو کی گئی ہے۔ ان افسانوں کا تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے جن سے قاضی عبدالستار بہ حیثیت افسانہ نگار قدم جماتے ہیں۔ اور اردو کی افسانوی دنیا میں اپنی انفرادیت قائم کرنے میں پیتل کا گھنٹہ، رضو باجی، مالکن، سایہ وغیرہ موضوعات کے تحت اس بات کا بھی اہتمام کیا گیا ہے کہ قاضی عبدالستار کے یہاں جو مختلف رنگ کے افسانے نظر آتے ہیں ان رنگوں کا حاطہ کیا جا سکے اور اس کے محرکات وعوامل پر بھی روشنی پڑ سکے مثلاً دیہی افسانوں میں دیہی رنگ، شہری افسانوں اور تاریخی افسانوں کا تاریخی رنگ موضوعات کے ساتھ زبان و بیان کا بھی جائزہ لیا گیا ہے اور زبان و بیان کے ان پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے جو قاضی عبدالستار کو ایک اہم اور منفرد افسانہ نگار بنانے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔

چوتھے باب میں قاضی عبدالستار کے ناولوں پر بحث کی گئی ہے۔ پہلا ناول ''پہلا اور آخری خط'' سے لے کر آخری ناول ''آخری کہانی'' تک کا تنقیدہ جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ معروضی نقطۂ نظر سے ان ناولوں کو پرکھا گیا ہے اور ان کی قدر و قیمت متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جن ناولوں سے قاضی عبدالستار کو شہرت ملی ان پر تفصیلی گفتگو مثلاً شب گزیدہ، صلاح الدین ایوبی، داراشکوہ ان ناولوں پر اس لیے زیادہ توجہ صرف کی گئی ہے کہ یہ ناول اور ناول نگاری کے ارتقاء میں اہم کردار نبھاتے ہیں اور اردو ناولوں کے سرمایہ کو زرخیز بنانے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ اس باب میں اس بات سے بھی بحث کی گئی ہے کہ تاریخ اور تاریخی ناولوں میں کیا فرق ہوتا ہے۔ تاریخ جب ناول بنتی ہے تو اس میں کیا کیا تبدیلیاں کرنی پڑتی ہیں اور فکشن کیسے سماجی حقیقت سے مختلف ہو جاتا ہے۔ قاضی عبدالستار کو ایک تخلیق کار کی نظر سے جب دیکھتے ہیں تو حقائق سے فسانہ اور فسانوں سے حقائق پھوٹ پڑتے ہیں۔ ان کے ناولوں کے تاریخی موضوعات پر تفصیلی گفتگو کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے اسلوب پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے تاکہ ان کے فن کے جوہروں کی چمک دمک ابھر کر سامنے آ سکے۔ اس باب میں قاضی عبدالستار کے اسلوب پر خاص طور پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ کیونکہ قاضی عبدالستار کے فکشن کی انفرادیت اور مخصوص پہچان ان کا دلکش و متاثر کن اسلوب ہے۔

ادب صرف مواد اور موضوعات کا نام نہیں بلکہ اس کے بہتر اظہار کا نام بھی ہے اس لئے ادب کا

اظہار یہ عام زبان کے اظہار سے مختلف ہوتا ہے یہ تخلیقی پیرایہ ہوتا ہے جس میں موضوع تخلیقی پیرایے میں نظر آتا ہے۔ اگر اسلوب بہتر نہیں تو ادب کا بہتر ہونا مشکل ہوتا ہے۔ یہ اسلوب کا ہی کارنامہ ہوتا ہے جو چھوٹی سے چھوٹی بات کو بھی اس طرح سے خوبصورت بنا کر پیش کرتا ہے کہ وہ بڑی نہ ہو کر بھی بڑی اور اہم لگنے لگتی ہے۔ اسلوب کی دولت بہت کم ادیبوں کو نصیب ہوتی ء ہے۔ اردو میں گنے چنے ایسے ادیب ہیں جو صاحب اسلوب ہیں اور جن کی تحریر دور سے پہچان لی جاتی ہے ان خوش نصیب ادیبوں میں قاضی عبدالستار بھی ایک ہیں بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ قاضی عبدالستار اپنے اسلوب کی وجہ سے زیادہ مشہور ہیں۔ ایسا پر شکوہ اور بلند آہنگ اسلوب بہت کم تخلیق کاروں کے یہاں نظر آتا ہے ان کے اسی وصف کو دیکھتے ہوئے مشہور و نامور نقاد شمس الرحمٰن فاروقی نے انھیں Paradoxes کا بادشاہ کہا تھا واقعی قاضی عبدالستار زبان و بیان کے بادشاہ ہیں لسانی اور اسلوبیاتی حسن کے نمونے ان کی تحریروں میں جا بجا بکھرے پڑے ہیں۔

مقالے کے آخری باب یعنی باب پنجم قاضی عبدالستار کی ان تحریروں پر مبنی ہے جو فکشن کے علاوہ انھوں نے مختلف ضرورتوں کے تحت قلم بن کئے ہیں۔ مختلف مضامین جو ادب کے موقر رسائل و جرائد میں وقتاً فو قتاً شائع ہوتے رہے ہیں، ان پر بھی تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے۔ مضامین کے علاوہ دو ایسی کتابیں جو قابل ذکر ہیں۔ ایک ان کی تھیسس (Thesis) ''اردو شاعری میں قنوطیت'' اور دوسری ''جمالیات اور ہندوستانی جمالیات'' اس زمرے میں قاضی صاحب کا وہ انٹرویو بھی آتا ہے جو انھوں نے راشد انور راشد کو دیا جو اسرار و گفتار کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔ یہ انٹرویو کئی اعتبار سے اہم ہے۔ ایک تو یہ کہ گو کہ یہ بولے گئے فل بدیع جملے ہیں مگر انھیں پڑھتے وقت ایسا لگتا ہے جیسے انھیں کافی غور و خوض کر کے منظّم طریقے سے لکھا گیا۔ مختلف جگہوں پر تو لگتا ہی نہیں کہ سوالوں کے جواب ہیں بلکہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ قاضی عبدالستار کے فن پارے ہوں یا کسی تحریر سے اخذ کئے گئے ہوں گو کہ یہ غیر افسانوی تحریر ہے مگر ایک نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو یہ ان کی افسانوی تخلیق ہے جس میں حقیقت بیانی کے ساتھ ساتھ افسانہ طرازی کے بہترین نمونے موجود ہیں جس میں قاضی صاحب کا بیانیہ انداز بیان قاری پر سحر طاری کرتا ہے اور وہ بار بار قرأت پر مجبور ہو جاتا ہے اور ہر بار اسے کتاب کا دل چسپ انداز اپنی طرف راغب کر لیتا ہے۔

''اردو شاعری میں قنوطیت'' قاضی عبدالستار کا تحقیقی مقالہ ہے جس پر انھیں پی ایچ۔ڈی کی ڈگری

تفویض کی گئی۔ان کے انٹرویو کے بعض بیانات سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ موضوع ان پر تھوپا گیا اور کی مرضی کے خلاف انھیں الاٹ کیا گیا مگر اسے انھوں نے Challenge کے طور پر قبول کیا اور تحقیق کا حق ادا کر دیا۔

''جمالیات اور ہندوستانی جمالیات'' اکیڈمک ضرورت کے پیش نظر لکھی گئی ۔ یہ کتاب بھی کافی سرخیوں میں رہی اس لئے کہ اس پر چودھری محمد نعیم نے ایسا سخت تبصرہ کیا کہ یہ ایک ایک نگاہ کی مرکزہ توجہ بن گئی۔انھوں نے اس کتاب کے متعلق یہ لکھا اس میں سرقہ کیا گیا ہے لیکن اس کتاب کو پورے طور پر سرقہ کہہ پانا مشکل ومناسب نہیں لگتا۔

مقالے میں قاضی عبدالستار کی شاعری کا بھی مختصر جائزہ لیا گیا ہے۔قاضی صاحب نے ایک زمانے میں کافی نظمیں اور غزلیں لکھیں مگر جلد ہی شاعری ترک کر کے فکشن سے اپنا رشتہ جوڑ لیا۔ان کی نثر میں ان کی شاعری اہم رول ادا کرتی ہے اور نثر کو نثری آہنگ کے ساتھ ساتھ شعری آہنگ بھی فراہم کرتی ہے جس کی وجہ سے ان کی نثری تخلیقات دوآتشہ بن جاتی ہے۔

اس محاکمے سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ قاضی عبدالستار کی شخصیت کے اصل کارنامے کیا ہیں، ان کے اسباب کیا ہیں اور ان کی وجہ سے ان کی تخلیقات میں کس کس طرح کا رنگ پیدا ہوا ہے۔یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ انھوں نے افسانے اور ناول دونوں میدانوں میں معرکے سر کئے ہیں اور غیر افسانوی نثر کے بھی اچھے نمونے پیش کئے ہیں ساتھ ہی اپنے تحقیقی مقالے میں ایک اچھے محقق کا حق بھی ادا کیا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ قاضی عبدالستار نے اردو فکشن میں ایک نئی راہ نکالی اس کے دامن میں نئے نئے موضوعات داخل کئے اور فکشن کو ایک نیا اسلوب اور زبان و بیان کا نیا رنگ وآہنگ بھی دیا۔

کتابیات

بنیادی مآخذ

نمبر شمار	مصنف کا نام	نام کتاب	نام ناشر	مقام اشاعت	سنہ اشاعت
1۔	قاضی عبدالستار	اردو شاعری میں قنوطیت	مسلم یونیورسٹی علی گڑھ پریس	علی گڑھ	1963
2۔	قاضی عبدالستار	آخری کہانی	علیشا پبلی کیشنز	علی گڑھ	2015
3۔	قاضی عبدالستار	غبارِ شب	نصرت پبلیشرز	لکھنؤ	1974
4۔	قاضی عبدالستار	جمالیات اور ہندوستانی جمالیات	ادبی پبلیشرز، آنند بھون	علی گڑھ	1977
5۔	قاضی عبدالستار	داراشکوہ	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس	دہلی	2008
6۔	قاضی عبدالستار	صلاح الدین ایوبی	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس	دہلی	2011
7۔	قاضی عبدالستار	خالد بن ولید	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس	دہلی	2017
8۔	قاضی عبدالستار	حضرت جان	ایجوکیشنل بک ہاؤس	علی گڑھ	1990
9۔	قاضی عبدالستار	پیتل کا گھنٹہ	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس	دہلی	2013
10۔	قاضی عبدالستار	پہلا اور آخری خط	اسرار کریمی پریس	الہ آباد	1984
11۔	قاضی عبدالستار	تاجم سلطان	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس	دہلی	2005
12۔	قاضی عبدالستار	شب گزیدہ	ایجوکیشنل بک ہاؤس	علی گڑھ	1988
13۔	قاضی عبدالستار	غالب	عرشیہ پبلی کیشنز	نئی دہلی	2016

ثانوی مآخذ

نمبر شمار	نام مصنف	نام کتاب	نام ناشر	مقام اشاعت	سنہ اشاعت
14	احمد خاں	قاضی عبدالستار: فکر فن اور فنکار	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس	دہلی	2005
15	احسن فاروقی محمد/سید نورالحسن ہاشمی	ناول کیا ہے؟	ایجوکیشنل بک ہاؤس	علی گڑھ	2011
16	اسلم آزاد	اردو ناول آزادی کے بعد	سیمانت پرکاشن دریا گنج	دہلی	1990
17	انور پاشا	ہندو پاک میں اردو ناول	پیش رو پبلی کیشنز منیرکا	نئی دہلی	1992
18	ابن کنول	کچھ شگفتگی کچھ سنجیدگی	کتابی دنیا	نئی دہلی	2020
19	اوم پرکاش پرشاد	اورنگ زیب ایک نیا زاویہ نظر مترجم: فیضان رشید	خدابخش اورنٹیل لائبریری	پٹنہ	1990
20	الطاف حسین حالی	یادگار غالب	غالب انسٹی ٹیوٹ	نئی دہلی	2019
21	اقبال مجید	بشری دوستی اور نئی ترقی پسندی	عرشیہ پبلی کیشنز	نئی دہلی	2014
22	ارتضیٰ کریم	اردو فکشن کی تنقید	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان	نئی دہلی	2016
23	انور احمد	اردو افسانہ ایک صدی کا قصہ	براؤن بک پبلی کیشنز	نئی دہلی	2014
24	آل احمد سرور	تنقید کیا ہے؟	مکتبہ جامعہ	نئی دہلی	2011
25	اختر اورینوی	تحقیق و تنقید	کتابستان	الہ آباد	1960
26	ابواللیث صدیقی	آج کا اردو ادب	ایجوکیشنل بک ہاؤس	علی گڑھ	2017
27	انور سدید	اردو افسانے میں دیہات کی پیش کش	اردو رائٹرس گلڈ	الہ آباد	1997
28	اوپندر ناتھ اشک	کونپل و دوسرے افسانے	مکتبہ اردو	لاہور	1940
29	اعجاز حسین	مختصر تاریخ ادب اردو	اعجاز پبلشنگ ہاؤس	نئی دہلی	1964
30	احتشام حسین	اردو ادب کی تنقیدی تاریخ	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان	نئی دہلی	2011

31	احمد صغیر	اردو ناول کی تنقیدی جائزہ 1980 کے بعد	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس	دہلی	2016
32	ارشد علی ٹھاکر	قاضی عبدالستار عکس وجہت	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس	دہلی	2020
33	اطہر پرویز	راجندر سنگھ بیدی اوران کے افسانے	ایجوکیشنل بک ہاؤس	علی گڑھ	2013
34	بنارسی پرشاد سکسینہ	تاریخِ شاہجہاں	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان	نئ دہلی	2015
35	پی سی جوشی	انقلاب اٹھارہ سوستّاون	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان	نئ دہلی	2009
36	خالد اشرف	برصغیر میں اردو ناول	کتابی دنیا	دہلی	2003
37	خلیل الرحمٰن اعظمی	اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک	ایجوکیشنل بک ہاؤس	علی گڑھ	2015
38	خواجہ الطاف حسین حالؔی	یادگارِ غالبؔ	غالب انسی ٹیوٹ	نئ دہلی	2019
39	راشد انور راشد	قاضی عبدالستار (گفتگو کی شکل میں سوانح عمری)	عرشیہ پبلی کیشنز	نئ دہلی	2004
40	راجندر پرشاد، جی این پانڈے	ہماری تہذیبی وراثت	پبلی کیشنز ڈویژن حکومت ہند	نئ دہلی	1995
41	صاحب علی	اردو فکشن کا مطالعہ	ؔاردو چینل	ممبئ	2006
42	صغیر افراہیم	اردو افسانہ ترقی پسند تحریک سے قبل	ایجوکیشنل بک ہاؤس	علی گڑھ	2009
43	صگیر افراہیم	افسانوی ادب کی نئ قرأت	مسلم ایجوکیشنل پریس	علی گڑھ	2011
44	قمر رئیس	تلاش وتوازن	ادارِہ خرام پبلیکیشنز، جمال پریس	دہلی	1968
45	غضنفر	روئے خوش رنگ	نیو پرنٹ سنٹر	نئ دہلی	2014
46	غضنفر	فکشن سے الگ	مکتبہ جامعہ	نئ دہلی	2013
47	قرۃ العین حیدر	آگ کا دریا	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس	دہلی	1990
48	قرۃ العین حیدر	آخری شب کے ہم سفر	علوی بک ڈپو	ممبئ	1979
49	قمر رئیس (مرتب)	ترقی پسند ادب کے معمار	نیا سفر پبلی کیشنز	دہلی	2006

50	کاکڑے این اے(مترجمہ)محمد شفیع الدین سوداگر، ڈاکٹر فرحین جہاں	ابوالمظفر الدین غازی اورنگ زیب عالمگیرؒ	سوداگر پبلیکیشن روشن گیٹ	اورنگ آباد	2015
51	مہناز عبید	قاضی عبدالستار کی افسانہ نگاری (تنقیدی محاکمہ)	مکتبہ جامعہ	نئی دہلی	2018
52	محمد غیاث الدین	نذر قاضی عبدالستار	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس	دہلی	2006
53	محمد شاکر	اردو میں تاریخی ناول (آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد)	کتابستان چندوارہ	مظفر پور	2003
54	منظر اعظمی	اردو ادب کے ارتقاء میں ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا حصہ	اتر پردیش اردو اکادمی	لکھنؤ	2009
55	محمد شہزاد ابراھیمی	قاضی عبدالستار کے تاریخی ناولوں میں ہیرو کا تصور	موڈرن پبلشنگ ہاؤس	نئی دہلی	2008
56	محمد یاسین	ہندوستان کے عہد مغلیہ کی سماجی تاریخ	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان	نئی دہلی	1998
57	مشیر الحسن	اتحاد سے انتشار کی طرف کلونیل اودھ کے قصبات	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان	نئی دہلی	2005
58	مرزا جعفر حسین	قدیم لکھنؤ کی آخری بہار	ترقی اردو بیرو	نئی دہلی	1981
59	مرزا خلیل احمد بیگ	اسلوبیاتی تنقید نظری بنیادیں اور تجزیے	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان	نئی دہلی	2014
60	مناظر عاشق ہرگانوی	فہم و تفہیم	دارالاشاعت مصطفائی	دہلی	2018
61	منتظر مہدی	ترقی پسند اردو ناول	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس	دہلی	2016
62	محمد نسیم	اردو ناول پر تقسیم ہند کے المیہ کے اثرات	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس	دہلی	2002
63	محمود کاظمی (مترجم) رالف فاکس	ناول اور عوام	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان	نئی دہلی	2014
64	محمد یٰسین	ناول کا فن اور نظریہ	خدابخش اورینٹل لائبریری	پٹنہ	2002

65 مرزا محمد ہادی رسوا | امراؤ جان ادا | مکتبہ جامعہ لمیٹڈ | نئی دہلی | 2012
66 نورالحسن نقوی | تاریخ ادب اردو | ایجوکیشنل بک ہاؤس | علی گڑھ | 2014
67 نسیم حجازی | داستانِ مجاہد | پرویز بک ڈپو | نئی دہلی | 1943
68 نزہت سمیع الزماں | اردو ادب میں تاریخی ناول کا ارتقاء | نامی پریس | لکھنؤ | 1982
69 نسیم حجازی | محمد بن قاسم | پرویز بک ڈپو | نئی دہلی | 1946
70 علی احمد فاطمی | عبدالحلیم شرر بہ حیثیت ناول نگار | قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان | نئی دہلی | 2007
71 عزیز احمد | ترقی پسند ادب | رزاقی مشین پریس | حیدرآباد | 1945
72 علی عباس حسینی | اردو ناول کی تاریخ اور تنقید | ایجوکیشنل بک ہاؤس | علی گڑھ | 2011
73 علی احمد فاطمی | ناول کی شعریات | عرشیہ پبلی کیشنز | نئی دہلی | 2016
74 علی احمد فاطمی | ترقی پسند تحریک سفر در سفر | ادارہ نیا سفر | الٰہ آباد | 2006
75 عباس رضا نیر | اردو ناول اور اودھ | ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس | دہلی | 2016
76 عبدالغفور | قاضی عبدالستار: بہ حیثیت ناول نگار | دانش کدہ دریاپور | پٹنہ | 2016
77 عظیم الشان صدیقی | اردو افسانہ فکری وفنی مباحث | ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس | دہلی | 2013
78 عنایت اللہ التمش | داستان ایمان فروشوں کی (پانچ جلد) | ادبی دنیا اردو بازار | دہلی | 1982
79 عصمت چغتائی | ٹیڑھی لکیر | نصرت پبلیشرز | لکھنؤ | 1990
80 عصمت چغتائی | ایک قطرہ خون | کتابی دنیا | نئی دہلی | 2002
81 عنایت اللہ التمش | شمشیر بے نیام | ادبی دنیا مٹیا محل | نئی دہلی | 1988
82 عبدالحلیم شرر | فردوسِ بریں | مجلس ترقی ادب | لاہور | 1967
83 عابد حسین سید | قومی تہذیب کا مسئلہ | قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان | نئی دہلی | 1998
84 عبدالمغنی | فروغ تنقید | ایجوکیشنل بک ہاؤس | علی گڑھ | 2007
85 کلیم الدین احمد | اردو تنقید پر ایک نظر | بک امپوریم سبزی باغ | پٹنہ | 2010
86 قمر رئیس | پریم چند کا تنقیدی مطالعہ | قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان | نئی دہلی | 2005
87 قمر رئیس | تلاش وتوازن | جمال پریس | نئی دہلی | 1968

88 وقار عظیم	فن افسانہ نگاری	ایجوکیشنل بک ہاؤس	علی گڑھ	2009
89 وارث علوی	گنجفہ بازِ خیال	ماڈرن پبلیشنگ ہاؤس	نئی دہلی	2007
90 شمس الرحمٰن فاروقی	فاروقی کے تبصرے	شب خون کتاب گھر	الہ آباد	1968
91 شبلی نعمانی	الفاروق	دارالمصنفین شبلی اکیڈمی	اعظم گڈھ	2012
92 شریف حسین قاسمی (مترجم)	دستنبو	غالب انسی ٹیوٹ	نئی دہلی	2007
93 شارب ردولوی	جدید اردو تنقید اصول ونظریات	اترپردیش اردو اکادمی	لکھنؤ	2002

رسائل و جرائد

94 آمد (سہ ماہی)	پٹنہ	اپریل تا جون، 2015
95 کتابی سلسلہ (سہ ماہی)	دہلی	اپریل تا جون
96 فکر و تحقیق	خاکہ نمبر، نئی دہلی	اپریل تا جون، 2017
97 فکر و تحقیق	ناول نمبر، نئی دہلی	اپریل تا جون، 2016
98 سہیل	کولکاتا	جولائی تا اکتوبر، 2017
99 اردو ادب	نئی دہلی	متعدد شمارے
100 طلوع افکار	کراچی	فروری، 1993
101 کتاب	لکھنؤ	1967
102 تزئین ادب	شیر پور	اپریل تا جون، 2017
103 نیا پرتیمان (ہندی)	الہ آباد	فروری، 2019
104 غالب نامہ	نئی دہلی	جولائی تا دسمبر، 2019
105 امروز	علی گڑھ	
106 شاندار	اعظم گڈھ	جون، 2018

☆☆☆